

# اسلام اور جدیدیت کی کشمکش



محمد ظفر اقبال

انصارِ علم و طالع نیشنل



# اسلام اور جدید سائنس کی کشمکش

روایتی اسلامی فکر پر سیکولر اعتراضات کا تحقیقی مطالعہ

محمد ظفر اقبال

عالم اسلام و دانش  
ادارہ

297-04

جملہ حقوق محفوظ ہیں

2

۱۲۸۵۵۷

ادارہ علم و دانش

ناشر:

ادارہ علم و دانش

کتاب:

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش

طبع اول:

محرم الحرام ۱۴۳۶ھ / نومبر 2014ء

قیمت:

تقسیم کنندگان:

مکتبہ عرفاروق: ۴/۵۰۱-شاہ فیصل کالونی، کراچی۔ فون: 021-34594144

موبائل: 0314-9600090, 0334-3432345

فضلی سنز: اردو بازار، کراچی

دارالکتاب: کتاب مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور

کتاب سرائے: پہلی منزل، الحمد مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور

ادارہ پاکستان شناسی: ۲/۲۴-سوڈھیوال کالونی، ملتان روڈ، لاہور۔ رابطہ: ۰۳۲۲۴۰۰۵۹۵۲

ادارہ علم و دانش: P.O Box No. 009221, Email: idaraeilmodanish@gmail.com

## مشمولات

| صفحہ | مضامین   |
|------|--|
| ۱۶-۱ | مقدمہ  |
| ۲    | ڈاکٹر منظور احمد: تصنیفات و تالیفات                            |
| ۲    | منظور احمد سے منسوب کتاب ”تاریخ فلسفہ“: ایک مغربی مصنف کی کتاب |
| ۵    | منظور احمد: مضامین و مقالات                                    |
| ۵    | قلم کاری: نمایاں موضوعات و عنوانات                             |
| ۶    | منظور احمد: پیش کردہ علمی حوالوں اور ماخذ و مصادر کی حقیقت     |
| ۶    | احقاق و تحقیق اور ثانوی ماخذ کے حوالے                          |
| ۷    | اصطلاحات کے ترجمے: وقتیں اور مشکلات                            |
| ۸    | مغربی اصطلاحات سے ناواقفیت: ہولناک نتائج                       |
| ۹    | مغربی علوم کو اسلامیانے کی کوشش: ایک معصوم خواہش               |
| ۹    | عربی زبان سے ناواقفیت اور ثانوی ماخذ سے استفادہ: ثمرات و نتائج |
| ۱۰   | ڈاکٹر منظور احمد: تضادات                                       |
| ۱۲   | فلسفیانہ بیج: ڈاکٹر منظور احمد کا اصل مسئلہ                    |
| ۱۳   | منظور احمد: ہمت اور جرأت کا فقدان                              |
| ۱۴   | اپنے افکار کی آبیاری کے لیے دوسروں کے نام کا سہارا: منظور احمد |

مجموعہ رسائل  
مجموعہ رسائل

۱۵

مابعد الطبیعیات: علمیات اور اخلاقیات کی درجے بندی کی واحد اساس

وحی کی مرکزیت

ڈاکٹر منظور احمد کا منہاج علم: مبہم اور گنجگ

منظور احمد: اسلامی منہاج علم پر تنقید کی حقیقت: بنیادی سوالات

اسلام اور عہد جدید: دو متضاد منہاج علم اور مقصدیت کے داعی

دنیا کی معلومہ تہذیبیں اور مغربی تہذیب: بنیادی اور جوہری فرق

امت مسلمہ کی زبوں حالی، منبر و محراب کی تلقین اور جدید مسائل

جدید فکر: مذہبی عقائد اور اخلاق کے متوازی راہ

منبر و محراب کی تلقین و تحدید: سرمایہ دارانہ نظام زندگی اور آزادی کی راہ میں رکاوٹ

مقاصد الشریعہ: زمانہ جدید کے مسائل کے محاکمے اور حل کے لیے مؤثر طریق

زمانہ جدید میں بعض امور پر رخصت کے درجے میں عمل کی اجازت: احتیاط اور قیود

جدیدیت پسند: مغربی فکر و تہذیب کے جامد مقلد

منظور احمد: زمانہ جدید سے نبرد آزمائی: ایک مذاق

منظور احمد: تفہیم دین کی واحد صورت: طبعیاتی نظام خدائی مداخلت سے آزاد

منظور احمد: نظام اخلاق میں الوہی مداخلت آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ: سنگین دعویٰ

اخلاقیات کو الوہی دانش سے آزاد کرنے کے مضمرات: چند بنیادی سوالات

معاشی و تکنیکی ترقی کا بدیہی نتیجہ: زندگی سے خدا اور آخرت کا انخلاء

جدید سائنس: کائنات کی دریافت نہیں اس پر تسلط سے عبارت ہے

ٹیکنوسائنس: سرمائے کی بڑھوتری کے لیے ادارتی صف بندی میں اختیار کی جانے والی تدبیر

کسی بھی نظریے کا تسلط اور شرح ترقی: متضاد راہیں

مارکیٹ: سرمائے کا معیاری دائرہ زر سے زر کا حصول: مذہبی اقدار کے سنانی رویہ

بلند معیار زندگی اور جمع سرمایہ: جدید ترقی کے اصول و آدش

ہوس اور لالچ کی عمومیت: جدید معاشیات اور مذہب میں جبر و مقابلے کا ناگزیر سبب

فکری بنیاد: معاشی و تکنیکی ترقی کا حصول اور انبیا کی آمد و بعثت کا مقصد: بنیادی فرق

- ۳۹ منظور احمد: مغربی افکار کی خوشہ چینی مسلمانوں کی علمی روایت کی فراخ دلی: ایک صریح مغالطہ
- ۴۱ جدیدیت پسندوں کا طریقہ: مغرب پر ایمان اور اس کی اسلام سازی
- ۴۱ مغرب اور اسلام دو متضاد مقصدیت سے پھوٹنے والی علمیات کے داعی
- ۴۲ مسلم تہذیب کا اختصاص: علوم کی اساس تو حید ہے
- ۴۲ جدیدیت: وحی کی اساس پر پروان چڑھنے والی تہذیبیں قرن مظلمہ کی یادگار
- ۴۲ جدیدیت: ماضی کے انکار اور مستقبل سے انسلاک کی داعی: ایک مستقل مابعد الطبیعیات
- ۴۲ جدیدیت کی فکری اساس: انسان خود خدا ہے
- ۴۳ آزادی اور عقل: جدیدیت پر ایمان کے دو لازم ارکان
- ۴۴ خدا کی موت: آزادی پر ایمان اور عقل کے آزادانہ استعمال کا منطقی نتیجہ
- ۴۴ جدیدیت کا نفاذ اور مذہب کی شکست: لازم و ملزوم
- ۴۵ قرآن و سنت اور دنیوی ترقی: بعد المشرقین
- ۴۵ جدید طرز زندگی: اثرات و مضمرات
- ۴۶ قرآن: انبیا کی زندگی فقر و تنگی کا استعارہ
- ۴۷ انبیا کی مد مقابل تہذیبیں: ترقی اور آسائش سے مملو
- ۴۷ قرآن: دنیوی ترقی بہ طور قدر مقاصد خلافت میں شامل نہیں
- ۴۸ اسلام اور مغرب: دو الگ الگ تصورات خیر کے داعی
- ۴۸ دنیا کی محبت اور دینی مآخذ اور دینی نمائندوں کی تحقیر: ترقی کا لازمہ
- ۴۹ ترقی یافتہ اقوام: ترقی کے لیے مذہب، تہذیب اور اخلاق سے مکمل دست برداری
- ۴۹ لادینی: ہر تہذیب میں ترقی کی قدر مشترک
- ۵۰ مغرب: اسلام کو ”الخیر“ ماننے والوں کو جراثیم کی طرح کچل دینا ضروری ہے
- ۵۲ مذہبی بنیاد پرستی نہیں، اسلام ”فساد کی جڑ“ ہے: مغرب
- ۵۲ نشاۃ الثانیہ: مسلمان خیر القرون کے معیاری طرز زندگی کی طرف لوٹ جائیں
- ۵۲ ترقی کے لیے خیر القرون کی تہذیبی حالت کو ترک کیا جاسکتا ہے: منظور احمد
- ۵۳ ترقی کے نام پر اقدار کی تبدیلی کا مطالبہ خیر و شر کے معیارات سے دست برداری
- ۵۴ منظور احمد: حصول ترقی کے لیے ماضی کا انکار: نئے تشخص کی بازیافت

|        |   |
|--------|---|
| ۵۴     | جدیدیت کا بنیادی وصف: اصول تاریخ کی خارجی تشکیل کا انکار اور تحقیر                  |
| ۵۵     | منظور احمد: حصول ترقی کے لیے بیان کردہ خطوط: نتائج                                  |
| ۵۶     | منظور احمد: مذاہب کی کوئی حیثیت نہیں: ترقی کا منطقی نتیجہ                           |
| ۵۶     | مذاہب اور ان کی حدود: اہم نکات  |
| ۵۷     | آزادی اور ترقی: الوہیت سرمایہ پر ایمان ہی سے ممکن ہے                                |
| ۵۸     | روسو: آزادی قدر ہے اسے جبراً نافذ کیا جائے گا                                       |
| ۵۸     | ڈربن: لبرل سرمایہ داری کا منکر ”مرتد“ ہے جس کی سزا موت ہے                           |
| ۵۹     | سرمایہ داری: ایک تصوراتی، عددی، غیر مرئی، خود تخلیقی اور مابعد الطبعی جادوگری       |
| ۵۹     | آزادی کو قدر مطلق مانے بغیر سرمایہ دارانہ ترقی کا حصول ممکن نہیں                    |
| ۵۹     | مغرب: محیر العقول ترقی: عیسائی الہیات اور اعتقادات میں تبدیلی: مذہب روحانی تعیش     |
| ۶۱     | استعماریت اور نوآبادیات: مغرب کی ترقی کے بنیادی لوازم                               |
| ۶۲     | ہزاروں دماغ + اربوں کی سرمایہ کاری + ریاستی سرپرستی = سائنسی ترقی                   |
| ۶۳     | جدید سائنس غیر اقداری نہیں  |
| ۶۳     | محیر العقول ٹیکنیکی ترقی کے ہولناک نتائج: مغربی مفکرین کا اعتراف                    |
| ۱۴۰-۶۸ | دوسرا باب: اسلام — دینی اور علمی منہاج  |
| ۷۱     | ماخذ اول — کتاب اللہ  |
| ۷۱     | عصر حاضر میں قرآن کے کلام الہی ہونے کو بہ طور علمی قضیہ ماننا ممکن نہیں: منظور احمد |
| ۷۲     | قرآن کا کلام الہی ہونا قابل تصدیق نہیں  |
| ۷۴     | منظور احمد: قرآن ایمانی جہت سے کلام اللہ ہے: مفہوم و مراد                           |
| ۷۴     | خدا پر ایمان اس کے ہونے کو مستلزم نہیں: منظور احمد                                  |
| ۷۵     | عصر جدید: کونیاتی و مابعد الطبعی تصورات کا طرز تفہیم                                |
| ۷۶     | قرآن میں بیان کردہ احکام ماورائے زمان و مکان نہیں: منظور احمد                       |
| ۷۷     | منظور احمد: دین دائمی اور شریعت قابل تغیر ہے: ایک التباس                            |
| ۷۷     | اسلام کا بہ طور آخری شریعت دائمی ہونا تنقید سے بالا نہیں: منظور احمد                |



- ۷۸ لفظ دین و شریعت مختلف تناظر میں مختلف مفاہیم کے حامل
- ۷۹ عہد نبویؐ کی تعلیمات اور تفصیلات کو دائمی اور عالم گیر سمجھنا لازم نہیں: منظور احمد
- ۸۰ مذہبی حقائق میتھا لوجیز ہیں، ان کی رد تشکیل ناگزیر ہے: منظور احمد
- ۸۰ فقہ اسلامی، اساطیر کی طرح ہیں: منظور احمد
- ۸۱ منظور احمد: رد تشکیل اور مذہب کے بنیادی احساس کی حفاظت: بے معنی دعویٰ
- ۸۲ رد تشکیل: اسلام کی اسلام کے نام پر بیخ کنی
- ۸۲ رد تشکیل: اسلام کی روح اور قالب دونوں کے انہدام کا منطقی نتیجہ
- ۸۳ قرآنی احکام کے اطلاقات کو زمان و مکاں میں محصور سمجھنا منشاء قرآن ہے: منظور احمد
- ۸۴ شرعی احکام کی تغیر پذیری کا ماخذ کیا ہے؟
- ۸۵ مسلمان: بتکوینی اور تشریحی دونوں احکام کا کامل تتبع
- ۸۶ فقہاء دین کے کل نظام احکام کے داعی
- ۸۶ احکام کے وقتی یا دائمی ہونے کا تعین: بہ ذریعہ عقل یا بہ ذریعہ شارع
- ۸۷ منظور احمد: سود کی حرمت کو دائمی سمجھنا منشاء قرآنی کی خلاف ورزی: ایک واہمہ
- ۸۸ سود کی حرمت: ادیان ماسبق اور اسلام کا اجماع
- ۸۹ سود کی حرمت پر قرآن کی واضح آیات
- ۹۰ منظور احمد: شان نزول سے صرف نظر کر کے قرآنی احکام کی عالم گیریت فقہاء کا اصرار، ایک کوتاہی
- ۹۱ شان نزول کے بغیر فہم قرآن تک رسائی ممکن نہیں: علماء و فقہاء
- ۹۲ فہم قرآن کا راست اور محکم ذریعہ سنت ہے: ارشاد نبویؐ
- ۹۲ قرآنی احکام کو شان نزول کے ساتھ مقید کر دینا، قرآن کو عملاً معطل کر دینا ہے
- ۹۳ منہج سلف: مخصوص واقعات کے تحت نازل ہونے والی آیات سے عموم پر استدلال
- ۹۵ معاشی و سائنسی ترقی کے لیے قرآنی احکام کی تخصیص ناگزیر ہے: منظور احمد
- ۹۷ قرآن قانونی دفعات کی نہیں موعظت و ترہیب کی کتاب ہے: منظور احمد
- ۹۸ قرآن: احکام کی قطعیت اور تغیر پذیری کا حسین امتزاج
- ۹۹ قرآن: احکام، موعظت، اور ہدایت کی عالم گیر اور جامع کتاب
- ۱۰۲ اسلامی ریاست: اسلامی سزاؤں اور حدود کے نفاذ کا اصل محل

- زنا کی سزا: ایک پاک باز اسلامی معاشرے کا موضوع
- ۱۰۵
- زنا کی سزا آزادی پر بہ طور قدر ایمان رکھنے والے معاشرے کے لیے نہیں ہے
- ۱۰۶
- چوری کی سزا: سادہ طرز زندگی کو معیار ماننے والے اسلامی معاشرے کا عنوان
- ۱۰۷
- سرمایہ دارانہ طرز زندگی کو معیار ماننے والے معاشرے چوری کی سزا کا موضوع نہیں
- ۱۰۸
- سزائیں اور حدود: اسلامی نظام حیات کی کلیت ہی میں با معنی اور موثر ہو سکتی ہیں
- ۱۰۸
- اسلامی قانون کی شان اعجاز: دنیوی سزا سے زیادہ آخرت کا خوف
- ۱۱۰
- صدر اول میں معاصی کے صدور: حکمت و مصلحت
- ۱۱۱
- اسلام توحید پر استوار ایک مکمل کلیت کا مظہر
- ۱۱۲
- ماخذ دوم — سنت
- ۱۱۵
- سنت ایک پیٹرن ہے: ڈاکٹر منظور احمد
- ۱۱۶
- سنت: ڈاکٹر منظور احمد کا نقطہ نظر: بنیادی سوالات
- ۱۱۸
- رسول اللہ کے فیصلے: زمان و مکاں میں محصور اجتہادات: منظور احمد
- ۱۱۹
- سنت واحد غیر متبادل نظام نہیں: منظور احمد
- ۱۲۰
- ”زمانہ“ ارشادات رسول کو پرکھنے کی کسوٹی ہے: جدیدیت پسند
- ۱۲۰
- مجتہدین رسول اللہ کے فیصلوں سے مختلف اجتہاد کر سکتے ہیں: منظور احمد
- ۱۲۱
- ”حدیث“ بزرگوں کی بات: منظور احمد
- ۱۲۲
- ماخذ سوم — اجماع امت
- ۱۲۵
- ماخذ چہارم — اجتہاد
- ۱۲۸
- نص ہی موجب اجتہاد ہے: جدیدیت پسند
- ۱۲۹
- منظور احمد: اجتہاد شرعی حکم کو ساقط کرنے کی اہلیت رکھتا ہے: چند سوالات
- ۱۳۰
- حرکی تصور اجتہاد: اطلاقات و مضمرات
- ۱۳۱
- اجتہاد: اہلیت، صلاحیت اور لیاقت
- ۱۳۲
- اجتہاد: حقیقت اور مقصد
- ۱۳۳
- قول نبوی: اجتہاد کا طریق اور مجتہد کے اوصاف
- ۱۳۵

- ۱۳۷ علوم کی ترقی اور اجتماعی اجتہاد کی ضرورت
- ۱۳۹ اجتہادی عمل میں فقہاء کے ساتھ دیگر علوم کے ماہرین کی شرکت: بنیادی اشتراک: ایمان
- ۱۳۷-۱۳۸ تیسرا باب: جدید منہاج علم — مآخذ و منابع
- ۱۹۸-۱۳۵ عقل محض اور عقل سلیم — فرق اور امتیاز
- ۱۳۵ مغرب: عقلیت کے دو معروف منہاج
- ۱۳۸ کانٹ کا تصور عقل: روایتی مابعد الطبیعیات کے بالمقابل ایک نئی مابعد الطبیعیات کا ظہور
- ۱۳۹ ہیگل: حلویت اور تاریخی اجتماعیت کے ذریعے عقلیت کا اظہار
- ۱۳۹ ہیگل: تاریخ خیر و شر کا پیمانہ اور غلبے کا سبب ہے
- ۱۵۰ تاریخ میں اخلاقی پیمانے بھی تغیر کا شکار رہتے ہیں
- ۱۵۱ تاریخ خیر و شر کا اصل پیمانہ ہے
- ۱۵۱ تاریخ کے خاتمے کا اعلان: مغربی تہذیب کا غلبہ اور برتری
- ۱۵۲ ریشٹل ازم اپنی بنیاد میں اسلامی فکر و عقل سے متصادم ہے
- ۱۵۳ اہل سنت و جماعت کا اختصاص: عقل اپنی جیت میں ناقص اور نقل کی تابع ہے
- ۱۵۳ منظور احمد کا تصور عقل جدیدیت پسندوں کے ہاں بھی متفقہ نہیں ہے
- ۱۵۴ حقیقت محض ایک انکشاف: ڈاکٹر منظور احمد
- ۱۵۵ حقیقت کی تخلیق اور تغیر پذیری کا نظریہ: ڈاکٹر منظور احمد
- ۱۵۶ عقلیت پسندی: اہم نکات اور سوالات
- ۱۵۷ عقل کی ذمہ داری: اہداف کا تعین یا اہداف کا حصول؟
- ۱۵۷ عقل: چند ماورائے محسوس بدیہی سچائیاں
- ۱۵۸ افلاطون: نظریہ مثال: عالم بالا میں ورائے عقل تصورات
- ۱۵۸ کانٹ: عقل کی ماورائے حواس دائرے میں دراندازی فکری اضراد کا سبب
- ۱۵۹ کانٹ: ماوراء حقیقت کا علم عقل کے زور پر ناممکن
- ۱۶۰ کانٹ: عقل محض حقیقت فی نفسہ کے ادراک میں ناکام
- ۱۶۱ شوپن ہاور: کانٹ کا کارنامہ حقیقت اور مظاہر کے درمیان فرق کی وضاحت

- ۱۶۱ ڈیکارٹ کا فلسفہ: مختلف مفروضات اور مابعدالطبیعیات پر انحصار
- ۱۶۲ لاک: حصول علم کا واحد ذریعہ تجربہ ہے عقل نہیں
- ۱۶۲ لائبنیز: عقل وجود کے تصور سے در ماندہ اور عاجز
- ۱۶۲ ہیوم: عقل جذبات کی باندی
- ۱۶۳ شوپن ہاور: ارادہ عقل سے فائق ہے
- ۱۶۳ کرکیرگارڈ: کیا چننا ہم نہیں کیسے چننا ہم ہے
- ۱۶۳ اسپنسر: صرف مظاہر لائق ادراک ہیں
- ۱۶۴ ڈیلتھی: فیصلوں میں صرف عقل کی نہیں نفس کے دیگر رجحانات کی عمل داری بھی لازم ہے
- ۱۶۴ برگساں: وجدان کی عقل پر بالادستی
- ۱۶۵ وٹکنسٹائن: اقدار دنیا کے باہر سے آتی ہیں
- ۱۶۶ جوڈ: عقل جذبات کے تابع مہمل ہے
- ۱۶۶ عقل: اقدار لذاتہ سے لاعلم اور عاجز
- ۱۶۷ فلسفے اور سائنس کے افکار: کشاکشی اور نبرد آزما
- ۱۶۷ آئن اسٹائن: استدلالی علوم کی غیر استدلالی بنیادیں
- ۱۶۸ جدیدیت: نقل سے زیادہ نقلی و تقلیدی دائرہ علم ہے
- ۱۶۹ علوم میں اختصاص فی الاصل علوم کی خانوں میں تقسیم اور محدودیت ہے
- ۱۶۹ مابعدالطبیعیاتی حقائق کے رد و قبول کی شرائط طبیعیاتی مسائل کے مماثل: منظور احمد
- ۱۷۰ منظور احمد: مذہبی وجدان اور مذہبی تجربہ نوعاً دیگر وجدانات اور اختبارات کے مماثل
- ۱۷۲ طبیعیات کی مابعدالطبیعی بنیادیں: حقیقت اب صرف محسوس میں منحصر نہیں
- ۱۷۳ مابعد جدیدیت: جدیدیت اور عقلیت کے تمام دعووں کا انہدام
- ۱۷۴ مابعد جدیدیت: سچائی اور حقیقت محض ایک التباس
- ۱۷۶ اہل ایمان عقل کی نارسائی سے آگاہ ہیں
- ۱۷۶ احاطے اور کمال سے معرا علم: عقل و مظاہر کا بنیادی نقص
- ۱۷۶ عقل کی خوئے جستجو سے یقین سے محروم رکھتی ہے
- ۱۷۷ وجود کے لازمانی و مکانی مراتب کا اثبات بہ ذریعہ تعقل قلبی

- ۱۷۸ قلب: منبع ایمان، مرکز خیر و شر
- ۱۷۹ ذہنی اور قلبی تعقل میں فرق
- ۱۸۰ اسلام کی جدید ذہن کے مطابق تفہیم: مسائل اور مشکلات
- ۱۸۲ صوفیانہ طریق: اسلام کی دعوت کا سب سے مؤثر ذریعہ
- ۱۸۳ امام ابوحنیفہ: کلامی و عقلی علوم سے دست برداری اور علم فقہ میں مشغولیت
- ۱۸۴ امام غزالی: کلامی و عقلی دلائل محدود افادے کے حامل
- ۱۸۵ توحید: منبع علوم
- ۱۸۵ صحابہ کرام: فلسفہ و کلام کے بغیر کثیر مخلوق کی ہدایت کا سبب
- ۱۸۶ ہدایت کا نبوی منہاج: انسان کے حال اور مقام کی درستی
- ۱۸۷ منظور احمد: الہیاتی نقطہ نظر نے قرآنی تعلیمات کے برعکس عقل کی اہمیت کو کم کیا: ایک الزام
- ۱۸۸ قرآن مجید کا عقلی منہاج اور ڈاکٹر منظور احمد کی عقلیت پسندی: بعد المشرقین
- ۱۸۸ العلم اور علم میں فرق نہ کرنا: التباس کا اصل سبب
- ۱۸۹ عقل سلیم کے مظاہر: اسلامی علوم و فنون کی محیر العقول ترتیب و تدوین
- ۱۹۰ اسلامی عقلی منہاج اور منظور احمد کی عقلیت پسندی: دو متوازی تصورات اور مختلف نتائج
- ۱۹۲ مغرب سے نبرد آزمانی اور ”نقل کے پیادے“: اصل خطرہ
- ۱۹۳ نقل کے پیادے: اسلامی علمیت کے محافظ صورت اور معنی دونوں کے ساتھ
- ۱۹۶ مدارس دینیہ: مغرب کے لیے ہمہ وقت خوف
- ۱۹۷ تبلیغی جماعت: مستقبل میں مغرب کے لیے خطرے کا الارم
- ۱۹۸ عزت اسلام کے ساتھ غیر مشروط وابستگی اور اطاعت میں ہے
- ۲۴۱-۱۹۹ علم اور ایمان — نسبت و تعلق
- ۲۰۰ مابعد الطبیعیات: مہمل اور جعلی افکار: منطقی ایجابیت پسند
- ۲۰۳ منطقی ایجابیت پسند: مابعد الطبیعیات پر اعتراضات کی حقیقت: سوالات و اعتراضات
- ۲۰۴ منظور احمد: تصور علم: ایک تفصیلی جائزہ
- ۲۰۴ سائنسی دعویٰ: تین بنیادی شرائط
- ۲۰۵ معروضیت

- ۲۰۵ معروضیت کی حقیقت پر ہیوم کے اعتراضات
- ۲۰۶ آفاقیت
- ۲۰۸ مفروضیت سے پاک
- ۲۱۰ استقرا: سائنسی تحقیق کا ابتدائی اصول: بنیادی خامیاں
- ۲۱۱ استقرا: سائنس کی غیر سائنسی بنیاد: برٹرینڈرسل
- ۲۱۲ سائنسی مشاہدہ مفروضے کا محتاج ہے
- ۲۱۳ تردیدیت: سائنسی تحقیق کے ارتقا کا اہم بنیادی مکتب
- ۲۱۶ تردیدیت: حقیقت اور سچ کا حصول ممکن نہیں
- ۲۱۷ پاپر کا فلسفہ: تیسری دنیا کا تصور: سچ اور حق تاریخی عوامل کی تحت تشکیل پاتا ہے
- ۲۱۸ تردیدیت: سائنسی علم کی تردید کا حتمی معیار نہیں
- ۲۱۹ فلسفہ تردیدیت: از خود ایک استقرائی دعویٰ
- ۲۱۹ ساختیت: لے کاٹوش اور کوہن: سائنسی مناجح کا حتمی اثبات یا ابطال ممکن نہیں
- ۲۲۱ ہر منہاج علم کا اپنا تعقل ہوتا ہے
- غیر متناسبتیت: ایک منہاج علم کے سوالات کے جوابات دوسرے منہاج علم میں تلاش کرنا نادانی ہے: فیرابینڈ
- ۲۲۱
- ۲۲۳ ریاستی سرمایہ دارانہ سرپرستی: سائنسی علمیت کی برتری کا اصل راز
- ۲۲۴ سائنس کی ریاستی سرپرستی: جمہوریت کے لیے بدترین خطرہ
- ۲۲۵ ہر قضیے میں کذب کا امکان سائنسی علمیت کا ایک اختصاص: ایک واہمہ
- ۲۲۹ نظریہ ارتقا: سائنسی ادعائیت کا منہ بولتا ثبوت
- ۲۳۱ سائنس کے ایک منہاج سے دوسرے میں منتقلی تبدیلی مذہب کی مانند ہے: کوہن
- ۲۳۳ صرف سائنس ہی "علم" نہیں
- ۲۳۴ سائنس کی زبان ریاضی سائنس نہیں: فائن مین
- ۲۳۴ سائنسی تجربات غیر سائنسی عناصر پر انحصار کرتے ہیں: فیرابینڈ
- ۲۳۵ جدید اور قبل از جدید معاشرے: علم کی تعریف: فرق اور تبدیلی
- ۲۳۶ دینی منہاج: علم: تصور اور تعریفات

|         |   |
|---------|---|
| ۲۳۷     | مذہبی منہاج: علم کی تعریف مذہبی شعور پر منحصر ہے                          |
| ۲۳۷     | معرفت حق کے باب میں ذہن کا کردار: انفعالی                                 |
| ۲۳۸     | ایمان: علم کی منطقی تعریف احاطے اور کمال سے عاری ہے                       |
| ۲۳۸     | علم، حصول نہیں حضور کا موضوع ہے: مذہبی شعور کا امتیاز                     |
| ۲۳۷-۲۳۲ | مغربی فکر و فلسفے کی خوشہ چینی اور اسلام سے تطبیق                         |
| ۲۳۲     | مغربی فلسفہ اپنی سرشت میں مذہب مخالف                                      |
| ۲۳۳     | منظور احمد: مغربی فلسفے کی خوشہ چینی کا بلا دلیل دعویٰ: ایک چیلستان       |
| ۲۳۳     | مختلف النوع فلسفیانہ مناہج اور مکاتب: منظور احمد کا مآخذ؟                 |
| ۲۳۵     | دو مختلف مابعد الطبعی علمیات کی یک جانی: عبقری فلاسفہ کا کارنامہ          |
| ۲۳۶     | اسلام اور مغرب کے مابعد الطبعی تصورات میں تطبیق محال ہے                   |
| ۲۳۶     | حاصل بحث  |
| ۲۳۸-۲۳۰ | چوتھا باب: خطبہ نیاز — تبصرہ و تجزیہ                                      |
| ۲۳۹-۲۵۳ | مذہبی فکر اور مسئلہ تکفیر — حزم و احتیاط یا عجلت و تشدد؟                  |
| ۲۳۹     | مسئلہ تکفیر: فقہاء کی تصریحات   |
| ۲۵۱     | امت مسلمہ: مختلف مسالک کے علما سے محبت اور کتابوں سے استفادہ: مجموعی رویہ |
| ۲۵۱     | مدارس عربیہ کا نصاب: مختلف مسالک کی کتابوں کا جامع                        |
| ۲۵۲     | امام ابوحنیفہ: افتراق و تشدد میں وحدت اور توسط کا استعارہ                 |
| ۲۵۲     | اسلاف: غیر اہل سنت کی کتابوں سے استفادے کا رواج: ایک کلیدی وجہ            |
| ۲۵۶-۲۵۴ | مذہب — وقتی یا ہمہ وقتی ضرورت   |
| ۲۵۷     | اسلام کی عالم گیریت اور معاشرتی ارتقا                                     |
| ۲۵۸-۲۶۳ | نیاز اور انکار حدیث   |
| ۲۵۹     | حجیت حدیث: مستشرقین کی مجموعی تحقیق                                       |
| ۲۶۰     | مسلمانوں کی مضبوط علمی روایت: مستشرقین کو منہ توڑ جواب                    |
| ۲۶۰     | حفاظت حدیث: بنیادی اسباب  |

|         |   |
|---------|---|
| ۲۶۱     | جدیدت پسند: انکار حدیث کے پس پشت کار فرما جذبہ                      |
| ۲۶۱     | حدیث: مذاہب عالم میں مسلمانوں کا امتیاز                             |
| ۲۶۱     | نیاز: صحیح بخاری پر اعتراض کی حقیقت                                 |
| ۲۶۳     | نیاز: موضوع حدیث سے مرزا قادیانی کے نبی ہونے پر استدلال             |
| ۲۸۴-۲۶۵ | سرسید کا تفسیری منہاج — فطرت  |
| ۲۶۶     | سرسید: حقیقت تک رسائی کے ذرائع: سائنس سے کلیۃً ناواقفیت             |
| ۲۶۷     | سرسید: مشاہدہ تجربی عمل کا نتیجہ: سائنس سے ناواقفیت کا ثبوت         |
| ۲۶۷     | فطرت: حقیقت تک رسائی کا معیار: جسے مغرب نے مسترد کر دیا             |
| ۲۶۸     | سرسید: لفظ فطرت اور اس کی حقیقت سے قطعی ناواقف                      |
| ۲۶۹     | فطرت: روایتی اسلامی مفہوم   |
| ۲۶۹     | فطرت: استفادے کی اہلیت و لیاقت: بنیادی شرائط                        |
| ۲۷۱     | فطرت: وحی کی روشنی میں روحانی و عقلی صلاحیت                         |
| ۲۷۲     | فطرت کی اتباع فی الحقیقت اسلام ہی کی پیروی ہے                       |
| ۲۷۲     | فطرت کی عدم اتباع فطری استعداد کے غیر موجود ہونے کی دلیل نہیں       |
| ۲۷۳     | فطرت کی اساس: مابعد الطبعی علمیات                                   |
| ۲۷۳     | روایتی تصور فطرت: ربانی مداخلت کے زیر اثر ہمہ وقتی معجزہ            |
| ۲۷۳     | فطرت کے میکائیکی نظریے کی تشکیل: مابعد الطبعی تبدیلی: مغرب          |
| ۲۷۵     | انجیل کی سند فطرت پر معیار اور حکم نہیں: مغرب                       |
| ۲۷۶     | فطرت کا نامیاتی تصور: مغرب کا اگلا قدم                              |
| ۲۷۶     | مادے کی الوہیت: فطرت کے میکائیکی اور نامیاتی تصورات کی اساس: مغرب   |
| ۲۷۷     | جدید مغرب: فطرت اب ایک داشتہ ہے: استعمال کرو اور پھینک دو: حسین نصر |
| ۲۷۸     | سرسید: خدا کا اور چھٹا ہوا نیچری ہے: [نعوذ باللہ]                   |
| ۲۷۸     | سرسید کے نظریہ فطرت کی راہ میں بڑی رکاوٹیں                          |
| ۲۷۸     | تقلید: پہلی رکاوٹ   |
| ۲۷۹     | مفسرین سلف کا تفسیری سرمایہ: دوسری رکاوٹ                            |



- ۲۷۹ احادیث و سنن: تیسری رکاوٹ
- ۲۸۰ کلام الہی اور کار الہی کا نظریہ: سرسید
- ۲۸۰ کار الہی و کلام الہی میں تعارض سے کلام کا جھوٹا ہونا لازم: سرسید
- ۲۸۲ قانون فطرت کی دریافت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا: سرسید
- ۲۸۳ سرسید کے تصور فطرت اور قرآن کی تفسیر: اثرات و نتائج: دور فقہ کی شہادت
- ۲۸۵-۲۹۲ نیاز — جدید سائنس سے ناواقفیت کے باوجود ایمان
- ۲۸۵ نیاز: سائنس مادیت و روحانیت کا امتزاج: ایک سفیہانہ دعویٰ
- ۲۸۵ کانٹ: حقیقت مطلقہ تک رسائی ممکن نہیں
- ۲۸۷ کانٹ: حقیقت دریافت کا موضوع نہیں، تخلیق کا عنوان ہے
- ۲۸۸ جدید سائنس: کائنات پر ارادہ انسانی کا تسلط
- ۲۸۸ سائنس اور اس کی حدود کار
- ۲۸۹ سائنس ایک کامیاب عملی مفروضہ
- ۲۹۰ مزعومات و نظریات: سائنسی علم کی واحد اساس
- ۲۹۰ سائنسی علوم کے زیر اثر مذہب کی تشریح: سائنس اور مذہب سے ناواقفیت
- ۲۹۱ سائنس اور مذہب میں تطبیق: سائنس کی مذہب پر برتری کا شاخسانہ
- ۲۹۳ نیاز — ایک غیر جانب دار مبصر؟
- ۲۹۳-۳۰۲ کیا روایتی علما کا تفسیری منہاج محض لغت عرب پر منحصر ہے؟
- ۲۹۳ سرسید کا علمی اثاثہ: معتزلی مکتب کی خوشہ چینی
- ۲۹۳ قرآن میں تدبر سے مراد صرف لفظی موشگافی نہیں
- ۲۹۵ اہل عرب صحابہ نے قرآن کو علم و عمل کے ساتھ سیکھا
- ۲۹۶ فن تفسیر: مستقل ریاضتوں کا مسلسل علمی سفر
- ۲۹۶ تفسیر قرآنی کے بنیادی ماخذ
- ۲۹۶ قرآن: تفسیر قرآن کا ماخذ اول
- ۲۹۷ حدیث و سنت: تفسیر قرآنی کا دوسرا ماخذ

|         |   |
|---------|---|
| ۲۹۷     | اقوال صحابہ کرام: تفسیر قرآنی کا تیسرا ماخذ                                       |
| ۲۹۸     | تابعین کے اقوال: تفسیر قرآنی کا چوتھا ماخذ  |
| ۲۹۸     | لغت عرب تفہیم قرآنی کا ماخذ نہیں، صرف ایک ذریعہ                                   |
| ۲۹۹     | تاویل: تفہیم قرآنی کا ایک ذریعہ   |
| ۳۰۰     | تاویل سے مراد الفاظ قرآن کو من مانے معنی پہنانا نہیں ہے                           |
| ۳۱۲-۳۰۳ | دینی الفاظ کی تفہیم پر معاشرتی ارتقا اور علمی ترقی کا اثر                         |
| ۳۰۳     | صحابہ و تابعین نے قرآن مجید کو علم و ترقی کے ساتھ سیکھا                           |
| ۳۰۴     | سنت نبوی اور تعامل امت: فہم قرآنی کا حتمی ماخذ                                    |
| ۳۰۴     | رسول اللہ دینی مرادات کی تفہیم کا حتمی و دائمی ماخذ نہیں: جدیدیت پسندوں کا المیہ  |
| ۳۰۵     | اعتقادات، عبادات اور معاملات: بعد زمانی اور ارتقا سے ماورا امور                   |
| ۳۰۶     | سیرت رسول: قرآن کے مفہیم تک رسائی کا لازمی ذریعہ: منظور احمد                      |
| ۳۰۶     | سیرت رسول عملاً نہیں الفاظ کی صورت میں محفوظ ہے                                   |
| ۳۰۷     | سیرت رسول کو حتمی ماخذ ماننے کے باوجود اس سے اختلاف: منظور احمد                   |
| ۳۰۸     | بعد زمانی سے الفاظ کی تفہیم: قرآن اور انجیل سے متعلق منظور احمد کے دو علیحدہ موقف |
| ۳۱۰     | علم تفسیر اور ہرمیڈیات: دو متضاد مابعد الطبیعیات سے ماخوذ تصورات علم              |
| ۳۱۰     | قرآن: لغت پر منحصر کتاب نہیں  |
| ۳۱۰     | الفاظ کے ارتقا اور نئے مفہیم کے ادراک کا ماخذ                                     |
| ۳۱۱     | دینی تناظر میں علم و معرفت میں ترقی کا اصول: مضمورات و اثرات                      |
| ۳۱۲-۳۱۳ | قوانین اسلامی — اقدار اور اطلاق دونوں ابدی و دائمی                                |
| ۳۱۳     | قوانین کے عالم گیر نہ ہونے پر اصرار: مغربی نظریہ ارتقا کا چربہ                    |
| ۳۱۴     | اسلامی فلسفہ احکام: ذات انسانی کی طرح قوانین بھی دائمی                            |
| ۳۱۵     | اسلامی قانون کی سازگاری: قانون کے دو اجزا ایک دائمی دوسرا متغیر                   |
| ۳۱۵     | قرآنی احکام: زمان و مکان کی قیود سے ماورا اور دائمی                               |
| ۳۱۶     | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: بہ طور شارع نافذ کی گئی سزائیں حدود — دائمی ہیں     |

- ۳۱۷ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: بہ طور قاضی نافذ کردہ سزائیں تعزیریں
- ۳۱۷ غیر منقول سزائیں تعزیر کے حکم میں ہیں
- ۳۱۷ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: بہ یک وقت شارع اور قاضی: فرق کی وضاحت
- ۳۱۹ پھانسی کے لیے بہ طور مثال قطع ید کی سزا: ڈاکٹر منظور احمد
- ۳۱۹ ڈاکٹر منظور احمد: چوری کا انسداد بہ ذریعہ ”نفسیاتی اصلاح“: ایک سوال
- ۳۲۰ چوری کی سزا کا سبب ایک مختصہ: منظور احمد
- ۳۲۰ اہل سنت کو اجماع کے خلاف شیعہ فقہیہ کی بلا حوالہ رائے قبول کرنے کا مشورہ: منظور احمد
- ۳۲۲ نجم الدین الطوفی کا تفر و شیعہ منہاج کا نمائندہ نہیں
- ۳۲۶ دینی سزائیں: دو قابل لحاظ امور
- ۳۲۶ دینی سزائیں: حق اللہ، یعنی شارع کا حق ہیں
- ۳۲۸ دینی سزائیں: جدید ذہن کی وحشت کا اصل سبب اور ماخذ
- ۳۲۹ جرائم کے سد باب کے لیے سنگین سزائیں: حکمت و مصلحت
- ۳۳۰ حدود: چند محدود سزائیں ہی دائمی اور ابدی ہیں
- ۳۳۱ چند مخصوص سزاؤں کا دوام انسانیت اور معاشرے کی حفاظت کا ضامن
- ۳۳۱ حدود: ثبوت جرم شریعت کے ضابطہ شہادت کے مطابق لازمی ہے
- ۳۳۲ تعزیر: احوال و ظروف کے مطابق قابل تبدیل سزائیں
- ۳۳۲ قوانین اسلامی میں صرف اقدار مستقل ہیں: ایک موہوم بیان
- ۳۳۲ مصلحت: مفہوم اور اقسام
- ۳۳۲ مقاصد شریعت کا تحفظ: مصلحت کے معتبر ہونے کی علامت ہے
- ۳۳۵ مصلحت، منصوص حکم کو بھی ساقط کرنے کی اہلیت رکھتا ہے: منظور احمد
- ۳۳۵ مصلحت کے نام پر منصوص احکام کی تبدیلی: چند اہم سوالات
- ۳۳۷ جدیدیت پسند: مصلحت کی آڑ میں تحریف دین کی کوشش
- ۳۳۵-۳۳۸ روشن خیالی اور قدامت پرستی — اصل جھگڑا
- ۳۳۸ روشن خیالی: مبدا و مرجع
- ۳۳۸ روشن خیالی: ہر مقتدرہ پر عقل کی حاکمیت اور برتری کا اعلان

|         |   |
|---------|---|
| ۳۳۹     | عقل کی خدائی: انسان کی بدترین غلامی کا نتیجہ                                      |
| ۳۴۰     | اسلامی سیاق میں ”روشن خیالی“: مقاصد، اثرات، نتائج                                 |
| ۳۴۲     | اسلام کی عالم گیریت اور جدیدیت پسندوں کی کوشش                                     |
| ۳۴۳     | اسلام: کامیاب زندگی اور معاشرے کا منفرد تصور                                      |
| ۳۴۴     | اصل کام: لوگوں کو دین کے قریب کرنا، نہ کہ دنیا کو دین کی راہ سے سند جواز عطا کرنا |
| ۳۴۴     | زمانے میں ”نوعیتی تبدیلی“ سے مراد   |
| ۳۴۵     | منظور احمد: اسلامی اصولوں کے پرانے طریقے اب بے معنی ہیں: بلا دلیل دعویٰ           |
| ۳۴۵     | پرانے طریقوں کے نئے طریقوں سے تبدیلی کا مطالبہ: نتائج و مضمرات                    |
| ۳۵۲-۳۴۶ | اسلام — ثبات و تغیر کا امتزاج   |
| ۳۴۶     | تبدیلی و تغیر: عہد جدید اور اسلام: فرق اور امتیاز                                 |
| ۳۴۷     | ماضی سے الحاق یا انقطاع   |
| ۳۴۷     | اسلام اور جدیدیت: بنیادی جھگڑا  |
| ۳۴۸     | تاریخ: تین معروف نظریات   |
| ۳۴۸     | اسلام کا ماضی سے وہی تعلق جو جدید مغرب کا روم و یونان سے ہے: جدیدیت پسند          |
| ۳۴۸     | عقل اور وحی کے ذریعے پروان چڑھنے والی تاریخ: جوہری فرق                            |
| ۳۴۹     | اسلام: مطلق سکون، مستقل حرکت  |
| ۳۵۱     | اجتہاد اور تجدید: تغیر آفریں ثبات اور ثبات آفریں تغیر                             |
| ۳۵۲     | خارجی اثرات کے تحت رونما ہونے والی تبدیلی: اجتہاد نہیں محض تجدید                  |
| ۳۵۲     | حقیقت تغیر محض ہے: جدیدیت پسند  |
| ۳۵۲     | تغیر پر اصرار: دین کو عمرانی علوم کی طرح سمجھنا: ماضی بہ مقابلہ حال ناقص ہے       |
| ۳۵۳     | تغیر کے نام پر تبدیلی کا مطالبہ: اسلام سے عملاً دستبرداری                         |
| ۳۵۳     | تبدیلی کے دو اسباب: داخلی و خارجی: فرق اور تضاد                                   |
| ۳۵۴     | قرون اولیٰ کے مسلمان عہد حاضر میں معیار نہ رہیں: جدیدیت پسندوں کی خواہش           |
| ۳۶۲-۳۵۵ | شاہ ولی اللہ — شریعت اسلامی میں تبدیلی کے امکان کی حقیقت                          |
| ۳۵۵     | منظور احمد: شریعت کی تبدیلی: شاہ ولی اللہ کا نامکمل حوالہ                         |

- ۳۵۵ شاہ ولی اللہ: دین اور شریعت کی حقیقت
- ۳۵۸ شراہ کی تبدیلی: شاہ ولی اللہ اور منظور احمد: دو علیحدہ اور متضاد موقف
- ۳۵۸ شاہ ولی اللہ: سزائیں شراہ سماویہ سے متواتر ہیں: مضبوطی سے پکڑو ترک نہ کرو
- ۳۵۹ دائمی سزاؤں کی خاصیت اور فہرست: شاہ ولی اللہ
- ۳۶۰ قرآن کے برعکس شریعت کی تبدیلی یا تنسیخ کا الوہی اختیار اب انسان کے پاس ہے: منظور احمد
- ۳۶۱ اسلام کی تکمیل اور دائمیت: امتیاز و اختصاص
- ۳۶۱ حدود میں تبدیلی یا تنسیخ تحریف دین کے مرادف ہے:
- ۳۶۲-۳۶۳ قانون اسلامی — ترمیم و تنسیخ یا ابدیت و دائمیت
- ۳۶۳ منظور احمد: معاشرتی تنظیم کے ہر قانون میں تبدیلی کا مطالبہ: مغربی فلسفہ قانون سے مستعار فکر
- ۳۶۵ وحی الہی: اسلامی قانون کی دائمیت کا اصل سبب
- ۳۶۶ اسلامی اور مغربی قانون: بنیادی فرق
- ۳۶۶ اسلامی قانون سازی کا دائرہ
- ۳۶۸ فقہاء پر تکفیر میں عجلت کا الزام: آرا کا اختلاف فطری امر
- ۳۶۸ بنیادی مسائل میں اختلاف: مذموم اور قبیح
- ۳۶۸ صحابہؓ و تابعینؓ میں نظری و فقہی اختلاف: نظائر اور مثالیں
- ۳۷۲ تکفیر مفتی کی ذمہ داری ہے شوق نہیں
- ۳۷۳ منظور احمد: علماء فقہی استنباط کو اسلام سمجھتے ہیں: ایک الزام
- ۳۸۰-۳۷۷ روایتی علماء اور شیخ عبدہ کا اجتہادی نقطہ نظر — بنیادی فرق
- ۳۸۵-۳۸۱ خلفائے راشدین کا اجتہادی مسلک — تخلیقی یا تقلیدی؟
- ۳۸۸-۳۸۶ اسلام کا تصور تجدید — ”ایک اجتماعی غلط فہمی“
- ۳۸۹-۳۹۰ امر بالمعروف و نہی عن المنکر — مفہوم، حدود اور شرائط
- ۳۹۰ اسلامی حکومت کا قیام: اہم ترین دینی مقصد
- ۳۹۳ پاکستان: نفاذ اسلام کی کوشش نا جائز مطالبہ؟
- ۳۹۴ صوفیہ کرام اور ریاست و حکومت

- ۳۹۷ ڈاکٹر منظور احمد: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر: فاش غلطیاں
- ۳۹۸ معروف و منکر: مفہوم و مراد
- ۳۹۹ امر و نہی: قرآن کے اعتبار سے مختلف مفہیم
- ۴۰۱ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر: قیام و نفاذ کا طریق
- ۴۰۵ اسلامی ریاست کے مسلم حکمرانوں کو امر معروف: آداب و شرائط
- ۴۰۶ مسلم ریاست کے جابر اور فاسق حکمرانوں کے خلاف بغاوت: نتائج و مضمرات
- ۴۰۹ کفر بواح کی صورت میں بھی مسلمانوں کی حفاظت کا یقین: خروج کی لازمی شرط
- ۴۱۱ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر: فرد اور ریاست کی علیحدہ علیحدہ ذمے داری
- ۴۱۲ قدرت و استطاعت انسداد منکر کی شرط لازم
- ۴۱۶-۴۱۴ مابعد الطبیعیات — وجودیات، کونیات اور اخلاقیات کی اساسی شناخت
- ۴۲۰-۴۱۷ غزالی اور ڈیکارٹ کے فلسفیانہ افکار میں تشکیک بہ طور منہاج ایک ادعا
- ۴۶۶-۴۲۱ پانچواں باب: نیاز فتح پوری: بر عظیم کی علمی اور ادبی تاریخ میں سنسنی خیزی اور سرتے کے علمبردار
- ۴۲۷-۴۲۴ سرتے و چربے
- ۴۳۵-۴۲۸ نگار: خدا نمبر — ایک مسروقہ تالیف
- ۴۳۸-۴۳۶ قمر زمانی بیگم — نیاز کا ایک بہروپ
- ۴۴۳-۴۳۹ نیاز — افکار و عقائد کی ایک جھلک
- ۴۵۰-۴۴۴ قرآن مجید کلام اللہ نہیں، کلام رسول اللہ ہے۔ [نعوذ باللہ]
- ۴۴۴ قرآن کا تعارف خود قرآن ہی سے
- ۴۴۵ قرآن کا لفظ لفظ کلام اللہ ہے: مستشرقین کی تصریحات
- ۴۴۶ قرآن مجید کلام اللہ نہیں انسانی کلام ہے: نیاز فتح پوری
- ۴۴۷ رسول اللہ پر کذب کی تہمت: کلام اللہ کو انسانی کلام باور کرنے کا نتیجہ
- ۴۴۸ وحی متلو اور غیر متلو: حقیقت اور فرق
- ۴۴۹ وحی کسی داخلی احساس یا بلند خیالی کا نام نہیں
- ۴۴۹ قرآن کا کلام اللہ ہونا عربوں کے فہم کا نتیجہ: منظور احمد

|         |   |
|---------|---|
| ۴۵۹-۴۵۱ | مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی — ”مجاہد اسلام اور عاشق رسول“        |
| ۴۵۳     | مرزا قادیانی: ”حمایت اسلام“ کے لیے دیگر اہل علم سے استفادہ            |
| ۴۶۱-۴۶۰ | ضمیمہ: علامہ نیاز فتح پوری — عبرت کا ایک ورق                          |
| ۴۶۶-۴۶۲ | علامہ..... یا..... ابو جہل؟   |
| ۴۷۸-۴۶۷ | چھٹا باب: ڈاکٹر منظور احمد اور سیکولرازم                              |
| ۴۶۸     | سیکولرازم: بنیادی خدو خال   |
| ۴۶۹     | منظور احمد کے سیکولر افکار  |
| ۴۷۱     | عبدیت: فکر اسلامی کا جوہر   |
| ۴۷۱     | سیکولرازم کی روح: اخلاقیات کے الٰہی ماخذ کا انکار                     |
| ۴۷۲     | مذہبی اخلاقیات بت پرستی کی آمیزش سے آلودہ: منظور احمد                 |
| ۴۷۳     | مذہبی اخلاقیات انسانی آزادی کی راہ کا سب سے بڑا پتھر: منظور احمد      |
| ۴۷۴     | اخلاقیات کا انسانی ماخذ: انسان کی خدائی کا اظہار                      |
| ۴۷۴     | حسن و فتح کلیات کے تابع   |
| ۴۷۵     | اخلاقیات کا انسانی ماخذ اگر خدائی نہیں تو ابلیسیت ہے                  |
| ۴۷۵     | الٰہی احکام کی مداخلت انسانی آزادی میں رکاوٹ: منظور احمد              |
| ۴۷۵     | ”نیت خدا کے شارحین“ اور قانون سازی: ایک بے بنیاد دعویٰ                |
| ۴۷۶     | قانون سازی کا انسانی اختیار: مغربی تناظر میں                          |
| ۴۷۷     | سیکولرازم: مکمل تصویر   |
| ۴۸۷-۴۷۹ | مرزا غلام احمد قادیانی سے متعلق نیاز و نگار کے حوالہ جات کی عکسی نقول |
| ۴۹۵-۴۸۸ | مضمون ”پاکستان“ از ڈاکٹر منظور احمد: عکسی نقل                         |
| ۵۲۱-۴۹۶ | کتابیات   |





## مقدمہ

سہ ماہی ”المعارف“ لاہور [اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۵ء] میں ڈاکٹر منظور احمد [چیئر مین عثمان انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، کراچی، سابق رکن اسلامی نظریاتی کونسل، اور سابق ریکٹر انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد] کا خطبہ ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“ مطالعے سے گزرا۔ اس خطبے کے علاوہ اُن کی دو کتابیں ”اسلام-چند فکری مسائل“ [لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۴ء] اور ”اقبال شناسی“ [لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۲ء] اور اکادمی بازیافت کے کتابی سلسلے ”مکالمہ“ میں چھپنے والے مضامین بھی ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ زیر نظر تحریر میں ڈاکٹر منظور احمد کے ”خطبہ نیاز“ پر گفتگو مقصود ہے، لیکن بہ قدر

۱- ڈاکٹر منظور احمد ۱۹۳۱ء میں یوپی کے علاقے رام پور میں پیدا ہوئے۔ رام پور کے حامد ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹۵۰ء میں رضا کالج سے انٹر پاس کیا۔ رام پور ہی میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کالج پڑھ کر جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے تھے۔ دور طالب علمی میں وہ اسلامی جمعیت طلبہ کے سرگرم کارکن تھے اور کالج میں باجماعت نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد انھیں مولانا مودودی کی فکر سے اختلاف پیدا ہوا اور انھوں نے جماعت اسلامی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ڈاکٹر منظور احمد کے والد میر احمد عدالت میں رجسٹرار تھے اور انھیں تصوف سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو ایم بی بی ایس ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے، لیکن اس دور میں ڈاکٹر منظور احمد کارخانہ مذہبی زیادہ تھا، بہر حال ان کے بڑے بھائی نے انھیں میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے لاہور بھیج دیا۔ چونکہ لاہور کے میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے ابھی چند ماہ باقی تھے لہذا وہ کراچی چلے آئے۔ کراچی آنے کے بعد انھوں نے کچھ عرصے پوسٹ آفس میں کام کیا۔ پھر کسی کے کہنے پر برما شیل میں انٹرویو دینے چلے گئے۔ انٹرویو میں پاس ہونے کے باوجود انھوں نے وہاں نوکری کرنے کے بجائے ایس ایم کالج میں شعبہ فلسفہ میں داخلہ لے لیا۔ گریجویشن کے بعد انھوں نے کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لیا، کراچی یونیورسٹی میں پڑھائی کے دوران ان کی تصوف سے وابستگی ہو گئی اور وہ ذہین شاہ تاجی کے عقیدت مندوں میں داخل ہو گئے۔ کراچی یونیورسٹی سے ماسٹرز کے بعد ڈاکٹر منظور احمد نے ۱۹۵۴ء میں ایس ایم کالج میں پڑھانا شروع کر دیا، ۱۹۶۱ء میں وہ بطور لیکچرار کراچی یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے، تدریس کے دوران انھوں نے تین سال کی چھٹی لی اور ۱۹۶۳ء میں پی ایچ ڈی کرنے لندن چلے گئے۔ لندن یونیورسٹی سے وہ پی ایچ ڈی کر کے ۱۹۶۶ء میں کراچی یونیورسٹی واپس آ گئے۔ ۱۹۹۳ء میں ڈاکٹر منظور احمد نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی اور ہمدرد یونیورسٹی کے قیام کے بعد مرحوم حکیم محمد سعید کے اصرار پر یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ وہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ریکٹر اور اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کے رکن بھی رہے۔ آج کل وہ عثمان انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے چیئر مین ہیں۔ [روزنامہ ایکس پریس، اسلام آباد، ۱۲ جولائی ۲۰۰۹ء، صفحہ ۴]۔

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش

ضرورت ان کی دونوں کتابوں اور چند دیگر مقالات سے بھی اعتنا کیا جائے گا۔

زیر بحث خطبے میں ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے نیاز فتح پوری [۱۸۸۳ء-۱۹۶۶ء] کو بہ طور ایک روشن خیال اسلامی مفکر باور کرانے اور ان کے افکار کو "اجتہاد" کی آڑ میں "اسلامیانے" کی کوشش کی ہے۔ مذکورہ الصدر مضمون ہرگز لائق اعتنا اور مورد التفات نہ سمجھا جاتا اگر اس میں بیان فرمودہ افکار و نظریات "انفرادی" نوعیت کے ہوتے۔ اس مضمون کے ذریعے ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے پہلی بار بزرگ عظیم کے تمام جدیدیت پسندوں کے موقف اور دلائل کو اپنے مخصوص سیکولر مگر دل چسپ فلسفیانہ پیرائے میں نہایت عمدگی اور سلیقے سے مجتمع فرما دیا ہے۔ اب چون کہ ان ہی خیالات کو اجتہاد کے حوالے سے الفاظ کے نئے نئے قالب دے کر بار بار دہرایا جا رہا ہے، لہذا ضروری معلوم ہوا کہ اس خطبے میں بیان کردہ نظریات پر گفتگو کر کے اس میں پوشیدہ افکار و خیالات کا علمی تجزیہ کر دیا جائے، جو فی الحقیقت ایک پورے طبقے کی مرکزی فکر کے نمائندہ اور ترجمان ہیں۔ اس لیے اب یہ تنقید محض ڈاکٹر منظور احمد صاحب پر نہیں بلکہ اس پورے طبقے پر ہے جو "اجتہاد" کے نام پر امت مسلمہ کو الحاد و انحراف کی "منظوری" دینے پر تلا ہوا ہے۔

یہ ایک عمومی تاثر ہے کہ مذہب کے دفاع میں لکھی جانے والی جدید تحریریں بالعموم علوم جدیدہ سے ناواقفیت اور معذرت خواہی کا شاہکار ہونے کے ساتھ ساتھ عامیانہ طرز استدلال اور بچگانہ تعبیرات پر مشتمل ہوتی ہیں اور علوم جدیدہ کے اٹھائے سوالات کا سامنا کرنے اور ان کے آگے بند باندھنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ اس صورت حال میں اگر کہیں سے علمی معاونت اور فکری رہنمائی کی نوید سنائی دے تو بہت خوشی ہوتی ہے کہ شاید عہد جدید میں روایت اور جدیدیت کی معرکہ آرائی پر کوئی قابل فہم اور مربوط علمی و فکری بحث سامنے آجائے اور جدید اشکالات و شبہات کا مبصرانہ جائزہ اور متوازن و اطمینان بخش جواب ہاتھ آجائے۔ اور کسی طرح یہ فکری الجھن سلجھ جائے۔

چوں کہ مزاج اور طبیعت طالب علمانہ ہے اس لیے جس در سے بھی کچھ ملنے کی امید ہو، راقم حاضر ہو جاتا ہے۔ راقم ان جدید موضوعات اور مباحث پر دینی روایت کے علم برداروں کی کتابوں کے ساتھ ساتھ جدیدیت پسند اور سیکولر فکر کے حامل صاحبان علم کی کتابوں کا مطالعہ بھی کرتا رہتا ہے کہ شاید راقم کو اس کی تشنگی کا سامان میسر آجائے اور ایک ہی موضوع پر مخالف و موافق دونوں آرا پوری تنقیح اور صحت کے ساتھ سامنے آجائیں اور کسی فکری نتیجے تک پہنچنا آسان ہو۔ اسی تلاش و جستجو میں راقم نے ایک جگہ پڑھا:

"[ڈاکٹر منظور احمد] مغرب میں اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں عام ہیں اس کا ازالہ کرنے کے لیے ایک کتاب پر بھی کام کر رہے ہیں"۔

۱- احمد حسین صدیقی، دبستانوں کا دبستان، کراچی: محمد حسین اکیڈمی، ۲۰۰۳ء، جلد ۱ صفحہ ۲۷۹۔

محترم ڈاکٹر منظور احمد پاکستان کے روشن خیال اور جدیدیت پسند حلقوں میں ایک بالغ نظر، سنجیدہ فکر دانش ور اور استاذ فلسفہ کی حیثیت سے معروف ہیں۔ اس لیے متذکرہ روایت نے راقم کو ڈاکٹر صاحب کی تالیفات کے مطالعے کی طرف سنجیدگی سے متوجہ کیا۔ ڈاکٹر منظور احمد اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

”میں مغربی فکر و فلسفے کا مرہون منت ہوں اور علم تفسیر [hermeneutics] کے جو معیارات میری دانست میں آج نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں، وہ مغربی فکر سے مستعار ہیں“۔<sup>۱</sup>

ہمارے علمی و فکری منظر نامے میں اس وقت ایسے افراد انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جو عہد جدید کے غالب فکر و رجحان، یعنی مغربی فکر و فلسفے کی حقیقت، کو اس کے اصل مآخذ و منابع کے ساتھ جانتے ہوں اور جو مرعوبیت کے بغیر اس کے حقیقت پسندانہ تجزیے سے عالم اسلام کے ناواقفین کو روشناس کرا سکیں۔ اسی امید اور خوش گواری احساس کے ساتھ راقم نے ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ مطالعے سے جہاں ڈاکٹر صاحب کے جان دار اسلوب تحریر اور اپنی بات کی نہایت خوب صورت پیرائے میں ابلاغ کی غیر معمولی صلاحیت نے متاثر کیا وہیں یہ امر بھی انتہائی حیرانی اور مایوسی کا باعث بنا کہ گزشتہ پچاس سال کے طویل علمی و قلمی سفر میں محترم ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی فکر و تحقیق اور قلم کاری کے نمایاں موضوعات کا تعلق مغربی فکر و فلسفے کی تحلیل و تجزیے اور اس کے زیر اثر درپیش مسائل کے ازالے سے نہیں بلکہ مختلف پہلوؤں سے اسلام، اسلامی افکار، اسلامی اقدار، قانون، معاشرت، حدود، عقائد اور ایمانیات جیسے انتہائی حساس دینی و علمی عنوانات کا فلسفیانہ منہاج میں جائزہ اور محاکمہ رہا ہے۔ حالاں کہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب اس بات کا برملا اعتراف فرما چکے ہیں:

”میں اسلام کی کوئی سند نہیں رکھتا، اس لیے قرآن و حدیث کو حوالے کے طور پر استعمال کرنے کے لیے اپنے کو سند یافتہ نہیں سمجھتا“۔<sup>۲</sup>

اس اقرار اور صراحت کے بعد توقع تو یہ تھی کہ وہ مباحث جن پر ڈاکٹر صاحب ولایت سے سند یافتہ ہیں، ان پر اپنا وقت اور اپنی محنت صرف فرماتے تو آج ہمارا معاشرہ بھی، کسی درجے ہی میں سہی، مغربی فکر و فلسفے سے آگہی کے ابتدائی مدارج ہی سے واقف ہوتا اس لیے کہ یہی ان کی فکر و تحقیق کا official عنوان تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب آدھی صدی سے فلسفہ اور مغربی فکر کو چھوڑ کر اسلام اور اسلامی موضوعات کو ”مشق سخن“ بنائے ہوئے ہیں۔

چوں کہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی زندگی فلسفے کی تحصیل و تدریس میں گزری ہے، اس لیے توقع تھی کہ ان کے مطالعے اور نگارشات کے خصوصی عنوانات بھی فلسفے ہی سے متعلق ہوں گے۔<sup>۳</sup> لیکن

۱- منظور احمد، ”چند تعلیمی مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۲ء، صفحہ ۱۸۳۔

۲- منظور احمد، ”حواشی“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۲۷۱۔

۳- محترم ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے مضامین و مقالات میں فلسفیانہ تعارف و تحلیل کے بعض عمدہ نمونے موجود ہیں۔ کلیمنٹ سی جے ویب کی کتاب کے ترجمے ”تاریخ فلسفہ“ کے آخر میں ”ہنری برگساں“ اور ”لڈوگ وٹلنسنائن“ کے فلسفیانہ افکار پر ڈاکٹر منظور احمد کے دو لائق مطالعہ مضامین موجود ہیں۔ [کلیمنٹ سی جے۔ ویب، تاریخ فلسفہ] مترجم، مولوی احسان احمد، کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۱۹۸۹ء، صفحات ۲۰۱-۲۳۶۔

ڈاکٹر صاحب کے علمی و فکری سفر کی کہانی ایک معکوس تاثر فراہم کرتی ہے۔ وہ یہ کہ فلسفیانہ موضوعات و مباحث جس کی تحصیل و تدریس میں ڈاکٹر صاحب نے ساری زندگی صرف کی اس پر تو ان کا کوئی دقیق اور نمایاں علمی کام موجود نہیں، دوسری جانب دین و مذہب جس کی ضابطے کی تحصیل و تعلیم کی کوئی نمایاں شہادت ڈاکٹر صاحب کا علمی و فکری سفر مہیا نہیں کرتا اس کے بنیادی اور قانونی مباحث پر ڈاکٹر صاحب ”مجتہدانہ“ قلم کاری سے بھی دریغ نہیں فرماتے۔ ان کی مطبوعہ تحریریں اس بات کی غماز ہیں کہ وہ دین و مذہب کی سرکاری زبان، یعنی عربی، سے بھی ایسی واقفیت نہیں رکھتے کہ زیر تحریر موضوع پر دین و مذہب کی اساسی کتابوں [جو کہ اکثر عربی زبان میں ہیں] سے استفادہ کر سکیں اور حوالے لے سکیں۔

ڈاکٹر منظور احمد: تصنیفات و تالیفات:

ڈاکٹر منظور احمد کئی کتابوں کے مصنف اور مؤلف شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی تالیفات کی فہرست میں [Books] Major Publications کے عنوان سے سات کتابوں کے نام ملتے ہیں:

- [1] History of Philosophy.
- [2] Morality of Law.
- [3] Translated Dialogue between Toynbee and Ikeda.
- [4] Pakistan Prospects and Perspectives.
- [5] Iqbal Shanasi.
- [6] Islam and Zindagi.
- [7] Islam Chund Fikri Masail.

منظور احمد سے منسوب کتاب ”تاریخ فلسفہ“: ایک مغربی مصنف کی کتاب:

”تاریخ فلسفہ“ [History of Philosophy] کو منظور احمد صاحب کی تالیفات کی فہرست میں سب سے پہلے نمبر پر Major Publications کے تحت درج کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب درحقیقت کلیمنٹ سی۔ جے۔ ویب کی تصنیف ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولوی احسان احمد صاحب نے کیا تھا، جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا تھا۔ منظور احمد صاحب جس زمانے میں کراچی یونیورسٹی میں شعبہ فلسفہ سے وابستہ تھے، اُس وقت یہ کتاب اُن کی نظر ثانی، پیش لفظ اور دو ابواب کے اضافے کے ساتھ، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ مگر منظور احمد صاحب کی تالیفات کی فہرست میں سب سے پہلے اسی کتاب کا نام درج کیا جاتا ہے، جس میں مصنف کا نام تحریر ہوتا ہے اور نہ مترجم کا۔ ”تاریخ فلسفہ“ کے متعلق عام تاثر یہی ہے کہ یہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب ہی کی تصنیف ہے۔ ۱۵ ستمبر ۲۰۰۷ء کو روزنامہ ایکسپریس اسلام آباد میں منظور احمد کے شائع ہونے والے انٹرویو

۱۔ علی یاسر [مرتب]، اہل قلم ڈائریکٹری، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۰ء، صفحہ ۲۷۴۔

اور اسلامی نظریاتی کونسل کے سہ ماہی مجلے ”اجتہاد“ میں اس کتاب کو منظور احمد صاحب کی تصنیف کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔<sup>۱</sup> آج تک منظور احمد کی طرف سے اس کی تردید سامنے نہیں آئی۔<sup>۲</sup>

بقیہ چھ تالیفات میں ”اقبال شناسی“ چھ مقالات کا مجموعہ ہے کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں اور ”اسلام۔ چند فکری مسائل“ مختلف اوقات میں تحریر کیے گئے نو<sup>۹</sup> مقالات کا مجموعہ ہے۔ ان دونوں کتابوں کا تعلق جدید فلسفے یا اس کی تفہیم سے نہیں ہے، بلکہ ان دونوں مجموعوں میں ”اسلام“ ہی کو مختلف عنوانات اور پہلوؤں سے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ”اسلام۔ چند فکری مسائل“ پر تو آگے چل کر کچھ عرض کیا جائے گا، جہاں تک ”اقبال شناسی“ کا تعلق ہے تو ۱۲ صفحات کی اس کتاب میں کسی ایک مغربی فلسفی کا حوالہ نہیں ملتا۔

منظور احمد: مضامین و مقالات:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی قلمی نگارشات کی فہرست میں کتابوں کے علاوہ منتخب مقالات [selected articles] کی بھی معتد بہ تعداد ہے۔ مقالات کی فہرست میں ڈاکٹر صاحب کے وہ مضامین و مقالات بھی شامل کر دیے جاتے ہیں جن کے مجموعے کو ”اقبال شناسی“ اور ”اسلام۔ چند فکری مسائل“ کے نام سے علیحدہ شائع کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد کے اکثر مضامین کا موضوع مذہب اور اقبال ہے۔ جدید فلسفے، مغربی فکر اور اقدار و تہذیب پر نقد و جرح سے یہ مضامین بالعموم معرا ہیں۔

قلم کاری: نمایاں موضوعات و عنوانات:

مشاغبہ [Propaganda] کسی بھی نقش یا خیال کو راسخ و ثابت کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ مسلسل اسلامی موضوعات پر خامہ فرسائی اور ”اسلام۔ چند فکری مسائل“ کی اشاعت کے بعد پاکستان کے جدیدیت پسند اور سیکولر حلقے یہ باور کراتے رہے ہیں کہ منظور احمد صاحب بہ یک وقت فلسفے اور اسلامی علوم پر نہایت وسیع اور بے کراں علم کے حامل ہیں اور ان دونوں میں وہ بڑی ماہرانہ اور متوازن تطبیق دیتے ہیں۔ وہ خصوصاً علوم اسلامی کے روایتی، تاریخی، تہذیبی، علمیاتی، کونیاتی اور مابعد الطبیعی عناصر پر نہایت عمیق اور گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ وہ روایتی اسلامی فکر پر جسے وہ ”فقہی اسلام“ سے تعبیر کرتے ہیں [نقد و جرح اس کے پیش منظر، پس منظر اور تہ منظر سے ماہرانہ واقفیت کے بعد فرماتے ہیں۔ اسلامی علوم و افکار پر ان کی نگاہ اتنی بصیرت افروز ہے کہ انہوں نے ان امراض و اسباب کو تلاش کر لیا، جن کے باعث امت مسلمہ آج زبوں حالی اور نکبت سے دوچار ہے۔ ان امراض کا علاج بھی انہوں نے

۱- اسلام آباد سے شائع ہونے والے سہ ماہی مجلے ”اجتہاد“ میں بھی اس کتاب *History of Philosophy* کا ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی تصنیف کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بات نہایت قابل لحاظ ہے کہ محترم ڈاکٹر منظور احمد اس مجلے کی ”مجلس ادارت“ میں بھی شامل تھے۔ سہ ماہی ”اجتہاد“، ۲:۱، دسمبر ۲۰۰۷ء، صفحہ ۱۱۳۔

۲- ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے علمی مقام و مرتبے سے یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایک مغربی مصنف کی معروف تصنیف کو دانستہ اپنی طرف منسوب فرمائیں۔ حسن ظن یہ کہتا ہے کہ متذکرہ کتاب میں دو قابل ذکر مضامین کے اضافے کے باعث ناواقفین پوری کتاب کو ڈاکٹر صاحب کی طرف منسوب کرتے رہے اور ڈاکٹر صاحب کی توجہ اس طرف نہ جاسکی۔

تجویز فرمایا ہے کہ بس مسلمانوں کے پستی اور فلاکت سے نکلنے کی واحد راہ ایسے آزادانہ "اجتہاد" میں مضمر ہے جو تقلید سے آزاد ہو، جس میں ہر چیز یہاں تک کہ ذاتِ خدا اور مذہبی عقائد و حقائق پر بھی "تفہیم" کے عنوان سے سوال اٹھایا جاسکتا ہو، اور جدید دور کے ساتھ چلنے کے لیے اگر اسلام کے بنیادی عقائد تک میں تبدیلی کر دی جائے تو روا ہے۔ ان کے نزدیک یونانی منطق نے مسلمانوں میں یہ خرابی پیدا کی ہے کہ مسلمان اپنے بنیادی عقیدے کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر منظور احمد اپنے انٹرویو میں فرماتے ہیں:

"یونانی منطق سے معاملات میں جبر پیدا ہوتا ہے، اور آپ بنیادی عقیدے کو تبدیل نہیں کر سکتے۔"

منظور احمد: پیش کردہ علمی حوالوں اور ماخذ و مصادر کی حقیقت:

کسی مضمون یا مصنف کی دیانت و ثقاہت، منہاج فکر اور علمی قابلیت و لیاقت کو جانچنے کا ایک موثر اور سریع العمل طریقہ یہ ہے کہ اس کے علمی حوالوں، مراجع اور کتابیات پر نظر ڈال لی جائے۔ اگرچہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے تعارف میں یہ بات پورے وثوق اور شد و مد کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ وہ عربی زبان و ادب پر عبور رکھتے ہیں لیکن ان کی تصانیف کے مطالعے سے تاثر یہی ملتا ہے کہ وہ عربی زبان و ادب سے ضروری واقفیت بھی نہیں رکھتے۔ اس عدم واقفیت کے باعث علوم اسلامی کے اصل ماخذ تک ان کی براہ راست رسائی نہیں ہے۔ دوسری طرف جن کتابوں کے حوالہ جات کو ڈاکٹر صاحب بہ طور استدلال و استشہاد پیش فرماتے ہیں وہ اصلاً عربی میں ہیں۔ "اسلام۔ چند فکری مسائل" کے حواشی و حوالہ جات پر ایک نظر ڈال لی جائے تو واضح ہو جائے گا کہ ۲۷۲ صفحات کی کتاب میں دین و مذہب کے اساسی و قانونی امور پر لکھتے ہوئے صرف ایک عربی کتاب کا حوالہ پیش کیا گیا ہے اور وہ امام غزالیؒ کی "المنقذ من الضلال" ہے جس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔

احقاق و تحقیق اور ثانوی ماخذ کے حوالے:

ثانوی ماخذ سے استفادہ احقاق و تحقیق کی دنیا میں اگرچہ باعث تحسین نہیں لیکن اگر کسی نایاب حوالے کے لیے ثانوی ماخذ کا حوالہ دے دیا جائے تو کوئی باعث گرفت اور قابل اعتراض بات نہیں بہ شرط یہ کہ حوالہ درست پس منظر اور نیک نیتی کے ساتھ پورے سیاق و سباق کو ملحوظ رکھ کر درج کیا گیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب اپنے مضامین و مقالات میں جن عنوانات پر گفتگو فرماتے ہیں، ان میں زیر بحث موضوع کی اہمات الکتب کا کوئی حوالہ نہیں دیتے۔ مثلاً مقاصد الشریعہ اور اجتہاد پر کوئی نتیجہ خیز علمی بحث یا مقالہ عز الدین بن عبدالسلام کی "قواعد الاحکام فی مصالح الانام" [قاہرہ: مطبعة حسینیہ، ۱۹۳۳ء]، شہاب الدین القرانی کی "کتاب الفروق" [بیروت: عالم الكتاب، ۱۳۳۷ھ]، امام الحرمین الجوینی کی "البرہان فی اصول الفقہ" [قطر: دولۃ قطر، ۱۳۹۹ھ]، ابو حامد محمد الغزالیؒ کی "المستصفیٰ من علم الاصول" [شرکة المدینة المنورة للطباعة، س۔ ن۔]، ابوالحسن ابراہیم الشاطبیؒ کی "الموافقات" [العربیة

السعودیة: دار ابن عفان، ۱۴۱۷ھ] اور ابن القیم الجوزیہ کی، "اعلام الموقعین عن رب العالمین" [المملکة العربیة السعودیة: دار ابن الجوزی، ۱۴۲۳ھ] سے صرف نظر کر کے نہیں لکھا جاسکتا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مختلف مقالات میں امام غزالی اور امام شاطبی کے حوالے سے مقاصد الشریعة اور مصلحت پر گفتگو فرمائی ہے، لیکن اپنی تمام تر تحقیق کا مدار و انحصار بالعموم ڈاکٹر خالد مسعود کی کتاب *Islamic Legal Philosophy: A Study of Abu Ishaq al-Shatibi's Life and Thought*, [Islamabad: Islamic Research Institute, 1977.] پر رکھا ہے۔

حالاں کہ امام غزالی کی "المستصفیٰ من علم الاصول" اور امام شاطبی کی "الموافقات فی اصول الشریعة" نادر و نایاب کتابیں نہیں بلکہ معروف و متداول ہیں۔ الموافقات کا تو اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ نتائج فکر سے اختلاف کے باوجود ڈاکٹر خالد مسعود کی کتاب کی تحقیقی حیثیت کا انکار مقصود نہیں، لیکن ڈاکٹر منظور احمد جیسے محقق فلسفی کے لیے یہ بات بڑی فرومایہ ہے کہ ایسے اجماعی اور متفق علیہ مسائل جن پر علمائے کرام نے محیر العقول تحقیقی اور تصنیفی لٹریچر تخلیق کیا ہے، مشرق و مغرب جس کی علمی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، ڈاکٹر منظور احمد ان کتابوں اور مقالات کو ان کی اصل زبان میں پڑھے بغیر یا صرف تراجم کی بنیاد پر علماء سے ان کے متفقہ ٹھوس، علمی نقطہ نظر کی مکمل تبدیلی یا کم از کم نظر ثانی کے خواستگار ہیں۔ یہ بات نہایت لائق افسوس ہوگی کہ ڈاکٹر صاحب کی وہ تحریریں جن میں علماء سے یہ مطالبہ کیا گیا ہو وہ علمی اور تحقیقی لحاظ سے ساقط الاعتبار ہوں۔

اصطلاحات کے ترجمے: وقتیں اور مشکلات:

تمام علوم اپنی اصطلاحات میں بند ہیں۔ کسی اجنبی زبان کی اصطلاحات کو معلوم کرنے کا مروج طریق یہی ہے کہ اپنی زبان میں اُس کا مرادف اور ہم معنی لفظ تلاش کیا جائے، لیکن یہ طریق فلسفیانہ موضوعات و اصطلاحات کے ضمن میں انتہائی نامعتبر ہے، کیوں کہ ہر اصطلاح [term] کا چاہے وہ اسلامی ہو یا مغربی اپنا ایک خاص سانچہ اور ڈھانچہ ہوتا ہے۔ اس کا اپنا ایک خاص تاریخی و تہذیبی، علمی و مذہبی اور نفسیاتی پس منظر ہوتا ہے جس کی علمیات [Epistemology] و وجودیات [Ontology] اور کونیات [Cosmology] و مابعد الطبیعیات [Metaphysics] سے وہ پھوٹی ہے۔ اصطلاحات محض ابلاغ کا ذریعہ نہیں بلکہ وہ ایک قوم کی تاریخ و فلسفے کا آئینہ ہوتی ہیں، جس میں اُس معاشرے اور عہد کی لطافتیں اور کشائفتیں مختلف جہات اور خصوصیات کے ساتھ موجود ہوتی ہیں، اسی لیے کسی بھی اصطلاح کے حقیقی مفہوم سے آشنائی، اُس کی مابعد الطبیعیات کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔<sup>۱</sup>

۱- اس سلسلے میں اگر نسبتی لسانیات [Ethnolinguistic] سے واقفیت اور دیگر زبانوں کے تصورات اصطلاحات اور الفاظ کے ترجموں کے ضمن میں Johann Leo Weisgerber کی کتاب *Vom Weltbild der deutschen Sprache: Die inhaltbezogene Grammatik* [Pädagogischer Verlag, 1953] اور Edward Sapir کے *Ethnolinguistic* سے متعلق خیالات و تاثرات کا مطالعہ کر لیا جائے تو مغربی فلسفے اور مخصوص اصطلاحات کے غلط سلسلہ ترجموں سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر فاوسٹ، گوٹے کی کتاب کا ترجمہ کرتے وقت یونانی لفظ Logos کا جرمن مترادف لفظ تلاش کرنے میں ناکام رہے، کیوں کہ لفظ کسی زبان کے بولنے والوں کے مخصوص ذہنی رویے اور زاویہ نظر کا عکاس ہوتا ہے۔ علم معنویات ان ہی داخلی رویوں کے تجزیاتی مطالعے کا نام ہے جو تصور اور لفظ کے مابین رشتے اور تعلق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معانی سے بحث کرتا ہے۔

مغربی اصطلاحات سے ناواقفیت: ہولناک نتائج:

یہ تو ایک دقیق بحث ہے عام فہم مثال پر غور کیجیے، Dead Labour مارکس ازم کی اصطلاح ہے جس کا ترجمہ ”مردہ مزدور“ نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کا مطلب ”سرمایہ“ ہے۔ جس طرح مغربی فکر و فلسفے سے واقفیت اُس کی تاریخ و تہذیب اور عصری تاریخ میں اُس کے مرتبے کے تعین کے بغیر ممکن نہیں، ورنہ ایک مسلمان خواہ وہ کتنا ہی صحیح العقیدہ اور راسخ العلم ہو وہ اُس اصطلاح کے اصل مفہوم سے ناواقفیت کے باعث اُس کی اسلام سازی [Islamization] کے درپے ہو جائے گا اور اُس اصطلاح کے پس پشت ہولناکی کو نظر انداز کر بیٹھے گا۔ مغربی اصطلاحات کی اسلام سازی کرنے والے جدیدیت پسند افراد سے عموماً ایک بنیادی غلطی یہ ہوتی ہے کہ وہ مغربی اور اسلامی اصطلاحات میں ظاہری یا جزوی، لفظی یا معنوی اشتراک کو دیکھتے ہوئے ایک کو دوسرے پر قیاس کر لیتے ہیں۔ اور دونوں پر ایک ہی حکم لگا دیتے ہیں، جیسے ”جمہوریت“ [Democracy] ایک خالص مغربی تصور ہے، اس میں اور اسلام کے تصور شوراہیت میں فی الاصل بعد المشرقین ہونے کے باوجود جزوی مشابہت بھی معلوم ہوتی ہے، اس ظاہری مشابہت سے متاثر ہو کر کوئی ناواقف جو جمہوریت کے مغربی تصورات، تاریخ اور مابعد الطبیعیات سے کچھ شناسائی نہ رکھتا ہو وہ جمہوریت کو عین منشائے اسلام قرار دے گا۔ جب کہ اصول قیاس جاننے والا ایک مبتدی بھی جانتا ہے کہ حکم و متعدی کرنے کے لیے مقیاس اور مقیاس علیہ میں کئی طرح کے اشتراک لازمی ہیں اور ساتھ ہی ان دونوں کی کامل معرفت بھی ضروری ہے، ورنہ یہ قیاس قیاس شرعی نہ ہوگا بلکہ منطق کی اصطلاح میں قیاس مع الفارق کہلائے گا۔ اسی بنیادی غلطی اور ناواقفیت کے باعث جدیدیت پسندوں کو اسلام کا ”تصورِ فلاح“ welfare ”افادیت پسندی“ utility کے مماثل نظر آتا ہے، ”اجماع“ کو وہ ”عوامی رائے public opinion کے مترادف سمجھتے ہیں اور مشاورت کے ذریعے

۱۔ اس سلسلے کی تفصیل کے لیے درج ذیل کتابوں کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے:

- [1] Donald D Evans, *The Logic of Self-involvement* (The Library of Philosophy and theology), London: SCM Press, 1963.
- [2] Benjamin Lee Whorf, *Language, Thought, and Reality*, [ed., John B. Carroll], USA: The MIT Press, 1956.
- [3] Roger W. Brown, *Language Thought & Culture*, [ed., Paul Henle], US: University of Michigan Press, 1958.
- [4] Hans-Georg Gadamer, *EPZ Truth and Method* (Continuum Impacts) New York: Continuum, 2004.

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۸



حکومت کو ”جمہوریت“ Democracy قرار دیتے ہیں۔ غرض دین و شریعت کے وہ تمام احکام و مسائل جو روحانیت و عرفانیت سے متعلق ہیں، یہ حضرات ان تمام مباحث و معاملات کی خالص مادی توجیح و توجیہ پیش کرتے ہیں۔ اور اپنی جزوی حیثیت میں اس اجتماعی کل کی پرورش اور پرداخت کرتے ہیں جو سرمایہ دارانہ طرز زندگی کا جز و لازم ہے۔

مغربی علوم کو اسلامیانے کی کوشش: ایک معصوم خواہش:

”علوم کو اسلامیانے“ [Islamization of knowledge] کی کوششوں کے دین سبکی کا باعث بننے کی اصل وجہ ان علوم پر اناڑیوں کی طرح دست اندازی تھی۔ انسان پرستی [Humanism]، عقلیت پرستی [Rationalism]، نشاۃ ثانیہ [Renaissance]، تنویر [Enlightenment]، انفرادیت پرستی [Individualism]، مساوات [Equality]، آزادی [Freedom] اور سرمایہ داری [Capitalism] وغیرہ اصطلاحات کے تراجم کے بجائے، ان کے مفہوم کو ان کی علمیات و مابعد الطبیعیات کے تحت سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اسلامی اصطلاحات کا بھی اپنا ایک علمیاتی اور مابعد الطبیعیاتی پس منظر ہے، ایک ایک اصطلاح کے دروں میں اقدار و روایات اور تہذیب و نفسیات کی دنیا آباد ہے۔ مثلاً سنت، اجماع، اجتہاد، مقاصد الشریعہ، عظمت صحابہ، معیار حقانیت، فتویٰ، تقلید، تلفیق، تکلیف، موضوع، علت، مجاز مرسل، عبارت القصد، دلالت القصد، اشارۃ القصد، اقتضاء القصد، استحسان، استصلاح، استصحاب وغیرہ اصطلاحات جن کی تشکیل و تعمیر و تخلیق خاص علمیاتی و مابعد الطبیعیاتی پس منظر میں ہوئی ہوں۔ ان کا ترجمہ دوسری زبان میں ممکن ہی نہیں، بلکہ اسے اُس کے مابعد الطبیعیاتی و کونیاتی پس منظر میں سمجھا جائے گا۔ اسلامی اصطلاحات کی تفہیم میں علم کے ساتھ ساتھ تقویٰ و تدبیر بھی بہت ضروری ہے۔

عربی زبان سے ناواقفیت اور ثانوی ماخذ سے استفادہ: ثمرات و نتائج:

عربی زبان سے عدم واقفیت اور علما اور فقہاء کی کتابوں تک بہ راہ راست عدم رسائی کے باعث اسلامی اصطلاحات کے حقیقی مفہوم سے آگہی اور تفہیم میں بعض اوقات بڑی سنگین نوعیت کی

۱- بات رفتہ رفتہ کہاں تک جا پہنچی ہے، ملاحظہ فرمائیے، نماز، ورزش، حج، بین الاقوامی میٹنگ اور آفاقی مسلم کاروباری سرگرمیاں، جنت کی طلب نفس کی تشنہ خواہشات کی تکمیل کا ایک ذریعہ اور محرومیوں کے ازالے کے امکانات کا سبز باغ۔ جہادی جذبہ و جہد معاشی عدم مساوات اور غربت کا شاخسانہ، لوگوں کا دین کی طرف رجوع تاریخی عمل، مسجد اور نماز معاشرتی جوڑ کا اہم ادارہ و طریقہ، وضو جملہ قلب سے دفاع کا وسیلہ، قربانی بہترین معاشی سرگرمی، جس سے کاروبار میں وسعت پیدا ہوتی ہے، مدارس دینیہ، این۔ جی۔ او جیسے ادارے جو غریب اور نادار بچوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاتے ہیں، نماز کے پانچ اوقات کی پابندی نظام انہضام میں بہتری کا سستا طریقہ، آب زم زم پیٹ، سینے اور جگر کے تمام امراض کا مجرب علاج بن کر تمام دینی سرگرمیاں مادی وحسی اور افادی دائرے میں آ جاتی ہیں اور دین مادی روحانیت کے ایک شاہکار کے طور پر ابھر کے سامنے آتا ہے، اور اس نظام کے چلتے رہنے کا ایندھن بن جاتا ہے۔

غلطیاں ہو جاتی ہیں، اور اس ناواقفیت کے باوجود دین و مذہب کے اساسی موضوعات پر قلم اٹھانے سے بڑے ہولناک مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ خود ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ فلسفے سے گہری واقفیت اور طویل وابستگی کے باوجود لفظ کو غیر اقداری [value neutral] سمجھتے ہیں۔ سنت کو [Pattern] اور دینی سیاق میں علم تفسیر کو [Hermeneutics] سے تعبیر کرنا اس کا ثبوت ہے۔ Hermeneutic کا ترجمہ ”علم تفسیر“ کرنا غیر عاقلانہ رویہ ہے۔ علم تفسیر ایک خاص مابعد الطبیعیات اور تاریخ و تہذیب سے برآمد ہونے والا علم ہے، جب کہ Hermeneutics فکری اعتبار سے لفظ کے روایتی مفہوم کی اس کے الہیاتی پہلو سے قطع نظر توسیع و تعمیم ہے۔ اس کے معنی و مفہوم کی تعین میں خاصا اختلاف ہے اور یہ لفظ بلکہ پورا مکتب فکری انتشار کا شکار ہے۔<sup>۱</sup>

ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالعموم خالص مذہبی عربی اصطلاحات کا انگریزی ترجمہ کر کے اس کا مفہوم متعین فرما لیتے ہیں، اور پھر اس پر اپنے خیالات و افکار کی عمارت تعمیر کر لیتے ہیں۔ حالانکہ استعمال کی گئی صرف اصطلاح اسلامی ہوتی ہے اور اس کا مفہوم منظور احمد کا خود متعین کردہ ہوتا ہے، جو بالعموم اسلام کی چودہ سو سالہ علمی و مابعد الطبیعی روایت کے منافی ہوتا ہے۔ اسلام۔ چند فکری مسائل میں ”اجتہاد“ اور ”مقاصد الشریعہ“ کے حوالے سے کی گئی گفتگو یہی ثابت کرتی ہے۔

علوم و افکار اسلامی کے جن عنوانات پر ڈاکٹر منظور احمد صاحب قلم اٹھاتے ہیں اس پر ان کا مطالعہ غیر مکمل اور سطحی محسوس ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر صاحب اسلام کو مغرب کی پیدا کردہ غلط فہمیوں اور شبہات کے تناظر میں دیکھتے ہیں اور اسلاف و قدما کی ”غلطیوں“ پر شرمندہ اور عرق انفعال میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کا عہد خلافت و حکومت انھیں تسلط نظر آتا ہے۔ کمان کا دعویٰ ہے کہ علما و فقہا فقہ کو عین شریعت سمجھتے ہیں اور ہر متناقض رائے کو کفر گردانے لگتے ہیں۔<sup>۲</sup> مستند و محقق علما و فقہا کی کتابوں سے سرسری واقفیت رکھنے والا بھی اس بات سے بہ خوبی واقف ہے کہ یہ دونوں اعتراضات یا تو نا فہمی پر مبنی ہیں یا بے خبری پر۔

ڈاکٹر منظور احمد: تضادات:

متعلقہ موضوعات پر عربی میں تصنیف شدہ کتابوں کے مطالعے سے محرومی، دین کے اساسی و قانونی اور مابعد الطبیعی حقائق و مسائل کو مغربی فکر و فلسفے کی روشنی میں پڑھنے اور ان سے حاصل ہونے والے نتائج کو ”نتیجہ خیز“ سمجھنے، اور عاجلانہ نتائج نے ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے مطبوعہ مضامین و مقالات میں عجیب قسم کا ابہام و تضاد پیدا کر دیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے وہ مسائل جن پر ڈاکٹر صاحب

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، لاہور، اکتوبر- دسمبر ۲۰۰۵ء، صفحہ ۸۲۔

۲- قاضی عبدالصمد الصارم، تاریخ التفسیر، کراچی: میر محمد کتب خانہ [س-ن]۔

۳- ڈاکٹر قاضی عبدالقادر، کشف اصطلاحات فلسفہ، کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳۴۲۔

۴- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۷۳۔

۵- ایضاً، صفحہ ۷۲۔

نے قلم اٹھایا ہے اس پر ان کا اپنا ذہن صاف اور واضح نہیں ہے اور وہ صورتِ مسئلہ کے درست فہم سے قاصر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی، بادی النظر میں، دل کش پیرائے میں لکھی گئی تحریریں بجائے تشکیک اور شبہات کم کرنے کے اسے اور بڑھادیتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں جدید مسائل کے حل کی فکری رہنمائی تو دور کی بات ہے، بعض اوقات خود دین و مذہب ہی واہمہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انتہائی نازک، حساس، علمی اور فکری مبحث میں بغیر تیاری کے ہاتھ ڈال دیا گیا ہے۔ تضادات کی فہرست تو طویل ہے، لیکن چند ایک مقامات بہ طور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

[۱] کہیں ڈاکٹر منظور احمد پورے انسان کو محض عقلیت [Rationality] میں محسوس و محصور فرمادیتے ہیں کہ مذہبی عقائد و حقائق، طبیعیات سے لے کر مابعد الطبیعیات تک ہر جگہ شے کے رد و قبول کی کسوٹی عقل ہے۔ اور کہیں ارشاد فرماتے ہیں:

”انسانی زندگی کا صرف روح یا صرف عقل، یا صرف مادے میں احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی روحی [احساسات، الم، مسرت، دکھ، ہم گزاری، درد احساسی یا دوسرے لفظوں میں دل کی دنیا] اور عقلی دونوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔“

[۲] ڈاکٹر منظور احمد کہیں مابعد الطبیعی حقائق کو ”اختباری تجربے“ سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اور کہیں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

مذہبی تجربہ از قبیل اختبار و احساس نہیں ہے۔

[۳] ایک جگہ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”مذہب کے بنیادی حقائق مثلاً خدا، آخرت، نبوت سائنس کے دائرہ کار سے باہر کی چیز ہے اور سائنس خود اپنی شہادت کے زور پر ان کے بارے میں حکم نہیں لگا سکتی۔“

سائنس کا دائرہ مذہب اور الہیات کے دائرہ کار سے مختلف ہے۔

جب سائنس اور مذہب دو الگ الگ منہاج ہیں اور مابعد الطبیعی حقائق اس کا موضوع نہیں

ہیں تو ڈاکٹر صاحب اہل اسلام کو یہ مشورہ کیوں دے رہے ہیں کہ:

”موجودہ زمانے میں بھی عقلیت یا سائنسی تحقیقات کی روشنی میں وحی کی مختلف تاویلات ہو سکتی ہیں۔“

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۲۷۔

۲- منظور احمد، ”چند تعلیمی مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحات ۱۷۰-۱۷۱۔

۳- ایضاً، صفحات ۲۰۴-۲۰۵۔

۴- منظور احمد، ”اقبال کا فلسفہ مذہب“، مشمولہ اقبال شناسی، صفحہ ۹۰۔

۵- منظور احمد، ”مذہب کی صداقت“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۲۱۔

۶- منظور احمد، ”اقبال کا فلسفہ مذہب“، مشمولہ اقبال شناسی، صفحہ ۸۹۔

[۴] احکام شرعیہ کی ابدیت و آفاقیت پر حضرت شاہ ولی اللہ کے موقف کے حوالے سے منظور احمد صاحب کے بیانات و اقتباسات انتہائی متضاد ہیں ایک مقام پر شاہ صاحب کے حوالے سے شراہ کی تبدیلی پر اصرار فرما رہے ہیں۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب اسلامی شریعت کے باب میں خاموش ہیں۔ ان تضادات کی اصل وجہ مذہب اور مابعد الطبیعیاتی حقائق کو فلسفے کی روشنی میں پڑھنا ہے۔

فلسفیانہ بیج: ڈاکٹر منظور احمد کا اصل مسئلہ:

فلسفے کی مجبوری یہ ہے کہ وہ ہر شے کو سوالات کی تلوار پر رکھ لیتا ہے، لیکن اُس کا مؤثر اور قطعی جواب فراہم نہیں کرتا۔ شک کا دروازہ کھول دیتا ہے مگر اُسے بند نہیں کرتا۔ فلسفہ کھلے ذہن کا شمر ہے، یعنی فلسفی ایک ایسا آدمی ہے جس کا منہ ہمیشہ کھلا رہے۔ سوالات کرنا اور اعتراض اٹھانا ہی اُس کا کام اور اُس کی پہچان ہے:

Philosophy questions everything and settles nothing, some reassurance may be found in the words of the late English journalist-critic G. K. Chesterton, who remarked, "Merely having an open mind is nothing. The object of opening the mind, as of opening the mouth, is to shut it on something solid."

ڈاکٹر منظور احمد صاحب خالص عقائدی اور دین و قانون کی اساس پر استوار مسائل کو عقلی مابعد الطبیعیات اور فلسفیانہ [یعنی شک کے] نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں، یہ بات اگرچہ وہ تصوف کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

”میرا علم ان مضامین [یعنی تصوف وغیرہ] کے بارے میں فلسفے کے حوالے سے ہے اور ان مسائل کو میں اسی نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں جس کو فلسفیانہ طریق کار کی روشنی میں صحیح سمجھتا ہوں۔“

درحقیقت ڈاکٹر منظور احمد دین کے ہر عقائدی، احکامی و قانونی مسئلے بلکہ نفس دین تک کو، اُس کے اپنے طریق تفہیم کی بجائے، فلسفیانہ جہت سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ وہ خود یہ لکھ چکے ہیں:

”روایت اور جدیدیت کے درمیان کوئی با معنی مکالمہ ممکن نہیں، اس کا امکان صرف ایک تیسرے نقطہ نظر سے ہو سکتا ہے جو ان دونوں مفاہیم کو ایک معروض کی حیثیت سے دیکھ سکے اور پھر دونوں کا کچھ نہ کچھ ادراک حاصل کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں ان دونوں کی تفہیم

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ ماہی المعارف، صفحہ ۷۱۔

۲- منظور احمد، ”حواشی“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحات ۶۷-۲۶۶۔

3- Stanley M. Honer, Thomas C. Hunt, Dennis L. Okholm, [eds.], Invitation to Philosophy: Issues and Options, Wadsworth Pub. Co., 1996, p. 25.

۴- منظور احمد، ”روایت، جدیدیت اور لسانیات“، مشمولہ ماہ نامہ صریح، جلد ۱۵، شمارہ ۶۵، نومبر ۲۰۰۳ء، صفحہ ۲۸۔

کے لیے ایک تیسری کلامی منطق کی ضرورت ہوگی۔ اس کا بھی امکان ہے کہ کوئی جدیدیت کے پیراڈائم سے روایت کے پیراڈائم میں منتقل ہو جائے یا روایت سے جدیدیت میں، اس طرح وہ پہلے پیراڈائم کو ماضی کی ایک غلطی سمجھ کر یاد رکھے۔ ان طریقوں کے علاوہ میری نظر میں کوئی اور طریقہ روایت اور جدیدیت کے مابین نزاع کی تفہیم کا ممکن نہیں ہے۔<sup>۱</sup>

جب ڈاکٹر منظور احمد صاحب کو خود اس بات کا اعتراف و ادراک ہے کہ روایت و جدیدیت کی اپنی اپنی کلامی منطق [جو اپنے طریق تفہیم اور نظام ہائے تصورات میں ایک دوسرے سے کلیہً متخالف و متغائر ہیں] سے بلند ہو کر ایک تیسری کلامی منطق کی دریافت کے بغیر دونوں نظاموں کے مابین نزاع کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ تو اس صورت میں جب کہ وہ علوم اسلامی پر سند یافتہ نہیں ہیں اور خود کو مغربی فلسفے کا پر داختہ اور مرہونِ کرم گردانتے ہیں۔<sup>۲</sup> وہ خود ہی غور فرمائیں کہ انھیں یہ استحقاق کیسے حاصل ہو گیا کہ روایت اور جدیدیت کے درمیان حکم اور ثالث بن کر فیصلے صادر کرنے لگیں؟ خصوصاً جب کہ وہ ”علم تفسیر“ کے نتیجہ خیز معیارات کو مغربی فکر سے مستعار قرار دیتے ہوں اور تصوف اور اس کی مابعد الطبیعیات جیسے روایتی مضامین کو فلسفیانہ طریق کار کی روشنی میں درست یا غلط سمجھنے کے عادی ہوں۔

دوسرے یہ کہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے فلسفیانہ افکار و خیالات کے مطالعے سے خلاق بصیرت اور تخلیقی ذہانت کا اظہار نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے سے موجود افکار و نظریات کے محض ناقل اور ترجمان نظر آتے ہیں۔ مزید ستم یہ کہ اس ماخوذ و مستعار فکر کی ترجمانی میں بھی وہ فکری صلاحیت اور ذہنی مہارت عنقا نظر آتی ہے، جو ہم جیسے طالب العلم ڈاکٹر صاحب کے مرتبے کا ناگزیر تقاضا سمجھتے ہیں۔ اگر دقت نظر سے ڈاکٹر صاحب کے فلسفیانہ تسامحات ہی کو جمع کیا جائے تو ایک بسیط مقالہ تیار ہو سکتا ہے۔<sup>۳</sup>

### منظور احمد: ہمت اور جرأت کا فقدان:

ان سب سے ہٹ کر ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی تحریروں کے مطالعے کے بعد جو تاثر نہایت شدت سے قائم ہوتا ہے وہ ہے: ہمت اور جرأت کا فقدان۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر منظور احمد صاحب اپنے مضامین میں ”مہلک جسمانی ضرر“ اور ”معاشرے میں انقطاع“ جیسے مسائل سے خوف کا اظہار فرماتے رہتے ہیں۔ اپنی بات کو دو ٹوک اور صریح الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے اسلام کو ”فقہی اسلام“ سے تعبیر فرما کر اس کی آڑ میں اسلام پر اعتراضات وارد کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اسلام کے جس حکم یا تعلیم کو اپنے مزعومہ افکار و نظریات سے متصادم پاتے ہیں اسے ”فقہی اسلام“ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ اس کا اسلام کی اصل تعلیم، روح اور کلیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ان افکار و بیانات کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ہم درد مستشرق ثالث بالخیر بن کر اسلامی اعتقادات، الہیات اور تعلیمات کا محاسبہ کر رہا

۱- منظور احمد، ”روایت، جدیدیت اور لسانیات“، مشمولہ ماہ نامہ صریح، صفحہ ۱۲۔

۲- منظور احمد، ”چند تعلیمی مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۸۳۔

۳- زیر نظر مقالے میں ان کے چند ایک فلسفیانہ تسامحات سے بحث کی جائے گی۔

ہے۔ جہاں جہاں وہ اسلامی احکام کو مغربی نظریات سے مختلف یا متصادم جانتا ہے وہ یہ کہہ کر اسلام کی حمایت کرتا ہے کہ اصل دین سے اس ”فقہی اسلام“ کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو فقہاء کا ترتیب دیا ہوا اسلام ہے۔ اس زمانے میں جب یہ تدوین و ترتیب دیے گئے تھے ان کی ایک گونہ افادیت تھی، لیکن اب یہ ازکار رفتہ ہیں۔ حالاں کہ اگر واقعہ ڈاکٹر صاحب اسلامی مآخذ و منابع کو اکیسویں صدی کے لیے ازکار رفتہ شے سمجھتے ہیں تو پھر انھیں نہ ”مہلک جسمانی ضرر“ [gravious bodily harm] لگی پرواہ کرنی چاہیے اور نہ معاشرے میں انقطاع یا کسی دوسرے ضرر رساں نتیجے کی۔ اگر سعید بن جبیر اور امام احمد بن حنبل کے آثار و نشانات اور حق گوئی و بے باکی قابل تقلید نہیں تو کم از کم سقراط [Socrates: 399-469 BC] کی مثال کو سامنے رکھا جائے جس نے زہر کا پیالہ پی کر خود کو دانش مندی اور شجاعت کی علامت بنا دیا۔

اپنے افکار کی آبیاری کے لیے دوسروں کے نام کا سہارا: منظور احمد:

ڈاکٹر منظور احمد اپنے خیالات و تاثرات خود اپنے نام سے پیش کرنے کے بجائے کبھی سیدنا عمر فاروق کے نام کا سہارا لیتے ہیں تو کبھی شاہ ولی اللہ کا۔ کبھی نیاز فتح پوری کی آڑ لیتے ہیں تو کبھی اقبال کا نام استعمال کرتے ہیں۔ اقبال کے افکار پر مشتمل اپنی کتاب کے دیباچے میں ڈاکٹر منظور احمد لکھتے ہیں:

”ہمارا قومی مزاج شخصیتوں کے حوالوں کو معتبر مانتا ہے، اور اس مضمون میں جس نئی جہت کی طرف میں متوجہ کرنا چاہتا ہوں اس کے لیے اقبال کا حوالہ شاید مفید ہو اور میری بات کے گوش شنوا تک پہنچنے میں کسی حد تک مدد و معاون“۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ راقم، عصر حاضر کے ان مسائل کے حوالے سے ذہنی یک سوئی کا طالب تھا۔ امید تھی کہ محترم ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی تحریریں اس خلجان کو رفع کرنے میں معاون ہوں گی، لیکن اس کے برعکس ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی تحریریں تشکیک میں اضافے کا باعث ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب کی کسی تحریر سے معاصر دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو درپیش مسائل میں سے کسی ایک مسئلے کا بھی، اسلام اور مآخذ اسلام کے ساتھ غیر مشروط وابستگی کے ساتھ، حل نہ مل سکا۔ اسی الجھن اور اضطراب میں راقم نے اپنا علمی سفر جاری رکھا۔ راقم نے طویل غور و فکر، صاحبان علم و نظر سے مسلسل مذاکرے اور مستقل مطالعے اور جستجو کے بعد ابتداً ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے مقالے ”خطبہ نیاز“ پر تبصرے و تجزیے کے ضمن میں ایک مضمون ترتیب دینے کا ارادہ کیا، اسی دوران ڈاکٹر صاحب کی متذکرہ دونوں کتابوں اور چند دیگر مضامین کا بھی مطالعہ کیا اور ان کے نوٹس لیے۔ جب لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو بحث مقالے کی حدود سے تجاوز کر کے ”اسلام اور جدیدیت کی کش مکش“ کے عنوان سے چھ ابواب پر مشتمل ایک مستقل کتاب کی صورت اختیار کر گیا۔ طوالت کا خوف اگرچہ اپنی جگہ

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۶۴۔

۲- منظور احمد، ”پاکستان“، مشمولہ پندرہ روزہ معارف، فیچر، کراچی، یکم اگست ۲۰۰۸ء، صفحہ ۷۔

۳- منظور احمد، ”پیش لفظ“، مشمولہ اقبال شناسی، صفحہ ۷۔

ڈراتا رہا۔ لیکن اس امر کی بہر حال خوشی ہے کہ توفیق ایزدی نے اس ایک ہی مجموعے میں انتہائی متنوع عنوانات پر اپنے مطالعے کا حاصل پیش کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی۔ **فلہ الحمد ولہ الشکر۔**  
 ان سب امور سے قطع نظر ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا بہر حال ”اسلام اور جدیدیت کی کش مکش“ یا ”روشن خیالی اور قدامت پرستی“ کی نبرد آزمائی میں اتنا حصہ ضرور ہے کہ ان کی فکر و تحریر نے اس بحث پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے، اس کا جائزہ لینے اور اس پر اپنے نقطہ نظر کے اظہار خیال کا موقع فراہم کیا ہے، جس سے اس بحث کو جاری رکھنے اور غور و فکر کے نئے زاویوں کو دریافت کرنے میں شاید معاونت ہو سکے۔ بحث و گفتگو کے اس سلسلے کا اجرا خود ڈاکٹر صاحب کی نظر میں بھی بہت اہم ہے۔ وہ اپنی ایک تالیف کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اگر میری اس کوشش سے بحث کا سلسلہ کسی حد تک بھی چل نکلا تو میری محنت رائیگاں نہیں ٹھہرے گی۔“

راقم الحروف کو ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی نیت، اخلاص اور ان کے نتائج فکر کے دیانت دارانہ ہونے میں ادنیٰ شبہ بھی نہیں ہے۔ تاہم یہ ایک بالکل دوسری بات ہے کہ مسلسل تحقیق و جستجو اور غور و فکر کے بعد ڈاکٹر صاحب کے فکری نتائج سے کلیۃً اختلاف کیا جائے اور اسے اسلامی فکر کی مسلسل روایت کے منافی قرار دیا جائے۔ بہر حال، ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی فکر پر راقم نے اپنا موقف اور نقطہ نظر تحریر کر دیا ہے۔ یہ پوری کتاب اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دہی کے احساس کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ پوری کوشش کی گئی ہے کہ کوئی بات بلا حوالہ اور خلاف دیانت نہ ہو۔ راقم کو اس موضوع پر اپنے نقطہ نظر کی صحت پر شدت سے اصرار ہے، تاہم اگر ڈاکٹر صاحب خود یا ان کا کوئی فکری ہم نوا یا کوئی اور صاحب علم اس پر اپنی تنقیدی آرا دیں گے اور راقم کے نقطہ نظر کی غلطی یا سقم کو مسلمہ علمی معیار پر واضح فرمادیں گے تو راقم کو اپنے نقطہ نظر سے رجوع میں ہرگز تردد نہ ہوگا، شکر ہے کہ ساتھ علمی رہنمائی اور فکری معاونت کا خیر مقدم کیا

۱- ہو سکتا ہے بعض دوست اس کتاب کی ضخامت کے پیش نظر استہزایہ بھی فرمادیں کہ نادان مؤلف نے اس کتاب کے ذریعے ”توپ سے چڑیا مارنے“ یا ”تلوار سے سبزی کاٹنے“ جیسی حماقت اور سفاقت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ناچیز مؤلف اس کے جواب میں فقط اتنی بات کہنے پر اکتفا کرے گا کہ اس کتاب کو ڈاکٹر منظور احمد کے انفرادی افکار و خیالات پر بحث و نظر سے متعلق سمجھ کر نہ پڑھا جائے، بلکہ اسے پورے متحدہ دانہ فکر و نظر کے اشکالات، شبہات اور اعتراضات کا شاخسانہ جان کر پڑھا جائے۔ جس کا خلاصہ محترم ڈاکٹر منظور احمد سے بہتر کوئی اور مفکر پیش نہ کر سکتا تھا۔

۲- منظور احمد، ”پیش لفظ“، مشمولہ اقبال شناسی، صفحہ ۸۔

۳- اس مخلصانہ ایمانی جذبے کا اظہار، بعض واقعی اختلافات سے قطع نظر، ڈاکٹر منظور احمد کی ریڈیائی تقاریر پر مشتمل مجموعے میں جا بجا ہوا ہے۔ بہ طور نمونہ صرف ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔ ڈاکٹر منظور احمد انسانی زندگی میں ثابت قدمی پیدا کرنے کے دو طریقے، قرآن مجید اور اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے دوسرے طریقے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ثابت قدمی پیدا کرنے کا دوسرا طریقہ ”ثابت قدم“ کی عملی مثال سامنے رکھنے کا ہے۔ یہ ہمارے سامنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں موجود ہے۔ اس ذات سے محبت اور اس کی مثال کو ہر وقت سامنے رکھنا، زندگی میں ثابت قدمی پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔“

منظور احمد، ”ثابت قدمی“ مشمولہ اسلام اور زندگی، کراچی: ہمدرد فاؤنڈیشن، ۲۰۰۴ء، صفحہ ۶۹۔

جائے گا کہ یہی علم کا تقاضا ہے اور اسلاف کی سنت۔ اگر راقم کی تحریر میں کہیں کوئی جملہ یا فقرہ ایسا نظر آئے جو ڈاکٹر صاحب کے مناسب حال نہ ہو تو وہ نادانستہ ہوگا، راقم اس پر غیر مشروط اور پیشگی معذرت خواہ ہے۔ نشان دہی پر، ان شاء اللہ، اسے بلا پس و پیش قلم زد کر دیا جائے گا۔

انتہائی ناسپاسی ہوگی اگر اس کتاب کی اشاعت کے وقت ان احباب کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جن کا ساتھ اس سفر میں ہم سفر رہا۔ راقم نہایت ممنون احسان ہے جناب شکیل عثمانی صاحب کا۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے مقالے ”نیاز، روشن خیالی اجتہاد اور اسلام“ پر تنقیدی تبصرے کی ابتدائی تحریک اور نیاز فتح پوری کے حوالے سے بعض اہم لوازم کی فراہمی سے لے کر مستقل بنیادوں پر کتاب کے ہر مرحلے سے دل چسپی اور اس کی مسلسل خبر گیری ہی نے راقم کو اس عجلے کی ترتیب و تکمیل کے لیے منزل کی جانب مستعدی سے رواں دواں رکھا۔ خدا تعالیٰ انھیں تادیر سلامت باکرامت رکھے۔ وہ اپنے خرد پر اسی طرح شفقت فرماتے رہیں۔ راقم کے لیے ان کی تجاویز، مشورے، ہدایات اور احکام ہمیشہ قلبی سکون اور ذہنی فرحت کا ذریعہ رہے۔ دوسری باغ و بہار شخصیت جناب ملک نواز احمد اعوان کی ہے ان کے مشورے اور ہدایات پوری نیک نیتی سے شامل رہے۔ دورانِ تالیف جناب سید خالد جمعی صاحب کے ساتھ مشاورت بھی رہی، بلکہ بعض مقامات پر جمعی صاحب کے مجوزہ مشوروں اور اضافوں کو، بہ استثنائے چند، تشکر کے احساس کے ساتھ قبول کر لیا گیا۔ کتاب کے بعض اہم مقامات ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب کے ملاحظے سے گزر جانے اور ان کی توثیق نے اس بحث کو پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ پیش کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔ اس علمی معاونت پر راقم ان دونوں حضرات کا شکر گزار ہے۔ محترم دوست سلیمان عامر کی ہمہ دم رفاقت نے راقم کو ہمیشہ راحت بخشی ہے۔ وہ راقم کی سابقہ تالیفات و تصنیفات کی طرح اس کتاب کے ابتدائی و ارتقائی مرحلے سے لے کر تکمیل تک حروف چینی کا جاں نسل کام پوری تندہی اور مستعدی سے راقم کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ انھوں نے راقم کے ہم راہ اس کتاب کے پروف اتنی بار پڑھے ہیں کہ گویا اب وہ اس کتاب کے ”حافظ“ ہیں۔

سب سے آخر میں راقم جناب یاسر بادامی صاحب کا بہت ممنون ہے، انھوں نے بہ ظاہر تو اس کتاب کی کمپوزنگ اور کمپیوٹر پر غلطیاں لگانے کا کام کیا ہے، لیکن راقم کے نزدیک ان کا حصہ شاید اس کتاب کی تیاری و تکمیل میں سب سے زیادہ ہے۔ وہ جس طرح رضا کارانہ طور پر اس کتاب کی تکمیل کے لیے ہمہ وقت موجود رہے اور جس باریک بینی سے حروف چینی انجام دیتے رہے راقم کے پاس الفاظ نہیں کہ ان کا شکریہ ادا کر سکے۔ اللہ تعالیٰ انھیں بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

ظفر اقبال



## منہاج علم اور ماخذ استدلال

مابعد الطبیعیات: علمیات اور اخلاقیات کی درجے بندی کی واحد اساس:

کسی بھی تہذیب کا تصور علم اُس کے اہداف و مقاصد کے اظہار کا بلند ترین ذریعہ ہوتا ہے، جس کی اساس پر اُس تہذیب کے علمی، نظری اور فکری مقاصد متعین ہوتے ہیں۔ یہ تصور ہر تہذیب کی مابعد الطبیعی ایمانیات کا رہن ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر کسی بھی تصور علم کی تشکیل اُس کی مابعد الطبیعیات کے بعد ہی ممکن ہے جس کی ماہیت [nature] اور درجہ بندی [Hierarchy] کا تعین عالم [knower] اور معلوم [known] کے درمیانی تعلق کی مقصدیت [purposiveness] پر ہے۔ یعنی مقصدیت ہی علمیات [Epistemology] کی نوعیت اور درجہ بندی کرتی ہے، جس کی تبدیلی سے تصور علم تبدیل ہو جاتا ہے۔

وحی کی مرکزیت:

جدیدیت پسند، وحی [Revelation] اور اُس کی اساس پر تشکیل و ترتیب پانے والی علمیات اور تاریخ کو اپنے ساختہ تجربی منہاج پر یقین و اذعان کے باعث پورے طور پر قبول بھی نہیں کرتے

۱- یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ فلسفے میں تحریک تنویر [enlightenment movement] کے بعد اس بات کا عمومی رجحان پایا جاتا ہے کہ علمیات سوالات، مابعد الطبیعیات سے اخذ کردہ نہیں ہوتے، بلکہ علمیات سوالات کی بنیاد پر مابعد الطبیعی تصورات کی حدود کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس عمومی رجحان کے باوجود ہم اسی ترتیب کو زیادہ با معنی سمجھتے ہیں جن میں علمیات سوالات، مابعد الطبیعی حقائق سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ مغربی فکر میں ہزرل [Edmund Husserl, 1859-1938] اور ہائیڈگر [Martin Heidegger, 1889-1976] کے افکار کا مطالعہ واضح کر دیتا ہے کہ ابتدائی تنویری مفکرین کا یہ خیال کہ مابعد الطبیعی سوالات ٹھوس علمی بنیادوں پر استوار نہیں ہوتے، ایک فکری گمراہی سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ خصوصاً ہائیڈگر کا خیال ہے کہ ڈیکارٹ کا تصور علمیات ایک مخصوص ontological presumption پر منحصر ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

Edmund Husserl, *Cartesian Meditations: An Introduction to Phenomenology*, [tr., Dorion Cairns], Netherlands: Kluwer Academic Publishers, 1999.

Martin Heidegger, *Being and Time*, Oxford: Blackwell, 1962.

Werner Brock, *Existence and Being*, Chicago: H. Regnery & Co., 1949.

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۷۱

اور زمان و مکاں کی حد بندیوں، خوف، مجبوری یا تاریخی جبر کی وجہ سے رد بھی نہیں کر پاتے، چنانچہ دینی افکار و اقدار پر مطالعے اور تحقیق کی ابتدا ہی اُن دعاوی کی نفی سے ہوتی ہے جن کی بنیاد پر ادیان جیسے عظیم مظہر کی عمارت تیار ہوئی ہے۔ اس ظاہر اثبات اور باطناً نفی سے پیدا ہونے والے خلجان کو رفع کرنے کے لیے ایسے متضاد اور متنوع مناہج وضع کیے جاتے ہیں کہ اُن پر یقین معجزات و وحی اور کشف و کرامات کے ورائے انسانی تصور پر یقین کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔

اسلامی منہاج میں وحی [Revelation] کو ایسی مرکزی و جوہری حیثیت حاصل ہے کہ اُس کی ابدیت و حکمیت اور حتمیت کا اثبات و اقرار کیے بغیر مطالعے کا آغاز ممکن نہیں۔ وحی کی اس مرکزیت کے تسلیم کر لینے کے بعد طریق مطالعہ اور منہاج علم کے بنیادی اصول اُسی کی روشنی میں متعین ہو جاتے ہیں، اب مطالعے کی دو ہی صورتیں ہیں:

[۱] دین کے اپنے منہاج علم اور طریق تفہیم کی روشنی میں مکمل اثبات و انقیاد کے بعد بحث کا آغاز ہوگا۔  
[۲] یا کُلّیۃً رد کر کے۔

یہ ممکن نہیں کہ دینی علمیات کے ایک جُز یا چند اجزا کو دیگر افکار و خیالات کے منہاج علم کے بعض اجزا سے خلط ملط کر کے ایک ”نئی الہیات“ وضع کر لی جائے۔ کیوں کہ اس تصور و تقدیر پر دین و مذہب کے جواز و اثبات یا عدم جواز و استرداد کی عمارت کھڑی ہے۔

ڈاکٹر منظور احمد کا منہاج علم: مبہم اور گجگ:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے منہاج علم اور ماخذ استدلال کا معاملہ بڑا مبہم [obscure] اور گجگ ہے۔ اُن کے افکار کے اظہار کا پیرایہ بہت ثر و لیدہ [confused]، متضاد و موقوف اور عاجلانہ نتائج پر مشتمل ہے۔ اُن کی تحریروں کے مطالعے سے واضح نہیں ہوتا کہ وہ کس حیثیت سے کلام کر رہے ہیں؟ بعض مقامات پر ان کی تحریریں، باوجود اختلاف کے، امت مسلمہ کے تہذیبی اور دینی زوال کے حوالے سے فکر مندانہ رویے کا مظہر ہوتی ہیں، اور کہیں ڈاکٹر صاحب اسلام اور مغرب میں ہم آہنگی تلاش کرنے کی جستجو اور اسلام کو عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے جوش اور جذبے میں اتنا آگے نکل جاتے ہیں کہ دین و مذہب تو کجا فلسفہ اور سائنس بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ ایک شخص کو مسلمانی کے دعوے کے بعد حتمی مقتدرہ [final authority] قرآن و سنت کو تسلیم کرنا ہوگا۔ چاہے وہ خود کو کتنا ہی آزاد رو [heterodox] باور کرائے اور قرآن و سنت کی تشریح و تفسیر کا وہی مفہوم و منطوق معتبر و مستند ہوگا، جس پر امت مسلمہ کا تسلسل تعامل چلا آ رہا ہو۔

منظور احمد: اسلامی منہاج علم پر تنقید کی حقیقت: بنیادی سوالات:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب، اسلامی منہاج علم کو عہد جدید کے لیے ناقص سمجھتے ہیں، وہ مسلمانوں کی فکر میں جمود و تعطل اور ترقی [progress] میں انقطاع کا اصل سبب مسلمانوں کا اپنے روایتی علمی منہاج پر ڈٹے اور اوراڑے رہنے کو قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”[مسلمان] جب تک اپنے علمی پیراڈا ایم پر نظر ثانی نہیں کریں گے، اُن کی فکر منجمد رہے گی اور وہ دنیا کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے قابل نہیں رہیں گے۔“<sup>۱</sup>

ڈاکٹر صاحب نے نہایت سادگی سے مسلمانوں کو اپنے علمی منہاج پر نظر ثانی کا مشورہ دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا علمی منہاج تاریخی اور ارتقائی عمل کے نتیجے میں تشکیل و ترتیب پاتا ہے یا پہلے سے متعین شدہ ہوتا ہے؟ علمی منہاج کا ماخذ نقل ہے یا عقل؟ یا نقل و عقل کا امتزاج؟ علمی منہاج کسی خاص طبقے نے متعین کیا ہے یا یہ امت کی عمومی رائے یا ارادہ عامہ سے طے پایا ہے؟ جب تک ان بنیادی سوالات کے جوابات نہ دیئے جائیں اس وقت تک علمی منہاج پر نظر ثانی کی تجویز اور رائے بے معنی ہے۔

اسلام اور عہد جدید: دو متضاد منہاج علم اور مقصدیت کے داعی:

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ مقصدیت [purposiveness] کا تعین ترجیحات اور فیصلوں پر بہ راہ راست اثر انداز ہوتا ہے، جس سے علمیات کی ترتیب [ordering] اور درجہ بندی [hierarchy] وضع ہوتی ہے۔ اب جو ذریعہ اس مقصدیت کے حصول میں جس درجے ممد و معاون ہوگا علوم کی درجہ بندی کی فہرست میں اُس کی اہمیت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ مثلاً ایک مسلمان سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے، جس کی صلاح و فلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء و مرسلین علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کی صورت میں ایک نظام ہدایت جاری فرمایا۔ انبیاء اور کتاب دونوں نے بتلادیا کہ انسان کی حقیقی کامیابی و کامرانی رب کی رضا اور خوشنودی میں ہے اور دنیا اُس کے لیے آزمائش کا گھر اور امتحان کی آماجگاہ ہے۔ چنانچہ ایک مسلمان کی مقصدیت بندگی رب، اطاعت انبیاء، اُس کے نتیجے میں دارالآخرتہ میں خوشنودی الہی اور اُس کی بارگاہ میں سُرخ روئی ہے۔<sup>۱</sup>۔ سے یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کے تصور انسان میں:

[۱] عبدیت بنیادی مقصد مہ ہے۔

[۲] خوشنودی رب مقصود اصلی ہے۔

[۳] محبت شخصیت کی تشکیل و تکمیل کا بنیادی جوہر ہے۔

[۴] اخلاقیات — تقویٰ، صبر اور احسان سے عبارت ہیں۔

[۵] فرائض کو اولیت اور حقوق پر فوقیت حاصل ہے، حقوق کا درجہ ثانوی ہے۔

اس کے برعکس جدیدیت پسند جس مقصدیت کی بنیاد پر علوم کی ترتیب اور ترجیحات کا تعین فرماتے ہیں، اُس کا سوتا مغرب کی تحریک تنویر سے اٹھنے والے فکری تناظر سے پھوٹا ہے۔ مغربی فکر و فلسفے پر نظر رکھنے والے ماہرین، خواہ مستشرقین ہوں یا مستغربین، نے اس مقصدیت کی درج ذیل بنیادیں متعین کی ہیں:

[۱] کائنات ”بشر مرکز“ ہے۔ [Anthropocentricity]

[۲] آزادی معیار اور فضیلت اصلی ہے۔ [Freedom is Ideal]

۱۔ منظور احمد، ”پیش لفظ“، مشمولہ اقبال شناسی، صفحہ ۸۔

[۳] مساوات بنیادی قدر ہے۔ [Equality is Value]  
 [۴] عقلیت معیارِ کل اور ہر شے کے رد و قبول پر حکم ہے۔ [Reason is the Criterion]  
 [۵] ترقی حصولِ آزادی کا واحد راستہ ہے۔ [Progress to achieve Freedom]  
 اس مقصدیت کے تحت پیدا ہونے والا انسان چار چیزوں کا حریص ہوگا، آمدنی [Income]، قوت [Power]، حاکمیت [Authority] اور دولت [Wealth]، جب یہ چار ”عناصر خیر“ کسی فرد کو حاصل ہوتے ہیں تو اس کے نتیجے میں اُسے پانچواں خیر تکریم ذاتی [self respect] خود بہ خود حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان جو کچھ کرنا چاہے وہ اس کی ذاتی پسند و ناپسند پر منحصر ہے، چاہے تو وہ نمازی بن جائے اور چاہے تو زانی۔ انسان کے معاشرتی مرتبے کا تعین اس کے عقیدے کے رسوخ اور اعمالِ صالحہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ ان Primary Goods کی بنیاد پر ہوگا۔  
 معاشرتی اعتبار سے نمازی اور زانی برابر ہیں۔ نمازی کے طرزِ زندگی کو زانی کے طرزِ زندگی سے فائق اور بہتر ماننا درست اور غیر عاقلانہ رویہ ہے۔ جو شخص ان مذکورہ چار عناصر سے محروم ہو اس کی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ مغربی تہذیب اور اس کی مقصدیت یا ما بعد الطبیعیات سے پھوٹنے والے اس تصور میں ”علم“ سے مراد لذت [pleasure] اور خواہشات [desires] میں اضافے دراضانے کے ذریعے دنیا کو جنت بنانے کے آثار و مظاہر شامل ہیں۔ یہی علمیت سرمایہ دارانہ علمیت [Capitalist Epistemology] کہلاتی ہے کہ ہر ایسی بات کو جاننا جس سے نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات کی تکمیل ہو سکے۔ خواہشات و جذبات کی تکمیل کسی پابندی اور حد کو قبول نہیں کرتی۔ خواہشات اور جذبات کی تکمیل کی ہر راہ ڈھونڈنا اور کائنات کو ارادۂ انسانی کے تابع کرنے کے طریقے معلوم کرنا ہی اس مقصدیت میں علم ہے، جو عقل پرستی یعنی ”انسان مرکزی“ سے شروع ہو کر حیات پرستی یعنی ”حیوان مرکزی“ پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ”علم“ جس مقصدیت کا مرہونِ کرم ہے وہاں بندگی رب، اطاعتِ وحی اور رضائے الہی لا یعنی و بے معنی باتیں ہیں۔ University of Michigan کے Skolimowski اس نئی فکر کو ایمانیات [Eschatology] سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

The elevation of the myth of power to its present and dangerous position [in the Western

۱- اردو میں ان نکات کے تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے:

عبدالوہاب سوری، ”مغربی تہذیب کے اصول و مبادی“، مشمولہ سرمایہ دارانہ نظام: ایک تنقیدی جائزہ، [مرتب: محمد احمد حافظ]، کراچی: الغزالی پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، صفحات ۴۳-۵۷۔

۲- تفصیل کے لیے دیکھیے:

John Rawls, "Social Unity and Primary Goods" in *Beyond Utilitarianism*, [eds., Amarty Sen and Bernard Williams], Cambridge: Cambridge University Press. ; John Rawls, *The Theory of Justice*, New York: Oxford University Press, 1971.

civilization] has happened because Western peoples have given up one form of salvation and have embarked [ in the post-Renaissance times] on another form. The idea of salvation was removed from heaven and placed squarely on earth. In time this salvation came to signify gratification in earthly terms alone. This meant using the earth, mastering the earth, subjugating the earth. The enjoyment of the fruit of the earth was only a part of the scheme; the other part was the enjoyment of power over the earth, over nature, over things. ۱

دنیا کی معلومہ تہذیبیں اور مغربی تہذیب: بنیادی اور جوہری فرق:

اسلامی علمیات میں مقصد سے قریب ہونا ترقی ہے اور دور ہونا تنزل۔ آخر کیا وجہ ہے کہ دنیا کی معلومہ سترہ یا اکیس روایتی، الہامی، اساطیری اور دینی تہذیبوں کے عالی دماغ لوگ وہ نظریات وضع نہ کر سکے جو جدید سائنس کے ظہور کا سبب بن سکتے، اس لیے کہ وہ تہذیبیں کسی نہ کسی صورت میں حقیقت مطلق اور آخرت کا کوئی نہ کوئی تصور اپنے یہاں رکھتی تھیں، لہذا ان تہذیبوں کے ذہن لوگ اپنی مابعد الطبیعی اساسیات کے زیر اثر وہ نظریات تخلیق ہی نہیں کر سکے جس قسم کے سائنسی نظریات مغرب نے سترہویں صدی میں، معاشرے کے مرکزی دھارے سے خدا اور عقیدہ آخرت کے انخلا کے بعد، پیش کیے۔ اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عصر حاضر میں تغیر اور تبدیلی کا سبب سائنسی ایجادات نہیں بلکہ فی الاصل وہ سائنسی نظریات ہیں جو سترہویں صدی میں ایک نئی مابعد الطبیعیات کے زیر اثر تاریخ انسانی میں جدیدیت اور روشن خیالی کے نام سے پہلی مرتبہ پیش کیے گئے، Alexandre Koyré کے مطابق:

What the founders of modern science..... had to destroy one world and to replace it by another. They had to reshape the framework of our intellect itself, to restate and to reform its concepts, to evolve a new approach to Being, a new concept of knowledge, a new concept of science. ۲

اصول کی سطح پر آدمی ایک ہی سے متعلق ہو سکتا ہے، خدا سے یا دنیا سے، اس ”یا“ کو قیامت تک ”اور“ نہیں بنایا جاسکتا۔ پھر حیات اپنے مظاہر اور نسبتوں کے ساتھ ان قواعد و شرائط کی پابندی و پاسداری کرے گی جس کے بغیر حصول مقصد کی تعیین و ترجیح کی ہر کوشش بے کار ہے۔ جدیدیت پسندوں

- 1- Henryk Skolimowski, *Living Philosophy: co-Philosophy as a Tree of Life*, Arkana, 1992, p. 140.
- 2- Alexander koyré, *Metaphysics and Measurment: Essays in Scientific Revolution*, London: Chapman and Hall, 1968, p.21.

کی بنیادی غلطی یا نادانی یہ ہے کہ وہ دو الگ الگ مقصدیت کو یک جا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ایک طرف وہ اسلامی منہاج علم کو نظر انداز کر کے کتاب و سنت کو اس کی مطلوبہ اہمیت و حتمیت دینے کو تیار نہ ہونے کے باوجود اسے اپنے دائرہ علم سے خارج بھی نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف وہ مغربی فکر و تہذیب اور موجودہ سائنسی ترقی کو انسانی تاریخ کے ارتقا کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا موجودہ علم ایک ایسا تاریخی عمل [historical progression] ہے جو تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانی تہذیبوں میں تحلیل ہوتے ہوئے اپنی موجودہ منطقی حالت تک پہنچا ہے۔

امت مسلمہ کی زبوں حالی، منبر و محراب کی تلقین اور جدید مسائل:

ڈاکٹر منظور احمد مسلمانوں کی زبوں حالی اور زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مسلمانوں کی حالت زار کی جو وجہ عام طور پر محراب و منبر سے سنائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسلام پر عمل چھوڑ دیا ہے، اس لیے وہ زبوں و خوار ہیں۔ لیکن اسلام پر عمل کرنے کے جو طریقے بتلائے جاتے ہیں ان میں زمانہ جدید کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے کوئی رہنمائی نہیں ملتی، بعض اوقات تو ایسا لگتا ہے مذہب پر عمل کرنے والوں کا جو تناسب مسلمانوں میں ہے وہ شاید کسی دوسرے مذہب میں نہیں“۔

زبوں حالی سے کیا مراد ہے؟ کیا زبوں حالی کا صرف ایک ہی مطلب ہے جو ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں پہلے سے متعین ہے؟ یا زبوں حالی کی کئی اقسام ہیں؟ زبوں حالی کا تعین اس وقت ہی ممکن ہے جب اس کے مقابل وہ نقشہ موجود ہو جس کو سامنے رکھ کر یہ بتایا جاسکے کہ اس حالت کو زبوں حالی نہیں کہا جاتا، وہ نقشہ کہاں ہے؟ کیا ہے؟ اور اس کی کیفیت کیا ہے؟ مثلاً اسلامی علمیات میں خیر القرون، خلافت علی منہاج النبوة، ملوکیت اور سلطان عادل کی اصطلاحات ملتی ہیں، یہ سلسلہ خلافت راشدہ، دور بنو امیہ سے لے کر خلافت عثمانیہ کے اختتام تک جاری و ساری رہا۔ ڈاکٹر صاحب یہ بتائیں کہ ۱۵۰۰ سال میں مسلمان کب کب زبوں حالی کا شکار رہے اور کب کب زبوں حالی ان سے دور رہی؟ تاکہ ہمارے سامنے زبوں حالی اور عدم زبوں حالی کی حقیقی تصویر موجود رہے اور ہم اس کو سامنے رکھ کر زبوں حالی کی موجودہ صورت حال سے اوپر اٹھ سکیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اس بات کی وضاحت بھی نہیں فرمائی کہ زمانہ جدید سے ان کی کیا مراد ہے؟ زمانہ جدید کا فلسفہ؟ زمانہ جدید کی مابعد الطبیعیات؟ زمانہ جدید کی مادی ترقی؟ اس کی سائنس اور ٹیکنالوجی؟ اگر اس سے مراد زمانہ جدید کا فلسفہ ہے تو فلسفے کا کون سا مکتب فکر؟ ڈاکٹر صاحب یہ بتائیں کہ زمانہ جدید کے وہ کون کون سے مسائل ہیں جن سے نبرد آزما ہونے میں اسلامی فکر رہنمائی نہیں کر سکی؟ یا یہ کہ اسلام نے دین پر عمل کرنے اور حالات کا سامنا کرنے کے جو طریقے بتائے ہیں ان میں کون کون سے آپ کے خیال میں ماضی میں تو موثر تھے لیکن اب غیر موثر ہو گئے ہیں؟ ازراہ کرام اس کی ایک فہرست

۱- منظور احمد، ”پیش لفظ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحات ۷-۸۔

مہیا کی جائے کہ اسلام پر عمل کرنے کے فلاں فلاں طریقے اب عہد جدید میں کارآمد نہیں رہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ عہد جدید جو کچھ بھی ہے اور جیسا بھی ہے کیا آخری اور ابدی سچائی ہے؟ اور کیا عہد جدید آج جس سطح پر کھڑا ہے تو کیا وہ اس منزل تک فطری طور پر پہنچا ہے؟ کیا زمانہ خود پیمانہ، منہاج، کسوٹی، اصل اصول اور فرقان و برہان ہے؟ زمانے کی تعریف کیا ہے؟ کیا روایتی تہذیبوں اور الہامی مذاہب، جدید فلسفے کے یہاں زمانے کا ایک ہی تصور ہے؟ یا ہر ایک کا تصور زمان الگ الگ ہے؟ اگر رومی عیسائی سلطنت باقی رہتی یا اگر خلافت اسلامیہ اپنی سابقہ قوت و شوکت کے ساتھ آج بھی قائم ہوتی تو کیا عہد جدید اسی طرح ہوتا جس طرح ہمیں نظر آ رہا ہے؟ — ڈاکٹر صاحب کے استدلال کی پوری عمارت اس مفروضے پر کھڑی ہے کہ عہد جدید جو کچھ اور جیسا بھی ہے، بعض لائق نظر انداز خامیوں کے باوصف، ایک بدیہی، اٹل اور فطری حقیقت ہے، اسے من و عن قبول کر لینا اور اسلام کو روح عصر سے ہم آہنگ کرنا ہی فی الاصل اسلام کا بنیادی مقصد ہے۔ یہ بنیادی طور پر ہیگل کا جدلیاتی ارتقائی نظریہ ہے کہ ہر گلا زمانہ پچھلے زمانے سے بہتر ہوتا ہے اور انسان نقص سے کمال کی طرف اور ادبار سے عروج کی طرف مسلسل گامزن رہتا ہے لہذا اب حال کے مقابلے میں سابقہ زمانے کی بازیافت، ماضی کی جستجو یا گزری ہوئی تاریخ دھرانے کی کوشش ایک احمقانہ رویہ [Nostalgia] ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب ہیگل کے اس نظریے پر یقین رکھتے ہیں، جیسا کہ ان کی تحریرات کے مافی الضمیر سے مترشح ہوتا ہے، تو اس صورت میں ان کے منہاج علمی کا خود ہی تعین ہو جاتا ہے کہ وہ اسلامی علمیات اور ماخذ کو ایک ملحد فلسفی کے منہاج میں کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں۔ علمی طور پر یہ تقابل ہی ٹھیک نہیں ہے۔ تقابل ہمیشہ یکساں علمیاتی مناہج میں ممکن ہوتا ہے دو متضاد و متخالف مابعد الطبیعی مناہج میں نہیں۔ جس طرح کانٹ کے منہاج میں کھڑے ہو کر ہیگل کے عقلیت اور تاریخی تصورات کا جائزہ نہیں لیا جاسکتا، ہو میو پیٹھی کے منہاج میں کھڑے ہو کر ایلو پیٹھی طریقہ علاج پر سوالات نہیں اٹھائے جاسکتے، اسی طرح دو مختلف تہذیبیں جن کی مابعد الطبیعیات اور اعتقادات [Grand Narrative] مختلف ہوں ان کو ملانا ممکن نہیں ہے، بالفاظ دیگر جس منہاج علم سے متعلق سوال یا تنقید ہوگی وہ اس کے اپنے منہاج علمی سے باہر ممکن ہی نہیں۔

جدید فکر: مذہبی عقائد اور اخلاق کے متوازی راہ:

اس وقت جدید فکر اپنی ہر صورت و جہت میں مغرب اور مغربی افکار و اقدار سے عبارت ہے، جس کا خاصہ یہ ہے کہ وہ کسی غیب اور مطلق مقتدرہ کو تسلیم نہیں کرتی، خدا، وحی، آخرت، رسالت وغیرہ اس کے تصور علم اور خوائے اثبات سے ادنیٰ مناسبت بھی نہیں رکھتے۔ جدید سائنس اگرچہ مذہبی عقائد، دینی حقائق اور مابعد الطبیعی امور کے بالقابل بہ ظاہر سکوت کا رویہ اختیار کرتی ہے، لیکن اس کا تصور کائنات اور انداز تحقیق ایسا ہے جس سے کسی مرغلے پر ادنیٰ درجے میں بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ آگے چل کر اثبات مذہب کے لیے معادین ہو سکے گی۔ اس کے برعکس اس کی سمت بالکل مذہب مخالف ہے بلکہ یہ افکار

بہ قول خود ڈاکٹر منظور احمد مذہب سے بڑی حد تک عناد کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اسی طرح نظری علوم فلسفہ، عمرانیات اور معاشیات وغیرہ غیب مطلق کے انکار، مغربی اقدار کے فروغ اور نظام سرمایہ داری کے استحکام سے عبارت ہیں، جو محسوس و مشاہد ہے وہ ہی موجود اور حقیقی ہے۔ مابعد الطبعی حقائق اور ماورائے زمان و مکاں اس تصور علم میں محض ایک واہمہ ہے۔ اس ”جدید فکر“ اور اس کے زیر اثر رائج شدہ نظام تعلیم نے ہمارے ہاں ایک محکوم نسل کو وجود بخشا ہے جس نے مغربی اقدار حیات، ثقافتی رجحانات اور علمی روایات کو ایسے قبول کیا ہے جیسے یہ بھی کوئی آسمانی مذہب ہے۔ اس نے جو ذہنیت عملاً پیدا کی ہے اس نے طلباء کے تصور کائنات اور تصور انسان سے خدا اور مذہب کی راست مداخلت بلکہ دینی عقائد و اخلاق کی قبولیت کی استعداد ہی سلب کر لی ہے۔ یہاں حرص و حسد اور ہوس کا نام مسابقت [competition] رکھ کر طلباء اور دوستوں کو ایک دوسرے کے مخفی دشمن [potential enemy] کے طور پر تیار کیا جاتا ہے، ایک دوسرے کو کچل کر، کہنی مار کر، آگے بڑھنے کو زندگی، ارتقاء، ترقی اور کامیابی کی کلید باور کیا جاتا ہے۔ یہاں عروج اور کامیابی کا منہا صرف مادی ترقی اور سرمائے کی ریل پیل ہے جس سے انسانی خواہشات کی خوب سے خوب تکمیل ہو سکے۔ یہاں گناہ بے معنی ہے غربت کا خاتمہ مقصود اصلی ہے، زندگی کا مقصد نیکی [virtue] کا حصول نہیں بلکہ دولت کا حصول ہے۔

منبر و محراب کی تلقین و تحدید: سرمایہ دارانہ نظام زندگی اور آزادی کی راہ میں رکاوٹ:

ظاہر ہے منبر و محراب سے اسلام پر عمل کرنے کے جو طریقے بتلائے جاتے ہیں، زندگی پر جو تحدیدات و قیود عائد کرنے کی تلقین کی جاتی ہے، اُسے قبول کر کے تو بے لگام ترقی کا حصول ناممکن ہے، اس بے مہار ترقی کے حصول کی صرف ایک صورت ہے کہ سائنسی علییت اور سرمایہ دارانہ نظام کو غلبہ، استحکام اور فروغ بخشا جائے، جس کی شرط لازم یہ ہے کہ معاشرے میں پہلے سے موجود و مقبول روایتی اور مذہبی علییت کو سرمایہ دارانہ تصور علم کے مقابلے میں غیر معتبر اور لایعنی باور کرایا جائے۔ سگمنڈ فرائڈ نے اپنے لیکچر میں مغرب کو نصیحت کی تھی کہ ترقی اور سنہرے مستقبل کے حصول کے لیے سائنسی طرز استدلال کو بروقت انسانی ذہن پر اپنی حاکمیت جتانا ہوگی:

Our best hope for the future is that the intellect ..... the scientific spirit, reason ..... should in time establish a dictatorship over the human mind. ۱

یعنی انسانوں کو یہ باور کرایا جائے کہ مذہب زندگی پر جو حد بندیاں عائد کرتا ہے اگر اس پر عمل پیرا ہوئے تو ہم محض حلال و حرام کے چکر میں پڑے رہ جائیں گے اور ترقی کی دوڑ سے باہر ہو جائیں گے۔ ترقی کا حصول صرف فکر معاد میں نہیں بلکہ کاوش معاش میں ہے۔ اس کے بالعکس اسلامی منہاج میں

1- Sigmund Freud, *New Introductory Lectures on Psycho-Analysis*, [trans. Joan Riviere], Georg Allen and Unwin Ltd., 1949, p. 219.



معاش سے مقصود اگر معاوضہ ہو تو یہ ایک خالص ماڈی سرگرمی ہے، حصول معاش لازماً حصول معاوضہ کے ساتھ پیوستہ اور ملحق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ان من الذنوب ذنوباً لا يكفرها إلا الهم في طلب المعيشة<sup>۱</sup>

”بعض گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ معیشت کی فکر اور جدوجہد کی کاوش ہی سے ہو سکتا ہے۔“

معاش نکاح کے لیے، زکوٰۃ کے لیے، حج کے لیے، جہاد کے لیے اور انفاق وغیرہ کے لیے بہت ضروری ہے۔ اسلامی علمیت و تاریخ میں معاشی سرگرمی بھی فی الاصل ایک دینی، مذہبی، روحانی اور اخروی جذبے سے مملو ہے۔ اس کا مقصد تمام مالی عبادات کو ممکن العمل بنا کر اپنے رب کی رضا اور خوشنودی کو حاصل کرنا ہے، اس کا مقصد ہرگز نفع کا حصول نہیں۔ سرمائے کے ارتکاز کے ذریعے آزادی کے دائرے کی توسیع خالصتاً مغربی نقطہ نظر ہے جس کے مطابق: There is one and only one kind of responsibility of business to increase its profits - مغربی اور اسلامی مابعد الطبیعی نقاط نظر کے اس فرق کو، جو فی الاصل دو مختلف تصورات خیر و شر اور مابعد الطبیعیات سے پھوٹے ہیں، دونوں علمیات کے نمائندوں فرائیڈمین [Milton Friedman, 1912-2006]<sup>۲</sup> اور امام غزالی [م ۵۰۵ھ]<sup>۳</sup> کی کتابوں میں تفصیل سے دیکھا جاسکتا ہے۔

مقاصد الشریعہ: زمانہ جدید کے مسائل کے محاکمے اور حل کے لیے مؤثر طریق:

خدا جانے زمانہ جدید کے وہ کون سے مسائل ہیں جن میں اسلامی فکر رہ نما نہیں ہو سکی۔ روایتی اسلامی فکر کا معاملہ ہر عہد میں پیدا ہونے والے مسائل کے قبول یا عدم قبول کے حوالے سے نہایت واضح اور دو ٹوک ہے۔ کسی شے کے حصول یا عدم حصول اور قبول یا عدم قبول سے قبل شریعت کے بیان فرمودہ پانچ مقاصد [دین، جان، عقل، نسل اور مال] کا تحفظ ضروری ہے، انھیں اصطلاح میں ”مقاصد شریعت“ کہا جاتا ہے۔ زندگی کے تمام معاملات، مخالفت یا موافقت دونوں صورتوں میں، ان ہی پانچ دائروں سے ہو کر

۱- ابی بکر اسیٰؓ، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۳۲۲ھ/۲۰۰۱ء، کتاب الجنائز، باب فی من یتلی، جلد ۳، صفحہ ۵۔

2- Milton Friedman, "The Social Responsibility of Business Is to Increase Its Profit", in *The New York Times Magazine*, September 13, 1970.

۳- ایک مسلمان کی زندگی میں معاشی سرگرمی کی ضرورت، اہمیت اور حدود پر روایتی اسلامی فکر کے سب سے مستند نمائندے امام غزالی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”احیاء علوم الدین“ میں مختلف مقامات پر قرآن و سنت، اجماع اور خیر القرون میں پروان چڑھنے والی تہذیب اور معاشرے کے تناظر میں تاریخی حوالوں سے نہایت سیر حاصل اور فیصلہ کن گفتگو کی ہے، جو احیاء علوم الدین کی مختلف جلدوں میں متفرق مقامات پر بکھری ہوئی ہے۔ اس بحث کے باحوالہ خلاصے کے لیے دیکھیے:

Javed A. Ansari and S. Zeeshan Arshad, *Business Ethics in Pakistan*, Karachi: Royal Book Company, 2006, pp. 120-124.

گزرتے ہیں۔ ان ہی مقاصد کے تحت زمانہ جدید کی تہذیب و تاریخ، فلسفہ و سائنس، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات اور نفسیات وغیرہ کا عمیق، مبہر انہ اور ناقدانہ جائزہ لیا جائے گا، جو چیز مقاصد شریعت کے منافی نہ ہو اُسے قبول کر لیا جائے گا، لیکن یہ سارا عمل دین کی کلّیت، روحانیت اور مقاصد کے تابع ہوگا۔ مقاصد اور مصلحت کے نام پر پوری شریعت کو پامال اور روح شریعت کو مسخ کر کے کوئی قابلِ تقلید اجتہاد ممکن نہیں۔

زمانہ جدید میں بعض امور پر رخصت کے درجے میں عمل کی اجازت: احتیاط اور قیود:

یہ بات بہت ممکن ہے کہ زمانہ جدید کے بہت سے امور اور معاملات قبول کیے بغیر مسلمانوں کے لیے مفر نہ ہو۔ امتِ مسلمہ اس صورت حال یا درپیش مسائل کو، حالتِ اضطرار ہی میں سہی، اپنانے یا قبول کرنے پر مجبور ہو۔ شریعتِ اسلامی نے اس سمت میں بھی پوری رہ بری کی ہے۔ جب کسی شے کو اضطرار آیا مجبوری میں قبول یا اختیار کیا جاتا ہے تو اس میں حلت و حرمت کی حدود قائم رہتی ہیں۔ حالتِ اضطرار میں کسی شے کی قبولیت اُسے دائماً حلال نہیں بنا دیتی، بلکہ وہ شے ایک ہنگامی حالت میں اضطراری صورت حال کے لیے جائز ہوتی ہے۔ مومن کا ایمان اس اضطراری حالت کے خاتمے کے لیے اسے موجود و مضطر پر قانع نہیں رہنے دیتا، بلکہ اس اضطراری حالت کو اس کا اضطراب رخصت سے بالآخر عزیمت کی طرف موڑ دینے کے لیے ہمہ وقت بیدار اور عملاً کوشاں رہتا ہے۔ جوں ہی وہ حالتِ اضطرار ختم ہوتی ہے، وہ شے جو مجبوراً حلال تصور کر لی گئی تھی، دوسرے ہی لمحے حرام ہو جاتی ہے۔ حرام فی نفسہ حرام ہوتا ہے، جس سے حالتِ اضطرار میں استفادے کی اجازت، رخصت کے درجے میں، شریعت نے فراہم کی ہے۔ اسلام نے اپنی تاریخ کے روز اول ہی سے کسی شے کے ترک و اخذ کا یہی اصول فراہم کیا ہے۔

جدیدیت پسند: مغربی فکر و تہذیب کے جامد مقلد:

عصر حاضر میں جدیدیت پسندوں بہ شمول ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ حضرات مغرب کو ایک عالم گیر سچ اور آفاقی تہذیب و تمدن کا امین تصور کر کے اسے من و عن قبول کر لینا ہی اسلام کی صیانت اور امت کے تحفظ کا ضامن سمجھتے ہیں۔ یہ حضرات عہد جدید کے درپیش مسائل کا حل نورِ اسلام سے نہیں چاہتے بلکہ اسلام کو مغرب کی فراہم کردہ ”روشنی“ میں دیکھتے ہوئے مسلم معاشرے میں اسلام کے نام پر مغربی افکار و اقدار اور تہذیب و ثقافت کی آبیاری کے خواہاں ہیں۔ یہ لوگ مغرب کی ماڈی ترقی اور یورپی سامراج کی چمک دمک سے اس قدر مرعوب اور احساس کہتری کا شکار ہیں کہ ان کے اسلوبِ تحقیق اور مدارِ کلام سے جو کچھ ”اجتہاد“ برآمد ہوتا ہے وہ ایک طرف مغرب کی کامل ”تقلید“ اور کتاب و سنت کی خالص ”تحریف“ پر مبنی ہوتا ہے۔ جب کہ دوسری طرف یہی طبقہ دینی امور میں مسلمانوں کے کتاب و سنت کی تقلید کو تحقیق اور تجزیے کے منافی رویہ سمجھتا ہے اور تقلید ہی کو مسلمانوں کے زوال اور جمود کا حقیقی سبب قرار دیتا ہے۔ حالاں کہ یہ طبقہ مقلدین سے بڑھ کہ تقلید کا خوگر ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ مقلدین دین و مذہب کے مستند نمائندوں اور شارحین کی رہنمائی اور تقلید میں کتاب و سنت کی پیروی کرتے ہیں،

جب کہ جدیدیت پسندوں کا گروہ مغرب کی تقلید میں کتاب و سنت کی تحریف پر کمر بستہ ہے۔ جو تقلیدی جذبہ اور روح اپنی پوری شدت اور کمال کے ساتھ قبولیت دین اور تفہیم مذہب کے لیے روایت پسندوں میں موجزن ہے، وہی تقلیدی جذبہ جدیدیت پسندوں میں اسی شدت و حدت کے ساتھ رد مذہب کے لیے کارفرما ہے۔ گویا نفس تقلید میں یہ دونوں طبقے مشترک ہیں۔ ایک کی تقلید کتاب و سنت پر عمل کو ممکن بناتی ہے اور دوسرے کی مغرب پر عمل کو۔

منظور احمد: زمانہ جدید سے نبرد آزمانی: ایک مذاق:

ڈاکٹر منظور احمد نے منقولہ بالا اقتباس میں زمانہ جدید کے مسائل سے ”نبرد آزمانی“ کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے۔ ”نبرد آزمانی“ لڑائی، معرکہ آرائی اور جنگ کو کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے حاشیہ گمان میں کبھی مغرب یا زمانہ جدید کے مسائل سے ”نبرد آزمانی“ کا خیال بھی گزرا ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا ہی بہتر ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب اس ”نبرد آزمانی“ کے خطوط اور حکمت عملی بھی واضح فرمادیتے۔ ڈاکٹر منظور احمد کی تالیفات و مقالات کے عمیق مطالعے کی روشنی میں یہ بات پوری ذمے داری سے عرض کی جا رہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اسلام اور زمانہ جدید میں ”نبرد آزمانی“ تو دور کی بات ہے، اس میں کلیئہ مفاہمت، مصالحت اور موافقت کے خواہش مند ہیں۔ ان کی نظر میں زمانہ جدید ہی اصل منہاج اور میزان ہے۔ ان کی نظر میں صنعتی انقلاب کے بعد حالات اور زمانے نے ایسی کروٹ لی ہے کہ اب منصوص احکام اور متعین حدود میں تغیر ناگزیر ہو گیا ہے۔

منظور احمد: تفہیم دین کی واحد صورت: طبعیاتی نظام خدائی مداخلت سے آزاد:

ڈاکٹر منظور احمد مسلمان معاشروں میں ترقی کے ان آثار و نشانات کو تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں جس کی مثالیں ان مغربی و مشرقی اقوام کے ہاں موجود ہیں، جنہوں نے اپنے مذاہب کی ”نئی تفہیم“ وضع کر لی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کے مطابق ترقی [progress] کے لیے مسلمانوں کا اپنے علمی منہاج پر نظر ثانی کرنا نہایت ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”تقدیر کے مقابلے میں تدبیر کے نئے تصور کے تحت سماجی اور مذہبی زندگی کو نئے طرز سے استوار کرنے کا کام مشکل اور وقت طلب ہے اور اس کے لیے مذاہب کی بالعموم اور اسلام کی بالخصوص ایک نئی تفہیم کی ضرورت ہے۔ دوسرے مذاہب نے یہ کام بڑی حد تک انجام دے لیا ہے۔ لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر ہم اپنی تاریخ اور تصوراتی نظام کا تنقیدی جائزہ نہیں لے پاتے۔ اس تنقید اور جائزے کے لیے نئے فریم ورک اور نقطہ نظر کی ضرورت ہے۔“

۱- منظور احمد، ”پیش لفظ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۸۔

اپنے ایک مضمون میں مزید لکھتے ہیں:

”آج کا مسلمان غیض و غضب اور طیش سے مملو ہے اور دانش سے خالی۔ وہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ دانش کے بغیر، ٹیکنالوجی کی ترقی یا سامان حرب و ضرب کی کثرت سے وہ غلبہ حاصل کر سکتا ہے، تو یہ اس کی بھول ہے۔ ٹیکنالوجی، سائنس اور آلات کو استعمال کرنے کے لیے جس فکری سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے اس کو مہیا کیے بغیر اس کے معاشرے میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔“

جب ڈاکٹر صاحب اسلام کی ”نئی تفہیم“ اور حصول ترقی کے لیے درکار دانش سے مملو ”فکری سرمائے“ کی بات کرتے ہیں تو انھیں گفتگو مبہم اور نامکمل نہیں چھوڑنی چاہیے کہ قاری کو ان کی مراد اور مدعا تک پہنچنے کے لیے ان کی پوری گفتگو سے مفہوم کشید کرنا پڑے۔ انھیں واضح لفظوں میں بتانا چاہیے کہ اسلام کی اس ”نئی تفہیم“ اور ترقی کے حصول کے لیے درکار ”فکری سرمائے“ سے ان کی کیا مراد ہے؟ اس تفہیم نو اور فکری سرمائے کے آثار و نشانات کیا ہیں؟ وہ کون کون سے مذاہب ہیں جنہوں نے اپنے مذہب کی ”نئی تفہیم“ وضع کر لی ہے؟ اور کیا تفہیم جدید اور دانش سے مملو ”فکری سرمائے“ کے حصول کے بعد بھی ان مذاہب اور ان کی مذہبی کتابوں کی اپنے ماننے والوں پر ویسی ہی قانونی یا اخلاقی گرفت رہی جیسی کہ ان کے داعیان چھوڑ گئے تھے؟ اگر صرف مغرب ہی کو سامنے رکھا جائے تو مغرب نے یونانی فکر کی حیاتِ ثانی کے ذریعے ہی اپنے مذہب کی ”نئی تفہیم“ وضع کر کے ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ مغرب نے ابتداً عقل انسانی کو تمام دنیوی ضابطوں اور قواعد کی تجویز کا اختیار سونپ کر گویا ریاست، معیشت، تعلیم، قانون، معاشرت اور اخلاق کو خالص دنیوی سرگرمی قرار دیتے ہوئے خود کو مذہبی حدود و قیود سے آزاد کر لیا اور اس بات کو ڈاکٹر منظور احمد کے الفاظ میں، بہ طور اصول طے کر لیا کہ ”طبیعیاتی نظام [دنیوی معاملات] میں خدا کی مداخلت بے جا ہے۔“ یوں الوہیت کلیسا تک محدود ہو گئی اور مذہب کی بساط الٹ گئی۔ بلکہ کلیسا [City of God] اپنے وجود اور بقا کے لیے دنیوی اداروں [City of Man] کا محتاج اور دست نگر ہو گیا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر دائرے میں انسان کی رائے، انسان کا فیصلہ، انسان کی عقل، انسان کی آزادی اور انسان کا ارادہ حتمی مقتدرہ قرار پایا جو انسانی زندگی سے خدا اور آخرت کی بے دخلی پر منتج ہوا۔

منظور احمد: نظام اخلاق میں الوہی مداخلت آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ: سنگین دعویٰ:

تحریک اصلاح اور تحریک تنویر کی اسی صدائے بازگشت کو ذرا مدہم لہجے اور light tone میں ڈاکٹر منظور احمد کے قلم سے ملاحظہ کیجیے، جس سے اسلام کی ”نئی تفہیم“ کی نوعیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

۱- منظور احمد، پس چہ باید کرد؟ ”لوگ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟“ بش / مسلمان، کراچی: شوکت ٹریڈ پارکچہ فاؤنڈیشن [س۔ن۔]، صفحہ ۲۲۔

”سیاسی اور معاشرتی عوامل کے ساتھ مسلمانوں کا نظام اخلاق بھی اسی پیراڈائم کا پابند ہے۔ یعنی اخلاقی اور غیر اخلاقی کا انحصار اقدار کے فی نفسہ خیر و شر ہونے پر نہیں بلکہ خدا کے حکم اور مرضی پر ہے ..... خیر و شر فی نفسہ خدا کے حکم کے تابع ہونے سے انسان کی شخصی آزادی اور قوت فیصلہ ختم ہو کر چند ایسے لوگوں کے فتوؤں کی پابند ہو جاتی ہے جو یہ بتا سکیں کہ خدا کس کام کے کرنے کو کہتا ہے ..... یہی صورت حال انسانی معاملات سے متعلق قوانین کی ہے جو یا متعین ہیں یا متعینہ قوانین سے استخراج کیے جاسکتے ہیں۔ کسی مفسدہ کو ختم کرنے یا کسی اخلاقی قدر کو معاشرے میں قائم کرنے کے سلسلے میں مناسب قانون سازی کا حق انسانی اختیار میں نہیں رہا، بلکہ وہ بھی ہمیشہ کے لیے ”نیت خدا کے شارحین“ کے نام منتقل کر دیا گیا۔ اس میں اجتہاد کے ذریعے صرف ضمنی تبدیلی ہی ممکن ہے اور اس کی سند بھی وہی شارحین دے سکیں گے۔ کسی متعین قانون کی جگہ دوسرا قانون اگرچہ وہ نتائج کے اعتبار سے بہتر ہی کیوں نہ ہو نہیں بنایا جاسکتا۔ ان سب عوامل نے مل کر انسان میں فکری آزادی کو بڑی حد تک معدوم کر دیا ہے“۔<sup>۱</sup>

اسلامی سیاق اور تناظر میں خدا اور رسول پر ایمان لانے کے بعد اس قسم کے فلسفیانہ اعتراضات اور مقدمات کا جواز دائرہ ایمان کے اندر نہیں بلکہ اس سے باہر کھڑے ہو کر ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ ایمان کی قبولیت کے بعد شے کے رد و قبول کا اختیار اب عقل کے آزادانہ اور بے لاگ فیصلوں کی بنیاد پر نہیں ہو سکتا، اب عقل کی ساری کار فرمائی اور تگ و تاز خدا اور اس کے رسول کے بنائے ہوئے حصار ہی میں ممکن ہے اور عقل کی تمام تر کاوش اور اہداف منشائے متکلم اور شارع کی مراد کی راست طلب اور جستجو تک محدود اور محصور ہے۔ ایک مسلمان اس مسئلے کا ایمانی طور پر پابند ہے۔ اس کے لیے اب اس بات کا کوئی جواز موجود نہیں کہ وہ مذہبی مابعد الطبیعیات کا ماخذ اور منبع خدا کی طرف سے نازل کردہ سمجھنے اور ماننے کے باوجود اس کے اطلاقات کو عقل کے آزادانہ فیصلوں سے متعین کرے۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے استدلال سے جو صورت حال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول کی لائی ہوئی ہدایت کے زیادہ سے زیادہ اعتقادی حصے کو ابدی مانا جاسکتا ہے [اگرچہ اس اعتقادی حصے کی تفہیم کے لیے بھی انسان کو کسی مقتدرہ کا پابند نہیں ہونا چاہیے]، لیکن خیر و شر کی تمیز، خوب و زشت میں تفریق اور حدود و قوانین کی پابندی پر اصرار یا بالفاظ دیگر طبیعیاتی نظام میں خدا کی مداخلت ایک غیر عاقلانہ اور غیر دانش مندانہ رویہ ہے۔ الوہی ہدایت کے مشمولات کے علم کے حصول کے لیے تو بہ امر مجبوری نصوص سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے علمی نفاذ اور اطلاقی امکانات کے لیے انسانی عقل و دانش کو کسی حکم مطلق کا تابع فرمان اور محکوم نہیں بنایا جاسکتا بلکہ کسی بھی حکم کی قدر و قیمت اور نوعیت و مصلحت طے کرنے کا مدار و انحصار خالصتاً عقلی استدلال پر رکھا جائے گا جو اپنی ترجیحات اور امکانات میں نص سے آزاد ہوگا۔

۱- منظور احمد، ”پاکستان“ مشمولہ پندرہ روزہ معارف فہر، صفحہ ۷۔

اخلاقیات کو الوہی دانش سے آزاد کرنے کے مضمرات: چند بنیادی سوالات:

ایمانی اور اعتقادی حصار کی بحث کو فلسفیانہ طریق اور عقلی استدلال کے دائرے میں منتقل کر دینے سے درج ذیل سوالات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے، جس کا جواب ان حضرات کے ذمے ہے، جو حکم کی ماہیت، غایت، نوعیت، حیثیت اور مصلحت کو محض ایک عقلی سرگرمی سمجھتے ہیں:

[۱] مذہب کے بنیادی اعتقادی حصوں، جن کی تفصیل ایمان مجمل میں درج ہے، کو بھی ماننے کا کیا عقلی جواز ہے؟ اگر مذہب کی "عقلت" پالنی ہی ہے تو کیا فقط اتنا اعتقاد ہی کافی نہیں کہ خدا ایک ہے اور کل آخرت ہوگی؟ جب کہ تاریخ سے انبیاء کی آمد کے ان ہی دو بنیادی مقاصد کا پتا چلتا ہے!

[۲] عبادات سے مقصود بندگی رب ہے، اس کے لیے ظاہری صورتوں کی پابندی اور اصرار کی کیا عقلی دلیل ہے؟ کوئی بھی فرد یا گروہ اپنے سماجی تناظر اور تہذیبی پس منظر میں اپنے عرف و عادات کے مطابق اپنے مناسب حال کوئی بھی طریق عبادت چاہے تو اختیار کر سکتا ہے۔ بلکہ اگر خالص عقلی تناظر میں دیکھا جائے تو مختلف عبادات اپنے اوقات سے لے کر مراسم عبودیت تک مختلف احوال و ظروف کے پیش نظر تبدیلی اور تغیر کی متقاضی نظر آتی ہیں۔ مثلاً جمعے کے روز لوگ اپنی کاروباری ذمے داریوں، دفتری مصروفیات اور مدرسے، جامعات میں اپنے اپنے معمولات زندگی کے مطابق مشغول ہوتے ہیں، دنیا اس وقت چودہ سو سال پرانا "گہوارہ اسلام" تو ہے نہیں جہاں جمعے کی نماز سے قبل کاروبار زندگی معطل ہو جاتا ہو، اس لیے لوگ اپنی مشغولیات اور مصروفیات سے وقت نکال کر جمعے کی نماز کے لیے بہ صورت اجتماع جمع ہوتے ہیں، جس میں امام صاحب کے وعظ و خطبے سے لے کر نماز کے اختتام تک کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے کا وقت صرف ہوتا ہے۔ آج کی مصروف دنیا میں کاروباری اوقات میں ڈیڑھ دو گھنٹے کا وقت خاصے مالی خسارے کا باعث ہوتا ہے تو کیا خالص عقلی بنیاد پر یہ مطالبہ نادرست ہے کہ کم از کم جمعے کی نماز کا وقت اور دن عصر جدید کے عرف و عادات کے مطابق تبدیل کر دیا جائے؟ — قدیم تمدن و تہذیب کے لوگوں کے سونے جاگنے کے اوقات عصر جدید سے بہت مختلف تھے، لوگوں کی کاروباری مصروفیات اور دنیا بہت محدود تھی، لوگ اپنے کاموں اور مصروفیات سے جلد فارغ ہو کر جلد سو جاتے تھے اور منہ اندھیرے بیدار ہوتے تھے، ایک محدود مذہبی معاشرے میں یہ مطالبہ عقلی طور پر بجا تھا کہ لوگ بیدار ہو کر معمولات زندگی شروع کرنے سے قبل اپنے مالک و خالق کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوں۔ لیکن عصر جدید کے احوال و ظروف میں جب کاروباری مصروفیات پھیل گئی ہوں، دنیا وسیع ہو چکی ہو، اکثر معاملات اور میٹنگز رات کو طے پاتی ہوں اور لوگوں کا جلد سونا اور صبح سویرے بیدار ہونا، الا ماشاء اللہ، معدوم ہو چکا ہو تو کیا خالص عقلی بنیادوں پر کم از کم ان لوگوں کو نماز فجر تاخیر سے ادا کرنے کی رخصت نہیں دی جاسکتی جو دیر سے بیدار ہوتے ہیں؟ — روزے سے تقویٰ اور نفس کے میلانات اور رجحانات کو کثافت اور آلودگی سے پاک کرنا ہی تو مقصود ہے اس کے لیے صرف روزے جیسی بدنی عبادت کی کیا احتیاج ہے؟ اوپر لکھا گیا کہ لوگ آج کل سوتے ہیں اور دیر سے جاگتے ہیں ایسے میں ان لوگوں کو نیند سے بیدار کر کے سحری کی مشقت میں

بتلا کرنا اور پھر پورا دن بھوکا پیاسا رہنے پر اصرار کا کیا جواز ہے، بدنی عبادت کی کوئی بھی صورت جو لوگ اپنے احوال و ظروف سے چاہیں اختیار کر لیں، اس میں کون سا عقلی امر مانع ہے؟ حج کی عبادت کو سال کے مخصوص ایام میں محدود کر دینے سے بڑی گھمبیر مشکلات کا سامنا ہے، جدید ذرائع نقل و حمل کی ترقی اور حجاج کی سال بہ سال بڑھتی ہوئی نفری نت نئے مسائل کو جنم دے رہی ہے، ہر سال انسانوں کی ایک معتد بہ تعداد ہجوم اور اژدھام تلے کچل اور روند کر موت کے گھاٹ اتر جاتی ہے تو کم از کم حج کے لیے ایام ذی الحجہ کی پابندی کی تبدیلی کا مطالبہ کیا عقلی طور پر جائز مطالبہ نہیں ہے؟ کہ لوگوں کو سال میں ایک سے زائد دفعہ مواقع حج فراہم کیے جائیں؟ اسی طرح احرام کا سفید غیر سلے کپڑوں پر مشتمل ہونا کیوں ضروری ہے؟ کالے، ہرے اور سلے ہوئے کپڑے پہننے میں کون سا عقلی حرج ہے؟ اس طرح وہ صاف بھی رہیں گے اور گندگی نمایاں بھی نہیں ہوگی۔ خود عبادت ہی کے مخصوص رسوم کو متعین آداب و حدود کے ساتھ بجالانے کی کیا عقلی توجیہ ہے؟ عبادت کو بندگی اور جذبہ عبودیت کی مخصوص حسی تشکیل و ترتیب کا پابند کیوں بنایا جائے؟ معرفت، تقویٰ اور طہارت باطنی کے لیے مختلف سماج اور تمدن کے لوگ اپنے اپنے تہذیبی ذوق اور تمدنی میلانات کے مطابق جو طریقہ چاہیں اختیار کر لیں، آخر مختلف تمدن اور تہذیب کی نمائندگی کرنے والوں کے لیے اہل عرب کے احوال و ظروف اور اذواق و عادات کو کیوں معیار بنایا جائے؟ بلکہ خود اہل عرب ارتقا کی منازل طے کر کے جہاں پہنچے ہیں اگر وہ چاہیں تو اس میں انہیں جزوی یا کلی تبدیلی سے کون سا عقلی مسئلہ روکتا ہے؟ خدا کے حضور حاضری کے لیے نماز کے علاوہ اور کوئی طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے، بدنی عبادت کے لیے صرف روزے پر اصرار کا کوئی عقلی جواز نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مذاہب عالم اور اس میں آنے والے تمام انبیاء و مرسلین کے سلسلے کو تسلیم کرتا ہے، تمام انبیاء کا یکساں درجے میں احترام بھی کرتا ہے، ان تمام عقائد کو بھی مانتا ہے جو تمام انبیاء کی شریعت میں بلا اختلاف مشترک رہے، یعنی توحید اور معاد۔ لیکن ظاہری احکام و قوانین کے دائرے میں نہ وہ شریعت داؤدی و ابراہیمی کی پابندی ضروری خیال کرتا ہے اور نہ ہی شریعت موسوی و محمدی کی۔ بس جو طرائق عبادت اور آداب بندگی اسے مناسب حال لگتے ہیں وہ انہیں بے کھٹکے اختیار کر لیتا ہے۔ تو کیا اسے قبولیت اسلام خصوصاً رسالت محمدی اور اس کے نتیجے میں انبیائے سابق پر ایمان اور محض آپ کے احکام و فرمودات کی پیروی پر مجبور کرنا عقلی طور پر درست ہے؟ ان سب سے بڑھ کر کسی فرد کو دنیا میں اچھا انسان بننے کے لیے اور معیاری اخلاقی زندگی بسر کرنے کے لیے مذہب پر ایمان لانے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر ایک انسان اپنے درون اور ضمیر کے پیش نظر سچ بولتا ہے، ایمان دار ہے، کسی کو دھوکا نہیں دیتا، اذیت اور تکلیف نہیں پہنچاتا، عزیزوں سے محبت کرتا ہے، اپنی روزی دیانت سے کماتا ہے، تو ان اخلاق کے ہوتے ہوئے مذہب پر ایمان لانے کا کیا عقلی جواز ہے؟ آخر مذہب بھی تو انسان میں ان ہی حسنت کے پیدا کرنے کا داعی ہے جو اس انسان نے اپنی ذاتی آواز پر، کسی خوشی یا لالچ یا ناراضگی کے خوف سے بے پرواہ ہو کر از خود اختیار کر لیا ہے۔ تو اب اس انسان کے لیے مذہب کے ”گور کھ دھندوں“ میں الجھنے کا عقلی طور پر کیا جواز ہے؟

ان تمام فلسفیانہ اور عقلی سوالات کو اگر اس کے منطقی نتائج کے آئینے میں دیکھا جائے تو بہ طور دین اسلام کا تشخص محدث اور امتیاز محو ہو جائے گا، دنیوی ترقی کے لیے دانش سے مملو ”فکری سرمائے“ اور اس کے حصول کے لیے دین کی ”تفہیم نو“ کا بدیہی نتیجہ یہ نکلے گا کہ:

”مذہب کبھی اپنی اصلی حالت پر برقرار نہیں رہتے، بلکہ ایک معنی میں کسی مذہب کی کوئی اصلی حالت نہیں ہوتی۔ صرف ایسے سرحدی نشان ہوتے ہیں جن کے باہر نکلنے سے کوئی شخص مذہب کے دائرے سے نکل جاتا ہے۔“<sup>۱</sup>

معاشی و تکنیکی ترقی کا بدیہی نتیجہ: زندگی سے خدا اور آخرت کا انخلاء:

ترقی [progress] کے وہ آثار، جس کا واحد مقصد انسانی آزادی کا حصول، اس پر سے ہر طرح کی قدغنون کا دور کرنا اور انسانی جذبات و خواہشات اور ارادے و عزائم کی خوب سے خوب تکمیل [maximum satisfaction] اور اس کے لیے مؤثر راہیں اور نت نئے طریقوں کی راہ سمجھانا ہے۔ اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے دینی روایت میں تغیر اور روایتی تہذیب میں تبدیلی ناگزیر ہے، وہ کیسے ممکن ہے؟ ڈاکٹر منظور احمد لکھتے ہیں:

”وہ فکری بنیاد، جس پر معاشی ترقی، تصوراتی ارتقا اور تکنیکی ترقی ممکن ہے اور جو ہم کو اسلام سے کاٹ کر خیالات کے میدان میں تنہا نہیں چھوڑ دیتی، یہ ہے کہ قرآن کریم اور سنت کی تفہیم کے روایتی اور خوشہ چینی طریق کار کو چھوڑ کر اس پر نئے سرے سے نظر ڈالی جائے۔ ان دونوں کو عمومی ہدایت کا سرچشمہ نہ سمجھا جائے، بلکہ ہدایت خاصہ کا منبع و ماخذ سمجھ کر اس سے عموم کو اخذ کیا جائے۔ اور پھر اس عموم سے آج کل کے حالات کے مطابق احکام اور قوانین بنائے جائیں۔“<sup>۲</sup>

عصر جدید میں ترقی سے مراد ”سائنسی ترقی“ ہے۔ یہ بحث اتنی سادہ نہیں ہے کہ اس پر عامیانہ اور سطح بینیوں کی سی گفتگو کر کے عالم اسلام کو سائنسی ترقی کے اختیار کرنے کا مشورہ دے دیا جائے اور زوال کا ذمے دار دینی مصادر علمی اور مذہب کے روایتی شارحین کو قرار دے دیا جائے۔ جیسا کہ ڈاکٹر منظور احمد لکھتے ہیں:

”وہ آزادی، قومی ریاست، جمہوریت، صنعت و حرفت، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی، غرض ہر شعبے میں جدید علوم کی ترقی کا سہرا مغرب کے سر ہے جو مسلمانوں پر حکمران رہا

۱- منظور احمد، ”پیش لفظ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۹۔

۲- منظور احمد، ”عصر حاضر میں اسلام کی تفہیم“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۶۸۔



ہے۔ اگر اسی مغرب سے دانش حاصل کر کے، مسلمان ممالک اپنی سیاسی اور معاشی آزادی کی حفاظت کرنے کے اہل نہیں ہوتے تو اس میں بڑی حد تک قصور ان کا اپنا ہے۔<sup>۱</sup>

اس بحث کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے سائنسی ترقی کی اصل حقیقت سے آگہی لازمی ہے۔ ان اسباب کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا ہوگا جن پر عمل پیرا ہو کر یہ ترقی ممکن ہو سکی ہے۔ ورنہ اٹھارویں صدی سے قبل بھی دنیا کی زرخیز تہذیبوں میں محیر العقول تیکنیکی ترقی کے مظاہر کی تاریخی شہادتیں موجود رہی ہیں۔ اُس وقت بھی عجائبات عالم تخلیق کیے جاتے تھے۔ لیکن آج جب اٹھارویں صدی کے بعد کی ترقی کی زرق برق رفتار کا قبل از جدید ترقیوں سے تقابل کیا جاتا ہے تو سابقہ ادوار کی ترقی زوال و ادبار کی تاریخ معلوم ہونے لگتی ہے۔ — بنیادی سوال یہ ہے کہ نقطہ نظر کی وہ کون سی تبدیلی ہے جو سترہویں صدی میں ایک خاص مابعد الطبیعیات کے زیر اثر ظہور پذیر ہوئی۔ جس کے باعث اس سرعت اور انفرادیت کے ساتھ تاریخ انسانی میں اپنی نوعیت کی واحد سائنسی ترقی ممکن ہو سکی ہے۔ تحریک تنویر اور تحریک اصلاح کا عیسائی نگاہ سے مطالعہ اس تبدیلی کے شواہد فراہم کر دیتا ہے کہ وہ بنیادی تبدیلی فرد، تہذیب اور معاشرت سے خدا اور آخرت کا انخلا اور خدا کی مرکزیت سے انسان کی مرکزیت کی طرف منتقلی تھی۔ بالفاظ دیگر یہ ”الوہیت انسانی“ کے عقیدے اور ایمان کا ظہور تھا، جس کے باعث تحریک تنویر نے یہ دعویٰ کیا کہ اس نے انسان کو ظلمت اور جہالت سے نکال کر بلوغت آشنا کیا اور دنیا کو وہ تہذیب و تمدن اور آسائش و ترقی عطا کی جس نے انسانی تاریخ کے تمام تر ارتقائی مراحل طے کر کے انسانی دنیا کو مغرب کا سیکولر جمہوری نظام اور آزاد منڈی کی معیشت عطا کی ہے۔ فرانس نو کو یا ماجدید مغرب بالخصوص امریکا کے سیاسی و معاشی نظام اور اس کی تہذیبی و سماجی اقدار کو عقل انسانی کی آخری، حتمی اور قطعی دریافت خیال کرتا ہے۔<sup>۲</sup>

جدید سائنس: کائنات کی دریافت نہیں اس پر تسلط سے عبارت ہے:

قبل از جدید معاشروں میں ٹیکنالوجی سوچہ بوجھ اور know how کے معنی میں استعمال ہوتی تھی۔ اس کے پس پشت کائنات کی مخفی قوتوں کو دریافت کر کے اس کی شان، حسن، رعنائی اور سچائی کو عیاں کرنا تھا اور اس سے مقصود استفادہ تھا۔ جدید مغربی عہد میں ٹیکنالوجی کائناتی قوتوں کی دریافت کی نہیں بلکہ اس پر تسلط کے جذبے اور عمل سے ظہور پذیر ہوئی ہے۔ قبل از جدید معاشروں میں فطرت اور کائنات ایک مقدس شے تھی۔ کار الہی [Work of God] تھی۔ جدید معاشروں میں فطرت اور کائنات محض اپنے مقاصد کے لیے استعمال کی جانے والی ایک شے [comodity] ہے جو انسانی ارادے کی غلام ہے، اس کے پس پشت کسی تقدیس کی کارفرمائی کا تصور نہیں۔ یہ ٹیکنالوجی کار تیسری سائنس

۱- منظور احمد، پس چہ باید کرد، صفحہ ۲۱۔

2- Francis Fukuyama, "History and September 11" in *Worlds in Collision: Terror and the Future of Global Order*, [eds., Ken Booth and Tim Dunne], New York: Palgrave Macmillan, 2002, pp. 28-29.

کی پیداوار ہے جس نے نیوٹن کے ذریعے ایک تاریخی جست لگا کر کائنات اور انسان کا رخ ”خدا مرکزی“ سے ”بشر مرکزی“ کی طرف موڑ دیا۔

ٹیکنو سائنس: سرمائے کی بڑھوتری کے لیے ادھرتی صف بندی میں اختیار کی جانے والی تدبیر:  
اس زمانے میں ٹیکنالوجی کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ جب سائنس کا اطلاق و نفاذ انسان کی عملی زندگی میں اس طرح ہو کہ اس کے نتیجے میں سرمائے کی بڑھوتری [accumulation of Capital] ممکن ہو سکے تو اسے ٹیکنالوجی کہا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے ذریعے پروان چڑھنے والی اس سائنس + ٹیکنالوجی کے مرکب کو برنوں لائور [Bruno Latour] ٹیکنو سائنس [technoscience] سے موسوم کرتا ہے۔<sup>۱</sup>

یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی اب محض تدبیر کا نام نہیں ہے بلکہ سرمائے کی بڑھوتری کے لیے جدید سائنسی طریقہ کار پر استوار اور سرمایہ دارانہ اداروں کی تحقیقی مد میں مالی معاونت سے بنائی جانے والی تدبیر کا نام ہے۔ اس کا مقصد انسان کی ضرورتوں اور حاجتوں کا پورا کرنا نہیں بلکہ انسان کی خواہشات اور چاہتوں کی خوب سے خوب تکمیل کی تدبیر ہے۔

عہد حاضر میں جدیدیت کا سب سے اہم، قد آور اور مرکزی فلسفی ہیر ماس [Jürgen Habermas] واضح لفظوں میں اس بات کی تصریح کرتا ہے کہ زمانہ جدید میں صنعتی عروج کے بعد ٹیکنالوجی کی ہیئت اور حیثیت محض کاروباری اور سرمایہ دارانہ ہو کر رہ گئی ہے اور اب اس کا انسلاک سائنس سے بالکل نئے طریقے پر ہو گیا ہے۔ اس کے خیال میں جدید سوچ کو برقرار رکھنے کے لیے دی جانے والی پرانی تاویلیں اب نافذ العمل نہیں رہیں، اس کے بجائے بہ زور طاقت نافذ کیے ہوئے سائنسی طریقے کا پیمانہ ہی اب واحد معیار قرار پا چکا ہے، جس کے باعث سائنس کے جزو لازم کے طور پر اب ٹیکنالوجی دنیائے جدید کے روئیں روئیں میں سرایت کر چکی ہے۔ ہیر ماس معاشی شکل میں ابھرنے اور پروان چڑھنے والی اس سائنس کو "technocratic consciousness" کہتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

The leading productive force – controlled scientific technical progress itself – has now become the basis of legitimation.<sup>۲</sup>

کوئی بھی سائنسی قانون [Scientific Law] جب اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کو زندگی کے کسی دائرے پر نافذ [apply] کر کے ایسی چیز بنائی جاسکے کہ اس پر جتنا پیسہ خرچ کیا جا رہا ہے اس سے زیادہ وصول ہو سکے تب وہ شے ٹیکنالوجی کی شکل میں ڈھل کر انسانوں تک پہنچتی ہے۔ اگر اس کی لاگت منافع سے

1- Bruno Latour, *Science in Action*, Cambridge: Harvard University Press, 1987.

2- Jürgen Habermas, *Towards a Rational Society*, [trans., Jeremy J. Shapiro], London: Heinemann Educational Books, 1971, p.111.

زیادہ ہو تو خواہ وہ کتنی اہم ہو، نہیں بن سکتی۔ اس لیے مطمح نظر اب یہ ہو گیا کہ ترقی [progress] کی بحث سے انسان کی ضرورت اور حاجت کو منہا کر کے اسے انسان کی حرص [accumulation] اور حسد [competition] سے جوڑ دیا جائے۔ یعنی مارکیٹ میں کون سا سائنسی قانون [scientific law] کب، کیسے اور کیوں استعمال کرنا ہے اس کی واحد قوت محرکہ منافع اور سرمائے کا زیادہ سے زیادہ حصول ہے۔ اگر وہ ریاست کے خلاف نہیں ہے تو جس Law کو بھی چاہے apply کیا جاسکتا ہے۔ اور جیسی چاہے technological transformation کے ذریعے جتنا منافع چاہے کمایا جاسکتا ہے۔ اسی اصول کے ذریعے امریکا اور یورپ میں سائنسی ترقی ممکن ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ اور روس دونوں ہی technological Progress کے خواہاں تھے، لیکن گاڑی روس کی نسبت امریکہ میں جلد پہنچ گئی۔ حالاں کہ روس کی آبادی بھی کم تھی اور وہاں گاڑی کی فراہمی بھی ریاست کی ذمہ داری تھی۔ جب کہ امریکہ میں گاڑی کی فراہمی لوگوں کا ذاتی مسئلہ تھا لہذا اصولاً وہاں گاڑی کے پھیلاؤ کی رفتار سست ہونی چاہیے تھی، لیکن امریکہ کی مارکیٹ نے اتنی سستی، دلکش اور مختلف ماڈل کی زیادہ سے زیادہ گاڑیاں بنائیں کہ وہ ہر فرد کے پاس پہنچ گئی۔ مشرقی یورپ اور روس کا حال یہ تھا کہ وہاں گاڑی مغربی یورپ کے مقابلے میں انتہائی تیسرے درجے کی تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ روس میں گاڑیاں ضرورت پوری کرنے کے لیے بنائی جاتی تھیں اور مغربی یورپ میں خواہشات کی خوب سے خوب تکمیل کے لیے بنائی جاتی تھیں۔ تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ عیاشی کے لیے اختیار کی جانے والی technological growth نہ صرف سریع بلکہ اہل الحصول بھی ہوتی ہے۔<sup>۱</sup>

کسی بھی نظریے کا تسلط اور شرح ترقی: متضاد راہیں:

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب بھی technological growth کے لیے کوئی ماڈل اختیار کیا جائے گا تو وہ یا تو ideological ہوگا یا a-ideological۔ کسی مذہب یا روایت سے وابستہ فرد، معاشرہ یا گروہ a-ideological نہیں ہو سکتا۔ جوں ہی technological Progress پر کوئی نظریہ [ideology] مسلط [impose] کیا جائے گا شرح ترقی گر جائے گی اور وہ اس ترقی کا مقابلہ نہیں کر سکے گی جو a-ideological ہو۔ چین کی مثال سب کے سامنے ہے آج اس کی ترقی حیران کن اور روز افزوں ہے، لیکن اس کی معیشت کا رخ اشتراکیت کی نہیں سرمایہ داری کی طرف ہے۔ چین کے پورے market structure میں اشتراکیت کہیں نہیں ہے۔

مارکیٹ: سرمائے کا معیاری دائرہ زر سے زر کا حصول: مذہبی اقدار کے منافی رویہ:

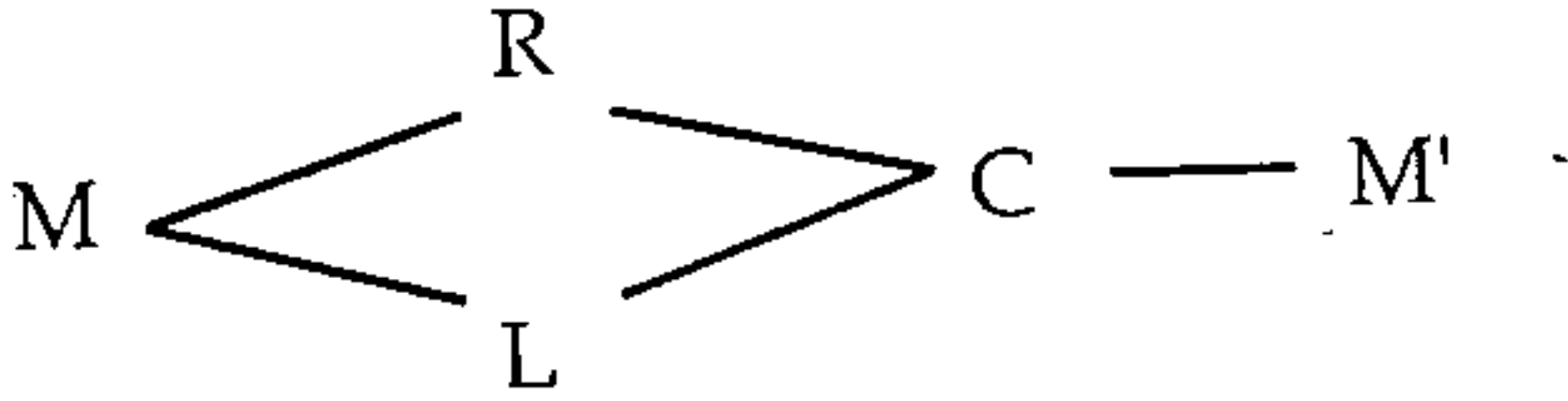
اگر مذہب پر یقین رکھنے والا خصوصاً مسلمان معاشرہ مغرب جیسی تیکنیکی ترقی [technological growth] کے حصول کی کوشش کرے گا تو لازماً اسے اپنی اقدار [values] کو قربان کرنا ہوگا۔ اس کی

۱- عبد الوہاب سوری، ”مسلم معاشرہ اور مغربی تہذیب کا چیلنج: ٹیکنالوجی کی بحث“، مشمولہ ماہ نامہ البرحان، لاہور، اگست ۲۰۱۱ء، صفحات ۲۳-۲۴۔

وجہ مارکیٹ میں سرمائے کا معیاری دائرہ زر سے زر کا حصول اور محنت اور اشیا کا اخراج ہے۔ مارکیٹ کا فارمولا  $M=M'$  ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام سے قبل بازار میں لین دین کا اصول  $C_A M C_B$  تھا۔ یعنی بیوپاری اشیا سے مال کماتا اور پھر اس سے اپنی ضرورت کی اشیا خریدتا ہے اس کو یوں لکھا جاسکتا ہے:

$$C_A [\text{Commodity}] + M [\text{Money}] + C_B [\text{Commodity}]$$

اس کے برعکس مارکیٹ میں لین دین کا اصول ہے:



مارکیٹ میں بیوپاری زر  $[M]$  لے کر آتا ہے اور وہ اس سے خام مال  $[R]$  اور مزدور  $[L]$  خریدتا ہے اور اس مزدوری اور خام مال کے ذریعے ایک شے  $[C]$  بنا کر بیچتا ہے تاکہ مزید زر  $M'$  کماسکے۔  $M$  اور  $M'$  میں جو فرق ہے وہ  $C_A$  اور  $C_B$  میں نوعی فرق ہے۔ مثلاً  $C_A$  کپڑا اور  $C_B$  آٹا ہے۔  $M$  اور  $M'$  میں کوئی نوعی فرق نہیں دونوں زر ہیں۔  $M$  اور  $M'$  میں فرق عددی  $[quantitative]$  ہے۔ مارکیٹ کے بیوپاری کو غرض ہے کہ  $M$  اور  $M'$  کا فرق زیادہ سے زیادہ ہو۔ اس کے کاروبار کے مقصد میں ضرورتوں کا پورا کرنا ضمنی ہے اصل مقصد  $M'$  سرمائے کی زیادہ سے زیادہ بڑھوتری ہے۔  $M$  اور  $M'$  کا فرق بیوپاری کا منافع ہوتا ہے۔ اگر یہ منافع اصولاً مزید نفع کمانے کے لیے استعمال ہو اور باقی تمام ضرورتیں ضمنی ہو جائیں تو یہ منافع سرمائے  $[capital]$  کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ سرمایہ وہ زر ہے جو محض اپنی مقداری بڑھوتری  $[quantitative accumulation]$  پیداواری عمل سے گزرتا ہے۔ سرمائے کی یہ بڑھوتری لامحدود ہوتی ہے۔ اس قدر کے نتیجے میں معاشرہ ایک ایسی معیشت کا داعی ہوتا ہے، جس میں شرکت صرف سرمائے کی بڑھوتری کے لیے کی جاتی ہے۔ اس قدر کا تعین مارکیٹ کرتی ہے۔

بلند معیار زندگی اور جمع سرمایہ: جدید ترقی کے اصول و آدرش:

عصر حاضر میں جتنی بھی technological Progress ہو رہی ہیں اس کا واحد مقصد آزادی  $[freedom]$  کا حصول ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں آزادی کا مطلب سرمائے کی آزادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا گویا سرمائے کے بغیر آزادی کا ہر تصور بے معنی ہے۔ اس لیے ٹیکنالوجی پر مطلق منحصر معاشرہ  $[technological driven world]$  میں قدر مطلق  $[absolute value]$  سرمائے کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ معیار زندگی کی بہتری اور جمع سرمایہ لازم و ملزوم ہیں۔ لہذا اسلام اور technological driven life world کو یکجا کرنا اجتماع نقیضین ہے۔ اس لیے کہ اس کے

۱- تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، ”لبرل ازم کیا ہے؟“، مشمولہ ماہنامہ سناہل، اکتوبر۔ نومبر، ۲۰۱۲ء، صفحات ۳۲-۳۵۔

نتیجے میں پروان چڑھنے والی اقدار [values] سرمایہ دارانہ ہوتی ہیں۔ سرمائے کی بڑھوتری برائے بڑھوتری کو [accumulation of the Capital for the sake of accumulation] قدر کے طور پر قبول کیے بغیر technological Progress ناممکن ہے۔

ہوس اور لالچ کی عمومیت: جدید معاشیات اور مذہب میں جبر و مقابلے کا ناگزیر سبب: یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ معاشی ترقی اور تکنیکی ارتقا کے تمام فعلی محرکات ہوس [Lust]، لالچ [greed]، اور خود غرضی [Self-interestedness] سے عبارت ہیں، جو مذہب خصوصاً اسلام کی بنیادی تعلیمات صبر و شکر، فقر و توکل، غنا و عطا اور جو د و سخا سے براہ راست متصادم ہیں۔ اس لیے مذہب اور معاشیات کے درمیان مقابلہ و کش مکش ناگزیر ہے، ماریہ سبرٹ [Jose Maria Sbert] لکھتی ہیں:

Leniency bordering on approval towards such a sin, which is now perceived as the vertiable phychological engine of material progress.<sup>۱</sup>

وہ مزید لکھتی ہیں کہ یہ بدیہی بات ہے کہ:

Greed and arrogance in individual turn into prosperity and justice for nations and all mankind an invisible hand, a cunning reason that will do him humanity good even its members indulge in evil.<sup>۲</sup>

فکری بنیاد: معاشی و تکنیکی ترقی کا حصول اور انبیا کی آمد و بعثت کا مقصد: بنیادی فرق:

اس پورے تناظر پر غور کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے ذمے لازم ہے کہ وہ وضاحت فرمائیں کہ وہ اسلام اور قرآن و سنت کے سیاق میں جس ”فکری بنیاد“ کی بات فرما رہے ہیں، وہ فکری بنیاد دین پر استوار ہے یا چلتی ہوئی دنیا پر؟ اگر فکری بنیادیں چلتی ہوئی دنیا اور ہر عہد کا زمانہ ہے تو ڈاکٹر صاحب یہ فرمائیں کہ انھوں نے یہ اصول قرآن و سنت کے کس کئیے یا جزیے سے اخذ کیا ہے؟ وہ تاریخ انبیا اور قصص النبیین کی روشنی میں یہ بتائیں کہ حضرات انبیا کی آمد کا مقصد اپنی امتوں کی ”معاشی ترقی“، ”تصوراتی ارتقا“ اور ”تکنیکی ترقی“ کب رہا ہے؟ کیا انبیا کی بعثت کا مقصد اور جہد کا میدان دنیوی ترقیوں، لذتوں، آسائشوں، تمناؤں، آرزوؤں اور خوابوں میں کھوجانے والوں اور ہر لمحہ خوب سے خوب تر دنیا کی تکمیل کے لیے سرگرداں رہنے والوں کو ان کے مقصد و جو د کا احساس دلانے، عہد الست کی یاد دہانی کرانے اور دنیا طلبی کی بجائے آخرت طلبی کی پیاس پیدا کرنے کے سوا اور بھی کچھ رہا ہے؟ انبیائے کرام علیہم السلام کا مقابلہ و معرکہ ہمیشہ بہترین ”معاشی ترقی“، ”تصوراتی ارتقا“ اور ”تکنیکی ترقی“ کے حاملین،

1- José Maria Sbert, "Progress" in *The Development Dictionary: A Guide to Knowledge as Power*, [ed., Wolfgang Sachs], New York: Schocken Books, 1962, p. 196.

2- Ibid.

عاد و ثمود، قوم سبا اور فرعون و نمرود سے رہا ہے، انبیاء ان اقوام جیسی معاشی اور تکنیکی ترقی کا عشرِ عشر بھی حاصل نہ کر سکے، اگر کسی قوم کی معاشی برتری اور تکنیکی ترقی ہی مقصدِ تخلیق اور کامیابی کا اصل اصول ہے تو پھر انبیاء کی ان اقوام کی طرف غرضِ بعثت ہی بے معنی ہے، کیوں کہ مذکورہ بالا تینوں اہداف [معاشی ترقی، تصوراتی ارتقا اور تکنیکی ترقی] وہ اقوام ان انبیاء کی آمد سے قبل ہی بہت احسن طریق پر حاصل کر چکی تھیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد مبارک میں قوم فرعون نے جو معاشی ترقی کی اور اہرام کی سائنس اور ٹیکنالوجی ایجاد کی تھی، بنی اسرائیل کے انبیاء و ملوک اس سے بہتر تو کجا اس جیسی ایک بھی عمارت تعمیر کرنے سے قاصر رہے اور اپنے رہنے اور عبادات کے لیے انھوں نے ایسی عمارتیں بنائیں جنھیں وقت کی ہوانے صفحہ ہستی سے مٹا دیا لیکن ان کا پیغامِ عمرت، سادگی، فقر، زہد، تنگ دستی کے باوجود صبحِ قیامت تک زندہ و تابندہ رہے گا اور اس میں آج بھی اتنی طاقت ہے کہ آج اگر تاریخ کے اوراق میں فرعون کا کبھی نام بھی لیا جاتا ہے تو اس کا سبب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ گرامی ہے۔ اگر موسیٰ علیہ السلام بھی فرعون کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرح ”اسلامی مابعد الطبیعیات“ کے زیر اثر ہی سہی کوئی ٹیکنالوجی ایجاد کرتے تو آج ان کے تکنیکی شاہکار بھی روئے زمین پر موجود ہوتے اور بہ طور معجزات عجائبات عالم میں شمار کیے جاتے۔ لیکن انبیاء کی تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے عاد و ثمود کے خاتمے کے بعد ان کی رہائش گاہوں تک میں قیام پسند نہ کیا، اور نہ ان کے طرزِ تعمیر کو اختیار کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ان معذبین اقوام کے عبرت کدوں سے گزرتے تو صحابہ کرام کو حکم فرماتے کہ ان مقامات سے سرعت اور تیزی کے ساتھ گزر جاؤ۔ اگر انبیاء اپنے مد مقابل تہذیبوں کی طرح معاشی و تکنیکی ترقی اختیار کرتے اور اسے معراج ارتقا پر پہنچا دیتے تو فی الاصل لوگ مقابل تہذیب کے علوم عقلیہ ہی سے متاثر اور مرعوب ہوتے جس کے پس پشت دنیا پرستی اور لذت اندوزی کا فلسفہ کار فرما تھا۔ اللہ کے آخری رسول حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا سے تشریف لے گئے تو آپ کی یادگار کے طور پر دو چیزیں باقی رہیں، ایک خانہ کعبہ جو سیاہ پتھروں کی ایک چار دیواری ہے جس پر غلاف بھی صدیوں بعد چڑھایا گیا اور دوسرا حجرہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، جسے بعد میں روضۃ النبی اور روضۃ من ریاض الجنۃ ہونے کا شرف حاصل ہوا، اس میں اتنی ہی گنجائش ہے کہ اس میں چار قبریں سما سکتی ہیں۔ ان دونوں عمارتوں میں کسی سے ”معاشی ترقی“، ”تصوراتی ارتقا“ اور ”تکنیکی ترقی“ کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ یہ عمارت دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی طرف رجوع کا استعارہ ہیں۔ اگر قرآن کریم میں درج انبیائے کرام کی دعاؤں کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں کوئی ایک دعا بھی ایسی نہیں ملتی جس میں عرض مدعا ”معاشی ترقی“، ”تصوراتی ارتقا“ اور ”تکنیکی ترقی“ کے لیے کیا گیا ہو، ہر دعا آخرت کی ترجیح، جنت کی طلب اور اخروی کامیابی کی درخواست و عرض گزاری سے مملو ملتی ہے۔ اگر اقوام کی بقا اور عروج کا انحصار ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ سنہری اصولِ ثلاثہ پر ہے تو ڈاکٹر صاحب ہمیں بتائیں کہ ہندوستان، اندلس، ترکی اور ایران میں تو مسلمانوں کی حکومتیں نہایت عالی شان معاشی ترقی اور تکنیکی ترقی کے ساتھ قائم ہوئیں، لیکن ہندوستان اور اندلس میں مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے اور اندلس میں تو بالآخر مٹ گئے۔ ان کی سائنس اور ٹیکنالوجی یعنی

تیکنیکی ترقی ان کا تحفظ کیوں نہ کر سکی؟ عباسی سلطنت جو معاشی ترقی کے عروج پر فائز تھی تا تاریخوں جیسی ان پڑھ اور وحشی قوم سے کیوں شکست کھا گئی؟ ترکی اور ایران طاقت ور مسلم حکومتوں کے باوجود دعوت دین کا دائرہ امریکہ، یورپ اور روس تک وسیع نہ کر سکے، آخر کیوں؟

اگر ڈاکٹر صاحب کے پیمانے پر دیکھا جائے تو بنی اسرائیل کے تمام انبیا اور ان کا تمام کام اس عہد کی مقابل طاقتوں اور تہذیبوں کے مقابلے میں شکست و ریخت سے دوچار بلکہ صریح لفظوں میں ناکام رہا اور اصلاً انبیا کی ناکامی میں، نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ کی ناکامی مضمر ہے کیوں کہ خدا تعالیٰ نے جو کام انبیا کے سپرد کیے تھے ان میں ڈاکٹر صاحب کے بیان فرمودہ اصولوں، ”معاشی ترقی“، ”تیکنیکی ترقی“ اور ”تصوراتی ارتقا“، کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

فی الاصل ڈاکٹر صاحب کا مذکورہ اقتباس pragmatism کا مظہر ہے۔ pragmatic ہونے کا مطلب ہے انسان کو کسی ضابطے، اعلیٰ قدر یا اصول کا نہیں بلکہ آسائش، آرام، سہولت اور حصول لذت کے نئے طریقوں کو وضع کرنے اور اس کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنے اور ترجیحات قائم کرنے کا حق ہے، کیوں کہ انسان افادیت پسند ہے۔

قرآن و سنت پر نئے سرے سے نظر ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے گرد متواتر و متواتر، مفہوم و منطوق کا جو حصار اسلاف نے کھینچا ہے، جس کے سائے میں اسلام کی تعبیر و تشریح تکوینی طور پر محفوظ رہی ہے اس کو توڑ دیا جائے۔ گویا قرآن و سنت کی ”اصلاح“ کر کے غالب تہذیب و فکر کے مطابق ڈھال دیا جائے۔

منظور احمد: مغربی افکار کی خوشہ چینی مسلمانوں کی علمی روایت کی فراخ دلی: ایک صریح مغالطہ: قابل غور بات یہ ہے کہ ایک طرف ڈاکٹر منظور احمد مسلمانوں کو کتاب و سنت کی ”خوشہ چینی طریق کار“ کے ترک کا مشورہ دے رہے ہیں، دوسری طرف مغربی افکار و اقدار کی خوشہ چینی، جو جدیدیت پسندوں کا و طیرہ ہے، کی تائید و تحسین فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جہاں تک مغربی افکار سے ”خوشہ چینی“ کا مسئلہ ہے، اس بارے میں مسلمانوں کی علمی روایت بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتی رہی ہے.... اس لیے اگر زمانہ حال کے مسلم مفکرین [ڈاکٹر فضل الرحمن وغیرہ] اپنے نظریات اور آرا کے ارتقا میں مغربی تہذیب اور مغربی فکر کے مرہون منت ہیں تو یہ دلیل کافی نہیں کہ ان کا محرک مغربی تہذیب کا غلبہ یا مسلمانوں کے مذہب کو تبدیل کرنا ہے۔“<sup>۱</sup>

۱- منظور احمد، ”چند توجہ طلب مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۳۶۔

ڈاکٹر صاحب قرآن و سنت کی غیر مشروط اور بلا تاویل خوشہ چینی کو امت کے لیے عیب سمجھتے ہیں اور اسے مسلمانوں کے لیے رکاوٹ، تباہی، شکست، زوال اور کم زوری کا سبب گردانتے ہیں۔ لیکن مغرب کی تقلید اور خوشہ چینی ڈاکٹر صاحب کی نظر میں کوئی عیب نہیں بلکہ فی زمانہ مغرب کی تقلید اور خوشہ چینی ہی امت مسلمہ کے عروج اور کامیابی کی کلید ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ”سابقہ دور عروج“ کو بھی مغرب کی خوشہ چینی ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: ”جہاں تک مغربی افکار سے ”خوشہ چینی“ کا مسئلہ ہے، اس بارے میں مسلمانوں کی علمی روایت بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتی رہی ہے“۔ اول تو یہ بیان ہی غلط ہے، اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کی علمی روایت کے نمائندے کے طور پر ڈاکٹر فضل الرحمن کے نام اور کام کو پیش کیا ہے، ڈاکٹر فضل الرحمن کے ”اجتہادات“ کو مسلمانوں کی علمی روایت کی فراخ دلی سے تعبیر کرنا ایک تاریخی مذاق ہے۔ مسلمانوں کی مجموعی علمی روایت نے مغرب کے تیس ڈاکٹر فضل الرحمن کی خوشہ چینی کو فراخ دلی سے کبھی قبول نہیں کیا بلکہ پوری حمیت اور شدت کے ساتھ رد کر دیا ہے۔ بالفرض اگر ڈاکٹر صاحب کا یہ مفروضہ درست بھی ہو تو سوال یہ ہے کہ مسلمان اگر اپنی تاریخ و تہذیب سے خوشہ چینی کرے تو وہ نادان اور زمانے کی ضرورتوں سے ناواقف ہے اور اگر مغربی افکار و اقدار کی خوشہ چینی کرے تو یہ اس کی عظمت ہے۔ اس اقتباس میں ڈاکٹر صاحب نے نہایت سادگی اور وضاحت سے اپنے منہاج و مقام کا خود ہی تعین فرما دیا ہے کہ وہ خود کس کی ”خوشہ چینی“ کو پسند فرماتے ہیں۔ اگر مغرب اس قدر افضل، اعلیٰ اور اہم ہے کہ کتاب و سنت کے بالمقابل اس کی ”خوشہ چینی“ کرنی چاہیے تو ڈاکٹر صاحب کو علی الاعلان کہہ دینا چاہیے کہ قرآن و سنت اور تاریخ امت اس قابل نہیں کہ مسلمان اکیسویں صدی میں اس سے ”خوشہ چینی“ کا سوچ بھی سکیں۔ ادھر ادھر کی منطق اور فلسفیانہ پیرایہ تحریر میں بات کو الجھانے کے بجائے صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ اگر دنیوی ترقی اور مادی آسائشیں مطلوب ہیں تو ہمیں اپنے علمی سرچشموں [قرآن، سنت اور اجماع] سے اپنی جان چھڑانی ہوگی اس لیے کہ کامیابی، نشاط اور نجات کا پہلا اور آخری سرچشمہ مغرب ہے لہذا اسی کی ”خوشہ چینی“ میں کامیابی ہے۔

اوپر کے پیرا گراف میں ڈاکٹر صاحب نے جو لکھا ہے کہ ”آج کل کے حالات کے مطابق احکام و قوانین بنائے جائیں“۔ کیا آج کل کے حالات قیامت تک تبدیل نہ ہوں گے؟ ظاہر ہے عملاً ایسا ممکن ہی نہیں۔ خود مغرب میں منشور انسانی حقوق کے نفاذ کے بعد گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں احکام و قوانین مسلسل تبدیلی اور ارتقا کا شکار رہے ہیں، اسی طرح اگلی صدیوں میں تغیر اور ارتقا کا سفر جاری رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق مغربی افکار و اقدار کی طرح دین اور شریعت بھی حتمی اور قطعی نہیں ہوتے بلکہ وقت، حالات اور زمانے کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں لہذا ہر نئے زمانے اور نئے حالات میں ان ہی کے مطابق شرعی احکام و قوانین میں تغیر اور تبدیلی ناگزیر ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کے اس بیان اور اس کے نتیجے کو مان لیا جائے تو پھر اصل اصول اور منہاج زمانہ اور اس کے حالات قرار پاتے ہیں، زمانہ ہی قانون اور اقدار کا سرچشمہ ہے۔ بدلتا ہوا زمانہ جو کچھ بتاتا جائے قرآن و سنت اس کے مطابق خود کو بدلتے چلے جائیں۔



جدیدیت پسندوں کا طریقہ: مغرب پر ایمان اور اس کی اسلام سازی:

جدیدیت پسندوں کا طریقہ واردات یہی ہے کہ وہ مغرب سے مرعوب ہو کر پہلے اُس کے کسی مفروضے پر ”ایمان“ لے آتے ہیں، پھر اسلامی اصولوں کی تاویل کر کے اُسے مغرب کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جدیدیت پسند خود اپنے علم و تحقیق اور وجدان کی آواز پر کوئی قدم نہیں اٹھاتے اُن کے سارے اقدام خارجی سہارے کے محتاج ہیں اور وہ سہارا مغرب ہے۔ یہ حضرات پہلے نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور دلیل بعد میں پیدا کرتے ہیں۔ کہیں سے کوئی حوالہ ڈھونڈتے ہیں جو مسلمہ اسلامی فکر سے اُن کے لیے مفید مطلب ہو، اگر حوالہ نہ مل سکے تو کسی بھی حوالے میں تحریف کر کے اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ مغربی افکار و اقدار کی خوشہ چینی کرنے والوں نے علوم و افکار کے کون سے دریا بہا دیے؟ جو کچھ جدیدیت پسند اب تک اپنی ”تحقیقات“ کے نام پر پیش کرتے رہے ہیں ان کی حیثیت مغربی مفکرین کے اگلے ہوئے نوالوں کی جگالی اور مغربی افکار کے ناقص چربے سے زیادہ کچھ نہیں! آخر آزادی [Freedom]، مساوات [Equality]، انسانی حقوق [Human Rights]، لبرل ازم [Liberalism]، سوشل ازم [Socialism]، تجربیت [Empiricism]، عقلیت [Rationalism]، سائنس [Science]، ملٹی کلچرل ازم [Multiculturalism]، نیشنل ازم [Nationalism]، اسلامی جمہوریت [Islamic Democracy]، اسلامی معاشیات اور سول سوسائٹی [Civil Society] غرض کون سا ایسا تصور ہے جو مغرب سے در آمد نہیں کیا گیا۔

مغرب اور اسلام دو متضاد مقصدیت سے پھوٹنے والی علمیات کے داعی:

اگر یہی معیار علم اور زینہ ترقی ہے اور مغرب اسلام کو جانے اور کلام اللہ کو پڑھے بغیر اس کے حصول میں کامیاب ہو گیا تو اب دنیا کو اسلام اور قرآن کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اسلامی علمیات کو مغربی تناظر میں سمجھنے اور پہچاننے کے طریق تحقیق کا مطلب یہ ہے کہ اسلام بہ ذات خود کوئی نظام نہیں محض ایک روئیہ ہے جس کا اظہار دوسرے نظام حیات میں بہ طور ایک شاخسانہ ممکن ہے۔ مغرب کی خوشہ چینی سے مسلمانوں میں عقائد و اعمال اور تہذیب و تمدن دونوں سطحوں پر فساد ناگزیر ہے۔ کیوں کہ ہر منہاج علم کے اپنے اصول و مبادی ہوتے ہیں جس میں موجود عقلیت اُس کی مابعد الطبیعیات سے پھوٹی ہے اور اُس میں موجود تصور خیر و شر کے تحت کام کرتی ہے لہذا کوئی عقلیت اپنے ہی مابعد الطبیعی تناظر میں درست معلوم ہوتی ہے اور دوسرے میں لغو اور مہمل۔ جدیدیت اور اسلام دو الگ الگ مقصدیت سے پھوٹنے والے سوتے ہیں جو ایک دوسرے سے اصلاً متضاد اور متغائر ہیں، اس تضاد اور غیریت کی کم از کم معنویت یہ ہے کہ ایک کے بنیادی تصورات اور تشکیل و تدریج میں دوسرے کا عمل دخل ناممکن ہے۔

مسلم تہذیب کا اختصاص: علوم کی اساس توحید ہے:

مسلم تہذیب کا آغاز اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ [پڑھا اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا] سے ہوا ہے، مسلمانوں نے علوم کو رب کے نام سے پڑھا ہے سو اس تہذیب میں علوم کی مقصدیت تقدیس و بندگی رب ہے۔

جدیدیت: وحی کی اساس پر پروان چڑھنے والی تہذیبیں قرن مظلمہ کی یادگار:

جدیدیت ”عقل“ کی خدائی اور مذہب سے بغاوت کا نام ہے۔ اسی لیے مغرب میں سترہویں صدی یعنی نشاۃ ثانیہ [Renaissance] اور روشن خیالی [Enlightenment] سے پہلے کے دور کو قرن مظلمہ [Dark Age] کہا جاتا ہے کیوں کہ اب تک علمیت [Epistemology] مذہب، یعنی عیسائیت، سے آرہی تھی، جس کا دعویٰ تھا کہ انسان سچائی تخلیق نہیں کر سکتا صرف وحی کے ذریعے دریافت کر سکتا ہے، انکار وحی کی صورت میں سچائی تک رسائی ممکن نہیں۔ جدیدیت نے یہ دعویٰ کیا کہ سابقہ تمام وہ ادوار جس میں علمیت روایت [Tradition]، تاریخ [History]، اساطیر [Mythology]، یا وحی [Revelation] سے آرہی تھی وہ سب دور اندھیرے کی تخلیق تھے۔ تنویر [Enlightenment] وہ دور ہے جس میں انسان ماضی کے اندھیرے سے روشنی کے دور میں داخل ہوا۔ سترہویں صدی سے پہلے تاریخ میں کوئی تہذیب ایسی نہیں گزری جو ناقص ترین صورت ہی میں سہی عبدیت کا تصور اور مافوق الفطرت ہستی پر یقین نہ رکھتی ہو۔ جو آخرت، حیات بعد الموت، خارجی ذرائع علم، ملائکہ یا روحانیت کا صراحتاً اور سراسر انکار کرتی ہو، صرف اور صرف خواہش نفس کی پرستش، شکم اور شہوت کی پوجا اور سرمایہ کمانے کو انسان کا واحد اور آخری مقصد سمجھتی ہو، عبدیت کو رد کر کے الوہیت انسان کی قائل ہو۔

جدیدیت: ماضی کے انکار اور مستقبل سے انسلاک کی داعی: ایک مستقل مابعد الطبیعیات:

سترہویں صدی میں ایک نئے انسان، تاریخ اور تہذیب نے جنم لیا، جو ایک الگ طرز زندگی اور علیحدہ فلسفہ حیات کا نام ہے، اس کا بنیادی وصف ماضی کا انکار اور مستقبل سے رابطہ ہے۔ جدیدیت تاریخ کا انکار کر کے ایک مستقل تاریخ کی تخلیق کی داعی ہے، جو ایک نئی مابعد الطبیعیات کے ساتھ ظہور کرتی ہے۔ ہیر ماس [Jürgen Habermas, b.1929] کے الفاظ میں:

It has to create its own normativity out of itself. ۱

جدیدیت کی فکری اساس: انسان خود خدا ہے:

جدیدیت نے انسان، حیات اور کائنات کا پورا تصور ”خدا مرکزی“ سے موڑ کر ”انسان مرکزی“ کی طرف پھیر کر خود انسان کو خدائی کے منصب پر لا بٹھایا، سارتر نے اس بات کو بہت ہی جرأت

1- Jürgen Habermas, *The Philosophical Discourse of Modernity*, Cambridge: Cambridge University Press, 1987, p.7.

کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان کو آزاد کرایا جائے، اسے قادر مطلق سمجھا جائے، ہم نے خدا کے وجود سے انکار کر دیا ہے تاکہ انسان خود انسان کے لیے وجود مطلق بن جائے۔<sup>۱</sup>  
سچائی تک رسائی کا حتمی و آخری ذریعہ خود انسان کے پاس ایسے ذرائع [facilities] کی صورت میں موجود ہے، جن کے ذریعے سچائی کو جانا جاسکتا ہے جیسے عقل، حواس، تجربات اور مشاہدات وغیرہ۔ انسان کو کسی خارجی ذریعہ علم [revealed text] کی احتیاج نہیں:

One of the most prominent and lasting achievements of modernism in all its manifestations is the devaluation of the premise that we occupy an 'objective' reality, accessible to but independent of human perception.<sup>۲</sup>

آزادی اور عقل: جدیدیت پر ایمان کے دو لازم ارکان:

خود ڈاکٹر منظور احمد صاحب کو اس بات کا اقرار ہے کہ جدیدیت جس کو اس سے قبل ”روشن خیالی“ کہتے تھے، ایک ایسا طرز فکر ہے جس کی بنیاد عقل پر ہے اور وہ آزادی، مساوات اور حقوق انسانی جیسے تصورات پر معاشرے کی نقش بندی کرتا ہے۔<sup>۳</sup> یعنی جدیدیت میں دو قدروں پر ایمان لانا ضروری ہے: آزادی اور عقل — آزادی [Freedom]، یعنی انسان قائم بالذات [Self Determined] اور فاعل خود مختار [Autonomous] ہے اور اپنے خیر و شر کے پیمانے خود متعین کر سکتا ہے:

To be autonomous is to be free in the sense of 'self-governing' and 'independent'.<sup>۴</sup>

بالفاظ دیگر آزادی انسان کی عبدیت کا رد اور اس کی الوہیت کا اقرار ہے، اور یہ مرتبہ، الوہیت اسے محض اس لیے حاصل ہے کہ اس کے پاس عقل ہے، آزادی [Freedom] کا حصول عقل کے آزادانہ استعمال پر منحصر ہے، اور عقل کا کام ہی یہ ہے کہ وہ آدمی کو آزادی کی ہر راہ بچھائے، ڈاکٹر منظور احمد لکھتے ہیں: ”عقل کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کے ذاتی مفادات کا تخمینہ لگائے اور انسانی خواہشات اور ضروریات کو ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے طویل سے طویل عرصے کے لیے پورا کرے، اطلاقی علوم اور ٹیکنالوجی وہ ذرائع ہیں، جن سے یہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔“<sup>۵</sup>

۱- تفصیل کے لیے دیکھیے:

نلی عباس جلال پوری، روایات فلسفہ، لاہور: تخلیقات، ۲۰۱۰ء۔

2- Thomas Vargish, "Modernism" in *Routledge Encyclopedia of Philosophy*, [ed., Edward Craig], London and New York: Routledge, 1998, p. 5572.

۳- منظور احمد، ”چند تعلیمی مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۶۹۔

4- Routledge [Firm], *Concise Routledge Encyclopedia of Philosophy*, Oxford: Taylor & Francis Routledge, 2000, p.295.

۵- منظور احمد، ”چند تعلیمی مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحات ۱۷۱-۱۷۲۔

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۴۳

خدا کی موت: آزادی پر ایمان اور عقل کے آزادانہ استعمال کا منطقی نتیجہ:

اس فکر نے ابتداً مابعد الطبعی حقائق کو عقل کے ذریعے جاننے کا اعلان کیا، رفتہ رفتہ مابعد الطبعی سوالات کا انکار اور بالآخر خدا کے وجود سے منحرف ہو کر الوہیت انسانی [Humanism] کا مذہب ایجاد کیا۔ اس لیے جدیدیت اپنے جوہر میں مذہب مخالف [anti-religion] ہے۔ جدیدیت کی قبولیت و نفوذ کی بات اسلام کے تصور بندگی سے دست بردار ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ جدیدیت محض ایک منفی تحریک نہیں ہے، بلکہ ایک مستقل عقیدے کی داعی ہے، جس کا اظہار نطشے [Nietzsche 1844-1900] نے ”خدا کی موت“ کا اعلان کر کے کیا تھا۔ رابرٹ پپن لکھتا ہے:

The great nineteenth and early twentieth century experience of the "Death of God" ... led either to a sense of absence ..... or a new individual of man and human power.!

جدیدیت کا نفاذ اور مذہب کی شکست: لازم و ملزوم:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مغرب میں مذہب کو شکست جدیدیت نے دی ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کی خواہش ہے کہ ترقی [Progress] کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے جدیدیت کی روایت مسلمانوں میں پروان چڑھنی چاہیے۔ لکھتے ہیں:

”اس میں شک نہیں کہ جدیدیت کی اس فلسفیانہ اور علمی روایت نے غیر ضروری طور پر فلسفے کے زیر اثر، عیسائیت کی بنیاد منطقی استدلال پر رکھی تھی۔ وہ استدلال پائے چوبیس ثابت ہوا اور جدیدیت کے علم کی جدت سے راکھ ہو کر گر پڑا اور اپنے ساتھ بڑی حد تک عقیدے کو بھی جلا ڈالا۔ مسلمانوں میں ابھی تک جدیدیت کی روایت نے سرایت نہیں کیا ہے، اس لیے اس استدلال کا پائے چوبیس کسی قدر خستگی کے ساتھ ابھی تک قائم ہے لیکن وہ جدید علم سے بے بہرہ رہ کر ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب کے مطابق عالم اسلام ترقی صرف اس لیے نہیں کر سکا کیوں کہ وہ ابھی تک قرآن و سنت کے سرچشموں سے عقائد اور احکام اخذ کرنے میں الجھا ہوا ہے۔ اس دعوے کے پیش نظر مقدمہ یہ طے پایا کہ دین و مذہب اور عقائد و اعمال اور اخلاقیات کا حاصل ”ترقی“ [Progress] ہے۔ اگر یہ

1- Robert B. Pippin, *Modernism as a Philosophical Problem: On the Dissatisfaction of European High Culture*, Chicago: Chicago University Press Chicago, 1999, p.2.

۲- منظور احمد، ”چند تعلیمی مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحات ۱۷۹-۱۸۰۔

تمام چیزیں ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوں تو ان سب کو ترک یا ساقط کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ ڈاکٹر منظور احمد نے یہ اصول وضع فرمایا ہے کہ: ”[قرآن و سنت] کو عمومی ہدایت کا سرچشمہ نہ سمجھا جائے بلکہ ہدایت کا خاص منبع سمجھ کر عموم کو اخذ کیا جائے“۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق چونکہ مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا اس لیے وہ جدید علم سے بے بہرہ ہو کر ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔

قرآن و سنت اور دنیوی ترقی: بعد المشرقین:

اس اصول کے تحت جب قرآن و سنت کو ہدایت کا خاص منبع جان کر عموم اخذ کرنے کے لیے تحقیق اور جستجو کی جاتی ہے تو پورے قرآن مجید، ذخیرہ احادیث، اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور زندگی صحابہ و اہل بیت میں سے کسی ایک کا مقصود بھی ڈاکٹر منظور احمد کی مزعومہ ”ترقی“ قرار نہیں پاتا۔ ڈاکٹر صاحب قرآن و سنت کے سرچشموں سے ہماری رہنمائی فرمائیں کہ روئے زمین پر حضرات انبیاء علیہم السلام کی آمد کا مقصد ”ترقی“ کب رہا ہے؟ قرآن مجید تو مقصد حیات کو صرف عبادت رب کے ساتھ مشروط کرتا ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ [۵۱:۵۶] ”میں نے جنوں اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں“۔

جدید طرز زندگی: اثرات و مضمرات:

کیا بندگی کے مفہوم میں یہ بات داخل نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے نظام حیات اور طرز زندگی کے اختیار کرنے سے بھی ابا کرتی ہے جس سے بندگی رب میں خلل پڑے؟ اوقات عبادت انسان کے لیے کم سے کم تر ہوتے چلے جائیں، حتیٰ کہ ترقی کی دوڑ میں شامل ہونے کے بعد کسی شخص کے لیے اپنی ازواج و اولاد کو بھی مناسب وقت اور نگہداشت کے لمحات میسر نہ آسکیں، وہ اپنے سارے اوقات و لمحات مارکیٹ کی نظر کر کے ترقی اور تعیشات حاصل کرنے میں لگا رہے۔ ”ترقی“ اور معیار زندگی کو بلند کرنے کی خاطر ایک برا عظیم سے دوسرے برا عظیم میں نقل مکانی نے معاش کے لیے نئے اور وسیع ذرائع تو بلاشبہ مہیا کر دیے ہیں، لیکن کس قیمت پر؟ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ چھ ماہ سے زیادہ کسی مجاہد کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، تاکہ وہ واپس لوٹ کر اپنی ازواج کے حقوق اور عیال کی ذمے داریاں پوری کر سکے۔ جب مرد اور عورت گھر اور خاندان کو چھوڑ کر معیار زندگی بلند کرنے کی خاطر چلے جاتے ہیں تو معاشرت کا کیا حشر ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب نے اس پر غور فرمایا ہے؟ وہ مسلمان جنہیں ”ترقی“ کے وسیع ذرائع میسر ہیں، وہ موجود ذرائع پر قانع کیوں نہیں رہتے؟ اس ترقی کی کیا قیمت ان کا خاندان، روایات، اقدار اور دین ادا کر رہا ہے؟ جو لوگ معاشی طور پر آسودہ حال ہیں ان کی اکثریت دین پر عامل کیوں نہیں ہے؟ ان کے اوقات و لمحات میں خدا، رسول، آخرت، قبر اور قیامت وغیرہ پر غور و فکر کی ضرورت کیوں نہیں رہتی؟ ظاہر ہے ان کا تمام وقت مارکیٹ کی نذر ہو گیا ہے۔ یہ تبدیلی مثبت ہے یا منفی کیا ڈاکٹر صاحب نے سوچا ہے؟ ایسا کام، کاروبار، مصروفیات اور تعیش کی

خاطر ایسے طرز زندگی کی جستجو جو ایک مسلمان کو اس کے بنائے حیات سے غافل کر دے ایسا نفس اور طرز زندگی دین کو مطلوب ہے؟ یا اس نفس کی تطہیر و تزکیہ اور اس نظام کا انہدام دین کو مطلوب ہے؟ اگر کسی فرد یا گروہ کی عظمت، عروج اور کامیابی کا پیمانہ صرف مادی ترقی، تعیشات اور نعمات و لذائذ دنیا کی کثرت اور فراوانی پر منحصر ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیٹ پر پتھر نہ باندھتے، ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو بھوکا نہ رہنا پڑتا، غزوہ تبوک کے موقع پر بہت سے صحابہ ساز و سامان نہ ہونے کے باعث واپس نہ کیے جاتے، سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں قحط نہ پڑتا۔

قرآن: انبیاء کی زندگی فقر و تنگی کا استعارہ:

قرآن و سنت کے ذخیرے کی مجموعی روح کو سامنے رکھ کر یہ بات ذمے داری سے عرض کی جا رہی ہے کہ بے سرو سامانی اور فقر و تنگی ازل سے انبیاء کرام علیہم السلام کا بالعموم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بالخصوص خاصہ رہی ہے، حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ان کی قوم نے کہا: اَنْتُمْ مِنْ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْضُ ذُلُوْنَ [۱۱۱:۲۶] ”کیا ہم تم پر ایمان لائیں حالانکہ ذلیل لوگ تمہاری پیروی کرتے ہیں۔“ حضرت نوح علیہ السلام نے بارگاہ الہی میں عجز کے ساتھ اپنے ضعف کی شکایت کی: اِنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ [۱۰:۵۳] ”میں شکست کھا رہا ہوں میری مدد کر۔“ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةٌ اَوْ اِوْیَ اِلَیْ رُكْنٍ شَدِيْدٍ [۸۰:۱۱] ”کاش تمہارے مقابلے کی مجھے طاقت ہوتی یا کسی مضبوط چیز کا سہارا لیتا۔“ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کا مذاق و استہزاء ان کی فقر و تنگی اور اپنی مال داری کی بنیاد پر اڑایا تھا: وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یَقَوْمِ اَلِیْسَ لِیْ مُلْكٌ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ

۱- اس مقدمے سے ہرگز یہ باور کرانا مقصود نہیں کہ اسلام فقر اور افلاس کا داعی اور مناد ہے۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ اسلام حصول دولت کو نظام زندگی میں بنیادی قدر کے طور پر اختیار کرنے کا حامی نہیں ہے۔ اسلام کا تصور فقر مغربی تصور غربت سے یک سر مختلف ہے۔ اسلامی تعلیمات میں اگر کسی شخص کے پاس دولت و ثروت نہیں ہے تو یہ فقر اس کے لیے موجب ہلاکت اور باعث ندامت نہیں ہے، کئی احادیث و آثار میں فقر کے فضائل اور اس کے باعث حاصل ہونے والے درجات بیان کیے گئے ہیں۔ فقیر کی یہ فضیلت و عظمت اس لیے بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے مسائل کے حل کے لیے اسباب کے بجائے مسبب الاسباب کی طرف رجوع کرتا ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ فقر کی حقیقت یوں بیان فرماتے ہیں:

وحقیقة الفقر ان لا تفتقر علی من هو مثلك.

”فقر کی حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہی جیسی ہستی [یعنی کسی دوسرے انسان] کا محتاج نہ رہ۔“

عبدالقادر الجیلانی، فتوح الغیب، مصر: مطبعة مصطفیٰ البابی الحلبي واولادہ، ۱۳۹۲ھ، المقالة الخامسة والسبعون فی تصوف وعلی ای شیء مینا، صفحہ ۱۶۶۔

یہی سبب ہے کہ فقیر مال کے آنے پر شکر کرتا ہے، لیکن مال نہ ملنے پر شکوہ کناں نہیں ہوتا۔ دولت کے حصول کے بعد بھی ایک مسلمان کو نفس مطمئنہ حاصل رہتا ہے۔ لیکن چونکہ ہر شخص کی ایمانی سطح یکساں نہیں ہوتی اسی لیے بعض احادیث و آثار میں فقر سے پناہ مانگنے کی بھی تلقین وارد ہوئی ہے۔ اور پناہ مانگنے کے باوجود اگر کسی کو فقر عطا ہوتا ہے تو پھر اس پر راضی بہ رضار ہونا ایک مستقل درجہ فضیلت ہے۔

تَجْرِي مِنْ تَحْتِي أَفَلَا تُبْصِرُونَ . أَمْ أَنَا خَيْرٌ مِمَّنْ هَذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ وَلَا يَكَادُ يُبِينُ . فَلَوْلَا أَلْقَى عَلَيْهِ آسُورَةٌ مِمَّنْ ذَهَبٍ أَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلَائِكَةُ مُقْتَرِنِينَ [۵۱:۲۳-۵۳] ”اور فرعون نے اپنی قوم میں اعلان کیا اور کہا کہ اے قوم! کیا میرے پاس مصر کی سلطنت نہیں؟ اور یہ نہریں میرے قدموں کے نیچے نہیں بہ رہی ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟ کیا میں اس سے بہتر نہیں ہوں جو ذلیل ہے اور بولنے پر بھی قادر نہیں، اور اگر وہ سچا ہے تو اس کے پاس سونے کے کنگن کیوں نہیں آئے یا اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آئے“ — کیا آج کے دنیا دار لوگ علما اور اہل دین کے لیے اسی طرح کے ”فرعونی الفاظ“ استعمال نہیں کرتے؟ اسی طرز کے اعتراضات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیے گئے جن میں مال کی تنگی اور اسباب کی قلت کا تمسخر اڑایا گیا تھا، قرآن نے آپ کے سینہ مبارک کی تنگی کی وجہ مشرکین کے ان ہی اعتراضات کو قرار دیا ہے: وَصَافِقْ بِهِ صَدْرَكَ أَنْ يَقُولُوا لَوْلَا أَنْزَلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ إِنَّمَا أَنْتَ نَذِيرٌ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ [۱۲:۱۱] ”اور اس سے آپ کا دل تنگ ہے صرف ان کی اس بات پر کہ اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اترتا؟ یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ ہی آتا، سن لیجئے! آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر چیز کا ذمے دار اللہ تعالیٰ ہے“۔

انبیا کی مد مقابل تہذیبیں: ترقی اور آسائش سے مملو:

انبیا کی مد مقابل ہر تہذیب کو اپنی سائنس اور ٹیکنالوجی، معیارات زندگی اور طرز حیات کے مثالی اور خوش حال ہونے پر فخر ہوتا ہے، وہ جب انبیا کی زندگیوں میں فقر دیکھتے ہیں تو لرزہ براندام ہو جاتے ہیں، وہ دنیا پرستی سے ماورا نہیں ہونا چاہتے — یہی حال جدیدیت پسندوں کا ہے، اس لیے وہ مختلف تاویلوں اور تحریفوں سے تسخیر کائنات اور تمتع فی الارض کو انسان کا مقصد تخلیق قرار دیتے ہیں۔ اگر قرآن مجید کے ترجمے پر ہی نظر ڈال لی جائے تو واضح ہو جائے گا کہ انسان کو مال میں اضافہ، ترقی پر ترقی اور لذات دنیا میں انہماک کے لیے نہیں، بندگی رب کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ورنہ ڈاکٹر منظور احمد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس جانب رہ نہائی فرمائیں کہ حضرات انبیاء نے اپنی امتوں کو تسخیر کائنات کی دعوت کب دی ہے؟ انبیا کی یہ دعوت کون سے ”صحیفہ آسمانی“ میں مرقوم ہے کہ خداوند تعالیٰ نے مجھے تمھاری ”معاشی ترقی“ ”تصوراتی ارتقا“ اور ”تکنیکی ترقی“ کے لیے مبعوث کیا ہے؟

قرآن: دنیوی ترقی بہ طور قدر مقاصد خلافت میں شامل نہیں:

قرآنی اصولوں پر ریاست کا قیام اسلام کے اہم ترین مقاصد میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو امانت الہی انسان کو سونپی ہے اس کا مقصد خلافت ارضی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ مشروط فرما دیا ہے: وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ

ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ [۵۵:۲۴] اور جب اللہ تعالیٰ تمکین اور غلبہ عطا فرمادیں تو پھر قرآن کے مطابق مقاصد خلافت چار امور کے حصول میں دائر ہوں گے: [۱] اقامت الصلوٰۃ، [۲] ایتائے زکوٰۃ، [۳] امر بالمعروف اور [۴] نہی عن المنکر: الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ المُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ [۲۴:۲۴] — اب امت مسلمہ میں ”ترقی“ کا دار و مدار اس آدرش کے حصول کی جدوجہد پر ہوگا اور زوال امت کا کلیدی سبب اس مقصد سے غفلت یا انحراف کو قرار دیا جائے گا۔

اسلام اور مغرب: دو الگ الگ تصورات خیر کے داعی:

ہر تہذیب کا ایک ”الخیر“ [the good] ہوتا ہے۔ تمام خیر اسی سرچشمے سے پھوٹتے ہیں۔ مغرب کا ”الخیر“ آزادی [freedom] ہے۔ مذہب میں ”الخیر“ بندگی اور عبدیت ہے جس کے ذریعے معرفت رب کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ کامیاب وہ ہے جو تقویٰ میں سبقت لے جائے اور ناکام وہ ہے جو دنیا کے نعائم و لذائذ، شان و شوکت، ترقی و برتری اور جاہ و حشم کے باوجود معرفت الہی سے بے بہرہ اور آخرت کی تیاری میں پیچھے رہ جائے۔

دنیا کی محبت اور دینی مآخذ اور دینی نمائندوں کی تحقیر: ترقی کا لازمہ:

ڈاکٹر صاحب خود بیان فرما رہے ہیں کہ جدیدیت نے عیسائیت کو فنا کر دیا۔ اگرچہ اس کا جو سبب بیان کیا گیا ہے وہ یک رخا ہے۔ تو پھر وہ ترقی کے حصول کے لیے جدیدیت کی روایت کو مسلمانوں میں پروان چڑھانے کے لیے کیوں کوشاں ہیں؟ جس کے نتیجے میں دین و مذہب کی بساط ہی الٹ جائے گی۔ جدیدیت نے ترقی کے نام پر لذات و خواہشات کے حصول کا ایسا پرکشش نظام کھڑا کر دیا ہے جس سے ہم آہنگ ہونے کے لیے احکام حق سے بے وفائی ناگزیر ہے۔ یہاں ذہن کی تمام صلاحیتوں اور عمل کی ساری قوتوں کا ہدف بس ایک ہے: دنیا۔ جو چیز اس مقصد کے حصول میں مدد و معاون ہو وہ لائق قبول ہے ورنہ: اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں، مذہب بھی لائق قبول ہے مگر اسی وقت تک جب تک وہ اپنے جاے سے پاؤں باہر نہ نکالے اور اپنی تمام تر سرگرمیوں کا دائرہ محض مذہبی رسومات تک محدود رکھے اور وہ بھی رضا کارانہ طور پر۔ چوں کہ سنت سے مسلمانوں کا ظاہر و باطن متعین ہوتا ہے، فقہ کی قانونیت اور تصوف کی تزکیہ نفس کے لیے محنت، دنیا سے تمتع کی حدود کو متعین کرنے والی اقدار ہونے کے باعث ”آزادی“ اور عقل پرستی کی راہ میں سنگ گراں ہیں اس لیے سب سے پہلی ضرب سنت پر لگائی گئی کہ یہ عجمی سازش ہے، فقہ کو ”جمود“ کا نام اور تصوف پر ”زہبانیت“ کا الزام لگا دیا گیا، اور چوں کہ دینی اقدار و روایات کی حفاظت اور انحراف کے اس سارے عمل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ علما ہیں اس لیے جدیدیت پسندوں کی نظر میں سب سے زیادہ موجب ملامت اور نشانہ تحقیر یہی ہیں۔

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۴۸



ترقی یافتہ اقوام: ترقی کے لیے مذہب، تہذیب اور اخلاق سے مکمل دست برداری:  
یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دنیا طلبی کے افق سے طلوع ہونے والی ترقی اور مسلمانی ایک جانہیں  
ہو سکتی۔ منظور احمد مغرب کی ترقی یافتہ اور مشرق کی ترقی پذیر اقوام کے آثار و نشانات یہاں ڈھونڈ رہے  
ہیں، روئے زمین پر ہماری مطلوبہ ترقی کی حامل کوئی ایک قوم بھی ایسی موجود نہیں جو ترقی کے منہجائے  
مقصود تک اپنے دین، دینی طرز احساس سے پیدا ہونے والی تہذیب اور اس کی بنیاد پر پروان چڑھنے  
والے معاشرے اور سماج سے مکمل دست بردار ہوئے بغیر نہ پہنچی ہو۔ ایسے پرویز منظور لکھتے ہیں:

A Fetish on Trial Like all Promethean myths, the myth of progress has its sequel in human suffering. Dethroning providence and faith by progress and profanity, man on his own has known neither joy nor freedom. The enlightenment's offspring, 'a rational humanity liberated from the superstition of religion', has given us the nightmare, of apartheid, the gas chambers, and the Bomb. Science, the greatest creation of the rational mind, has turned out to be a spectre of doom, posing the greatest threat to our natural environment and our human existence. If there's been any progress since Western man rebelled against God and deified himself in 'the age of enlightenment', it has been in the spheres of human suffering, greed and oppression. ۱

لا دینی: ہر تہذیب میں ترقی کی قدر مشترک:

ترقی یافتہ اقوام نے ترقی کی ہر راہ متعین کر دی ہے۔ اب حصول ترقی کی کسی ایسی ڈگر کی دریافت  
محال ہے جس میں بہ یک آن ترقی کا حصول بھی ممکن ہو اور اسلام کے تصور کائنات و مابعد الطبیعیات سے زندہ  
و محسوس حالت میں رشتہ بھی استوار رہے۔ ان تمام اقوام میں، خواہ ترقی یافتہ ہوں یا ترقی پذیر، ایک قدر  
مشترک ہے: لا دینی — سو اس ترقی کے لیے ترقی کے بُت پر مذہب و تہذیب کو بلی دینا ہوگا۔ مغرب یہ  
طے کر چکا ہے کہ جب تک مسلمان مغربی تہذیب کی بنیادوں کو اختیار نہیں کریں گے اُس وقت تک سائنسی  
ترقی اور معاشی خوش حالی کا امکان محال ہے، مغربی مفکرین نے اس کا اظہار بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کر دیا ہے:

Only when Muslims explicitly accept the western model will they be in a position to technicalize and then to develop. ۲

1- Afkar Inquiry, Vol. 5, Issues 1-5, Tropvale Limited, 1988, p. 42.

2- Samuel P. Huntington, The Clash of Civilizations and the Remarking of World Order, Penguin Books, 1997, p. 74.

اور مشہور مفکر Ayres لکھتا ہے:

Since the technological revolution is itself irresistible, the arbitrary authority and irrational values of pre-scientific, pre-industrial cultures are doomed. Three alternatives confront the partisans of tribal values and beliefs. Resistance, if sufficiently effective, though it cannot save the tribal values, can bring on total revolution. Or ineffective resistance may lead to sequestration like that of American Indians. The only remaining alternative is that of intelligent, voluntary acceptance of the industrial way of life and values that go with it.

We need make no apology for recommending such a course. Industrial society is the most successful way of life mankind has ever known. Not only do our people eat better, sleep better, live in more comfortable dwellings, get around more in far greater comfort, and ..... live longer than man have ever done before. In addition to listening to radio and watching television, they read more books, see more pictures, and hear more music than any previous generation or any other people ever has. At the height of the technological revolution we are now living in a golden age of scientific enlightenment and artistic achievement.

For all who achieve economic development, profound cultural change is inevitable. But the rewards are considerable.

مغرب: اسلام کو ”الخير“ ماننے والوں کو جراثیم کی طرح کچل دینا ضروری ہے:

یہ حقیقت نصف النہار کی طرح آشکارا ہے کہ اگر مسلمان اپنی روایت اور تہذیب کے سودے پر سائنسی ترقی کو پانا چاہیں تو بھی اس کا حصول غیر ممکن ہے۔ اس کی وجہ مغرب یا مغربی استعمار کے چند سیاسی یا معاشی مفادات کی وابستگی نہیں بلکہ اس کے پس پشت ایک مستقل نظریہ کار فرما ہے، اور وہ یہ کہ انسان اور اس کے متعلقات کو ایک ہی اصل سے اصل اور واحد مقصود سے وابستہ ہونا چاہیے۔ اس اصل اور مقصود کا

1- C.E. Ayers, *The Theory of Economic Progress: A Study of the Fundamentals of Economic Development and Cultural Change*, New York: Schocken Books, 1962, pp. xxiv-xxv.

ادراک رکھنے والی ترقی یافتہ اقوام غیر ترقی یافتہ اقوام کو اپنے بنائے حصار میں رکھنا چاہتی ہیں، اور اس کے لیے اُن کی ہر نظریاتی اور تہذیبی تحدید کو توڑنے کے درپے ہو چکی ہیں۔ عولمتہ [Globalization] اسی ادراک کا مظہر ہے۔ اس طرز نے ایشیا پر قدرت کو مغربی اقوام کی حقیقی اور فوق الوجودی خواہش کا حصہ بناتے ہوئے دیگر انسانوں کی حیثیت بھی ان کی نظر میں ”اشیا“ ہی کی طرح بنا دی ہے:

The Craving for power over things [and over other people, that are reduced to things] is a part of a transcendental yearning; it is an attempt to identify with a larger scheme of things.<sup>1</sup>

Henryk Skolimowski مزید لکھتے ہیں کہ طاقت و قوت کے متعدد ممکنہ مظاہر اور دلائلوں میں مغرب نے اپنی مخصوص تجسید کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ بالفاظ دیگر حصول قوت بہ طور قوت طاہرہ جس سے نہ صرف اقتدار حاصل ہو بلکہ وہ برقرار بھی رہے۔ طاقت کا یہ وہ مخصوص مظہر ہے جو اس وسیع و عریض عمارت میں ہمہ جا پیوست ہو گیا ہے جسے مغربی سیکولر تہذیب کہا جاتا ہے اور یہی وہ صورت ہے جو خوف کا سبب ہے اور بہت خطرناک ہے:

Out of the many possible connotations and manifestations of power, we have chosen to enshrine one particular embodiment: power conceived as brute force for the purpose of control and domination. It is this particular manifestation of power that has become interwoven into a larger structure called Western secular civilization; and it is this form of power that causes havoc and is 'most dangerous'.<sup>2</sup>

مغرب کی نظر میں کسی ملت یا امت کا اپنے ”خیر“ پر اصرار اور آزادی، سرمایہ داری اور جمہوریت کو خیر کُل تسلیم کرنے سے انکار کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔ کیوں کہ اُن کی نظر میں قوموں کی سطح پر نظریاتی اور تمدنی انفرادیت کا اظہار اور اُس پر اصرار [Humanism] کے منافی ہے جو طاقت و اقوام کا خاصہ ہے۔ مغرب کا سب سے نمایاں سیاسی فلسفی رالس [John Rawls] صاف کہتا ہے کہ کسی کو بھی لبرل ازم کے لیے خطرہ بننے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، وہ انسان جو لبرل سرمایہ داری کا انکار کریں وہ معاشرے کے لیے بیماری کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کو عملاً کچل دینا اتنا ہی ضروری ہے جتنا امراض اور مضر جراثیم کو ختم کر دینا ناگزیر ہوتا ہے:

That there are doctrines that reject one or more democratic freedom is itself a permanent fact of

1- Henryk Skolimowski, *Living Philosophy: Eco-Philosophy as a Tree of Life*, p. 139.

2- Ibid., pp. 139-40.

life, or seems so. This gives us the practical task of containing them – like war and disease – so that they do not overturn political justice. ۱

مذہبی بنیاد پرستی نہیں، اسلام ”فساد کی جڑ“ ہے: مغرب:

سیمویل ہنٹنگٹن [Samuel Huntington, 1927-2008] نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ مسلمانوں کی معاشی زبوں حالی اور احساسِ محرومی کا تعلق مذہبی بنیاد پرستی سے نہیں بہ راہِ راست اسلام سے ہے، جو ایک مختلف تہذیب ہے، اور جس کے ماننے والے اپنی ثقافت کی برتری پر یقین رکھتے ہیں، اور اقتدار میں اپنے کم تر حصے پر پریشان ہیں:

The underlying problem for the west is not Islamic fundamentalism. It is Islam a different civilization whose people are convinced of the superiority of their culture and obsessed with inferiority of their power. ۲

نشأۃ الثانیہ: مسلمان خیر القرون کے معیاری طرز زندگی کی طرف لوٹ جائیں:

اسلامی علمیات و کونیاات میں منظور احمد صاحب کی بیان فرمودہ ترقی کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہاں مقصد سے قریب ہونا ترقی ہے اور دور ہونا تنزل۔ مسلم فکر میں نشأۃ الثانیہ [اگرچہ اسلامی سیاق میں اس اصطلاح کا اطلاق محلِ نظر ہے، تاہم اس] کا مفہوم فقط اتنا ہے کہ آدمی اپنی بنیادوں، یعنی ابتدا، کی طرف واپس لوٹ جائے کیوں کہ: ”میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے“ یہاں نشأۃ الثانیہ کا مقصد قطعاً یہ نہیں ہے کہ دنیوی آسائش کا گزشتہ دور عود کر آئے، یا ملتِ اسلامیہ ایک بار پھر اقوامِ عالم پر اپنی حکومتی اور عسکری بالادستی قائم کر دکھائے، بلکہ اس کی اصل ساری دنیا کے لیے داعی الی الحق بننا ہے، جس کی ماہیت اور غایت علمی سے زیادہ عملی، فکری سے زیادہ روحانی، اجتماعی سے زیادہ انفرادی اور نظریاتی سے زیادہ معاشرتی ہے۔ دین کو فرد کے قلب، روح اور معاشرت میں منتقل کیے بغیر نشأۃ الثانیہ کا ہر تصور مہمل ہے۔

ترقی کے لیے خیر القرون کی تہذیبی حالت کو ترک کیا جاسکتا ہے: منظور احمد:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب پر ترقی کی دُھن ایسی سوار ہے کہ انھیں کچھ اور سوچتا ہی نہیں، وہ ترقی کے حصول کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہیں۔ ترقی کی راہ میں کوئی شے خواہ مذہب، تہذیب،

1- John Rawls, *Political Liberalism*, New York: Columbia University Press, 2005, p. 64, ft.

2- Samuel P. Huntington, *The Clash of Civilization*. p. 217.

روایت رکاوٹ بنے اُسے سنگِ راہ سمجھ کر ہٹا دیا جائے۔ منظور احمد بتاتے ہیں کہ اگر مغرب کی خوشہ چینی سے اسلام پر کوئی زد پڑے یا تہذیب میں تبدیلی پیدا ہو تو اس بات سے قطعاً خائف ہونے کی ضرورت نہیں کہ ہم عصر حاضر میں ہزاروں ہزار سال پرانی تہذیب، مثلاً خیر القرون کی تہذیبی حالت کو، جسے ہم نے بہ طور آئیڈیل قبول کیا ہے، تبدیل کر کے اُس معیار تک نہیں پہنچ سکتے وہ نہایت پُر اعتماد لہجے میں لکھتے ہیں:

”اگر ایک فرد اپنی عمر کے کسی حصے میں اپنے ہر جز کو بدل کر بھی وہی فرد رہ سکتا ہے تو تاریخ کے اس تسلسل میں کوئی تہذیب اپنی روایتوں میں تبدیلیوں کے باوجود کیوں اپنا تشخص برقرار نہیں رکھ سکتی؟“

ڈاکٹر صاحب کے لیے اس بابت کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ جب ایک فرد اپنا ہر جز بدل لیتا ہے تو صرف جز کو بدلتا ہے یا اس کا ”کُل“ بھی تبدیلی کے عمل سے گزرتا ہے؟ کیا جز کی تبدیلی کے بعد بھی فرد کا جوہر ایک رہتا ہے یا نہیں؟ اگر اس کا جوہر ہر جز میں باقی رہتا ہے تو پھر اسے تغیر یا تبدیلی کہنا درست ہوگا؟ کیا یہ اسی طرح کا عمل نہیں، جس طرح پانی مختلف ظروف کے لحاظ سے اپنی شکلیں اور سانچے تبدیل کرتا رہتا ہے؟ جیسے کبھی جم کر برف بن جاتا ہے، کبھی ابل کر بھاپ میں تبدیل ہو جاتا ہے، لیکن وہ بھاپ بنے یا برف رہے، اولے کی شکل اختیار کرے یا بارش کی صورت میں برسنے لگے اس کا جوہر  $H_2O$  ہی رہتا ہے۔ اور کسی فرد کا ”کُل“ اس کی مابعد الطبیعیات، تاریخ، تہذیب اور زمان و مکاں سے برآمد ہوتا ہے یا وہ کانٹ کی طرح ایک ایسا فرد ہوتا ہے جسے کسی اجتماعیت کی حاجت نہیں، وہ اپنی تاریخ و تہذیب اور زمان و مکان سے ماورا ہو کر ایک نئی شخصیت تشکیل دے سکتا ہے؟ تہذیب اپنی روایت کہاں سے اخذ کرتی ہے؟ روایت کا سرچشمہ اس تہذیب کی کلیت ہوتی ہے یا محض عقلیت؟ کسی تہذیب میں روایت کی تبدیلی کا پیمانہ کیا ہے؟ خود بدلتی ہوئی روایت؟ بدلتا ہوا عصر؟ اگر کوئی شے خود ہمہ وقت حرکت و تغیر کے مرحلے میں ہے تو کیا وہ پیمانہ اور منہاج بن سکتی ہے؟ اس لیے کہ پیمانہ اور منہاج ناقابل تغیر ہوتا ہے۔ ہر وہ حرکت و تغیر جو اس پیمانے کے اصول سے ہم آہنگ ہو قابل قبول ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب واضح کریں کہ وہ پیمانے کو غیر متغیر سمجھتے ہیں؟ باہر سمجھتے ہیں؟ اور خود پیمانہ ان کی نظر میں کیا ہے؟

ترقی کے نام پر اقدار کی تبدیلی کا مطالبہ خیر و شر کے معیارات سے دست برداری:

ترقی [progress] کے نام پر تبدیلی کا مطالبہ یہی واضح کرتا ہے کہ اقدار کے منابع کو، جس کے نتیجے میں اُن کی ترتیب وضع ہوتی ہے، تاریخی عمل قرار دیا جائے اور چوں کہ تاریخی عمل میں تبدیلی ناگزیر ہے، اس لیے اقدار [values] بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فی نفسہ کوئی چیز

۱- منظور احمد، ”ثبات، تغیر اور نشاۃ ثانیہ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۲۱۵۔

۲- ایضاً، صفحہ ۲۱۶۔

”خیر“ [good] ہے نہ ”شر“ [evil]۔ تاریخی عمل کے تحت افراد جس شے کے درست ہونے پر اتفاق کر لیں وہ خیر ہے اور جسے قبیح جان لیں وہ شر۔

منظور احمد: حصول ترقی کے لیے ماضی کا انکار: نئے تشخص کی بازیافت:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا کہنا ہے کہ اس تاریخی عمل کے نتیجے میں ایک نیا فرد اور سماج وجود پذیر ہوگا، لکھتے ہیں:

”ہمیں اپنے ذہنوں سے اس خوف کو نکالنا ہوگا کہ سماج اور فرد کی نئی تعبیر سے ہم اپنا تشخص کھودیں گے۔ ایسا نہیں ہوگا، بلکہ ہمارا ایک نیا تشخص متحقق ہو جائے گا۔“

”نئے تشخص“ کی بازیافت کی خواہش ماضی کے بلبے سے برآمد ہوتی ہے۔ جب کوئی فرد اپنی سابقہ تاریخ کو حقارت اور کراہت سے دیکھتا ہے تو اسے اپنی تاریخ و تہذیب سے شرم آتی ہے اور وہ اپنے ماضی کو منہدم کر کے نئی تصویر تراشنے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے تین مغربی مقاصد [معاشی ترقی، تصوراتی ارتقا اور تکنیکی ترقی] غیر مشروط طور پر قبول فرمائے ہیں، جب وہ اسلامی تاریخ و تہذیب کو ان مغربی اہداف کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو انہیں اپنی پوری تاریخ قحط الرجال سے دوچار نظر آتی ہے، انہیں اپنی اس تاریخ میں کوئی ارسطو، سقراط، ڈیکارٹ، کانٹ، ہیگل، فرانڈ، نیٹشے، ڈارون، ہائینڈگر، مارکس اور ہیبر ماس نظر نہیں آتا، انہیں پوری اسلامی تاریخ و تہذیب ایسے ”عبقری صفت“ اشخاص سے محروم نظر آتی ہے، جن کے افکار کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر صاحب اسلام اور مغرب کے درمیان کوئی پل تعمیر کر سکیں اور خود مسلم مفکرین کے افکار و نظریات میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ملتی جس کی اساس پر مغرب سے بے نیاز ہو کر از خود اسلامی دنیا میں سرمایہ دارانہ ترقی کی راہ ہموار ہو سکے۔ اس لیے اب ”نئے تشخص“ کی تخلیق اور ماضی کا انکار ہی وہ واحد صورت ہے جس سے سرمایہ دارانہ ترقی ممکن ہو سکتی ہے۔ جدیدیت کا بنیادی مقدمہ یہی ہے کہ وہ تاریخ ماضی کے انکار سے عبارت ہے۔

جدیدیت کا بنیادی وصف: اصول تاریخ کی خارجی تشکیل کا انکار اور تحقیر:

ایک مذہب پسند معاشرہ اس بات کا متحمل نہیں ہوتا کہ وہ اپنی تاریخ کو یک سر رد کر کے آن واحد میں اپنا تعلق ماضی سے منقطع کر لے۔ بالفاظ دیگر یہ ممکن نہیں کہ اصول عامہ اور تاریخ کو ایک ساتھ رو کر دیا جائے، اس لیے جدیدیت پسندوں کا ابتدائی ہدف یہی ہوتا ہے کہ وہ حالات کے جبر کے باعث ان اصول عامہ [abstract principles] کی تو بہت تعریف کرتے ہیں، لیکن ان کی کوشش ہوتی ہے کہ یہ اصول تاریخ ماضی میں جس صورت میں متشکل ہوتے آئے ہیں انہیں عہد جدید کے تقاضوں اور

۱۔ منظور احمد، ”پیش لفظ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۹۔

زمانے کی تبدیلی کے نام پر ناقابل اطلاق قرار دیا جائے۔ اگر عیسائیت کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ پروٹسٹنٹ نے اُس تاریخ کو پہلے رد کیا جو تاریخ ان اصول عامہ کی روشنی میں متشکل ہوئی تھی۔ تاریخ کے انکار کے کچھ صدیوں بعد ان اصولوں کے رد کرنے کا بھی امکان پیدا ہو گیا۔ اگر ڈیکارٹ کی کتابوں *Discourse on Method* اور *Meditations* کا اس نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نے یقین کے حصول کے لیے اپنی کاوش کا آغاز شک سے کیا، وہ حقیقت کو ”عقیدہ پرستی“ کی دلدل سے نکالنا چاہتا تھا، اور آزاد تخلیقی، تنقیدی اور ناقابل شکست اصولوں کا متلاشی تھا، وہ عہد گزشتہ کی علمی تاریخ اور اس سے پیدا ہونے والی ذہنیت کو ختم کر دینے کا خواہاں تھا، کیوں کہ وہ اس کی ماوراء تاریخ یعنی Certainty کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ بالفاظ دیگر ڈیکارٹ ایک ایسے علم کے حصول کا خواہاں تھا جو تاریخ کی جزئیات اور ملاوٹ [distortion] سے پاک ہو۔ لیکن چون کہ اس وقت مدرسیت کے اثرات بہت غالب اور قوی تھے اس لیے ڈیکارٹ نے کلیسا سے ٹکر لینے کے بجائے اسی کے سائے اور سرپرستی میں اپنے فلسفے [I think, therefore I am] کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور کلیسا کو مطمئن رکھنے کے لیے وجود خدا پر عیسائی متکلمین کے وضع کردہ ”عقلی دلائل“ بھی دیے۔ اور اپنی کتاب *Meditations* کا انتساب بھی پادریوں کے نام کر دیا، پادری خوش ہو گئے اور کلیسائی سند کے ساتھ ڈیکارٹ کی فکر قبولیت عامہ حاصل کرنی چلی گئی، بالآخر رفتہ رفتہ عیسائیت شکست کھا گئی اور ڈیکارٹ جدیدیت کا باوا آدم [Father of Modern Philosophy] کہلایا۔<sup>۱</sup>

تاریخ اور اصول کے درمیان دوئی [dichotomy] ہی فی الاصل جدیدیت کا خاصا ہے۔ مغرب ان دنوں عالم اسلام میں ڈیکارٹ کی طرز کے کسی ”راخ العقیدہ“ مفکر کی تلاش میں ہے، کیوں کہ ہمارے جدیدیت پسند اپنی تمام تر جدیدیت پسندی کے باوجود مغرب کے لیے قابل قبول نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر منظور احمد بھی حالات کے جبر کے تحت ڈیکارٹ کی تقلید میں اپنی تاریخ کا انکار ایسے پیرائے میں کرتے ہیں جس سے یہ گمان پیدا نہ ہو کہ وہ اسلامی تاریخ اور اس کے اطلاقی امکانات اور عملی رجحانات کے منکر ہیں۔ منظور احمد: حصول ترقی کے لیے بیان کردہ خطوط: نتائج:

ڈاکٹر صاحب کے افکار امت مسلمہ کی جس سمت ”رہنمائی“ کر رہے ہیں اس کی قبولیت سے جس فرد اور سماج کے قیام کی علمی و عملی بنیادیں فراہم ہوں گی، وہ معاشرہ اسلامی ہوگا، نہ اُس کا مثالی فرد عبداللہ [اللہ کا بندہ] اور اس ترقی کی کلید جن ہاتھوں میں ہوگی وہ ہاتھ بہر حال دست دعا اور حامل عطا نہیں ہوگا، بلکہ حرص و ہوس کا پجاری اور غضب و شہوت کا اسیر ہونے کے باوجود معاشرے کا باعزت اور

۱- تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے:

James Mannion, *Essential Philosophy: Every thing You Need to Understand the World's Greatest Thinkers*, U.K.: David & Charles Book, 2007, p. 75.

ذی وقار فرد ہوگا۔ new morality میں ترکِ اخلاقِ رذیلہ اور حصولِ اخلاقِ حمیدہ بے کار باتیں ہیں۔ ازمنہ گزشتہ میں جن اخلاقی قواعد و ضوابط کی پابندی کی جاتی تھی، وہ سب مہمل اور لغو ہیں کیوں کہ مقصود اصلی تو نظریہ افادیت [utilitarianism] کے تحت شدتِ لذت [intensity of pleasure] ہے، اگر 'A' کو زنا میں لذت کتاب پڑھنے سے زیادہ محسوس ہوتی ہے تو وہ زنا کو مطالعے کی نسبت زیادہ قدر دے گا۔ 'B' اگرچہ مطالعے میں زنا کی نسبت زیادہ لذت محسوس کرتا ہے مگر اسے 'A' کا حق تسلیم کرنا پڑے گا۔ گویا قدر کے ان دونوں تصورات میں human being آزاد ہے کہ کس قدر کا تعین ارادے کے موافق کرے دوسرے کی قدر کے حق کو تسلیم کرنے کے ساتھ۔ اسی کا نام مغرب میں اصلاحِ مذہب [Reformation] کی تحریک تھی۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب اس کو نئے شخص کے متحقق ہو جانے سے تعبیر فرما رہے ہیں۔

منظور احمد: مذاہب کی کوئی حیثیت نہیں: ترقی کا منطقی نتیجہ:

ڈاکٹر منظور احمد کی مزعومہ ترقی کا اثر بہ راہِ راست مذہب اور مسلمانیت پر پڑنا ناگزیر ہے۔ جہاں تک مذہب پر پڑنے والا اثر ہے تو ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ: ”مذاہب کبھی اپنی اصلی حالت پر برقرار نہیں رہتے، بلکہ ایک معنی میں کسی مذہب کی کوئی اصل حالت نہیں ہوتی۔ صرف ایسے سرحدی نشان ہوتے ہیں، جن کے باہر نکلنے سے، کوئی شخص، کسی مذہب کے دائرے سے نکل جاتا ہے۔“

رہی ”مسلمانیت“ — تو اس کے لیے تعمیر محض جیسی بڑی تبدیلیوں کے باوصف صرف ”مسلمان“ کہلانا کافی ہے۔ منظور احمد لکھتے ہیں:

”تبدیلی کے اس عمل میں اُن کی قدر مشترک اسی طرح باقی رہتی ہے کہ ”بڑی تبدیلیوں“ کے بعد بھی وہ اُن ہی ناموں سے پکارے جاتے ہیں، جن سے وہ پہلے پکارے جاتے تھے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں اور آج کے مسلمانوں میں تفاوت کسی درجے کا بھی کیوں نہ ہو، آج بھی قدر مشترک اسلام کے نام سے ہی جانی جاتی ہے۔“

مذاہب اور ان کی حدود: اہم نکات:

ڈاکٹر صاحب یہاں بہ طور ایک Islamist Liberal مفکر یہ باور کر رہے ہیں کہ جرمن اور فرینچ وغیرہ قومیتوں کی طرح ”مسلمان“ بھی ایک ایسی ہی قومی شناخت کی وحدت کا غماز ہے۔ پس مسلم قوم کی نسبت اپنے ساتھ چسپاں کر کے کسی بھی قسم کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی ماڈل کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد کے متذکرہ دونوں بیانات مذاہبِ عالم کے بارے میں بالعموم اور اسلام

۱- منظور احمد، ”پیش لفظ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۹۔

۲- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۷۔



سے متعلق بالخصوص ملحدانہ نقطہ نظر کے غماز معلوم ہوتے ہیں۔ اس ملحدانہ نقطہ نظر کی نظری و فکری اساس جدیدیت کے ابتدائی مفکرین کے یہاں بہ آسانی مل جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو براہیہی مذاہب [یہودیت، عیسائیت اور اسلام] اور ہندومت کی تاریخ کا بھی امعان نظر سے مطالعے کا موقعہ نہیں ملا۔ اسی لیے وہ نہ صرف براہیہی مذاہب اور ہندومت میں فرق کرنے سے قاصر رہے بلکہ وہ براہیہی مذاہب کو بھی ہندومت کے تناظر میں بیان کر رہے ہیں، جس کی سرحدیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں اور کہاں ختم کچھ معلوم نہیں۔ اس کے برعکس براہیہی مذاہب، جس کی آخری اور حتمی شکل اب اسلام ہے، اس کی سرحدیں متعین ہیں جن کی بنیاد پر حق و ناحق یا ایمان و کفر کی شرعی تقسیم عمل میں آتی ہے جو اپنے اطلاق میں مستقل اور عالم گیر ہیں۔ ہندومت دین نہیں ایک مابعد الطبعی روایت ہے جو حق کے ان ظاہری تعینات کو قبول ہی نہیں کرتی جہاں شریعت مابعد الطبیعیات پر غالب، فائق، برتر اور حکم ہو، جو قبل ازیں براہیہی مذاہب اور اب اسلام کا جوہر خاص ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص خود کو صرف مسلمان کہے تو امت مسلمہ اُسے محض اس کے دعوے کی بنا پر مسلمان تسلیم نہیں کرے گی، بلکہ اس دعوے کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے اُسے اس سانچے اور ڈھانچے کو عملاً اختیار کرنا ہوگا جو امت کی تاریخ میں تسلسل تعامل کی صورت سے اسلاف سے اخلاف تک بلا انقطاع رائج رہا ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کو اس کے دعویٰ نبوت کے بعد ہزار دعووں کے باوجود بھی امت کی مجموعی روایت نے کبھی مسلمان نہیں مانا۔ اسلام کی سرحدیں اتنی محکم، مضبوط، نمایاں اور واضح ہیں جو کسی سطح پر بھی حق کو باطل سے، یعنی اسلام کو غیر اسلام سے، مخلوط کرنے کی اجازت نہیں دیتیں، بلکہ آخری، حتمی اور اکمل دین کی حیثیت سے اسلام کا پہلا دعویٰ ہی یہ ہے کہ حق فقط مجھ میں منحصر ہے۔ — یہ مذاہب کی بالعموم اور بالخصوص اسلام کی طاقت ہے کہ ڈاکٹر منظور احمد جیسے جدیدیت پسند آج بھی اپنا مافی الضمیر دو ٹوک اور صریح الفاظ میں بیان کرنے سے خائف ہیں، ورنہ اگر ڈاکٹر صاحب کے یہ قول مذاہب کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے تو عرض مدعا سے کس چیز کا خوف مانع ہے؟ جدیدیت کی قبولیت اور نفاذ کی راہ میں وہ کون سی رکاوٹیں ہیں جس نے آج تک یہ قول خود ڈاکٹر صاحب امت کو جدیدیت کی تیز لہر کے ساتھ بہنے سے روکا ہوا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو ڈاکٹر صاحب ان وجوہات کی نشان دہی فرمائیں جن کے باعث امت مسلمہ ڈاکٹر صاحب کی مزعومہ ”ترقی“ سے اب تک محروم ہے۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب کا یہ مفروضہ ”کہ مذاہب کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی“ غلط ہے۔

آزادی اور ترقی: الوہیت سرمایہ پر ایمان ہی سے ممکن ہے:

حالات کی تبدیلی کو دین پر وارد کرنے کی ہر کوشش کا محرک ”مغرب کی غلامی“ یا ”دنیا پرستی“ ہے۔ اور جسے ڈاکٹر صاحب ”ترقی“ کہہ رہے ہیں وہ فی الحقیقت ایمان کی دست برداری کا نام ہے۔ — عصر جدید میں ترقی کا سب سے ”معیاری“ اظہار مغرب میں ہو رہا ہے، اور مغرب کی یہ ساری ترقی جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی مرہونِ منہج ہے جس کی پشت پر سرمایہ داری کی کمک ہے۔ بالفاظِ دیگر سائنس سرمایہ داری کا

آلہ [instrument]، اور سرمایہ [capital] آزادی [freedom] کی کلید ہے، کیوں کہ سرمایہ ہی وہ شے ہے جو انسان کی ہر خواہش کے حصول کو ممکن بناتا ہے۔ آزادی بجز کچھ نہیں [Freedom it self is nothing] ہوتی بلکہ آزادی اپنے اظہار میں سرمائے کی محتاج ہے، گویا سرمایہ آزادی کا مجسم پیکر ہے۔ اب خود یہ آزادی کیا ہے؟ روسو کہتا ہے کہ آزادی خواہش نفس کی اتباع کا نام ہے:

Freedom means doing only what one wants to do.<sup>1</sup>

روسو: آزادی قدر ہے اسے جبراً نافذ کیا جائے گا:

روسو کا کہنا ہے کہ معاشرے کو حق ہے کہ اس آزادی کو جبراً نافذ کرے، اگر کوئی اس اصول آزادی کی اتباع نہ کرے تو بالجبر اس سے اطاعت کروائی جائے:

If those in the minority refuse to follow the general will, they are violating their own will and thus are refusing to be free. Therefore, people who refuse to comply with the general will, and thus with their own best interest, can be forced to comply.<sup>2</sup>

ڈربن: لبرل سرمایہ داری کا منکر ”مرتد“ ہے جس کی سزا موت ہے:

مشہور فلسفی ڈربن [Darben] صاف کہتا کہ مغرب کے دستوری لبرل جمہوریت پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں جو شخص لبرل سرمایہ داری نظام کو نہیں مانتا اس سے کسی قسم کی گفتگو کی ضرورت نہیں ہے اس کا علاج صرف ”موت“ ہے:

What Rawls is saying is that there is in a constitutional liberal democracy a tradition of thought which it is our job to explore and see whether it can be made coherent and consistent ..... We are not arguing for such a society. We take for granted that today only a fool would not want to live in such a society ..... If one cannot see the benefits of living in a liberal constitutional democracy, if one does not see the virtue of that ideal, then I do not know how to convince him. To be perfectly blunt, sometimes I am asked, when I go around speaking for Rawls, What do you say to an Adolf Hitler? The answer is [nothing.] You shoot

1- Baradat Leon, *Political Ideologies: Their Origins and Impact*, New Jersey: Prentice Hall, 2000, p. 81.

2- Ibid.

him. You do not try to reason with him. Reason has no bearing on that question. So I do not want to discuss it.<sup>1</sup>

سرمایہ داری: ایک تصوراتی، عددی، غیر مرئی، خود تخلیقی اور مابعدا لطبعی جادوگری:

آزادی کا حصول صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کے پاس سرمایہ [capital] ہو، لہذا قدرِ مطلق [absolute value] سرمایہ ہے، اور سرمایہ دارانہ عقلیت کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ایسے طریقے وضع کرے جس کے نتیجے میں سرمائے کی بڑھوتری ممکن ہو سکے۔ سرمایہ ایک ایسی مقدار ہے جو اپنی بڑھوتری کے لیے خود سرگرداں ہے، بالفاظِ دیگر سرمائے کی بڑھوتری کا مقصد سوائے بڑھوتری کے اور کچھ نہیں، لہذا سرمائے کے متعلق یہ خیال کہ وہ کوئی مرئی اور موجود شے ہے، جہالت کے سوا کچھ نہیں، سرمایہ بہ ذاتِ خود ایک مابعدا لطبعی تصور ہے، جو معاشرے کے عقلی تناظر کو بھی بدل کر رکھ دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں حرص [accumulation] اور حسد [competition] کو عقلی بنیادوں پر اقداری حیثیت حاصل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اب یہاں عقلیت سرمائے کی گردش سے ہم آہنگ ہونے کا نام ہے، افراد سرمائے کی گردش سے ہم آہنگی کی بنیاد پر ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں، لیکن سرمائے کی گردش کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ فرد سرمائے کو اپنی ملکیت میں رکھ سکے بلکہ یہ سرمایہ ہے جو افراد کو اپنا غلام بنا لیتا ہے بالفاظِ دیگر سرمایہ افراد کی ملکیت نہیں بلکہ افراد سرمائے کی ملکیت ہیں اور زندگی کا مقصد سرمائے کی گردش سے ہم آہنگی ہے۔ اس پورے عمل کو عیسائیت میں حرص اور اسلام میں تکاثر کے ہم معنی قرار دیا جاسکتا ہے۔

آزادی کو قدرِ مطلق مانے بغیر سرمایہ دارانہ ترقی کا حصول ممکن نہیں:

اس تناظر میں اگر غور کیا جائے تو سرمائے اور آزادی میں ایک خاص قسم کی مماثلت نظر آتی ہے، دونوں ہی مقدار محض کی بڑھوتری سے عبارت ہیں، اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ فی زمانہ جب بھی کسی ریاستی صف بندی میں آزادی بنیادی قدر کے طور پر سیاسی ہدف کی صورت اختیار کرے گی تو اس ریاست کے سرمایہ دارانہ نظام میں مدغم ہو جانے کے امکانات صد فی صد ہو جائیں گے، چنانچہ آزادی جب بھی کوئی ٹھوس صورت اختیار کرے گی تو وہ ”سرمائے“ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

مغرب: مجیر العقول ترقی: عیسائی الہیات اور اعتقادات میں تبدیلی: مذہب روحانی تعیش:

آزادی میں اضافہ سرمائے میں اضافے کے راستہ متناسب ہے۔ فلسفہ، سائنس، عیسائیت، استعماریت، نوآبادیات، پروٹسٹنٹ ازم کی تاریخ اور بڑے بڑے عیسائی متکلمین اور فلسفیوں اینزلم اور

1- Burton Dreben, "On Rawls and Political Liberalism", in *The Cambridge Companion to Rawls*, [ed., Samuel Richard Freeman], UK: Cambridge University Press, 2003, pp. 328-329.

ایکوانٹس وغیرہ کے افکار و نظریات پر یونانی فلسفے اور سائنس کے اثرات اور اس کے نتیجے میں عیسائی مابعد الطبیعیات میں آنے والی تبدیلیوں اور عیسائی اعتقادات، الہیات اور مابعد الطبیعیات میں یونانی فلسفے اور منطق کے اثر و نفوذ اور شمولیت کی تاریخ کے گہرے مطالعے کے بغیر جدید سائنس کی محیر العقول ترقی کو سمجھنا ممکن نہیں۔ جدید سائنس کے فروغ میں سرمایہ داری کا کردار کلیدی ہے، جس کی مذہبی تعبیر لوٹھر

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

- [1] Samir Okasha, *Philosophy of Science: A Very Short Introduction*, Oxford: Oxford University Press, 2002.
- [2] Jared Diamond, *Guns, Germs and Steel: The Fates of Human Societies*, New York: W.W. Norton & Company, 1999.
- [3] Alex Rosenberg, *Philosophy of Science: A Contemporary Introduction*, New York: Routledge, 2000.
- [4] Marc Lange, *Philosophy of Science: An Anthology*, Oxford: Blackwell Publication, 2007.
- [5] Robert C. Scharff, Val Dusek, *Philosophy of Technology: The Technological Condition - An Anthology*, Oxford: Blackwell Publishing, 2003.
- [6] Lynn White, Jr., *The Historical Roots of Our Ecologic Crisis*, Science, March 10, 1967, pp. 1203-07.

۲۔ بنیادی طور پر سرمایہ داری کی دو شکلیں ہیں: [۱]۔ ارتکاز سرمایہ بہ ذریعہ مارکیٹ [۲] ارتکاز سرمایہ بہ ذریعہ ریاست — بہت ممکن ہے کہ اس استدلال پر، کہ سرمایہ دارانہ نظام کے فروغ کی بنیاد پر ہی محیر العقول ٹیکنالوجیکل ترقی ممکن ہو سکتی ہے، یہ اعتراض وارد کر دیا جائے کہ سوشلسٹ نظام معیشت میں بھی technological development کے تاریخی شواہد موجود ہیں۔ روس، چین، اور مشرقی یورپ کی مثال سب کے سامنے ہے۔ لیکن اس بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ سوشل ازم بھی سرمایہ دارانہ نظام کی دوسری تعبیر پیش کرتا ہے — ٹیکنالوجیکل ترقی کا جو ماڈل کیونسٹوں نے استعمال کیا اسے ترقی بہ ذریعہ پلاننگ [scientific development by virtue of planning] کہتے ہیں، اس کے باعث ایک Totalitarian state ارتکاز سرمایہ کو ممکن بناتی ہے۔ اس کے بالمقابل ترقی کا ایک دوسرا ماڈل ہے ارتکاز سرمایہ بہ ذریعہ مارکیٹ یعنی آزادانہ مسابقت [free competition] کے ذریعے حصول آزادی اور ترقی کو ممکن بنایا جائے — لہذا اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ روس میں ہونے والی ٹیکنالوجیکل ترقی سرمایہ داری کے علی الرغم اشتراکی نظم معیشت کی پیداوار تھی تو بھی تاریخ نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ روس اپنی تمام تر technological development کے باوجود مغربی سرمایہ دارانہ ریاستوں میں market mechanism کے ذریعے پر دان چڑھنے والی ترقی کا مقابلہ نہ کر سکا، بالآخر ۱۹۸۹ء میں اشتراکی نظم معیشت کو شکست ہو گئی، دوسری طرف مشرقی یورپ میں مغرب نے محض ٹیکنالوجیکل برتری کی بنیاد پر اشتراکیت کو شکست دے دی۔ اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ ترقی کے سرمایہ دارانہ مغربی ماڈل کا نقطہ ماسکہ مارکیٹ ہے یعنی scientific technological development کو انسان کی ضرورتوں اور حاجتوں سے ہٹا کر حرص و حسد کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔ اس طرح حاصل ہونے والی ترقی سریع العمل اور سہل الحصول ہوتی ہے۔ اس کی اہم اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ مارکیٹ وہ نظام فراہم کرتا ہے جہاں افراد غرض کی بنیاد پر تعلقات قائم کرتے ہیں اور کسی شے اور خدمت کی قدر [value] کے تعین کا معیار مجموعی لذت [aggregate utility] اور سرمائے کی بڑھوتری کے لامحدود اضافے پر ہوتا ہے۔

[Martin Luther] کی پروٹسٹنٹ تحریک نے مہیا کی تھی کہ ”جو دنیا میں کامیاب ہے وہ آخرت میں بھی کامیاب ہے“۔ لہذا دین و دنیا کا اصل فاتح بادشاہ [King] ہے اور سب سے نیک اور متقی بھی۔ دنیا و دین کی اس ظاہری یک جائی کے نتیجے میں دین مغربی معاشرے اور تہذیب سے رخصت ہوا اور محض روحانی تعیش [Spirial Luxury] بن کر رہ گیا۔ دنیا کے ذریعے آخرت کی کامیابی کے اس تصور نے آخرت اور وہاں کی نعمتوں اور کلفتوں یعنی جنت و جہنم کے تصورات کو فنا کر دیا۔ اور زمین ہی کو جنت [Paradise] بنانے کا نظریہ ظہور پذیر ہوا، اس لیے کہ اس تصور علم میں اصل حقیقت انسان ہے، اصل علم نفس انسانی، عقل، تجربے اور طبیعی دنیا ہی سے حاصل ہوتا ہے، ہر وہ علم دائرہ علم سے خارج ہے جو حواس، تجربے، عقل اور طبیعی دنیا سے ماورا ہو۔ یوں جنت آسمان سے زمین پر منتقل ہو گئی جس طرح خدا انسانی ذات میں منتقل ہو گیا تھا۔ اسی لیے اس خالص، حسی، تجربی اور طبیعی سائنس نے وہ ترقی کی جو تاریخ میں کبھی نہ ہو سکی، جدید سائنس کی اس ترقی کا اصل سبب خیر اور علم کی تعریف میں تبدیلی ہے جس کی نوعیت مابعدالطبعی ہے۔

استعماریت اور نوآبادیات: مغرب کی ترقی کے بنیادی لوازم:

جدید سائنس کی ترقی کا یورپی ممالک کی اس لوٹ مار سے بھی بہ راہ راست تعلق ہے جس کے نتیجے میں چین، ہندوستان، افریقہ اور آسٹریلیا وغیرہ کو بری طرح لوٹا گیا۔ اس لیے جب تک سرمایہ داری کے آغاز و ارتقا کی تاریخ سے واقفیت حاصل نہیں کی جائے گی مغرب میں عیسائیت سے مادیت تک کا سفر سمجھ میں نہیں آئے گا۔ مثال کے طور پر کوانٹم مکینکس کے ایک تجربے کے لیے پاکستان کے مجموعی بجٹ سے کئی گنا زیادہ رقم درکار ہے، یہ رقم سوائے لوٹ مار کے اور کسی طریقے سے حاصل نہیں کی جاسکتی، جس کی

۱- اس مابعدالطبعی تبدیلی کے نتیجے میں تمام تر تصورات خیر کو رد کر کے صرف تصور حق [right] پیش کیا گیا۔ عصر حاضر میں تمام تر گفتگو، اسالیب اور مکالمات صرف اور صرف حق [right] کے منہاج میں ہوتے ہیں۔ یہ غالب تعقل ہے۔ حقوق [rights] ہمیشہ ایک خاص مابعدالطبعیات اور علمیات سے ظہور کرتے ہیں، مجرد حق [abstract right] کوئی شے نہیں ہوتی۔ کوئی معاشرہ تصور خیر کے بغیر تصور حق تخلیق نہیں کر سکتا، خیر [good] کے بغیر حقوق [right] اخذ نہیں کیے جاسکتے، کیوں کہ جب اجتماعی زندگی میں کسی امر کو درست یا غلط یا جائز و ناجائز ٹھہرایا جاتا ہے تو فی الاصل کسی خاص تصور خیر [good] کے منہاج اور خاص سچ [truth] کے دائرے میں داخل ہو کر ہی خیر و شر یا قانونی و غیر قانونی ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً آج ایک بائبل اور نقاب اوڑھنے والی مسلمان عورت بھی کہتی ہے کہ پردہ اور حجاب میرا ”حق“ ہے۔ وہ اسے ”خیر“ کے طور پر پیش نہیں کرتی۔ نقاب خیر نہیں تو کیا ہوا حق [right] تو ہے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتی ہے کہ نقاب و حجاب الحق [good/truth] سے اخذ شدہ تصور حق [concept of truth] ہے، اسے صرف حق [right] سمجھنا درست نہیں یہ الحق [the good] ہے۔ فلسفہ حق [right] اور حقیقت خیر [good] کی اردو زبان میں قابل ابلاغ تفہیم کے لیے دیکھیے:

زاہد صدیق مغل، ”اسلام، ہیومن رائٹس اور جمہوریت“، مشمولہ اسلامی بینکاری اور جمہوریت: فکری پس منظر اور تنقیدی جائزہ، لاہور: مکتبہ وراثت، ۲۰۱۲ء، صفحات ۱۹۶-۲۳۷۔

کامیابی اور ناکامی دونوں کے امکان برابر ہیں، کوانٹم مکینکس کی ایک مساوات [equation] اگر کمپیوٹر کے ذریعے حل نہ کی جائے تو پوری زندگی میں ایک سائنس دان صرف ایک مساوات کو حل نہیں کر پائے گا، اگر کمپیوٹر نہ ہوتا تو یہ کوانٹم مکینکس محض ایک نظری علم رہ جاتا، لہذا اس کے لیے بے دریغ سرمائے کی ضرورت تھی، آئن سٹائن نے  $E=mc^2$  کا جو نظریہ پیش کیا تھا اُسے ثابت کرنے کے لیے ٹیکنالوجی بعد میں وجود میں آئی، سواب سائنس ٹیکنالوجی کی محتاج ہو چکی ہے اور ٹیکنالوجی، سرمائے [capital] کی محتاج ہے اور سرمایہ اپنی بڑھوتری اور مقدار میں اضافے کے لیے صرف سرمائے کا محتاج ہے اور سرمایہ دار صرف ان شعبوں میں ٹیکنالوجی پر سرمایہ لگائے گا جہاں منافع کا زیادہ سے زیادہ یقین ہو۔

ہزاروں دماغ + اربوں کی سرمایہ کاری + ریاستی سرپرستی = سائنسی ترقی:

سائنس ایک سماجی تجربہ [social practice] ہے، جس کی صورت گری پر مختلف سطحوں پر ہزاروں لوگ دن رات اربوں کھربوں روپے کی سرمایہ کاری کے ساتھ مصروف عمل رہتے ہیں، تب جا کر کوئی تجربہ ایک مادی وجود میں تبدیل ہو کر ایجاد کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ لیکن محسوس یہ ہوتا ہے کہ کوئی سائنس دان اچانک کھڑا ہو گیا اس نے کوئی خیال اور نکتہ پیشہ کر دیا، پھر اسے تجربے سے گزار کر دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ یہ محض نادانانہ خیال ہوتا ہے۔ سائنس کی تاریخ سے واقف اور سائنسی ایجادات کے مراحل سے آگاہ محققین جانتے ہیں کہ حکومت، ریاست، سرمائے کے بازار کی قوتیں اور ہزاروں قسم کے ذہن و دماغ سالہا سال تک مل جل کر کسی سائنسی نتیجے تک پہنچتے ہیں۔ جب تمام تر صلاحیتیں اور سرمایہ ایک ہی سمت اور ایک ہی حصول کے لیے مصروف عمل رہتے ہیں، تب ایجاد سامنے آتی ہے۔ فلسفہ سائنس کا مورخ چامر لکھتا ہے:

So far I have outlined an objectivist view that focuses on theories as explicitly expressed in verbal or mathematical propositions. However, there is more to science than this. There is also the practical aspect of a science. A science, at some stage in its development, will involve a set of techniques for articulating, applying and testing the theories of which it is comprised. The development of a science comes about in a way analogous to that in which a cathedral comes to be built as a result of the combined work of a number of individuals each applying their specialized skills. As J. R. Ravetz has put it, "Scientific knowledge is achieved by a complex social Endeavour, and derives from the work of many craftsmen in their very special

interaction with the world of nature". A full objectivist characterization of a science would include a characterization of the skills and techniques that it involves.<sup>1</sup>

جدید سائنس غیر اقداری نہیں:

سائنس، ٹیکنالوجی اور سرمائے کی مثلث کے بغیر ترقی کا امکان خواب ہے — یہ ہے وہ اصول جس پر چل کر عظیم الشان سائنسی ترقی ممکن ہو سکی ہے، جس کی چکا چوند سے جدیدیت پسندوں کی آنکھیں خیرہ ہیں۔ اُن پر عجیب قسم کی دیوانگی مسلط ہے۔ ترقی کا نام سنتے ہی وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں، اور اپنی روایات و تہذیب بلکہ دین و مذہب تک کو خاک میں ملانے پر تل جاتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام اور سائنس میں خدا کو داخل کر کے اُسے مشرف بہ اسلام کیا جاسکتا ہے، گویا سائنس ایک ایسا مظروف ہے جو ظرف کے بدل جانے سے تبدیل ہو جائے گا، جوں ہی اُس میں سے مغربی روح باہر نکلے گی اور اسلامی روح داخل ہوگی تو یہ سارا نظام اور اُس کے مظاہر اسلامی، روحانی اور نورانی ہو جائیں گے۔ یہ سوچ نہایت عامیانه اور سادہ لوحی پڑتی ہے۔

ہر ایجاد اپنے فلسفے کی روشنی میں اپنے اقدار [values] کے ایک مربوط نظام کی حامل ہوتی ہے۔ value loaded اور value specific یا value oriented ہوتی ہے۔ اس نظام فکر کا [جس کے تحت مغرب میں یہ ترقی ممکن ہوئی ہے] نقطہ ماسکہ "لذت" ہے۔ اُس کی ہر ایجاد اور دریافت لذت اندوزی اور تعیش پسندی کے حصول، اس کے دائرے کی وسعت اور اس کی راہ میں درپیش مسائل اور مشکلات کو دور کرنے کے لیے ہے۔ نفس کے ہر تقاضے اور مطالبے کو جدیدیت کے لٹن سے ظہور کرنے والی جدید سائنس نے جس طرح ممکن بنایا ہے اور جس طرح نفس کی پرستش کے عملی وسائل مہیا کیے ہیں، آج یہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اس کے نتیجے میں نفس کے تڑکیے کے امکانات رفتہ رفتہ ناکارہ ہوتے جا رہے ہیں۔ سائنسی ایجادات چوں کہ ہمارے سامنے آخری تیار شدہ حالت [finished form] میں آتی ہیں، اس لیے ہماری نظر اور توجہ اُس کی ظاہری چمک دمک پر مرکوز اور فوری فوائد تک محدود ہو جاتی ہے۔ ہم یہ تصور کر لیتے ہیں کہ اُس شے کی تیاری کا پورا عمل فطری اور حلال طریقے سے عمل میں آیا ہے اور یہ ایجاد و اکتشاف کائنات کے اصول فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

محیر العقول تیکنیکی ترقی کے ہولناک نتائج: مغربی مفکرین کا اعتراف:

حالاں کہ ان ایجادات اور صنعتی ترقی کے انبار کے پس پشت نقصانات، ہولناکی اور ہوسناکی کی ایسی داستان پوشیدہ ہے جس نے، انسان اور کائنات دونوں کو اندھی طاقتوں [blind forces] کے سپرد کر دیا ہے۔ بحر و بر میں فساد برپا کر کے تسخیر کائنات کے نام پر تدفین کائنات کا پورا سامان مہیا

1- A. F. Chalmers, *What is this Thing Called Science?: an Assessment of the Nature and Status of Science and its Methods*. England: Open University Press, 1988, p. 119.

کر دیا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کی بندگی سے نکال کر مشین کی غلامی میں مبتلا کر دیا ہے۔ جدید سائنس کا دعویٰ تھا کہ وہ مابعد الطبیعیات سے ماورا ہو کر آزادانہ طور پر سائنسی تجربات سے مشاہدات اخذ کر کے نتائج حاصل کرتی ہے، حالاں کہ یہ دعویٰ کذب محض ہے، جو اب خود مغرب میں رد ہو چکا ہے۔ جدید سائنس کا پورا تانا بانا، خاص فلسفے، تاریخ و تہذیب اور مخصوص اہداف و مقاصد اور مابعد الطبیعیات سے برآمد ہوا ہے جو آزادی [Freedom]، ترقی [Development] بہ ذریعہ سرمایہ [capital] سے ابھرتا ہے۔ اس لیے عصر حاضر میں تبدیلی اور تغیر کا سبب سائنسی ایجادات کو سمجھنا نادانی ہے، اس ہمہ گیر تغیر کا اصل سبب وہ سائنسی نظریات ہیں جو سترہویں صدی میں ایک نئی مابعد الطبیعیات کے زیر اثر تاریخ انسانی میں جدیدیت اور روشن خیالی کے نام سے پیش کیے گئے۔ جنہوں نے انسان، کائنات، خدا، آخرت، زندگی اور مقصد زندگی سے متعلق تمام قدیم مابعد الطبعی تصورات کو ظلمت [Dark Ages] قرار دے کر رد کر دیا۔ عصر جدید میں آزادی اور ترقی کا غیر ماڈی تصور ممکن ہی نہیں رہا، یہاں آزادی کے آزار [Agony of freedom] سے نجات دلانے کا کام مزید آزادی [More Freedom] یعنی آزادی کے مزید ذرائع [more resources for freedom] کے ذریعے مہیا کیا جاتا ہے، جس کے اظہار کی واحد صورت مارکیٹ [Market] ہے، جہاں سرمائے [capital] کے بغیر آزادی و ترقی کا اظہار نہیں ہو سکتا، اس لیے سرمایہ [capital] ہی عہد حاضر کا خیر، سچ اور حق ہے۔ تمام رشتے، نا طے تعلقات اور خستہیں صرف اور صرف سرمائے کے منہاج پر رکھی جا رہی ہیں، ہر تعلق پیسے سے شروع ہو کر پیسے پر ختم ہو رہا ہے، ہم مارکیٹ سوسائٹی میں جی رہے ہیں، گھر، دفتر، اسکول غرض خواب گاہ تک میں ہر لمحہ ہم مارکیٹ میں بسر کرتے ہیں، کچھ نہ کچھ بیچتے یا خریدتے رہتے ہیں یا خریدنے اور بیچنے کی منصوبہ بندی میں مصروف رہتے ہیں، لیکن ہمیں نہ اس کا علم ہوتا ہے نہ اندازہ۔ اس جبر کی ایسی ایسی صورتیں ہیں کہ انسان اگر غور کرے تو دنگ رہ جائے، کہ وہ کیسی سنہری زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، زنجیر سنہری ہو یا لوہے کی، بہر حال وہ ہوتی زنجیر ہی ہے اور قید کی علامت۔ اسی لیے فلاسفہ مغرب اب اعتراف کر رہے ہیں کہ جدید سائنسی ترقی نے ہمیں ہلاکت کے مہیب و عمیق غار میں ڈھکیل دیا ہے،

۱- اس سلسلے میں فلاسفہ اور مفکرین مغرب کی درج ذیل کتابوں کا مطالعہ بھی مفید رہے گا:

- [1] Edmund Husserl, *The Crisis of European Sciences and Transcendental Phenomenology: An Introduction to Phenomenological Philosophy*, Evanston: Northwestern University Press, 1970.
- [2] Martin Heidegger, *The Question Concerning Technology, and Other Essays*, New York: Harper Collins, 1982.
- [3] Erich Fromm, *The Sane Society*, New York: Routledge Classics, 2002.
- [4] Erich Fromm, *Escape from Freedom*, New York: Open Road Media, 2013.
- [5] Alvin Toffler, *Future Shock*, New York: Bantam Books, 1990.
- [6] Herbert Marcuse, *One-Dimensional Man: Studies in the Ideology of Advanced Industrial Society*, Boston: Beacon Press, 1991.



ہائیڈرگر Heidegger کا کہنا ہے:

Western civilization had become spiritually bankrupt and that a radical Transvaluation of values was needed.<sup>1</sup>

برٹریڈ رسل Bertrand Russell کا کہنا ہے کہ اس کترہ ارض پر انسانیت کا آخری دور ہے جسے سائنس معدوم کرنے جا رہی ہے، وہ مشین جس کی اس قدر تعریف کی جا رہی ہے، عصر حاضر کا شیطان ہے جس کی عبادت ایک نئی طرز کی عفریت پرستی ہے۔

We are perhaps living in the last age of man, and, if so, it is to science that he will owe his extinction. .... This really won't do. The idolatry of the machine is an abomination. The Machine as an object of adoration is the modern form of Satan, and its worship is the modern diabolism.<sup>2</sup>

لیوس ممفورڈ [Lewis Mumford, 1895-1990] نے اس شیطانی تہذیب کے ذریعے

پروان چڑھنے والے انسان کی کیفیت ان لفظوں میں بیان کی ہے:

Modern Man has infact been painfully Committing Suicide.<sup>3</sup>

Aldous huxle نے صاف صاف بتایا ہے کہ ”اخلاقی قیود و اقدار سے آزاد اس سائنس نے

انسان سے آزادی اور دنیا سے امن دونوں سلب کر لیا ہے۔“

ان تمام اعترافات کے مطالعے کے بعد کوئی ہوش مند قطعاً اس انسان دشمن تہذیب کے خونی

ہاتھوں سے ملنے والی ترقی کو مسلمانوں کے لیے قبول کرنے کا مشورہ نہ دے گا، اور اس پر واضح ہو جائے گا کہ

یہ Value Neutral نہیں بلکہ Value Specific ہے کیوں کہ وہ مابعد الطبیعیاتی تصورات

اپنے ساتھ لاتی ہیں اور سائنس تو بہت دور کی چیز ہے، بچوں کے کھلونے تک Value neutral

نہیں بلکہ Value Oriented اور Value loaded ہوتے ہیں۔ مغرب سے درآمد شدہ

کھلونوں مثلاً باربی ڈول ہی کے خدو خال، رنگ روپ، اعضا کی بناوٹ اور غمزے و عشوے ایک خاص

1- David E. Roberts, *Existentialism and Religious Belief*, New York: Oxford University Press, 1959, p. 149.

2- Bertrand Russell, *The Impact of Science on Society*, New York: AMS Press, 1968, pp. 76, 60.

3- Lewis Memford, *The Condition on Man*, London: A Harvest / HBJ Books 1973, p.264.

تہذیب و تمدن اور اقدار و ثقافت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس ترقی کے ہاتھوں پروان چڑھنے والی تہذیب نے انسانیت پر نزاع کا عالم طاری کر دیا ہے، آج کا انسان [modern man] تمام تر سائنسی لاؤ لشکر اور علوم و عقلیت کے اسلحے سے لیس ہونے کے باوجود ہلاکت کے مہیب و عمیق کھو میں گر رہا ہے، اُس کا چہرہ بھلے شفاف، چمک دار اور لطیف ہو مگر باطن اتنا ہی ظلمت زدہ اور کثیف ہے۔ وہ انتہائی زخم خوردہ اور دکھی ہے۔ وہ اپنی زندگی میں توازن، اعتدال اور ٹھہراؤ کی معدومیت سے پریشان ہے۔ اس تہذیب میں ”انسان“ ناپید ہو گیا ہے۔ وہ حصولِ تسکین و یقین کے لیے ہر حربہ و طریقہ آزما چکا ہے، لیکن قلبی سکون اور روحانی سرور کا انخلا اُسے کھائے جا رہا ہے اس سلسلے میں مغرب ہی کے ایک مفکر کا عبرت انگیز اقتباس دیکھیے جس میں LeComte کی کتاب کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

The aim of author is specifically human. He is convinced that the modern uneasiness arises mainly from the fact that intelligence has deprived man of all reason for existence by destroying in the name of science still in cradle, the doctrines which up till now gave a meaning to unindividual life, a reason for effort, a transcendent end to attain: namely, the religion. ۱

”اس بات پر یقین ہو گیا ہے کہ موجودہ دور کی بے چینی خاص طور پر اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ عقل نے سائنس کے نام پر، جو ہنوز گوارا اطفال میں ہے، انسانوں کو زندہ رہنے کے لیے ہر قسم کی اُمنگ اور معقولیت سے محروم کر دیا، اس نظریہ حیات کو — مذہب کو — ہی ختم کر ڈالا جو ابھی تک زندگی کا مفہوم متعین کرتا تھا، جو جدوجہد میں حصہ لینے کے لیے انسان کو ابھارتا تھا، جو مادیت سے ما فوق ایک نصب العین عطا کرتا تھا“۔

انیسویں صدی میں نیٹشے [Nietzsche, 1844-1900] نے کہا تھا کہ ”خدا مر گیا ہے“ مگر بیسویں صدی میں مابعد جدیدیوں نے کہا: ”یہ انیسویں صدی کا مسئلہ تھا کہ خدا مر گیا، اب بیسویں صدی کا مسئلہ یہ ہے کہ ”انسان بھی مر گیا“۔ جو خدا سے کسی قسم کا خواہ مثبت یا منفی رشتہ چاہے۔ بالفاظِ دیگر انسان کی

1- Pierre Lecomte do Noüy, *Human Destiny*, Longmans: Green and Co., 1947, p. 13.

موت خدا کی موت کا منطقی نتیجہ ہے۔ مشہور اطالوی پس جدید مفکر Vattimo لکھتا ہے:

Post modernism would then be understood as the "DEATH OF MAN" or of humanism and its faith in human power and transcendence, as well as of God; The end of all attempts to discover ultimate "Origins" or a certain method, or to revolutionize human consciousness.<sup>1</sup>

1- Gianni vattimo, *The End of Modernity: Nihilism and Hermeneutics in Postmodern Culture*, [Trans., Jon R. Snder], Baltimore: John Hopkins University Press, 1988, pp.31, 47.

## اسلام — دینی اور علمی منہاج

ڈاکٹر منظور احمد: فرسودگی اور نظر ثانی کا طریقہ

دین نے انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کا جو ضابطہ مقرر کیا ہے، اس کا سب سے اہم موضوع حکم شرعی اور اس کو جاننے کے ذرائع کا تعین ہے۔ بعض گروہوں کا خیال ہے کہ اس ضابطے کی اساس عقل انسانی ہے۔ انسان اپنی عقل سے یہ فیصلہ کرے کہ وہ انسانی زندگی کو کس طرح مربوط و منظم طریقے پر استوار کر سکتا ہے۔ شریع سماویہ کا عموماً اور اسلام کا خصوصاً یہ دعویٰ ہے کہ حکم شرعی کا اصل الاصول وحی الہی ہے، اس لیے کہ انسانی عقل کے فیصلے نہ تو ہر ایک کے لیے مشترک و متفقہ طور پر حجت ہو سکتے ہیں اور نہ ہی عقل مفادات، جذبات، خواہشات اور ذاتی مصلحتوں سے ماورا ہو سکتی ہے۔ صرف وحی الہی کی یہ خاصیت ہے کہ وہ معروضی ہوتی ہے، اس میں ذاتی مفاد اور مصلحت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا اور وہ تمام انسانوں کی فلاح و بہبود اور کامرانی و کامیابی کی یکساں طور پر ضامن ہوتی ہے۔ اس لیے شریعت اسلامی نے انسانی زندگی کے نظام کی بنیاد کو وحی الہی کے ذریعے طے کر دیا ہے۔ بالفاظ دیگر انسانی زندگی کا مدار جن کلیات پر ہے اور جن کے تعین میں عقل انسانی کے بہکنے اور بھٹکنے کے امکانات تھے، شریعت نے اسے از خود متعین کر دیا، خیر و شر کے معیارات اور حق و باطل کے پیمانے مقرر فرما دیے۔ عقل انسانی کو اس حصار میں اجازت ہے کہ وہ جتنی چاہے تفصیلات، توضیحات، تفہیمات اور تشریحات پیش کرے اگر وہ ان بنیادی احکام کے موافق ہیں تو قابل قبول ہیں اور اگر معارض ہیں تو مردود۔

اسلامی شریعت میں حاکم اور حکم شرعی کو جاننے کا ذریعہ صرف فقہ نہیں بلکہ ایمانیات سے متعلق ہے اور اس کا جواب علم العقائد کی رو سے یہ ہے کہ حاکم اللہ تعالیٰ ہے، یہی توحید ہے اور اس کے احکام کا مجموعہ اس کی کتاب ہے، اسی لیے تمام فقہاء کے یہاں یہ جملہ مشترک ہے:

الحاکم و المشرع المکلف هو اللہ سبحانہ و تعالیٰ .

”یعنی حکم دینے والا اور احکام شریعت کا مکلف بنانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔“

اس حکم کو قوی تشریح اور عملی نمونے کے ساتھ بندوں تک پہنچانے والی ذات رسول کی ہے، یہ رسالت

ہے، اور بندگانِ خدا کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ اور رسول کے درمیان مکالمے اور رابطے کی عمومی صورت وحی ہے، جو عموماً فرشتے کے ذریعے انجام پاتی ہے، اس کی توضیح ایمان بالملائکہ سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمانیات کے ان تینوں ابواب کو ایک آیت میں جمع کر دیا ہے:

أَمِنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَيْكَتِهِ وَ  
كُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ  
رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ [۲۸۵:۲]

”رسول [اللہ] اس کتاب پر جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل ہوئی ایمان رکھتے ہیں اور مومن بھی۔ سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں [اور کہتے ہیں کہ] ہم اس کے پیغمبروں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ اور وہ [اللہ سے] عرض کرتے ہیں کہ ہم نے [تیرا حکم] سنا اور قبول کیا۔ اے رب ہم تیری بخشش مانگتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

اصولی طور پر علم العقائد ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وحی، یعنی کلام اللہ اور اسوۂ رسول، حکم شرعی کا حقیقی مصدر اور حتمی ماخذ ہے۔ اگر کتاب اللہ انْ هُوَ الْوَحْيُ الْيُوحَىٰ [۴:۵۳] کا نام ہے تو سنت انْ تَبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيْ [۵۰:۶] کا۔ اس صراحت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کتاب و سنت فی الاصل دوا لگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہے: وحی۔ اگر کتاب اللہ متن [text] ہے تو سنت اس کی شرح ہے جو متکلم کی منشا کے عین مطابق ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے براہِ راست اور بلا واسطہ مخاطبین کے لیے یہ متن اور شرح یکساں درجے کی حجیت کے حامل تھے لیکن بالواسطہ مخاطبین کے لیے بہ اعتبار حفاظت و ثبوت، مصادر فقہ میں کتاب اللہ کو اولیت ملی اور سنت کو ثانویت، نیز سنت کے لفظی ثبوت اور معنوی صحت کے لیے کتاب اللہ سے مراجعت اور موافقت ضروری ٹھہری۔ اس لیے شریعت اسلامی کے لیے اصل اور بالذات ماخذ وحی الہی ہے یعنی کتاب و سنت اور بقیہ تمام ماخذ ان دونوں کاخذ کی سند کی بنیاد پر مصدر بن سکتے ہیں۔ روایتی علما قانون الہی کے اس تقابلی منابح کا، جسے کلاسیکی فقہانے وحی الہی کی روشنی میں اجماعاً متعین کیا ہے، مکمل دفاع کرتے ہیں اور ان فقہی اصولوں پر قانون کے اطلاق و نفاذ کے لیے طریق استعمال اور مہیا کرنے کے امکانات کو قبول کرتے ہیں، لیکن یہ سارا عمل ہمیشہ روایتی فقہی اصولوں کی بنیاد پر ہی ممکن ہے۔

ڈاکٹر منظور احمد صاحب مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب روایتی علمی منہاج پر اصرار کو قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے تقریباً فہم کے لیے اپنی تحریروں میں مسلمانوں کے روایتی علمی منہاج پر نظر ثانی کا طریقہ بھی

تجویز فرمادیا ہے۔ اسلامی سیاق [context] میں علمی منہاج [epistemological paradigm] سے مراد وہ شرعی دلائل ہیں جن سے احکام شرعیہ کا استنباط و استخراج کیا جاتا ہے۔ وہ چار ہیں:

[۱] کتاب اللہ۔

[۲] سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

[۳] اجماع امت۔

[۴] اجتہاد۔

---

## ماخذِ اول — کتاب اللہ

قرآن مجید انسانوں کی ہدایت و سرفرازی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری [final] اور دائمی [eternal] دستاویز ہے، جو بہ ذریعہ وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اس کی لفظی و معنوی حفاظت کا وعدہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لیا ہے۔ یہ قانون شرعی کا اصل الاصول اور بنیادی سرچشمہ ہے۔ اس کا ایک ایک حکم اٹل ہے اور زمان و مکاں کی حد بند یوں سے ماورا بھی۔

عصر حاضر میں قرآن کے کلام الہی ہونے کو بہ طور علمی قضیہ ماننا ممکن نہیں: منظور احمد: ڈاکٹر منظور احمد صاحب اگرچہ نیاز فتح پوری کی طرح کھل کر اپنے عقائد کا اظہار کرتے ہوئے یہ نہیں فرماتے کہ قرآن مجید کلام اللہ [Word of God] نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے پوری امت کے اس عقیدے کو، کہ قرآن مجید کا حرف حرف ما انزل اللہ ہے، ایمانی یا غیر علمی قضیہ قرار دے دیا ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد لکھتے ہیں:

”انسان اپنے زمان و مکان کی کُلّی علمی کائنات [universe of knowledge] سے باہر نکل کر نہیں سوچ سکتا۔ جس طرح اب سے چودہ سو سال پہلے کے عربوں کے لیے ناممکن تھا کہ وہ قرآن کو خدا کا کلام اسی طرح نہ مانیں جس طرح ان کا اپنا کلام ہوتا ہے۔ اسی طرح آج کے ذہن کے لیے اس بات کو عربوں کی طرح قیاس کرنا بعید از قیاس ہے۔ یہ ایمانی عمل کی حیثیت سے تو تسلیم کیا جاسکتا ہے، لیکن اس بات کو علمی قضیے کے طور پر پیش کرنا آج کی علمی فضا میں ممکن نہیں ہے۔ ممکن ہے کل کی علمی فضا آج سے بھی مختلف ہو اور آئندہ بہت سے کونی [cosmic] اور ما بعد الطبیعیاتی [ontic] تصورات کا طرز تفہیم بدل جائے گا۔“

”اب سے چودہ سو سال پہلے کے عربوں کے لیے ناممکن تھا کہ وہ قرآن کو خدا کا کلام اسی طرح نہ مانیں جس طرح ان کا اپنا کلام ہوتا ہے۔“ یہ فقرہ بلا حوالہ اور انتہائی مبہم ہے۔ — یہ ایک تاریخی حقیقت

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۶۹۔

ہے کہ عرب اپنی تمام تر فصاحت و بلاغت اور طلاقت کے باوصف قرآن کے شکوہ اور صولت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مشرکین عرب غلاف کعبہ کے پیچھے چھپ کر کلام الہی سنتے تھے، فصحاء عرب نے اللہ تعالیٰ کو سجدہ بعد میں کیا ہے، پہلے وہ اس کلام مقدس کے روبرو سجدہ ریز ہوئے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی پر نازل فرمایا تھا۔ عرب قرآن کو غیر انسانی اور الہامی کلام تو مان ہی چکے تھے لیکن وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا پیغمبر اور فرستادہ ماننے سے انکاری تھے۔ قرآن حکیم کا فکر و تدبر سے مطالعہ کرنے والوں، عہد جاہلیت کے شعر و ادب سے واقفین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت کی تاریخ پر نظر رکھنے والوں کے لیے یہ حقائق اجنبی نہیں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ آج کل کی علمی فضا میں قرآن کو ”علمی قضیے“ کے طور پر پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر واقعہ ڈاکٹر صاحب ایسا سمجھتے ہیں تو ان کا قرآن مجید کی تفسیر جدید، تاویل نو اور تفہیم جدید کا سارا مقدمہ ہی مسترد قرار پاتا ہے، اور قرآن حکیم سے مسائل کے حل اور احکام کے استنباط کے لیے رجوع ایک غیر علمی رویہ بن جاتا ہے۔ عہد حاضر کے علمی پیمانے ۱۸ویں صدی میں منظر عام پر آئے ہیں۔ ان علمی پیمانوں پر بھی کوئی اتفاق و اجماع نہیں ہے۔ ان میں اختلاف کی کئی سطحیں موجود ہیں۔ ہیگل اور وگنٹسٹائن ہی کو لے لیا جائے، جن سے ڈاکٹر صاحب بہت اخذ و استفادہ کرتے ہیں، کیا ان کے فلسفیانہ افکار کو دیگر عبقری فلاسفہ نے اسی طرح قبول کیا ہے جس طرح ڈاکٹر صاحب انھیں فلسفے سے ناواقف قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

قرآن کا کلام الہی ہونا قابل تصدیق نہیں:

اس مختصری وضاحت کے بعد اب اگر ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ اقتباس کی فلسفیانہ منہاج میں تفہیم کے لیے فلسفے کی ابتدائی کتابوں میں بیان کی ہوئی ایک مثال پر غور کیا جائے تو قرآن مجید کے ”علمی قضیے“ نہ ہونے سے متعلق ڈاکٹر صاحب کی مراد واضح ہو جائے گی۔ اگر کوئی شخص مجھ سے یہ کہے کہ میرے سامنے ایک میز رکھی ہے تو قبل اس کے کہ میں یہ فیصلہ کر سکوں کہ وہ جملہ درست ہے یا غلط، میرے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ بالآخر یہ سمجھوں کہ اس جملے کا معنی و مفہوم کیا ہے؟ گویا اس جملے کا مفہوم وہ احساسات ہی ہیں کہ جو میز کے تصورات سے وابستہ ہیں۔ یعنی یہ کہ میں نے پہلے میزیں دیکھی ہوئی ہیں اور ہمارے سابقہ تجربے نے ہم کو یہ سکھا دیا ہے کہ آخر کار اس لفظ ”میز“ سے ہماری مراد ایک خاص قسم کی چیز ہی ہے اور اسی واسطے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے لفظ ”میز“ کا مفہوم آتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی مجھ سے یہ کہے کہ یہ عالم ایک کُل ہے جو کہ تمام اختلافات اور تضادات کا ایک امتزاج ہے، تو ایسا جملہ بے معنی اور لغو ہوگا باوجود اس کے کہ اس جملے کے قواعد و ضوابط سے ہم مانوس معلوم ہوتے ہیں۔ کیوں کہ میں اپنے حواس سے اس بات کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتا کہ یہ ”کُل“ آخر کس قسم کی چیز ہے۔ چنانچہ اگر کوئی دوسرا شخص مجھ سے یہ کہے کہ یہ عالم ایک ”کُل“ ہے جو تضادات و اختلافات کا ایک عظیم تر



مظہر ہے تو باوجودیکہ یہ دونوں ہی جملے ایک دوسرے سے متضاد ہیں، ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ان جملوں میں کون سا جملہ صداقت پر مبنی ہے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ جملے گو کہ با معنی معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقتہً یہ معنی و مفہوم سے عاری جملے ہیں کیوں کہ تجرباتی طور پر ان اصطلاحوں کی ”صداقتی قدر“ کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی نوعیت بالکل ایسے من گھڑت لفظوں کی سی ہے جنہیں کوئی شخص یوں ہی گھڑیا تراش لیتا ہے اور پھر یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ اُس کا ان الفاظ سے کوئی مطلب بھی ہے۔<sup>۱</sup>

ڈاکٹر صاحب کا قرآن مجید کے کلام الہی ہونے کو ”علمی قضیہ“ ماننے سے انکار کا دعویٰ ان ہی معنوں میں ہے۔ یہ تصور منطقی ایجابیت پسندوں سے مستعار و ماخوذ ہے۔ اُس کے مطابق با معنی [علمی] قضایا کو بے معنی [غیر علمی] قضایا سے الگ کرنا ضروری ہے۔ با معنی قضیہ ایسے قضیے کو کہا جاتا ہے جو قابل تصدیق یا قابل تکذیب ہو:

A meaningful proposition as one which is either empirical or analytic. If we agree with distinction and if we accept the definition, then we must conclude that metaphysical propositions are meaningless.<sup>۲</sup>

یعنی وہ تمام قضایا جن کی تصدیق یا تکذیب حواس کے ذریعے نہیں ہو سکتی، بے معنی [غیر علمی] قضیے ہیں۔ مثلاً خدا، وحی، جنت و جہنم، قرآن کا کلام الہی ہونا وغیرہ۔ اسی طرح مثلاً سورج نکلا ہوا ہے یا نہیں، بارش ہو رہی ہے یا نہیں، با معنی [علمی] قضایا ہیں کیوں کہ ان کی حسی و مشاہداتی تصدیق یا تکذیب ہو سکتی ہے۔ اسی لیے منطقی ایجابیت [logical Positivism] کے مطابق وہ قضایا جو مذہب، اخلاق اور جمالیات کے تصورات سے بحث کرتے ہیں، سب بے معنی [غیر علمی] ہیں کیوں کہ ان علوم کے قضایا کی حسی تصدیق یا تکذیب نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر منظور احمد وٹکنسٹائن کا موقف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مہمل جملوں [Nonsensial] کی ایک تیسری قسم، جس کو ہم ذرا عمیق قسم کہہ سکتے ہیں، وہ جملے ہیں جو مذہب اور اخلاق کے ماورائی اور متصوفانہ رموز سے متعلق ہیں۔ یہ جملے بھی، وٹکنسٹائن کے نزدیک، کسی امر واقعہ کا اظہار نہیں ہیں۔“<sup>۳</sup>

وٹکنسٹائن کے موقف کی وضاحت کے علاوہ خود ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے بھی اپنی کتاب میں کسی قضیے کے علمی [با معنی] ہونے کے لیے یہی شرط رکھی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ خدا کی طرف سے بنایا ہوا کوئی قانون ایمان کا جز تو ہو سکتا ہے: ”لیکن علمی قضیہ نہیں، اس لیے کہ اُس کو کسی علمی معیار سے صحیح یا غلط

- ۱- تفصیل کے لیے دیکھیے: قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کے بنیادی مسائل، اسلام آباد پبلیشنگ فاؤنڈیشن، ۲۰۰۰ء، صفحات ۱۸۲-۱۸۵۔
- ۲- یہ سوال بہ ہر حال حد درجے قابل غور ہے کہ کیا وٹکنسٹائن اور دیگر منطقی ایجابیت پسندوں کے افکار کو دیگر عمیقی فلاسفہ نے اسی طرح قبول کیا ہے جس طرح ڈاکٹر صاحب اسے بہ طور بدیہی حقیقت پیش فرما رہے ہیں؟
- 3- S. Korner, Kant, England: Penguin Books, 1977, p. 17.
- ۳- منظور احمد، ”لڈوگ وٹکنسٹائن“ مشمولہ تاریخ فلسفہ [مترجم، مولوی احسان احمد]، صفحہ ۲۲۸۔

کوئی قانون ایمان کا جز تو ہو سکتا ہے: ”لیکن علمی قضیہ نہیں، اس لیے کہ اُس کو کسی علمی معیار سے صحیح یا غلط ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ علمی معیار پر صرف وہ حقائق پرکھے جاسکتے ہیں جن میں صحت یا عدم صحت کا امکان ہوتا ہے اور یہ قضیہ کہ ”قانون قادر مطلق نے بنایا ہے“ عدم صحت کے امکان سے خارج ہے اس لیے علم کی بنیاد نہیں بن سکتا۔“

منظور احمد: قرآن ایمانی جہت سے کلام اللہ ہے: مفہوم و مراد:

قرآن کے کلام الہی ہونے کو علمی قضیہ ماننے سے تو ڈاکٹر صاحب نے انکار فرمادیا، ایمانی عمل کی حیثیت سے تسلیم کرنے کی گنجائش البتہ رکھی ہے۔ مگر کیا ڈاکٹر صاحب کے منہاج علم میں اس کی کوئی حیثیت بھی ہے؟ ایمانی عمل ڈاکٹر صاحب کے نزدیک کیا حیثیت رکھتا ہے، ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”یہ انسانوں کی پسند و ناپسند، قبولیت یا عدم قبولیت، افادیت یا عدم افادیت کے احساس سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں صادق اور کاذب کے زمرے میں نہیں آتیں۔ میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں، یہ میرا ذاتی فعل ہے۔“

ڈاکٹر صاحب کی نظر میں ”ایمان“ کی کیا حیثیت ہے، وہ لکھتے ہیں:

”ایمان وہ چیز ہے جو اپنے وجود کے لیے کسی استدلال کا مرہون منت نہیں ہے، ایمان کے لیے تو یہ بھی لازم نہیں ہے کہ وہ شے جس پر کوئی شخص ایمان لایا ہو وجود رکھتی ہو، یا اگر رکھتی ہو تو کسی خاص انداز سے۔“

خدا پر ایمان اس کے ہونے کو مستلزم نہیں: منظور احمد:

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے نزدیک قرآن مجید کے حرف کلام اللہ ماننا، بے معنی یا مہمل قضیہ ہے، اس طرح قرآن مجید علم کے دائرے سے باہر ہو گیا۔ اسے کسی علمی اختلاف کے ازالے یا عملی تنازع کے تصفیے کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا، یہ محض ایک کتاب صامت ہے جس پر ایمان لانا ہی کافی ہے اور ایمان کا علم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو بس ایک داخلی کیفیت ہے، ذاتی و انفرادی پسند و ناپسند ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کسی قضیے کو حقیقت مان کر ایمان لائے بیٹھے ہوں اور وہ موجود ہی نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ خدا پر ایمان لانا اُس کے موجود ہونے کو مستلزم

۱- منظور احمد، ”چند تعلیمی مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۸۱۔

۲- ایضاً، صفحہ ۱۶۲۔

۳- ایضاً، صفحہ ۱۸۰۔

۴- جب قرآن مجید کے حرف کلام اللہ ہونا غیر علمی قضیہ ٹھہرا، تو اُس سے ثابت و صادر ہونے والے احکام یا مستنبط و مستخرج مسائل کب دائمی ہو سکتے ہیں؟ اگر ڈاکٹر صاحب کی نظر میں قرآن عصر حاضر میں علم کے معیار پر پورا نہیں اترتا تو خود ڈاکٹر صاحب کا وہ سارا مقدمہ جو قرآن کی تفسیر نو، تشریح جدید، اور نئی تاویلات پر بنیاد رکھتا ہے از خود مسترد ہو جاتا ہے اور قرآن کو کسی بھی علمی قضیے میں زیر بحث لانا ایک غیر علمی رویہ قرار پاتا ہے۔

نہیں ہے، کیوں کہ یہ بات کہ خدا ہے یا نہیں ثابت نہیں ہو سکتی۔<sup>۱</sup>

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی یہ تصریحات حد درجے حیران کن ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مابعد الطبعی حقائق اور ایمان و اعتقادات کے اثبات کا پورا منہاج ان کی نظر میں درخور اعتنا نہیں، بلکہ یہ سب بچکانہ اور طفلانہ باتیں ہیں۔ — مخلوق کے لیے علم کے تین ذرائع ہیں حواس، عقل اور خبر۔ مابعد الطبعی حقائق اور باب ایمانیات سے متعلق امور اگرچہ امتیوں کے لیے خبر ہے۔ لیکن انبیاء و مرسلین کے لیے وہ باقاعدہ حسی تجربہ اور ذاتی مشاہدہ ہے جس کے ذریعے وہ مابعد الطبعی حقائق اور حیات انسانی کے لیے راہ نما اصولوں اور کلیات کا بہ راہ راست ادراک کرتے ہیں۔ امتیوں کے لیے مخبر صادق کی خبر پر اعتماد اور اس پر ایمان اپنے نقطہ کمال پر پہنچ کر شعور کی تمام سطحوں کو شاداب اور سیراب کرتی ہے اور یقین کا وہ حال پیدا کرتی ہے جو تجربے و مشاہدے کا لازمہ ہے۔ اس معرفت کے وسیلے سے غیب بھی مورد یقین بن جاتا ہے۔ اس لیے یہ ایک مسئلہ ہے کہ انسانی شعور کی دو جہتیں ہیں:

[۱] علم کے معروف ذرائع کی امداد و اعانت سے مجہول سے معلوم تک پہنچنا۔

[۲] حقائق کو ماننا اور ان کا اقرار کرنا انھیں معلوم کرنے کی جدوجہد میں پڑے بغیر۔

اگر انسانی شعور کی ان دونوں کار فرمایوں کو متوازن حالت میں برقرار نہ رکھا جائے تو پورا وجود اور شعور انسانی مہمل ہو جائے گا اور اس کی علمی و فکری زندگی کا جواز ختم ہو جائے گا۔

عصر جدید: کونیاتی و مابعد الطبعی تصورات کا طرز تفہیم:

ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ زمانے میں کونیاتی اور مابعد الطبعیاتی تصورات کا طرز تفہیم تبدیل ہو جائے گا۔ — زمانہ جدید سے سرسری واقفیت رکھنے والا بھی جانتا ہے کہ مابعد الطبعیاتی مسائل ہوں یا کونیاتی مسائل یہ عصر حاضر کے انسان کا مسئلہ ہی نہیں ہیں۔ عصر حاضر کے انسان کا صرف ایک ہی مسئلہ ہے اور وہ ہے آزادی۔ جو مارکیٹ میں ارتکاز سرمایہ کے عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ معیار زندگی میں مسلسل اضافہ عصر حاضر کے انسان کا مقصد ہے۔ عصر جدید کی پوری روح خواہ جدیدیت ہو یا مابعد جدیدیت اس کا تعلق مغرب کے فلسفہ مادہ پرستی سے ہے جس کی بے شمار اشکال لذت پرستی [hedonism] اشتراکیت، افادیت پرستی اور surrealism سے مل جاتی ہیں۔ آزادی کا مطلب عملی دنیا میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ سرمائے میں اضافے کے ہر امکان کو مادی دنیا میں بہ روئے کار لایا جاسکے۔ ایک ایسا انسان جو شہوت و شکم کی سطح سے اٹھنے کو تیار نہیں اس کے متعلق یہ پیشن گوئی کہ مابعد الطبعیاتی و کونیاتی تصورات کی تفہیم ان پر اثر انداز ہو سکے گی عصر حاضر سے ڈاکٹر صاحب کا غص بصر ہے۔ — عصر حاضر اور اس کے انسان کے اہداف و مقاصد کے متعلق خود مغرب میں بہت لکھا جا چکا ہے۔

۱- منظور احمد، "چند تعلیمی مسائل"، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۶۲۔

قرآن میں بیان کردہ احکام ماورائے زمان و مکان نہیں: منظور احمد:

ڈاکٹر صاحب پورے قرآن مجید کو ابدی حقائق کا مجموعہ نہیں سمجھتے کہ انسان اس کتاب کو پورے کا پورا اپنالے۔ چوں کہ ڈاکٹر صاحب مسلم معاشرے میں رہتے ہیں اس لیے کھل کر اظہار سے ڈرتے ہیں، لہذا ان کا بہ تکلف موقوف یہ ہے کہ قرآن مجید کے بعض حصے ایسے ہیں جو بنیادی اور اصولی اقدار کے حامل ہیں، جنہیں وہ ”دین“ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور بعض حصے وہ ہیں جو وقتی نوعیت کے تھے، یعنی جب کلام پاک نازل ہوا تھا وہ اُس وقت تک کے لیے قابل اطلاق اور لائق عمل تھے، مگر اب چوں کہ وقت اور حالات تبدیل ہو چکے ہیں، لہذا اُس حصے پر عمل کو لازمی قرار دینا رجعت پسندی اور حالات سے عدم واقفیت ہے۔ اب دین کی روح، قدر اور کلیت کو سامنے رکھتے ہوئے اُن احکام و حدود میں وقت اور حالات کے تحت تبدیلی کی جاسکتی ہے بلکہ تبدیلی ناگزیر ہے کیوں کہ شریعت جزئی [particular] مدرک بالحواس بہ قید زمان و مکان ہے، کلی [universal] یعنی ماورائے زمان و مکان نہیں ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”حضرت عمر فاروق قرآن کے معاشرتی مسائل سے متعلق قرآنی احکامات کو جزئی سمجھتے ہیں، کلی نہیں۔ البتہ اُن کی نظر اُس کلیت تک ضرور پہنچ گئی تھی جو خصوصی احکامات کے پس پشت کار فرما تھا، اُن کے ایسے فیصلوں میں جو بہ ظاہر قرآن کے مغایر نظر آتے ہیں۔ یہی فلسفہ کار فرما تھا۔“

جناب منظور احمد نے جو بات سیدنا فاروق اعظمؓ سے منسوب فرمائی ہے کہ وہ احکام قرآنی کو جزئی سمجھتے ہوئے اُسے شریعت کا کوئی ابدی اور دائمی حکم نہیں سمجھتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے فتاویٰ اور فیصلوں سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ کسی حکم کا اصولی طور پر واجب الاتباع نہ ہونا اور مخصوص حالات میں کسی حکم کے اطلاق و نفاذ میں کسی شرعی مصلحت کو ملحوظ رکھنا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ لیکن شرعی احکام کے نفاذ میں سیدنا عمرؓ نے مختلف حالات کے موافق سختی یا نرمی برتی ہے یا جرم کی نوعیت اور مجرم کے حالات کو پیش نظر رکھا ہے، اگر اس کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ وہاں

- ۱- منظور احمد، ”اسلام اور پاکستان“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۲۳۔
- ۲- مثال کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے موقعوں پر چوروں کے ہاتھ کاٹنے سے منع فرمایا ہے: لا یقطع الایدی فی الغزو، [محمد بن عیسیٰ الترمذی، سنن الترمذی، کراچی: قدیمی کتب خانہ [س-ن]، ابواب الحدود، باب ما جاء أن لا یقطع الایدی فی الغزو، جلد ۱، صفحہ ۲۶۹]۔ حالانکہ قطع ید اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سزاؤں اور حدود میں سے ایک حد ہے، لیکن چوں کہ جنگ کے دوران اقامت حد میں اندیشہ ہے کہ مجرم شیطانی حمیت اور نفسانی جوش سے مغلوب ہو کر کفار و مشرکین سے جا ملے گا اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے نزدیک حدود کے معطل یا مؤخر ہو جانے سے زیادہ مبغوض ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران جنگ اس کے نفاذ سے منع فرمادیا۔ جسے بعد میں فقہانے اس اصول میں ڈھالا کہ: ان الحدود لا تقام فی ارض العدو [دشمن کی سرزمین پر حدود اللہ قائم نہ کی جائیں] [ابن القیم الجوزی، اعلام الموقعین عن رب العالمین، فصل النهی عن قطع الایدی فی الغزو، جلد ۲، صفحہ ۳۳۱]۔

ان مخصوص حالات کے پیش نظر سیدنا عمرؓ کا فیصلہ شارع کی منشا اور اس کے بیان فرمودہ اصولوں کے عین مطابق ہے۔ اس لیے سیدنا عمرؓ کے بعض فیصلوں کا گہرائی میں مطالعہ کیے بغیر ان سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کسی طرح درست نہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بجنہ حدود و احکام کو ابدی حکم نہیں مانتے تھے۔<sup>۱</sup>

منظور احمد: دین دائمی اور شریعت قابل تغیر ہے: ایک القباس:

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ:  
”شراعیہ انسانی ضرورتوں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں، البتہ وہ بنیادی اقدار جو ”دین“ ہیں، تمام انبیاء کی تعلیمات میں مشترک ہیں۔“<sup>۲</sup>

حضرت شاہ ولی اللہ سے منسوب اس عبارت پر تو اسی مقالے میں آگے گفتگو کی جائے گی — مندرجہ بالا القباس سے ڈاکٹر صاحب کا جو موقف مترشح ہوتا ہے وہ یہ کہ ”دین“ اور ”شریعت“ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ ”دین“ دائمی [eternal] اور آفاقی [universal] ہونے کے باعث سیدنا آدم علیہ السلام سے سیدنا خاتم علیہ السلام تک واحد اور مشترک ہے، جب کہ شراعیہ وقتی اور زمان و مکاں کی پابند ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ موقف دین محمدی کے سیاق [context] میں نادرست ہے۔ کیوں کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ”دین“ سے مراد محض مابعد الطبیعی مسائل و حقائق ہیں جو ناقابل تبدیل ہیں [اگرچہ ان کی بھی قہیمات و تعبیرات میں ڈاکٹر صاحب وقت اور حالات کی تبدیلی کے باعث تغیر کو ناگزیر سمجھتے ہیں] اور شریعت یعنی احکام و معاملات اور حدود و قضایا وغیرہ سب قابل تغیر و تبدیل ہیں۔ گویا دین فقط مجموعہ عقائد یعنی توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان لانے کا نام ہے اور باقی سب کچھ شریعت۔

اسلام کا بہ طور آخری شریعت دائمی ہونا تنقید سے بالا نہیں: منظور احمد:

اقبال پر نقد کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ اسلام آخری شریعت فراہم کرتا ہے اور اس میں کسی رد و بدل کی گنجائش برقرار نہیں رکھ سکتا، یعنی بنیادی طور پر شریعت ناقابل تبدیل ہے..... اقبال نے

۱- منظور احمد نے جو بات سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ذمے لگائی وہ ان سے ثابت بھی ہے یا نہیں، سردست اس سے بحث نہیں، کیوں کہ تمام جدیدیت پسند اپنی بات کے مسلمانوں میں اثر و نفوذ کے لیے کسی بڑے آدمی کا سہارا لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کسی بات کا حضرت عمرؓ سے منسوب ہو جانا ہی اس کی صحت و استناد کی کافی دلیل ہے۔ اسی لیے تمام جدیدیت پسند حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی کو اپنی الحاد پروری کے لیے بہ طور ذریعہ استعمال کرتے ہیں۔ اولیات عمرؓ فی الحقیقت ہیں کیا؟ ان سے جدیدیت پسندوں کا موقف واقعتاً ثابت بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ لیکن ایسے تمام الزامات و بیانات کا جو منظور احمد سمیت دیگر تمام جدیدیت پسندوں کی کتابوں میں سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ذمے لگائے گئے ہیں، ان شاء اللہ، عنقریب جواب دیا جائے گا۔

۲- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۷۱۔

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۷۷

اسلامی فکر کے اس دعوے کو بلا تنقید قبول فرمایا، ممکن ہے اس کی وجہ وہ دباؤ ہو جو پچھلے چودہ سو سال کی اسلامی فکر پیدا کرتی ہے۔<sup>۱</sup>

ڈاکٹر صاحب اسلام کے آخری شریعت ہونے کو تنقید سے بالا نہیں سمجھتے، انہوں نے اس اقتباس میں یہ بات واضح لفظوں میں تسلیم کی ہے۔ چودہ سو سال کی پوری اسلامی فکر، دین، اور احکام و قوانین کو دائمی و ابدی سمجھتی ہے، اس سلسلے میں کوئی نیا موقف اختیار کرنا چودہ سو سالہ اسلامی فکر کو غلط مان لینے پر اصرار کرنا ہوگا۔ دوسرے، ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا بھی ٹھیک نہیں کہ دین و شریعت کو دائمی اور ابدی بنا دینے کے لیے ماننا ”مسلمانوں“ کا دعویٰ ہے۔ یہ دعویٰ مسلمانوں کا نہیں بلکہ قرآن کا ہے، وہ ہمیں بتاتا ہے: لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ [۶۴:۱۰] ”اللہ کے کلمات [احکام و فرامین] بدلے نہیں جاسکتے۔“ وَلَا مَبْدَلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ [۳۴:۶] ”اللہ کے کلمات کو بدل دینے والا کوئی نہیں۔“ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَ لَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ [۳۰:۳۰] ”اللہ کی بنائی ہوئی ساخت میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا، یہی سیدھا دین ہے۔ اکثر لوگ جانتے نہیں۔“ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا [۲۳:۳۵] ”پس تم اللہ کے طریقے میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔“

قرآن مجید کی یہ آیات واضح کر رہی ہیں کہ دین اور اس کے احکام و فرامین زمانے کی گردش سے متاثر نہیں ہوتے، وہ اٹل اور دائمی ہیں۔ کیوں کہ ان کا صدور ایک ایسی ہستی کبریٰ اور حقیقتِ مطلقہ سے ہوا ہے جس کا علم محیط کل اور بصیرت لا محدود ہے، زمان و مکان کی قیود اس کے لیے بے معنی ہیں، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ مرور ایام سے یہ قوانین از کار رفتہ ہو جائیں۔ اب اس میں انسان کی طرف سے کوئی تبدیلی قانونِ فطرت کے خلاف ہوگی کیوں کہ وہ ماضی، حال، اور استقبال کے تمام حقائق سے واقف نہیں، ہر لمحے معانی کی ایک نئی کائنات آشکار ہو کر خود انسان پر اس کا جہل واضح و ثابت کر دیتی ہے۔

لفظ دین و شریعت مختلف تناظر میں مختلف مفہام کے حامل:

اسلامی تناظر میں کتاب و سنت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ کل کا کل دین ہے۔ شریعت اس دین کا ایک جزو و غیر منفک ہے، جسے کسی طور دین سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ جب کہا جاتا ہے کہ ”دین“ حضرت آدم علیہ السلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک واحد ہے تو اس سے مراد وہ امور ہیں جو اختلافِ شراعی سے نہیں بدلتے، یعنی ما بعد الطبعی امور یا حقائقِ غیبیہ اور چند احکام اور اخلاقیات۔ لیکن جب کہا جاتا ہے کہ اسلام ہمارا دین ہے تو اس سے عقائد، عبادات، احکام، معاملات اور اخلاقیات سب کچھ مراد ہوتا ہے۔ جب شریعت محمدی کی بات کی جاتی ہے تو اس سے کبھی احکام و عبادات مراد ہوتے ہیں اور کبھی اس میں ما بعد الطبعیات سے لے کر معاملات و اخلاقیات تک سب داخل و شامل ہوتا ہے۔ گویا

۱- منظور احمد، ”اسلامی فکر کی بصیرت اور اقبال“، مشمولہ اقبال شناسی، صفحہ ۲۲۔

ایک معنی میں دین و شریعت دو علیحدہ علیحدہ مفہوم کے حامل ہیں جب کہ دوسری صورت میں یہ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ جب ایک مسلمان دین محمدی کو اپنا دین کہتا ہے تو اس میں مابعد الطبیعیات، عبادات، احکام، حدود، معاملات اور اخلاقیات سب شامل ہیں۔ اب یہاں دین و شریعت ایک ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت تک ہمارا دین ہے اور ناقابل تبدیل بھی۔ ختم نبوت کا اقتضا ہی یہ ہے کہ دین محمدی اپنی مابعد الطبیعیات اور شریعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا محبوب اور پسندیدہ دین ہے اور اب تاقیام قیامت اسی کی اتباع لازمی ہے۔

عہد نبوی کی تعلیمات اور تفصیلات کو دائمی اور عالم گیر سمجھنا لازم نہیں: منظور احمد:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب ختم نبوت کے اس اقتضا کو بھی لازمی نہیں سمجھتے وہ لکھتے ہیں:

”مسلمانوں میں ختم نبوت کے ساتھ یہ نقطہ نظر بھی آ گیا ہے کہ جو طور طریقے رسول اللہ نے مقرر فرمائے ہیں، چاہے وہ وحی جلی کی بنیاد پر ہوں یا وحی خفی کی، ان میں نہ تو تبدیلی کی جاسکتی ہے اور نہ ترمیم..... تیسرا تصور ختم نبوت کے عقیدے سے ایک ایسا نتیجہ اخذ کرنے کے بارے میں تھا جو اگرچہ ممکن تو ہے لیکن لازمی نہیں اور یہ کہ زندگی گزارنے کی جو تفصیلات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں متعین ہو گئیں وہ بھی عالم گیر اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہیں“۔

یہاں بھی محترم ڈاکٹر منظور احمد صاحب ختم نبوت کی ہمہ گیری، جامعیت اور تقاضے کو نظر انداز کر گئے، ختم نبوت ان ہی معنوں میں تو ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے تمام احکام اپنی ہیئت اور حقیقت دونوں اعتبار سے دائمی ہیں۔ اتنی بات تو طے ہے کہ خدا کا دین ثابت اور محکم ہے، زمانے کا چلن دیکھ کر دین کو تبدیل کر دینا خود دین سے بغاوت ہے۔ ہر غالب تہذیب اور فکر کو ”الحق“ مان کر دین کو اس کے مطابق ڈھال دینے کی کوشش کرنا زمانے کی پیروی ہے، دین کی اتباع نہیں۔ البتہ زمانے کو دین کے مطابق چلا دینا ہی ختم نبوت کی وراثت اور انبیا کی حقیقی نیابت ہے۔ جدیدیت پسند زمانے کی اصلاح کی بجائے ”اسلام کی اصلاح“ کے درپے ہیں، حالاں کہ فی الاصل اسلام کا مقصد کسی باطل مطالبے کو پورا کرنے کا جائز طریقہ یا شرعی حیلہ بیان کرنا نہیں، بلکہ اُس باطل مطالبے اور تقاضے کو ختم کرنا ہے۔ جدیدیت پسند سرمایہ دارانہ طرز زندگی اور اس کے باطل مقاصد کو غیر متنازعہ، حقیقی، آفاقی، ابدی اور قطعی سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں، پھر اس کی آبیاری کے اسلامی حیلے تراشنے لگتے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کے لیے اس سے بڑی ذلت اور گم راہی کیا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے آخری دین کا امین ہو کر بھی زمانے کو دین کے مطابق بدل

۱- منظور احمد، ”چند توجہ طلب مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحات ۱۵۰-۱۵۱۔

دینے کے بجائے خود زمانے کی گردش کا شکار ہو کر اُس کی رُو میں بہنے لگے اور دین کو بھی اُسی رُو پر بہانے کی کوشش کرے۔ یہ طریق تمام انبیاء کی تعلیمات کے خلاف ہے اور دین کو مسخ کر دینے کی ایک کوشش۔

مذہبی حقائق میتھا لوجیز ہیں، ان کی رُو تشکیل ناگزیر ہے: منظور احمد:  
ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”ہماری تاریخ میں اور یہ صرف ہمارے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، ہر مذہب کی تاریخ میں اُس کے ماننے والوں نے ابتدائی ہدایت کی روشنی میں منطقی، فلسفیانہ، مابعد الطبیعیاتی، فقہی، معاشرتی اور سیاسی نظاموں کی مختلف mythologies تعمیر کی ہیں، غلطی اُن mythologies کی تعمیر میں نہیں اُن کو حق کا آخری اظہار مان لینے میں ہے، اسلام میں اب اگر کوئی نئی علمی نہج نکالنی ہے تو مذہب کے بنیادی احساس کو خیر باد کہے بغیر ان میتھا لوجیز کو deconstruct کرنا ہوگا۔ ڈیکنسٹرکشن سے مراد صرف اس قدر ہے کہ زمانے نے اُس پر علمیات کے جو پرت چڑھا دیے ہیں ان کو علیحدہ کر کے بنیاد تک پہنچا جائے اور اُس کی تفہیم پر ایک نئی عمارت تعمیر کی جائے، یہ نئی عمارت بھی ایک نئی میتھا لوجی ہو سکتی ہے جس کو آئندہ دوبارہ deconstruct کرنا پڑے، لیکن اس عمل کے بغیر ہم اس جوہر خاص تک نہیں پہنچ سکتے جو مذہب کی اصل روح ہے۔ یہ تاریخی عمل ہے اور اگر ہم مذہب کو اپنی زندگیوں سے خارج کرنے کو تیار نہیں تو اس طریق کار کو مسلسل چلتے رہنا چاہیے۔“

ڈاکٹر منظور احمد کے منہاج علم کے مطابق جب قرآن علم ہے ہی نہیں تو اس کی پرتیں اتارنے کی محنت و مشقت کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں! اگر کلام اللہ کسی تنازع کے تصفیے یا پیش آمدہ مسئلے کے حل کے لیے علمی طور پر معاون ہو سکتا ہے تو پھر اس تجویز اور بحث کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے، ڈاکٹر صاحب کے کلام میں یہ کھلاتا نقض ہے۔

فقہ اسلامی اساطیر کی طرح ہیں: منظور احمد:

مذہبی حقائق کو mythology [افسانہ کہن] کہنا ایک سنگین جسارت ہے۔ ڈاکٹر صاحب فقہ اور میتھا لوجی کے فرق کو نظر انداز کر گئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یونانی فلسفہ پڑھتے پڑھتے انھوں نے اسے فقہی مباحث کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔ فقہ کی بنیاد اسلامی منہاج علم میں ایک متعین عقلیت [guided rationality] پر مبنی ہے، جب کہ اساطیر [mythologies] سرے سے کسی عقلیت پر یقین ہی نہیں رکھتے۔ اسطور ایک ایسی کہانی کو کہا جاتا ہے جس کا آغاز بھلا دیا گیا ہو۔ ایسی کہانی جو تاریخی وجود تو رکھتی ہو لیکن واقعی شواہد سے محروم ہو۔ بالفاظ دیگر پسند عامہ کا حامل روایتاً مقبول جھوٹا اسطور کہلاتا ہے۔ اسی لیے

۱- منظور احمد، ”چند توجہ طلب مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحات ۱۵۱-۱۵۲۔



امام لغت جوہری کہتے ہیں: الاساطیر الاباطیل الترهات، اساطیر کے معنی ہیں: ”بیہودہ اور خرافات باتیں“۔ مذہب کی منطقی، فلسفیانہ، مابعدالطبیعیاتی اور فقہی تعبیرات [جسے ڈاکٹر صاحب Mythology کہتے ہیں] کو کسی نے حق کا آخری اظہار نہیں کہا، اگر کسی نے کہا ہے تو ڈاکٹر صاحب کو حوالہ پیش کرنا چاہیے تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب کی تحریروں سے تو پتا چلتا ہے کہ وہ خود اسلام ہی کو ”حق کا آخری اظہار“ ماننے میں شک وارتیاب کا شکار ہیں۔ جب کہ مسلمانوں کے نزدیک دین کی بنیاد ہی حق کی وحدت مطلق پر ہے مابعدالطبیعی اور قانونی و شرعی دونوں معنوں میں۔ دین کامل اور ختم نبوت کی حیثیت سے اسلام کا پہلا دعویٰ یہی ہے کہ حق اپنی حقیقت اور اجمال اور ظہور و تفصیل میں فقط مجھ میں منحصر ہے، اسلام سے باہر جو کچھ ہے وہ حق نہیں ہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب تو کتاب و سنت کی تعبیرات اور فقہی جزئیات ہی کو نہیں بلکہ خود نصوص میں وارد شدہ امور کو deconstruct کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ جو کچھ ڈاکٹر صاحب کے افکار عالیہ اور نیاز فتح پوری کے خیالات و نظریات ہیں کیا وہ مذہبی تعبیرات یا فقہی جزئیات سے اختلاف کے ضمن میں آتے ہیں یا اس سے خود دین ہی سے بغاوت ثابت ہوتی ہے؟ اب اگر کوئی ڈاکٹر صاحب کے یا نیاز فتح پوری کے اس طرز عمل سے اختلاف کرے اور اسے مسلسل اسلامی فکر کی روایت کے منافی طرز عمل قرار دے تو ڈاکٹر صاحب شکوہ کناں ہوتے ہیں کہ فقہی منطق ہمیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دے رہی ہے۔ دین مکمل ہو گیا، حجت خدا پوری ہوئی اور اسلام کو رمضانے الہی کی آخری سند عطا ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی ساخت و سرشت ایسی بنائی ہے کہ یہ قیامت تک آنے والے حالات و مقتضیات میں انسانیت کی ہدایت کی کفایت کرتا رہے گا۔ بہ شرط یہ کہ کوئی ہدایت و فلاح کا طالب بھی ہو۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ میری ہر نفسانی خواہش اور ترقی اسلام کی راہ سے پوری ہو جائے تو ایسا کبھی ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ اسلام، تاریخ اور وقت کے دھارے میں بہہ جانے کا عادی نہیں، اُسے بدل دینے کا خوگر ہے۔

منظور احمد: رد تشکیل اور مذہب کے بنیادی احساس کی حفاظت: بے معنی دعویٰ:

ڈاکٹر صاحب نے deconstruction کے عمل میں ”مذہب کے بنیادی احساس“ کی حفاظت کو ضروری اور لازم قرار دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مذہب کا ”بنیادی احساس“ بندگی، یاد آخرت، تقویٰ اور معرفت رب کے سوا ہے کیا؟ ڈاکٹر صاحب کے اصول اور منہاج کے مطابق تو عصر حاضر میں خدا اور آخرت بے معنی [غیر علمی] ہیں۔ جب ایک چیز علمی معیار پر ثابت ہی نہیں ہے تو اس کے ”بنیادی احساس“ کا سوال ہی غیر متعلق ہے۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے مذہب کی ”اصل روح“ کی بات بھی فرمائی ہے، یہاں پھر اسی سوال کو دہرانا ناگزیر ہے، جب مذہب اور قرآن کسی علمی معیار پر پورا ہی نہیں اترتا تو اس کی روح پر بحث کی کیا ضرورت ہے؟ ڈاکٹر منظور احمد صاحب اور دیگر جدیدیت پسندوں کے نزدیک چوں کہ اب اسلام کا قالب کہنہ، دور از کار اور بوسیدہ ہو چکا ہے، اس لیے اس کی روح کو ایک چُست اور توانا پیکر میں منتقل کر دینا چاہیے۔ اس منتقلی کے لیے جسم کو deconstruct کرنا ناگزیر ہے۔

ردِ تشکیل: اسلام کی اسلام کے نام پر بیخ کنی:

Deconstruction [ردِ تشکیل] کا مطلب ہے، لفظ میں مفروضہ [meaning structure] اور ذہن میں موجود [meaning form] کو ختم کر دیا جائے، یعنی لفظ میں پہلے سے موجود معانی کو لفظ سے خارج کر دیا جائے اور ذہن میں موجود راسخ تصورات کو مٹا دیا جائے۔ ٹھیٹھ مذہبی معنوں میں Deconstruction کا مطلب ہے: اسلام کی اسلام کے نام پر بیخ کنی۔ یعنی کتاب و سنت اور مروّج و متداول دینی و فقہی اصطلاحات کو برقرار رکھتے ہوئے انہیں متکلم اور شارع کے بیان فرمودہ معنی سے آزاد کر دیا جائے، تعاملِ اُمت اور سندِ اعتماد کو توڑ دیا جائے، اور ان لفظوں کو بار بار deconstruct کیا جائے، نئی نئی معنویت دی جاتی رہے۔ اس طرح قرآن و سنت کی حیثیت عضوِ معطل [redundant] کی ہو جائے گی مگر لفظ اور اصطلاح کے باقی رہنے سے لوگ مطمئن رہیں گے کہ یہ مذہب ہی کی خدمت ہو رہی ہے اور معانی کی تبدیلی کا یہ عمل وقت اور حالات کا ناگزیر تقاضا ہے۔ اسی کا نام اسلامک ماڈرن ازم، تشکیلِ جدید، اور تعمیر نو ہے، یعنی دین کی تفہیم جدید اور تعبیر نو کے نام پر مغربی سیاسیات، معیشت اور سائنس کی اسلام کاری۔ یعنی الفاظ و اصطلاحات اور کنائے تو مذہبی رہیں مگر اس کے معنی کی ”نئی تفہیم“ وضع کر لی جائے مظاهر و مراتب وجود کی ترتیب بدل دی جائے — سانچہ اور ڈھانچہ بظاہر وہی رہے، اس کے مطالب مسخ کر دیے جائیں، روح ختم کر دی جائے، کیوں کہ مسلمان اپنی اصطلاحات، شخصیات اور روایات سے تعلق قطع نہیں کر سکتے لہذا انہیں باقی رکھا جائے لیکن مسخ کر کے۔

ردِ تشکیل: اسلام کی روح اور قالب دونوں کے انہدام کا منطقی نتیجہ:

یہ بات حد درجے قابلِ غور ہے کہ ردِ تشکیل [deconstruction] کے نتیجے میں مذہب کی جو نئی صورت یا عمارت جدید تیار ہوگی، ڈاکٹر صاحب کے بیان کے مطابق وہ بھی ایک اسطور [myth] ہی ہوگا، اسے بھی مستقبل میں ردِ تشکیل [deconstruction] کے عمل سے گزرنا ہوگا۔ بالفاظِ دیگر مذہب کی بنیاد پر کسی مُسلمہ ٹھوس علیست کی تشکیل ممکن نہیں بلکہ اساطیر ہی کی تعمیر ممکن ہے۔ اگر یہ مفروضہ درست مان لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر منظور احمد اکیسویں صدی میں شریعت کی روح کی بنیاد پر لوگوں کو اساطیر کے اختیار اور قبول کرنے کی دعوت کیوں دے رہے ہیں؟ اور پھر ان تعمیر شدہ اساطیر کے مستقبل میں دوبارہ انہدام اور تعمیر نو کی بات بھی فرما رہے ہیں، وہ بہ راہِ راست ان اساطیر کو رد کر دینے کی دعوت صاف الفاظ میں کیوں نہیں دیتے؟ اس طرزِ عمل اور اسلوبِ فکر کو اختیار کرنے کا سبب ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ بالا اقتباس کی آخری دو سطروں میں نہایت خوب صورتی سے بیان کر دیا ہے۔ کہ مذہب کی روح اور احساس کی بنیاد پر اساطیر کی بار بار تعمیر و تخریب ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی زندگیوں سے مذہب کو خارج کرنے پر راضی نہیں یہ ایک تاریخی عمل [historical progression] ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ لوگ جو اکیسویں صدی میں حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مذہبی رہنے پر اصرار کرتے ہیں

ان کی مذہبیت کو ڈاکٹر منظور احمد ایک لحاظ سے کارآمد بنانا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ مذہب کو ایک حقیقت، علم، فرقان، برہان، روشنی، نور اور ہدایت کی بجائے، اساطیر کی حیثیت سے دیکھا اور عملی زندگی میں برتا جائے۔ اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ دیگر مذاہب کی طرح اسلام بھی کوئی حقیقت، علم اور نور نہیں بلکہ ایک تاریخی عمل ہے جو ہر عہد میں کچھ لبادے اوڑھ لیتا ہے اور کچھ اتار دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق مذہب کی اس تعمیر و تخریب کے ساتھ مذہب کا عہد حاضر میں زندگی کے دھاروں کے ساتھ تھوڑا بہت رشتہ برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ جو لوگ مذہب کی اس طرز پر تعمیر و تشکیل کے لیے راضی نہیں، ان کے مذہب کی عہد حاضر میں کوئی وقعت نہیں۔ مذہب کو ایک سابقے اور لاحقے کے طور پر، مذہبی اعمال و رسوم کو ثقافتی رویے کے طور پر، مذہبی عبادات کو معاشرتی اصلاح کے ایک آلے کے طور پر اور مذہبی طرز زندگی کو ایک تاریخی جبر کے طور پر قبول کیا جاسکتا ہے۔ اس کے سوا مذہب کی کوئی حیثیت نہیں۔

ایک مسلمان کے لیے اسلام روح اور قالب دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ دونوں اپنے اسلوب ہستی اور فعلیت کے نظام میں ایک دوسرے کے متوازی اور ایک دوسرے سے مستغنی نہیں بلکہ مدغم اور پیوست ہیں۔ جس دن اسلامی روح کو اسلامی قالب سے نکال کر خواہ کیسے ہی خوش نما پیکر میں منتقلی کے لیے عمل جراحی کا آغاز ہوگا وہ اسلام کا آخری دن ہوگا۔ کیوں کہ وہ سانچہ ہی ختم ہو جائے گا، ٹوٹ جائے گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا ہے، جس کا رنگ صبغۃ اللہ کی بھٹی میں چڑھا ہے۔ اُس نئے قالب پر لاکھ اسلام..... اسلام کی تختی چسپاں کی جائے وہ اور بہت کچھ ہوگا لیکن اسلام اور دین محمدیؐ نہیں۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب اسلامی قالب کی ردِ تشکیل [Deconstruction] کے لیے ایسے طریقے تجویز فرما رہے ہیں کہ جس کے بعد قالب تو اپنے تمام مظاہر سمیت تہس نہس ہوگا ہی، دین کی روح بھی مسخ [Distort] ہو کر فنا کے گھاٹ اتر جائے گی۔

قرآنی احکام کے اطلاقات کو زمان و مکاں میں محصور سمجھنا منشا قرآن ہے: منظور احمد:  
ڈاکٹر منظور احمد لکھتے ہیں:

”لوگوں نے قرآن کی آیات کو قضیاتی منطق کے جملوں پر محمول کرنا شروع کر دیا تھا۔ حالاں کہ وہ آیات ایک خاص موقع پر ایک خاص حکم کے ساتھ نازل ہوئی تھیں اور ان سے ایک مقصد کا حصول تھا۔ اصل وہ منشا اور مقصد تھا جو اُس حکم کے پس پشت کار فرما تھا۔ اور وہ حکم ان خاص حالات میں اُس منشا کو پورا کرتا تھا۔ یہ منشا اور مقصد البتہ وقتی نہیں تھا بلکہ معاشرتی زندگی کا ایک معیار تھا جو زمان و مکان سے آزاد تھا۔ حکم البتہ زمانی و مکانی تھا“۔<sup>۱</sup>

۱- منظور احمد، ”اسلامی فکر کی بصیرت اور اقبال“، مشمولہ اقبال شناسی، صفحات ۲۸-۲۹۔

سوال یہ ہے کہ اگر شارع کو شریعت کے ظاہری احکام کی پیروی مطلوب نہیں تھی اور ان کی حیثیت محض وقتی ہدایات و نظائر کی ہے تو قرآن مجید میں بعض احکام کو متعین صورت میں بیان کر دینے اور پھر ان کی پابندی پر اصرار و تاکید کرنے کی کیا وجہ تھی؟ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی تعلیم دی گئی کہ جن معاملات کی تفصیل کو اللہ تعالیٰ نے از خود بیان نہیں فرمایا ان میں سوالات و استفسارات کے ذریعے منشاء خداوندی کو محکم اور متعین طور پر معلوم کرنے سے گریز کیا جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبَدِّلْكُمْ تَسْؤُكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبَدِّلْكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ [۱۰۱:۵]

”اے ایمان والو! ان چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو جو اگر تم پر واضح کر دی گئیں تو تمہیں مصیبت میں ڈال دیں گی اور جب تک قرآن نازل ہو رہا ہے، اگر تم ان کے بارے میں پوچھو گے تو وہ تمہارے لیے واضح کر دی جائیں گی۔ اللہ نے خود ہی ان کو بیان نہیں کیا، اور اللہ بہت بخشنے والا اور بڑے تحمل والا ہے۔“

### شرعی احکام کی تغیر پذیری کا ماخذ کیا ہے؟

مقاصد کو قائم رکھنے کے لیے احکام قرآنی میں رد و بدل درست ہے، اپنے اس نقطہ نظر کی تفہیم و ترسیل کے لیے ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے کچھ مثالیں بھی دی ہیں۔ قرآن مجید نے چور کی سزا قطعید [ہاتھ کاٹنا] بیان فرمائی ہے۔ مگر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”چور کی سزا معاشرے سے چوری ختم کرنے، یا اس کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے ہے، جو سزا اس مقصد کے حصول میں سریع الاثر ہو اور جرم و سزا میں ایک توازن قائم کرتی ہو وہ مقاصد شریعہ کو پورا کر دیتی ہے۔“

جو سزا خالق نے مخلوق کے لیے تجویز کی ہے، کیا اس سے زیادہ سریع الاثر اور کوئی سزا ہو سکتی ہے؟ اگر مختلف سزائیں مقاصد شریعت کو پورا کر سکتی ہیں تو شریعت کو صرف ایک سزا مقرر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اگر سزائیں مختلف ہو سکتی ہیں اور مقاصد شریعت ایک ہی ہیں تو پھر سزا کی تجویز کا اختیار ہر عہد کے اولی الامر کو دینا چاہیے تھا؟ کیا مغرب میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ ایک ہی جرم کی مختلف سزائیں ہوں، جو مقصد کے اعتبار سے ہر مجرم پر الگ الگ نافذ ہوتی ہوں؟ پھر مساوات کیسے ممکن رہے گی؟ — سوال یہ ہے کہ منشاء کلام کون بتلائے گا؟ خدا کی اس مراد کو جو اس نے اپنی کتاب محکم میں صریح لفظوں میں بیان کر دی: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا [۳۸:۵] ”چوری کرنے والے مرد و عورت کا ہاتھ کاٹ دیا کرو۔“ اس صریح حکم کے بعد ڈاکٹر صاحب کو خدا کی اس مراد کی تبدیلی کا کس ذریعے سے علم ہوا

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۷۹۔

کہ محض ہاتھ کاٹنا مقصود نہیں بلکہ جو سزا بھی اس مقصد کے حصول میں سرلیج الاثر ہو وہ مقاصد شریعت کو پورا کر دیتی ہے؟ خدا کے صریح حکم کے بعد اس کے رسول جنہوں نے بہ راہ راست اس کی جناب سے کسب علم و فیض کیا تھا، وہ تاحیات چوری کی سزا میں قطعید کو نافذ کرتے رہے، صحابہ جنہوں نے اس مہبط وحی سے بہ راہ راست علم و ہدایت کی دولت پائی وہ اسی سزا کو بہ طور ”حد“ نافذ کرتے رہے، اسی طرح یہ سلسلہ تابعین و تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین سے ہوتا ہوا، امت تک مسلسل منتقل ہوا ہے، اب پندرہ سو برس کے بعد ڈاکٹر صاحب کو خدا کی اس مراد کی تبدیلی کا علم کس ذریعے سے ہوا؟ یا وہ کون سی آیات ہیں جن میں ڈاکٹر صاحب کے مزعومہ موقف کا اشارہ پایا جاتا ہے؟ وہ کون سی احادیث یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا واقعہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کے اس ادعا کی گنجائش ہے؟ پوری امت شروع سے آج تک ان سزاؤں کو حدود اللہ سمجھتے ہوئے نافذ کرتی رہی اور اب ڈاکٹر صاحب چاہتے ہیں کہ محض ان کے ادعا پر امت مسلمہ خدا کے اس صریح حکم کو ترک کر دے؟ جب کانٹ اور ہیگل کے افکار کی تفہیم کے لیے کسی ایسے آدمی کی شرح و تفصیل کی کوئی وقعت نہیں سمجھی جاتی جو کم از کم مروجہ طریق پر فلسفہ جدید کی تحصیل نہ کر چکا ہو تو کیا خدا کا دین اور اس کی بیان کردہ حدود اتنی ارزاں ہیں کہ انہیں محض ڈاکٹر منظور احمد کے انفرادی ادعا پر قربان کر دیا جائے؟ ڈاکٹر صاحب کے پاس اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے کتاب و سنت تو دور کسی ایک مستند فقیہ، اصولی اور عالم کا حوالہ تک نہیں ہے۔ اس علمی افلاس اور در ماندگی کے باوجود ڈاکٹر صاحب کی یہ خواہش ہے کہ امت مسلمہ محض ان کے واہموں اور مفروضوں پر اپنے تمام فقہی ذخیروں پر پانی پھیر دے؟ دوسرے کیا خود ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ قرآن کو علمی قضیے سے خارج قرار دے کر اس میں بیان کردہ احکامات پر بحث کریں کہ اس میں کیا دائمی ہے اور کیا وقتی؟ جب قرآن علمی معیار پر پورا ہی نہیں اترتا تو اس کے احکامات پر بحث محض تضحیح اوقات کے سوا کیا ہے؟ شاید اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی — رہے وہ لوگ جو قرآن کو علم بلکہ العلم مانتے ہیں ان کے نزدیک ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی یہ پوری گفتگو محض ادعا ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے استناد کا ماخذ کیا ہے؟ استدلال کی بنیاد کیا ہے؟ کس اصولی، فقیہی، مفسر، معتکف یا محدث نے ان مفروضات بلکہ واہموں کی تائید کی ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ اسلامی سے ایک حوالہ پیش کرنے کی بھی زحمت نہیں فرمائی۔ ڈاکٹر صاحب کے ان تمام دعاوی کو عصر حاضر کے منہاج علمی کے مطابق غیر علمی بلکہ ڈاکٹر صاحب ہی کے اسلوب میں ”ادعائی“ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

مسلمان: بگونی اور تشریحی دونوں احکام کا کامل قبیح:

اتنی بات طے اور مسلم ہے کہ احکام شریعت اور قانون شرعی کا واضح صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کے امر و نہی سے بندوں نے فرض و واجب اور حرام و حلال کو جانا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم اگرچہ شریعت الہی کا مظہر ہونے کی حیثیت سے حکم الہی ہے، لیکن یہ استحقاق بالاستقلال آپ کو بھی حاصل نہیں۔

احکام الہی دو طرح کے ہیں تکوینی اور تشریحی۔ وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقات میں ودیعت کر دیے گئے ہیں، تکوینی کہلاتے ہیں، اور تشریحی وہ احکام ہیں جنہیں انبیاء و مرسلین کے توسط سے انسانوں کی ہدایت و فلاح کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ امر تکوینی کی تعمیل میں انسان ناچار اور بے کس و مجبور ہے، وہ تکوینی امور کے اصول و قواعد میں ذرہ بھر بھی تغیر و تبدل اور کمی و اضافہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح فکر کی مسلسل اسلامی روایت اسے ہی راہِ حق و صواب پر سمجھتی ہے جو احکام تکوینیہ کی طرح احکام تشریحیہ کا بھی تابع فرمان ہو۔ بے شک احکامات الہیہ کی بے شمار عقلی مصلحتیں اور حکمتیں ہوں گی لیکن مدارِ احکام، مصالِح عقلیہ پر نہیں بلکہ رضائے الہی کے حصول اور رب کی ناراضگی سے بچنے پر ہے۔ حکم کی ماہیت اور غایت، عقلا کی عقل اور حکما کی حکمتوں سے نہیں خود اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے معلوم ہو سکتی ہے۔ بلاشبہ اس میں بے شمار عقلی مصلحتیں اور حکمتیں رموز ہوں، ایک مسلم کو اس سے غرض نہیں اُس کے نزدیک تو اصل چیز خوشنودی رب ہے۔

فقہاء دین کے کل نظام احکام کے داعی:

اب رہا ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا کہ ”لوگوں“ نے آیات قرآنی کو قضیاتی منطق کے جملوں پر محمول کرنا شروع کر دیا۔ پتا نہیں ”لوگوں“ سے ڈاکٹر صاحب کی مراد کون لوگ ہیں؟ اگر اس سے فقہاء اور اصولیین مراد ہیں تو کسی مسلم اصولی یا فقیہ نے قرآنی حکم کو اُس کے کل نظام احکام سے کاٹ کر ایک خشک اور مجرد منطقی قضیے یا فلسفیانہ تعقل کے طور پر پیش نہیں کیا۔ قانون، اسلام کی کلیت کا ایک جز ہے، کل نہیں۔ اسلامی تاریخ میں کبھی قانون کو اسلام کی عطا فرمودہ روحانیت اور اخلاقی نظام سے جدا کر کے نافذ نہیں کیا گیا۔ مسلم فقہاء، سطحیت پرست اور خشک قانون دان نہیں تھے، بلکہ صاحبِ حال و کمال عارف اور بحر حقیقت کے شناور بھی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر دین کو صرف قانون میں منحصر کر دیا جائے تو اس سے کبھی خیر برآمد نہیں ہو سکتا، اسی لیے حضرت امام حسن بصری رحمہ اللہ [م ۱۱۰ھ] فقیہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

إنما الفقیہ الزاهد فی الدنیا الراغب فی الآخرة، البصیر بلیغہ المداوم علی عبادة ربہ،

الورع الکاف عن أعراض المسلمین، العفیف عن أموالہم الناصح لجماعتہم۔<sup>۱</sup>

”فقیہ وہ ہوتا ہے جو دنیا سے بے رغبت ہو، آخرت کا طلب گار ہو، اپنے دین کی بصیرت رکھتا

ہو، اپنے رب کی عبادت میں لگا رہتا ہو، متقی ہو، مسلمانوں کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچانے

سے بچا رہتا ہو، اُن کے مال و دولت سے بے تعلق ہو اور جماعتِ مسلمین کا خیر خواہ ہو۔“

احکام کے وقتی یا دائمی ہونے کا تعین: بہ ذریعہ عقل یا بہ ذریعہ شارع:

حکم زمانی اور وقتی تھا یا دائمی۔ یہ عقل بتلائے گی یا شارع؟ اس کا تعین عقل کر ہی نہیں سکتی۔ یہ صرف حکم الہی یا حکم رسول سے ثابت ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب چودہ سو سالہ مسلمانوں کی اجماعی روایت کو یک

۱- عبدالعزیز ابن عابدین، برد المختار علی الدر المختار، الریاض: دار عالم الکتب، ۱۳۲۳ھ، المقدمة، جلد ۱، صفحہ ۱۲۰۔

قلم رو کر کے، کتاب وسنت کی سند سے بے نیاز ہو کر، پورے تحکم اور تیقن سے ارقام فرماتے ہیں: ”حکم البتہ زمانی و مکانی تھا“ — حکم کی حقیقت امر و نہی اور تحلیل و تحریم ہی ہے اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، انسان اگر اپنی طرف سے سابقہ قانون کو رد کر کے بلاسندالہ کسی حلال کو حرام کر دے اور حرام کو جائز کہہ دے تو یہ خدا پر تہمت باندھنے کے مرادف ہے، ارشاد ربانی ہے:

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلَالٌ وَ هَذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ..... مَتَاعٌ قَلِيلٌ وَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ. [۱۱۶:۱۱۷-۱۱۷]

”اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو، جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے..... دنیا کا عیش چند روزہ ہے، آخر کار اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

آیت مبارکہ میں صاف تصریح فرمادی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تحلیل و تحریم کا کسی کو بھی حق اور اختیار حاصل نہیں، یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بہ طور پیشین گوئی یہ بھی فرمادیا گیا کہ جو لوگ شریعت الہی کے بیان فرمودہ احکام سے ہٹ کر اپنی حد سے تجاوز کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی شے کو حلال کرتے ہیں یا حلال کو حرام، اُن کا یہ عمل بتلا رہا ہے کہ وہ خود کو وضع احکام سمجھتے ہوئے اس بات کے مدعی ہیں کہ خدا تعالیٰ نے تحلیل و تحریم کے اختیارات سے دست بردار ہو کر انسانوں کو خود اپنی شریعت کو بنا لینے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ یہ بات جھوٹ اور افترا علی اللہ ہے، اس سے چند روزہ فائدہ تو حاصل ہو جائے گا مگر وہ اُن کے لیے دنیا و آخرت میں عذاب ہی ثابت ہوگا۔

منظور احمد: سود کی حرمت کو دائمی سمجھنا منشاء قرآنی کی خلاف ورزی: ایک واہمہ:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے سود کے مسئلے پر اپنی ناقص اعترافی عقلمندی کے بل پر قرآن کریم کی نص صریح کو رد کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ سود کی حرمت کا حکم اُس وقت کے حالات و مقتضیات کے تحت تھا، آج کے دور میں اُس کی حرمت قرآن کے احکامات کو محدود اور اُن کے معاشرتی و اخلاقی جواز کو ختم کر دینے کے مماثل ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”ربا کی حرمت ایک مخصوص معاشی معاشرتی اور اخلاقی حکم ہے جو حالات کے پیش نظر دیا گیا تھا۔“

اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں:

”مثلاً ربا کے مسئلے کو لے لیں، صورت حال اُس وقت یہ تھی کہ بعض قبیلوں پر سود کا بوجھ

۱- منظور احمد، ”چند توجہ طلب مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۳۱۔

اس حد تک ناقابل برداشت ہو رہا تھا کہ وہ فسادِ عام کی صورت اختیار کر سکتا تھا، اس لیے اُن لوگوں کے خلاف خدا اور رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان کیا گیا..... اس پس منظر میں قرآنی احکامات کی حکمت اور مقاصد واضح ہو جاتے ہیں اور اُن اسباب و وجوہ کا پتہ چل جاتا ہے، جن کے سبب یہ احکامات دیے گئے تھے، یعنی معاشی انصاف اور انسانی برادری کی مساوات، اسی لیے ان احکامات کا لفظی، زمانی اور مکانی اطلاق اُن احکامات کے معانی کی انتہا نہیں ہو سکتا اور اس پر اصرار احکامات کو محدود کر دینے اور اُن کے معاشرتی اور اخلاقی جواز کو ختم کر دینے کے مماثل ہے۔<sup>۱</sup>

سود کے مسئلے پر ڈاکٹر صاحب کی یہ ساری خامہ فرسائی محض واہمہ اور خام عقلیت کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ کتاب و سنت اور صحائفِ ماسبق سے کلیتہً ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اُن کا بلا حوالہ تحریر کیا ہوا اقتباس قرآن مجید کی نصِ قطعی سے متصادم اور اللہ تعالیٰ کے حرام فرمودہ کو حلال کر دینے کے مرادف ہے۔ اتنی بودی بات ڈاکٹر صاحب ایسی حمیت سے بیان فرما رہے ہیں گویا یہ تصریح قرآن ہی میں کہیں موجود ہے کہ سود کی حرمت دائمی نہیں ہے۔

سود کی حرمت: ادیان ماسبق اور اسلام کا اجماع:

ڈاکٹر صاحب کے شاید علم میں نہیں کہ سود کا تعلق صرف عرب قبائلیت سے نہیں تھا بلکہ یہودیت، عیسائیت اور اسلام تینوں مذاہب میں سود بالاتفاق حرام ہے۔ تمام انبیاء نے بالا جماع اس ناجائز کسبِ معاش سے روکا ہے۔ ایسی متفق علیہ ناجائز اور حرام شے کو ڈاکٹر منظور احمد صاحب محض چند روزہ معاشی فائدے کے لیے قرآن کی تحریف معنوی کا ارتکاب کر کے ”حلال“ کر دینے کے درپے ہیں۔ ذیل میں تورات مقدس، زبور مقدس، انجیل مقدس اور قرآن مجید سے چند حوالے نقل کیے جا رہے ہیں جس سے سود کی حرمت و ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے تورات مقدس میں ہے:

”اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہو، کچھ قرض دے تو اُس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا، اور نہ اُس سے سود لینا۔“<sup>۲</sup>

تورات مقدس کے مزید حوالے کے لیے ملاحظہ فرمائیے:

احبار: باب ۲۵، فقرات: ۱۹-۲۰۔

استثنا: باب ۲۳، فقرات: ۱۹-۲۰۔

نجمیہ: باب ۵، فقرات: ۳-۱۳۔

حزقی ایل: باب ۱۸، فقرہ: ۱۷۔

۱- مشکور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحات ۸۲-۸۵۔

۲- خروج: باب ۲۲، فقرات: ۲۵-۲۶۔



زبور مقدس کے حوالے کے لیے دیکھیے۔ زبور: ۱۵

انجیل مقدس میں محض پند و نصائح ہیں، احکام بالکل نہیں ہیں۔ اس لیے سود کی حرمت سے متعلق کوئی فقرہ درج نہیں مگر پولوس کے خطوط سے، جو عیسائیوں کے نزدیک بہ منزلہ انجیل ہیں، سود کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔

سود کی حرمت پر قرآن کی واضح آیات:

قرآن حکیم میں ہے:

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ [۲۷۵:۲]

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ [قیامت میں] اُس شخص کی طرح اٹھیں گے جس کو شیطان نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو، اور یہ اس لیے کہ یہ کہا کرتے تھے کہ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے، حالاں کہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام، جو شخص اپنے پاس آئی ہوئی اللہ تعالیٰ کی نصیحت سن کر رُک گیا، اُس کے لیے وہ ہے جو گزرا اور اُس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے اور جو پھر دوبارہ [حرام کی طرف] لوٹا وہ جہنمی ہے، ایسے لوگ ہمیشہ ہی اُس میں رہیں گے۔“

پھر فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ..... فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ [۲۷۸:۲-۲۷۹]

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور لوگوں کے ذمے تمہارا جو سود باقی رہ گیا ہے، اگر تم ایمان والے ہو تو چھوڑ دو۔ اور اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول [صلی اللہ علیہ وسلم] سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ، ہاں اگر توبہ کر لو اور تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے، نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔“

نوٹ: یہ ایسی سخت وعید ہے جو اور کسی معصیت کے ارتکاب پر نہیں دی گئی۔ اسی لیے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا ہے کہ اسلامی مملکت میں کوئی سود چھوڑنے کو تیار نہ ہو تو خلیفہ وقت کی ذمے داری ہے کہ وہ اُس سے توبہ کرائے اور باز نہ آنے کی صورت میں اُس کی گردن اڑا دے۔ ڈاکٹر منظور احمد

۱- تفصیل کے لیے دیکھیے سید سلیمان ندوی، ”سود اور صحف انبیا“ مشمولہ مقالات سلیمان [مرتبہ: شاہ معین الدین احمد ندوی]، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۰ء، جلد ۳، صفحات ۲۳۵-۲۵۳۔

صاحب سود کی حرمت کو وقتی کہہ کر آج اُس کو حلال کر دینے پر آمادہ ہیں کہ اس سے دولت و ثروت میں اضافہ ہوتا ہے اور معاشی ترقی کی راہیں اُستوار ہوتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہ حیثیت طہارت و روحانیت اس میں کچھ ترقی نہیں ہوتی۔ ارشاد باری ہے:

وَمَا آتَيْتُمْ مِّن رَّبٍّ لَّيْرُبُوا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوا عِنْدَ اللَّهِ [۳۹:۳۰]

”اور جو تم نے سود دیا کہ لوگوں کے مال میں بڑھتا رہے، تو وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا۔“

یہ تمام آیات مبارکہ اور صحیفِ ربانی کے حوالے سود کی حرمت پر دلالت کر رہے ہیں۔ نزولِ قرآن سے قبل بھی سود ایک متعارف اور معروف چیز تھی کہ قرض اُدھار پر بہ حسابِ معیار زیادتی لینے کو ”ربو“ کہا جاتا تھا۔ قرآن میں اس کی حرمت نازل ہوتے ہی تمام صحابہ کرام نے اس ربو کو ترک کر دیا اور اس کے معنی سمجھنے سمجھانے میں کسی کو اشکال پیش آیا نہ اشتباہ۔ آج کل جو ربو انسانی معاشیات کا مدار سمجھا جاتا ہے اور مسئلہ سود میں جو زیر بحث ہے، علما کی تصریحات کے مطابق وہ یہی ربو ہے، جس کی حرمت قرآن کی سات آیات، چالیس احادیث اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔

منظور احمد: شانِ نزول سے صرف نظر کر کے قرآنی احکام کی عالم گیریت فقہا کا اصرار، ایک کوتاہی: احکام کی لازمانی و لامکانی عمومیت کو محدود نہ کرنے کی وجہ سے منظور احمد کو مفسرین سلف سے بڑی شکایت ہے کہ انہوں نے آیاتِ قرآنی کے سبب و شانِ نزول پر محنت کیوں نہ کی؟ مطلب یہ ہے کہ اگر ہر آیت کا شانِ نزول ساتھ بیان کر دیا جاتا تو ہر احکامی آیت کے اطلاق کو مخصوص زمانی و مکانی سیاق میں محدود کرنے میں آسانی ہوتی۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”شانِ نزول سے متعلق اسلامی روایات کوئی زیادہ منضبط اور مسلسل نہیں رہیں۔ اور اُس کی اہمیت اُن کے نزدیک بعض آیات کی تفہیم یا اُن کے کسی تاریخی واقعے سے منسلک ہونے کی وجہ سے تھی۔ لیکن شانِ نزول کے ایک بہت اہم معنوی نکتے کی طرف توجہ مبذول نہ ہو سکی۔ اس وجہ سے انہوں نے یہ اصول بتایا کہ باوجود اس کے کہ حکم کسی خاص واقعے کے پیشِ نظر یا کسی خاص مسئلے کے حل کے لیے کیوں نہ نازل کیا گیا ہو۔ وہ اطلاق کے اعتبار سے ایک کلی قانون ہے۔ جب حکم سے مراد اُس کے لفظی معنی نہ ہوں، یا زمان و مکان میں اُس کا ایک خاص شکل و صورت میں اطلاق نہ ہو اس لیے کہ یہ اطلاق شکل اُس قانون کی کلیت کا اظہار نہیں ہے۔ کلیت وہ قدر یا مقصد ہے جو اُس قانون کے توسط سے پورا ہوتا ہے۔ احکام کی شانِ نزول سے متعلق یہی اہم نکتہ ہے جس سے مسلم فقہانے صرف نظر کیا ہے۔“

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحات ۸۳-۸۴۔

شان نزول سے متعلق اسلامی روایت میں کوئی منضبط کام ہوا ہے یا نہیں، سر دست بحث سے خارج ہے۔<sup>۱</sup>

شان نزول کے بغیر فہم قرآن تک رسائی ممکن نہیں: علما و فقہا:

علمائے اس موضوع پر مستقل تصنیفات کے علاوہ علوم القرآن سے متعلق کتابوں میں بھی اس موضوع پر شرح و بسط کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ، زرکشی، سیوطی اور شاہ ولی اللہ وغیرہ نے اپنی کتابوں میں اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ تفسیر قرآن کے لیے اسباب النزول کو کس قدر اہمیت حاصل ہے، امام واحدی لکھتے ہیں:

ہی اوفی ما یجب الوقوف علیہا، وأولی ما تصرف العنایة إلیہا؛ لا متناع

معرفة تفسیر الآیة و قصد سبیلہا، دون الوقوف علی قصتها و بیان نزولہا.<sup>۲</sup>

”اسباب نزول سے واقفیت اور دل چسپی بہت ضروری ہے، اس لیے کہ آیت کی تفسیر کا علم اور اس کے

مذہب کا حصول، اس کے واقعے سے واقفیت اور اس کے سبب نزول کی معرفت کے بغیر ممکن نہیں۔“

علامہ ابن دینق العید لکھتے ہیں:

بیان سبب النزول طریق قوی فی فہم معانی الکتاب العزیز.<sup>۳</sup>

”سبب النزول کا بیان معانی قرآن کے فہم کا قوی ذریعہ ہے۔“

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

معرفة سبب النزول یعین علی فہم الآیة؛ فإن العلم بالسبب یورث العلم بالمسبب.<sup>۴</sup>

”سبب نزول کی معرفت آیت کے فہم میں مدد دیتی ہے، اس لیے کہ سبب کے علم سے

مسبب کا علم ہوتا ہے۔“

حافظ جلال الدین سیوطی نے صحیح تفسیر کے لیے جن پندرہ شرط کا ذکر فرمایا ہے ان میں سے ایک شرط

یہ بھی ہے کہ تفسیر کرنے والا اسباب نزول سے واقف ہو، ورنہ وہ تفسیر، تفسیر بالرائے سمجھی جائے گی۔<sup>۵</sup>

۱- شائقین تحقیق درج ذیل کتابوں کی طرف مراجعت فرمائیں:

[۱] علی بن احمد الواحدی، اسباب نزول القرآن، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۱۱ھ۔

[۲] احمد بن حجر العسقلانی، العجائب فی بیان الاسباب [اسباب النزول]، بیروت: دار ابن حزم، ۱۴۲۲ھ۔

[۳] جلال الدین سیوطی، لباب النقول فی اسباب النزول، بیروت: مؤسسة الکتب الثقافیہ، ۱۴۲۲ھ۔

۲- علی بن احمد الواحدی، اسباب نزول القرآن، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۱۱ھ، مقدمة المصنف، صفحہ ۱۰۔

۳- ایضاً۔

۴- تقی الدین ابن تیمیہ، مقدمة فی اصول التفسیر، دمشق: کلیۃ الشرعیۃ جامعۃ دمشق، ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء، فصل فی

اختلاف السلف فی التفسیر و انه اختلاف تنوع، سبب النزول و اثره فی ذلك، صفحہ ۲۷۔

۵- جلال الدین سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، بیروت: مؤسسة الرسالة ناشرون، ۱۴۲۹ھ، النوع الثامن

والسبعون فی معرفة شروط المفسر و آدابہ، صفحہ ۷۷۲-۷۷۳۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے بیان کیا ہے کہ کتاب اللہ میں بعض مقامات کے معانی اُس وقت تک صحیح طور پر سمجھے نہیں جاسکتے جب تک اُن کے اسباب نزول نہ معلوم ہوں۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک جگہ کسی لفظ کے معنی نہ معلوم ہونے کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے بارہ اسباب گنائے ہیں۔ ان میں تیسرا سبب اسباب نزول کا یاد نہ رہنا ہے۔<sup>۱</sup>

ان اقتباسات سے اسباب نزول کی اہمیت واضح ہے۔ اس وقت گفتگو اس امر میں ہے کہ اگر ہر آیت کا شان نزول بیان بھی ہو جائے تو بھی کیا حکم قرآنی کی عمومیت کو مخصوص کیا جاسکتا ہے؟ کیا اسباب النزول بیان کر دینے کے بعد قرآنی آیات کی آفاقیت اور لازمانیت و لامکانیت تبدیل ہو جائے گی؟ ڈاکٹر صاحب کا مذکورہ بالا ارشاد مقاصد قرآن اور موارد نزول کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے اس کا منشا کلاسیکی مفسرین و مؤلفین کی تصانیف سے محض ناواقفیت اور لاعلمی ہے۔

فہم قرآن کا راست اور محکم ذریعہ سنت ہے: ارشاد نبوی:

شان نزول کسی آیت مبارکہ کے حکم کو سمجھنے میں مدد و معاون تو ہو سکتا ہے، لیکن وہ حکم کی علت نہیں بن سکتا۔ اگر شان نزول کے ساتھ حکم کو مقید کر دیا جائے کہ فلاں آیت مخصوص پس منظر کے ساتھ خاص ہے، جس میں یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تھی، تو پھر قرآن مجید کے عالم گیر کتاب ہونے اور قیامت تک آنے والی تمام انسانیت کے لیے ہدایت کا دعویٰ بے معنی ہو جائے گا، اس لیے قرآن کا بیان صرف شان نزول نہیں بلکہ سنت بھی ہوا کرتا ہے، جس سے منشاء متکلم متعین ہو جاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

إنہ سیأتی ناس یجادلونکم بشبہات القرآن، فخذوہم بالسنن، فإن أصحاب السنن أعلم بکتاب اللہ.<sup>۲</sup>

”ایک وقت آئے گا کہ کچھ لوگ قرآن مجید کے مبہم اور غیر واضح احکامات کو لے کر تم سے جھگڑا کریں گے تم ان کی تشریح ”سنت“ سے کیا کرو، کیوں کہ سنت کو جاننے والا قرآن کو زیادہ جانتا ہے۔“

قرآنی احکام کو شان نزول کے ساتھ مقید کر دینا، قرآن کو عملاً معطل کر دینا ہے:

خود ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد نئی اختراع نہیں۔ وہ تو عہد حاضر میں مغرب کی صنعتی و سائنسی ترقی سے مرعوب و مسحور ہو کر اور شان نزول کی آڑ لے کر آیات و احکامات قرآنی کی عمومیت کو مخصوص کرنے کی بات فرما رہے ہیں۔ اُن سے بہت پہلے بھی لوگ قرآنی آیات کی عمومیت کو مخصوص کرنے اور اپنے بعض

۱- شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر [اردو ترجمہ: رشید احمد انصاری]، دہلی: مکتبہ برہان [س-ن]، صفحہ ۳۰۔

۲- عبدالرحمن الدارمی، سنن الدارمی، الرياض: دار المعنی، ۱۴۲۱ھ، باب التورع عن الجواب فیما لیس فیہ کتاب ولا سنة، جلد ۱، صفحہ ۲۴۰-۲۴۱۔

مشرکانہ اعمال کو جاری رکھنے کے لیے یہ شوشہ چھوڑتے رہے ہیں کہ فلاں آیت مشرکین مکہ سے متعلق ہے، ہمارے اعمال سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر اس اصول کے تحت آیات قرآنی کی عمومیت کو مخصوص کر دینے کا قاعدہ عام اور دائرہ وسیع کر دیا جائے تو کسی بھی نزاع کے تصفیے کے لیے قرآن مجید سے استدلال ہی بے معنی ہو جائے گا۔ جوں ہی کسی اختلاف کے ازالے کے لیے کوئی آیت پڑھی جائے گی تو جواب یہی دیا جائے گا: ”یہ حکم کسی خاص واقعے کے پیش نظر نازل کیا گیا تھا“۔ اس طرح پورا قرآن، نعوذ باللہ، معطل ہو کر زندگی اور معاشرے کے مرکزی دھارے سے کٹ کر محض نماز میں اور میت کے ختم پر تلاوت کے لیے مخصوص ہو کر رہ جائے گا۔ مفسرین سلف باطل کیشوں اور متجددین کی ان شرارتوں سے خوب واقف تھے کہ اولاً یہ بات منشا و مراد قرآن کے خلاف ہے، ثانیاً، اس نکتہ آفرینی کی بنیاد کسی نیک نیتی پر نہیں بلکہ نفس شریک کی کٹافٹوں سے مجبور و مغلوب ہو کر محض آزادی کے حصول کے لیے ہے۔ اسی لیے انھوں نے سازش کی ہر راہ بند کر دی ہے۔ علم تفسیر کا مشہور قاعدہ ہے:

والعبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب۔<sup>۱</sup>

”اعتبار عموم لفظ کا ہے، خصوص سبب نزول کا نہیں۔“

منہاج سلف: مخصوص واقعات کے تحت نازل ہونے والی آیات سے عموم پر استدلال:

حافظ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ صحابہؓ و تابعینؒ مخصوص واقعات کے پس منظر میں نازل ہونے والی آیات کے عموم سے استدلال کرتے تھے اور یہ چیز ان کے درمیان عام معروف تھی۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

ونظائر هذا كثير مما يدكرون أنه نزل في قوم من المشركين بمكة، أو في قوم من أهل الكتاب؛ اليهود والنصارى، أو في قوم من المؤمنين. فالذين قالوا لم يقصدوا أن حكم الآية مختص بأولئك الأعيان دون غيرهم؛ فإن هذا لا يقوله مسلم، ولا عاقل على الإطلاق. والناس وإن تنازعوا في اللفظ العام الوارد على سبب، هل يختص بسببه أم لا، فلم يقل أحد من علماء المسلمين إن عمومات الكتاب والسنة تختص بالشخص المعين، وإنما غاية ما يقال: إنها تختص بنوع ذلك الشخص، فتعم ما يشبهه [و] لا يكون العموم فيها بحسب اللفظ.<sup>۲</sup>

”اس قسم کے اقوال بہ کثرت ہیں کہ سلف کہہ دیتے ہیں کہ فلاں آیت مشرکین مکہ کے حق

۱- شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، القاہرہ: دار الصحوة، ۱۴۰۷ھ، الباب الرابع فی بیان فنون التفسیر الخ، الفصل الثانی فی بیان الآثار المروریة فی التفسیر الخ، صفحہ ۱۷۶۔  
۲- تقی الدین ابن تیمیہ، مقدمہ فی اصول التفسیر، فصل فی اختلاف السلف فی التفسیر وانه اختلاف تنوع، سبب النزول واثره فی ذلك، صفحات ۴۶-۴۷۔

میں نازل ہوئی، یا اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے متعلق، یا مومنین کے کسی خاص گروہ کے بارے میں، تو ان اقوال سے ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ ان آیات کے احکام ان ہی اشخاص سے مخصوص ہیں اور دوسرے سے ان کا تعلق نہیں۔ اس قسم کی بات کوئی مسلمان اور صاحب عقل کہہ ہی نہیں سکتا۔ اس بارے میں تو اختلاف ہوا ہے کہ آیت میں سبب کی بنا پر جو لفظ عام استعمال ہوا ہے وہ اسی سبب کے ساتھ خاص ہے یا نہیں، لیکن علمائے اسلام میں کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ کتاب و سنت کے عموماً متعین اشخاص کے ساتھ ہی خاص ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے عموماً متعین اشخاص کے اشبہ و امثال کے ساتھ خاص ہیں۔ یعنی ان کا حکم ایسے تمام لوگوں کو گھیرے ہوئے ہے جو ان اشخاص کے مشابہ ہوں۔“  
 علامہ زرکشی فرماتے ہیں:

وقد يكون السبب خاصاً و الصيغة عامة؛ لينبه على أن العبرة بعموم اللفظ.<sup>۱</sup>  
 ”بسا اوقات سبب مخصوص ہوتا ہے، لیکن صیغہ عمومی کا استعمال ہوتا ہے۔ اس سے یہ وضاحت مقصود ہے کہ اعتبار عموم لفظ کا ہے۔“

حضرت شاہ ولی اللہؒ بھی حافظ ابن تیمیہؒ اور علامہ زرکشیؒ کے ساتھ اس نکتے پر متفق ہیں کہ حضرات صحابہ کرام و تابعین رضی اللہ عنہم جب کسی مسئلے پر نزلت الآیة فی کذا کہہ کر کوئی واقعہ بیان فرماتے ہیں تو اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہوتا کہ ان کے نزدیک وہ واقعہ اُس آیت کا سبب نزول ہے بلکہ اُس سے اُن کی مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ فلاں واقعہ اس آیت کے حکم میں داخل ہے، آیت کے نزول کا براہِ راست سبب نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں:

والذی ینظر من استقراء الکلام الصحابة والتابعین : انهم لا یستعملون نزلت فی کذا لمحض قصة کانت فی زمنه صلی اللہ علیہ وسلم، وهی سبب نزول الآیة بل ربما یدكرون بعض ماصلقت علیہ الآیة مما کان فی زمنه صلی اللہ علیہ وسلم، أو بعده صلی اللہ علیہ وسلم ویقولون نزلت فی کذا ولا یلزم هناک انطباق جمیع القیود بل ینکفی انطباق اصل الحکم فقط وقد یقرون سوالا سئل عنه رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ أو حادثة تحققت فی تلك الايام المبارکة واستبط صلی اللہ علیہ وسلم حکمها من آیة وتلاھا فی ذلك الباب ویقولون نزلت فی کذا.<sup>۲</sup>

”حضرات صحابہ و تابعین کے کلام میں استقراء سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ نزلت فی کذا [یہ آیت اس باب میں نازل ہوئی ہے] کے الفاظ محض اُس واقعے کے لیے مذکور نہیں

۱- بدرالدین الزرکشی، البرہان فی علوم القرآن، القاہرہ: مکتبۃ دار التراث، ۱۳۰۴ھ/۱۹۸۴ء، النوع الاول

معرفة أسباب النزول، فصل خصوص السبب وعموم الصیغہ، جلد ۱، صفحہ ۳۲۔

۲- شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر مع العون الکبیر، دیوبند: المکتبۃ الوحیدیۃ، [س-ن]، صفحات ۱۹۱-۱۹۲۔

جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں واقع ہو کر نزولِ آیت کا سبب بنا، بلکہ بسا اوقات وہ اُن مواقع پر بھی یہ الفاظ بول دیتے ہیں، جن پر وہ آیت [اپنی دلالت کے اعتبار سے] صادق آرہی ہو خواہ ایسے مواقع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوں یا آپ کے بعد۔ صحابہؓ و تابعینؒ ایسے تمام موقعوں پر بھی ”نزلت فی کذا“ کے الفاظ بول دیتے تھے۔ ان مواقع پر تمام قیود کا انطباق ضروری نہیں، ہاں اصل حکم میں انطباق چاہیے اور بس۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کوئی سوال پیش کیا یا آپ کے زمانے میں کوئی واقعہ یا حادثہ پیش آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاص موقعے کا حکم کسی آیت سے استنباط فرمایا [گو وہ آیت پہلے سے نازل شدہ ہو] اور اُس آیت کو تلاوت فرمادیا تو ایسے واقعات کو بھی بیان کرتے ہوئے ”نزلت فی کذا“ کہہ دیا کرتے ہیں۔

اسی لیے حافظ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں:

والآیة التي لها سبب معين، إن كانت أمرا ونهيا فهي متناولة لذلك الشخص ولغيره ممن كان بمنزلته، وإن كانت خبراً بمدح أو ذم فهي متناولة لذلك الشخص وللمن كان بمنزلته.

”جس آیت کا سبب نزول معلوم و متعین ہو، اگر وہ امر یا نہی کی آیت ہے تو اس کا حکم یقیناً اُن سب لوگوں پر جاری ہوگا جو اُس شخص متعین سے ملتے جلتے ہیں۔ اسی طرح آیت میں اگر مدح و ذم کی بنا پر کوئی خبر دی گئی ہے تو وہ بھی اُس شخص کے مشابہ تمام لوگوں کے حق میں عام ہے۔“

معاشی و سائنسی ترقی کے لیے قرآنی احکام کی تخصیص ناگزیر ہے: منظور احمد:

علمائے تفسیر کے ہاں شانِ نزول بہت اہمیت رکھتا ہے، لیکن جدیدیت پسندوں کی خواہش ہے کہ اس کو موضوع بنا کر احکام قرآنی کی عالم گیریت اور عموم کو مخصوص کیا جاسکے، تاکہ اسلامی معاشرے میں مغربی افکار و اقدار کی آبیاری ممکن ہو سکے۔ ایک مقام پر تو ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے صاف لفظوں میں اقرار کر لیا ہے کہ شانِ نزول کی بنیاد پر شرعی و قرآنی احکام و حدود کی تخصیص پر اصرار کی اصل وجہ معیشت اور سائنسی ترقی میں آگے بڑھنا ہے اور ترقی قرآن حکیم میں استخراج سے حاصل نہیں ہو سکتی، اس کے لیے قرآن مجید کو اسلاف کی بیان کردہ تفسیر سے بے نیاز ہو کر دیکھنا پڑے گا، وہ لکھتے ہیں:

”فکرِ اسلامی میں شانِ نزول کی اصطلاح اسی حقیقت کا ادراک ہے۔ پھر یہ بات بھی جان لینے کی ہے کہ استخراج ایسے نتائج تک نہیں لے جاتا، جو نئے ہوں اور اسی طرح معاشرے

۱- تقی الدین ابن تیمیہ، مقدمة في اصول التفسير، فصل في اختلاف السلف في التفسير وأنه اختلاف تنوع، سبب النزول وأثره في ذلك، صفحہ ۴۷۔

کی نوعی تبدیلیوں کو اجتہاد کے اس طریقے سے تشفی بخش طور پر مخاطب نہیں کیا جاسکتا۔ ظاہر ہے کہ صنعتی اور پھر ٹکنالوجی کے انقلابات کے بعد، معاشرے کی ہیئت جس طرح بدلی ہے اور سیاست، معیشت اور حقوق انسانی کے جوئے پہلو سامنے آئے ہیں، ان کو صحیح طرح سمجھنے، اور ان کے لیے مناسب قانون اور طور طریقے بنانے کے لیے استخراجی طریق کار میں بنیادی تبدیلی لانی پڑے گی۔

ڈاکٹر صاحب سمیت تمام جدیدیت پسندوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ مغرب کی خوش حالی، صنعتی ترقی اور فارغ البالی پرفریفتہ ہیں، ان کی خواہش ہے کہ زندگی فرعون کی طرح نہایت عالی شان ہو لیکن آخرت کا انجام سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہو۔ جدیدیت پسندوں کی بڑی تمنا یہ ہے کہ کسی طرح مغرب سے مادی فتوحات حاصل کر کے اس میں اسلامی اخلاقیات کی پیوند کاری کر دی جائے۔ یہ بات ناممکن ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے لیے فرعون اور اس کا طرز زندگی دونوں لائق نفرت اور ناقابل اتباع ہوں گے۔ طرز زندگی ان ایمانیات اور مابعد الطبیعیات سے ظہور کرتی ہے، جسے قدر، ایمان اور پیمانہ جان کرایمانی سطح پر اختیار کیا جاتا ہے۔ دو متضاد مابعد الطبیعیات سے پھوٹنے والے دو مختلف اسالیب حیات کو جمع کرنے اور اس میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش فلسفے کی زبان میں اصطفائیت [Eclecticism] کہلاتی ہے۔ معیارات زندگی اور اسالیب حیات ارتقاء، ادغام، انضمام، تلفیق اور تطبیق سے نہیں مابعد الطبیعیات، اس پر استوار علمیات کے زیر اثر پیدا ہونے والی تاریخ اور تعامل امت سے برآمد ہوتے ہیں۔ جس امت کے لیے عقیدے کی ہر کسوٹی اور عمل کا ہر معیار ”خیر القرون“ ہو، وہ ہمیشہ معیار زندگی کے لیے اسی طرف دیکھے گی۔ جس کے بعد اس کا معیار زندگی کم سے کم تر ہوتا چلا جائے گا۔ خیر القرون کے معیار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت اہم اور مطلوب ہو کر ہر شے کے ترک و اخذ کا پیمانہ بن جائے۔ دنیا مری ہوئی بکری سے زیادہ حقیر اور کم تر قرار پا جائے۔

جدید طرز معیشت اور جدیدیت کے نزدیک دنیا اہم ترین مقاصد میں سے ایک ہے۔ تمام ریاستیں سرمایہ دارانہ نظام معیشت کو ایک عالمی آفاقی قدر کے طور پر قبول کرتی ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک دنیا کا حصول اور یہاں کی اسائش اسی ایمانی جوہر اور ایمانی جذبے سے مطلوب ہے جیسا ایمانی

۱- منظور احمد، ”اسلامی فکر کی بصیرت اور اقبال“، مشمولہ اقبال شناسی، صفحہ ۲۳۔

۲- مغرب میں اس خواہش کا اظہار معروف مغربی مفکر Jared Diamond نے اپنی مشہور کتاب *The World Until Yesterday: What Can We Learn from Traditional Societies?*, London: Penguin Books Ltd., 2012 کے آخری باب میں کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مغرب اپنی عظیم الشان اور محیر العقول سائنسی و تکنیکی ترقی کے باوصف روایتی معاشروں خصوصاً نیوگنی [New Guinea] جیسے معاشروں کی اخلاقیات اور اقدار کا پابند ہو جائے اور اگر وہاں محیر العقول ترقی کے ساتھ اقدار، خاندانی نظام، روایتی معاشروں جیسے سماجی رویے، جس کا بنیادی وصف بڑوں کی عظمت، چھوٹوں پر شفقت، اکرام ضیف اور قلبی سکون ہے، پروان چڑھائیں تو یہ ایک بڑی تبدیلی ہوگی۔



جو ہر اور ایمانی جذبہ ایک مسلمان کے لیے معرفت رب اور دار آخرت میں کامیابی کے لیے درکار ہے۔ یہ امر بہت قابل غور ہے کہ جدید طرز زندگی کو اختیار کرنے والے ایک مسلمان کے لیے بھی فکر آخرت ایک ثانوی چیز ہو جاتی ہے۔ جس شخص کے لیے مغرب کا طرز زندگی معیار ہوگا اُسے ”خیر القرون“ ہر اعتبار سے ناقص اور پس ماندہ نظر آئے گا، وہ تاریخی جبر کے طور پر ایسا کہنے کی جرأت تو نہیں کرے گا، لیکن مختلف حیلوں، بہانوں اور ہتھکنڈوں سے اسلام اور سرمایہ داری میں تلفیق و تطبیق کی راہیں تلاش کرتا رہے گا۔ اس طرز زندگی کے حامی اور عادی افراد اسلام اور اسلامی علمیات کو کسی بھی شے کے رد و قبول کا معیار نہیں بناتے بلکہ اسلام کو محض ایک ثقافتی رویہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک حقیقت مغرب اور مغرب کے دیے ہوئے جدید نظام قدر، اصول اور آدرش ہیں۔ ان حقیقتوں کو تسلیم کرنے اور خود کو اس میں تحلیل کر دینے کے بعد اسلام جہاں چاہے اپنی جگہ بنالے۔ بالفاظ دیگر ان جدید اداروں کے ”الخیر“ [hyper good] کے تابع فرمان ہو کر اسلام کا ”الخیر“ اگر اپنی جگہ بنا سکتا ہے تو بنالے، کھڑا رہ سکتا ہے تو خوشی سے کھڑا رہے۔

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا منقولہ بالا اقتباس اسی نقطہ نظر کا غماز ہے، ورنہ ”استخراجی طریقہ کار میں بنیادی تبدیلی“ سے ان کی کیا مراد ہے؟ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ مسلمانوں کی علمی، فکری اور عرفانی روایت اپنے ہر ہر جز میں نزولی اور استخراجی ہے۔ یہاں حقیقت ہی مقدمہ ہے اور حقیقت ہی نتیجہ۔ ڈاکٹر صاحب ایسے کن نتائج کے متمنی ہیں جو ”نئے“ ہوں؟ نتائج کے ”نئے“ ہونے سے ان کی کیا مراد ہے؟ اس بحث میں استخراج کی بحث بالکل بے معنی ہے۔ اسلامی علمیات میں چاہے استقرا و استخراج سے نتائج اخذ کیے جائیں یا جدلیاتی طریقے یا دیگر جدید منطقی اصولوں کو اختیار کیا جائے اس کا ہر نتیجہ یا آخرت، معرفت رب اور دنیا کی بے ثباتی کی صورت میں نکلے گا بہ شرط یہ کہ استخراج کی بنیاد قرآن و سنت ہوں۔ — یہ بات اتنی بنیادی اور بدیہی ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم اور مستشرق بھی قرآن و سنت کے ذخیروں سے اس کی حقیقی روح اور قدر کو مد نظر رکھتے ہوئے نتائج اخذ کرے گا تو وہ بھی یہی کہے گا کہ اسلام دنیا کی بے ثباتی کے اثبات پر کھڑا ہوا ہے۔

قرآن قانونی دفعات کی نہیں موعظت و ترہیب کی کتاب ہے: منظور احمد:

ڈاکٹر منظور احمد کتاب اللہ کے بیش تر حصے کو موعظ و ترہیب پر مشتمل سمجھتے ہیں اور موعظ کو

قانونی دفعات کے طور پر پیش کرنے کے خلاف ہیں۔ لکھتے ہیں:

”قرآن و حدیث زیادہ تر ترغیب، ترہیب اور موعظ پر مشتمل ہے۔ اس کلام میں جو ما بعد

الطبیعیاتی، تاریخی یا کسی حسی حقیقت کا بیان ہے وہ اُس ترغیب، ترہیب اور موعظت کے لوازمات

ہیں جن کے بغیر کلام کے مقاصد پورے نہیں ہوتے، اس موعظت کو تضایا کی شکل میں ڈھالنے

سے کلام کا اصل مقصد ختم ہو جاتا ہے اور کلام ایک بے جان جملہ بن جاتا ہے۔ جس کو ارد گرد کی وجودی حقیقت سے جدا کر دیا گیا ہو، اس قضیے کے اصل معانی اور مقصد اس کو اس وجودی حقیقت سے دوبارہ متصل کر کے ہی معلوم کیے جاسکتے ہیں، جس میں وہ بولا گیا ہو۔<sup>۱</sup>  
ایک مقام پر مزید لکھتے ہیں:

”جس طرح قرآن فطری علوم کی کتاب نہیں ہے، اسی طرح یہ قانون کی نہایت درست کتاب بھی نہیں ہے کہ اُس کی دفعات کو سامنے رکھتے ہوئے حج اسی طرح فیصلے کریں جس طرح تعزیرات ہند سے عدالتوں میں فیصلے کیے جاتے ہیں۔ زمانہ جدید میں اسلامی شریعت کے جو مسائل درپیش ہیں اُن کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے قرآنی آیات کو ایک مجموعی ہدایت کی بجائے قانون کی دفعات کا درجہ دے دیا۔“<sup>۲</sup>

قرآن: احکام کی قطعیت اور تغیر پذیری کا حسین امتزاج:

ڈاکٹر منظور احمد کے بقول قرآن کریم صرف کتاب ہدایت ہے اور ان کے نزدیک:  
”ہدایت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس میں انسانی زندگی کے ہر عمل اور فعل کے لیے خصوصی یا عمومی ہدایتیں موجود ہیں۔“<sup>۳</sup>

بلاشبہ قرآن مجید سے انسانی زندگی کے ہر جزئیے کی تفصیل تلاش کرنا حماقت ہوگی۔ زیر بحث امر یہ ہے کہ جن احکام کا حکم اور اس کے نفاذ اور اطلاق کا طریقہ خود قرآن نے یا اسوۂ رسولؐ نے بتلا دیا اسے دائمی نہ سمجھنا اور اسے قرآن مجید کی واضح تصریح کے باوجود ایک مخصوص حالات اور زمانے کے اقتضا کا نتیجہ باور کرنا کہاں تک منشاء شارع ہے؟ اگر ایسی ہی بات ہے جیسی ڈاکٹر صاحب بیان فرما رہے ہیں تو سوال یہ ہے کہ قرآن مجید میں اصولی احکام کی تفصیل کیوں بیان کی گئی ہے؟ اور ان احکام کو مع تفصیلات کے ”حدود اللہ“ قرار دیتے ہوئے اُس سے تجاوز کرنے سے کیوں منع فرما دیا ہے:

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا [۲۲۹:۲]

”یہ اللہ کی حدود ہیں، خبردار! ان سے تجاوز نہ کرنا۔“

ان حدود سے تجاوز کر جانے والوں کو ہُمْ الظالمُونَ [۲۲۹:۲]، هُمْ الفاسقُونَ، هُمْ الكافِرُونَ [۴۳:۵] کیوں قرار دیا ہے؟ انھیں فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ [۱:۶۵] ”خود اپنے اوپر ظلم کرنے والا“ کیوں قرار دیا ہے؟ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصوص قرآنیہ کی مدد سے بہت سے تفصیلی احکام و قوانین بنائے، اسی طرح ان اصولی احکام کی تفصیل بھی آپ بنا سکتے تھے، کیوں قرآن نے آپ کو یہ حکم دیا:

۱- منظور احمد، ”اسلامی فکر کی بصیرت اور اقبال“، مشمولہ اقبال شناسی، صفحہ ۲۳۔

۲- منظور احمد، ”چند توجہ طلب مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۴۰۔

۳- ایضاً، صفحہ ۱۳۸۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيْعَةٍ مِّنَّا لَمُرًّا فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ [۱۸:۴۵]

”پھر ہم نے آپ کو ایک خاص طریقے پر کر دیا، سو آپ اسی طریقے پر چلے جائیے اور ان جہلا کی خواہشوں پر نہ چلیے۔“

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود کو نافذ کرتے ہوئے کسی کی بھی سفارش کو قبول فرمانے سے کیوں انکار فرمادیا تھا؟

اصل مسئلہ جسے نظر انداز کر دیا گیا یہ ہے کہ قرآن میں بیان فرمودہ احکام و عقائد کی دو قسمیں ہیں:

[۱] عقائد سے متعلق احکام جو مفصل بھی ہیں اور ناقابلِ تغیر و تبدل بھی۔

[۲] عبادات اور غیر تعبدی احکام اور عائلی قوانین۔

عبادات کے سلسلے میں کئی و جزئی دونوں طرح کے احکام ملتے ہیں، جس کی بڑی حکمتیں ہیں، لیکن سر دست موضوع سخن یہ نہیں ہے، لہذا اس کو قلم زد کیا جاتا ہے۔ جہاں تک غیر تعبدی احکام و قوانین کا تعلق ہے ان میں سے کچھ کو قرآن نے حمیت اور قطعیت سے متعین فرمادیا ہے جو ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ باقی کے اصولی احکام دے کر تفصیل سے بالقصد احتراز فرمایا ہے تاکہ ان امور میں حالات و مقتضیاتِ زمانہ کے لحاظ سے بذریعہ اجتہاد ایسے تفصیلی احکام بنا لیے جائیں، جو مقاصد الشریعہ کے موافق ہوں۔

یہ قرآن مجید میں بیان فرمودہ احکام و مسائل کا اجمالی تذکرہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا مسئلہ یہ ہے کہ ایک طرف وہ اس درجے وسعت اور فراخی کے قائل ہیں کہ عقائد تک میں تلبیس و تحریف [جس کا مفصل نمونہ افکارِ نیاز پر بحث کے دوران پیش کیا جائے گا] کو بھی ”غیر روایتی تفہیم“ کے عنوان سے اسلام کے دائرے میں روا سمجھتے ہیں۔ دوسرے، احکام قرآنی اور منصوص حکم کو جزئی سمجھتے ہوئے وقت اور حالات کی تبدیلی کے نام پر متغیر جانتے ہیں۔ تو اب جب کہ عقائد اور احکام و حدود دونوں ہی بدلے جاسکتے ہیں تو دین و شریعت کی ضرورت کا جواز ہی بے معنی اور عبث ہو جاتا ہے۔

قرآن: احکام، موعظت، اور ہدایت کی عالم گیر اور جامع کتاب:

جہاں تک ڈاکٹر صاحب کے اس ارشاد کا تعلق ہے کہ ہدایت کو قانونی شکل دینے سے اس کی مقصدیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اصولی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کی شاید ہی کوئی آیت ہو جس سے کوئی حکم مستنبط نہ ہوتا ہو۔ ڈاکٹر صاحب کے مدوح اصولی نجم الدین طوی [م ۱۶۷ھ] لکھتے ہیں:

فإن أحكام الشرع كما تستنبط من الأوامر والنواهي؛ كذلك تستنبط

من الأقاویص والمواعظ ونحوها.

۱- نجم الدین طوی، شرح مختصر الروضة، المملكة العربية السعودية: وزارة الشؤون الإسلامية والأوقاف والدعوة والإرشاد، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء، الاجتهاد، ما يشترط للمجتهد، جلد ۳، صفحہ ۵۷۷۔

”احکام شریعت جس طرح اوامر و نواہی سے مستنبط کیے جاتے ہیں، اسی طرح قصص اور وعظ و نصیحت کی آیات سے بھی ان کا استنباط کیا جاتا ہے۔“

قرآن چوں کہ انسان کی دائمی ہدایت کا سامان لے کر آیا ہے اس لیے اُس میں ہدایت کے لیے وعظ و نصیحت بھی ہے اور معصیت پر سزا بھی۔ دونوں ہی ابدی اور دائمی ہیں۔ غلط فہمیاں اُس وقت جنم لیتی ہیں جب معاشرے کے بقا اور قیام و استحکام کا ضامن و ذریعہ محض ریاست کو سمجھا جائے۔ دنیا افراد پر مشتمل ہے، افراد سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے اور معاشرے کے تحفظ و استحکام کے لیے ایک مقتدر اعلیٰ اور بالادست حاکم کی ضرورت ہے جس کے بغیر معاشرے کی بقا بلکہ اُس کا وجود و ثبوت ہی باطل ہے۔ بالفاظ دیگر فرد، معاشرہ اور ریاست ہی حیات انسانی کی وہ بنیادیں ہیں جن پر عظمت انسانی کا مدار و انحصار ہے۔ تہذیب و تمدن کی تشکیل، علوم و فنون میں ترقی اور راحت و سکون کی دولت ان ہی پر ٹکی ہوئی ہے۔ اس لیے اسلام نے فرد، معاشرہ اور ریاست تینوں کے تحفظ اور بقا کے لیے کچھ ”حدود“ مقرر رکھی ہیں۔ اور پھر چوں کہ اسلام میں معاشرے اور ریاست پر بھی ایک اعلیٰ و بالا مقتدر ہے: دین — جس طرح دیگر معاشروں میں ریاست سے بغاوت اُس کی بنیادوں کو متزلزل کر دینے کے مرادف ہے، اُسی طرح اسلام میں داخلے کے بعد دین سے بغاوت چاہے کھلم کھلا ہو یا اشاروں کناؤں میں، اسلامی علمیات کو مسخ اور مسلم معاشرے کو ڈھا دینے کے برابر ہے۔ لہذا اُس کی حفاظت و صیانت کے لیے بھی ایک حد ہے۔ ان ہی کو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ”حدود اللہ“ قرار دیا ہے اور اس سے تجاوز کرنے والوں کو قرآن مجید نے کافر، ظالم اور فاسق قرار دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ مبارکہ اور حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے فیصلے، صحابہ کرامؓ، تابعینؓ و ائمہ مجتہدینؒ اور کل امت شروع سے آج تک ان حدود کے دائمی، اٹل اور قطعی ہونے پر ایمان رکھتی چلی آرہی ہے اور اُس کے اطلاق و نفاذ پر عمل پیرا بھی رہی ہے۔ اس میں ترمیم و اضافے یا تغیر و تبدل کا حق کسی کو نہیں ہے۔<sup>۱</sup>

۱- نفاذ و اطلاق حدود کے حوالے سے اس مقام پر نظر کا پیش کرنا موجب تطویل ہوگا لہذا حوالہ جات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔  
مطلوبہ استعداد کے حامل افراد استفادہ کر سکتے ہیں:  
عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں نفاذ حدود:  
[۱] نفاذ حد زنا:

[۱:۱] مالک بن انس، المؤطا للامام مالک، کراچی: قدیمی کتب خانہ، [س-ن]، کتاب الحدود، باب فی الرجم، جلد ۲ صفحہ ۱۶۵۔

[۱:۲] محمد بن اسمعیل بخاری، الصحيح البخاری، لاہور: مکتبۃ الحسن [س-ن]، کتاب الحدود، باب الرجم بالمصلی، جلد ۲، صفحہ ۱۰۰۔

[۱:۳] مسلم بن حجاج القشیری، الصحيح المسلم، ملتان: دار الحدیث [س-ن]، کتاب الحدود، باب حد الزنا، جلد ۲، صفحہ ۶۸-۶۹۔

- [۱:۴] = سلیمان بن اشعث ابی داؤد، سنن ابی داؤد، کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی، [س-ن]، کتاب الحدود، باب فی المرأة التي امر النبي صلى الله عليه وسلم بوجعها من جهينة، جلد ۲ صفحہ ۲۵۳۔
- [۱:۵] شعیب بن علی النسائی، سنن النسائی، ملتان: المکتبۃ الفاروقیہ، ۱۴۲۱ھ، ابواب الحدود، باب حد الزنا، صفحہ ۱۸۶۔
- [۱:۶] محمد بن حسن الشیبانی، الموطا للامام محمد، ملتان: مکتبہ حقانیہ [س-ن]، ابواب الحدود فی الزنا، باب الرجم، صفحہ ۳۰۶۔
- [۱:۷] حسین بن علی البیهقی، السنن الکبریٰ، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۲ء، کتاب الحدود، باب العقوبات فی المعاصی قبل نزول الحدود، جلد ۸ صفحہ ۳۶۴۔

[۲] نفاذ حدہ قذف:

- [۲:۱] شعیب بن علی النسائی، سنن النسائی، ابواب الحدود، باب حد القذف، صفحہ ۱۸۷۔

[۳] نفاذ حدہ سرقت:

- [۳:۱] مالک بن انس، الموطا للامام مالک، کتاب الحدود، باب ماجاء یجب فیہ القطع، جلد ۲ صفحہ ۲۷۴۔
- [۳:۲] سلیمان بن اشعث ابی داؤد، سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، باب فیمن سرق من حرز، جلد ۲، صفحہ ۲۴۷۔
- [۳:۳] محمد بن اسمعیل بخاری، صحیح البخاری، کتاب الحدود، باب کراهیة الشفاعة فی الحد، جلد ۲، صفحہ ۱۰۰۳۔

- [۳:۴] مسلم بن حجاج القشیری، صحیح المسلم، کتاب الحدود، قطع السارق الشریف وغیرہ، جلد ۲ صفحہ ۶۴۔

- [۳:۵] احمد بن حنبل، مسند احمد، الرياض: بیت الافکار الدولیہ، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء، جلد ۲ صفحات ۱۵۰-۱۵۱۔

- [۳:۶] ابوبکر عبدالرزاق الصنعانی، المصنف لعبد الرزاق، کراچی: مجلس علمی، ۱۹۷۲ء، جلد ۱۰، صفحہ ۱۸۸، رقم ۱۸۷۷۳۔

[۴] نفاذ حدہ حرابیہ:

- [۴:۱] مسلم بن حجاج القشیری، صحیح المسلم، کتاب القسامۃ والمحاربین، باب حکم المحاربین المرتدین، جلد ۲، صفحہ ۵۷۔

[۵] نفاذ حدہ شرب خمر:

- [۵:۱] مسلم بن حجاج القشیری، صحیح المسلم، کتاب الحدود، باب حد الخمر، جلد ۲، صفحہ ۷۱۔
- [۵:۲] محمد بن حسن الشیبانی، کتاب الآثار، کراچی: ادارۃ القرآن والعلوم والاسلامیہ، ۱۴۰۷ھ، باب حد السكران، صفحہ ۱۳۷۔

- [۵:۳] محمد بن اسمعیل بخاری، صحیح البخاری، کتاب الحدود، باب ما یکرہ من لعن الشارب، جلد ۲، صفحہ ۱۰۰۲۔

عہد سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، میں نفاذ حدود:

- [۱] حسین بن علی البیهقی، السنن الکبریٰ، جلد ۷، صفحہ ۱۵۵۔

- [۲] محمد بن حسن الشیبانی، الموطا للامام محمد، باب الاقرار بالزنا، صفحہ ۳۱۰۔

- [۳] ابوبکر عبدالرزاق الصنعانی، المصنف لعبد الرزاق، جلد ۷، صفحہ ۳۷۷۔

- [۴] علی بن حزم الاندلسی، المحلی، بیروت: دارالآفاق الجدیدہ [س-ن]، جلد ۱۱، صفحہ ۳۶۴۔

اسلامی ریاست: اسلامی سزاؤں اور حدود کے نفاذ کا اصل محل:

بلاشبہ مسلم معاشرہ حدود کی پامالی پر سزاؤں کے نفاذ کا اسی طرح مکلف ہے جس طرح عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ کے دور میں یہ سزائیں نافذ تھیں۔ ان سزاؤں کے ذریعے مسلم معاشرے کی اصلاح اور جرائم کا انسداد نہایت موثر اور کامیاب طریقے پر ہوتا رہا ہے۔ مگر یہ سزائیں اسلامی نظام حیات اور اس میں موجود روحانیت کا ایک جز ہیں کُل نہیں — کوئی بھی اسلامی ریاست اپنی بنیاد سے لے کر نفاذ قانون تک مکمل اسلامی ریاست ہوتی ہے۔ وہ صرف جزئیات میں نہیں بلکہ اپنی کلیت میں اسلامی ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر شریعت ایک ایسی وحدت کاملہ کی ترجمان ہے جسے اجزا اور ٹکڑوں میں نہیں بانٹا جاسکتا۔

فی زمانہ شریعت کی اصطلاح جن معنوں میں عموماً استعمال کی جاتی ہے ان میں غالب پہلو سزاؤں کے نفاذ اور حدود کے اجرا کا پایا جاتا ہے۔ جہالت خالصہ، یا غالب سیاسی مصلحتوں کے پیش نظریہ عالمی استعماری طاقتوں کے اشارے پر منظم منصوبہ بندی کے تحت شریعت کا یہ محدود اور عامیانہ تصور اسلام کے جامع اور مربوط نظام کی کلیت کو نظر انداز کر کے حدود و تعزیرات سے متعلق سوالات اور مباحث کو خود مسلمانوں کی نگاہ میں ایک ہولناک اور سنگین مسئلہ بنا دیتا ہے۔ دین کی روح اور نفاذ دین کی تمام حکمت عملی صرف حدود و تعزیرات کی صورت میں سامنے لائی جاتی ہیں، جن کے منفی اثرات و نتائج سے سیکولر اذہان

- [۵] ابو بکر ابن ابی شیبہ، المصنف، کراچی: ادارۃ القرآن، ۱۹۸۵ء، جلد ۱ صفحہ ۱۲۵۔
- [۶] موفق الدین ابن قدامہ المقدسی، المغنی، بیروت: دار الفکر، ۱۴۰۵ھ، جلد ۸، صفحہ ۲۱۸۔
- عہد سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ میں نفاذ حدود:
- [۱] ابو بکر عبدالرزاق الصنعانی، المصنف لعبد الرزاق، جلد ۷، صفحہ ۳۰۳۔
- [۲] موفق الدین ابن قدامہ المقدسی، المغنی، جلد ۸، صفحہ ۳۱۲۔
- [۳] مالک بن انس، الموطا للامام مالک، جلد ۲، صفحہ ۸۲۔
- [۴] علی بن حزم الاندلسی، المحلی، جلد ۱۱، صفحہ ۳۶۲۔
- [۵] ابو بکر ابن ابی شیبہ، المصنف، جلد ۲، صفحہ ۱۲۸۔
- [۶] حسین بن علی التیمی، السنن الکبریٰ، جلد ۸، صفحہ ۳۶۸۔
- [۷] علی بن عمر الدارقطنی، سنن الدارقطنی، دہلی: المطبع الفاروقی [س۔ ن۔]، جلد ۲ صفحہ ۳۷۳۔
- عہد سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ میں نفاذ حدود:
- محمد بن حسن الشیبانی، الموطا للامام محمد، باب ما يجب فيه القطع، صفحہ ۳۰۲۔
- عہد سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں نفاذ حدود:
- ابو جعفر احمد الطحاوی، شرح معانی الآثار، لاہور: مطبع مجتہبی، ۱۴۱۲ھ، صفحہ ۸۳، تفصیل کے لیے محمد عبداللہ بن نور لدین کی کتاب: النجم الناقب فی القضاة علی بن ابی طالب، لاہور: جہانگیر بک ڈپو، ۱۳۶۰ھ، کا مطالعہ کیا جائے۔

بہت خوش ہوتے ہیں — اسلام، دارالاسلام میں، ان سزاؤں کے نفاذ کا حکم تو ضرور دیتا ہے لیکن اعتدال و احتیاط اور عدل و انصاف کا دامن نہیں چھوڑتا۔ وہ سزا کے نفاذ سے قبل دو امور کو ملحوظ رکھتا ہے:

[۱] مجرم کا نقطہ نظر

[۲] معاشرے کا زاویہ نظر

بالفاظ دیگر اسلام اندھا دھند سزائیں تجویز نہیں کرتا بلکہ وہ ریاست کو حدود کے نفاذ کا مکلف بناتے ہوئے، سزا کے نفاذ سے قبل اسباب و ارتکابِ جرم اور حالات کو سامنے رکھتا ہے۔ دوسرے، ان سزاؤں کے نفاذ کا محل اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرہ ہے۔ جہاں مملکت کا نظم و نسق اور معاشرت و تمدن کی ترتیب و تنظیم اسلام کے تجویز فرمودہ اصولوں اور طرز کے مطابق کی گئی ہو۔ اسلام ان سزاؤں کے نفاذ کا متمنی نہیں بلکہ وہ ان سنگین جرائم کی پیدائش کے احتمال ہی کو ختم کر دینے کا خواہاں ہے، وہ معاشرے کو ایسے تمام اسباب و عوامل سے پاک کر دینا چاہتا ہے جن کے باعث ان سنگین نوعیت کے جرائم جنم لیتے اور پنتے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلام اپنی تمام تر صفات و کمالات کو بروئے کار لا کر معاشرے کی اٹھان اور بنیاد ہی صالحیت پر رکھنا چاہتا ہے۔ اسلام انسان کے نفس کی لطافت کو ابھارنے اور کثافت کو دبانے کے اسباب و محرکات پہلے فراہم کرتا ہے، اُس کے بعد اگر کوئی ان سنگین جرائم کا ارتکاب کرتا ہے تو پھر اُس پر نہایت سخت قیود و شرائط کے ساتھ حد لاگو کرنے کا حکم دیتا ہے اور اس میں بھی جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے مجرم کو قانون کی زد میں آنے سے بچانے کی ترغیب دیتا ہے۔

۱- اس توجہ طلب حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ شریعت کی ہدایت مجرم کو بہ ہر صورت سزا دینے پر اصرار نہیں کرتی، بلکہ جہاں تک ممکن ہو مجرم کو سزا سے محفوظ رکھتے ہوئے اصلاح احوال کا موقع فراہم کرنا چاہتی ہے، اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مجرم، اسلامی معاشرے کے افراد اور اربابِ حل و عقد کو علیحدہ علیحدہ ہدایات دی ہیں۔ مجرم کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی پہلو کے پیش نظر یہ ترغیب دی ہے کہ اگر کسی سے قابل حد جرم سرزد ہو جائے [اور اگر اس جرم سے کسی بندے کا حق متعلق نہیں ہے] تو اسے اپنے جرم پر پردہ ڈالے رکھنا چاہیے اور توبہ و استغفار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع کرنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من اصاب من هذه اتعافورات شيئاً فليستر بستر الله فإنه من يدلنا لنا صفحته نقم عليه كتاب الله.

[مالک بن انس، الموطا للامام مالک، کتاب الحدود، باب ماجاء فيمن اعترف على نفسه بالزنا، صفحہ ۲۸۶]۔

”جو شخص ان ناپاک چیزوں میں سے کسی میں ملوث ہو جائے تو وہ اس پردے سے خود کو چھپالے جو اللہ تعالیٰ

نے ڈال رکھا ہے۔ کیوں کہ جو شخص ہمارے رو بہ رو اپنے جرم کو بے نقاب کرے گا، ہم اس پر کتاب اللہ کا

قانون نافذ کر کے رہیں گے۔“

مجرم کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی معاشرے کے افراد کو بھی تلقین فرمائی ہے کہ قابل حدود سزاؤں کے مرتکبین کو عدالت میں پیش کرنے سے گریز کریں، سیدنا عمرو بن عاصؓ آپ کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

تعافوا الحدود فيما بينكم فما بلغني من حد فقد وجب. [سليمان بن اشعث ابى داؤد،

ابوداؤد، کتاب الحدود، باب العفو عن الحدود ما لم تبلغ السلطان، جلد ۲، صفحہ ۲۳۵]۔

”سزاؤں کو آپس ہی میں معاف کر دیا کرو، اس لیے کہ جب معاملہ مجھ تک پہنچ جائے تو سزا واجب ہوگئی۔“  
ارباب حل وعقد کے لیے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ادراء والحدود عن المسلمین ما استطعتم فان كان له منخرج فخلوا سبیلهم فان الامام  
یخطی فی العفو خیر من ان یخطی فی العقوبة. [محمد بن عیسیٰ الترمذی، ابواب الحدود، باب فی  
درء الحدود، جلد ۱، صفحہ ۲۶۳]۔

”جہاں تک ممکن ہو سکے مسلمانوں سے سزاؤں کو ٹالو، اگر مجرم کے لیے سزا سے بچنے کی کوئی صورت  
ہو سکتی ہے تو اسے چھوڑ دو، اس لیے کہ امام کا معاف کر دینے میں غلطی کرنا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا  
دینے میں غلطی کرے۔“

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اسلام میں سب سے پہلے جس شخص پر قطع ید کی سزا نافذ کی گئی تو  
آپ کا روئے انور اس طرح متغیر ہو گیا جیسے اس پر نعوذ باللہ، کسی نے راکھ ڈال دی ہو، جب صحابہؓ نے سبب دریافت کیا  
تو آپ نے فرمایا:

وما یمنعنی، وانتم اعوان الشیطان علی صاحبکم، واللہ عزوجل عفو یحب العفو، ولا  
ینبغی لوالی امر، ان یؤتی بحد إلا اقامہ. [احمد بن حنبل، مسند احمد، مسند المکثرین،  
مسند عبد اللہ بن مسعود، جلد ۱، صفحہ ۴۱۹]۔

”میں اس پر نفاذ سزا سے کیسے رک سکتا ہوں، جب کہ تم خود اپنے بھائی کے خلاف شیطان کے مددگار ہو۔ اللہ  
تعالیٰ عفو درگزر کرنے والا ہے اور معاف کر دینے کو پسند کرتا ہے [تمہیں چاہیے تھا کہ اس کے ساتھ عفو کا معاملہ  
کرتے ہوئے اسے میرے سامنے پیش نہ کرتے، کیوں کہ] حکمران کے سامنے جب سزا سے متعلق کوئی  
معاملہ پیش ہو جائے تو اس کے لیے سزا کو نافذ کرنا ہی مناسب ہے۔“

سیدنا معاذ سلمی رضی اللہ عنہ کو ارتکاب زنا کے بعد ان کے مالک حضرت ہزال نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم کی خدمت میں اقرار جرم کے لیے جانے پر آمادہ کیا۔ جب حضرت معاذؓ پیش ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
بار بار اعراض فرماتے اور انھیں لوٹ جانے کو کہتے اور توبہ و استغفار کی ترغیب دیتے: ویحک ارجع، فاستغفر  
اللہ، وتب الیہ. [شعیب بن علی النسائی، السنن الکبریٰ، بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۴۲۱ھ، ۲۰۰۱م،  
کتاب الرجم، کیف الاعتراف بالزنا، جلد ۶، صفحہ ۴۱۴] لیکن ان کی جانب سے دوبارہ وہی بات دہرائی گئی تو  
آپ نے پھر فرمایا: لعلک قبلت، او غمزت، او نظرت؟ [ایضاً، مسألة المعترف بالزنا عن کیفیتہ  
السخ، جلد ۶، صفحہ ۴۱۸] ”شاید تو نے بوس و کنار کیا ہوگا، چھیڑ چھاڑ کیا ہوگا، بری نظر ڈالی ہوگی،“ جب ان کی طرف  
سے مسلسل اصرار جاری رہا کہ نہیں میں نے زنا ہی کا ارتکاب کیا ہے تو پھر آپ نے ان سے نہایت کڑے سوالات  
کے بعد رجم کی سزا کا حکم سنایا اور انھیں شہر سے باہر لے جا کر رجم کر دیا گیا، جب پتھر پڑنے شروع ہوئے تو حضرت  
معاذؓ بھاگے اور بولے: ”لوگو! مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس لے چلو، میرے قبیلے کے لوگوں نے  
مجھے مروادیا، انھوں نے مجھے دھوکا دیا کہ رسول اللہ مجھے قتل نہیں کرائیں گے۔ مگر مارنے والوں نے انھیں مار ڈالا بعد  
میں جب اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی تو آپ نے فرمایا: ہلا تر کتموہ لعلہ یتوب،  
فیتوب اللہ علیہ. [ایضاً، إذا اعترف بالزنا ثم رجع عنه، جلد ۶، صفحہ ۴۳۶] ”یعنی تم لوگوں نے اسے  
چھوڑ کیوں نہیں دیا ممکن ہے وہ توبہ کر لیتا اور اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا۔“ اس موقع پر آپ نے حضرت معاذؓ کے  
سر پرست حضرت ہزال سے فرمایا: لو سترتہ بشوبک، کان خیراً لک [ایضاً، الستر علی الزانی، جلد ۶،  
صفحہ ۴۶۲] ”اگر تم اپنی چادر سے معاذؓ کو ڈھانپ دیتے تو یہ اس سے بہتر ہوتا جو تم نے اس کے ساتھ کیا۔“



زنا کی سزا: ایک پاک باز اسلامی معاشرے کا موضوع:

مثلاً زنا کے مجرم پر سزا کے مسئلے کو لیجیے، اسلام یوں ہی کسی پر زنا کی سزا جاری نہیں کرتا ہے، بلکہ بہ طور پیش بندی اسلام جائز ذرائع سے صنفی خواہشات کی تسکین کا سامان مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ، معاشرے کو بدکاری و عیاشی کے ماحول سے پاک کرنے کے اسباب پہلے فراہم کرنے کا داعی ہے۔ مثلاً اسلام کم عمری میں شادی کو مستحسن جانتا ہے، مرد و زن کے آزادانہ اختلاط:

[۱] خواہ تعلیمی اداروں "میں تعلیم" کے نام پر ہوں۔

[۲] چاہے نام نہاد ترقی کے خوش نما نعروں کی صورت میں ہو۔

[۳] یا خواتین کی غیر ضروری ملازمتوں کے عنوان سے ہو۔

مخرب اخلاق [audiovisual] لٹریچر اور ایسے جرائم و مجلات جو جنسی براہینتگی کا ذریعہ

بنتے ہیں۔ ان سب کو سخت ناپسند کرتے ہوئے ان پر پابندی کو ضروری جانتا ہے۔ پھر اُس نے انسان کی جنسی تسکین کے لیے نکاح کی اجازت ہی نہیں ترغیب دے کر رشتہ ازدواج کے باہر آزاد شہوت رانی کی ہر راہ بند کر دی ہے۔ نکاح صرف جنسی لذت جوئی کا ذریعہ نہیں بلکہ افزائش نسل، تسلسل افراد اور اُس کے نتیجے میں پروان چڑھنے والے پورے خاندانی نظام کا ضامن ہے، جو انسان کو تولید، کفالت و پرورش اور سکون فراہم کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ اس کے بعد اگر مرد چاہے تو ایک سے زائد بیوی رکھ سکتا ہے لیکن عدل کے ساتھ۔ اگر عدل و انصاف نہیں کر سکتا تو پھر صرف ایک ہی نکاح کی اجازت ہے اور اگر کوئی کر لے تو ایک سے زائد نکاح میں عدم انصاف کی صورت میں اسلامی قانون عورت کو انصاف فراہم کرے گا۔ قرآن معاشرے کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ غیر شادی شدہ افراد کی شادی کا اہتمام کریں، ایسا نہ ہو کہ کوئی غریب وسائل کے فقدان کے باعث تہجد کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے یا اپنی شہوت سے مغلوب ہو کر زنا کر بیٹھے۔ اب ان تمام امور کی موجودگی میں اگر کوئی بد طینت زنا کا مرتکب ہوتا ہے، تو وہ: [۱] منشا اور حرمت الہی، [۲] تحفظ رشتہ ازدواج [۳] تحفظ خاندان — کے خلاف سنگین جرم کے باعث سخت ترین سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اب یہاں غیر محسن [غیر شادی شدہ] کو سو کوڑے اور محسن [شادی شدہ] کو تیرہم [سنگ سار] کیا جائے گا۔ لیکن اس کے لیے درج ذیل شرائط کا پایا جانا بھی ضروری ہے:

ان ہی اسباب کی بنا پر خلفائے راشدین اور دیگر حکام حتی المقدور مجرم پر سے سزا کوٹالنے اور معافی کا راستہ نکالنے کی کوشش فرماتے۔ سیدنا ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پاس جب کسی چور کو لایا جاتا تو وہ اس سے دریافت کرتے کیا تم نے چوری کی ہے؟ کہو نہیں۔ یہی طریقہ سیدنا ابوالدرداء اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہے۔ سیدنا عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے چوری کے ملزم سے کہا، کیا تم نے چوری کی ہے؟ کہو، یہ چیز مجھے کہیں سے ملی ہے۔

تفصیل کے لیے دیکھیے، مصنف ابن ابی شیبہ ۲۵۸۷-۲۸۵۸۰۔

[۱] زانی بالغ ہو، نابالغ پر حد نہیں۔

[۲] زانی عاقل ہو، پاگل و مجنون پر حد نہیں۔

[۳] زانی مختار ہو، جبراً زنا کرنے والے پر حد نہیں۔

[۴] زنا کرنے میں شبہ نہ ہو۔ مثلاً کسی نے کسی عورت سے اپنی بیوی سمجھ کر غلطی سے مقاربت کر لی تو شبہ کی بنا پر حد نہیں لگے گی۔

[۵] حرمتِ زنا کا زانی کو علم ہو، اگر زانی کہے کہ اُسے معلوم نہ تھا کہ زنا قابلِ حد جرم ہے تو اُس پر حد نہیں۔

[۶] عورت غیر حربی ہو۔

[۷] عورت زندہ ہو۔

[۸] مرد کا حشفہ عورت کی اندامِ نہانی میں غائب ہو جائے، اس سے کم پر حد نہیں۔

[۹] زنا کا ارتکاب دارالاسلام میں ہو، دارالکفر یا دارالحرب میں ہونے والا زنا موجبِ حد نہیں ہے۔

[۱۰] ان سب شرائط کے ساتھ اگر چار گواہ نہ ہوں تو حد زنا قائم نہیں ہوگی۔ اگر چارہ گواہ مکمل

نہ ہوں تو پاک دامن پر تہمت کے جرم میں گواہوں پر حدِ قذف لگے گی۔

یہ موجبِ حدِ زنا کے سلسلے میں دی جانے والی سزا کا مختصر سا تذکرہ ہے۔

زنا کی سزا آزادی پر بہ طور قدر ایمان رکھنے والے معاشرے کے لیے نہیں ہے:

یہاں پھر یہ بات تکرار اور اصرار کے ساتھ عرض کی جا رہی ہے کہ ان سزاؤں کا محلِ اسلامی معاشرے کے افراد ہیں۔ یہ سزائیں اُس معاشرے کے لیے نہیں ہیں جہاں نوجوانوں کو تعلیم اور ملازمتوں کے نام پر آزادانہ اختلاط کے مواقع فراہم کیے گئے ہوں۔ اُس کے جنسی جذبات کو بھڑکانے اور دائماً متحرک رکھنے کے لیے آوارگی و عیاشی کے نت نئے طریقے حکومتی سرپرستی میں ترقی اور روشن خیالی کے نام پر فراہم کیے جا رہے ہوں۔ ناجائز جنسی تعلقات کو معیوب نہ سمجھا جاتا ہو۔ جہاں معاشرے کا وہ نوجوان جو صالح رہنا چاہتا ہے اور خود کو شہوت کے آزادانہ استعمال سے محفوظ رکھنے کے لیے جلد شادی کی خواہش رکھتا ہے مگر اُس کی ناداری اور نام نہاد معاشرتی رسم و رواج ایک طرف شادی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہوں، دوسری طرف اُسے گناہ پر آمادہ اور مائل کرنے کے لیے مغربی تہذیب کی تقلید میں انٹرنیٹ، کیبل اور موبائل کی بہتات نے اُس کی رہی سہی ہمت بھی توڑ کر رکھ دی ہو۔ اس صورتِ حال میں جہاں بے

۱- صرف ایک موبائل فون ہی کو لیجیے، بظاہر یہ ایک بڑا خوشنما آگے ہے، اس سے یقیناً کچھ فائدے بھی ہیں، لیکن کیا یہ صرف ایک آلے کا نام ہے؟ یا یہ ایک مستقل تہذیب، اسلوبِ حیات، طرزِ زندگی اور زبان و بیان کا داعی بھی ہے؟ اس نے لوگوں کے درمیان میل جول، خط و کتابت اور محبت آمیز ملاقات و تعلقات کی روایت کو فنا کر دیا ہے، البتہ نوعمر لڑکے لڑکیوں کو گفتگو، =

شمار صنفی محزکات پھیلے ہوئے ہوں، جہاں ایک معتدل مزاج آدمی کا زنا سے بچنا مشکل ہے وہاں زنا اور قذف کی شرعی حد جاری کرنا بلاشبہ ظلم ہوگا۔

چوری کی سزا: سادہ طرز زندگی کو معیار ماننے والے اسلامی معاشرے کا عنوان:

چوری کی سزا میں جرم ثابت ہو جانے پر قطع ید کا حکم ہے۔ آج جدیدیت پسند ہاتھ کاٹ دینے کو نہایت بھیا تک انداز میں پیش کرتے ہیں۔ کیا اسلام نے بلا کسی قیود و حدود اور امتیاز کے قطع ید کا حکم دیا ہے؟ یا پہلے معاشی تصورات اور اصول و قوانین کے عملی نفاذ و اطلاق کے ذریعے اُن اسباب و عوامل کو معاشرے سے ختم کر دینے پر زور دیا ہے جس سے چوری کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ اسلامی نظام میں حکومت نادار افراد کی کفالت کی ضامن ہے اُس کی نگاہ میں سادہ طرز حیات معیاری اور پسندیدہ ہے، اسلام مال دار کو بھی تکلف اور تعیش کی زندگی سے پرہیز کی ترغیب دیتا ہے۔ ایسے حالات و اسباب مہیا کرتا ہے جس سے سادہ طرز زندگی اختیار کرنا باعث فضیلت اور موجب تقلید ہو جائے۔ اگر ایسے معاشرے میں کوئی چوری کا مرتکب ہوتا ہے تو پھر درج ذیل شرائط کے ساتھ اُس پر حد کا اجرا کیا جائے گا:

= پھر میل جول اور رفتہ رفتہ ناجائز جنسی تعلقات کے سینکڑوں طریقے تجھادیے ہیں، سستے سے سستے پیکیجز اور سستے فون کی سہولت کیا معاشی ترقی اور نوجوانوں کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے فراہم کیے گئے ہیں؟ موبائل کمپنیوں نے رات بارہ بجے سے لے کر صبح آٹھ بجے تک گفتگو کی مفت سہولت مہیا کر کے آوارگی اور آبرو باختگی کا دروازہ کھول کر گناہ کا دائرہ خلوت تک وسیع کر دیا ہے، خیر و شر کے پیمانے تک تبدیل کر دیے ہیں۔ مسجدوں تک کوفون کی گھنٹیوں سے آلودہ کر دیا ہے، حالت نماز میں بھی لوگوں کا دھیان موبائل کی طرف لگا ہوتا ہے۔ ایک فون نے پوری تاریخ و تہذیب اور روایت و اقدار کا سفر معکوس کر دیا ہے، مگر جدیدیت پسندان تمام مضرتوں اور ہولناکیوں سے آنکھیں موندے سائنس اور ٹیکنالوجی کے قصیدے پڑھ رہے ہیں اور اس کے لیے احکام قرآنی اور قوانین اسلامی کو مورد اعتراض اور عہد حاضر میں ناقابل اطلاق گردان رہے ہیں۔ موبائل فون کی ایجاد کا سہرا جس معاشرت اور تہذیب کے سر ہے یعنی مغرب، خود وہاں کے مفکرین اور صاحبانِ قلم نے فرد اور معاشرے پر موبائل فون اور اس قسم کی دیگر ایجادات کے اثرات اور مضرتوں پر جو کچھ لواز مہ فراہم کیا ہے اس کا مطالعہ بہت سے اہم اور تلخ حقائق کے انکشاف کا سبب بن سکتا ہے اور اس سلسلے میں ترقی پذیر اقوام کے اہداف کے تعین پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ یہ موضوع ایک بسیط مقالے کا عنوان ہے جس پر آئندہ کسی مرحلے میں تفصیل سے گفتگو پیش نظر ہے۔ سردست اس سلسلے میں درج ذیل کتابوں کا مطالعہ مفید رہے گا:

- [1] Albert J. Fritsch, Paul Gallimore, *Healing Appalachia: Sustainable Living Through Appropriate Technology*, Kentucky: University Press of Kentucky, 2007.
- [2] Dafna Lemish, *The Routledge International Handbook of Children, Adolescents, and Media*, London: Routledge, 2013.
- [3] Rich Ling, *The Mobile Connection: The Cell Phone's Impact on Society*, San Francisco: Morgan Kaufmann Publications, 2004.

[۱] سارق عاقل ہو۔

[۲] بالغ ہو۔

[۳] خود مختار ہو۔

[۴] مال مسروقہ حد نصاب کو پہنچے۔

[۵] مال مسروقہ محفوظ و مقفل جگہ سے خفیہ طریق پر چرایا گیا ہو۔

[۶] مال مسروقہ میں سارق کو کسی قسم کے انہ حقوق حاصل نہ ہوں۔

[۷] بہت سی اشیا ایسی ہیں جن کی چوری پر حد سرقہ نہیں لگتی:

[۷:۱] پھل، ترکاری اور کھانے کی چوری پر قطع ید نہیں۔

[۷:۲] حقیر اشیا [الشئی التافۃ] پر حد سرقہ نہیں۔

[۷:۳] پرندے کی چوری پر حد سرقہ نہیں۔

[۷:۴] بیت المال سے چوری پر حد سرقہ نہیں۔

یہ تمام اصول قرآن حکیم، سنت اور تعاملِ خلفائے راشدین سے ثابت ہیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں ایسی اشیا کی ایک طویل فہرست مندرج ہے۔

سرمایہ دارانہ طرز زندگی کو معیار ماننے والے معاشرے چوری کی سزا کا موضوع نہیں:

قطع ید کی سزا اس معاشرے کے لیے نہیں ہے جہاں انسان کو مادی ایجادات کا غلام بنا کر بندہ درہم و دینار بنا دیا گیا ہو۔ جمالیات، سہولت، آسائش، کامیاب اور پرسکون زندگی کی روایتی معنویت تبدیل کر کے مغربی تصور حیات اور بلند معیار زندگی کو نہایت پرکشش اور دل فریب انداز میں پیش کر کے تہذیب کی شرط لازم قرار دے دیا گیا ہو۔ زہد و قناعت وغیرہ اصطلاحات کو افسانہ کہن قرار دے کر سادگی اور سادہ طرز حیات کو موجب تحقیر اور باعث لعنت و ملامت بنا دیا گیا ہو۔ جہاں سود کا عام رواج ہو اور زکوٰۃ متروک ہو، انصاف و عدل بکٹا ہو، ٹیکسوں کی بھر مار نے ضروریات زندگی نہایت گراں کر دی ہو اور یہ تمام ٹیکس چند طبقات کو سامانِ عیش و عشرت فراہم کرنے میں صرف ہوتے ہوں۔ ظاہر ہے جس معاشرے میں یہ صورت حال ہو وہاں لوگوں کا خوب سے خوب تر کے لیے کوشاں رہنا اور اپنی کامیابی و ترقی کے لیے ہر جائز و ناجائز حربے و ہتھکنڈے اختیار کرنا قدرتی امر ہے۔ چنانچہ آج ہر شخص ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دوڑ میں ہے اور اس غرض کے لیے جب محدود آمدنی کفایت نہیں کرتی تو بے شمار ناجائز اور حرام ذرائع سے کام لیا جاتا ہے اور نتیجہ چوری ڈاکوں کی نوبت آتی ہے۔

سزائیں اور حدود: اسلامی نظام حیات کی کلیت ہی میں با معنی اور موثر ہو سکتی ہیں:

اسلام کا نظام قانون، حدود اور تعزیرات اس کی کلیت کا ایک جز ہیں۔ سزا کی شقوں کو پورے اسلامی نظام حیات کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ اگر روئے زمین پر تمام احکام، نظام، طریقہ ہائے زندگی

۱- ملاء نظام الدین، فتاویٰ عالمگیری، لاہور: حامد اینڈ کو [س۔ ن۔]، جلد ۳، صفحات ۳۱۱-۳۱۷۔

اور اسالیب لادینی [secular] ہوں۔ سیاسی، معاشی، سماجی، عمرانی، اقتصادی، تعلیمی اور عدالتی نظام لادینی [secular] کی بنیادوں پر استوار ہوں تو ان سب پہلوؤں کو ترک کر کے چند انفرادی عدالتی سزائیں کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتیں۔ شریعت کا کوئی حکم جب کسی منکر، غیر اخلاقی، ممنوع کاموں اور فحش امور کو مٹانا چاہتا ہے تو اس کا مقصد کل انسانی معاشرے میں رویتے کی ایک نوعی تبدیلی پیدا کرنا ہوتا ہے، جو صرف قانون کے دائرے میں محدود نہیں ہوتا بلکہ اس کی وسعت فرد، معاشرے اور ریاست تک محیط ہوتی ہے۔ تنہا قانونی سختیاں اپنی کلیت سے الگ ہو کر جزوی طور پر بھی کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتیں۔ جب تک شریعت اپنی کلیت میں نافذ نہ ہو اس کا حسن آشکار اور روح جلوہ طراز نہیں ہو سکتی۔ شریعت کی چند سزاؤں پر مشتمل دین کی نہایت محدود تعبیر کو تسلیم اسی وقت کیا جاسکتا ہے، جب اس توجہ طلب حقیقت کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے کہ شریعت ایک نامیاتی وحدت نہیں ہے۔ جس طرح جسم انسانی کے کسی ایک عضو کو کاٹ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ انسان کا آٹھواں حصہ ہے، اسی طرح شریعت کے چند احکام کو اس کی وحدت سے نکال کر ہرگز شریعت نہیں قرار دیا جاسکتا۔ نہ ایسی حکومت کو اسلامی حکومت باور کیا جاسکتا ہے جو شریعت کے نام پر لوگوں کو سراب دکھا رہی ہو۔ جب شریعت کو اس کی کلیت کے تناظر میں دیکھنے کے بجائے انفرادی اجزا کے طور پر دیکھا جائے گا اور ان اجزا کی تکمیل کے لیے اُسے مسلط کردہ غیر اسلامی بلکہ لادینی نظام سے منسلک کر دیا جائے گا تو نتیجہ لا حاصل ہوگا۔ اسلامی حدود اور تعزیرات اسی وقت صحیح طور پر رو بہ عمل آسکتی ہیں اور اپنی افادیت ثابت کر سکتی ہیں، جب پورا نظام حیات شریعت کے کل کے مطابق ڈھال دیا جائے۔ فرد سے لے کر خاندان، معاشرہ اور ریاست و حکومت تک تمام ادارے شریعت کی قبولیت کے لیے آمادہ اور تیار ہوں۔ — شریعت کی بیان فرمودہ تمام سزاؤں کو اس پس منظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حدود اللہ کی مخالفت کرنے کے بجائے معاشرے کے سنگین جرائم کو امراض سمجھتے ہوئے اُس کی تشخیص بالکل حکیمانہ انداز میں ہونی چاہیے تاکہ تشخیص کے بعد اُس کا ایسا ازالہ ہو سکے کہ دوبارہ پیدائش کا احتمال ہی مٹ جائے۔ اس طرز کی کوشش ایجابی بھی ہوگی اور ثمر آور بھی۔ مگر حالات میں کسی ادنیٰ تبدیلی کے بغیر اور فساد و بگاڑ کی عمومی صورت حال کو رو رکھتے ہوئے، بجائے اصلاح معاشرہ کے حدود و احکام کی معطلی یا تغیر پر بحث کرنا ایک لغو بات ہے۔ جسے کسی طور قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اولاً، یہ غیر اسلامی معاشرے کا موضوع نہیں ہیں، ثانیاً ان سزاؤں کے اطلاق و نفاذ کا حکم نص سے ثابت ہے۔ یہ سزائیں جب اور جہاں بھی نافذ ہوں گی تو مذکورہ قیود و شرائط کے ساتھ اس کا طریق نفاذ کتاب و سنت سے متعین ہے۔ مسلمانوں کی اجماعی فکر ایک لمحے کے لیے بھی اس سے دست بردار نہیں ہو سکتی، اس کے خلاف لگائی جانے والی ہر صدانہ صرف صدابہ صحرانہ ہو کر فضا کی نظر ہو جائے گی بلکہ اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا سبب ہو کر سلب ایمان کا ذریعہ بھی بن جائے گی۔

اسلامی قانون کی شان اعجاز: دنیوی سزا سے زیادہ آخرت کا خوف:

ایک نکتہ مزید قابل غور ہے کہ مذہبی معنوں میں قانون، یعنی حکم، جس غیر مشروط قوت نافذہ کا مظہر ہے اس میں جبریت بہ طور جوہر موجود ہوتی ہے۔ حکم کی تعمیل کا کوئی بھی عمل احساسِ جبر کا ازالہ نہیں کر سکتا۔ قانون کی بالا دست مداخلت انسانی نفس کی تین بنیادی قوتیں اور فعال عناصر و محرک یعنی ذہن، ارادہ اور طبیعت گوارا نہیں کر سکتے، چاہے تعمیل حکم کی تمام غایات کو اخلاقی دلائل سے محکم طریق پر ثابت کیا جا چکا ہو۔

مخاطب کو بغیر کسی دباؤ کے فعل اور ترک کا مکمل اختیار سونپ کر حکم کی واقعی تشکیل کو ممکن بنانا ماہیت حکم میں داخل ہے۔ اسلامی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے قوت نافذہ پر اخلاق و روحانیت کا سائبان پھیلا کر، تطہیر و تزکیے کے داعیے کو پیدا کر کے زندگی کے واقعی موثرات کا احاطہ کرنے کے قابل بنا دیا ہے، جس نے قانون کی جبریت کو رضا و رغبت میں تبدیل کر کے اطاعت کے دینی داعیے کو دوام بخشنے ہوئے تعمیل حکم اور نفاذ قانون کو بندگی کی تسکین کا حتمی وسیلہ بنا دیا ہے۔ اس جذبہ تسکین اور ذوقِ عبودیت کی مستقلاً اساس ہے: خدا خونی، عند اللہ مسئولیت کا اندیشہ، فکرِ فردا اور وہاں کی خذلان و ہلاکت کا ڈر۔ یہ جذبہ اور احساس انسان میں ایک ایسا ایمانی شعور پیدا کر دیتا ہے کہ وساوس و خطرات بھی اُسے خائف اور مضطرب کر دیتے ہیں اور انسان اپنے مفروضہ گناہوں کے تذکرے کو بھی زبان پر انکار رکھ لینے کے مثل تکلیف دہ سمجھتا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ لوگ آئے اور انھوں نے پوچھا:

إنا نجد في أنفسنا ما يتعاضم أحدنا أن يتكلم به. قال: وقد وجدتموه؟

قالوا: نعم، قال: ذاك صريح الإيمان!

”ہم اپنے دل میں ایسے خیالات پاتے ہیں جنہیں زبان پر لانا ہمیں بڑی [ناگوار] بات لگتا ہے۔ آپ نے پوچھا، کیا تم ایسا ہی پاتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا، جی ہاں۔ آپ نے فرمایا یہ تو واضح ایمان ہے۔“

یہ اسلام ہی ہے جس نے اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم تفویض فرمائی اور یہ احساس عطا کیا کہ انسان کی نیکیاں اور بُرائیاں ساری کائنات سے چھپ سکتی ہیں مگر اللہ تعالیٰ سے نہیں۔ وہ یہاں اپنے ارتکاب کردہ جرم اور گناہ کی سزا سے بچ سکتا ہے لیکن آخرت میں نہیں۔ یہ اندرونی دباؤ اور اخلاقی قوت ہی ہے، جو انسان میں اُس شدتِ تسلیم اور جذبہ اطاعت و افگندگی کو بیدار کر دیتا ہے کہ ارتکابِ جرم کے بعد مجرم و مرتکب خود چل کر آتا ہے کہ مجھ سے فلاں جرم سرزد ہو گیا ہے، میرے نفس و روح کو گناہ کی نجاست آلودہ کر گئی ہے لہذا مجھے پاک کر دیا جائے تاکہ میں دنیا ہی میں سزا بھگت کر آخرت کی سزا اور رسوائی سے

۱- مسلم بن حجاج القشیری، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان الوسوسة فی الإیمان وما یقولہ من وجدھا، جلد ۱، صفحہ ۷۹۔

فتح جاؤں۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:  
 ومن أصاب من ذلك شيئاً فعوقب به فهو كفارته ومن أصاب من ذلك  
 شيئاً فستره الله عليه إن شاء غفر له وإن شاء عذبه۔<sup>۱</sup>  
 ”اور جو ان [گناہوں] میں سے کسی کا مرتکب ہو اور اسے اس کی سزا بھی دے دی گئی تو یہ  
 سزا اس کے لیے کفارہ ہے۔ اور جو ان [گناہوں] میں سے کسی کا مرتکب ہو اور اللہ تعالیٰ  
 نے اس کی پردہ پوشی فرمادی تو وہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، چاہے اسے معاف کر دے  
 چاہے اس کو سزا دے۔“

قانون کا مقصد دہشت نہیں خوفِ خدا اور فکرِ آخرت ہے بہ شرط یہ کہ واقعی ایمان دلوں میں جاگزیں  
 ہو۔ آج بھی حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں ایسے واقعات کو پڑھ کر واقعی اسلام کی قانونی اخلاقیات کی  
 شانِ اعجاز کا پتا چلتا ہے۔

محدثہ واقعات اور مثالیں کتب حدیث و تاریخ میں موجود و مسطور ہیں کہ اسلام نے حیرت انگیز  
 قانونی اخلاقیات کے طفیل مجرم کو ارتکابِ جرم کے بعد خود کو پاک کرنے کے لیے تیار کیا۔ سزا میں موجود تطہیر  
 و تزکیے کا یہ داعیہ اسلامی قانون کا اختصاص ہے جو مجرم کو قانون سے بغاوت نہیں بلکہ اُس کو خود پر نافذ  
 کر دینے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ اُس میں ندامت اور شرمندگی کے احساس کو بیدار کر دیتا ہے۔ اور اُس کو یہ  
 یقین دلاتا ہے کہ سزا مغفرت کی موجب اور، ان شاء اللہ، توبہ کے قبول ہونے کی علامت ہے۔  
 صدر اول میں معاصی کے صدور، حکمت و مصلحت:

بعض نا فہم اور سادہ لوح افراد کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہو جانا بہت ممکن ہے، اس لیے  
 یہاں ایک نکتے کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ بعض معصیتوں کے ارتکاب اور صدور کے باوجود  
 قرن اول کا معاشرہ مثالی اور خیر کیوں کہلاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس عہد کو عالی، مثالی اور خیر  
 قرار دینے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہاں گناہ کا وجود ناپید تھا۔ وہ معاشرہ ان معنوں میں مثالی اور خیر ہے کہ وہ  
 بنیادی انسانی لزومیات کی تحدید کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔ گناہ اور کجی انسانی تحدید کا لازمہ ہیں اور  
 توبہ، انابت اور رجوع اور حق کی طرف لپکنے کا جذبہ انسان کے خلقی ضعف اور فطری نقص سے پیدا ہونے  
 والا کمال ہے۔ اگر وہ معاشرہ ان معنوں میں مثالی اور خیر ہوتا کہ معصیت اور ذنب کا وجود ہی عنقا ہوتا تو وہ  
 معاشرہ آنے والی امت کے لیے کبھی مثالی معاشرہ نہ بن پاتا۔

۱- محمد بن اسماعیل بخاری، الصحيح البخاری، کتاب الحدود، باب الحدود كفارة، جلد ۲، صفحہ ۱۰۰۳۔

شان نزول سے لے کر قرآن کی ہدایت، موعظت، قانون اور ترغیب تک ڈاکٹر صاحب کی تمام تر گفتگو الجھاؤ کا شکار ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک ہی موضوع اور عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے مختلف مناہج اور علمی دائروں میں سفر کرتے رہتے ہیں، کبھی فلسفے کے منہاج میں کھڑے ہو کر قرآن مجید کو علمی قضیہ ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ایسا الجھاؤ اور فکری تضاد جس میں مختلف فلسفیانہ یا دینیاتی مسائل کو مرکب کرنے کا اصول، عمل اور رجحان پایا جاتا ہو، ایسے مفکرین کے یہاں موجود ہوتا ہے جن میں ذہنی ایچ کی کمی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا منہاج علم واضح نہیں ہے کہ وہ اسلام کے ناقد ہیں، شارح ہیں، مخالف ہیں، مقلد ہیں، اس کی اصلاح کے دعوے دار ہیں، کیا ہیں؟ بہ ہر حال وہ کچھ بھی ہیں اتنی بات تو ان کی تحریروں سے طے ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام اور اسلامی فکر سے متعلق بہت سے مغالطوں کا شکار ہیں۔ اسلام اور مذہب کی اساسی اور قانونی حیثیت پر ان کی تمام تر گفتگو محض دعوے اور صرف ادعا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو اس مذہب کے منہاج میں ادعائی ہے جہاں ابوحنیفہؒ و شافعیؒ، بخاریؒ و مسلمؒ، غزالیؒ و رازیؒ اور جنیدؒ و شبلیؒ جیسے جہاں علم و عمل کی گفتگو کو بھی قرآن و سنت اور تسلسل تعامل کی روشنی میں جانچا اور پرکھا جاتا ہے، اگر وہ قرآن و سنت کے مطابق ہو تو ٹھیک، ورنہ اُسے ان کا تفرقہ قرار دے کر رد کر دیا جاتا ہے۔ اس منہاج علم میں ڈاکٹر صاحب مقاصد شریعت، شریعت کی روح اور قرآن کی قانونیت پر، جو کچھ انھوں نے مغربی فلسفے کے زیر اثر قبول کیا ہے، بے جھجک دعوے کرتے چلے جاتے ہیں، جو ان کی قرآن فہمی کی عدم تفہیم، تفسیر، حدیث اور فقہ کی کلیدی اور چنیدہ کتابوں سے ناواقفیت کی غماز ہیں۔ ان کے کلام کا ایک ایک لفظ گواہ ہے، کہ وہ شان نزول کی اطلاقی بحث، قانون کی کلیت، شریعت کے مقاصد اور دینی اقدار پر گفتگو کے باوجود اسلامی تاریخ، اسلامی علمیت، تعامل امت، مقاصد شریعت اور دین کی کلیت سے سرسری آگہی بھی نہیں رکھتے۔

اسلام توحید پر استوار ایک مکمل کلیت کا مظہر:

اسلام ایک مکمل کلیت ہے، جس میں ہر شے اپنے مقام پر پورے عدل کے ساتھ موجود ہے، خواہ وہ قانون ہو یا اخلاقیات اور موعظت ہو یا سزا۔ اس کلیت کی اساس توحید ہے۔ قرآن، سنت اور اجماع توحید پر استوار ایک ایسے نظام زندگی کے داعی اور اقدار حیات کے ضامن ہیں جس کی مابعد الطبعی اور عمرانی اساسیات نہایت واشگاف، صریح اور مبرہن انداز میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کر دی ہیں، اور امت مسلمہ کے تسلسل تعامل نے اس کے اطلاقی امکانات کو ہر عہد میں بلا انقطاع حسی تشکیل کے ساتھ معاشرے میں زندہ رکھا ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب اسلام کی کلیت اور دائمی اقدار کی گفتگو تو بہت کرتے ہیں لیکن وہ خود جس ابتلا کی لپیٹ میں گلے گلے تک ڈوبے ہوئے ہیں اس کی جڑیں فلسفہ جدید [modern philosophy] اور سائنسی طریقہ کار [scientific method] میں پیوستہ ہیں۔ وہ اٹھارویں صدی کے بعد کے فلسفے سے متاثر ہونے والے مفکر ہیں جو سائنسی طریقہ کار [scientific method of knowledge] کو ایک برتر اور فائق علم کی حیثیت سے قبول کرتا



ہے ایسے لوگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے، ایک مغربی مفکر کہتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک:

Science is the available Providence of man.<sup>1</sup>

سائنسی طریق تفتیش انسان، حیات، کائنات اور حقیقت کو کلیت یا وحدت میں دیکھنے سے قاصر ہے۔ اشیا اور ان کی حقیقتوں کو حصوں، خانوں، اجزا اور ٹکڑوں میں بانٹ کر دیکھنا اس جدید طریق علم کا خاصہ ہے۔ بالفاظ دیگر حقیقت کو مختلف اجزا میں تقسیم کرنا اور ہر جزو کے بھی جزوی حصے کا مطالعہ کرنا اور پھر ان جزئیات سے کلیات اخذ کرنا عہد جدید کا سب سے بڑا ”کمال“ سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ اس طریق تحقیق کو اختیار کرنے کے نتیجے میں حقیقت تک گئی طور پر رسائی ناممکن ہو جاتی ہے۔

اسلامی علوم اور ان کے اقدار و مقاصد کو دین کے طے شدہ منہاج [قرآن، سنت اور اجماع] میں دیکھا جائے گا اور اس کے نتائج کو اسلامی علییت کا نتیجہ قرار دیا جائے گا۔ کسی دوسرے منہاج علم میں کھڑے ہو کر اسلامی علییت کا تجزیہ صداقت اور حقیقت کا خون کر دینے کے مترادف ہے۔ اگر اس سلسلے میں، بعض ناقابل نظر انداز اختلاف کے باوجود، دبستان روایت سے وابستہ مفکرین خصوصاً رینے گینوں اور فرتھ جو ف شوآن ہی کی کتابیں پڑھ لی جائیں تو عہد حاضر کے اس علمی افلاس اور ذہنی پس ماندگی سے متعلق بہت سے حقائق پر غور و فکر کا موقع ملے گا۔

اس طویل بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ڈاکٹر منظور احمد اسلام کے مآخذ تشریح میں سے سب سے پہلے ماخذ، کتاب اللہ کو کلام اللہ ماننے کے باوجود بہ طور ”علم“ قبول نہیں کرتے اور نہ ہی قرآن کو کسی علمی قضیے کے طور پر پیش کرنے کے حق میں ہیں۔ البتہ غیر علمی یعنی ایمانی سطح پر یہ موقف قبول کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے، ڈاکٹر صاحب کے نزدیک قرآن میں بیان فرمودہ احکام اور سزائیں دائمی نہیں ہیں، بلکہ انھیں وقت اور حالات کے مطابق تبدیل بھی کیا جاسکتا ہے، بلکہ احکام و حدود میں تبدیلی وقت کا تقاضا اور حالات کی ناگزیر ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی جذباتیت اور شدت یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ قرآن کی نصوص قطعاً، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۃ وارشاد اور صحابہؓ و تابعینؓ کے تعامل سے صرف نظر کر کے بلا حوالہ و استناد فقہاء پر صورت مسئلہ کی درست تفہیم نہ ہونے کا الزام عائد کر دیتے ہیں۔ ان واضح نصوص کے مقابلے پر ڈاکٹر صاحب کے پاس احکام کی تبدیلی کے لیے ماقبل جدیدیت پسندوں سے مستعار چند مفروضے، واہے اور قیاسات ہیں، جن کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب احکامات قرآنی کی تبدیلی کے متمنی اور خواہاں ہیں۔

1- George Jacob Holyoake, *English Secularism: A Confession of Belief*, Chicago: The Open Court Publishing Company, 1896, p. 35.

ڈاکٹر منظور احمد صراحہ قرآن کے ماخذ علم ہونے کا انکار نہیں کرتے، مآخذ جس مقتدرہ سے شناخت ہوتا ہے وہ اسے گنجلک اور متنازعہ بنا دیتے ہیں۔ مآخذ کو صریحاً مسترد کیے بغیر اس پر سوالیہ نشان لگا دیتے ہیں۔ مبہم اور مغلط عبارات کی صورت میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار فرماتے ہیں۔ کبھی اس کا اظہار قرآن مجید کو وعظ و ترہیب کی کتاب گردان کر اسے قانونی دفعات کے طور پر استعمال کرنے کی ”خامی“ کی طرف اشارہ کر کے ہوتا ہے۔ کہیں سزا کی سرلیح الاثری اور انسانی نفسیات کی رعایت کو بنیاد بنا کر، اور کہیں مقاصد الشریعہ کی تکمیل کی دھائی دے کر حدود اللہ کی معطلی کی بات کی جاتی ہے۔ حالاں کہ مقاصد شریعت سے مراد شریعت کے پیش نظر مخلوقات کے مقاصد خمسہ ہیں نہ کہ مقاصد شریعت کے نام پر خود شریعت ہی کو، معاذ اللہ، مفسدہ قرار دینا ہے اور اس کا دور کرنا مصلحت۔

## ماخذ دوم — سنت

کتاب اللہ کے بعد اسلامی شریعت کا دوسرا ماخذ ”سنت“ ہے — سنت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس محسوس جادہ عمل کا نام ہے جسے آپ نے مسلمانوں کے لیے بہ طور نمونہ اور معیار پیش فرمایا ہے۔ صحابہ کرام نے ان اعمال سے اپنی مقدس زندگیوں کو زینت دی ہے، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے مبارک ادوار میں قانونی طور پر بلاد اسلامیہ میں کسی مسئلے کا نفاذ عمل میں آیا ہو اور عہد خیر القرون میں بغیر کسی روک ٹوک کے جس امر پر مسلمانوں کا عمل درآمد رہا ہو، وہ سنت کے دائرے میں آتی ہیں۔ مختصر یہ کہ سنت ایک ایسی علمیت ہے جو سند کی محتاج نہ ہو اور نسخ کے امکان سے پاک ہو۔

ماخذ قانون ہونے کی حیثیت سے سنت کا مرتبہ اگرچہ کتاب اللہ سے مؤخر اور اسی کے تابع ہے کیوں کہ یہ قرآن کے اجمال کی تفسیر اور اشکال کی توضیح ہے، امام ابو حنیفہ کا ارشاد ہے: لولا السنة ما فهم احد منا القرآن بل ”اگر سنت نہ ہوتی تو ہم میں سے کسی نے قرآن نہ سمجھا ہوتا“۔ دوسری جہت سے یہ خود ایک مستقل ماخذ تشریح بھی ہے، کیوں کہ سنت سے وہ احکامات بھی ثابت و صادر ہوتے ہیں، جن سے قرآن خاموش ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں شارح ہیں وہیں شارح بھی ہیں۔ امت شروع سے آج تک اسلام کے قانونی نظام میں سنت کو قرآن کے بعد ماخذ قانون تسلیم کرتی رہی ہے۔ حافظ ابن رجب حنبلی [م ۹۵ھ] لکھتے ہیں:

السنة: هي الطريقة المسلوكة، فيشمل ذلك التمسك بما كان عليه هو وخلفاؤه الراشدون من الاعتقادات والأعمال والأقوال، وهذه هي السنة الكاملة.<sup>۱</sup>  
 ”سنت اس راہ کا نام ہے جس پر چلا جائے اور یہ اس [راہ] کا تمسک ہے، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین عامل تھے۔ خواہ وہ اعتقادات ہوں یا اعمال واقوال اور یہی سنت کاملہ ہے۔“

۱- عبد الوہاب شعرائی، کتاب المیزان، بیروت: عالم الکتب، ۱۴۰۹ھ، فصل فی بیان ماورد فی ذم الراي عن الشارع وعن الصحابة والتابعين، جلد ۱، صفحہ ۲۰۷۔

۲- عبد الرحمن ابن رجب، جامع العلوم والحکم، بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۴۱۹ھ، الحديث الثامن والعشرون، جلد ۲، صفحہ ۱۲۰۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

فعلى المؤمن اتباع السنة والجماعة، فالسنة ما سنه رسول الله صلى الله عليه وسلم، والجماعة ما اتفق عليه أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم في خلافة الائمة الأربعة<sup>١</sup>

”مومن پر اہل سنت وجماعت کی پیروی لازم ہے۔ سنت وہ امر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے [قوالاً، فعلاً، تقریراً] مسنون قرار دیا اور جماعت [وہ احکام ہیں] جن پر صحابہؓ نے خلفائے راشدین کے عہد میں اتفاق کیا۔“

سُنّت ایک پیٹرن ہے: ڈاکٹر منظور احمد:

ڈاکٹر منظور احمد سُنّت کی اس متواتر تعریف اور اس کی بنیاد پر قائم [establish] دین کے مکمل نظام کو خلاف مصلحت اور خلاف عقل قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ”سُنّت“ کو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال تک محدود کر دینا ٹھیک نہیں ہے، بلکہ سُنّت محض ایک Pattern ہے جس کا تعلق کسی بھی فرد یا قوم کے طور طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بڑی تفصیل سے اپنے اس موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”عرب معاشرہ، تمام قبائلی معاشروں کی طرح روایتی زندگی کا سختی سے پابند ہوتا ہے اور اپنے رواج اور طور طریقوں یعنی سُنّت کو بدلنے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوتا۔ قریش کے سرداروں کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید مخالفت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ اہل مکہ کے رسوم و رواج کو چیلنج کر رہے تھے۔ اسی طرح جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی کامیابی سے قرآنی پیغام نے اہل عرب کی زندگی کو ایک دوسرے طرز پر ڈھال دیا تو پھر وہ ایک مستقل پیٹرن [Pattern] [سُنّت] بن گیا، جس نے قبائلی رسوم و رواج کی جگہ لے لی اور اب عربوں نے اس سے کسی قسم کی روگردانی کو، چاہے وہ بہتر مقاصد کے لیے ہی کیوں نہ ہو، قابل قبول نہیں سمجھا اور اسی لیے بعد میں اجتہادی فیصلے کے لیے یہ ثابت کیا جانا ضروری ٹھہرا کہ وہ اسی حکم یا رواج کی ایک توسیعی شکل ہے جو پہلے سے موجود تھا۔“<sup>٢</sup>

ڈاکٹر صاحب مستقل Pattern اور سُنّت کی اصطلاح کے فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے قبائلی رسم و رواج کو ”سُنّت“ قرار دے رہے ہیں۔ گویا ڈاکٹر صاحب کی نظر میں عربوں کے قبائلی رسم و رواج

١- عبدالقادر جیلانی، الغنية لطالبي طريق الحق، بيروت: دار احیاء التراث العربی، ١٣١٦ھ، فصل في اعتقاد اهل السنة أن أمة محمد خير الأمم، جلد ١، صفحات ١١٣-١١٥۔

٢- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ٨٣۔

اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مماثل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار مکہ کے درمیان اختلاف کا بنیادی سبب فریقین کی ”سنتوں“ کے ٹکراؤ کو قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے یہ ہے کہ عرب معاشرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ”سنت“ کے مقابلے میں ”پرانی سنت“ کو بدلنے پر آمادہ نہیں تھا لہذا تصادم کی نوبت آگئی۔ گویا ڈاکٹر صاحب نے عرب قبائل کے قبولیت اسلام کو صرف قبائلی طرز زندگی میں تبدیلی سے موسوم کیا ہے اور اس تبدیلی کی عملی شکل کو ”سنت“ قرار دیا ہے۔ فلسفے کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ تبدیلی کا عمل رسوم و رواج کی شکل میں بعد میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور مابعد الطبیعی سطح پر پہلے۔ انسان جن ایمانیات، اعتقادات اور نظریہ حیات کو قبول کرتا ہے اس سے پھوٹنے والے رویوں، طریقوں اور رسوم و رواج کی پیروی کرتا ہے۔ لہذا اہل مکہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اختلاف محض رسوم و رواج کا نہیں بلکہ ایمانی، اعتقادی اور مابعد الطبیعی سطح کا تھا۔ دوسرے، اسلام کے غلبے کے بعد اہل عرب کی تمام رسوم و رواج کا خاتمہ نہیں ہو گیا بلکہ بعض کو بعینہ برقرار رکھا گیا، بعض کی تطہیر و اصلاح کر دی گئی اور بعض رسوم کو، جو اسلام کے بنیادی اعتقادات کے منافی اور دعوت اسلامی سے عدم مطابقت رکھتے تھے، ختم کر دیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب اسلامی سیاق میں فرماتے ہیں کہ اجتہاد کسی ”حکم یا رواج کی توسیعی شکل“ کا نام ہے۔ اگر یہ بات اختلاف کے باوجود تسلیم کر بھی لی جائے تو بھی اتنی بات تو بدیہی ہے کہ اجتہاد قرآن و سنت کی بنیاد پر ہوگا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اجتہاد کے نام پر خود قرآن و سنت ہی کو اجتہاد کا موضوع بنا دیا جائے اور اجتہادی سرگرمی کے ذریعے قرآن و سنت کی جگہ کسی اور ماخذ کو قبول کر لیا جائے۔

1۔ ڈاکٹر منظور احمد اور ان کے ہم خیال جدیدیت پسندوں کا لوہر کی اتباع میں یہ نظریہ ہے کہ اجتہاد کے نام پر ہر شخص کو قرآن کی تعبیر و تشریح کا مساوی حق و اختیار دے دیا جائے۔ جدیدیت پسندوں کی تمام تر اجتہادی کاوشیں Protestantization of Islam ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ جدیدیت پسندوں کا داعیان تحریک اصلاح کی طرح مسئلہ یہ ہے کہ اجتہاد کی جڑیں ماضی سے پیوستہ کیوں ہیں اور مجتہد آگے کی جانب سفر کرتے ہوئے پیچھے کی طرف کیوں دیکھتا ہے؟ لہذا کسی طرح اجتہاد کا رشتہ ماضی سے منقطع کر کے مستقبل سے جوڑ دیا جائے اور تاریخ ماضی کا انکار کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں سب سے غور طلب بات یہ ہے کہ مستقبل کا تو ابھی وجود ہی نہیں ہے تو پھر اجتہاد کی جڑیں مستقبل سے کیسے وابستہ کی جاسکتی ہیں؟ جدیدیت پسندوں کا دطیرہ یہی ہے کہ مسلمانوں کا رشتہ ماضی سے کاٹ کر، مسلمانوں کو سنہرے دنیوی مستقبل کی اُمید دلا کر ان کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا جائے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جدیدیت پسندوں کی اصلاح پسندی کی اس ساری تحریک کے نتیجے میں انداد مذہب کے سوا کچھ بھی نہیں ہوا۔ مشرق و مغرب کی مذہبی تاریخ اور متجددانہ سرگرمیوں پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ اصلاح مذہب کے مدعیان، خواہ عیسائی ہوں یا مسلمان، ان کی اصلاحی سرگرمیوں کے نتیجے میں مذہب کمزور ہوا اور لادینیّت [secularism] کو فروغ حاصل ہوا۔ بڑے عظیم کے نمائندہ اصلاح پسندوں میں چراغ علی، سرسید احمد خان، احمد دین امرتسری، غلام احمد پرویز، اور عنایت اللہ مشرقی معروف نام ہیں، ان سب کی ذاتی، اجتماعی یا گروہی سرگرمیاں اس کا بین ثبوت ہیں۔ انکار تاریخ جدیدیت پسندوں کا بنیادی =

سنت: ڈاکٹر منظور احمد کا نقطہ نظر: بنیادی سوالات:

سنت پر ڈاکٹر صاحب کے موقف کی علمی سطح پر تنقیح اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک ڈاکٹر صاحب کے متذکرہ اقتباس سے مترشح ہونے والے درج ذیل نکات پر غور نہ کر لیا جائے:

[۱] عہد جاہلیت کے رواج اور طریقے بھی ”سنت“ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی کامیابی سے قرآنی پیغام نے اہل عرب کی زندگی کو ایک دوسرے طرز پر ڈھال دیا تھا تو پھر وہ ایک ”مستقل پیٹرن“ بن گیا — عارضی اور مستقل سنت میں کیا فرق ہے؟ جاہلی سنت اور قرآنی دعوت کے زیر اثر تشکیل پانے والی سنت کی تقسیم کا ماخذ کیا ہے؟

[۲] کیا ”سنت“ ایک عام لفظ ہے جس کے مفہوم و معانی تک رسائی کے لیے محض عربی لغت کا دیکھ لینا کافی ہوگا یا یہ ایک مستقل دینی اصطلاح ہے؟ اس کا تعین لغت کرے گی یا شارع کے قول، فعل اور تقریر سے اس کا تعین ہوگا؟

[۳] ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ جاہلی و قبائلی ”سنت“ کی جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نے لے لی اور یہ ایک ”مستقل پیٹرن“ بن گیا تو کیا اجتہاد کے ذریعے اس ”مستقل پیٹرن“ میں تبدیلی، تنسیخ یا توسیع کی گنجائش ہے؟ اگر ہے تو پھر وہ ”مستقل پیٹرن“ تو نہ رہا؟ اور اگر تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے تو آپ کے لیے سنت کو واحد غیر متبادل نظام ماننے میں کیا امر مانع ہے؟

[۴] ڈاکٹر صاحب نے صحابہ کرامؓ کے مزاج کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عربوں نے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سختی سے پکڑ لیا، اور اس میں ادنیٰ تبدیلی خواہ ”بہتر مقاصد“ کے لیے ہی کیوں نہ ہو، گوارا نہ کی۔ ڈاکٹر صاحب ان ”بہتر مقاصد“ کی نشان دہی فرمادیں، جن کے لیے سنت میں تبدیلی بھی روا ہے؟

[۵] جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے، کیا ”بہتر مقاصد“ کے لیے سنت سے روگردانی اور انحراف کیا جاسکتا ہے؟ کیا واقعہ کوئی چیز سنت رسولؐ سے اپنے مقاصد، اہداف، عمل اور نتائج میں بہتر ہو سکتی ہے؟

[۶] جب صحابہؓ نے سنت کو سختی سے پکڑ لیا، تو اب کیا بعد کے لوگوں کے لیے سنت سے انحراف کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے؟

جب تک مندرجہ بالا نکات کے جوابات پوری تنقیح اور صراحت سے نہ دے دیے جائیں اس وقت تک ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے نقطہ نظر کی حیثیت محض ایک ”مفروضے“ کی سی ہے، جس پر کوئی شعوری اور قابل اطلاق موقف کی بنیاد ممکن نہیں۔

= وصف ہے۔ جدیدیت تاریخ میں سے فقط اپنے مقاصد کی تکمیل کرنے والے ”کلاسیک“ کو قبول کرتی ہے اور بقیہ کو old کہہ کر رد کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ جدیدیت کی تقلید میں قرآن و سنت کو ”کلاسیک“ کے طور پر قبول کرتے ہیں، تاکہ لوگ کتاب و سنت کا نام سن کر مطمئن رہیں اور ”اجتہاد“ کے نام پر ”الحاد“ کا کھیل کھیلا جاسکے۔

رسول اللہ کے فیصلے: زمان و مکاں میں محصور اجتہادات: منظور احمد:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے اجتہاد کا طریق کار اس بنے بنائے طریق کی اتباع میں تھا، جس کو اسلام سے قبل یہودیت اور عیسائیت اختیار اور استعمال کر چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے حسب معمول اپنے دعوے کا کوئی حوالہ درج نہیں فرمایا — ڈاکٹر صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے فیصلوں کو دو ابعادی [two dimensional] اجتہادی عمل سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس بیان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے مابین حفظ مراتب کی نظر اندازی اور مساوات کا گمان پیدا ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو بھی ”اجتہاد“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں اور اجتہادات کی رعایت کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ:

”حضور کے اجتہادات اس راست الہامی تجربے سے بھی فیض یاب ہوتے تھے جو حضور کو حاصل تھا“۔<sup>۱</sup>

یہ ایک خلط بحث اور لفظی بازی گری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راست الہامی تجربات اس راست الہامی حقیقت کا ظہور تھے جو وحی کی صورت میں آپ کے قلب مطہر پر بہ راہ راست نازل ہوتی تھی، جس کی بدولت آپ کی زندگی مبارک کا لمحہ لمحہ، آپ کا ہر قول، فعل اور تقریر بہ راہ راست خدا کی نگہبانی میں گزرتا تھا۔ اس قلب مقدس اور ذہن مطہر سے صادر ہونے والی علمی و عقلی سرگرمی کو، مطلوبہ تمام تراجم اور اکرام کے باوصف، غیر انبیاء مثلاً خلفائے راشدین و ائمہ مجتہدین کے ساتھ بلا امتیاز و استثناء کرنا اور اسے بغیر کسی وضاحت کے محض لفظ ”اجتہاد“ میں سمودینا سادگی یا شاطری کا شاہکار ہے۔<sup>۲</sup> امت کے عام مجتہدین جن پر کتاب و سنت کی پیروی لازم کی گئی، وہ اگر قرآن و سنت کے ذخیروں سے استفادہ کرتے ہوئے اجتہاد کریں اور درست بات نہ پاسکیں تو بارگاہ خداوندی سے ایک اجر کے مستحق قرار پاتے ہیں اور درست بات پانے والوں کو دوہرے اجر کی بشارت دی گئی ہے — تو خود رسول اللہ کے فیصلوں کو امتیوں کے اجتہاد کے ساتھ یک جا کر دینا، نادرست ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد اسی تسلسل میں آگے لکھتے ہیں:

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۷۷۔

۲- ایضاً، صفحہ ۷۸۔

۳- ایضاً، صفحہ ۷۸۔

۴- یہاں اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ خلفائے راشدین بھی مجتہد تھے اور دیگر ائمہ مجتہدین بھی مجتہد تھے۔ لیکن دونوں کے اجتہادات کی نوعیت مختلف ہے۔ ائمہ مجتہدین کا اجتہاد، مابعد مجتہدین سے فرق مراتب کے باوصف، عام امت کا اجتہاد ہے، لیکن خلفائے راشدین کا اجتہاد ان خاص افراد کا اجتہاد ہے جو لسان نبوت سے مقتدا اور پیش وا ہونے کی نص پانے والے تھے۔ ان کا اجتہاد تشریح سے تو اگرچہ فروتر ہے لیکن عام اجتہادات سے بہت برتر اور فائق بلکہ ان کے صحت و حکم پر حکم ہے۔

”اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ رسول کے فیصلے اسی راست الہامی تجربے کا زمانی، مکانی اور لسانی اظہار تھے“۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تجربہ ایک خاص زمان و مکان میں محصور و مشروط تھا۔ گویا زمان و مکان کی تبدیلی سے آپ کا راست الہامی تجربے سے اخذ اور کشید کردہ ”اجتہاد“ غیر معتبر اور غیر مؤثر قرار پاسکتا ہے۔ یہ نہایت سنگین جسارت ہے جو فلسفے اور ادب کی چلمن کے ذریعے کی گئی ہے جس میں ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قضایا اور فیصلوں کو زمان و مکان میں محصور کر دیا گیا ہے، دوسری جانب اس بیان سے خود وحی کے بھی لازمی و لامکانی ہونے کے انکار کا شائبہ محسوس ہوتا ہے۔

سنت واحد غیر متبادل نظام نہیں: منظور احمد:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں اور ارشادات کو مخصوص زمانی و مکانی پس منظر میں محدود کر دینے کی جسارت کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر منظور احمد حضرات فقہاء پر معرض طعن ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو ”قانونی دفعات“ کے طور پر کیوں پیش کرتے ہیں، انھیں دائرۃ اجتہاد میں کیوں نہیں رکھتے؟ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”[فقہاء] رسول اکرم کے فیصلوں کو اجتہاد نہیں کہتے بلکہ ان کو قانونی دفعات کے طور پر

استعمال کرتے ہیں اور اس کا جواز، وہ اس عقائدی نظام سے، جو قرآن و سنت سے انھوں

نے تشکیل دیا ہے، حاصل کرتے ہیں، دین کی تفہیم کا یہ ایک بہت اہم اور مقبول نظام ہے،

لیکن یہ دعویٰ کہ یہ واحد نظام ہے اور اس کا متبادل ممکن نہیں، قرین قیاس نہیں ہے۔“

گویا ڈاکٹر صاحب کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے ”اجتہاد“ ہی کی ایک شکل ہیں اور

اجتہاد چوں کہ زمانے کے تغیر سے متغیر ہو جاتا ہے، اس لیے ڈاکٹر صاحب فقہاء کے موقف کو درست نہیں

سمجھتے جو ڈاکٹر صاحب کے خیال میں رسول اللہ کے فیصلوں کو مطلق ”قانونی دفعات“ کے طور پر قبول

کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی نظر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے عہد رسالت میں تو مطلق تھے، لیکن

انھیں ماورائے زمان و مکان سمجھ کر مطلق، دائمی اور اٹل بنا لینا قرین انصاف نہیں ہے۔

”زمانہ“ ارشادات رسول کو پرکھنے کی کسوٹی ہے: جدیدیت پسند:

اس بیان کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک مطلق صرف زمان و مکان ہے

جس پر، معاذ اللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو بھی پرکھا جائے گا۔ زمانے کی گردش اور مکان کی

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۷۸۔

۲- فقہاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو محض ”اجتہاد“ اس لیے نہیں کہتے کیوں کہ ”اجتہاد“ میں یہ بات بدلتی موجود ہوتی ہے کہ اس میں خطا و صواب دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول، فیصلہ، عمل اور تقریر خطا کے امکان سے پاک ہے اس لیے فقہاء و علماء سے محض ”اجتہاد“ کے عموم میں شامل نہیں فرماتے۔

۳- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۹۲۔



تبدیلی ہر مطلق کو متغیر، محدود، محصور اور موضوع بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر صاحب سنت کو دین کا اہم نظام ماننے کے باوجود ”واحد“ اور ”غیر متبادل“ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اس کے بہت سے متبادل ممکن ہیں، جس کے نمونے ڈاکٹر صاحب کے ارشادات کی روشنی میں مسلسل پیش کیے جاتے رہے ہیں۔

مجتہدین رسول اللہ کے فیصلوں سے مختلف اجتہاد کر سکتے ہیں: منظور احمد:  
ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”سنت چوں کہ ایک اجتہادی معاملہ ہے اور حضور کے بعد اجتہاد کا یہ عمل نبی کے وارثوں [علماء] کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اسی لیے وہ احکامات و معاملات میں اپنے اجتہادات کی روشنی میں فیصلہ کر سکتے ہیں، اگرچہ ان کا فیصلہ حضور کے زمانے کے فیصلوں سے مختلف ہی کیوں نہ ہو“۔  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں، جو ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے بقول از قبیل اجتہاد ہیں، اس کو قبول کر لینے کے بعد آپ کی حیثیت، نعوذ باللہ، محض ایک زیرک انسان کی ہو کر رہ جائے گی خدا کے فرستادہ کی نہیں۔ قرآن کی شہادت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے اور ”اجتہادات“ مبنی بروحی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پاس سے کچھ نہیں کہتے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ [۵۳:۳-۴] ”اور وہ [نبی] اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتے، وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے“ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آپ کی حین حیات میں آپ پر وحی آتی تھی تو یہ احکام کے درست ہونے کی ضمانت تھی خواہ وہ احکام وحی خفی پر مبنی ہوں یا از قبیل اجتہادات ہوں کیوں کہ اس صورت میں اگر آپ کا کوئی اجتہادی فیصلہ مرتبہ کمال سے فروتر ہوتا تو فوراً اس کی تصویب کر دی جاتی ورنہ تقریر خداوندی ہی اس کے حجت ہونے کو کافی ہے جس پر کسی امتی کولب کشائی کی جرات نہیں۔ سنت سے متعلق منظور احمد کا مذکورہ ”اجتہاد“ وحی الہی کو حتمی اور دائمی حجت نہ سمجھنے کا شاخسانہ ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

سن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وولایة الامر بعده سنناً، الاخذ بها تصدیق لكتاب الله، و استكمال لطاعة الله، وقوة على دين الله، ليس لأحد تغييرها ولا تبديلها النظر في شئني خالفها. من عمل بها مهتداً، ومن انتصر بها منصور، ومن خالفها اتبع غير سبيل المؤمنين.<sup>۱</sup>

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صاحبان امر یعنی خلفائے راشدین نے آپ کے بعد بہت سی سنتیں قائم کی ہیں جن کو اختیار کرنا، کتاب اللہ کی تصدیق کے ہم معنی ہے۔ اس سے اطاعت الہی میں کمال حاصل ہوتا ہے اور اسی سے دین کے لیے قوت حاصل ہوتی ہے۔ ان

۱- منظور احمد، ”چند توجہ طلب مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۳۲۔

۲- ابوالفتح ابراہیم الشاطبی، الاعتصام، بیروت: دارالکتب العلمیہ [س۔ ن]، جلد ۱، صفحہ ۵۶۔

سنتوں میں تغیر و تبدل جائز نہیں ہے اور نہ قرآن کی مخالفت گوارا کی جاسکتی ہے۔ جس نے اس پر عمل کیا اس نے ہدایت پائی اور جس نے اس کا سہارا لیا اس نے غلبہ پایا اور جس نے اس کی مخالفت کی اس نے مومنوں کی راہ چھوڑ کر دوسرے راستے کی پیروی اختیار کی۔“  
حضرت شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں:

واجتهادہ صلی اللہ علیہ وسلم بمنزلة الوحي، لأن الله تعالى عصمه من أن يتقرر رأيه على الخطأ، وليس يجب أن يكون اجتهاده استبطاً من المنصوص كما يظن، بل أكثره أن يكون علمه الله تعالى مقاصد الشرع وقانون التشريع والتيسير والأحكام فبين المقاصد المتلقاة بالوحي بذلك القانون.

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد بھی بہ منزلہ وحی ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے محفوظ رکھا ہے کہ آپ کی رائے خطا پر جم سکے اور یہ بھی ضروری نہ تھا کہ آپ کا اجتہاد کسی امر منصوص سے مستنبط ہو جیسا کہ اکثر لوگ گمان کرتے ہیں، بلکہ اکثر یہ حالت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مقاصد شرع بتلا دیے تھے، امور تشریحیہ اور تیسیر احکام کے قانون کی تعلیم دے دی تھی، پس اسی قانون کے تحت آپ ان مقاصد کی وضاحت فرمادیا کرتے تھے جو آپ کو بہ ذریعہ وحی حاصل ہوئے تھے۔“

الغرض امت مسلمہ کی علمی و فکری روایت پورے تواتر اور تسلسل کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں، احکام، ہدایات اور ارشادات کو مبنی بروحی مانتے ہوئے اس کے لازمانی و لامکانی ہونے کی قائل رہی ہے۔ اس مسلسل روایت اور متفق علیہ موقف سے اختلاف کرنے والوں یا اصحاب شذوذ کی حیثیت النادر کا معدوم کی سی ہے۔

”حدیث“ بزرگوں کی بات: منظور احمد:

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات [قوی، فعلی اور تقریری] معرض بیان میں ہوں تو وہ حدیث ہے۔ ڈاکٹر صاحب سنت کی طرح حدیث کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے اسے محض ”بزرگوں کی بات“ میں شمار کرتے ہیں۔ لفظ روایت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”روایت ایک عام لفظ ہے..... جو کسی حد تک ماضی پرستی، اسلاف کے نقش قدم پر چلنے اور بزرگوں سے جو بات تواتر سے ثابت ہو [مثلاً حدیث] اس پر عمل کرنے کا نام ہے۔“

۱- شاہ ولی اللہ، حجة الله البالغة، پشاور: وحیدی کتب خانہ [س۔ن]، جلد ۱، صفحہ ۲۹۳۔

۲- منظور احمد، ”روایت، جدیدیت اور لسانیات“، مشمولہ ماہ نامہ صریح، صفحہ ۱۳۔

ڈاکٹر صاحب نے ”روایت“ اور ”حدیث“ کے ضمن میں جو کچھ بھی ارشاد فرمایا ہے وہ کوئی علمی بیان نہیں ہے۔ ”روایت“ اور ”حدیث“ خواہ اپنے لغوی معانی میں کچھ بھی مطلب اور مفہوم رکھتے ہوں، لیکن جب ”روایت“ اور ”حدیث“ کے الفاظ اسلامی سیاق میں استعمال ہوں گے تو ان کا ایک خاص اور متعین مفہوم ہوگا۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ حدیث کے معنی ”بات“ کے ہیں اور ان معنوں میں یہ لفظ قبل از اسلام بھی مستعمل تھا، بلکہ اپنے لغوی مفہوم میں اب بھی یہ لفظ شائع اور رائج ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی اتنی ہی بدیہی ہے کہ انبیاء و مرسلین کی باتوں کو اس لفظ یعنی ”حدیث“ سے خاص مناسبت رہی ہے۔ کلام اللہ شریف نے انبیائے ماسبق کی باتوں کو اسی نام سے درج کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اب یہ لفظ ”حدیث“ محض ”بات“ یا قدیم کی ضد کے طور پر استعمال نہیں ہوتا، بلکہ اس لفظ کے زبان پر آتے ہی ایک مسلمان کے لیے اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی، فعلی، تقریری تعلیمات ہوتی ہیں۔ ایک مسلمان کا قلب و ذہن اس لفظ کے آتے ہی احترام اور جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے آقا و مولیٰ کی وہ تعلیمات ہیں جنہیں ان کے اصحاب و احباب نے ہمیشہ حرز جاں بنایا، یاد رکھا، آگے پہنچایا اور عمل کیا، اگرچہ لغت میں اب بھی اسے قدیم کی ضد کہا جاتا ہے، لیکن اصطلاحاً اسے کیا کہتے ہیں، حافظ شمس الدین السخاویؒ لکھتے ہیں:

والحدیث لغة: ضد القديم، واصطلاحاً: ما أضيف إلى النبي صلى الله عليه وسلم قولاً له أو فعلاً أو تقريراً أو صفة حتى الحركات والسكنات. <sup>۱</sup>  
 ”حدیث لغت میں لفظ قدیم کی ضد ہے اور اصطلاحاً اس سے ہر وہ بات مراد ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت دی گئی ہو۔ قول سے یا فعل سے یا توشیح سے یا صورت سے، یہاں تک حرکات و سکونات سے۔“

اب ”حدیث“ کا مرکزی عنوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، اور آپ حضرت عبد اللہ کے صاحب زادے یا خواجہ عبدالمطلب کے پوتے ہونے کی حیثیت سے اس کا موضوع نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ اور رسول ہونے کی حیثیت سے ”حدیث“ کا موضوع ہیں۔ حدیث وہ نعمت خداوندی ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے صدر مطہر میں اتاری اور آپ نے اسے بہ حکم الہی دوسروں تک منتقل کیا: **أَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ** [۱۱:۹۳] ”اپنے پروردگار کی نعمت کی تحدیث کیجئے“۔ ڈاکٹر منظور احمد کا لفظ ”حدیث“ کو محض ”بزرگوں کی بات“ سے تعبیر کرنا حد درجے خطرناک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو امت کے افراد کے دائرے میں لانے کی ایک جسارت ہے۔ کوئی انسان خواہ وہ کتنا ہی بڑا عالم اور عابد ہو اس کی بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات [حدیث] سے کوئی نسبت نہیں، بلکہ حدیث، بہ شرط صحت، کسی قول کے قبول و عدم قبول کا حتمی معیار ہے۔ اسی لیے ائمہ اربعہ کے اقوال مشہور

۱۔ شمس الدین السخاویؒ، فتح المغیث بشرح الفیہ الحدیث، الریاض: دار المنہاج، ۱۳۲۶ھ، جلد ۱، صفحہ ۱۲۔

ہیں کہ جب ہمارا قول حدیث سے متصادم ہو اسے دیوار پر دے مارو! انبیائے کرام علیہم السلام کے سوا کوئی انسان ایسا نہیں جس کے ارشادات و اعمال پر حفاظت کی ربانی مہر ہو۔

عملاً بھی ڈاکٹر منظور احمد صاحب احادیث شریفہ کو ”بزرگوں کی بات“ سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ وہ جسمانی ارتقا جیسے مشکوک نظریے، جس پر خود مغرب میں نقد ہو چکا ہے اور جو آج تک محض ایک نظریہ ہے، کی تائید میں مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ پر نقد فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مذہب اسلام میں مولویوں کا ایک گروہ حیاتی ارتقا کا قائل نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت آدم کی جسمانی تخلیق سے متعلق وارد احادیث نظریہ ارتقا کی نفی کرتی ہیں“۔

سردست اس سے بحث نہیں کہ نظریہ ارتقا کیا ہے؟ اس پر مغرب میں کیا کچھ نقد ہو چکا ہے، مغربی محققین نے دلائل اور حوالوں سے ثابت کر دیا ہے کہ نظریہ ارتقا ایک انتہائی مشکوک نظریہ بلکہ ایک ”فرضیہ“ ہے۔ لیکن اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ سرسید کی طرح ڈاکٹر منظور احمد بھی قرآن و سنت اور سائنسی مزعومات میں تعارض کی صورت میں سائنسی مزعومات سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے نزدیک:

[۱] زمانہ جاہلیت میں عربوں کے رسم و رواج اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و ارشادات و اعمال اور قضایا و احکام دونوں ”سنت“ ہیں۔

[۲] بزرگوں کی بات اور باطنی پرستی کا نام ”حدیث“ ہے۔

[۳] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے قانونی دفعات نہیں بلکہ اجتہاد ہیں۔ جس میں خطا و صواب دونوں کا احتمال ممکن ہے۔

[۴] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے ماورائے زمان و مکاں نہیں ہیں بلکہ وہ راست الہامی تجربے کا زمانی و مکانی و لسانی اظہار ہیں۔ اسے ہر عہد اور معاشرہ کے لیے قابل نفاذ و لائق اطلاق ماننا ٹھیک نہیں ہے۔

[۵] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے چوں کہ اجتہادات میں داخل ہیں، لہذا انھیں واحد اور غیر متبادل نظام سمجھنا دانش مندی نہیں، بلکہ اس میں وقت اور حالات کے تحت ترمیم و تنسیخ اور تغیر و تبدل کیا جاسکتا ہے۔

[۶] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے بھی چوں کہ ”اجتہادات“ اور زمان و مکاں کے پابند تھے، اس لیے بعد کے مجتہدین اس سے الگ اور مختلف اجتہاد کر سکتے ہیں۔

۱- منظور احمد، ”روایت، جدیدیت اور لسانیات“، مشمولہ ماہ نامہ صریح، صفحہ ۱۸۔

۲- نظریہ ارتقا کے مشکوک اور ناقابل ثبوت ہونے پر بعض اہم نکات اسی مقالے میں اپنے مقام پر بیان کیے جائیں گے۔

## ماخذ سوم — اجماع اُمت

تشریح اسلامی کا تیسرا ماخذ اجماع ہے، اس کے لغوی معنی عزم اور اتفاق کے ہیں۔ فقہاء کی اصطلاح میں اجماع کی تعریف یہ ہے:

وهو: اتفاق أهل الحل والعقد من أمة سيدنا محمد رسول الله عليه وسلم على امر من الامور.<sup>۱</sup>  
 ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ارباب حل و عقد کا کسی معاملے میں اتفاق  
 ”اجماع“ کہلاتا ہے۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب و سنت اور فہم اُمت ساتھ چلنے کے مکلف ہیں۔ اسلام ایک زندہ دین ہے، اس لیے تاریخ کے ہر عہد میں اس کے لیے تسلسل حیات لازمی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ پورے عالم اسلام میں کتاب و سنت کی راست تعبیر ایک مدت تک کلیۃً مفقود ہو جائے۔ اگر کبھی بھی کتاب و سنت اور اس کے معانی و مہانی میں انفکاک و انقطاع پیدا ہوا تو پھر اسلام زندہ دین رہ سکتا ہے، اور نہ اس کی حفاظت و صیانت کا ربانی نظام با معنی باور کیا جاسکتا ہے۔ ختم نبوت اور آخری و عالم گیر ہدایت کا تقاضا یہی ہے کہ قرآن و سنت اپنے نظم و معانی کے ساتھ ابدی طور پر مصنون رہیں۔ اجماع کی مشروعیت [Legality] قرآن و سنت سے ثابت ہے۔

جدیدیت کی اصل روح انفرادیت پسندی ہے۔ ”انفرادیت پسندی“ کا معنی دوسروں سے مختلف ہونا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تہذیب و معاشرت سے لے کر مذہب و اخلاق تک ہر جگہ معیار اور پیمانہ فرد ہے۔ چون کہ فرد محسوسات و جذبات، افکار و خیالات اور پسند و ناپسند سے عبارت ہے جس میں ہر آن تغیر و تبدل کا عمل جاری رہتا ہے، اس لیے انفرادیت پسندی کا معنی ہے زیادہ تجربی اور تغیر پسند ہونا۔ مغربی تہذیب ان ہی معنوں میں ”جدید“ ہے۔

۱ - عبداللہ بن عمر البیہاوی، منہاج الوصول الی علم الاصول، بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ ناشرون، ۲۰۰۶ء،  
 الكتاب الثالث في الاجماع، صفحہ ۸۱۔

انکار مذہب کی دو صورتیں ہیں:

[۱] دین و مذہب کو یک سرزد کر دیا جائے۔

[۲] دین و مذہب کی اس متواتر تفہیم کا انکار کر دیا جائے جسے ”اجماع“ کہتے ہیں۔

ہمارا معاشرہ دینی و ایمانی اور اعمالی و اخلاقی لحاظ سے زوال و اضمحلال کے باوجود ابھی ترک دین کے حتمی مقام تک نہیں پہنچا، اس لیے جدیدیت پسند اپنے اندر یہ جرأت و ہمت تو نہیں پاتے کہ مذہب کو یک سرزد کر دیں، اگرچہ مقصود یہی ہوتا ہے۔ ان حضرات کا طریقہ واردات یہ ہے کہ پہلے کسی مسئلے کے اس متواتر مفہوم کے خلاف بات کرتے ہیں، جو امت کی تاریخ میں تسلسل سے چلا آ رہا ہے۔ دین کی اس لبرل تعبیر کے نتیجے میں اسلام رب کی منشا کے حصول کا سبب بننے کے بجائے خواہشات انسانی کے حصول کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جدیدیت پہلے قدم پر خرقِ اجماع کی کوشش کرتی ہے، تاکہ کچھ عرصے بعد مذہب کو یک سرزد کرنے کا امکان پیدا ہو جائے۔ یہ معاملہ جو آج جدیدیت پسندوں کے ہاتھوں اہل اسلام کو درپیش ہے، ماضی میں مسیحیت کے ساتھ پیش آچکا ہے۔ اصلاح کی تحریک، جسے Protestant Reformation بھی کہا جاتا ہے، فی الاصل انجیل مقدس کی اجماعی روایت اور تفہیم ہی کے خلاف ایک مزاحمت تھی۔ تحریک اصلاح کے بانی مفکرین مارٹن لوتھر [Martin Luther: 1483-1546] اور جان کیلون [John Calvin: 1509-1564] کی فکری تحریکیں انجیل مقدس کی روایتی اور اجماعی روایات سے صرف نظر کر کے اسے ہر فرد کے فہم، عقل، حواس اور ضمیر کے مطابق سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے ہی کی داعی تھیں۔ اس فکر نے منشا خداوندی اور مراد الہی کو ہر فرد کی عقل میں منحصر قرار دے دیا تھا۔ یوں اولاً، وحی اور عقل دونوں حقیقتِ مطلقہ تک رسائی کے یکساں مجاز قرار پائے۔ ثانیاً، رفتہ رفتہ عقل کی وحی پر حاکمیت قائم ہوئی اور بالآخر وحی کے علی الاطلاق انکار کا رویہ پروان چڑھا۔ تحریک اصلاح، نشاۃ ثانیہ، عقلیت اور تجربیت کے مختلف تصورات سے ہوتی ہوئی مغربی فکر و تہذیب بالآخر ”خدا کی موت“ کی داعی ہوئی۔ اگر غور کیا جائے تو تحریک احتجاج کا منطقی انجام نیٹشے [Friedrich Nietzsche: 1844-1900] ہے جو ایک پروٹسٹنٹ پادری کا بیٹا تھا — Hollingdale انکار اجماع سے ”خدا کی موت“ تک کے سفر اور پروٹسٹنٹ فکر و تحریک پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتا ہے:

From the point of view of the Catholic church, the sin of Protestantism is its refusal to accept faith on authority - a refusal which must in the end lead to a loss of faith. Protestantism is a halfway stage between belief in God and atheism. From this point of view Nietzsche's Origin in Protestantism must seem unquestionable: he must, indeed, if one takes

him seriously, appear as the inevitable end of course inaugurated by Luther. This way of viewing Nietzsche possesses over the legend of the solitary seer the advantage that it is sustained by biography: Nietzsche was in fact the heir of generations of Protestant clergymen and, in his own person, a son of the parsonage.<sup>1</sup>

”کیتھولک چرچ کے نقطہ نظر سے تحریک احتجاج کا بنیادی جرم ایمان کو سند کی بنیاد پر ماننے سے انکاری ہونا تھا۔ کیتھولک عیسائیت کے خیال میں سند کے انکار کا منطقی اور لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالآخر انسان ایمان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریک احتجاج خدا اور دہریت کے درمیان پُل کا کام دیتی ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو نیٹشے کی فکر کے سوتے تحریک احتجاج سے پھوٹے نظر آتے ہیں۔ وہ اس سلسلے کا منطقی انجام تھا جس کا آغاز لوتھر نے کیا تھا۔ نیٹشے کی حیات کی اس تعبیر کو ان دوسری تعبیروں پر، جو اسے بے حسب و نسب دیو مالائی مفکر کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں، اس لحاظ سے فائق ہے کہ اس کی سوانح اس تعبیر کی منہ بولتی تصویر ہے۔ نیٹشے فی الحقیقت پروٹسٹنٹ علما کے سلسلے کا وارث تھا اور اپنی ذات میں خود ایک پروٹسٹنٹ پادری کا بیٹا تھا۔“

اب اسی طرح کی کوششیں مسلمانوں میں بھی کی جا رہی ہیں کہ کتاب و سنت کے گرد متواتر و متواتر مفہوم و منطوق کا جو حصار جماعت امت کے نام سے ہے، جس کے باعث اسلام کی تعبیر و تشریح تکوینی طور پر محفوظ رہی ہے کسی طرح اسے توڑ دیا جائے۔ اس کی حجیت کو چیلنج کر دیا جائے۔ اسے مآخذ تشریح سے خارج کر دیا جائے تاکہ آیات و احکام قرآنی کو اپنے باطل افکار و نظریات کی بھینٹ چڑھا کر باز سچے اطفال بنا دیا جائے۔ دیکھیے ڈاکٹر منظور احمد اس سلسلے میں کیا لکھتے ہیں۔

منظور احمد اسلام کی متواتر روایتی تفہیم کو ”فقہی اسلام“ سے تعبیر فرماتے ہیں۔ جسے ان کے خیال میں اصول نہیں بنانا چاہیے، لکھتے ہیں:

”زندگی کے منجملہ معاملات کو نبٹانے کے لیے قدما کی آرا اور فیصلے مدد و معاون تو ثابت ہو سکتے ہیں، لیکن ان کو حتمی اصول بنا کر ان سے استخراج کو ایک ناقابل تردید حقیقت سمجھنا ممکن نہیں۔“

1- R.J. Hollingdale, "The Hero as Outsider", in *The Cambridge Companion to Nietzsche*, [eds., Bernd Magnus and Kathleen M. Higgins], Cambridge: Cambridge University Press, 1996, p. 82.

۲- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۷۸۔

ایک مقام پر لکھتے ہیں:

”وہ فکری بنیاد جس پر معاشی ترقی، تصوراتی ارتقاء، اور تکنیکی ترقی ممکن ہے..... یہ ہے کہ قرآن کریم اور سنت کے روایتی اور خوشہ چینی طریقہ کار کو چھوڑ کر اس پر نئے سرے سے نظر ڈالی جائے۔“

فقہا اور قدما کی آرا تو رہیں ایک طرف ڈاکٹر منظور احمد صاحب تو قرآن و سنت ہی کو حتمی اصول مان کر اس سے استخراج کو اسلامی شریعت کے منافی رو یہ سمجھتے ہیں۔

۱- منظور احمد، ”عصر حاضر میں اسلام کی تفہیم“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۶۸۔

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۱۲۸



## ماخذِ چہارم — اجتہاد

اسلام ادیانِ ماسبق کا مصدق و ناسخ ہے اور قیامت تک پیش آمدہ مسائل کا ضامن و کفیل بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ابدیت و دائمیت کے باوصف تو وسیع پذیرگی اور سازگاری کی صفت سے بھی نوازا ہے۔ قرآن و سنت اور ان سے متعلقہ علوم وہ فیاض چشمے ہیں جن سے حل مسائل کے سوتے ابلتے ہیں۔ یعنی مسائل کا ایسا حل جو رب کی رضا کے حصول میں معاون ہو نہ کہ نفسانی خواہشات کی تسکین کا سبب بنے۔ اسلامی تاریخ کی مسلسل روایت میں ”اجتہاد“ نئے سرے سے کسی حکم کے پیدا کرنے کا نام نہیں بلکہ کتاب و سنت سے دلیل تلاش کرنے کا نام ہے۔ مذہب میں حق اور خیر لازماً وحی سے وابستہ ہیں۔ مذہبی روایت میں اجتہاد نص ہی سے تلاش و جستجو کا نام ہے۔ یعنی اجتہاد ایک ایسی علمی و تحقیقی کاوش کا نام ہے جو لازماً اصل سے ماخوذ ہو یا اس کے بنائے ہوئے دائرے کے اندر ہو جس کا مقصد دین اور زندگی کو کتاب و سنت کی مقرر کردہ حدود اور شارع کی منشا کے مطابق استوار کرنا ہے۔ بالفاظِ دیگر، اجتہاد ہماری مذہبی اصطلاح میں بدلتے ہوئے حالات اور مسلسل متغیر تہذیب و تمدن میں فرد اور معاشرے کا رشتہ محسوس اور زندہ حالت میں دین کے ساتھ قائم رکھنے کے لیے قانونی سطح پر اختیار کی جانے والی علمی و فکری کاوش کا نام ہے۔

نص ہی موجب اجتہاد ہے: جدیدیت پسند:

ظلم یہ ہے کہ جدیدیت پسندوں نے اجتہاد ہی کو، جو اسلامی تشریح کا ایک ماخذ ہے، اسلام کی منصوص روایت کے بالقابل لا کر نص ہی کی حجیت کو ”اجتہاد“ کا موضوع بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد کو فقہا سے بڑی شکایت ہے کہ انہوں نے قرآن و سنت سے استخراج [deduction] کو اجتہاد قرار دے دیا ہے کیوں کہ اُس میں آغاز ہی قرآن و سنت کو اصول اور کُلّیہ ماننے سے ہوتا ہے جس پر انفرادی صورتوں کا اطلاق و انطباق کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے استخراج تو قرآن و سنت کے دائرے ہی میں ”اجتہاد“ کو محدود رکھے گا۔ ڈاکٹر منظور احمد کے نزدیک استخراج اجتہاد نہیں ہے کیوں کہ:

”استخراج ایسے نتائج تک نہیں لے جاتا جو نئے ہوں“۔

۱- منظور احمد، ”اسلامی فکر کی بصیرت اور اقبال“، مشمولہ اقبال شناسی، صفحہ ۲۳۔

ان حضرات کے نزدیک شریعت میں بے روک تغیر کا نام اجتہاد ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد لکھتے ہیں:  
”اجتہاد، عمومی تصورات کی عالم گیریت کو برقرار رکھتا ہے اور خصوصی روایت کے تغیر کو بے جا نہیں سمجھتا“۔<sup>۱</sup>

اس بیان کی تفہیم یہ ہے کہ اجتہاد عمومی تصورات کہ ہم مسلمان ہیں، ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا آخری رسول مانتے ہیں، قرآن کو اللہ تعالیٰ کی کتاب مانتے ہیں، ایسے امور میں مغل نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ہر چیز یعنی پوری شریعت کو متغیر و متبدل کر دینے کی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے۔ اس بے لگام تغیر کا مطلب ہے، اپنا غیر ہو جانا، جس کے قدم بہ قدم ہونے کی ناکام کوشش بھی اسلام سے باہر نکل جانے کے مرادف ہے۔

منظور احمد: اجتہاد شرعی حکم کو ساقط کرنے کی اہلیت رکھتا ہے: چند سوالات:

ایک مقام پر بڑی وضاحت سے اجتہاد کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:  
”انسان حکم کے پیچھے مقصد اور مصلحت کو معلوم کرے، اور اگر وہ مقصد اور مصلحت قرن اول کے کسی حکم سے قرن آخر میں پوری نہیں ہو رہی تو وہ مصلحت کو باقی رکھے، وہ دوامی ہے اور حکم کو بدل دے کہ وہ وقتی ہے۔ اور اگر سرے سے مصلحت ہی تبدیل ہو جائے تو وہ حکم بھی ساقط ہو جائے گا“۔<sup>۲</sup>

ڈاکٹر صاحب نے تین سطروں میں اجتہاد کا پورا مقصد صاف بیان کر دیا ہے لیکن مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوتا، اس لیے کہ:

- [۱] مقصد اور مصلحت کیا ہے؟ اس کی تعریف اور تعین کا ماخذ کیا ہے؟
- [۲] مصلحت دوامی ہے اور حکم وقتی، یہ اصول اور کلیہ کس مقتدرہ سے صادر ہوا ہے؟
- [۳] قرن اول کے حکم سے مصلحت قرن آخر میں پوری نہیں ہو رہی اس کا تعین کون کرے گا؟
- [۴] اگر مصلحت دوامی ہے جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے تو پھر مصلحت میں تبدیلی کیسے ممکن ہے؟ جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے آگے لکھا ہے۔

[۵] انسان جب کسی حکم کے پس پشت مقصد اور مصلحت معلوم کرے گا تو یہ ایک عقلی سرگرمی اور اجتہادی عمل ہوگا، لہذا یہ ضروری نہیں کہ ایک فرد کے تعقل و تفکر کے نتائج دوسرے شخص کے لیے بھی قابل قبول ہوں۔ اس طرح پوری شریعت متضاد و متخالف نقطہ ہائے نظر کا مجموعہ بن کر رہ جائے گی۔ اس تضاد و متخالف کے رفع کرنے کی صورت کیا ہوگی؟ کیا نص، یعنی کتاب و سنت، کو بنیاد مان کر اس اختلاف کو رفع کیا جاسکتا ہے، جب کہ جدیدیت پسندوں کے نزدیک اجتہاد کے ذریعے نص ہی میں تبدیلی اور تنسیخ بھی ممکن ہے۔

۱- منظور احمد، ”ثبات، تغیر اور نشاۃ ثانیہ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۲۱۶۔

۲- منظور احمد، ”روایت، جدیدیت اور لسانیات“، مشمولہ ماہ نامہ صریح، صفحہ ۲۵۔

[۶] اگر سرے سے مصلحت ہی تبدیل ہو جائے تو وہ حکم بھی ساقط ہو جائے گا — ڈاکٹر صاحب ایک انتہائی غور طلب مسئلہ سادہ سی ایک عبارت میں بیان کر کے فارغ ہو گئے۔ سوال یہ ہے کہ حکم تو خدا کے صریح احکام اور رسول کے واضح بیانات کی صورت میں متعین ہے، جس میں دوسری رائے ممکن نہیں مثلاً اسلامی ریاست میں چور کے ہاتھ کاٹنا، شادی شدہ زانی کو سنگ سار کرنا وغیرہ — اب اس کی مصلحت جو بھی ہوگی، خواہ کیسی ہی مقتدر اور لائق اعتماد علمی و دینی شخصیت نے بیان کی ہو، وہ بہر حال ایک انسانی عقلی و ذہنی کاوش کا مظہر ہوگی، جس میں نقص اور خطا کا امکان لازماً موجود ہوگا۔ تو کیا ایک متعین حکم کو جو خدا اور رسول کی طرف سے واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، محض انسان کے بیان کردہ ”مصلحت کی تبدیلی“ کے اعلان سے ساقط کر دینا روا ہے؟ بالفاظ دیگر ایک غیر متعین اور خطا کے امکان سے مملو عقلی و علمی سرگرمی کی بنیاد پر متعین احکام کی تبدیلی کا مطالبہ کیا حیثیت رکھتا ہے؟

حرکی تصور اجتہاد: اطلاقات و مضمرات:

جدیدیت پسند حضرات بہ شمول ڈاکٹر منظور احمد کی نظر میں اجتہاد کے ضمن میں اقبال کا principle of movement ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے ذریعے ترقی اور برتری کے مقام تک پہنچنے والے عوامل کا جواز فراہم ہوتا ہے جو ترقی یافتہ اقوام اور غالب تہذیبوں کا خاصارہا ہے۔ ان حضرات کی نظر میں مسلمانوں کی ترقی کے لیے یہ بات از حد ضروری ہے کہ وہ اپنی تمام اخلاقی، معاشی، معاشرتی، قانونی حتی کہ مابعد الطبیعی اقدار کی تفہیم نو بھی خالصتاً مغربی اصولوں کے مطابق کریں [Purely Western genealogy of history]

ڈاکٹر منظور احمد کے مطابق اقبال کا تصور اجتہاد ایسی قوت اور صلاحیت رکھتا ہے جس کو بہ روئے کار لا کر اسلام کی بنیادی ساخت میں ”تبدیلی“ لائی جاسکتی ہے، خود ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں ”حرکت سے مراد بنیادی وجود میں حقیقی تبدیلی ہے“۔

ڈاکٹر صاحب کی نظر میں اجتہاد ایک ایسا تخلیقی [creative] عمل ہے جو ترقی یافتہ زندگی [progressive life] کا جواز فراہم کرتا ہے۔ یہ سوال اور بحث اتنا سادہ نہیں جتنا ڈاکٹر صاحب سمجھ رہے ہیں۔ یہ تصور اجتہاد اپنے اطلاقی رجحانات میں اسلام کی ہر اس بنیادی، جوہری، قانونی، اعتقادی اور مابعد الطبیعی حقیقت کی تبدیلی یا تنسیخ کا مطالبہ کرتا ہے جو تعقل غالب اور عصر جدید سے متصادم ہو۔ اجتہاد کے ذریعے تبدیلی کا یہ خبط [obsession] کئی اہم نکات پر غور کرنے کا تقاضا کرتا ہے:

[۱] اجتہاد کے ذریعے اسلام کی ”بنیادی ساخت“ میں تبدیلی اور اسے تعقل غالب کے مطابق

ڈھال دینے کا عمل ایسا ہی ہے جیسے کسی نامیاتی وجود کے genetic code کو تبدیل کر دیا جائے۔

[۲] حرکی تصور اجتہاد، اسلام پر نظریہ ارتقا [theory of evolution] کے نہایت غیر

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۸۹۔

مخاطب اور بے باکانہ اطلاق کا مظہر ہے۔

[۳] حرکی تصور اجتہاد میں یہ بات بہ طور بدیہی حقیقت تسلیم کر لی جاتی ہے کہ ہر تبدیلی، ترقی، برتری، تخلیقی، ارتقائی نوعیت کی ہوتی ہے۔ یہ مفروضہ مذاہب خصوصاً اسلام سے بہ راہ راست متصادم ہے جہاں ثبات کو تغیر پر فوقیت حاصل ہے۔

[۴] حرکی نظر یہ اجتہاد کو مان لینے کے بعد فرد، معاشرے اور ریاست کو منشاء الہی [will of God] کے مطابق ڈھال دینے کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں، بلکہ دین کو اعتقادی و مابعد الطبعی سطح سے لے کر معاشی، معاشرتی اور اخلاقی جہات تک تعقل غالب اور عصر حاضر کے مطابق بنا دینا ہی منشاء رب [will of God] اور مذہب کا بنیادی مقصد بن جاتا ہے۔

[۵] اگر اجتہاد کا مقصد بنیادی نوعیت کی ”تخلیقی تبدیلی“ ہے تو سوال یہ ہے کہ جدیدیت پسندوں کے پیش کردہ اس اجتہادی سانچے، نمونے، خاکے یا قالب میں سوائے اسلام کی نفی اور مغرب کی تقلید کے اور کیا نیا اور تخلیقی ہے؟ اس اصول حرکت سے جو بھی اجتہاد برآمد ہوگا وہ ہیگل کے جدلیاتی طریق کار [dialectical Method] کانٹ کے ماورائی تصوریت [transcendental idealism]، نیطشے کے Superman برگساں کے تخلیقی ارتقا [Creative Evolution]، لائبنیز کے موناد [monodology] اور استشراتی افکار کی تقلید اور نقالی کے سوا کیا ہوگا؟ مذہب کے منصوص اور متعین احکام کے بالمقابل اعتراضات اور تنقید کا شکار بننے والے سائنسی اور فلسفیانہ افکار میں کیا چیز نئی اور تخلیقی ہے؟

اجتہاد: اہلیت، صلاحیت اور لیاقت:

حرکی تصور اجتہاد اور حکم کی مصلحت کے نام پر ڈاکٹر صاحب اسلامی احکام و قوانین میں جس نوعیت کی تبدیلی اور سقوط کے خواہاں ہیں۔ ان مصارح اور حکمتوں کو بیان کرنے والے ”مجتہدین“ کی

۱- یہ بالکل وہی سوچ ہے جو لو تھر نے تخلیق کی تھی کہ دنیوی فرائض، دنیا پرستی اور لذات دنیا میں انہماک و اشتغال ہی منشاء خداوندی ہے:

[Luther] strongly emphasized, the statement that the fulfilment of worldly duties is under all circumstances the only way to live acceptably to God. It and it alone is the will of God, and hence every legitimate calling has exactly the same worth in the sight of God.

Max Webber, *The Protestant Ethic and the Spirit of Capitalism*, [trans., Talcott Parsons], New York: Routledge, 1930, p. 41.

2- Abdul Wahab Suri, "What is Living and What is Dead in Iqbal: A Critical Attempt to Understand Apparently Incommensurable Hermeneutical Circles Prevailing in Iqbal's Thought" in *Revisioning Iqbal As a Poet and Muslim Political Thinker*, [Gita Dharampal-Frick, Ali Usman Qasmi and Katia Rostetter, eds.], Pakistan: Oxford, 2011.

مجتہدانہ لیاقت پر بھی ڈاکٹر صاحب اپنا ایک الگ نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اجتہاد کی دو بنیادوں کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ کلاسیکی فقہاء کے ہاں:

”اجتہاد کے اس عمل کے لیے ایک خاص قسم کی اہلیت شرط ہے، جس میں عربی زبان اور گرامر کا جاننا اور مجتہد کا مسلمان ہونا شرط ہے، مجتہد کے لیے شرائط کی تفصیل اکثر کتابوں میں مل جائے گی، بعض نے مجتہد کے لیے ایک خاص قسم کے غیبی الہام سے تقویت پانے کو بھی اپنے اجتہاد کے صحیح ہونے کی دلیل کے طور پر استعمال کیا ہے [شاہ ولی اللہ]..... اجتہاد کی ان تینوں بنیادوں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے“۔<sup>۱</sup>

مزید لکھتے ہیں:

”مجتہد کی اہلیت بھی اب ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ علوم کی ترقی کے ساتھ، اب فرد واحد کی ذات میں ان سب کا جمع ہونا ناممکن ہے، اس طرح اجتہاد کا عمل اب افراد سے زیادہ ایک اجتماع کا کام معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس راہ میں سب سے بڑی مشکل ذہنی ہم آہنگی کی ہے۔ کلاسیکی علم رکھنے والے عالم اور موجودہ علوم کے ماہر اگرچہ ایک زبان بولتے ہیں، لیکن الفاظ کے جو معانی دو مختلف پیراڈائم کی وجہ سے ان کے ذہنوں میں ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کے لیے بڑی حد تک اجنبی رہتے ہیں“۔<sup>۲</sup>

ڈاکٹر صاحب کے دونوں اقتباسات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ ایسے آزادانہ اجتہاد کے داعی ہیں جس میں مجتہد کے لیے عربی زبان و ادب، جس میں قرآن مجید نازل ہوا اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی زبان میں محفوظ ہے، کا جاننا حتیٰ کہ مجتہد کا مسلمان ہونا بھی نظر ثانی کا متقاضی ہے۔ یہ دعویٰ ایسے مذہب کے فکری تناظر میں کیا جا رہا ہے جہاں دین کی قانونی حیثیت محکم اور بنیادی ہے۔ یہاں اجتہاد کا مقصد انسان کو ایسی علمی، فکری اور عملی رہنمائی مہیا کرنا ہے جن پر عمل پیرا ہو کر وہ زمانہ جدید میں اسلام پر عمل پیرا ہو سکے۔ اس کا مقصد قطعاً الہی قانون کو انسانی قانون سے بدلنا نہیں ہے، قرآن اسے زمین و آسمان میں فساد کے مرادف گردانتا ہے: **وَلَوْ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ** [۱:۲۳] ”اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو زمین و آسمان میں فساد برپا ہو جائے“۔ لیکن جدیدیت پسند عصر جدید اور تعقل غالب کے پیمانوں پر اسلام کے محاکمے کے متمنی ہیں۔ جو شخص بھی اسلام کے منہج علمی سے سرسری واقفیت بھی رکھتا ہے اسے معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے متذکرہ اقتباسات یا تو اسلام کے تصور اجتہاد سے ناواقفیت پر مبنی ہیں یا ڈاکٹر صاحب اجتہاد کے نام پر انحراف کا فروغ چاہتے ہیں۔

۱- منظور احمد، ”اسلامی فکر کی بصیرت اور اقبال“، مشمولہ اقبال شناسی، صفحہ ۲۲۔

۲- ایضاً، صفحہ ۲۳۔

اجتہاد: حقیقت اور مقصد:

مجتہد کی اہلیت کا سوال اس وقت منحصر کی صورت اختیار کر جاتا ہے جب تک اجتہاد کا مقصد واضح نہ ہو۔ اسلامی فکر میں شروع سے آج تک اجتہاد کا مقصد واضح رہا ہے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی [جن کی مذہبی اور روحانی حیثیت کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ حیثیت بھی مسلم ہے] لکھتے ہیں:

اعلم ان الاجتهاد ما هو ان تحدث حکما هذا غلط وانما الاجتهاد المشروع في طلب الدليل من كتاب او سنة او اجماع او فهم عربي على اثبات حكم في تلك المسئلة بذلك الدليل الذي اجتهدت في تحصيله والعلم به في زعمك هذا هو الاجتهاد<sup>۱</sup>

”آگاہ ہو جاؤ! اجتہاد نئے سرے سے حکم کے پیدا کرنے کا نام نہیں، یہ قطعاً غلط ہے۔ شریعت میں جس اجتہاد کا اعتبار ہے، وہ کتاب یا سنت سے دلیل تلاش کرنے میں جدوجہد کرنا ہے، یا اجماع یا عربی زبان کے محاورات و مفہومات کی رہ نمائی میں خاص مسئلے میں کسی ایسے حکم کو ثابت کرنا جو اس دلیل سے پیدا ہوتا ہو۔ جس کی تلاش میں تم نے کوشش کی اور اپنے خیال میں اس حکم کا علم اسی دلیل سے تمہیں حاصل ہوا ہو۔ بس اسی کا نام ”الاجتہاد“ ہے۔

شیخ اکبر اس کے بعد فرماتے ہیں اگر اجتہاد اس کا نام ہے کہ جو امور دین میں نہ تھے اسے دین بنا دیا جائے تو یہ اجتہاد نہیں الحاد ہے:

فإن الله تعالى قال: اليوم اكملت لكم دينكم وبعد ثبوت الكمال فلا يقبل الزيادة في الدين نقص في الدين وذلك هو الشرع الذي ياذن به الله<sup>۲</sup>  
 ”اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ”آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا۔“ پس ”الدين“ کسی زیادتی کو قبول نہیں کر سکتا۔ اس لیے دین میں اضافہ دین میں نقص کے مرادف ہوگا اور یہی وہ شریعت ہے جس کا فرمان اللہ تعالیٰ سے صادر نہیں ہوا ہے۔“

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ علما کے کلام سے اجتہاد کی جو حقیقت سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ: استفراغ الجهد في إدراك الأحكام الشرعية الفرعية، عن أدلتها التفصيلية، الرجعة كليتها إلى أربعة أقسام: الكتاب، والسنة، والإجماع، والقياس<sup>۳</sup>  
 ”شریعت کے فروری احکام کو ان کے تفصیلی دلائل یعنی کتاب، سنت، اجماع اور قیاس سے

- ۱- محی الدین ابن عربی، الفتوحات المکیة، بیروت: دار الکتب العلمیة، ۱۳۲۰ھ/۱۹۹۹ء، الباب الثمانون وثلاث مائة، في معرفة منزل العلماء ورثة الانبياء من المقام المحمدي، جلد ۶، صفحہ ۳۰۰۔
- ۲- ایضاً۔
- ۳- شاہ ولی اللہ، عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، الشارحة: دار الفتح، ۱۳۱۵ھ/۱۹۹۵ء، باب فی بیان حقیقة الاجتہاد وشرطه وأقسامه، صفحہ ۲۰۔

سمجھنے کے لیے بھرپور کوشش کرنا۔“

علماء اور فقہانے بہت وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ کتاب و سنت اور اجماع امت کے مقابلے میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔ حافظ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اجتہاد کی چار قسمیں ہیں واجب العین، واجب کفایہ، مباح اور حرام۔ آخری قسم کے بارے میں تصریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والی حرام وهو الاجتهاد في مقابلة دليل قاطع من نص كتاب أو سنة أو اجماع.  
”اجتہاد حرام وہ ہے جو کسی دلیل قطعی یعنی کتاب و سنت کی نص صریح یا اجماع کے مقابلے میں ہو۔“

قول نبوی: اجتہاد کا طریق اور مجتہد کے اوصاف:

اجتہاد کا مقصد واضح ہو جانے کے بعد مجتہد کی اہلیت اور صلاحیت کے ضمن میں اصول فقہ کی کتابوں میں مندرج لمبی چوڑی بحث کے نقل کرنے سے بہتر ہے کہ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے رہنمائی لے لی جائے۔ جس کی ایک ہی سطر میں اصول فقہ کی بیان کردہ طویل الذیل اجتہادی صفات سمٹ کر جمع ہو گئی ہیں:

عن علی قال: قلت: یا رسول اللہ ان نزل بنا امر لیس فیہ بیان امر، ولا نہی، فما تأمرنی قال: شاوروا فیہ الفقہاء والعابدین، ولا تمضوا فیہ رأی خاصہ. رواہ الطبرانی فی الأوسط ورجالہ موثقون من اهل الصحیح.  
”سیدنا علیؑ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے، جس میں آپ کا کوئی بیان کرنے یا نہ کرنے کا نہ ملتا ہو، تو آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ کیا کیا جائے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فقہاء اور عابدین سے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کریں اور شخصی رائے کو دخل نہ دیں۔“

اس حدیث مبارکہ سے اجتماعی اور شورائی فیصلوں کی نہ صرف اہمیت ثابت ہوئی بلکہ اس جماعت کی اہلیت، شرائط اور لیاقت بھی بتا دی گئی، جن کے فیصلے اجتہادی عمل میں موثر ہوں گے۔ حدیث مبارکہ سے درج ذیل امور مستفاد ہوئے:

[۱] اگر پیش آمدہ مسئلے کا حل کتاب و سنت میں مل جائے تو وہ کافی ہوگا۔

[۲] ایسے مسائل کا سامنا رہے گا جن میں قرآن و سنت کا واضح اور صریح فیصلہ موجود نہ ہوگا۔

[۳] ایسی صورت میں علماء کے ذمے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ کتاب و سنت کی رہنمائی میں اس

کا حل تلاش کریں۔

۱- محمد امین المعروف بامیر بادشاہ، تیسیر التحرییر شرح علی کتاب التحرییر، مصطفیٰ البابی الحکمی واولادہ

بمصر، ۱۳۵ھ، المقالة الثالثة في الاجتهاد وما يتبعه من التقليد والافتاء، جلد ۲، صفحہ ۱۸۰۔

۲- ابی بکر الصدیقؓ، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، کتاب العلم، باب فی الاجماع، جلد ۱، صفحہ ۱۳۲۔

[۴] انفرادی اور شخصی رائے سے اجتناب کریں اور باہمی مشورے سے فیصلہ کریں۔

[۵] علما میں دو اوصاف کی موجودگی لازم ہے: تفقہ فی الدین اور تقویٰ و عبادت گزاری۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ڈاکٹر منظور احمد کے متذکرہ بیان کی جڑ کٹ جاتی ہے جس میں انھوں نے مجتہد کے ”مسلمان“ ہونے کو بھی مورد سوال ٹھہرایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید اس سلسلے میں اتنی محتاط ہے کہ اجتہادی سرگرمی میں حصہ لینے والے اہل علم کے لیے آپ نے صرف علما کے الفاظ استعمال نہیں فرمائے بلکہ فقہا اور عابدین کے الفاظ ارشاد فرمائے۔ اجتہادی فیصلے صادر کرنے والے اہل علم صرف علما نہیں فقہا ہوں گے اور وہ تقویٰ و تدین سے مزین ہوں گے۔ علامہ ابن امیر الحاج لکھتے ہیں:

من الفقیہ احتراز من بذل الطاقة من غیرہ فی ذلک فانہ لیس باجتہاد اصطلاحی۔<sup>۱</sup>

”اجتہاد کی تعریف میں فقیہہ کی قید سے غیر فقیہہ کی محنت اور جدوجہد سے احتراز مقصود ہے،

کیوں کہ اجتہاد اصطلاحی میں اس کا شمار نہ ہوگا۔“

اصل میں ڈاکٹر صاحب اجتہاد کی ماہیت اور غایت دونوں کو امر عام سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ مسلمانوں کی فکری و علمی روایت میں اجتہاد کوئی امر عام یا ریاضیاتی سرگرمی نہیں ہے کہ جمع و تفریق کا عمل کوئی بھی کرے نتیجہ یکساں نکلے گا۔ اجتہاد ایک علمی و فکری سرگرمی کے ساتھ ساتھ نبوت کی وراثت اور ایک روحانی عمل بھی ہے۔ یہ بات کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص ایمان کے نور سے محروم اور نبوت کی حکمتوں سے نا آشنا ہو کر اس ادراک و فہم اور بصیرت و حکمت سے سرفراز ہو جائے جو اجتہاد کا لازمہ ہے۔ اجتہاد کے متعلق ڈاکٹر منظور احمد صاحب کو بھی تسلیم ہے کہ یہ نبوت کی وراثت ہے جو نبی کے بعد اس کے وارثین یعنی علما کو منتقل ہوتا ہے۔<sup>۲</sup> یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی کی وراثت ایک ایسے شخص کو منتقل ہو جائے جو ایمان سے محروم ہو ملاحظہ الدین بہاری لکھتے ہیں کہ:

الاجتہاد استخراج الحکم، فلا بد من معرفة الحاکم ومن هو وسیلة فی تبلیغ الأحکام وسائر صفاته من القدرة والعلم والإرادة والكلام والحکمة ونحوها [ولو بالأدلة الإجمالية] یعنی معرفتہ الأدلة التفصیلیة المذكورة فی علم الکلام، بحيث یقدر علی دفع شبه المکابرین المجادلین لیست شرطاً۔<sup>۳</sup>

”اجتہاد استخراج حکم کا نام ہے تو مجتہد کے لیے حاکم حقیقی کی پہچان بھی ضروری ہے کہ وہ حاکم حقیقی کو اس کی تمام صفات، علم، ارادہ، کلام اور حکمت وغیرہ کے ساتھ جانے [اگرچہ

۱- ابن امیر الحاج الحلبي، التقریر والتحریر علی التحریر، مصر: المطبعة لأ میریة، ۱۹۰۰ھ، المقالة الثالثه فی الاجتہاد وما یتبعہ، جلد ۳، صفحہ ۲۹۱۔

۲- منظور احمد، ”چند توجہ طلب مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۳۲۔

۳- عبدالعلی محمد الانصاری، فوائح الرحموت بشرح مسلم الثبوت، بیروت: دار الکتب العلمیة، ۱۳۲۳ھ/۲۰۰۲ء، جلد ۲، صفحہ ۲۰۵۔



اولہ اجمالیہ کے ساتھ]۔ گویا علم کلام کے دقیق اور باریک نکتوں کا علم جس کی بدولت مجادلین کے شبہات کا رد کر سکے، مجتہد کے لیے شرط نہیں۔“

مسلمانوں میں اجتہاد کا تعلق صرف آئینی و قانونی معاملات سے بحث نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ عقائدی نظام، اخلاقی اقدار اور روحانی و باطنی معاملات مابعد الطبیعی سطح پر اجتہادی عمل میں پیوست ہوتے ہیں، یہاں ہر ہر اجتہادی سرگرمی عقبی و آخرت کو سامنے رکھ کر انجام دی جاتی ہے۔ لہذا مسلمانوں کے یہاں اجتہاد کی بحث کو صرف آئین و قانون تک محدود کر دینا ٹھیک نہیں۔  
مجتہد کے فیصلے ہی پر امت مسلمہ کی کثیر آبادی عمل پیرا ہوگی لہذا اسے جس قدر شارع کی منشا اور تکلم کی مراد سے قربت ہوگی اسی درجے پر اجتہاد نگاہ شریعت میں با معنی ہو سکے گا۔

### علوم کی ترقی اور اجتماعی اجتہاد کی ضرورت:

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ:

”علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ اب فرد واحد کی ذات میں ان سب کا جمع ہونا ناممکن ہے، اس طرح اجتہاد کا عمل بھی اب افراد سے زیادہ اجتماع کا کام معلوم ہوتا ہے۔“

مسلمانوں کی علمی روایت شروع ہی سے اجتہادی عمل میں انفرادی اجتہاد پر اجتماعی اجتہاد کو فوقیت و ترجیح دیتی آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولا تمضوا فیہ رای خاصہ [اجتہادی عمل میں شخصی اور انفرادی رائے کو دخل نہ دیا جائے] ارشاد فرمایا کہ اس پر تنبیہ فرمائی تھی — حضرات صحابہ کرام نے اجتہاد کو زیادہ با معنی بنانے کے لیے اجتماعی اجتہاد کا نظم فرمایا تھا۔ سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے اہل علم صحابہؓ کی ایک مجلس قائم فرمائی تھی:

أن ابا بکر الصديق كان إذا نزل به أمر يريد فيه مشاورة أهل الرأي وأهل الفقه ودعا رجلاً من المهاجرين والأنصار دعا عمر وعثمان علياً وعبد الرحمن بن عوف ومعاذ بن جبل وأبي بن كعب وزيد بن ثابت.<sup>۱</sup>  
”سیدنا ابو بکرؓ کو جب کوئی معاملہ پیش آتا، جس میں اہل رائے اور اہل فقہ کے مشورے کی ضرورت پڑتی تو وہ مہاجرین و انصار کے کچھ لوگوں کو بلا تے۔ مثلاً حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم وغیرہ۔“

۱- محمد بن سعد، کتاب الطبقات الکبیر، القاہرہ: مکتبۃ الخانجی، ۱۳۲۱ھ، ۲۰۰۱ء، باب اهل العلم والفتوى من اصحاب رسول الله، جلد ۲، صفحہ ۳۰۲۔

یہی معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی تھا۔ ابن القیم لکھتے ہیں:

وكان عمر يفعل ذلك، فإذا اعياه أن تجد ذلك في الكتاب والسنة سأل: هل كان أبو بكر قضى فيه بقضاء؟ فإن كان لأبي بكر [فيه] قضاء قضى به، وإلا جمع علماء الناس واستشارهم، فإذا اجتمع رأيهم على شيء قضى به. <sup>١</sup>  
”سیدنا عمر فاروقؓ کو جب کوئی حکم کتاب و سنت میں نہ ملتا تو آپ اس سلسلے میں سیدنا ابو بکر صدیقؓ کا کوئی فیصلہ تلاش فرماتے، اگر ان کا فیصلہ [فتویٰ] مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ صادر فرمادیتے۔ ورنہ علماء کو جمع کرتے ان سے مشورہ کرتے، جب اتفاق رائے ہو جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرمادیتے۔“

حضرات صحابہ کرامؓ کی ایک مستقل جماعت غیر منصوص مسائل پر غور و فکر اور مذاکرہ کرتی تھی۔ امام محمدؒ لکھتے ہیں:

كان ستة من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم يتذاكرون الفقه منهم علي بن ابي طالب و ابي و ابو موسى ا على حده و عمر و زيد و ابن مسعود رضى الله عنهم. <sup>٢</sup>  
”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے چھ حضرات آپس میں فقہ کا مذاکرہ کرتے تھے۔ سیدنا علیؓ، سیدنا ابی بن کعبؓ، سیدنا ابو موسیٰ اشعریؓ ایک ساتھ اور سیدنا عمرؓ، سیدنا زیدؓ اور سیدنا عبد اللہ بن مسعودؓ ایک ساتھ۔“

اسی طرح عہد تابعین میں مدینہ میں فقہائے سبعہ کے متعلق لکھا ہے کہ:

كان فقهاء اهل المدينة سبعة و ذكره فيهم قال و كانوا إذا جاءتهم المسئلة دخلوا فيها جميعاً فنظروا فيها ولا يقضي القاضي حتى يرفع إليهم فينظرون فيها فيصدرون. <sup>٣</sup>

”فقہائے اہل مدینہ سات تھے، جب بھی کوئی نیا مسئلہ پیش آتا تو وہ مل کر اس میں غور و فکر کرتے اور قاضی اس وقت تک فیصلہ نہ کرتا جب تک مسئلہ ان کے سامنے پیش نہ کر دیتا اور وہ اس میں غور و فکر کر کے کوئی فیصلہ نہ کر دیتے۔“

امام اعظم ابو حنیفہ کا تدوین فقہ اسلامی کا عظیم الشان کارنامہ بھی فی الاصل اسی اجتماعی اجتہادی کاوش کا ثمر ہے۔ امام اعظم انفرادی رائے پر اجتماعی اجتہاد کی ترجیح کے قائل تھے، موفق ابن قدامہ لکھتے ہیں:

- ١- ابن القیم الجوزی، اعلام الموقعین عن رب العالمین، دار ابن الجوزی، ۱۴۲۳ھ، فصل تاویل ما روي عن الصحابة من الأخذ بالرأي، طريقة أبي بكر و عمر في الحكم على ما يرد عليهما، جلد ۲، صفحہ ۱۱۵۔
- ٢- محمد بن حسن الشیبانی، کتاب الآثار، باب فضائل الصحابة من اصحاب النبي، صفحہ ۱۲۰۔
- ٣- احمد بن حجر العسقلانی، تہذیب التہذیب، لاہور: مکتبۃ الاثریہ، [س-ن]، تذکرہ سالم بن عبد اللہ، [م ۱۰۶ھ]، جلد ۳، صفحہ ۲۳۷۔

فوضع ابو حنیفہ مذہبہ شوریٰ بینہم لم یستبد فیہ بنفسہ دونہم۔<sup>۱</sup>  
 ”امام ابو حنیفہ نے اپنے مذہب کی بنیاد شوریٰ پر رکھی ہے اور شوریٰ سے الگ اپنے ذاتی  
 رائے کو ان پر مسلط نہیں کیا۔“

امام ابو حنیفہ نے اپنا فقہی مسلک اپنے اصحاب سے باہمی مشاورت کے ذریعے مدون کیا تھا۔  
 وہ اپنی رائے پر اصرار نہیں فرماتے تھے، بلکہ مجلس میں کوئی مسئلہ پیش کر کے شرکائے مجلس کی آرا سنتے اور اپنی  
 رائے سناتے تھے۔ بعض اوقات مباحثہ و مناظرہ ایک ماہ سے زائد تک جاری رہتا۔ حتیٰ کہ جب کسی مسئلے  
 پر اتفاق رائے ہو جاتا تو امام ابو حنیفہ اسے قلم بند کر دیتے۔<sup>۲</sup>

امام ابو حنیفہ کی تحقیقی و اجتہادی مجلس کے شرکاء کی تعداد چالیس سے زائد تھی۔ ان میں سے ہر ہر فرد اپنے  
 فن کا نابغہ اور امام تھا۔

ہندوستان میں ”فتاویٰ عالمگیری“ اسی اجتماعی اجتہادی کاوش کا نتیجہ ہے۔ عثمانی حکومت میں  
 ”مجلة الاحکام العدلیة“ سات رکنی مجلس کی نو سالہ انتھک کاوش کا مظہر ہے جو تقریباً سو سال تک ترکی  
 حکومت کا قانون رہی۔

اس فہرست میں مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے، لیکن تطویل کے باعث قلم زد کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد  
 کا علماء و فقہاء کو ”اجتہاد“ کا مشورہ دینے کی ضرورت نہیں وہ پہلے ہی اس کی اہمیت و افادیت سے واقف ہیں۔

اجتہادی عمل میں فقہاء کے ساتھ دیگر علوم کے ماہرین کی شرکت: بنیادی اشتراک: ایمان:  
 اجتماعی اجتہاد کے لیے بلاشبہ عصری شعور سے آگاہی اور دیگر شعبہ ہائے علوم اور متنوع فنون  
 کے متخصصین و ماہرین سے استفادہ بھی نہایت ضروری ہے۔ کوئی اصولی و فقہیہ اس کا منکر نہیں جہاں تک  
 ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کا تعلق ہے:

”[اجتہادی اجتہاد] کی راہ میں سب سے بڑی مشکل ذہنی ہم آہنگی کی ہے۔ کلاسیکی علم رکھنے والا عالم  
 اور موجودہ علوم کے ماہر، اگرچہ ایک زبان بولتے ہیں لیکن الفاظ کے جو معانی دو مختلف پیراڈائم کی  
 وجہ سے ان کے ذہنوں میں ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کے لیے بڑی حد تک اجنبی رہتے ہیں۔“  
 اگر کلاسیکی علم رکھنے والے عالم اور جدید علوم کے ماہرین میں ایمان اپنی پوری قوت اور شدت کے  
 ساتھ جاگزیں ہو اور ہر دونوں علم کے نمائندوں کا مقصد اجتہاد کے ذریعے حالات کی تبدیلی کے باوصف  
 دین پر عمل کو ممکن بنانا ہو تو ان کے افکار اور سرگرمیاں نہ منہاج کے اختلاف سے متاثر ہوں گے اور نہ اس  
 میں مزاحم ہوں گے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول آخر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ان کا مشترک

۱- موفق بن احمد الحنفی، مناقب الامام الاعظم، کوئٹہ: مکتبہ اسلامیہ، ۱۳۰۷ھ، جلد ۲، صفحہ ۲۳۔

۲- ایضاً، صفحہ ۱۳۳۔

روتیہ، طرز احساس، طریق فکر و عمل اور تصور حیات و کائنات اپنی پوری تفصیل کے ساتھ ان کا مجموعی مزاج اور مرکزی تجربہ بن کر تمام داخلی و خارجی نسبتوں کو اپنی پوری صورت اور تعبیر کے ساتھ ایک اصولی سطح پر متعین کر لے گا۔ اس باہمی مشاوت اور اعانت سے جو بھی اجتہاد برآمد ہوگا وہ امت کے لیے سراپا خیر ہوگا اور اس میں خطا بھی بہ نص حدیث ایک اجر کی مستحق قرار پائے گی۔

خلاصہ یہ کہ جدیدیت پسندوں کے نزدیک اجتہاد independent opinion کا نام ہے۔ یعنی ”مطلق آزادی رائے“۔ چونکہ آزادی اور خواہشات کی تکمیل عقل کے آزادانہ استعمال پر منحصر ہے لہذا انسان [Faculty of Reason] کو استعمال کرے تاکہ جو کرنا چاہے کر سکے، جو چاہنا چاہے چاہ سکے: To be able to do what he wants to do جدیدیت پسندوں کے نزدیک تمام خواہشات Subjective ہیں اسے Modern Subjectivism بھی کہتے ہیں: Modernity is not based upon one single principle ..... it is the result of a dialogue between reason and subjectivity.

اسی لیے یہ فکر Anthropocentric کہلاتی ہے۔ لہذا جدیدیت پسندوں کے نزدیک اجتہاد عقل کے ایسے آزادانہ استعمال کا نام ہے جس سے انسان کی آزادی اور خواہشات کی تکمیل کی ہر راہ فراہم ہو سکے اور اسلام میں اپنی ضروریات و احتیاجات کے مطابق کتر بیونت یا ترمیم و اضافہ کیا جاسکے اور جو تقلید سے آزاد ہو۔ گویا اجتہاد انسان کی آزادی کی کلید اور خواہشات نفسانی کی الوہیت کا اعلان ہے۔ یہ فکر اپنی جوہریت میں Anti Religion ہے۔ مذہب دشمن اور وحی مخالف ہے۔

”اجتہاد“ کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اس نکتے کو مسلسل نظر انداز کر رہے ہیں کہ اجتہاد کی ضرورت تو وہاں ہے جہاں اسلامی قانون نافذ ہو یہ بحث ہم سے یا ہماری قوم سے بالکل غیر متعلق ہے، یہاں تو اینگلو سیکشن قانون نافذ ہے۔ فقہ کا مسئلہ ہے کہ، اگر کنوئیں میں گتتا گر جائے تو پہلے گتے کو نکالا جائے پھر کنوئیں کا سارا پانی بہا دیا جائے۔ یہاں تو کتا کنوئیں میں گرا ہوا ہے اور جدیدیت پسند منڈیر پر بیٹھ کر ڈول کی تعداد میں اجتہاد فرما رہے ہیں۔ گتے کو باہر نکالنے کی بات کوئی نہیں کر رہا۔

۱- لیکن یہ نکتہ بہ ہر حال قابل غور ہے کہ اجتماعی اجتہاد کے عمل میں دیگر علوم کے ماہرین کی شرکت عمل اجتہاد کی حیثیت سے ہوگی یا ان سے استفادہ اور ان کی شرکت کو مشاورت یا معاونت تک محدود رکھا جائے گا۔

2- Touraine Alain, Critique of Modernity, [Trans., David Malcy], Cambridge: Blackwell 1995.

## جدید منہاج علم — مآخذ و منابع

تشریح اسلامی کے چاروں مآخذ پر جناب منظور احمد صاحب کا موقوف اور اس پر ”نظر ثانی“ کا طریقہ ان ہی کے اقتباسات اور حوالوں سے بیان کیا جا چکا۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک مسلمانوں کا روایتی علمی منہاج فرسودہ اور ناقص ہونے کے باعث اصلاح کا نہیں انہدام کا متقاضی ہے کیوں کہ:

ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریب تمام

جب تک اس کا ازالہ نہیں ہوگا، ڈاکٹر صاحب کے مطابق مسلمان زمانہ جدید کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر منظور احمد خطیبانہ آہنگ میں لکھتے ہیں:

”آج کے مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ معاشرتی ساخت اور قوانین کا جو بھی استخراجی پیراڈائم انہوں نے مقدس جان کر قبول کر رکھا ہے، وہ اپنا مصرف پورا کر چکا ہے اور آج کی دنیا میں وہ کار آمد نہیں ہے۔ کسی زمانے میں اجتہاد اسلامی معاشروں کا اصول حرکت اور ارتقا تھا، آج وہ بھی جمود اور رجعت کا اصول بن گیا ہے۔ مسلم مفکر اگر اس طرف توجہ نہیں کرتے تو پھر وہ دنیا کی سیادت کے خواب دیکھنا چھوڑ دیں اور ظالم طاقتوں کے رحم و کرم پر زندہ رہنے کے لیے تیار ہو جائیں۔“

۱- منظور احمد، پس چہ باید کرد؟ صفحات ۲۲-۲۳ — متذکرہ اقتباس کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر منظور احمد صرف مسلمان نہیں، ایک ”مسلم قوم پرست“ کی حیثیت سے مسلم امت سے نہیں ”مسلم قوم پرستی“ سے مخاطب ہیں۔ ڈاکٹر صاحب امت مسلمہ کو یہ تجویز دے رہے ہیں کہ اگر دنیا کی قیادت تمہیں درکار ہے تو تمہارے فرسودہ علمی طریقے دنیا کی قیادت و سیادت کی باگ ڈور تمہارے ہاتھوں میں دے دینے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ امامت عالم کے لیے دین کی ”تشکیل جدید“ اور ”نئی الہیات“ کی تدوین ضروری ہے — ڈاکٹر صاحب کا مقدمہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ان کے نزدیک مسلمانوں کے دنیا میں آنے کا مقصد ہی کسی نہ کسی طریقے سے دنیا کی قیادت و سیادت کا حصول ہے، تاکہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تمتع فی الارض میں اپنا حصہ ڈال سکیں۔ جدیدیت کافی الاصل ہدف یہی ہے کہ انسان اس مختصری زندگی میں لذتوں کے حصول کے دائرے کو آخری ممکنہ حد تک وسیع کر سکے اور معیار زندگی میں مسلسل اضافہ کر سکے۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کا مقدمہ جدیدیت کے منہاج کے عین مطابق ہے جو اسلامی علمیت اور اسلامی منہاج سے یک سر مختلف ہے۔ اس لیے جدید ترقی کا حصول ایک علیحدہ مابعد الطبیعی تناظر کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۱۳۱

ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں:

”میری دانست میں وہ پُرانا پیرا ڈائم بہ شمول اجتہاد کے جو مسلمانوں میں چودہ سو سال سے مروّج رہا ہے، جدید مسائل کے حل کرنے کے لیے کافی نہیں رہا۔“

اُصولی طور پر ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے یہ بیانات ٹھیک ہیں۔ اسلام جدید مسائل کا ”غیر جدید حل“ پیش کرے گا لہذا وہ جدیدیت پسندوں کے لیے ناقابل قبول ہوگا اور جدیدیت پسند اسلام سے جس ”جدید حل“ کے خواہاں ہیں وہ خود اسلام کے لیے قابل قبول نہیں۔ اصل حقیقت، جسے صورتِ مسئلہ کی تفہیم کے وقت نظر انداز کر دیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام اس دنیا میں سرمائے کی گردش اور افادے کی توسیع میں مسلسل اضافے کے لیے نہیں آیا۔ اسلام کا بنیادی مقصد معرفت رب اور حیات اخروی کو اس دنیا میں عبادت کے ذریعے ممکن بنانا ہے، اس کا مرکزی نکتہ اس دنیا سے کم سے کم تمتع ہے، مومن کو دنیا صرف بہ قدر ضرورت مطلوب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من أحب دنياہ أضرباً آخرتہ ومن أحب آخرتہ أضرباً دنياہ فآثروا یقی علی یفنی۔<sup>۱</sup>

”جو شخص دنیا سے محبت کرے گا وہ اپنی آخرت کو تباہ کرے گا، اور جسے آخرت محبوب ہوگی وہ اپنی دنیا کو نقصان پہنچائے گا، تو اے لوگو! تم باقی رہنے والی زندگی کو فنا ہو جانے والی زندگی پر ترجیح دو۔“

اس کے بالعکس جدید مسائل کے حل کا واحد نکتہ سرمایہ دارانہ طرز زندگی کے دائرے کی وسعت ہے جو اسلام کے لیے اُصولی اور مابعد الطبیعی سطح پر قابل رد ہے۔ اس اُصولی نکتے کے بعد یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ آج کا جدید انسان ایک مذہبی معاشرے میں رہنے کے باوجود عملاً مذہب کو نظام زندگی بنانے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید نظام زندگی جن اہداف و مقاصد کو معیاری [ideal] جان کر ترقی کی منازل طے کر رہا ہے اس کا ماخذ اسلام کے اُصول و مقاصد اور اسلام کی تاریخ نہیں ہے۔ کیا آج کا جدید انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام کی زندگیوں سے ان اہداف، مقاصد، عزائم اور سرگرمیوں کو تلاش کر سکتا ہے جو جدید طرز زندگی کا لازمہ و خاصہ ہے؟ قبل از جدید معاشروں میں افراد کی زندگی چند گھنٹوں کی معاشی سرگرمی [few hours of economic activity] پر یقین رکھتی تھی۔ اس لیے کہ ان کی معاشی سرگرمیاں ان کی ضرورتوں [needs] کو پورا کرنے کے لیے تھیں نہ کہ ان کی چاہتوں [wants] کو۔ اس معاشرے کے افراد جانتے تھے کہ چاہتوں، تمناؤں، خوابوں، آرزوؤں اور امنگوں کے پورا ہونے کی جگہ جنت ہے، لیکن جدیدیت نے

۱- منظور احمد، ”علم کے امین“، مشمولہ ماہ نامہ ”تعمیر افکار“ [کراچی]، علامہ طاسین نمبر، جون۔ جولائی، اگست ۲۰۰۶ء، صفحہ ۲۹۴۔

۲- الحسین بن علیؑ، ”الجامع لشعب الایمان، الریاض: مکتبۃ الرشد، ۱۴۲۳ھ، باب فی الزهد و قصر الامل، جلد ۲، صفحات ۵۳۸-۵۳۹۔ احمد بن حنبل، ”مسند احمد، مسند الکوفیین، جلد ۴، صفحہ ۴۱۲۔“

سرمایہ دارانہ طرز زندگی کے ذریعے ترقی اور لذت اندوزی کے نام پر کامیاب اور ناکام افراد اور معاشرے دونوں کو مسلسل ”ترسنے“ کے عمل میں مبتلا کر دیا ہے اسی لیے جدیدیت پسند بنیادی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے طرز زندگی کو اپنانے اور بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ وہ بس انھیں مسلم معاشرے کی تاریخی جذباتیت کے پیش نظر خاص سطح پر ناگزیر مجبوری کے طور پر ایک تقدیسی حصار میں رکھ کر قبول کرتے ہیں، جس کی طرف صرف تقدیس اور محبت کی نگاہ سے دیکھا تو جاسکتا ہے، لیکن اسے اپنانے کی ادنیٰ کوشش بھی نہیں کی جاسکتی — اسی لیے ڈاکٹر صاحب کی نظر میں اس دور میں اسلام کی ایک نئی تفہیم [understanding] کی ضرورت ہے جس کے لیے ڈاکٹر صاحب کے نزدیک سب سے مؤثر راہ ایسے ”اجتہاد“ میں مضمر ہے جو نص اور اجماع سے آزاد ہو۔ ڈاکٹر صاحب کی نظر میں اجتہاد کا مطلب ہے اسلام اور مسلمانیت کی نسبت اپنے ہمراہ رکھ کر، اسلام پر اسلاف اور قدما سے بے نیاز ہو کر از سر نو نظر ڈالی جائے۔ اس غور و تدبر میں قرآن و سنت کی خوشہ چینی نہیں بلکہ مغربی افکار و اقدار کی خوشہ چینی ضروری ہے۔ اس طرح مسلمان بھی کہلایا جاسکے گا اور دنیوی ترقی اور آسائش کی راہ بھی فراہم ہو سکے گی۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”عصر حاضر میں اجتہاد کو با معنی بنانے کے لیے جو طریق کار تجویز کیا جا رہا ہے اُس کے لیے نئی الہیات کی ضرورت ہے“۔<sup>۱</sup>

یہ ”نئی الہیات“ فرد، معاشرے اور ریاست کو منشاء خداوندی [will of God] کے مطابق ڈھال دینے پر اصرار نہیں کرتی، بلکہ اجتہاد کے نام پر ترقی [Progress]، آسائش [luxury] اور لذتوں [Pleasure] ہی کو خدا کی رضا گردانتی ہے۔ یہ اس نئی الہیات کی گویا مابعد الطبعی خصوصیت ہے، جس میں قرآن و سنت اور اجماع امت کو وہ حکمیت، قطعیت اور حتمیت حاصل نہیں جو مسلمانوں کی روایتی دینی فکر کا خاصہ رہی ہے۔ یہ جدید الہیات چند مصادر و منابع پر مشتمل ہے۔ جس کے بنیادی خدو خال ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کی روشنی میں یہ ہیں:

[۱] عقل مستقل بالذات حسن و قبح کی کسوٹی اور احکام اسلامی کو جانچنے کا معیار اور مستقل ماخذ ہے۔

[۲] علم کا مطلب عقلی اور سائنسی ہونا ہے۔ علم اور ایمان دو علیحدہ راستے ہیں۔

[۳] چوں کہ اب غالب فکر مغربی ہے لہذا عصر حاضر میں اسلام کی معقول تفہیم کے لیے کتاب

و سنت کے روایتی اور خوشہ چینی طریقہ کار کو ترک کر کے مغربی فکر و فلسفے کی خوشی چینی کرتے ہوئے از سر نو نظر ڈالی جائے، اور اس کی روشنی میں اگر وحی کی مناسب تاویل ہو سکتی ہے تو فہما، ورنہ صریح تعارض کی صورت میں وحی کو عہد رفتہ کی ایک ضرورت کہہ کر ساقط کر دیا جائے۔

۱۔ منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی العارف، صفحہ ۸۶۔

ان تینوں نکات پر تفصیل سے گفتگو کی جاتی ہے جن کے مطالعے سے واضح ہو جائے گا کہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب تخلیقی ذہانت کے حامل مفکر نہیں ہیں۔ وہ پہلے سے موجود افکار و نظریات کے محض ناقل و ترجمان ہیں۔ مزید ستم یہ ہے کہ اس مآخذ و مستعار فکر کی ترجمانی میں بھی وہ اس فکری صلاحیت و مہارت کا ثبوت نہیں دیتے جو ان کے مرتبے کا لازمی تقاضا ہے۔

---



## عقل محض اور عقل سلیم — فرق اور امتیاز

جناب ڈاکٹر منظور احمد کے افکار کے تناظر میں

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”مذہبی تعلیمات کو پرکھنے کی کسوٹی عقل ہے، اور اس کی تعبیر عقلی بنیادوں پر کیے بغیر بدلے ہوئے زمانوں میں انسانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتیں“۔<sup>۱</sup>

ایک مقام پر مزید لکھتے ہیں:

”اگر اس [مغرب یا امریکہ] کا مقابلہ کرنا ہے تو عقل کے گھوڑے کو آگے بڑھنا ہوگا، نقل کے پیادے مغرب یا امریکہ کو شکست نہیں دے سکتے“۔<sup>۲</sup>

مغرب: عقلیت کے دو معروف مناہج:

حسب عادت یہاں بھی ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے اپنا منہاج واضح نہیں فرمایا کہ وہ عقلیت پرستی [Rationalism] کے کس مکتب کے ہم نوا اور فکر کے قائل ہیں۔ کیا وہ مطلق تصور عقلیت پر ایمان رکھتے ہیں یا ارتقائی تصور عقل پر؟ عقلیت کو بنیادی طور پر معروضی ماننے والے جدیدیت پسندوں نے دو غالب رویوں اور انداز نظر کو جنم دیا ہے۔

ایک رویے کا سب سے موثر اظہار کانٹ [Immanuel Kant, 1724-1804] کے یہاں ہوا ہے،<sup>۳</sup> جب کہ دوسرے کا سب سے قوی اظہار ہیگل [G.W.F. Hegel, 1770-1831]

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۶۷۔

۲- منظور احمد، پس چہ باید کرد؟، صفحہ ۲۴۔

3- Critique of Pure Reason [1781 and 1787], Critique of Practical Reason [1788], A.H. Smith, Kantian Studies, Oxford: Clarendon Press 1947, Norman Kemp Smith, A Commentary to Kant's Critique of Pure Reason, 2nd ed., London: Macmillan 1923.

کے یہاں۔

کانٹ کا تصور عقل ماورائی [transcendental] اور انفرادی [individual] ہے جب کہ ہیگل کا اجتماعی [communitarian] اور حلولی [Imminent] ہے۔ کانٹ کے مطابق انسانی ذات [self] میں ایسا جو ہر موجود ہے، جس کی بنیاد پر اور جس کے استعمال سے زمان و مکاں سے ماورا ہو کر حقیقت کو جانا جاسکتا ہے۔ بالفاظ دیگر انسانی ذات میں ایسا نظام اور ترتیب موجود ہے، جو انسانی تجربے کو ہیئت [form] اور معانی [meaning] فراہم کر کے تجربے کو بہ حیثیت تجربہ ممکن بناتا ہے۔ ذات [self] میں ودیعت شدہ یہ علم قبل تجربی [a priori] ہوتا ہے، یعنی کائنات میں کوئی بھی تفہیم ان تصورات سے ماورا نہیں ہو سکتی جو self میں پہلے سے موجود ہیں۔ تجربے کو تجربہ بننے کے لیے اس ماورائی علم میں شرکت کرنی ضروری ہے، ورنہ تجربہ نہ بن سکے گا بلکہ محض بے ربط احساسات و معطیات کا ایک مجموعہ [bundle] بن کر رہ جائے گا۔ کائنات اپنے اندر کوئی معانی نہیں رکھتی، جب ذات [self] کے نظام [order] کو اس پر مسلط [impose] کیا جاتا ہے تو معنویت کا ظہور ہوتا ہے، جو باہم مربوط ہو کر تجربے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ گویا عقل، تفہیم، معانی، احساس، ربط و ضبط اور ادراک و اظہار ہر چیز کا منبع و مصدر ذات ہے۔ حصول علم کے عمل میں خارجی اشیا ذہن کی اپنی موضوعی صورتوں کے مطابق ڈھل جاتی ہیں۔ خارجی دنیا سے اٹھنے والے احساسات کہہ سکتے ہیں کہ گوندھی ہوئی مٹی [clay] کی مانند ہوتے ہیں جو ذہن کے ماورائی اور قبل تجربی سانچے میں ڈھل کر ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو صورت عقلیہ ان پر عائد کرتی ہے، بالفاظ دیگر انسان نے رنگین شیشوں کی ایسی عینک پہن رکھی ہے جسے کسی طور اتارنا ممکن نہیں، اب ظاہر ہے اشیا کے جو رنگ انسان کو نظر آئیں گے وہ ان اشیا کے حقیقی نہیں بلکہ عینک کے رنگ ہوں گے، اشیا کا اپنا رنگ [thing-in-itself] کیا ہے، انسان کبھی نہیں جان سکتا۔ لیکن کانٹ کے مطابق ذات کی اس صلاحیت پر ایمان لانے کے بعد ایسے اصول و قوانین وضع کیے جاسکتے ہیں جو: [۱] مطلق [absolute]، [۲] یقینی [certain] اور [۳] آفاقی [universal] ہوں گے یعنی وہ ہر معاشرے، نظام اور ریاست پر عمومی اور یکساں طور پر قابل عمل و نفاذ ہوں گے:

If what confers objectivity and generality on the objective empirical judgment is not to be [and it obviously can not be] identified with its specific concept, then it must be an *a priori* concept embodied in the form of the objective empirical

- 1- Lectures on Philosophy of History, [trans., J. Silbree], New York: Dover Publications, 1956, C. J. Friedrich, ed., The Philosophy of Hegel, New York: Random House, 1953, G. W. F. Hegel, Reason in History: A General Introduction to the Philosophy of History, [trans. R. S. Hartman] New York: Liberal Arts Press, 1953., Benedetto Croce, What Is Living and What Is Dead of the Philosophy of Hegel, [trans., Douglas Ainslie] London: Macmillan, 1915.

judgment and there will then be on elementary a priori concept or category for each of the different ways in which objective empirical judgments confer objectivity and generality of the corresponding perceptual judgments. ۱

کانٹ کے مطابق انسانی ذہن بارہ مقولات [12-categories] پر مشتمل ہے، ۲ اس سے جو تعقل بھی برآمد ہوگا وہ مثالی [ideal]، اور تاریخ و ثقافت کی حدود و قیود سے ماورائے تاریخی اور a-cultural ہوگا۔ ان ہی آفاقی اصولوں کی بنیاد پر قائم شدہ عادلانہ معاشرے کو کانٹ [Kingdom of Ends] کہتا ہے۔ جہاں ہر فرد کا یہ حق و اختیار تسلیم کیا جائے کہ وہ خود مختار [autonomous] اور قائم بالذات [self-determined] ہے، وہ اپنے خیر و شر کا تعین خود کر سکتا ہے، اسے کسی شریعت و قانون کی حاجت و ضرورت نہیں:

So act that you use humanity, whether in your own person or in the person of any other, always at the same time as an end, never merely as a means. ۳

کانٹ کے نزدیک ما بعد الطبیعیات کا سب سے بڑا جرم یہی ہے کہ وہ انسانی خود مختاری [Human worship] کا سودا کر کے اسے خدایا کائنات کے تابع کرتی ہے، جب کہ خود مختاری انسانیت کا جوہر ہے۔ کائنات یا خدا اگر انسانی خود مختاری کو ممکن بناتے ہیں تو ٹھیک ورنہ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ کسی بھی شے کے حق یا ناحق ہونے کا واحد معیار یہ ہے کہ وہ آفاقی تعقل سے ہم آہنگ ہے یا نہیں۔ کانٹ کا جنتِ ارضی [Kingdom of Heaven] کا تصور بہ راہِ راست جنتِ سماوی کی تردید اور اس کا متبادل ہے۔ اس کے نزدیک فی الاصل جنت کوئی ماورائی حقیقت نہیں بلکہ ایسا خیال ہے جسے انسان اس دنیا میں عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ بس مقصود، انسانی ارادے کی تکمیل اور افادہ انسانی کی توسیع ہونی چاہیے۔ واضح رہے افادے میں اضافے سے مراد کانٹ کے یہاں لذت میں اضافہ نہیں بلکہ تصرف و اختیار میں اضافہ مراد ہے، یعنی انسان کے ارادے پر سے ہر غیر ضروری، واقعتی اور ارادی تدغینیں رفع دفع کر دی جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ وجود خدا پر تنقیدات کے باوجود عیسائیت سے کانٹ کا ایک نوعیت کا تعلق بھی ہے، لیکن عملاً کانٹ کے عقلیاتی فلسفے نے جن خیالات کو تقویت بخشی اور جس رویے کو جنم دیا وہ نظریہ خود مختاری [autonomy] ہے، کہ فلسفے کا مقصد سچائی کی جستجو اور حقیقت کی تلاش نہیں بلکہ اس کی تخلیق ہے:

Among all the ideas of speculative reason freedom is .... The only one the possibility of which we

1- S. Korner, *Kant*, p. 49.

2- Ibid., p. 50.

3- Kant: *Metaphysics of Morals* quoted in P. Guyer, *Kant* London & New York: Routledge, 2006, p. 186.

know a priori ..... because it is the condition of the moral law, which we do know, while the idea of God and immortality ..... are not conditions of moral law but only conditions of the necessary object of a will determined by this law.<sup>1</sup>

اسی فلسفے کے تحت کانٹ نے اخلاقیات و سیاسیات کی بھی نئی تعریف و تعبیر پیش کی۔ اس سے قبل مغرب میں اخلاقیات کے دو نقطہ ہائے نظر تھے، پہلا مذہبی نقطہ نظر یہ تھا کہ اخلاقیات ارادہ الہی کے سامنے سر نیاز خم کر دینے کا نام ہے اور زندگی کا مقصد ارادہ الہی کی اتباع اور رضائے الہی کا حصول ہے۔ دوسرا نقطہ نظر فطری قوانین کی پیروی کا تھا کہ اخلاقی و سیاسی اقدار کو فطری قوانین کا پابند اور تابع ہونا چاہیے۔ انسانی معاشرت و اجتماعیت میں اخلاقی و سیاسی قوانین طبعی قوانین ہی کی طرح کار فرما ہیں۔ ان قوانین کا ادراک عقل کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ عیسائی مفکرین ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں تطابق و توافق اس طرح پیدا کرتے تھے کہ قانون بھی خدا کا ہے اور فطرت بھی اسی کی تخلیق ہے، لہذا فطرت کی پیروی دراصل خدا ہی کی اتباع ہے۔ اس کے برعکس کانٹ کے نزدیک اخلاقیات کا منبع ”ارادہ“ تو ہو سکتا ہے، لیکن وہ ارادہ الہی نہیں بلکہ ارادہ انسانی ہے اور اخلاقیات ارادہ انسانی کی اتباع کا نام ہے، خود کو کسی اور کے ارادے کا تابع کرنا غیر اخلاقی امر، بدترین شر اور انسانی خود مختاری کا سودا ہے۔ سیاسی تشکیل کا مطلب بھی کانٹ کے یہاں ایسے نظام کی تشکیل ہے جو انسانی خود مختاری کے تحفظ اور نمو کا باعث ہو۔

کانٹ کا تصور عقل: روایتی مابعد الطبیعیات کے بالمقابل ایک نئی مابعد الطبیعیات کا ظہور:

اگر غور کیا جائے تو بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ کانٹ نے اپنے فلسفے میں روایتی مابعد الطبیعیات کو رد ہی نہیں کیا بلکہ اس کے مد مقابل ایک نئی مابعد الطبیعیات پیش کی جس کے تحت وہ انسانی مفادات اور اس کی خود مختاری کو تحفظ فراہم کرتے ہوئے انسان پرستی [Humanism] یعنی الوہیت انسانی کی بنیاد رکھتا ہے۔ کانٹ کے اس تصور عقل، جس میں وہ کہتا ہے believe in reason نے مغرب میں تین بڑی لادینی تحریکوں یعنی لبرل ازم [Liberalism]، سرمایہ داری [Capitalism] اور جمہوریت [Democracy] کو جنم دیا۔ لبرل ازم، انفرادی و اجتماعی سطح پر جائز و ناجائز اعمال کی حدود وضع کرتا ہے، یہ دو اہم تصورات کا حامل ہے۔ تصور حقوق انسان اور تصور دستور۔ ان دونوں تصورات کا مقصد انسان پرستی کے عقیدے کا انفرادی، اجتماعی، ادارتی اور غیر ادارتی سطح پر اظہار، توجیہ اور تحفظ ہے۔ سرمایہ داری کہتے ہیں: محدود وسائل کو لامحدودیت میں بدل دینا۔ ہر شخص سرمائے کی بڑھوتری کی دوڑ میں شامل ہو جائے۔ اس طرح انسان وسائل کی محدودیت کی قید سے آزاد ہو کر جنت ارضی کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر کے، جنت سماوی سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔

1- Kant, Critique of Pure Reason quoted in P. Guyer, Kant, London, New York: Routledge 2006, p. 212.

جمہوریت وہ نظام فراہم کرنے کا داعی ہے جس میں یکساں طور پر خود مختار افراد اپنے اداروں کو سیاسی اور ادارتی سطح پر جوڑ سکتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس بات کو قدر بنا دیا جائے کہ انسان کے لیے انسانی خود مختاری کے سوا کچھ اور چاہنا محال ہو جائے۔

یہ کانٹ کے تصور عقل اور اس کے اطلاقی جہات کا مختصر سا تذکرہ ہے۔ اس تصور عقل کی موجودگی میں خدا، مذہب اور وحی قابلِ تضحیک حد تک بے معنی لگتے ہیں۔

ہیگل: حلویت اور تاریخی اجتماعیت کے ذریعے عقلیت کا اظہار:

کانٹ کے ماورائی تصور عقل کے برعکس ہیگل کا تصور عقل حلوی ہے۔ اس کے مطابق عقل اپنا اظہار اوپر سے نیچے کی جانب حلول کرتے ہوئے تاریخی اجتماعیت کے نتیجے میں کرتی ہے۔ اس کے نزدیک ایک روح [spirit] ہے جو انسانی زندگی میں بہ حیثیت مجموعی جس درجے حلول کرتی چلی جاتی ہے انسانی عقلیت کا ارتقا اسی قدر ممکن ہوتا چلا جاتا ہے اور اس تاریخی عمل کے نتیجے میں انسانی تہذیب زیادہ عاقل و بالغ ہو جاتی ہے۔ ہیگل self کے تصور کو رد نہیں کرتا بلکہ اس کا کہنا ہے Historical Language Community کے تناظر اور سیاق و سباق میں ذات کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس تناظر کے علی الرغم self کے کسی تصور کو متصور کرنا خام خیالی ہے۔ بالفاظ دیگر انفرادی self کی قائمیت اور موجودیت اجتماعی self پر منحصر ہے۔ self کے انفرادی اور اجتماعی تصور کے علاوہ ہیگل کے یہاں ایک absolute self کا بھی تصور ہے، جسے اس نے عیسائی مابعد الطبیعیات سے اخذ کیا تھا۔ مگر ہیگل کے ذاتِ مطلق اور عیسائی تصور حقیقت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ عیسائیوں کے ہاں خدا ازل سے مکمل ہے اور اس نے کائنات کو عدم سے تخلیق کیا ہے، وہ اس کائنات سے مربوط و متعلق ہونے کے باوجود اس سے ماورا و منزہ ان معنوں میں ہے کہ اس کی ذات اور صفات ثبات سے متصف اور تغیر سے پاک ہے۔ مگر ہیگل کہتا ہے کہ مطلق تصور ذات کہیں بھی مکمل صورت میں موجود نہیں ہے، یہ محض ایک مجرد تصور ہے، لیکن جب یہ absolute self زمان و مکان میں داخل ہوتی ہے تو یہ مجرد تصور ایک عملی شکل [actualization] اختیار کر کے، ارتقائی مراحل کو طے کرتا ہوا واقعیت [Giest] میں ڈھلتا ہے۔ اس طرح کائنات اپنی منطقی صورت سے معاشرتی سطح تک پہنچتی ہے اور پھر ہزار ہا رنگ اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ تاریخ اس ذاتِ مطلق کی خود تخلیقیت [self-creations] اور خود تشکیلیت [self-constitution] کا سفر ہے۔

ہیگل: تاریخ خیر و شر کا پیمانہ اور غلبے کا سبب ہے:

ہیگل کہتا ہے کہ جب خود تخلیقیت کے اس عمل کے ذریعے ذاتِ مطلق خود کو ریاستی ادارتی صف بندی کے ذریعے مکمل کر لے گی تو تاریخ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسی کو ہیگل [End of History] کہتا ہے:

The State is the Divine Idea as it exists on Earth. We have in it, therefore, the object of History in a more definite shape than before; that in which freedom

obtains objectivity, and lives in the enjoyment of this objectivity. ۱

وہ کہتا ہے کہ جو قوم غالب قوم کی حیثیت سے تاریخ میں چھائی نظر آتی ہے وہ ہی قوم اس امر کی غماز ہے کہ اس کے اندر تصورِ مطلق کے غالب عناصر موجود ہیں، جو اجتماعی تعقل کی عقدہ کشائی کے نتیجے میں ظہور کرتی ہے۔ البتہ انفرادی self اور اجتماعی self دونوں ذاتِ مطلق کی خود تخلیقیت اور خود تشکیلیت کے آلہ کار ہیں اسی کو ہیگل [cunning of reason] اور [cunning of History] کہتا ہے جن کے ذریعے تاریخی اجتماعیتیں حق کے اظہار پر مجبور ہیں۔ یہ تاریخی اجتماعیتیں ہی خیر و شر کے تعین کا پیمانہ اور اخلاقیات کا واحد معیار ہیں۔ تاریخی اجتماعیت نے ارتقا [evolution] کے لیے جو معیارات خیر و شر مقرر کیے ہیں ان ہی سے اخلاقی معیارات اور پیمانے تشکیل پاتے ہیں — ہو سکتا ہے کہ کسی زمانے میں قرآن و انجیل اخلاقیات کے معیارات اور خیر و شر کے پیمانے متعین کرتے ہوں، کیوں کہ وہ اس زمانے کی تاریخی اجتماعیتوں کی اخلاقیات کا اظہار تھے، لیکن اب وہ ماضی کی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں اجتماعیتوں نے اخلاقیات کے اظہار کے جو نئے نئے دروا کیے ہیں، انہوں نے قرآن اور انجیل کو آج کی دنیا کے لیے ازکار رفتہ شے بنا کر رکھ دیا ہے۔

تاریخ میں اخلاقی پیمانے بھی تغیر کا شکار رہتے ہیں:

ملاحظہ فرمائیے ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے ہیگلی تصور تاریخ و تعقل کو کس طرح اپنی تحریر میں سمو کر مسلمانوں میں پروان چڑھانے کی سعی فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

”جدید فکر..... اخلاقیات کی بنیاد کے لیے خدا کو انسان کے ایک ایمانی عمل کی حد تک تو تسلیم کرتی ہے لیکن سائنسی، سماجی اور سیاسی مسائل میں اس کی راست مداخلت کو غیر عقلی اور غیر علمی سمجھتی ہے اور زندگی کے مسائل سے نمٹنے کے لیے انسان کی عقل سلیم [common reasoning] اور ضمیر [good will] کو ہی وہ ذرائع سمجھتی ہے جو نوع انسانی کو دستیاب ہیں۔ انسانی تاریخ جس میں مذاہب بھی شامل ہیں انسان کی مجموعی فہم میں ممد و معاون تو ہو سکتے ہیں لیکن ان کو سند یا نظیر کے طور پر آنے والے واقعے کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دلیل چوں کہ ماضی میں ایسا ہو چکا ہے یا ایسا سمجھا جا چکا ہے اس لیے اب بھی ایسا ہی ہونا چاہیے یا اب بھی ایسا ہی سمجھنا چاہیے کافی نہیں ہے، فکر جدید سے انسان کو وہ رہنما اصول ملے ہیں جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے اور ان میں ترمیم و ترمیم کا حق بھی عقل سلیم کے علاوہ اور کسی کو نہیں۔ ان ہی اصولوں کی روشنی میں انسان اپنے لیے نظام وضع کرتا ہے اور برتنے کے بعد اگر وہ کسی تبدیلی کے

1- Georg W. F. Hegel, *The Philosophy of History*, New York: Cosimo, Inc., 2007, p.39.

مقتضی ہوتے ہیں تو بدل دیتا ہے۔ جمہوریت، آزادی فکر، قانون کی عمل داری، ضمیر کی آزادی، صنفی مساوات یہ تمام وہ تصورات ہیں، جو اب بدبھی حقیقتوں کے طور پر قبول کیے جاتے ہیں اور ان میں اکثر تصورات کو اسلام نے بھی قبول کیا ہے، لیکن اپنے اطلاق میں وہ زمانہ جدید سے مماثلت نہیں رکھتے۔<sup>۱</sup>

اس کا مطلب ہے تاریخ میں تغیرات کے ساتھ ساتھ اخلاقی پیمانے اور خیر و شر کے معیارات بھی بدلتے چلے جاتے ہیں، ہر آنے والا وقت پہلے سے بہتر اور اس کے پیمانے عہد گزشتہ پر فوقیت رکھتے ہیں، کیوں کہ آنے والے دور میں ذاتِ مطلق [absolute self] اپنی تخلیق و تشکیل اور تکمیل کے اگلے بہتر، برتر اور فائق مرحلے میں داخل ہو چکی ہوتی ہے۔ اسی کا نام ترقی [progress] اور development ہے:

The goal of attainment we determined at the outset: it is Spirit in its Completeness, in its essential nature i.e. Freedom. This is the fundamental object, and therefore also the leading principle of the development-- that whereby it receives meaning and importance.<sup>۲</sup>

تاریخ خیر و شر کا اصل پیمانہ ہے:

جس اجتماعیت نے جتنی زیادہ ترقی کی وہ اسی قدر معیار حق و باطل اور پیمانہ خیر و شر ہوگی، چوں کہ مغرب سے زیادہ ترقی کسی نے نہیں کی اس لیے مغربی تہذیب ہی بنیادی طور پر ذاتِ مطلق اور روح کائنات کا مکمل اظہار ہے۔ اس لیے ہر تہذیب و ملت کو چاہیے کہ مغربی آدرشوں، اداروں اور تہذیب کو خیر مطلق [absolute good] کی حیثیت سے قبول کر لیں۔

تاریخ کے خاتمے کا اعلان: مغربی تہذیب کا غلبہ اور برتری:

ان معنوں میں تاریخ کا خاتمہ ہو گیا، انسانیت و تہذیب اپنے معراج پر پہنچ گئی۔ ہیگل نے کہا تھا کہ اس معراج کا عملی نمائندہ امریکہ ہوگا، اس کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔ Samuel P. Huntington نے اپنی کتاب *The Clash of Civilizations* اسی تناظر میں لکھی ہے کہ یہ تہذیبوں کے تصادم کا دور ہے چوں کہ مغربی فلسفہ اور طرز زندگی سائنس اور ٹیکنالوجی تاریخ کے بہترین دور کا نمائندہ ہے جو اسے قبول کرنے سے انکار کر دے، ایسی تہذیب سے تصادم لازم ہے۔

۱- منظور احمد، "نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام"، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحات ۷۴-۷۶۔

2- Georg W. F. Hegel, *The Philosophy of History*, p.55.

جب کہ اسلام بہترین دور کا دوسرا تصور دیتا ہے جو جمعے کے خطبے میں ہر مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے کہ:

خیر الناس قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم۔<sup>۱</sup>

اس لیے دنیا میں صرف اسلام ہی وہ واحد تہذیب ہے جسے آج بھی یہ ادعا ہے کہ وہ بہترین علمیت، روایت اور تہذیب کا حامل ہے۔

ریشنل ازم اپنی بنیاد میں اسلامی فکر و تعقل سے متصادم ہے:

ڈاکٹر صاحب نے اپنا عقلیاتی منہاج واضح نہیں فرمایا وہ اپنے ایک انٹرویو میں کسی زمانے میں اپنے کانٹین ہونے کا اظہار کر چکے ہیں اور ان کی بعض تحریروں سے ہیگل کے تصور تعقل سے مماثلت مترشح ہوتی ہے [اسی لیے شروع میں عقلیت پرستی کے ان گنت مکاتب فکر میں سے صرف کانٹ اور ہیگل ہی کے عقلیاتی افکار کو موضوع بحث بنایا گیا ہے] تاہم پورے وثوق کے ساتھ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ چون کہ عقلیت کے آزادانہ استعمال کی اس دعوت میں ڈاکٹر صاحب کے عمومی مخاطب مسلمان، خصوصاً روایتی علماء، ہیں، اس لیے یہ بات واضح کرنی ضروری ہے کہ مسلمانوں کی مسلسل کلامی و فقہی اور صوفیانہ روایت اپنے عہد اول سے تا حال، اس تصور عقل کی کسی بھی قسم اور جہت کو، جس میں عقل پر وحی کی حاکمیت کا دعویٰ مضمر اور پوشیدہ ہے، گمراہی اور عنلات سمجھتی ہے۔ عقلیت [Rationalism] کی تعریف ہی مسلمانوں کی مابعد الطبعی فکر سے صراحتاً متصادم ہے، Rationalism کی تعریف ہے:

The theory that the exercise of reason, rather than the acceptance of empiricism, authority, or spiritual revelation, provides the only valid basis for action or belief and that reason is the prime source of knowledge and of spiritual truth.<sup>۲</sup>

ایک اور تعریف یہ ہے:

The term "Rationalism" [from the Latin *ratio*, "reason"] has been used to refer to several different outlooks and movements of ideas. By far the most important of these is the philosophical outlook or program which stresses the power of a priori reason to grasp substantial truths about the world

۱- محمد بن اسماعیل بخاری، الصحیح البخاری، باب فضل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد ۱، صفحہ ۵۱۵۔

2- The American Heritage Dictionary of the English Language, United States: Houghton Mifflin Publication, 1969, p.1425.



and correspondingly tends to regard natural science as a basically a priori enterprise.<sup>1</sup>

عقلیت کا یہ تصور صراحتاً وحی الہی پر عقل انسانی کی حاکمیت کا اعلان ہے۔

اہل سنت و جماعت کا اختصاص: عقل اپنی حجیت میں ناقص اور نقل کی تابع ہے:

اہل سنت و جماعت کی مختلف فرقوں اور گروہوں سے تاریخی معرکہ آرائی ہی اس بنیاد پر تھی کہ عقل کی مطلوبہ اہمیت کے باوصف وحی عقل پر حاکم اور اس کے فیصلوں کے صحت و سقم کی کسوٹی ہے۔ عقل حجت ہونے میں ناقص ہے، حجیت کامل انبیا کی بعثت ہے جس کے بغیر تزکیہ ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کی مجموعی فکری روایت کا فیصلہ نہایت بے لاگ اور دو ٹوک ہے۔<sup>2</sup>

منظور احمد کا تصور عقل جدیدیت پسندوں کے ہاں بھی متفقہ نہیں ہے:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے یہ افکار و خیالات فکر کی دینی روایت کے مطابق ہیں نہ ہی فلسفیانہ فکر ہی اسے متفقہ طور پر قبول [own] کرتی ہے۔ یہ افکار فلسفے کی ایک شاخ جدیدیت [Modernism] کی ناقص، جزوی بلکہ جزو کے بھی جزو کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جدیدیت پسند فلسفیوں کے ہاں بھی عقل کی مطلق، مستقل اور دائمی حیثیت اجماعی نہیں ہے۔ اس مفروضے کی تردید و تکذیب میں بے شمار قدیم و جدید فلاسفہ کے اقوال پیش کیے جاسکتے ہیں [چند ایک فلاسفہ کے اقوال اگلے صفحات میں تفہیم مدعا کی غرض سے پیش کیے جائیں گے]۔ عقل کے پیمانہ خیر و شر ہونے اور ہر مقتدرہ پر حکم بننے پر اب تک جدیدیت پسند فلسفیوں کا اجماع نہ ہو سکا۔<sup>3</sup> ڈاکٹر منظور احمد اسے ناواقف قارئین کے سامنے یوں پیش فرما رہے ہیں جیسے یہ بیان فلسفہ

1- *The Encyclopedia of Philosophy*, [ed., Paul Edwards], Vol. 7, New York: Macmillan Publishing Co., 1967, p. 69.

۲- تفصیل کے لیے دیکھیے: امام غزالی کی "المنقذ من الضلال"، قاہرہ: مکتبۃ لأئجلو المصریۃ، ۱۹۶۲ء اور "تہافت الفلاسفہ، قاہرہ: دار المعارف، [س-ن]: امام ابن تیمیہ کی "الرد علی المنطقین"، لاہور: دار ترجمان السنۃ، ۱۹۷۶ء اور "موافقہ صحیح المنقول لصریح المعقول"، قاہرہ: مطبعتہ السنۃ الحمدیۃ، ۱۹۵۱ء: محی الدین ابن عربی کی "فصوص الحکم"، بیروت: دار الکتاب العربی، ۱۹۳۶ء: علامہ ابن خلدون کا "المقدمة"، الدار البیضاء، ۲۰۰۵ء اور محمد الف تائی کے "مکتوبات امام ربانی"، کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی، ۱۹۷۷ء۔

۳- ذیل میں چند مشرقی مفکرین اور فلسفیوں کی منتخب کتابوں کے نام درج کیے جا رہے ہیں جن میں انہوں نے خود عقل کا دائرہ متعین کر دیا ہے۔ اگر وقت نکال کر انہیں ملاحظہ فرمایا جائے تو بات صاف اور مسئلہ واضح ہو جائے گا:

1. Charles Taylor, *Sources of the Self: The Making of the Modern Identity*, UK: Cambridge University Press, 1989.
2. Hans-George Gadamer, *EPZ Truth and Method [Continuum Impacts]*, New York: Continuum, 2004.
3. Martin Heidegger, *Being and Time*, [trans., John Macquarrie & Edward Robinson] USA: Blackwell Publishing, 1962.

ہی نہیں دینی فکر کے نزدیک بھی حتمی اور متفقہ ہے — عقلیت کے آزادانہ استعمال کا سب سے بڑا سبب اور مظہر مادہ پرستی ہے۔ آزادی [freedom] کے حصول کو عقل پر منحصر قرار دیتے ہوئے علم کا اصل ماخذ صرف عقل کو قرار دیا گیا کہ عقل کے ذریعے انسان خیر کی معرفت حاصل کر سکتا ہے اور اسے تبدیل بھی کر سکتا ہے۔ وہ اپنے پیمانہ خیر و شر کے تعین میں کسی خارجی ذریعے کے سامنے سر نیاز خم کرنے کا محتاج نہیں۔ عقل absolute truth ہے۔ علم کی ابتدا و انتہا عقل سے ہوتی ہے، external authority سے حاصل ہونے والا علم، علم کہلانے کا مستحق نہیں۔

حقیقت محض ایک انکشاف: ڈاکٹر منظور احمد:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”انسانی علم میں نہ تو کُلّی معروض ہے اور نہ موضوع... حقیقت وہ ہے جو ہمارے اوپر منکشف ہوتی ہے، انسان اُس انکشاف میں اتنا ہی شریک ہے، جتنی کہ حقیقت“۔

اس بیان میں یہ واضح نہیں فرمایا گیا کہ یہ انکشاف روحانی، وجدانی، جذباتی، عقلی کس سطح پر ہوتا ہے۔ فلسفے کی تاریخ میں عنایت [Solipsism] کے سوا کسی فلسفیانہ مکتب نے یہ دعویٰ نہیں کیا، جس کے مطابق "me and my world" میں اور میری دنیا میرے ادراک حقیقت تک محدود ہیں۔ مگر یہ فلسفے کا کوئی مقتدر مکتب نہیں، بلکہ Solipsism سے وابستگی فلسفیانہ روایت میں ایک نقص اور کمزوری سمجھا جاتا ہے، اور نہ ہی ان کے افکار و خیالات فلسفیانہ سطح پر کسی خاص اہمیت اور وقعت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ Kant سے لے کر Heidegger تک کوئی بھی حقیقت کے موجود ہونے کے حوالے سے غلط فہمی میں نہیں رہا، اُن کا اختلاف حقیقت کے معنی اور اُس تک رسائی کے حوالے سے ہے۔ جب کہ منظور احمد صاحب کے بیان کے مطابق خود انسان منبع حقیقت ہے اور نفس انسانی حقیقت کا سرچشمہ۔ گویا انسانی نفس کے ارادے و وسوسے اور مطالبات و خواہشات سب حقیقت کی آماجگاہ ہیں۔ انسان کو حق اپنے اندر ہی تلاش کرنا ہے: The Self must find in itself، یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان مکمل داخلی [totally subjective] ہو جائے۔ جب کوئی اپنے آپ کو مکمل نفس کے سپرد کر دیتا ہے اور

= 4. Gilles Deleuze & Felix Guattari, *Anti-Oedipus: Capitalism and Schizophrenia*, New York: Penguin Books, 2009.

5. Gilles Deleuze & Felix Guattari, *A Thousand Plateaus Capitalism and Schizophrenia*, [trans., Brian Massumi], London: University of Minnesota Press, 2005.

6. Richard Rorty, *Contingency, Irony, and Solidarity*, UK: Cambridge University Press, 1989.

7. Michel Foucault, *Madness and Civilization: A History of Insanity in the Age of Reason*, New York: Vintage Books, 1988.

۱- منظور احمد، ”خدا، خودی اور زمان و مکان“، مشمولہ اقبال شناسی، صفحہ ۱۲۷۔

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۱۵۳

نفس کی کیفیات کا ادراک کر لیتا ہے تو گویا وہ حقیقت کا ادراک کرتا ہے۔ مظہریات [Phenomenology] کے مطابق انسان کو اسی وقت حق کا ادراک ہوتا ہے جب وہ نفس کے تابع ہو جائے۔ گویا حقیقت کوئی معروضی [objective] چیز نہیں بلکہ ہر عہد کا انسان حقیقت کے تصورات کا خالق ہوتا ہے، یعنی حقیقت کچھ نہیں یہ انسانی نفس اور ارادے کی تخلیق کا نام ہے۔

حقیقت کی تخلیق اور تغیر پذیری کا نظریہ: ڈاکٹر منظور احمد:

ڈاکٹر منظور احمد لکھتے ہیں:

”حقیقت ایک جامد شے نہیں ہے، بلکہ ہر لمحہ تخلیق کے مراحل سے گزر رہی ہے، اس لیے زمانے کی تبدیلی ایک نئی حقیقت سے روشناس کراتی ہے اور ہر نئی حقیقت اپنے عرفان کے لیے نئے اظہار کی متقاضی ہوتی ہے۔“

ایک مقام پر ڈاکٹر صاحب مسلمانوں کے تمام مابعد الطبعی اور روایتی مناہج کے تصور حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے، لیکن اس پر اعتراض وارد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ہماری روایت منطق استخراجی پر قائم ہے۔ حقیقت یا تو تغیر ہے یا دوام — یہ بات کہ تغیر اور دوام دونوں صحیح ہو سکتے ہیں، بہ ظاہر غیر منطقی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کو کسی نہ کسی صورت میں تقریباً ہر مابعد الطبعیاتی نظام نے تسلیم کیا ہے۔“

حقیقت سے متعلق محترم ڈاکٹر منظور صاحب کے یہ دونوں بیانات روایتی تصور حقیقت کو اس کے اپنے طریق تفہیم کے بجائے مغربی فلسفے کے نقطہ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کا شاخسانہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو سب سے پہلے یہ بتانا چاہیے تھا کہ حقیقت سے ان کی کیا مراد ہے؟ اور حقیقت کا تعین وہ کس بنیاد پر کرتے ہیں؟ محسوسات کی بنیاد پر یا مافوق الحسی بنیادوں پر؟ اگر وہ محسوسات کی بنیاد پر حقیقت کا تعین فرماتے ہیں تو پھر ان کے نزدیک حقیقت اصلی یہی ماڈی کائنات ہے اور اس سے ماورا کوئی بھی حقیقت وجود نہیں رکھتی۔ اگر ان کے تصور حقیقت کی بنیاد ماورائے محسوسات [یعنی وحی] پر ہے تو وحی اس ماڈی دنیا کو فریب نظر، التباس اور غیر حقیقی قرار دیتی ہے، اس کے نزدیک اصل حقیقت فقط اور فقط اخروی ہے۔ اب یہاں حقیقت کی ”تخلیق“ کا نظریہ بالکل بے معنی ہے۔ اس کے مطابق حقیقت اشیا کی اس وجودی اصل کا نام ہے جو اس کی manifested meaning کو برقرار اور اس کے تنوع [diversity] کو قائم رکھے۔ یہاں حقیقت ایک ایسا گل ہے جو محیط گل اور غیر منقسم وحدت کا آئینہ دار ہے اور زمان و مکاں سے ماورا ہونے کے باعث بالذات قائم اور ناقابل تغیر ہے۔ بالفاظ دیگر حقیقت مطلقہ ہر قسم کے تعینات سے ماورا اور ظہور کے دائرے سے بے نیاز ہے، لیکن یہی حقیقت جب بہ اعتبار معرفت یا ازراہ ہدایت

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ ماہی المعارف، صفحہ ۸۸۔

۲- منظور احمد، ”روایت، جدیدیت اور لسانیات“، مشمولہ ماہ نامہ صریح، صفحہ ۲۲۔

جلوہ فرما ہوتی ہے تو اس کا ابلاغ و اظہار زمان و مکاں میں تعینات کے ذریعے ہوتا ہے جس سے حقیقت میں کُلّ یوم ہو فی شأن کے اقتضا کے بہ موجب تنوع، بوقلمونی اور تضاد و تخالف کی شان نظر آنے لگتی ہے۔ شئون حق کائے نئے رنگ میں نمایاں ہونا تلون کے معنی میں نہیں کہ وہاں کسی بات کو ثبات و قرار نہیں کہ یہ خامی اور نقص کی دلیل ہے، بلکہ درجہ ظہور میں اس سے بوقلمونی اور نت نئے عجائبات انتہائی قدرت اور شان کے ساتھ محض توجہ سے دائرہ ظہور میں آجاتے ہیں، یعنی حق اپنی اصل میں واحد ہے اور بہ اعتبار ظہور متنوع المظہر، جس سے لامتناہی مظاہر کا صدور ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر حقیقت حق کی جہت سے واحد اور خلق کی جہت سے کثرت کو مستلزم ہے۔ اس حقیقت کا عرفان ہی جستجوئے حقیقت کا منہجائے مقصود ہے،

حالیٰ روایت نے اسے یوں بھی بیان کیا ہے:

”حق سبحانہ تعالیٰ بالذات تغیر کو قبول نہیں فرماتا، لیکن اس کی ہر تجلی میں ایک تغیر ہے جسے تحول فی الصور کہتے ہیں۔ اس کا متغیر نہ ہونا حکم ذاتی ہے، اور تجلیات میں تنوع امر وجودی یعنی ہے۔“

لیکن ڈاکٹر صاحب کے تصور حقیقت میں کسی تنوع کا گزر نہیں، وہ فرماتے ہیں کہ روایتی مکتب فکر کا تصور حقیقت چوں کہ منطق استخراجی پر استوار ہے اس لیے ان کے یہاں حقیقت میں بہ یک وقت تغیر اور ثبات دونوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب کے مطابق حقیقت دونوں میں سے ایک ہی ہو سکتی ہے یا دوام یا تغیر۔ گویا ڈاکٹر صاحب نے روایت کے تصور حقیقت میں بہ یک وقت تغیر اور دوام کے عنصر کی موجودگی کو استخراجی منطق کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ حالاں کہ یہ اعتراض روایت پر نہیں جدیدیت پر وارد ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کو تغیر اور ثبات میں سے ایک ہی تصور کو مانتی ہے، دونوں کو بہ یک وقت تسلیم نہیں کرتی لیکن نہ معلوم کیوں ڈاکٹر صاحب نے جدیدیت پر وارد ہونے والے اعتراض کا عنان روایت کی طرف موڑ دیا۔

عقلیت پسندی: اہم نکات اور سوالات:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے اپنے متذکرہ بیانات میں پورے انسان کو محدود [reduce] کر کے صرف عقلیت کے دائرے میں محبوس و محصور کر دیا ہے، گویا انسان سراپا عقل ہے اور کچھ نہیں، وہ اپنی

۱- حضرت شاہ سید محمد ذوقی، سر دہراں، لاہور: الفیصل، ۲۰۰۸ء، صفحہ ۱۰۲۔

۲- اگر ٹھیٹھ مذہبی معنوں میں ڈاکٹر صاحب کے تحریر فرمودہ ”تخلیق حقیقت“ والے جملے کی تفہیم کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا ہر لمحے تخلیق ہو رہا ہے، ہر نیاز مانہ نئے خدا سے روشناس کراتا ہے، ہر نئے خدا کو نئے زمانے میں پہچاننے کے لیے نئے عرفان کی ضرورت ہوتی ہے۔

زندگی کا ہر فیصلہ محض عقل کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اگر اس ضمن میں درج ذیل امور کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کی جائے تو بات نتیجہ خیز اور با معنی ہوگی۔

عقل کی ذمے داری: اہداف کا تعین یا اہداف کا حصول؟

عقل اہداف کا تعین کرتی ہے یا اس تک رسائی کا سہل الحصول اور سرعت پذیر طریقہ بتاتی ہے؟ بالفاظ دیگر طے شدہ مقصدیت کے حصول کا طریقہ بتلانا عقل کی ذمے داری ہے، یا اس کا تعین کرنا؟ بعض فلاسفہ کے نزدیک عقل صرف ہیئت علم [form] کو متعین کر سکتی ہے substance یا content تک رسائی اس کے بس میں نہیں۔ it is given، وہ پہلے سے دیا جا چکا ہے۔ کیا ان اہداف و معیارات کی کوئی عقلی توجیہ پیش کی جاسکتی ہے؟

Modernity is not based upon one single principle  
..... It is the result of a dialogue between Reason  
and Subjectivity.<sup>1</sup>

خود جدیدیت کے عطا فرمودہ دو تحفے: modern subjectivity اور instrumental reasoning میں سے اول الذکر زندگی کے معانی متعین کرتی ہے، جو عقلیت کا نہیں مابعد الطبیعیات کا دائرہ ہے۔ معنویت کا تعین، معیارات کی تخصیص، جائز و ناجائز کی تحدید، بہتر و کہتر کا فیصلہ اور مقصدیت کی معرفت، عقلیت کا منہاج نہیں، یہ کام modern subjectivity کا ہے۔ جدیدیت پسند فلاسفہ تسلیم کرتے ہیں کہ جدیدیت کے منہاج علم میں عقل اہداف کا تعین نہیں کر سکتی۔ modern subjectivity صرف عقلیت نہیں ہے، جذبات، تاریخ، تہذیب، روایات، اقدار، وجدان اور تجربات کی کامیابیاں و ناکامیاں مل کر اس کی مابعد الطبیعیات تخلیق کرتی ہیں جس کو instrumental reasoning ممکن بناتی ہے۔

عقل: چند ماورائے محسوس بدیہی سچائیاں:

عقل کے دو اجزا ہیں: [1] منطق [logic]، [2] چند بدیہی سچائیاں [a priori]، یہ عقل کو بغیر کسب و استدلال کے راست طریقے پر معلوم ہیں، جن کا حسی مشاہدہ اور عقلی ثبوت نہ ضروری ہے نہ ممکن۔ یہ بہت حد تک ماورائے محسوس ہوتی ہیں، مثلاً ہر واقعے کا سبب ہوتا ہے۔ ان بدیہات، تیقنات اور ایمانیات کو بغیر سوچے سمجھے تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ ہمارے ذہن میں کہاں سے آئیں۔

1- Touraine Alain, *Critique of Modernity*, [Trans., David Malcy], Cambridge: Blackwell 1995. p.6. quoted in Cornelia Kinger, "From Freedom Without Choice to Choice Without Freedom: the Trajectory of the Modern Subject", in *Constellation* Vol. 11, No. 1, Blackwell Publisher, March 2004.

افلاطون: نظریہ مثال: عالم بالا میں ورائے عقل تصورات:

افلاطون [Plato, 348-428 B.C] نے نظریہ مثال [Theory of Forms] یا تصورات [ideas] کے ذریعے یہ سمجھایا ہے کہ عالم بالا میں ایسی اشیا اور حقائق موجود ہیں جو غیر متبدل اور اصل الحقائق ہیں۔ دنیا میں نظر آنے والی اشیا ان حقائق اصلہ کا مدہم سا عکس ہیں۔ جن کے کامل معانی کا ادراک اور نوعیت اصلی محض حواس کی بنیاد پر دریافت نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر جمال اور بد صورتی دو مختلف معانی ہیں، جن کا ادراک ہم مختلف ظاہری شکل و صورت کی حامل اشیا میں کرتے ہیں۔ مگر یہ معرفت کیسے حاصل ہوگئی کہ فلاں چیزیں حسن میں مشترک ہیں اور فلاں قبح میں، بالفاظ دیگر ہم اس موازنہ و تقابل کے قابل کیسے ہو گئے؟ افلاطون کہتا ہے کہ اس کے لیے ہمیں حسن و قبح کی forms تک، جو غیر متبدل ہیں، رسائی حاصل کرنا ہوگی۔ جس کا عالم بالا میں ہماری عقلوں سے ورے حقیقی وجود ہے۔ جس کے بعد ہم فیصلہ کر سکیں گے کہ اس دنیا میں پائی جانے والی اشیا میں حسن و قبح کا کتنا عنصر موجود ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہماری ارواح اجسام میں داخل ہونے سے قبل عالم مثال میں رہتی تھیں جب وہ جسموں میں داخل ہوئیں تو عالم مثال کو ایک حد تک بھول گئیں۔ مگر جب ہماری نظر جمال و بد صورتی پر پڑتی ہے تو اس کی مثال یاد آجاتی ہے اور ہم ان دونوں کے تقابل سے ادراک کے قابل ہو جاتے ہیں۔ علم سے مراد "المثل" کا یاد آ جانا اور جہل سے مراد اسی سے نسیان ہے، بالکل یہی حال عدل اور خیر وغیرہ کے مفہومات کا ہے:

Knowing is commonly said to be the "having" of knowledge [1796]. But we might improve this statement by distinguishing "possession" and "having". A man may possess or own a cloak without actually having it on. So possibly a man may possess knowledge without having it. ۱

کانٹ: عقل کی ماورائے حواس دائرے میں دراندازی فکری اضداد کا سبب:

منظور احمد مذہبی عقائد کی عقلی توجیہ پر مصر ہیں حالانکہ فلسفے کا ایک مبتدی بھی اس بات سے بہ خوبی آگاہ ہے کہ designed argument یا theological argument کی فلسفے کی دنیا میں پرکاش کے برابر وقعت نہیں ہے۔ مابعد الطبعی حقائق، طبعی منطق سے اپنے اصول تحقیق اور سیاسیات علم میں نہ صرف مختلف بلکہ متصادم ہے۔ یہ تقسیم اتنی واضح اور بعد اتنا مستقل ہے کہ اگر طبعی منطق پر ذات حق کا اثبات ہو بھی جائے تو اس ثبوت کو مابعد الطبعی روایت قبول نہیں کرتی بلکہ اس وجود کو خدا ہی نہیں مانتی جسے طبعی منطق نے دریافت کیا ہو۔ کانٹ نے مذہب کی عقلی توجیہات [rational theology]

1- A. E. Taylor, *Plato: The Man and his Work*, London: Methuen & Co. Ltd., 1960, p. 343.

پر جو نقد کیا ہے، اس کا مطالعہ ڈاکٹر منظور احمد کی اس منطق کی حقیقت واضح کر دیتا ہے۔ Kant خدا کا قائل ہے، مگر اس نے اپنے نظام فکر کی عمارت استوار کرنے سے قبل یہ ضروری سمجھا کہ عقل کی استعداد، حدود اور ماہیت کا جائزہ لے لیا جائے، بالفاظ دیگر انسان، کائنات اور اقدار کے بارے میں نظریات وضع کرنے سے قبل عقل کی استعداد کا تنقیدی جائزہ لے لیا جائے کہ کن باتوں کا علم ممکن ہے اور کون سی باتیں عقل کی رسائی سے باہر ہیں۔ کانٹ نے اسی لیے اپنی تینوں اہم کتابوں کے عنوانات میں ”انتقاد“ [critique] کا لفظ شامل کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے:

[۱] سرچشمہ معرفت جس اور عقل ہیں۔ جس عقل سے بے نیاز ہے اور نہ عقل حواس سے مستغنی۔  
 [۲] عقل کے فطری افکار [systematic laws] ہیں، جن کے ذریعے وہ اپنی طرف لوٹائے جانے والے حسی آثار کے درمیان قائم [علاقات] کے ادراک کے قابل ہو جاتی ہے۔ اور احساسات سے حسی آثار تشکیل دیتی ہے، پھر ان سے عقلی مدارکات بناتی ہے۔  
 [۳] عقل ان منظم قوانین سے احکام انشائیہ کی تکوین میں احساس اور تجربے پر انحصار کیے بغیر بذاتہ قابل ہو جاتی ہے۔

[۴] عقل کی یہ قوت محدود اور محسوسات کے تغزیے کی پرداختہ ہے۔ جوں ہی وہ ظواہر کے میدان سے نکلنے اور اشیا کی ماہیت میں داخل ہونے کی کوشش کرتی ہے، خطا میں پڑ جاتی ہے۔ اس کی نشان دہی مابعد الطبیعیات کا کام ہے۔ جہاں عقل ماورائے محسوسات میں داخل ہونے کی کوشش کرتی ہے فکری اضداد کا شکار ہو کر خطا کر جاتی ہے، کیوں کہ عقل کا مدار و انحصار زمان و مکاں میں محدود ہے۔ ماورائے محسوسات اس کی جولان گاہ نہیں ہے۔ Kant کی بیان کردہ دونوں اصطلاحوں Noumena اور Phenomena کا مفہوم یہی ہے:

Kant calls the things in themselves "noumena" because they are entities of the understanding to which no object of experience can ever correspond and contrasts them with "phenomena" which are or can be objects of experience. ۱

کانٹ: ماوراء حقیقت کا علم عقل کے زور پر ناممکن:

Kant کے مطابق ماوراء حقیقت [transcendent reality] کا علم ناقابل حصول ہے، کیوں کہ عقل ان آفاق تک پرواز نہیں کر سکتی۔ ہم نے اپنے ذاتی فکری اصولوں اور موضوعی ذہنی مقولوں کی مدد سے ایک کائنات تعمیر کر رکھی ہے جو حقیقت مطلقہ کی ہرگز آئینہ دار نہیں، خدا، کائنات اور نفس کے بارے میں ہم جب بھی منطقی انداز سے سوچیں گے، فکری اضداد کا شکار ہو جائیں گے۔ کانٹ کے

1- S. Korner, Kant, p. 94.

نزدیک انسانی ذہن نے تین بڑی غلطیاں کی ہیں:

[1] Rational Psychology: جب بھی عقل کے زور پر نفس کو جاننا چاہا، ناکام ہوا۔

[2] Rational Cosmology: جب بھی عقل کے سہارے کائنات کی ابتدا و انتہا اور تکوین

کو جاننا چاہا، ناکام ہوا۔

[3] Rational Theology: جب بھی عقل کے بل پر الوہی معرفت چاہی، ناکام ہوا۔

کانٹ: عقل محض حقیقت فی نفسہ کے ادراک میں ناکام:

واضح رہے ناکامی سے مراد یہ نہیں ہے کہ ”سمجھ میں نہیں آیا“۔ بلکہ اس سے مراد ہے کہ حقیقت فی نفسہ [thing-in-itself] کیا ہے ہم نہیں جان سکتے۔ کیوں کہ ہم ان چشموں اور ذریعہ علم سے محروم ہیں جو حقیقت کو تجربی سطح پر ایسی تفہیم کے قابل بنادیں ”جیسی کہ وہ ہیں“ [thing-in-itself]۔ ہم ان کو اسی طرح جان سکتے ہیں جیسی کہ وہ ہم کو معلوم ہوتی ہیں کیوں کہ ہمارے مشاہدے کی دنیا خود ہمارے فہم کی پیدا کردہ ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ انسان کے اندر اپنے علم کو منظم کرنے اور شے فی نفسہ کو جاننے کی خواہش اتنی شدید ہے کہ وہ عقل محض کو غیر حسی حقائق کی تہہ تک پہنچنے کے لیے استعمال کرتا ہے، اس طرح وہ فکری تضادات میں پھنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ عقل محض ماورائے ادراک حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے اور مدرکات کو اپنی راہ کی رکاوٹ سمجھتی ہے۔ جس طرح ایک فاختہ یہ گمان کرتی ہے کہ اگر اس کی پرواز میں باد مخالف مزاحم نہ ہو تو وہ افلاک کی انتہائی بلندیوں تک جا پہنچے، حالاں کہ اسے علم نہیں ہوتا کہ ہوا کی مزاحمت ہی اُسے فضا میں بلند کرتی ہے اور اگر وہ خلائے محض میں اڑنے کی کوشش کرے تو ایک انچ بھی بلند نہیں ہو سکے گی۔ اسی طرح عقل محض تجربے سے تہی اور ماورائی حقیقت کے خلائے محض میں اڑنے کی کوشش کرتی ہے لیکن سوائے ناکامی کے اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ عقل کو اس کی استعداد و استطاعت سے باہر دوڑا کر گویا ہم نے Catagory Mistake کی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی ٹیومر کے مریض کو ٹیومر نکلوانے کے لیے بجائے ڈاکٹر کے قصابی کے پاس لے جایا جائے یہ بات یقینی ہے کہ قصابی ٹیومر نکال دے گا مگر اس سے زیادہ یقینی بات یہ ہے کہ پھر مریض زندہ نہیں بچے گا۔ اس بات کو تفصیل سے جاننے کے لیے گلبرٹ رائل [Gilbert Ryle, 1900-1976] کو پڑھا جائے وہ لکھتا ہے:

Ryle holds that there are clear - cut cases of category mistake and in the concept of Mind he outlines same ..... when some one who knows how to use certain concepts correctly in situations where they are normally applied misuse them in novel situations because he extends their use. Such a category,



mistake is what Ryle calls "Descartes Myth".<sup>1</sup>

شوپن ہاؤر: کانٹ کا کارنامہ حقیقت اور مظاہر کے درمیان فرق کی وضاحت:  
مشہور جرمن قنوطیت پسند فلسفی Schopenhauer کانٹ کا سب سے بڑا کارنامہ ہی یہ قرار دیتا ہے کہ اس نے اشیا کے درمیان "حقیقت" اور "مظاہر" کے فرق کو واضح کر دیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے Kant کی کتاب Critique of Pure Reason کا باب Rational Theology۔<sup>2</sup>  
ڈیکارٹ کا فلسفہ: مختلف مفروضات اور مابعد الطبیعیات پر انحصار:

ڈیکارٹ [René Descartes, 1596-1650] جو جدیدیت کا باوا آدم اور عقل پرستوں کا امام ہے، خود اس کا اپنا فلسفہ بہت سی مابعد الطبیعیات اور مفروضات کا مرہون منت ہے۔ اس نے تشکیک [Skepticism] سے یقین کا استخراج کیا۔ وہ روح اور مادے کی تفریق اور جسم و ذہن کی دوئی کا قائل ہے، اس کا اصرار ہے کہ خارجی حقائق [Res Extusa]، داخلی حقائق [Res Cogitans] سے بالکل الگ ہیں بلکہ ایک دوسرے کے متوازی اور مستغنی حالت میں مؤثر اور حقیقی ہیں، مگر اس کے اس ادراک [Cartesian Dualism] کو Physicalist نہیں مانتے، وہ صرف Body کی حقیقت کو مانتے ہیں کہ انسان ایک Psycho-chemical organism ہے۔  
ڈیکارٹ کے تشکیکی فلسفے پر Husserl کی کتاب Cartesian Meditation کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے، کہ اس کا فلسفہ کئی مابعد الطبیعی مفروضات کا مرہون منت ہے، جس نے

- 1- Gross Barry, *Analytic Philosophy: An Historical Introduction*, New York: Pegasus, 1970, p. 183.
- 2- Paul Guyer, *Kant*, p. 145.
- 3- "Husserl's main critique of Cartesian philosophy is that it is not radical enough: there are presuppositions left untouched by Cartesian doubt. He points out that when Descartes doubted in order to establish a foundation of the sciences, he presupposed the model of an axiomatic and deductive geometry as an ideal of all sciences. As a "prejudice this ideal determines philosophies for centuries and hiddenly determines the Meditations themselves". Because of this undoubted prejudice, Descartes was not ultimately successful in his enterprise. The axiomatic and deductive ideal determined Descartes' ideal to knowledge towards the exclusively clear and distinct. In this way Descartes lost touch with the world as it is immediately presented to the senses". Lilli Alanen & Charlotte Witt, eds., *Feminist Reflections on the History of Philosophy* [The New Synthese Historical Library], Netherlands: Kluwer Academic Publishers, 2004, p.75.

اس کے فلسفے کو ایک خاص رخ پر پھیلنے میں مدد دی، جس پر چل کر Crisis of Eurpion Sciences کی بنیاد فراہم ہوئی۔

لاک: حصول علم کا واحد ذریعہ تجربہ ہے عقل نہیں:

تجربیت پسند فلسفی جان لاک [John Locke, 1632-1704] کہتا ہے کہ ہمیں جو بھی علم ہوتا ہے وہ حس [Sense] اور تامل [Reflection] کے باعث ہوتا ہے۔ ان کے بغیر ذہن کی حیثیت قرطاس سادہ کی ہوتی ہے، اس مخصوص کیفیت کے لیے اس نے [Tabula-Rasa] کی اصطلاح استعمال کی ہے، اس کا مطلب ہے: Clean Slate۔ یعنی ایسی سادہ سلیٹ جس پر کوئی نقش ثبت نہ ہو، ایسا سفید کاغذ جس پر کوئی حرف مرقوم نہ ہو۔ افکار اپنے انواع کے اختلاف کے باوجود محض تجربے پر منحصر ہوتے ہیں۔ مگر بعض قضایا ہمیں بدیہی [a priori] معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ عقل غور و تجسس کے ذریعے ان کا ادراک نہیں کر سکتی اس لیے انہیں ہم فطری افکار شمار کر لیتے ہیں۔ حالاں کہ وہ تجربے سے بنائے ہوئے ہماری عقل کے افکار ہوتے ہیں۔ بے سمجھ لوگوں اور اطفال پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی۔

لائیبنیز: عقل وجود کے تصور سے در ماندہ اور عاجز:

لائیبنیز [Wilhelm Leibniz, 1646-1716] کہتا ہے عقل، نفسی اثبات کے

حوالے سے دو اصولوں پر مبنی ہے:

[1] اصول تناقض [The Principle of Contradiction]

[2] اصول سبب ملکی [The Principle of Sufficient Reason]

وہ کہتا ہے کہ کوئی بھی تصور درج ذیل احوال سے خالی نہیں ہوگا:

محال: جس کے وقوع کے تصور سے عقلی تناقض واجب ہو۔

ممکن: جس کے وقوع کے تصور سے عقلی تناقض واجب نہ ہو۔

واجب: جس کے عدم وقوع کے تصور سے عقلی تناقض واجب ہو۔

چنانچہ اس کا کہنا ہے کہ اگرچہ عقل وجود کے تصور سے در ماندہ و عاجز ہے، مگر اس سے اس کا عدم وجود لازم نہیں آتا۔ بہت سی حقیقتیں موجود ہونے کے باوجود مکمل تصور میں نہیں آتیں۔ خدا پر تمہارے تصور کا فقدان اس کے وجود کو محال نہیں ہے۔

ہیوم: عقل جذبات کی باندی:

ہیوم [David Hume, 1711-1776] کا کہنا ہے کہ:

Reason is and ought to be the slave of the passions.<sup>1</sup>

1- David Hume, A Treatise of Human Nature, Book II part 3 chapter 3, in the edition by David Fate Norton and Mary J. Norton, Oxford: Oxford University Press 2000, p. 266.

وہ عقل کو جذبات کی باندی مانتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ذہن ایک تھیٹر [theatre] ہے جو ماڈی حقائق کے آمد و رفت کی ایک تماشہ گاہ ہے۔  
شوپن ہاور: ارادہ عقل سے فائق ہے:

معروف قنوطیت پسند [Passimist] فلسفی شوپن ہاور, [Arthur Schopenhauer, 1788-1860] نے ارادے [Will] ہی کو حقیقت مانتے ہوئے عقل پر ترجیح دی ہے کہ زندگی کے لاتعداد اشکال و مظاہر ارادے کے نتائج ہیں۔ وہ جس ارادے [will] پر یقین رکھتا ہے وہ غیر عقلی [irrational] اور اندھا ارادہ [blind will] ہے۔ اس کے مطابق اسی اندھے ارادے کے ماتحت رہ کر عقل سرگرم عمل رہتی ہے۔

کر کیگارڈ: کیا چننا اہم نہیں کیسے چننا اہم ہے:

دوسری طرف وجودیت پسند [Existentialist] فلسفی [S. Kierkegaard, 1813-1855] کہتا ہے کہ ہم اشیا کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کو عقلی بنیادوں پر Justify نہیں کر سکتے بلکہ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم اسے کیسے چنتے ہیں:

It is not important what you choose, but how you choose it. ۱

”یہ اہم نہیں کہ تم کیا چنتے ہو بلکہ اہم یہ ہے کہ تم کیسے چنتے ہو۔“

اسپنسر: صرف مظاہر لائق ادراک ہیں:

اسپنسر [Herbert Spencer, 1820-1903] کہتا ہے کہ حقیقت نہائی، [Ultimate Reality] ایسی شے ہے جس کا ہمیں علم نہیں ہو سکتا، صرف مظاہر کا علم ہو سکتا ہے۔ اسپنسر اپنی کتاب *First Principles* میں دعویٰ کرتا ہے کہ:

Ultimate reality is unknowable, and phenomena alone are knowable. ۲

بالفاظ دیگر ایسے حقائق موجود ہیں جن کے وجود کو ہمارے قویٰ باطنی بہ طور شعور محسوس کرتے ہیں مگر عقل سے ان کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ اسپنسر خدا پر بہ خنثیت ایک حقیقت مطلقہ [ultimate reality] کے پختہ یقین رکھتا ہے، جو تمام اشیا کا سرچشمہ اور ماخذ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم اپنے تجربی حقائق

1- Soren Kierkegaard, *Fear and Trembling*, eds., Stephen Evans and Sylvia Walsh, New York: Cambridge University Press, 2006, Soren Kierkegaard, *Either/or: A Fragment of life [penguin classics]*, New York: Penguin Books 1992, p. 508.

2- Clement C.J. Webb, *A History of Philosophy*, New York: Henry Holt and Company, p. 246.

[empirical facts] اور تجربی شواہد سے اس مقام پر ضرور پہنچ جاتے ہیں کہ خدا ایک غیر مشروط اکائی [uncondition unity being] کے طور پر موجود ہے، تاہم اس کی ذات یا ہستی ہمارے لیے نامعلوم ہی رہتی ہے۔ خدا کا موجود ہونا اس کے معلوم ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ بالفاظ دیگر شے موجود، شے معلوم کے لیے دلیل ملکتی نہیں کہی جاسکتی۔ نامعلوم کی اصل ماہیت اور اس کے مظاہر دونوں جدا جدا چیزیں ہیں۔

اسپنسر کہتا ہے یہ درست ہے کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ خدا موجود ہے۔ مگر اس کے اصل خواص اور اس کی حقیقی قوت ہم پر کھل کر کبھی سامنے نہیں آتی۔

ڈیلٹیھی: فیصلوں میں صرف عقل کی نہیں نفس کے دیگر رجحانات کی عمل داری بھی لازم ہے:

ڈیلٹیھی [Wilhelm Dilthey, 1833-1911] کہتا ہے کہ انسان کسی بھی چیز کے رد یا قبول کا فیصلہ محض عقل کی بنیاد پر نہیں کرتا، بلکہ اس میں اس کے جذبات و احساسات، رجحانات و میلانات اور تاریخ و روایات کا بڑا دخل ہوتا ہے:

Knowledge of mind-constructed world originates from the interaction between lived experience, understanding of other people, the historical comprehension of communities as the subject of historical activity and insight into objective mind.

تفہیم اشیا کی محض عقلی جہت [rational approach] درست نہیں کیوں کہ یہ انسان کو محض عقلیت میں محصور و مجبوس کر دیتی ہے، جس سے اس کی زندگی کے جائز [Legitimate] مگر غیر عقلی [Ir-rational] دائرے ناقص [abnormal] سمجھے جاتے ہیں یا غیر ضروری [Irrelevent] لہذا ایک ایسے اظہار [Interpretation Model] کی ضرورت ہے جو انسان کو ایک خانے [Faculty] میں محدود نہ کرے بلکہ پورے انسان سے بحث کرے۔

برگساں: وجدان کی عقل پر بالادستی:

مشہور ارتقائی فلسفی ہنری برگساں [Henry Bergson, 1859-1941] اپنے تخلیقی تطوّر [creative evolution] میں یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ طبعیاتی کش مکش میں ذہن یا intellect کا ایک عنصر ضرور ہوتا ہے، لیکن برگساں عقل کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے۔ اور ہر شے کی عقلی توجیہات ڈھونڈنے اور سائنسی منہاج علم ہی کو سچائی کا منبع و ماخذ قرار دینے والے جھوٹے رویے کو بے

۱- قاضی قیصر الاسلام، تاریخ فلسفہ مغرب: قدیم یونان سے عہد جدید تک، کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۲ء، جلد ۱، صفحہ ۲۴۷۔

2- W. Dilthey, "The Hermeneutics of the Human Sciences", in *The Hermeneutics Reader: Texts of the German Tradition from the Enlightenment to The Present*, ed., Kurt Muller-Vollmer, New York: Continuum, 1985, pp. 151-152.

نقاب کرتا ہے۔ اس کے مطابق عقل یا ذہانت تو قوت حیات کے تابع رہتی ہے۔ یہ عقل نہیں وجدان ہے جو درست معنوں میں ماورائے بیان اور مافوق العقل تخلیقی قوت ہے۔ انسان کو غیر مادی اور سائنسی سچائی کی تلاش و جستجو میں عقل کی بجائے وجدان پر ایک گونا گونا زیادہ بھروسہ کرنا پڑے گا:

Bergson, in his *Creative Evolution*, tried to show that intellect was just one factor in biological adaptation and evolution and in man's struggle with life and nature. Bergson undermines reason and exposes the pretensions of reason and scientific intelligence as sources of truth. Intelligence was the servant of a life-force. Not reason but intuition can apprehend the world which is an indefinable 'super-rational creative force'. Man should depend on intuition more than on intelligence in his pursuit of scientific and metaphysical truth.<sup>۱</sup>

وٹگنسٹائن: اقدار دنیا کے باہر سے آتی ہیں:

وٹگنسٹائن [Ludwig Wittgenstein, 1889-1951] جو منطقی ایجابیت پسند

[Logical Positivism] فلسفیوں میں سب سے اونچے مقام کا حامل فلسفی ہے، اس کا کہنا ہے:

One major job of the philosopher is just bring words back from their metaphysical flights: to stop and ask whenever on essence is discovered or a word is restricted to one essential meaning, whether in fact we do use words only like that after all. And if we do not so use them ordinarily that is a sign that something has gone wrong.<sup>۲</sup>

وٹگنسٹائن کی کتاب *Tractatus* کے انداز کو ڈاکٹر منظور احمد صاحب "مقدس کتابوں" سے تشبیہ دیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ عقل کے ذریعے *Ontological* حقائق کا ادراک ممکن نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ اقدار دنیا کے باہر سے:

It must lie outside the world.<sup>۳</sup>

- 1- Des Raj Bhandari, *History of European Political Philosophy*, Bangalore: Print. & Pub. Co., 1963, p. 558
- 2- [Wittgenstein MPD, 116] quoted in Gross Barry, *Analytic Philosophy* p. 154.
- 3- Ludwig Wittgenstein, *Tractatus Logico-Philosophicus*, [trans., D. F. Pears and B. F. McGuinness] New York: Routledge Classics, 2001, 6.41., p. 86.

اس کی فکر کا خلاصہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

Wettgenstein asserts of the discovering the ethical life through reason. Metaphysics is unsayable. There was therefore a need to transcend rational discourse. There is no necessity or value in the world. Knowledge is not to be found even in language - there are "language games" which cannot represent universal truth. Wettgenstein gives us self doubt. ۱

جوڈ: عقل جذبات کے تابع مہمل ہے:

جوڈ [Joad, 1891-1953] کہتا ہے کہ عقل، جذبات کے ایسے تابع ہے جیسے کتے کے

پاؤں اس کی ناک [یعنی قوتِ شامہ] کے پیچھے ہوتے ہیں:

Reason is thus represented as the handmaid of instinct and desire, her function being to invent arguments for what we instinctively believe and justifications for what we instinctively want to do, so that a man's thought follows his desires much as the feet of a hungry dog follow his nose. ۲

عقل: اقدار لذتہ سے لاعلم اور عاجز:

عقل، مظاہرات [Phenomena] اور صفات [Attribute] سے تو واقف ہو جاتی ہے لیکن ذات [Nomena] سے واقفیت حاصل کرنے سے معذور ہے۔ وہ اشیا کے فوری [Immediate] اور قریبی [Proximate] مقاصد بیان کر دیتی ہے لیکن اصلی [Intrinsic] اور حقیقی [Ultimate] مقاصد بتانے میں بالکل عاجز ہے، اسے اقدار لغیرہ [Instrumental Values] کا علم تو ہو جاتا ہے لیکن اقدار لذتہ [Intrinsic Values] کا علم نہیں ہوتا۔ وہ یہ تو بتا سکتی ہے کہ بارش کیسے ہوتی ہے؟ زلزلہ کیسے آتا ہے؟ لیکن یہ بتانے سے عاجز ہے کہ زلزلہ کیوں آتا ہے؟ بجلی کی تسخیر کے باوجود عقل اس کی حقیقت کی دریافت سے عاجز ہے۔ ۳

پھر زلزلے اور بارش کے اسباب کی توجیہ و توضیح بھی حتمی نہیں بلکہ ان توجیہات کی اقسام اتنی ہی ہیں جتنی سانپوں کی۔

- 1- Javed Akber Ansari, "Rejecting Freedom and Progress: The Case Against Capitalism" in *Jareeda*, 29, KU: BCC&T, 2004, p.20.
- 2- C.E.M. Joad, *Decadence: A Philosophical Inquiry*, Kessinger Publishing, 2008, p. 36.

۳- سید محمد سلیم، مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ، لاہور: تنظیم اساتذہ، ۱۹۸۹ء، صفحہ ۸۱۔

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۱۶۶

فلسفے اور سائنس کے افکار: کشاکشی اور نبرد آزمائی:

ایک سائنسی مکتب دوسرے کی علمی توجیہ کو علمی حقیقت دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ وہ اس میں کسی قسم کی رواداری [Tolerance] پر راضی نہیں، یہی حال فلسفے کا ہے، اگر عقلیت پرستی [Rationalism] کے مکتب فکر ہی کو دیکھ لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہاں، ڈیکارٹ، اسپینوزا اور لائبیر، تینوں فلاسفہ ذہن انسانی کی عقلی صلاحیت و لیاقت کو حقیقت کے علم کا واحد ماخذ تسلیم کرتے ہیں، کہ عقل انسانی کے درست استعمال کے ذریعے کائنات کی حقیقت معلوم کی جاسکتی ہے، لیکن اس کے باوجود ان تینوں کی عقلی کاوشوں کے نتائج ایک دوسرے سے بالکل متخالف و متضاد ہیں، ڈیکارٹ کی تفتیش کا نتیجہ ثنویت [Dualism] کی صورت میں برآمد ہوا، اسپینوزا کا وحدت پرستی [Pantheism] کی شکل میں، اور لائبیز کا کثرت پرستی [Monadism] کے روپ میں۔ اسی لیے کولن ولسن لکھتا ہے:

There is not a single statement by any philosopher since Descartes that cannot be immediately contradicted by another statement of another philosopher -- or sometime from the same one. ۱

خود ڈاکٹر منظور احمد صاحب کو اقرار ہے کہ:

”جدیدیت کے فلسفے اگرچہ آپس میں اختلاف کا شکار رہے ہیں اور ڈیکارٹ، اسپینوزا، ہیگل، مارکس اور فرائڈ جدیدیت کا ایک خاص نقطہ نظر رکھتے ہیں، لیکن کسی خاص دوسرے نقطہ نظر کی صحت کے امکان کو خارج از قیاس قرار دیتے ہیں“۔ ۲

غرض فلسفے اور سائنس کی تاریخ ہی رد و قبول کی کش مکش اور نبرد آزمائی سے عبارت ہے۔ اس کے باوجود جدیدیت پسند، سائنس دانوں اور فلسفیوں کی ایک دوسرے کی توجیہات کے عدم اتفاق [Disagreement] کو تنوع [Diversity] سے تعبیر کرتے ہیں اور مذاہب کے درمیان ہونے والے Intra-Religious یا Inter-Religious اختلاف آرا کو فرقہ بازی [Sectarianism] کا نام دیتے ہیں۔ یہ صراحتاً علمی بددیانتی اور مذہب دشمنی ہے۔

آئن سٹائن: استدلالی علوم کی غیر استدلالی بنیادیں:

فلسفہ اور سائنس بہت سی مابعد الطبیعیات [Metaphysics] و ایمانیات [Dogmas] پر مشتمل ہے۔ آئن سٹائن کا کہنا ہے کہ سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ ”کیا ہے“۔ کیا ہونا چاہیے وہ نہیں بتا سکتی۔ اسی طرح جن علوم کو ہم استدلالی کہتے ہیں ان کی بنیاد بھی غیر استدلالی ہوتی ہے۔ مثلاً ریاضی کے بنیادی اصول۔ آئن سٹائن کا کہنا ہے:

1- Colin Wilson, *Beyond the Outsider: The Philosophy of the Future*, Houghton Mifflin, 1995, p. 67.

۲- منظور احمد، ”روایت، جدیدیت اور لسانیات“، مشمولہ ماہ نامہ صریح، صفحہ ۲۱۔

As far as the law of mathematics refer to reality, they are not certain; and as far as they are certain, they do not refer to reality.<sup>1</sup>

جدیدیت: نقل سے زیادہ نقلی و تقلیدی دائرہ علم ہے:

کیا جدیدیت خود علمیت کا نقلی دائرہ نہیں، جس میں مختلف فلسفیوں کے آرا و افکار اور نظریات واقوال کی روشنی میں نتائج کا استخراج کیا جاتا ہے؟ مشہور مغربی فلسفی اور ریاضی داں وائٹ ہیڈ [A.N. Whitehead, 1861-1947] کا یہ قول کس علم دوست کو معلوم نہیں:

The Safest general characterization of the European philosophical tradition is that it consists of a series of foot notes to Plato.<sup>2</sup>

گو کہ ڈاکٹر صاحب اس مقولے کے قائل نہیں، لیکن بات صرف وائٹ ہیڈ کی نہیں دیگر مغربی مفکرین اور فلاسفہ بھی اسی موقف کے حامی ہیں۔ نیطشے کے مطابق اگرچہ فلاطونی عیسوی اقدار اب اپنا اثر و تحرک کھو چکی ہیں لیکن جدیدیت اپنے جوہر میں کوئی نئی معاشرتی تبدیلی نہیں ہے بلکہ جدیدیت خود ماضی کے افکار و نظریات ہی کا تسلسل ہے، اور نہ ہی جدیدیت کوئی ہمیشہ قائم رہنے والی شے ہے۔ نیطشے دعویٰ کرتا ہے کہ جدیدیت اور اس کے تمام عناصر ترکیبی یا ادارے مثلاً جدید سائنس، جوعلت و معلول سے عبارت ہے، لبرل جمہوری سیاست، رومانویت، انسان پرستی اور آزاد فکر اشتراکیت سب کی سب اپنی اصل میں فلاطونیت اور عیسائیت ہی سے ماخوذ و مستعار ہیں، رابرٹ پین لکھتا ہے:

According to Nietzsche, all the major institutions of modernity -- modern science, with its reliance on causal, deterministic explanation, liberal-democratic politics, romanticism, humanism, "free thinking," socialism -- should be interpreted as essentially Christian, or as expressing the kind of psychological and moral interests promoted by Christianity.<sup>3</sup>

- 1- William P. Berlinghoff and Fernando Quadros Gouvea, *Math Through the Ages: A Gentle History of Teachers and Others*, Oxton House Publishers and Mathematical Association of America, 2004, p. 63 — Wesley J. Wildman and W. Mark Richardson, *Religion and Science: History, Method, Dialogue*, UK: Routledge, 1996, p.123.
- 2- Alfred North Whitehead, "Process and Reality", [eds., David Ray Griffin and Donald W. Sherburne], Free Press, 1979, p. 39.
- 3- Robert B. Pippin, *Modernism as a Philosophical Problem: On the Dissatisfactions of European High Culture*, UK: Blackwell Publishers, 1999, p.79.



اسی لیے ہائیڈر جدیدیت کو بے ثبات اور بے بنیاد قرار دیتے ہوئے کامل بے معنویت [consummate meaninglessness] کا دور قرار دیتا ہے۔<sup>۱</sup>

علوم میں اختصاص فی الاصل علوم کی خانوں میں تقسیم اور محدودیت ہے:

کیا [Compartmentalization of Knowledge] علم کی خانوں میں تقسیم نے آدمی کو جہالت پر قانع کرتے ہوئے منحصر بر غیر نہیں کر دیا؟ کیا آج کا آدمی [Modern Man] اپنی دسترس سے باہر دیگر علوم کو محض ایمانی سطح پر قبول نہیں کرتا؟ مثلاً ڈاکٹر منظور احمد صاحب اگر بیمار ہو جاتے ہیں تو اپنے معالجے کے لیے طبیب کی تجاویز پر انحصار و ایمان محض کے سوا ان کے پاس اور کوئی چارہ ہے؟ ان سوالات و اشکالات کے جوابات اور تصفیے کے بغیر انسان یا مذہب کو محض عقلیت کے اندر محصور کر دینا عقل اور اس کے مقام سے عدم واقفیت کا ثبوت ہے اور اس پر مشرق و مغرب میں ہونے والے علمی مباحث سے بے خبری کی دلیل۔

مابعد الطبیعیاتی حقائق کے رد و قبول کی شرائط طبعیاتی مسائل کے مماثل: منظور احمد:

ڈاکٹر منظور احمد کا یہ بیان پڑھ کر تو آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ اتنی اٹھلی اور بے مغز بات انھوں نے کیسے لکھ دی؟ ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”مابعد الطبیعیاتی مسائل حقیقت میں طبعیاتی مسائل سے علیحدہ کوئی دوسرا نوعی وجود نہیں رکھتے۔ ان کی یقینی اور بے یقینی کی شرائط بجنسہ وہی ہیں جو طبعی علوم کی یقینی اور بے یقینی کی ہیں..... اسی طرح مذہبی وجدان بھی یقیناً میرے دوسرے وجدانوں سے مختلف نہیں، بلکہ میرے دوسرے تجربات کی طرح ایک تجربہ اور میرے دوسرے اختبارات کی طرح ایک اختیار ہے۔“<sup>۲</sup>

مذہب پر جدیدیت پسند سفرات کی گفتگو عموماً تین نکات کے گرد گھومتی ہے:

[۱] مذہب، عقلی [Rational] نہیں ہوتا، یعنی نقل، عقل سے معزاً ہے۔

[۲] مذہب کا ذریعہ علم وجدان [Intuition] ہے، گویا مذہبی حقائق کا ادراک ایک

صوفیانہ واردات ہے جس کا تجربہ ہر اس شخص کو ہو سکتا ہے جو خود کو محض صوفی سمجھے۔

[۳] وجدان پر اٹھنے والے علمی اعتراضات کا اطلاق وحی [Revelation] سے ثابت

شدہ مذہبی علیت پر کر دیا جاتا ہے۔

1- Robert B. Pippin, *Modernism as a Philosophical Problem*, p. 135.

۲- منظور احمد، ”ثبات، تغیر اور نشاۃ ثانیہ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحات ۲۰۳-۲۰۵۔

مذہب وجدانی نہیں ہوتا۔ وحی سے ثابت شدہ غایات اور وجدان کے ذریعے حاصل ہونے والے تجربے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وحی [Revelation] ایک ایسا ذریعہ علم ہے جس میں کلتیت اور قطعیت پائی جاتی ہے۔ نبی کی ذات مہبط وحی ہے جس میں خدا اور اس کے نبی کے درمیان نوع انسانی کی عملی ہدایت کے لیے رابطہ فرشتے کے وسیلے سے انجام پاتا ہے، اور اس کے ذریعے وہ علم حاصل ہوتا ہے جو انسان اپنی ذاتی استعداد سے نہیں جان سکتا، جیسا کہ ارشاد فرمایا:

وَيَعْلَمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ [۱۵۱:۲]

”اور تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے، جو تم نہیں جانتے تھے۔“

صاحب نبوت کو وحی کی صحت و قطعیت پر اس شدت اور فور سے یقین حاصل ہوتا ہے جو ہر معیار کی احتیاج سے بالا ہے، خود نبی کی بات تو رہی ایک طرف، وہ اس یقین کامل کو اپنے اصحاب و احباب میں بھی اس درجے بیدار کرتا ہے کہ وہ بھی نبی کے بیان فرمودہ عقائد و احکام پر یقین کے لیے ہر طرح کے عقلی و عملی ثبوت سے ماورا ہو جاتے ہیں — وجدان ایک باطنی کیفیت کا نام ہے جو ادراکات حسی ہی کے اصول پر منکشف ہوتا ہے اور ماورائی حقائق کے علم کا ذریعہ نہیں، سب سے بڑھ کر وجدان ظن و احتمال خطا کے امکان سے ہرگز مبرا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہ اعتبار نوعیت و کیفیت وجدان فکر سے مختلف نہیں۔ حضرت امام غزالی [م ۵۰۵ھ] اور برگسٹن [Henri Bergson, 1899-1941] دونوں کے مطابق وجدان بہ اعتبار نوعیت عقل سے مختلف نہیں بلکہ عقل ہی کی کمال یافتہ صورت ہے جو شعور کی غیر ارادی سطح پر کار فرما ہوتی ہے۔

وجدان یعنی ”اعماقِ نفس میں پایا جانے والا شعور“ موضوعی معاملہ [subjective matter] ہے۔ جب کہ وحی ایک معروضی [objective] حقیقت ہے۔ موضوعیت کو معروضیت کے برابر لانے کا مطلب ہے: ”موضوع ہی معروض ہے اور معروض ہی موضوع“ فی الاصل حقیقت کچھ نہیں یہ مجھ پر منکشف ہونے والی محض ایک کیفیت یا واردات کا نام ہے جس میں خطا بھی ہو سکتی۔ یہ فکر حد درجے کج اور گم راہ کن ہے جس نے وحی اور شریعت محمدی کو عام انسانی تجربات کے مثل ایک تجربہ قرار دے کر اس کے رد و قبول کا اختیار عقل استقرائی کو سونپ دیا، اور وحی کو مابعد الطبیعی جہت سے کاٹ کر عقل کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ دوسری طرف یہ فلروچی میں بھی خطا کا امکان مضمحل سمجھتی ہے۔ یہ تمام گم راہ کن امکانات وحی کو صوفیانہ واردات پر قیاس کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

منظور احمد: مذہبی وجدان اور مذہبی تجربہ نو عادیگر وجدانات اور اختبارات کے مماثل:

دوسری بات ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے یہ ارشاد فرمائی: ”مذہبی وجدان بھی.... میرے دوسرے نوع کے تجربات کی طرح ایک تجربہ اور میرے دوسرے اختبارات کی طرح ایک اختبار ہے۔“

خدا اور معاد جیسے مذہبی حقائق کو ”اختباری تجربہ“ قرار دینا، اختبارات کے اصول و مبادی اور

تعریف و اساس سے ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے۔ مابعد الطبعی حقائق حواس انسانی کے دائرہ ادراک سے ماورا ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کا حسی تجربہ و مشاہدہ ممکن نہیں۔ جب کہ اختباری تجربہ محسوس کے مشاہدے سے عبارت ہے جو لازماً زمان و مکاں کی حد بندیوں میں محصور ہوتا ہے۔ اب اگر مابعد الطبعی حقائق کا تجربہ اختباری ہے تو وہ ماورائے زمان و مکاں نہیں ہو سکتا، اور اگر ماورائے زمان و مکاں ہے تو پھر اسے اختباری قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ڈاکٹر منظور احمد لکھتے ہیں:

”ہم میں سے ہر شخص اپنے اعماقِ نفس میں ایک ایسا شعور پاتا ہے جو تمام مذہبی حقائق کی بنیاد بنتا ہے اور شعور کے یہی امکانات زمان و مکاں کی حد بندی سے نکل کر ہم کو اس حقیقت کا پتہ دیتے ہیں جس پر مذہب کی بنیاد قائم ہے۔“

عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب مذہبی حقائق کو اختباری تجربہ قرار دینے کے باوجود ”ماورائے زمان و مکاں“ بھی مان رہے ہیں۔ ایک مقام پر علامہ اقبال پر [جنہوں نے مذہبی تجربے میں وقوف کے عنصر کی بنا پر اسے اختباری قرار دیا تھا] نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مذہبی تجربہ اختباری نہیں ہوتا:

”مذہبی تجربہ اس قبیل کا تجربہ نہیں ہے، اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ تجربہ بنیادی طور پر حسی اور اختباری تجربہ بن جاتا اور مذہبی حقائق حسی اور اختباری حقائق کا درجہ پاتے اور علوم حسی اور مذہب میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔ یہ بات صحیح نہیں ہے جیسا کہ اقبال کا منشا معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی تجربے میں احساس کا نتیجہ زیادہ ہوتا ہے اور حسی تجربے میں وقوف کا، اور یہ کہ دونوں تجربات میں نوعیت کا نہیں بلکہ درجات کا فرق ہے۔“

عہد حاضر کے جدید ذہن کے لیے اسلام کی عقلی تفہیم کے شوق میں ڈاکٹر صاحب ایسے متضاد و متناقض موقف اختیار فرما رہے ہیں، جسے عہد جدید کا ترقی یافتہ، ”خوگر پیکر محسوس“ انسان، کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ اول تو منظور احمد صاحب کے ہاں مذہبی وجدان یا تجربے کا اختباری یا غیر اختباری ہونا اور نوعاً حسی تجربے سے مختلف ہونا یا نہ ہونا تضادات و تناقضات کے باعث طے شدہ نہیں ہے۔ دوسرے وہ مذہبی تجربے میں وقوف کے عنصر کو داخل نہیں سمجھتے کہ اگر ان تجربات میں وقوف کا عنصر شامل ہوتا تو ان کی توثیق ممکن ہوتی۔ ان کے مطابق مذہبی تجربات میں وقوف کا عنصر داخل سمجھنے سے تجربے کے معروض کا حقیقی وجود ثابت نہیں ہوتا، اس لیے کہ:

”ان کا سبب امر واقعہ میں اس طرح موجود نہیں ہوتا جس طرح وقوفی حسی تجربوں کا ہوتا ہے۔“

ظاہر ہے ایسی صورت حال میں اسے خدا، ملائکہ، مقامات معاد، وحی جیسے مابعد الطبعی حقائق کی بنیاد

۱- منظور احمد، ”ثبات، تغیر اور نشاۃ ثانیہ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۲۰۹۔

۲- منظور احمد، ”اقبال کا فلسفہ مذہب“، مشمولہ اقبال شناسی، صفحہ ۹۰۔

۳- ایضاً، صفحہ ۹۲۔

قراردے کر عہد حاضر کے ترقی یافتہ انسانی ذہن کے لیے قابلِ فہم اور لائق قبول بنانے کی بات کرنا، موجودہ انسانی فہم، اس کی نفسیات اور ان مذہبی معتقدات و حقائق کی اصل سے ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے۔

طبیعیات کی مابعد الطبیعی بنیادیں: حقیقت اب صرف محسوس میں منحصر نہیں:

عقل کا گھوڑا تو مدت ہوئی مرچکا۔ اٹھارویں صدی تک بعض فلسفیوں کے ہاں عقل کی یہ حیثیت تسلیم کی جاتی تھی کہ وہ مجرد عمل کے بل پر بھی حقیقت کو پاسکتی ہے۔ انیسویں صدی میں Rationalism کی صرف اصطلاح باقی رہ گئی اور زور اس پر ہو گیا کہ حقیقت صرف تجربے اور مشاہدے ہی سے ممکن ہے۔ اس ذہنی رویے نے Scientism کی بنیاد رکھی۔

انیسویں صدی کی طبیعیات ٹھیٹھ مادیت پر مبنی تھی، جس کے زیر اثر کچھ عرصے پہلے تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ اصل حقیقت مادہ ہے اور مادہ نام تھا، اُس چیز کا جو مشہود فی الخارج اور موجود فی المكان ہو، یعنی ایک ایسی سخت، بسیط اور بدیہی شے جسے دیکھنا اور چھونا ممکن ہو۔ چنانچہ اس تصور کے تحت حقیقی کہلانے کی مستحق صرف وہی اشیا ہو سکتی تھیں جو مرئی بھی ہوں اور قابلِ لمس بھی۔ لیکن آج اس تمام طرزِ فکر کی بنیاد کا کہیں پتا نہیں چلتا۔ مادہ اب مذکورہ خصوصیات کا حامل نہیں رہا، بلکہ اب تو اسے خلائے مکانی کے واقعات کا مجرد ریاضیاتی اتصاف [Abstract Mathematical Characterization] خیال کیا جاتا ہے، یا برقی سیال کا ایک معجون مرکب، یا پھر اسے احتمال کی ایسی لہروں [Waves of Probability] سے تعبیر کیا جاتا ہے جو عدم کے اندر سرگرداں ہوں۔ اندریں حالات یہ کہنا غلط نہیں کہ آج کل مادہ ایک ایسی پراسرار، گریزاں اور ناقابلِ گرفت شے کا نام ہے جو کسی مادی نظریہ کائنات کے لیے کوئی معقول بنیاد فراہم نہیں کر سکتی۔ چنانچہ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ آج کل کا مادہ تو اس بلی کی ہنسی کے مانند ہے جو رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو کر اپنے پیچھے صرف اپنی ہنسی چھوڑ گئی ہو۔

علاوہ ازیں اب تو سائنس کی دنیا میں یہ بھی باور کیا جانے لگا ہے کہ مادے [اگر وہ کہیں موجود ہے تو] کی اصل ایک غیر مادی یا روحانی دنیا سے متعلق ہے۔ پروفیسر ایڈنگٹن اس دنیا کو غیب کی دنیا [Unseen World] کہتا ہے، اور سی ایم جوڈ [C.M. Jode] کا کہنا ہے کہ متعدد ماہرینِ طبیعیات کی تحقیقات کے مطابق اس عالم کے پیچھے، جس کا مطالعہ طبیعیات کرتی ہے، ایک اور دنیا موجود ہے۔ یہ دوسری دنیا ایک ذہنی یا روحانی وحدت [Mental or Spiritual Unity] ہے جس کے بارے میں کہا یہ جاتا ہے کہ مادہ اسی وحدت کا ایک ظاہری پیکر ہے۔ چنانچہ سائنس داں اب اس امر کا اعتراف کرنے لگے ہیں کہ وہ عالم جس کا مطالعہ سائنس کرتی ہے، حقیقی عالم نہیں۔ تو پھر سوال یہ

ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب سر جیمس جینز کے نزدیک یہ ہے کہ اصل حقیقت ایک بڑے ریاضی داں کا ذہن ہے، جب کہ پروفیسر ایڈنگٹن بھی اسے ایک ہمہ گیر اور عالم گیر وجود ذہنی سے تعبیر کرتے ہیں اور برگساں کے نزدیک اصل حقیقت عبارت ہے جوشش حیات کے ایک بہتے ہوئے دریا [Elan Vital] سے۔ سواگر حقیقت یہی کچھ ہے تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہے کہ مادی اشیا کا وہ عالم جو ہمیں اپنی ظاہری آنکھوں سے نظر آتا ہے اور جسے ہم کل تک حقیقی سمجھنے کے عادی تھے، اب حقیقی نہیں رہا۔ چنانچہ پروفیسر ایڈنگٹن اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ سائنس کو اب اس پر کوئی اصرار نہیں رہا کہ حقیقت صرف اور صرف محسوسیت سے عبارت ہے اور سی ایم جوڈ [C.M. Jode] سر جیمس جینز کے حوالے سے کہتے ہیں کہ انھوں نے طبیعیات کے عام پیرایہ و حدود کا نقشہ کھینچتے ہوئے طبیعیات داں کے علم موجودات کو افلاطون کے ان زنجیر بستہ قیدیوں کے علم کے مماثل قرار دیا ہے جو اس کے غار کی تمثیل میں صرف اپنے سامنے دیوار پر منعکس ہونے والے سایوں ہی کو دیکھ سکتے ہیں اور اپنے پیچھے مڑ کر حقیقی اشیا کو نہ دیکھ سکنے کی وجہ سے اصل حقیقت سے ہمیشہ بے خبر رہتے ہیں۔ گویا سر جیمس جینز کے نزدیک افلاطون کے غار کے قیدیوں کے علم کی طرح ہمارے طبیعیات داں کا علم موجودات بھی دراصل سایوں اور پرچھائیوں ہی کا علم ہے اور ہم گویا سایوں اور پرچھائیوں کی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ چنانچہ اس تمام تر گفتگو کی رو سے تو مادہ اور مادی اشیا کا یہ عالم محسوس و مشہود سرتاسر فریب نظر ہی نکلا اور سائنس نے خود ہی ثابت کر دکھایا کہ اشیا عالم جیسی کہ ہمیں نظر آتی ہیں، اصلاً ویسی نہیں۔<sup>۱</sup>

مابعد جدیدیت: جدیدیت اور عقلیت کے تمام دعوؤں کا انہدام:

اب تو پانی سر سے اوپر ہو چکا ہے۔ مابعد جدیدیت [Post Modernism] نے جدیدیت کی پیش کردہ تمام آفاقی سچائیوں کو فریب قرار دے کر فکری میدان میں دلائل سے جدیدیت کی عمارت ہی ڈھادی ہے، اگرچہ جدیدیت کے قائم کردہ ادارے اپنی جگہ برقرار رہے، لیکن ان سب کی افادیت مشکوک ہو گئی۔ یہاں تک کہ مابعد جدیدی مفکرین سائنس کو بھی حتمی سچائی کی حیثیت سے قبول نہیں کرتے، لیونٹارڈ [J.F. Lyotard, 1924-1998] کہتا ہے:

The point is that there is a strict interlinkage between the kind of language called science and the kind called ethics and politics: they both stem from the same perspective.<sup>۲</sup>

۱- جمال پانی پتی، اختلاف کے پہلو، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۲ء، صفحات ۹۸-۱۰۰۔

2- J.F. Lyotard, *The Postmodern Condition: A Report on Knowledge*, trans., Geoff B Bennington and Brian Massumi, Minnesota: University of Minnesota Press, 1984. p. 8.

سائنس کی زبان اور اخلاقیات اور سیاسیات کی زبان میں گہرا تعلق ہے اور یہ تعلق ہی مغرب کے تہذیبی تناظر کی تشکیل کرتا ہے — یعنی سائنس بھی مغرب کی سیاست اور اخلاقی فلسفوں سے آزاد نہیں ہے۔  
 مابعد جدیدیت: سچائی اور حقیقت محض ایک التباس:

مابعد جدیدیوں کے نزدیک کسی بھی آفاقی سچائی کا تصور محض خیالی [Utopia] ہے۔ کیوں کہ سچائی محض ہمارے مشاہدے کا نتیجہ ہوتی ہے اور مشاہدہ ذہن کی تخلیق ہے۔ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں اس کی حیثیت سچائی کی نہیں، بلکہ ہم وہی دیکھتے ہیں جو دیکھنا چاہتے ہیں۔ یا جو مخصوص احوال و ظروف ہمیں دکھاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ذہن فی الحقیقت سچائی کی تلاش نہیں کرتا بلکہ اسے تخلیق کرتا ہے۔ ہر ذہن کی سچائی کی تشکیل و ترتیب، احوال و ظروف اور پسند و ناپسند کے بدل جانے سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ چوں کہ بہ یک وقت متضاد و متنوع سچائیوں کی تخلیق ممکن ہے لہذا اس کی کوئی تعبیر و ترتیب حتمی نہیں۔ مابعد جدیدی مفکرین کے نزدیک دنیا حقیقی، ٹھوس اور مظاہر کی بجائے ایسے عکسوں [images] اور مظاہر [representation] سے عبارت ہے جو غیر حقیقی [unreal] اور غیر محسوس [Intangible] ہے۔ بالفاظ دیگر دنیا محض ایک ویڈیو گیم ہے، جس میں ہم اپنی پسند کی سچائیاں دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ ضیا الدین سردار اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

This mean that the world has been transformed into a theater where everything is artificially constructed. Politics is a stage managed for mass consumption. Television documentaries are transformed and presented as entertainment. Journalism blurs the distinction between fact and fiction. Living individuals become character in soap operas and functional characters assume real lives. Everything happens instantaneously and every body gets a live feed on everything that is happening in the global theater.<sup>2</sup>

گویا سچائی، اقدار، اذواق اور عقلیت وغیرہ سب اضافی ہیں۔ ان کے پسند و ناپسند کا تعلق انفرادی پسند و ناپسند اور حالات سے ہے۔ ایک ہی بات ایک حال و مقام میں سچ ہو سکتی ہے اور دوسرے میں جھوٹ۔ مابعد جدیدی فکر کا نمائندہ لیوٹارڈ [J.F. Lyotard] کہتا ہے:

۱- منظور احمد کا ارشاد کہ: ”حقیقت وہ ہے جو ہمارے اوپر منکشف ہوتی ہے“ اسی بات کی غمازی کرتا ہے کہ ”حقیقت“ کوئی معروضی شے نہیں بلکہ بہ یک وقت ہزاروں حقیقتیں ہو سکتی ہیں۔ یہ جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک ہی کا ارتقائی سفر ہے۔  
 2- Ziauddin Sardar, Postmodernism and the Other: the New Imperialism of Western Culture, London: Pluto Press, 1998, p.23.

I define postmodernism as incredulity towards meganarratives.<sup>1</sup>

مابعد جدیدی تمام دعاوی اور سچائیوں کو مہا بیانیوں [Meganarratives] سے تعبیر کرتے ہیں، جن کی حیثیت ان کے نزدیک داستانوں اور کہانیوں کی سی ہے۔ ان کے نزدیک زندگی صرف جذبات و احساسات اور Pragmatic Issues سے عبارت ہے۔ حقیقت کا سوال ہی بے معنی ہے، مطمع نظر ”مسئلہ“ اور ”حل“ ہے، نئے افکار و نظریات، نہ اصول و آدرش۔ اسی لیے بعض مفکرین اسے ”Age of No Ideology“ قرار دیتے ہیں۔ اس فکر میں سیکولر ازم [Secularism] بھی ایک ”دین“ ہے سو مابعد جدیدی انسان اسے بھی قبول کرنے کو تیار نہیں، اسی لیے اسے لا دینیت کے خاتمے کا عہد [Age of De Secularization] بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں باہم متضاد و متخالف نظریات بہ یک وقت درست سمجھے جاتے ہیں۔ ایک شخص جو خدا، معاد، وحی جیسے مابعد الطبعی امور پر یقین نہیں رکھتا روحانی سکون کے لیے کسی مذہبی پیشوا سے رجوع کر سکتا ہے، کبھی وہ اس سکون کے لیے سنیا سی یا جوگی کے پاس جاسکتا ہے، تو کبھی عیسائی راہب کے پاس۔ غرض نظریات و افکار سے لے کر طرز زندگی تک کسی مبنیوٹ نظام [Doctrine] کسی شخص یا طبقے کو کسی رویے، عقیدے و نظریے کو رد یا ناپسند کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، مثلاً شادی، مرد و عورت کے درمیان بھی ہو سکتی ہے، مرد و مرد کے درمیان بھی اور عورت و عورت کے درمیان بھی، بلکہ آدمی خود اپنے آپ سے بھی شادی کر سکتا ہے، لباس جیسا چاہے پہنے اور اگر کوئی بالکل برہنہ رہنے میں خوشی محسوس کرتا ہے تو اسے حق ہے کہ وہ عریاں رہے۔ وحدت ادیان کا نظریہ اگرچہ قدیم ہے مگر اسی وجہ سے مابعد جدیدیت [Postmodernism] نے اسے تقویت بخشی ہے کیوں کہ ہر چیز کے رد و قبول کا معیار انفرادی پسند و ناپسند پر ہے، اگر ایک طرف تمام مذاہب سچے ہیں تو دوسری طرف مذہب پر یقین نہ رکھنا بھی غلط نہیں ہے۔ کوئی چیز حتمی، مطلق اور اٹل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ مابعد جدیدی مفکرین قوموں کے وجود اور قوم پرستی، قومی فرائض، قومی کردار، قومی تفاخر کے بھی مخالف ہیں، پالیسی کی سطح پر محض سائنسی ترقی اور ٹیکنالوجی کے جبر کو ماننے کے لیے تیار نہیں، انہوں نے دیہی زندگی اور روایتی معاشروں کی افادیت اجاگر کی۔ ان کے نزدیک ہر شخص کو اپنی من چاہی زندگی بسر کرنی چاہیے، تعلیم، سائنس و ٹیکنالوجی اور تعیشات و آسائش کوئی چیز اس پر مسلط نہیں کرنی چاہیے، آرٹ اور فنون لطیفہ میں وہ ہر طرح کے نظم اور پابندی کے خلاف ہیں۔ بہ قول گوپی چند نارنگ: ”ہر طرح کی نظریاتی اذعانیت سے گریز اور تخلیقی آزادی پر اصرار مابعد جدیدیت ہے۔“<sup>2</sup>

1- J.F. Lyotard, *The Postmodern Condition*, p.xxiv.

2- Peter L. Berger, *The Desecularization of the World, Roourgent Religion and World Politics*, Michigan:William B Eerdman's Publishing co., 1999.

۳- گوپی چند نارنگ، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۲ء، صفحہ ۵۳۔

اہل ایمان عقل کی نارسائی سے آگاہ ہیں:

اب جب کہ صورت حال یہاں تک پہنچ چکی ہے ایسے میں ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا یہ کہنا کہ مذہبی عقائد کی عقلی تعبیر کے بغیر مذہب کو ہر ایک کے لیے واجب القبول نہیں بنایا جاسکتا، فرسودہ اور ازکار رفتہ لگتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو دینی طور پر ایک نظام استناد سے وابستہ ہیں، انھیں فرمان خداوندی، ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے متواتر عقائد و اعمال کی تفہیم و تعبیر کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ وہ God procentic apporach کے حامل ہیں۔

احاطے اور کمال سے معر اعلم: عقل و مظاہر کا بنیادی نقص:

اہل ایمان جانتے ہیں کہ عقل اور مظاہر کی نسبت سے حاصل ہونے والا علم اپنی ساخت میں نامکمل ہوتا ہے، اُس کی کارکردگی اور پیش قدمی کبھی نہ زائل ہونے والے یقین کے حصول کے لیے ناکافی ہوتی ہے، جس کے باعث اُس علم کا معلوم بھی وجودی کمال و استقلال سے عاری ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عقل کی فعلیت کا رخ اور پیش قدمی کا ہدف زمان و مکان سے مشروط ہے، جب کہ مابعد الطبیعی حقائق خصوصاً ذات حق، حرکت و جہت اور تغیر وحد سے ماوراء ہے، بلکہ ان امور و اوصاف کی نسبت بھی کمال ذاتی کے منافی ہے۔ لازمانیت و مکانیت اُس کا خاصہ [property] ہے، جب کہ زمان و مکان کی حد بندی عقل کی مجبوری اور اُس کی جولان گاہ ہے۔ اسی لیے موجود کا دائرہ ہمیشہ معلوم سے بڑا ہوتا ہے، موجود کو مکمل معلوم بنادینا محال ہے اور کسی شے کا نامعلوم ہونا اُس کے غیر موجود ہونے کو مستلزم نہیں ہے۔ انسانی علم اپنی ماہیت میں احاطے کے اقتضا کی تکمیل سے خلقت عاری ہے۔ عقل محض آگہ علم ہے، جو کسی بھی دیے گئے [given] ہدف [end] کو بہترین موجود ذریعے [mean] کے واسطے سے حصول کا موثر [efficient] طریقہ بتلاتی ہے۔ اس کا ہدف شے کا وجود نہیں بلکہ اُس کی معلومیت ہے، جس کے لیے زمان و مکان کا جبرنا گزیر ہے اور حرکت و تغیر اور جہت و حدود، زمانیت و مکانیت کا خاصہ ہیں۔ اسی لیے انسانی علم [عقل] خود اپنے اندر مطلق، مستقل، دائمی اور اٹل ہونے کی کوئی تمنا اور ایک حالت پر قانع رہنے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا اس کے تجربات و مشاہدات ہر دم حرکت و تغیر کا شکار ہو کر اس کی محدودیت، نقص اور عدم تکمیل کا اظہار و اعلان کر رہے ہیں۔ اسی لیے فکر کی دینی روایت میں عقل کا کردار غیر محدود ہے نہ فیصلہ کن۔

عقل کی خوئے جستجو سے یقین سے محروم رکھتی ہے:

عقل خود اپنے مطالبات و مقاصد کی تکمیل و تعیین سے عاری ہے، عقل، جس کی سب سے بڑی تمنا حصول یقین ہے، اُس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ خود ہے، کیوں کہ اُس کی خوئے جستجو کسی مرحلے پر بھی اسے تلاش و جستجو سے دست بردار نہیں ہونے دیتی، یہی سبب ہے کہ عقل کے ذریعے حاصل ہونے والا علم قطعیت سے بھی خالی ہوتا ہے اور یقین سے بھی۔ جب کہ دینی فکر کی ہر قسم اور جہت ”غیب“



کے حقیقی اور مطلق ہونے پر قائم ہے، جہاں حقیقت بر بنائے معلومیت واجب الاثبات نہیں بلکہ بر بنائے موجودیت ممکن الاستدلال ہے۔ اس کا بنیادی محتوا [content] نظری و فکری نہیں بلکہ ورائے عقلی و فوق تجربی ہے۔ منتہائے علم ایک موجب یقین اثبات سے آگے کچھ نہیں، جس کے تحقق میں عقل تنہا کفایت نہیں کرتی بلکہ شعور کی دیگر اقسام ایک ہیئت وحدانی میں ڈھل کر مقصود کے حصول کو ممکن بناتی ہیں۔ مثال کے طور پر حُسن کی دریافت میں ذوق ایسا ہی ضروری ہے جیسی عقل — وجود کے لازمانی و لامکانی مراتب کو عقل مان تو سکتی ہے لیکن دیکھ کر سوچ کر نہیں، صرف سُن کر۔ ان کے ساتھ عقل کی نسبت حصول اور نظر کی نہیں بلکہ قبول اور خبر کی ہوتی ہے۔<sup>۱</sup>

وجود کے لازمانی و مکانی مراتب کا اثبات بہ ذریعہ تعقل قلبی:

عقل کو یہ درجہ سماعت اور معرفت حق کی خبر جس واسطے سے میسر آتی ہے، وہ قلب ہے۔ قلب ماورائے علم وجود کو واجب الاثبات اور ممکن الاستدلال بنا دیتا ہے۔ قلب کے لیے مدار اثبات علم نہیں ایمان ہے۔ اس کا موضوع حقیقت، محتوی الغیب اور فعل جمال حق کا مشاہدہ ہے۔ اسی کے باعث غیب و شہود مربوط ہو کر مورد یقین بن جاتے ہیں، جس سے معرفت حق کی تکمیل ہوتی ہے اور شعور کے داعیہ یقین کو تسکین ملتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے: يَهْدِي قَلْبَهُ [التغابن: ۱۱] ”اللہ اُس کے دل کو ہدایت دیتا ہے“۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الا وان في الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد كله واذا فسدت فسد الجسد كله الا وهي القلب.<sup>۲</sup>

”آگاہ ہو جاؤ! جسم میں ایک ایسا ٹکڑا ہے، اگر وہ ٹھیک ہو جائے تو سارا جسم ٹھیک ہو جاتا ہے اور اگر اُس میں فساد آجائے تو سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے، اور وہ قلب ہے۔“

۱- اس شخص بحث کے تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے: ابو حامد محمد الغزالی، المنقذ من الضلال، مصر: مكتبة الأنجلو المصرية، ۱۹۶۲ء - محی الدین ابن عربی، الفتوحات مکیة، بیروت دار الکتب العلمیة، ۱۳۲۰ھ/۱۹۹۹ء - شیخ احمد سرہندی، مکتوبات امام ربانی، کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی، ۱۹۷۷ء - فاطمہ اسمعیل محمد اسمعیل، القرآن والنظر العقلي، امریکا: المعهد العالمی للفکر الاسلامی، ۱۳۱۳ھ/۱۹۹۳ء۔

Hossein Nasr, "Epistemological Questions: Relations among Intellect, Reason, and Intuition within Diverse Islamic Intellectual Perspectives", in *Islamic Philosophy from its Origin to the Present: Philosophy in the Land of Prophecy*, USA: State University Press of New York Press, 2006, pp. 93-103.

سید حسین نصر، ”عقل اور وجدان“ [ترجمہ: احمد جاوید]، مشمولہ اقبالیات ۲: ۲، جولائی ۱۹۸۶ء، صفحات ۲۵۱-۲۶۱، اقبالیات ۲: ۲، جولائی-ستمبر ۲۰۰۶ء، صفحات ۱۲۹-۱۳۸۔

۲- محمد بن اسمعیل بخاری، الصحيح البخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرا لدينه، جلد ۱، صفحہ ۳۱۔

## قلب: منبع ایمان، مرکز خیر و شر:

قلب ہی جسم انسانی یعنی عالم اصغر کا سالار ہے۔ قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر نازل ہوا اور حضرات صحابہؓ کے قلوب میں محفوظ رہا۔ عقل کی تمام تر مابعد الطبیعی جہت قلب پر موقوف ہے۔ دل ہی عقل کو غیب پر اعتماد کے قابل بناتا ہے۔ دل سے منقطع ہو کر عقل کا درائے حسی مادہ سلب ہو جائے گا، جو عقل کا حقیقی امتیاز اور بنیادی جوہر ہے۔ عقل کے تمام تر مقدمات کی تائید و توثیق و تصدیق اگر قلب سے نہ ہو تو یہ تعقل ہدایت کا ذریعہ نہیں بنتا۔ عقل اور علم نور ہیں مگر ایمان کے ساتھ۔ وہ پردہ نور جو لذت و حلاوت ایمان کے حصول کی راہ میں حائل رہتا ہے، اُس وقت چاک ہو جاتا ہے، جب دولت ایمان و ایقان اطمینان قلبی کے ساتھ نصیب ہو جائے۔ حقیقت الحقائق کی قبولیت کا مشاہدہ تعقل قلبی کی نگاہ سے میسر آتا ہے۔ اسی لیے کفار کی سرزنش کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ آنکھوں سے اندھے نہیں بلکہ: تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ [۲۲:۲۶] ”ان کے سینوں میں دھڑکتے دل اندھے ہیں۔“ اسی قلب سے آدمی تدبیر و تفکر اور تعقل کے قابل ہوتا ہے، اسی سے انسان سوچتا سمجھتا ہے، لیکن کفار کے بارے میں کہا: لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا [۷۹:۷] ”اُن کے دل ہیں مگر یہ اُن سے سوچتے سمجھتے نہیں۔“ ایمان کا تعلق قلب سے ہے اسی لیے بعض اعرابیوں نے جب کہا کہ ہم ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا کہنے سے منع کرتے ہوئے اس کی وجہ بتلائی کہ: لَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ [۱۳:۲۹] ”ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔“ گویا ایمان کا مستقر دل ہے اور خدا اور آخرت کے انکار کا داعیہ بھی دل ہی میں پیدا ہوتا ہے: قُلُوبُهُمْ مُنْكَرَةٌ [۲۲:۱۶] ”ان کے دل منکر ہو رہے ہیں۔“ یہی قلب احکامات و منہیات کا خیال رکھ کر تقویٰ کا محل بن جاتا ہے: فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ [۲۳:۲۲] ”اور یہ دلوں کے تقوے سے ہے۔“ مگر اللہ تعالیٰ کے کلام پر غور نہ کر کے یہی قلب مقفل ہو جاتا ہے: عَلِي قُلُوبٌ أَقْفَالُهَا [۲۳:۴۷] ”دلوں پر قفل لگ گئے ہیں۔“ اعمال کی پستی سے مہر لگوا لیتا ہے: خَتَمَ اللَّهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ [۷:۳] ”اللہ نے اُن کے دلوں پر مہر کر دی۔“ اُن کے دلوں پر ایسے پردے پڑ جاتے ہیں جو عبرت و نصیحت کے قبول کرنے سے مانع بن جاتے ہیں: جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً [۲۵:۶] ”ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں۔“ اُس کا دل زنگ آلود ہو جاتا ہے: بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوبِهِمْ [۱۳:۸۳] ”ان کے دلوں پر اُن کے کرتوتوں کا زنگ چڑھ گیا ہے۔“ شک و نفاق سے مملو قلب کو اللہ نے مریض بتلایا ہے: فِى قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ [۱۰:۲] ”اُن کے دلوں میں بیماری ہے۔“ یہی قلب قساوت و شقاوت اور زلیغ و غیض میں مبتلا ہو کر کبھی یاس و حسرت میں مبتلا ہوتا ہے، کبھی حسد سے جلتا ہے، بغض کی آگ سے بھڑکتا ہے، کبھی اندھا ہو جاتا ہے، کبھی لرز جاتا ہے، کپکپا جاتا ہے، ڈبڈبا جاتا ہے۔ اسی طرح قلب کا خاشع و رافع، نسیب و سلیم اور طاہر ہونا بھی قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہے، کہ مومن کا دل خوفِ خدا سے سہم جاتا ہے اور ذکرِ الہی سے اطمینان پاتا ہے۔ یہی خوف ورجا اور اُمید و بیم کی کیفیت اُسے خدا کی معرفت نصیب کرتی ہے اور قربِ خداوندی کی دولت عطا کرتی ہے۔ قرآن نے مومنین و متقین کی ان

دونوں کیفیات کو ایک آیت میں اس طرح جمع کیا ہے:

تَفْشَعِرُ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ [۲۳:۳۹]

”اس سے اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں پھر اُن کی چلد اور دل اللہ کے ذکر کے لیے نرم ہو جاتی ہیں۔“

قرآن و سنت کی ان واضح نصوص کے باعث اسلاف اہل سنت و جماعت کا متفقہ اور محققانہ مسلک یہی ہے کہ مرکز و محل عقل دماغ نہیں قلب ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

القلب محل العقل في قول الأكثرين.

”جمہور کے مختار مسلک کے مطابق محل عقل قلب ہے۔“

یہ بات محض اجماع و اتفاق تک ہی محدود نہیں بلکہ ائمہ عقائد سے باب عقائد میں ذکر کرتے ہیں۔ امام ابو الشکور السالمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

نحن فيه العقل محله القلب.

”ہم اسی پر قائم ہیں کہ قلب ہی محل عقل ہے۔“

ذہنی اور قلبی تعقل میں فرق:

اگر دین و مذہب کی قبولیت سے لے کر مسائل و نظائر کی تفہیم و ترسیل تک ہر جگہ معیار اور سند تعقل قلبی [reason by heart] کی بجائے دماغی عقلیت [reason by mind] ہی ہے تو اس کا لازمی اور بدیہی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دین و مذہب کو قبول نہ کرنے کی صورت میں کسی کو کافر اور ابدی عذاب کا مستحق سمجھنا عقلی اعتبار سے نادرست ہے کیوں کہ دماغی عقلیت جزو اجزوا، نجما نجما اور آہستہ آہستہ حقیقت کے ادراک کے قابل ہوتی ہے، جب کہ تعقل قلبی کے ذریعے ان بنیادی معروضات کا بہ راہ راست اور کھلی مشاہدہ ممکن ہو جاتا ہے، جو دماغی عقلیت کی دسترس سے یا تو باہر ہیں یا ان تک رسائی کے لیے دماغی عقلی مباحث نہایت پیچیدہ اور عمیق ہیں اور مکمل یقین اور معرفت کے ساتھ کبھی مابعد الطبعی حقائق کا اثبات نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت حق نہایت شرح و تفصیل کے ساتھ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، اور ابو جہل دونوں کے سامنے پیش فرمادی۔ صدیق اکبرؓ کی عقل نے اس کو قبول فرمایا اور ابو جہل کی عقل نے نہیں مانا، تو اب اس میں ابو جہل سے شکوے کا کیا حق ہے؟ کیوں کہ عقلی اعتبار سے دونوں کو مذہب کی قبولیت یا رد کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ ایسی صورت میں ایمان و کفر کا امتیاز چہ معنی دارو؟ ابو جہل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا تھا، لیکن، نعوز باللہ، آپ کے ہر قول و عمل

۱- محمد بن احمد القرطبی، الجامع لأحكام القرآن، بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۳۲۷ھ، جلد ۱، صفحہ ۲۸۹۔

۲- ابوالشکور السالمی، التمهيد، وبلي: الفاروق، ۱۳۰۹ھ، باب الاول في العقل، صفحہ ۸۔

میں دروغ پاتا تھا، ادھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھے جو ہر بات پر آمنا و صدقنا کی صدا لگاتے، دونوں اپنی اپنی بات میں سچے تھے، ابو جہل کا دل عقل موضوعی [subjective reason] کا مسکن تھا، جو فرد کی خواہشات کو حقیقت کا رنگ دے کر گم راہ کرتی ہے، اسی لیے وہ اپنے دل کے آئینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا تھا، لیکن فی الاصل وہ اس میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھ پاتا تھا، کیوں کہ اس پر حجاب ذات نے عقل موضوعی کو مسلط کر رکھا تھا، وہ اس آئینے میں اپنی قلبی کشافت کا عکس دیکھتا اور اُسے نعوذ باللہ، حقیقت محمدیٰ خیال کرتا اور آپ کا انکاری بنتا۔ حجاب ذات نے اُس کے لیے حقیقت محمدیٰ تک رسائی ناممکن بنا دی۔ بالفاظ دیگر عقل موضوعی ادراک حقیقت سے قاصر رہی، وہ اپنے نقطہ نگاہ سے لاکھ سچا ہو لیکن حقیقت کے نقطہ نظر سے سب سے بڑا کذاب تھا۔ اس گمراہی سے نجات کے لیے اُسے ماورایت [transcendence] کی ہدایت کی ضرورت تھی تاکہ وہ حاضر و موجود [imminence] کی قید سے نکل کر عقل حقیقی [objective reason] کے مرتبے پر فائز ہو جائے اور اس کا قلب ایسا شفاف آئینہ ہو جائے کہ وہ حقیقت بعینہ دیکھنے کے لائق ہو جائے جس سے صدیق اکبر کا قلب بہرہ ور تھا، ان کا قلب ان کی طہارت و عفت کے باعث ایسا شفاف آئینہ بن گیا تھا، جس نے انہیں حجاب ذات کی ظلمت سے نکال کر حقیقت محمدیٰ کے نور سے آشنا کر دیا تھا۔

اسلام کی جدید ذہن کے مطابق تفہیم: مسائل اور مشکلات:

اس صورت حال میں عقل کے مردہ گھوڑے پر سوار ہو کر کون سا میدان سر کیا جاسکتا ہے — ویسے یہ خیال بہت مبارک اور تمنا لائق ستائش ہے کہ ڈاکٹر صاحب اسلام کو عصر حاضر کے ترقی یافتہ عقلی ذہن کے لیے قابل قبول بنانے کے خواہاں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ موجودہ انسانی ذہن تو حید، معاد اور وحی جیسے مذہبی حقائق کو ہرگز ان دلائل کی بنیاد پر قبول نہیں کر سکتا جن پر ماضی کا غیر ترقی یافتہ ذہن اور انسان قبول کرتا تھا۔ ماضی میں ان حقائق کے اثبات کے لیے جو دلائل فراہم کیے گئے تھے وہ معراج ارتقا پر فائز عقلی ذہن کے لیے از کار رفتہ، مہمل بلکہ مضحکہ خیز ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”آج کل مذہب پر جس قسم کے اعتراض کیے جاتے ہیں ان کے لیے یہ جواب [جو اسلاف و متکلمین نے ماضی میں دیا ہے..... ناقل] ناکافی اور غیر اطمینان بخش ہے، موجودہ تعلیم یافتہ انسان محض ”لیطمنن قلبی“ کی خاطر مذہب کے بارے میں سوالات

۱- علی محمد رضوی، ”جدیدیت: دینی اور لادینی پس منظر“، مشمولہ ساحل، جولائی-اگست، ۱۹۹۹ء، صفحات ۵۲-۵۵۔

۲- تمام جدیدیت پسند مفکرین اس سادہ لوحی کا شکار ہیں کہ عہد حاضر کا انسان نہایت بالغ نظر اور عقلیت پسند ہے، زمانے میں اب وہی بات مانی جاتی ہے جس کا حسی تجربہ اور عینی مشاہدہ ممکن ہو، گویا شہود و حضور محض ہی معیار اور کسوٹی ہے، بس جوں ہی اسلام کو عقلی، منطقی اور سائنسی بنیادوں پر ثابت کر دیا جائے گا، اسی لمحے ”اسلام بدلے ہوئے زمانے میں انسانوں کے لیے قابل قبول ہو جائے گا“۔ یہ تصور اپنے اظہار میں بہت ہی خوش نما ہے لیکن بہر حال مفروضہ۔ عہد حاضر میں عقل کا ڈھنڈورا پیٹ کر اس کی جتنی تذلیل و تحقیر کی گئی ہے، تاریخ ماضی اس کے تذکرے سے خالی ہے۔ مثلاً سگریٹ کے ڈبے پر وزارت صحت کی طرف سے یہ اعلان مسطور ہوتا ہے:

دریافت نہیں کرتا۔ اس کی ذہنی کیفیت ”براہمی“ نہیں ہے۔ یہ تو ماڈی اور مغربی تعلیم کا پیدا کردہ انسان ہے جو مذہبی تشکیک کا شکار ہے۔ ایسے انسان کی عقل ان جوابات کو [جو فکر اسلامی کی تاریخ میں علمائے مذہب نے دیے ہیں..... ناقل] قبول کرنے کے لیے مستعد نہیں ہوتی، چاہے وہ بادل ناخواستہ اسلام ہی کا معتقد کیوں نہ ہو۔“

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اب دلیل کے دوسرے قرینے اور تفہیم کے جدید منہاج کی ضرورت ہے، جو ان معتقدات کو جدید ذہن کے لیے باعث قبول اور سرلیح الفہم بنا سکے۔ لیکن یہ بات مکمل طور پر نظر انداز ہوگئی کہ سائنسی فکر سے متاثر جدید ذہن تو وحی والہام کی حقیقت پر ہی سوالیہ نشان لگا چکا ہے اور ذات الہی کے بارے میں تشکیک کا شکار ہے۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ آسمانی کتابیں اپنے مخاطبین میں انفس و آفاق کے مشاہدے اور اس پر غور و تدبر کے نتیجے میں ایک خاص قسم کا شعور اور کیفیت پیدا کرنا چاہتی ہیں، جس سے ان کے اندر مابعد الطبیعی حقائق، یعنی معرفت رب اور حیات اخروی وغیرہ، کی قبولیت کی استعداد پیدا ہو۔ ظاہر ہے مابعد الطبیعی حقائق کا حسی تجربہ و مشاہدہ تو ممکن نہیں ہے، اگر ایسا ہو تو وحی پر اعتماد ہی ساقط ہو جائے اور مابعد الطبیعیات کی اصطلاح بے معنی ٹھہرے۔ کیوں کہ اس طرح یہ حقائق مابعد الطبیعی جہت سے کٹ کر عام انسانی تجربات کے ذیل میں ایک تجربہ بن جائیں گے، جس کے رد و قبول کا حق و اختیار عقل استقرائی کو حاصل ہوگا۔ جب یہ ناممکن ہے تو جیسے سائنسی فکر سے متاثر ذہن کے لیے علمائے مذہب کے دلائل فرسودہ اور لائق اعتنا نہیں، ویسے ہی مسلم جدیدیت پسندوں کے پیش کردہ دلائل بھی قطعاً مورد التفات نہ ہوں گے۔ جتنے دلائل اور ثبوت وجود خدا کے حق میں دیے جاسکتے ہیں اتنے ہی اس کے رد میں بھی پیش کیے جاسکتے ہیں۔ سینٹ انزلم [1109-1033] اور اگسٹائن [345-430 A.D.] وغیرہ نے وجود خدا پر بہت سے دلائل دیے، لیکن فلسفے کی دنیا میں

”خبردار! تمہا کو نوشی کینسر اور دل کی بیماریوں کا باعث ہے۔“

مگر اس کے باوجود مارکیٹ میں سگریٹ فروخت ہو رہی ہے اور لوگ خرید رہے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ ریاست کا سرمایہ دارانہ ہونے کی وجہ سے اخلاقی حدود و قیود سے معز ہونا ہے۔ اس کا واحد مقصد پیداوار [production] میں اضافہ در اضافہ ہے۔ عہد حاضر کا انسان بڑے بڑے ادارتی ڈھانچوں اور سانچوں میں محدود و محصور کر دیا گیا ہے، وہ عقل کے استعمال کے قابل ہی نہیں رہا، ارادے، تمنائیں، فیصلے اور خیر و شر عقلیت کے حامل بڑے بڑے ادارتی ڈھانچوں کے ذریعے لوگوں پر مسلط کر دیے گئے ہیں۔ اسی لیے فوکویاما [Francis Fukuyama] کی کتاب Trust: The Social Virtues and Creation of Prosperity, Free Press, 1995. نے انسان کی ناہمی، اعلیٰ اور بے بساعتی کا پردہ چاک کر دیا ہے کہ عہد جدید کا معاشرہ Trust Worthy ہے، ہر انسان اس بات پر مجبور ہے کہ دوسرے پر اعتماد کرے۔ بازار میں ادویات، پانی کی بوتلوں، کھانے پینے کی اشیا کی پیکنگ پر ان اشیا کی تیاری سے لے کر استعمال کے لیے مقررہ معیار کی تاریخیں درج ہوتی ہیں۔ اس کاغذ کو کوئی بھی شائع کر کے مذکورہ اشیا پر چسپاں کر سکتا ہے۔ مگر جدید انسانوں کی بھیڑ درست یا غلط کی تعین و تحقیق کے بغیر عقل کی میزان اور تجربہ گاہ کے فیضان کو بالائے طاق رکھ کر اسے ”ایمانی“ سطح پر قبول کرتی ہے۔ یہ اعتماد و ایمان ”علم“ اور ”عقل“ کی بنیاد پر نہیں بلکہ brand کی مارکیٹی قوتوں کی ضمانت پر استوار ہوتا ہے۔

۱- منظور احمد، ”مذہب کی صداقت“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۲۵۔

ان کو Weak Analogy قرار دے کر دلائل سے رو کر دیا گیا۔ اس لیے کہ Limits of Rationality is Limits of Human Mind عقل محدود کی تگ و تا زبھی محدود ہے۔ مغربی مفکرین اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ جدیدیت کی فکر، جو عقل کے ذریعے تلاش حق کی دعوے دار تھی، کبھی مذہبی قوت کو، جسے جدیدیت نے خیر باد کہہ دیا تھا، عقل کے ذریعے واپس نہیں لا سکتی۔ ہیرماں [Habermas] لکھتا ہے:

But the principle of subjectivity is not powerful enough to regenerate the unifying power of religion in the medium of reason. The demotion of religion leads to a split between faith and knowledge which the Enlightenment can not overcome by its own power.<sup>1</sup>

صوفیانہ طریق: اسلام کی دعوت کا سب سے موثر ذریعہ:

اس لیے منظور احمد صاحب کا تجویز فرمودہ طریق جدید ذہن کے لیے لائق قبول ہے نہ اسلام کی تبلیغ و تفہیم کے لیے موثر اور نہ ہی یہ اسلام کی مسلسل روایت کے داعیانہ اسلوب و طریق سے میل کھاتا ہے۔ نبوی طریق میں قلب پر محنت کو اولیت و فوقیت ہے، جس کی اصلاح پر سارے وجود کی سعادت کا مدار ہے۔ دل سرچشمہ محبت و یقین ہے جو اعمال صالحہ اور بندگی رب پر انسان کو آمادہ کرتا ہے، جہاں عقل ساتھ چھوڑ دے وہاں انسان لا چاری و بے کسی کے اعتراف و اعلان کے ساتھ مالک کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں اسے یقین کی دولت اور حکمت کا خزانہ میسر آتا ہے، اس کا قلب تجلیات ربانی کا مورد بن جاتا ہے، پھر اسے تبلیغ و تفہیم اسلام کے لیے خرد افروزی و نکتہ طرازی کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ وہ اپنے کردار و گفتار میں اللہ کی برہان ہوتا ہے۔ عقلی دلائل مرعوب و مغلوب تو کر سکتے ہیں مگر فتح و مسخر نہیں۔ اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ حضرات صوفیہ نے تبلیغ و اشاعت اسلام کا فریضہ جس حسن و خوبی سے ادا کیا اس میں کوئی طبقہ ان کا شریک نہیں، کیوں کہ ان کا طریق [مردہ دلوں کی مسیحا اور شکستہ قلوب کی تسکین] نبوی طریق سے اقرب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ مبارک اور صحابہ کرام کی زندگیاں اس بات پر شاہد عادل ہیں کہ انھوں نے دنیا کو اپنے حسن عمل اور رفعت کردار سے مغلوب کیا تھا۔ وہ خود بے قرار ہو کر دوسروں کی راحت و رافت کا سبب بنے، شمع کی مانند خود چھلے مگر مخلوق خدا پر ضوفشانی کی۔ اسی لیے مجروح دل اور مریض ذہن ان کے انفاس کی برکت سے شفا یاب ہوتے تھے۔ عقل حیلہ جو ہے، شکوک و شبہات اور تشکیک و ارتیاب اس کا طبعی وظیفہ ہے، وہ اپنی شہادت کے زور پر ماڈی دنیا کے امور کی انجام دہی سے محروم ہے چہ جائیکہ مابعد الطبعی حقائق۔ اس کے پیش کردہ افکار و نظریات ہر دم متعیر ہو کر اپنی ناکامی کا ثبوت دیتے ہیں۔

1- Jürgen Habermas, *The Philosophical Discourse of Modernity : Twelve Lectures*, [trans., Frederick G. Lawrence], MIT Press, Paperback edition, 1990, p.20.

امام ابو حنیفہؒ: کلامی و عقلی علوم سے دست برداری اور علم فقہ میں مشغولیت:  
 حضرات متکلمین جن کی زندگی کلامی و عقلی مباحث میں گزرتی ہے آخر میں اس کو ترک کر دیتے  
 ہیں اور نقلیات کی آغوش میں جا بیٹھتے ہیں، جہاں ایمان کی سلامتی اور عمل پر دوام لازمی ہے — حضرت  
 امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے علم الکلام میں اس درجے مہارت پیدا کر لی تھی کہ خود فرماتے ہیں کہ:  
 قال و کنت اعد الکلام الفضل العلوم و کنت اقول هذا الکلام في اصل  
 الدين فراجعت في نفسي بعد ما مضى لي فيه عمر و تدبرت فقلت ان  
 المتقدمين من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم والتابعين واتباعهم لم  
 يكن يفوتهم شيء مما ندر که نحن و كانوا عليه اقدروا به اعرف و اعلم  
 بحقائق الامور ثم لم ينتصبا فيه منازعين ولا مجادلين ولم يخوضوا فيه  
 بل امسكوا عن ذلك ونهوا عنه اشد النهي و رأيت خوضهم في  
 الشرائع و ابواب الفقه و كلامهم فيه عليه تجالسوا و اليه و به حضوا و كانوا  
 يعلمون الناس و يدعونهم الى التعلم و يرغبونهم فيه و كانوا يطلقون الکلام  
 و المنازعة فيه و يتناظرون عليه و يفتون فيما يستفتون على ذلك مضى  
 الصدر الاول من السابقين و تبعهم التابعون عليه فلما ظهر لنا من امورهم  
 هذا الذي وصفنا تركنا المنازعة و المجادلة و الخوض في الکلام و اکتفينا  
 معرفته و رجعنا الى ما كان عليه السلف و اخذنا فيما كانوا عليه و شرعنا فيما  
 شرعوا فيه و جالسنا اهل المعرفة بذلك و مع ذلك فاني رأيت من يتحلل  
 الکلام و يجادل فيه قوم ليس سيماهم سيما المتقدمين و لا منهاجهم  
 منهاج الصالحين رأيتهم قاسية قلوبهم غليظة افئدتهم لا يبالون مخالفة  
 الكتاب و السنة و السلف الصالح و لم يكن لهم ورع و لا تقى.<sup>۱</sup>  
 ”میں علم کلام کو افضل ترین علم سمجھتا اور کہا کرتا تھا کہ یہی دین کی بنیاد کی نگہبانی ہے۔ عرصہ  
 گزرنے پر میں نے خود اپنے تئیں غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ صحابہ کرامؓ و تابعین کبارؓ نہ  
 صرف یہ کہ ان امور سے بے بہرہ نہ تھے بلکہ ہم سے زیادہ ان کے علم میں گہرائی تھی۔ وہ  
 حقائق سے واقف تھے، مگر اس کے باوجود ان کی زندگیوں میں ان مجادلانہ شورشوں سے یکسر  
 خالی تھیں۔ نہ صرف یہ کہ یہ ان کا مشغلہ نہ تھا بلکہ وہ لوگوں کو اس سے روکتے تھے ان کے غور  
 و فکر کی جولان گاہ علم الشرائع اور ابواب فقہ تھے، یہی ان کا موضوع تھا، یہی ان کی مجلسی

۱- موفق بن احمد الحلی، المناقب الموفق، حیدرآباد: مجلس دائرة المعارف النظامية، ۱۳۲۱ھ، جلد ۱، صفحات ۶۰-۶۱۔

زندگی کی رونق تھی، اسی کی وہ لوگوں کو تعلیم اور اس کے سیکھنے کی ترغیب دیتے تھے — صدر اول ایسے ہی گزرا ہے، تابعین بھی ان کے نقش قدم پر تھے — اس موقف پر پہنچنے کے بعد میں نے علم کلام کو خیر باد کہہ دیا۔ صرف فنی معرفت باقی تھی اور زندگی میں بہ طور فن سلف کے علوم کو اپنالیا۔ وہ ہی کام شروع کیا جو وہ کرتے تھے اور اس فن کے حاملین سے رابطہ پیدا کر لیا، ان ہی کی مجلسوں کو اپنالیا اور اپنی جگہ یہ یقین ہو گیا کہ متکلمین کا گروہ اسلاف کے قدم سے ہٹا ہوا اور صالحین کے مقام سے دور ہے، ان کے دلوں میں قساوت ہی قساوت ہے۔ کتاب وسنت کی مخالفت سے بے پروا، بے روح اور تقوے سے دور طبقہ ہے۔“

امام غزالی: ”کلامی و عقلی دلائل محدود افادے کے حامل:

حضرت امام غزالی رحمہ اللہ جو ایک صاحب اجتہاد متکلم ہیں، مدتوں درک حقائق کی تشنہ لبی نے انھیں در بہ در پھرایا، انھیں کلامی و عقلی مباحث میں اس درجے مہارت تامہ حاصل ہوئی کہ انھوں نے اپنی تصانیف میں کلامی و عقلی موضوعات پر مجتہدانہ طرز میں اصول و عقائد پر گفتگو کی اور بعض مباحث میں اپنے پیش رو متکلمین مثلاً امام ابوالحسن اشعری اور علامہ ابوبکر باقلانی پر سبقت لے گئے۔ لیکن آخر میں اپنی سلامت طبع، حق پسندی، اور تجربات و حوادث کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچے کہ کلامی موثکافیوں اور عقلی مباحث وقتی چیزیں ہیں اور ان کا فائدہ بہت محدود ہے، اس کی مضرت، منفعت سے بڑھ کر ہے۔

امام غزالی نے اپنی عمر بھر کا حاصل یہی بتلایا کہ:

انی علمت یقیناً ان الصوفیة هم السالکون لطریق اللہ تعالیٰ خاصۃ. وأن سیرتہم أحسن السیر، وطریقہم أصوب الطرق، و اخلاقہم أزکی الأخلاق. بل لو جمع عقل العقلاء و حکمة الحکماء، و علم الواقفین علی اسرار الشرع من العلماء، لیغیروا شیئاً من سیرہم، و اخلاقہم، و یبدلوه بما هو خیر منه، لم یجدوا إلیہ سبیلاً، فإن جمیع حرکاتہم و سکنااتہم، فی ظاہرہم و باطنہم مقتبسة من نور مشکاة النبوة، و لیس وراء نور النبوة علی وجه الارض نور یستضاء بہ۔<sup>۱</sup>

”صوفیہ ہی اللہ کے راستے کے سالک ہیں، ان کی سیرت بہترین اور ان کا طریق مستقیم ہے، ان کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں، اگر عقلا کی عقل، حکما کی حکمت اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم مل کر بھی ان کی سیرت و اخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں، ان کے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکناات مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہیں اور نور نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں، جس سے روشنی حاصل کی جائے۔“

۱- ابو حامد محمد الغزالی، المنقذ من الضلال، صفحات ۱۷۷-۱۷۸۔



فیض رسائی و قبولیت دوام، ہدایت سامانی اور تاثیر پذیری کے حوالے سے امام غزالی کی دونوں تالیفات ”تہافت الفلاسفہ“ اور ”احیاء علوم الدین“ کا تقابلی جائزہ لے لیا جائے تو فرق واضح ہو جائے گا۔ حضرت امام غزالی کی بیش تر تصنیفات لاطینی میں ترجمہ ہوئیں اور مغرب میں پڑھی گئیں، لیکن جس کتاب سے حقیقی ہدایت حاصل ہو سکتی تھی، یعنی: احیاء علوم الدین۔ اس پر ہر پوپ نے پابندی لگا دی۔  
توحید: منبع علوم:

یہی حال دیگر متکلمین کا ہے کہ ساری زندگی عقلی اور فلسفیانہ مباحث میں بسر کرنے کے بعد بالآخر عقل کی در ماندگی اور فرو مائیگی ان پر واضح ہوئی اور وہ نقل کی آغوش میں چلے گئے جو دین کی تحصیل و ترسیل کا محفوظ و محکم اور مستند ذریعہ ہے، جس میں حقیقت ایک ہے: یعنی توحید — جو زمانی سطح پر ایک انسلاک و تسلسل سے عبارت ہے اور وحی و رسالت کے وسیلے سے ایک مابعد الطبیعیاتی نظام کی تشکیل و ترتیب کا سبب بھی۔ مذہب، قانون، اخلاق، معاشرت، تہذیب، ثقافت، علوم، فنون، سائنس اور ادب سب اسی سرچشمے کی عطا ہیں اور اسی کے تابع۔ اس نظام سے مقصود دائمی فوز و فلاح اور خوشنودی رب ہے اور اسی کی جانب پیش رفت اور اس کی جستجو ترقی۔ اس مقصدیت میں روح اور مادے کی دوئی ہے اور نہ ذہن و جسم کی تفریق۔ یہاں حقیقت تک رسائی کا واحد ذریعہ ایمان ہے جس کے بغیر حقیقت مطلقہ کا ادراک ممکن نہیں۔ ہاں! حواس، عقل، وجدان، فکر، تدبیر اسی مابعد الطبیعیاتی حصار میں اپنی کاوش و کاوش کا اظہار کرے تو مضائقہ نہیں مگر یہ حقیقت کلی تک رسائی کے حتمی [ultimate] ذرائع نہیں۔

صحابہ کرام: فلسفہ و کلام کے بغیر کثیر مخلوق کی ہدایت کا سبب:

منظور احمد صاحب اس پہلو پر بھی غور فرمائیں، کیوں کہ اصل مقصود تو مخلوق کو خالق کی بندگی پر آمادہ کرنا ہے، نہ کہ دنیا پر اسلامی فلسفے و علوم کی برتری کا اثبات۔ اس کے لیے صاحب ایمان و اعمال صالحہ کے حامل شخص کے منہ سے نکلے حکمت و معرفت کے دو بول ہی ایک خلقت کی ہدایت کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ، حضرات صحابہ کرام، جو صحبت نبوی کے فیض یافتہ تھے، اور متاخرین، جو فلسفہ و کلام کے گرویدہ تھے، کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وأصحاب محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] كانوا — مع أنهم أكمل الناس  
علماً نافعاً وعملاً صالحاً — أقل الناس تكلفاً، يصدر عن أحدهم الكلمة  
والكلمتان من الحكمة أو من المعارف، ما يهدى الله بها أمة، وهذا من  
منن الله على هذه الأمة. وتجد غيرهم يحشون الأوراق من التكاليف  
والشطحات، ما هو من أعظم الفضول المبتدعة، والآراء المخترعة.

۱- ظفر حسن، سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۰ء، صفحہ ۱۵۶۔

۲- نقی الدین ابن تیمیہ، نقض المنطق، قاہرہ: مطبعة السنة الحمیدیہ، ۱۹۵۱ء، صفحہ ۱۱۳۔

”صحابہ کرامؓ باوجود اس کے کہ علم نافع اور عمل صالح کے اعتبار سے کامل ترین خلایق تھے۔ تکلفات سے بالکل پاک و بری تھے۔ کسی صحابی کی زبان سے ایک یا دو لفظ حکمت و معارف کے نکل جاتے ہیں، اور ان دو لفظوں کے اثر و برکت سے پوری کی پوری قوم کو ہدایت نصیب ہو جاتی ہے۔ یہ اس اُمت پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے، اس کے مقابلے میں دوسرے لوگ صفحے کے صفحے ان تکلفات و شطحات سے بھر دیتے ہیں، جو محض غیر ضروری مباحث اور نو ایجاد آراء و نظریات ہیں۔“

ہدایت کا نبوی منہاج: انسان کے حال اور مقام کی درستی:

عصر حاضر میں انسانی ذہن اور مزاج کے تزکیے اور تطہیر کے بغیر، بالفاظ دیگر اُس کی مابعد الطبیعی سطح کو تبدیل کیے بغیر مذہب کی عقلی توجیہ و دلیل بیان کرنا اُسے مادہ پرستانہ ذہن کے مطابق ڈھال کر مذہب کو کفر آمیز کر دینے کے مرادف ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی محنت کا اصل ہدف انسان کا قلب اور باطن کی صفائی ہوتا ہے، جس سے اُس کا حال درست ہو کر اُس میں قبولیتِ حق اور معرفتِ رب تک رسائی کی اہلیت و صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اعمالِ صالحہ کی نورانیت اور تزکیہ باطن کی روحانیت اُسے زمان و مکان کی حد بندیوں سے ماورا کر دیتی ہے۔ معرفتِ الہی میں مستغرق اور فکرِ فردا میں منہمک یہ عقل اب عقلِ مجرّ نہی رہ جاتی بلکہ حکمت و بصیرت کا ایسا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بن جاتی ہے جس پر احکام الشریعہ کے مصالِح آشکار ہوتے ہیں۔ بے فکر اور بے ذکر عقل پر مصالِح و مقاصدِ شریعت کھل ہی نہیں سکتے۔ قرآن مجید نے اسی عقل کو ”لب“ کہا ہے جو صورتوں اور پیکروں کی ظاہری رنگینی و رعنائی میں الجھ کر نہیں رہ جاتی بلکہ باطل میں سے حق نکال لاتی ہے۔ قرآن حکیم نے کائناتِ ارض و سما کو پیش فرماتے ہوئے اُس میں قدرتِ الہیہ کی نشانیاں نکال لانے والوں ہی کو ”اولوالالباب“ قرار دیتے ہوئے اُن کے دو اوصاف بیان کیے ہیں، ذکر اور فکر:

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ [۱۹۱:۳]

”یہ خلقِ ارض و سما کی حکمتیں اور قدرتِ الہی کی نشانیاں اُن لوگوں کے لیے ہیں جو اولوالالباب، یعنی گہری اور حقیقت پسند عقل والے ہیں [جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر لیٹے ہوئے کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں۔“

آیت مبارکہ سے پتا چلا کہ فکر سے خالی اور ذکر سے عاری عقل دین کی خادم بننے کی اہلیت و لیاقت بھی نہیں رکھتی چہ جائیکہ وہ دین پر حجت اور وحی پر حاکم بن بیٹھے۔ قرآن میں عقل، حکمت، فقہ، شعور، تدبیر، تفکر، فواد، قلب اور بصیرت وغیرہ کے الفاظ ان ہی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔

منظور احمد: الہیاتی نقطہ نظر نے قرآنی تعلیمات کے برعکس عقل کی اہمیت کو کم کیا: ایک الزام:  
ڈاکٹر منظور احمد لکھتے ہیں:

”اسلام نے فہم، عقل اور علم پر جتنا زور دیا ہے، اُس کی مثال دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی، عقل اور فہم کی اہمیت کو اسلامی فکر کے الہیاتی نقطہ نظر نے کم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی تاریخی وجوہات تھیں، ایک زمانے میں یہ بات کسی حد تک اسلامی معاشرے کے تحفظ کے لیے ضروری تھی لیکن اس نقطہ نظر کو اسلامی فکر کا مرکزی نقطہ نظر سمجھنا اور عقل و فکر کو بالکل ارادہ مطلق کا تابع بنا دینا بنیادی طور پر اسلامی فکر کے مزاج سے میل نہیں کھاتا اور قرآن کی اُس عمومی فکر سے متصادم ہو جاتا ہے جس میں انسانوں کو عقل و فہم کے استعمال پر اُکسایا گیا ہے۔“  
بلاشبہ قرآن حکیم نے عقل و فہم اور علم پر زور دیا ہے، مگر کیا ڈاکٹر صاحب نے کبھی یہ بھی غور فرمایا ہے کہ قرآن نے جن لوگوں کو صاحبانِ عقل و فہم اور حاملانِ علم قرار دیا ہے اُن کے لیے چار باتوں پر ایمان لازمی ہے:  
[۱] انسان تخلیق کیا گیا ہے۔

[۲] اُسے مالک و خالق کل اور خیر مطلق نے پیدا کیا ہے۔

[۳] انسان کی پیدائش حادثاتی طور پر نہیں ہوئی کہ خدا کچھ اور کر رہا تھا، اچانک انسان تخلیق ہو گیا۔

[۴] انسان کو عبث نہیں کسی مقصد کے تحت پیدا کیا گیا ہے۔

صحائفِ سابق اور قرآن مجید نے مشترکہ طور پر ان ایمانیات کو صاحبانِ عقل و فہم کے لیے لازم قرار دیا ہے، ان ایمانیات کے بعد جو غور و تدبر اور تفکر و تعقل ہوگا، اُس کے نتیجے میں خشیتِ الہی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اُس سے ہیگل کی مطلقیت، ڈیکارٹ کی تشکیلیت اور مارکس کی مغایرت پیدا نہیں ہوتی بلکہ غزالی کی کیمیائے سعادت اور مولائے روم کی مثنوی وجود میں آتی ہے۔ قرآن نے عقل و فہم کا فعل اور علم کا نتیجہ اور پھل وحی پر ایمان کو قرار دیا ہے، بالفاظِ دیگر فکرِ اسلامی کا مادہ علم ہی ایمانی اور خدا اساس ہے۔ قرآن کے نزدیک علم وہی ہے جس سے منشا و ارادہ الہی کی معرفت نصیب ہو۔ اس موقف کے ثبوت میں مذکورہ موضوع کی آیات قرآنی پر ایک سرسری اور طائرانہ نگاہ ڈال لینا ہی کافی ہوگا۔ اس کے برعکس ڈاکٹر منظور صاحب کے ارشاد: ”عقل و فکر کو بالکل ارادہ مطلق کا تابع بنا دینا بنیادی طور پر اسلامی فکر کے مزاج سے میل نہیں کھاتا، قرآن کی عمومی فکر سے متصادم ہو جاتا ہے۔“ ارادہ مطلق سے مراد رضائے الہی اور معرفتِ رب ہے۔ قرآن ارادہ مطلق کی مطلق اور غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ صرف بندوں ہی سے نہیں بلکہ نبی سے بھی کرتا ہے، لہذا ڈاکٹر صاحب کا استدلال ٹھیک نہیں ہے، انھیں اپنے استدلال کی بنیاد ایسی دلیل پر رکھنی چاہیے جس میں وارد ہو کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں اپنی اطاعت مطلقہ سے لوگوں کو منع کیا ہے، لوگ عقل کی اطاعت کے بجائے خواہ مخواہ خدا کی اطاعت کر رہے ہیں۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کے حق میں قرآن کی کوئی ایک ایسی آیت

۱- منظور احمد، ”اسلام، قانون اور اخلاقیات“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحات ۹۶-۹۷۔

پیش نہیں کی جاسکتی جس میں صراحت تو گنجا، اس موقوف کی حمایت کا اشارہ بھی پایا جاتا ہو۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس گمراہ گن موقوف کو قرآن حکیم کی عمومی فکر بنا کر پیش فرما رہے ہیں۔

قرآن مجید کا عقلی منہاج اور ڈاکٹر منظور احمد کی عقلیت پسندی: بعد المشرقین:

ایک طرف منظور احمد صاحب عقل و فہم پر اُسکسانے کو قرآن مجید کی عمومی دعوت قرار دے رہے ہیں، دوسری طرف فرما رہے ہیں کہ اسلامی فکر کے الہیاتی نقطہ نظر نے عقل و فہم کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلامی سیاق میں فہم و عقل کے استعمال پر کوئی بامعنی بحث اس وقت تک نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جب تک عقل کے استعمال کا قرآنی منہاج واضح نہ کر دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کے تصور عقل اور قرآن کے تصور عقل میں بعد المشرقین ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں عقل حاکم، حکم، حجت، معیار، کسوٹی اور مقصد ہے۔ جب کہ قرآن جس عقل کو لائق تعریف بتاتا ہے، وہ عقل سلیم، عقل منیب، عقل ساجد اور وحی کے آگے محکوم عقل ہے۔ جس عقل کے ڈاکٹر صاحب حامی ہیں اس کا حامل نگاہ قرآن میں ”شر الدواب“ ہے — مسلمانوں کا صرف ”الہیاتی نقطہ نظر“ ہی کیوں؟ حدیثی، فقہی، تفسیری ہر مکتب فکر اور نقطہ نظر عقل کی محدودیت اور نارسائی کا معترف اور اس پر وحی اور ایمان کی حجیت اور حاکمیت کا قائل ہی نہیں داعی ہے۔

العلم اور علم میں فرق نہ کرنا: التباس کا اصل سبب:

اصل مسئلہ جسے ڈاکٹر صاحب مسلسل نظر انداز کر رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک ”العلم“ اور علم میں فرق ہے۔ العلم کا واحد سرچشمہ اور حتمی ماخذ وحی ہے بہ واسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — اس کے سوا جو کچھ بھی ہے خواہ عقل، ادراک، الہام، وجدان، کشف، تدبیر، تعمق، وقوف ساری، وقوف مذہبی، عقل جزئی، عقل استدلالی، اقلیم روانی، وراثت مخفی یا داخلی، نفسیاتی واردات، باطنی مشاہدات، شعوری و تعقلی کیفیات، خرق عادات، فلسفہ و سائنس، منطق خواہ کچھ بھی ہو، وہ ”علم“ ہے، فہم حقیقت کا ایک آلہ ہے، art and craft ہے، اسے ”العلم“ کے تابع رہ کر اپنے کمالات کا اظہار کرنا ہوگا اور ”بولہب را حیدر کرار کن“ پر عمل کرنا ہوگا اور اس کی برتری، حمیت و حجیت، حاکمیت و حکمیت کو تسلیم اور اپنے عجز اور لاچاری کا اعتراف کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ ادراک کے مقابلے میں اپنے عجز کو تسلیم کرنا از قبیل ادراک ہی ہے: ”العجز عن الادراک ادراک“، مسلمان ”العلم“ کی پرچھائیں اور سائے سے ایک لمحے کے لیے بھی دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ البتہ ”علم“ کے بارے میں ان کا موقوف وسیع الظرفی اور کشادہ قلبی پر مبنی ہے وہ ہر اس علم و معلومات کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں جو مقاصد الشریعہ [یعنی ”العلم“ کی قائم کردہ حدود] کے منافی نہ ہوں۔ مگر سرچشمہ علوم اور معیار فقط اور فقط وحی ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کے ہاں ”عالم“ کی اصطلاح حامل علوم وحی کے لیے آج تک مستعمل ہے

اور وضعی علوم کے لیے ”دانش مندی“ کا لفظ استعمال ہوتا تھا جیسے آج ”دانش ور“ جیسی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں مسلم فکر کی جذباتیت یہاں تک بڑھی ہوئی تھی اور ”العلم“ اور وضعی علوم میں امتیاز و احتیاط اس درجے ملحوظ رکھی جاتی تھی کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ منطق اور فلسفے کا درس مسجد میں دینا پسند نہیں فرماتے تھے۔

عقل سلیم کے مظاہر: اسلامی علوم و فنون کی محیر العقول ترتیب و تدوین:  
اس جذباتیت اور احتیاط کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمانوں پر عقل و فہم کے استعمال کی معطلی کا الزام عائد کر دیا جائے۔ مستشرقین تک اس حقیقت سے بہ خوبی واقف ہیں کہ:

The traditionalists, are not "irrationalists", but rather they are proponents of a scripturalist rationalism, a rationalism put solely in the service of revelation.<sup>1</sup>

فقہ و کلام کے جو بڑے بڑے دفاتر مدون ہوئے ہیں، جزئیات سے کلیات تک رسائی اور ان کلیات سے پھر نئے نئے جزئیات کی تفریع اور احکام کی لم اور علت تک سراغ رسانی کا محیر العقول کارنامہ، کیا نوریوت اور تنزیل ربانی کی رہ بری میں عقلی کاوش اور کاہش فہم کے استعمال کا مظہر نہیں ہے؟ اور فقہ اسلامی کے اہم ترین ماخذ ”اجتہاد“ کا عمل بغیر تعقل و تفہم کے ممکن ہے؟ فقہ اور تفسیر تو نام ہی وحی الہی سے حاصل ہونے والی معلومات میں غور و تجسس کا ہے۔ امام جلال الدین السیوطی رحمہ اللہ [م ۹۱۱ھ] فقہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

أن الفقه معقول من المنقول.<sup>2</sup>

”فقہ، منقول [یعنی وحی الہی] سے حاصل ہونے والا عقلی علم ہے۔“

بلکہ ابتداً فقہ کے لفظ کا اطلاق ہر اس بحث پر ہوتا تھا، جس کا تعلق تنزیل ربانی سے حاصل ہونے والی معلومات پر ہو، علامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ [م ۹۷۰ھ] لکھتے ہیں:

سواء كان من الاعتقادات، أو الوجدانيات أو العمليات ومن ثم سمى الكلام فقها أكبر.<sup>3</sup>

”خواہ ان کا تعلق اعتقادات سے ہو یا وجدانیات سے، یا عملیات سے یہی سبب ہے کہ ”علم الکلام“ کو فقہ اکبر کہا جاتا ہے۔“

1- Richard C. Martin, Mark R. Woodward, and Dwi S. Atmaja, eds., *Defenders of Reason in Islam: Mu'tazilism from Medieval School to Modern Symbol*, Oxford: Oneworld, 2003, p.120.

۲- جلال الدین السیوطی، الاشباہ والنظائر فی النحو، حیدرآباد دکن: دارالمعارف العثمانیہ، ۱۳۵۹ھ، جلد ۱، صفحہ ۵۔

۳- ابن نجیم المصری، البحر الرائق، کوئٹہ: مکتبہ رشیدیہ، [س-ان]، خطبہ الکتاب، جلد ۱، صفحہ ۱۶۔

اسی لیے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ [م ۱۵۰ھ] کی باب العقائد میں مشہور تالیف کا نام ہی ”الفقہ الاکبر“ ہے۔ مگر بعد میں فقہ دین کے عملی و احکامی پہلو کا نام رہ گیا اور اعتقادات کے فن کو ”علم الکلام“ کہا جانے لگا، یہ بھی عقلی مباحث پر مشتمل ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے تصوف کی مہمات الکتب اور صوفیہ کرام کی مہمات دیکھ رکھی ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ تصوف کی علمی روایت فلسفہ و کلام کے نقطہ کمال سے اپنا آغاز کرتی ہے۔

ہر انسان کی عقلی صلاحیت و لیاقت یکساں نہیں ہے بہ اعتبار مراتب و مدارج اس میں تفاوت ہے، ایک ہی آیت یا حدیث سے ایک اصولی یا فقیہ ایک دو مسئلوں کا استنباط کرتا ہے، جب کہ دوسرا جو اس سے ”افقہ“ ہے دسیوں مسائل کا استخراج کرتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

نضرا لله عبداً سمع مقالتي فوعاها، ثم أداها الي من لم يسمعها، فرب حامل فقه لا فقه له، ورب حامل فقه الي من هو أفقه منه<sup>۱</sup>

”اللہ تعالیٰ اُس بندے کو تر و تازہ رکھیں جو میری بات سُنے، اُس کو یاد کرے پھر اس تک پہنچادے جس نے اسے نہیں سنا، کیوں کہ بعض پہنچانے والے علم کے خود فہیم نہیں ہوتے اور بعض ایسوں کو پہنچاتے ہیں جو اس پہنچانے والے سے افقہ [زیادہ فہیم] ہوتے ہیں۔“

اسلامی عقلی منہاج اور منظور احمد کی عقلیت پسندی: دو متوازی تصورات اور مختلف نتائج:

فقہ، کلام اور تصوف کے تمام عقلی مظاہر کیا اسی ”عقلیت“ کا نتیجہ ہیں جس کا اظہار نیاز فتح پوری کی ”من ویزادوں“ اور منظور احمد کی ”اسلام۔ چند فکری مسائل“ یا ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“ میں ہوا ہے؟ یہ عقلیت نہیں تشکیک ہے، تحقیق نہیں تلبیس ہے اور اجتہاد نہیں الحاد ہے جو حقیقت کی معرفت نہیں اُس سے برکشتگی اور بغاوت پر اُکساتی ہے، قرآن و سنت، اور فقہاء، متکلمین و صوفیہ کا اس عقلیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں، وہ عقل و فہم اور علم کے استعمال کے حامی و مؤید ضرور ہیں، مگر صدیق و فاروق اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کی عقلیت کے جن کی ہر بات کا جواب ایک ہی ہوتا تھا: اللہ ورسولہ اعلم [اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی جانتے والے ہیں]۔ یعنی وہ اعمال کی ہدایت اور اشکال کی تعیین میں بھی وحی کی ہدایت اور رہنمائی کے طالب تھے، یہ عقلیت و تفہیم، عقل محض اور فہم مجرد نہیں بلکہ عارف و بصیر اور مطیع عقل و فہم ہے۔ اسی لیے صاحبان علم و نظر بزرگوں کے ارشاد کے مطابق مسلمانوں کی دینی اور مابعد الطبعی روایت میں عقل واضح احکام نہیں مستدل احکام ہے، منشی احکام نہیں مدرک احکام ہے، ملہم احکام نہیں منہم احکام ہے اور مجتہد و متکلم شارع احکام نہیں شارح احکام ہیں، جس

۱- عبدالرحمن الدارمی، سنن الدارمی، باب الاقتداء بالعلماء، جلد ۱ صفحہ ۳۰۲۔

سے بالذات مقصود تسخیر کائنات نہیں، نجاتِ آخرت ہے۔ اسی سے اطاعت و بندگی، اعتماد و انقیاد اور تسلیم و رضا کی دولت میسر آتی ہے۔ باب العلم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے:

لو كان الدين بالرأى لكان أسفل الخف أولى بالمسح من اعلاه.<sup>۱</sup>  
 ”اگر دین عقل [محض] سے ہوتا تو موزے کے نچلی طرف مسح کرنا اوپر کی طرف مسح کرنے سے بہتر ہوتا۔“

اسی طرح حضرت معاذہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ایک عورت نے ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا:

مال بال الحائض تقضى الصوم ولا تقضى الصلاة فقالت أحرورية أنت؟  
 قلت لست بحرورية ولكني اسأل قالت كان يصيبنا ذلك فنؤمر بقضاء  
 الصوم ولا نؤمر بقضاء الصلوة.<sup>۲</sup>

”کیا وجہ ہے کہ عورت ایام حیض میں چھوڑی ہوئی نماز تو قضا نہیں کرتی، مگر روزے قضا کرتی ہے؟ آپ نے فرمایا، کیا تو حرور یہ ہے؟ [حرور یہ ایک جگہ حرور کی جانب منسوب ہے، جو خوارج کا مرکز تھا، اور خوارج دین میں شدت پسندی کے باعث مشہور تھے]، اس عورت نے کہا نہیں میں حرور یہ تو نہیں البتہ میں صرف وجہ جاننا چاہتی تھی۔ سیدہ عائشہ نے فرمایا، ہم عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں ایام سے دو چار ہوتی تھیں تو ہمیں روزوں کی قضا کا حکم دیا جاتا، نمازوں کا نہیں۔“

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے فرمایا:

يا ابن اخي! اذا حدثتک عن رسول الله صلى الله عليه وسلم حديثا فلا  
 تضرب له الامثال.<sup>۳</sup>

”اے میرے بھتیجے! جب میں تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کروں تو اس کے آگے مثالیں [منطوق وغیرہ] نہ بیان کیا کرو۔“

یہ وہ ذہنیت اور مزاج ہے جو صحابہؓ سے لے کر آج تک امت مسلمہ میں مسلسل منتقل ہوا ہے۔ اب سیدنا علی، ام المؤمنین سیدہ عائشہ اور سیدنا ابو ہریرہؓ پر تو عقل و فہم کی معطلی کا الزام نہیں لگایا جاسکتا، آخر تاریخی جبر اور معاشرتی دباؤ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے عقل و فہم اور علم کے استعمال کی کمی کا الزام مسلمانوں کے الہیاتی نقطہ نظر پر لگادیا گیا۔ جس سے کسی کو سمجھ میں نہیں آیا کہ مخاطب کون ہے؟ ورنہ منظور احمد

۱- سلیمان بن اشعث ابی داؤد، سنن ابی داؤد، باب کیف المسح، جلد ۱، صفحہ ۱۲۲۔

۲- مسلم بن حجاج القشیری، صحیح المسلم، باب وجوب قضاء الصوم علی الحائض دون الصلوة، جلد ۱، صفحہ ۱۵۳۔

۳- محمد بن یزید القزوینی، سنن ابن ماجہ، مائتان: المکتبۃ الفاروقیۃ [س-ن]، باب تعظیم حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و التغلیظ علی من عارضہ، صفحہ ۲۲۔

قرآن مجید اور احادیث نبویہ اور آثار صحابہؓ و اہل بیتؑ سے لے کر آج تک کسی ایک مسلم و محقق اہل سنت و جماعت سے تعلق رکھنے والے عالم کا نام تو پیش فرمائیں جو ڈاکٹر صاحب کی مزعومہ ”اعتزالی عقلیت“ کا حامی ہو۔ ظاہر ہے ایسا کوئی حوالہ پیش کرنا جوئے شیر لانے کے مرادف ہے۔ اس لیے کبھی فقہا پر نقد کیا جاتا ہے تو کبھی مسلمانوں کے الہیاتی نقطہ نظر پر۔ اصل مسئلہ، جس سے دل تنگ اور ذہن پریشان ہیں، یہ ہے کہ اسلام مبہم اقدار کا مجموعہ، یعنی موم کی ناک، کیوں نہیں ہے؟ اس میں ہیات و اشکال تک کا تعین کیوں کر دیا گیا ہے اور امت کی مسلسل روایت نے شدت کے ساتھ اس پر اعتراف و عمل کی مہر کیوں ثبت کر دی ہے؟ اس لیے اب یہی کہا جاسکتا ہے کہ ہیات و اشکال لازمانی و لامکانی نہیں ہیں بلکہ ان میں سے اکثر کا تعلق قرون اولیٰ سے تھا۔ ہم اکیسویں صدی میں رہتے ہوئے اس شدتِ اطاعت اور بنیاد پرستی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ایسے لوگوں کا اظہارِ اسلام بہت ہی مضحکہ خیز اور تصنع و تکلف کا حامل ہوتا ہے جو اسلام کی کھل کر نہ مخالفت کر سکتے ہیں، کہ اس کے لیے مردانہ جرأت چاہیے، اور نہ ہی اسلام کو مکمل اطاعت اور اقلندگی کے ساتھ قبول کر سکتے ہیں کیوں کہ اس کے لیے جاں نسیں اور علمی مشقت درکار ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے ممدوح حیناز فتح پوری کی رائے بڑی صائب ہے:

”میں ان اہل مذاہب کو اچھا سمجھتا ہوں جو کسی علمی برہان و حجت کو اپنے پاس آنے ہی نہیں دیتے اور خدا کو صرف ”بلا دلیل“ پہچاننے کے مدعی ہیں کیوں کہ ان کے اندر ایک ایسا عزمِ راسخ پنہاں ہے کہ اس کے مقابلے میں علم کو بھی خاموش رہ جانا پڑتا ہے۔ لیکن وہ حضرات جو اپنے عقائد کی صحت میں عقلی دلائل پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں وہ حقیقتاً وہی ہیں جو مذہب کی طرف سے مطمئن بھی نہیں ہیں اور اس کے ترک کر دینے کی جرأت بھی اپنے اندر نہیں پاتے، یہ سب مذہب کے نہایت خطرناک دوست ہیں۔“

مغرب سے نبرد آزمائی اور ”نقل کے پیادے“: اصل خطرہ:

رہا منظور احمد کا یہ ارشاد: ”نقل کے پیادے مغرب یا امریکہ کو شکست نہیں دے سکتے“ قرین انصاف نہیں۔

یہ نقل ہی کا اعجاز ہے جس نے دنیا کے تمام مسلمانوں کو اب تک روحانی و جذباتی طور پر عہد رسالت سے عملاً وابستہ و مربوط رکھا ہوا ہے۔ مسلمان نقل کے آئینے میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب و احباب کو مدینہ منورہ کی گلیوں میں چلتا پھرتا دیکھتے اور خود کو اس عہد سے منسلک پاتے ہیں، یہی سبب ہے کہ ایک مسلمان اپنے مستقبل کا ہر فیصلہ ماضی کے مثالی معیار پر کرتا ہے۔ یہ جذباتی وابستگی اس روایتِ نقل کا تسلسل ہے جو متواتر و مسلسل عقائد و اعمال کے ذریعے اسلاف سے اخلاف کو بہ طور میراث ملی ہے۔



نقل کے پیادے: اسلامی علمیت کے محافظ صورت اور معنی دونوں کے ساتھ:

آج مغرب کے لیے اصل خطرہ ”نقل کے پیادے“ ہی ہیں، جن سے مغرب کو اپنی بساط کے اٹنے کا ڈر ہے۔ اسی لیے وہ مسلمانوں کا رشتہ ان کے ماضی سے کاٹ کر مستقبل کے مادہ پرستانہ نظام سے جوڑنا چاہتا ہے۔ تنویری علمیات [Enlightenment Epistemology] نے دنیا کی ہر روایت و تہذیب کو علمیا ت بنیادوں پر مسخر کر لیا۔ عیسائیت نوافلاطونیت [neoPlatonism]، کانٹ کی عقلیت [Rationalism] اور ہیوم کی تجربیت [Empiricism] کا شکار ہو گئی، بدھ علمیت اور چینی روایات کو ہیگل کی تاریخی جدلیت [Historical Materialism] اور مارکس کے [Dialectical Idealism] نے فتح کر لیا، وغیرہ وغیرہ۔ مگر نقل کے پیادوں نے دوسو برس فرنگی استبداد و تسلط کے باوصف آج تک اسلامی علمیت کو اس کی نفرا دیت اور اصل تعبیر کے ساتھ زندہ و محفوظ رکھا ہے۔ مشہور یہودی مستشرق Bernard Lewis جو اسلام پر مغرب میں سند سمجھا جاتا ہے اور کئی زبانوں پر عبور رکھتا ہے، وہ عالم اسلام اور ملت اسلامیہ کو بہت اچھی طرح پہچانتا ہے، وہ اعتراف کرتا ہے کہ اکثر مسلم ممالک میں اسلام ابھی تک مسلمانوں کی دین سے وفاداری اور شناخت کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ اسلام ہی ہے جو اپنوں اور دوسروں یعنی مسلمین اور دیگر میں فرق کو روا رکھتے ہوئے سب کو ایک تصور نہیں کرتا۔ مغربی دنیا میں شناخت اور تشخص کے بہت سے تصورات ہیں، مگر کوئی تشخص انسانوں کی شناخت کا واحد معیار نہیں، مغرب میں لوگ قومیت، ملک اور اس سے متعلق ذیلی شناختوں کے ذریعے اپنے تشخص کا اظہار کرتے ہیں، جب کہ عالم اسلام میں قومیت اور ملک کی شناخت کا تصور بھی موجود ہے، بعض ممالک میں قومیت کو اہمیت حاصل ہے، لیکن عالم اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ بحرانوں کے دور اور ہنگامی حالات میں بھی اُمت مسلمہ اپنی وفاداریوں کا مرکز و محور اسلام ہی کو سمجھتی ہے، اس کی شناخت کا واحد ذریعہ اسلام ہے، مسلمان اسلام سے اپنی وفا کا رشتہ جوڑ کر زبان، ملک، قومیت، نسل اور رنگ وغیرہ کے امتیازات اور معیارات سے ماورا ہو جاتا ہے۔ مسلمین اپنے سوا پوری دنیا کو اپنے سے الگ اور کافر سمجھتے ہیں، پندرہ سو سال سے اُمت مسلمہ اسی عقیدے پر پورے استقلال و ثبات سے قائم ہے، یہ اُمت اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کو اپنا دوست نہیں دشمن سمجھتی ہے، غرض تمام مسلمانوں کے لیے اسلام ہی واحد اور قابل قبول ذریعہ شناخت ہے، لیوں کا موقف اُس کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

What then is the power, the attraction of Islam, both as a claim to allegiance and as a revolutionary appeal? This is a large and complex question, from which at this point I would like to bring a few major themes to your attention. The first which seems to me relevant is that in most Muslim countries Islam is still the ultimate criterion of group identity and loyalty. It is Islam which

distinguishes between self and other, between insider and outsider, between brother and stranger. We in the Western world have become accustomed to other criteria of classification, by nation, by country, and by various subdivisions of these. Both nation and country are of course old facts in the Islamic world, but as definitions of political identity and loyalty they are modern and intrusive notions. In some countries, these notions have become more or less acclimatized. But there is a recurring tendency in times of crisis, in times of emergency, when the deeper loyalties take over, for Muslims to find their basic identity in the religious community; that is to say, in an entity defined by Islam rather than by ethnic origin, language, or country of habitation.

And just as the insider is defined by his acceptance of Islam, so in the same way the outsider is defined by his rejection of Islam. He is the *kafir*, "the unbeliever," i.e., he who does not believe in the apostolate of Muhammad and the authenticity of the revelation which he brought. The languages of Islam, like those of the civilizations of antiquity, of Christendom, and of Asia, have words to denote the stranger, the foreigner, the barbarian. But from the time of the Prophet to the present day, the ultimate definition of the Other, the alien outsider and presumptive enemy, has been the *kafir*, the unbeliever.

A second related point is that for many, probably most, Muslims, Islam is still the most acceptable, indeed in times of crisis the only acceptable, basis for authority. Political domination can be maintained for a while by mere force, but not indefinitely, not over large areas or for long periods. For this there has to be some legitimacy in government, and this purpose, for Muslims, is most effectively accomplished when the ruling authority derives its legitimacy from Islam rather than from merely nationalist, patriotic, or even dynastic

claims-still less from such Western notions as national or popular sovereignty. In political life, Islam still offers the most widely intelligible formulation of ideas, on the one hand of social norms and laws, on the other, of new ideals and aspirations. And, as recent events have repeatedly demonstrated, Islam provides the most effective system of symbols for political mobilization, whether to arouse the people in defense of a regime that is perceived as possessing the necessary legitimacy or against a regime which is perceived as lacking that legitimacy; in other words, as not being Islamic or, perhaps, as having forfeited that legitimacy by no longer being Islamic. ۱

آج مغرب کے لیے اصل خطرہ ”نقل کے پیادے“ ہی ہیں، جن سے اُسے اپنی بساط کے اُلٹنے کا خوف لاحق ہے، مدارس دینیہ کے فیضان کی بدولت ملت اسلامیہ بیرونی اور اندرونی یلغار و خلفشار اور جدیدیت کے تند و تیز حملوں کے باوجود آج بھی من حیث الکل ماڈرن نہ ہو سکی۔

اسی سبب سے مغرب مدارس دینیہ کو اپنے لیے ایک عظیم خطرہ سمجھتا ہے، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ سیاسی عمل داری، تہذیبی غلبے، قیادت عالم کی بقا اور جنگ و جدال کے اس سارے عمل میں مغرب کی راہ کا سب بڑا پتھر مدارس دینیہ ہیں، جو پندرہ سو سال سے، کائنات میں ذات حق کے ”الحق“ ہونے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور الکتاب کے ”الحق“ ہونے پر اپنے زندہ اور موجود ہونے کو مشروط رکھے ہوئے ہیں۔ ہفت روزہ اکانومسٹ لندن کے خصوصی شمارے ”A Survey of Islam“ کے مطابق دنیا کی قیادت کے لیے مغربی تہذیب کا حریف ایک ہی ہو سکتا ہے: اسلام — اسلام سے مغرب کا تصادم ہو سکتا ہے، اس لیے کہ اسلام ایک آئیڈیا ہے، آج کی دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد آئیڈیا۔ یہ آئیڈیا انسانی تجربے اور مشاہدے سے ماوراء حق کے وجود پر یقین کا مدعی ہے! اس کے نزدیک یہ، وہ حق ہے جو چودہ سو سال پہلے محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] پر نازل ہوا اور قرآن کی صورت میں محفوظ و موجود ہے، ایک تہذیب کی قوت اور غلبے کے لیے ایسے ”الحق“ پر یقین کی قوت کے برابر کوئی قوت نہیں۔ اسی لیے اہل یورپ اسلام اور مسلمانوں سے خائف ہیں، انھیں خطرہ ہے ایک نئی سرد جنگ آرہی ہے جو غالباً سرد نہ رہے گی۔

ہفت روزہ اکانومسٹ کی اصل عبارت یہ ہے:

Islam claims to be an idea based upon a transcendental certainty. The certainty is the word of God, revealed syllable by syllable to Muhammad

1- Bernard Lewis, *The Political Language of Islam*, Chicago: University of Chicago Press, 1988, pp. 4-5.

in a dusty corner of Arabia 1,400 years ago and copied down by him into the Koran.

As a means of binding a civilisation together, there is no substitute for such a certainty. Moreover—— and this is not happening anywhere else —— new recruits are flocking to join this claim to certainty. Whether it is because of the repeated defeats inflicted upon Muslims by the outside world, or because of the corrupt incompetence of most of their own governments, the past 25 years have seen a huge growth in what outsiders call Islamic fundamentalism. Muslims themselves hate the phrase, but it is not inaccurate. A large number of people who feel ashamed of the past few centuries want to show they can do better. To do that, they need to rediscover a sense of identity. And to do that, they turn back to the Koran. You can call it a revival, or a resurgence; but it is also a return to the foundations.

This is what has set scalps tingling in other parts of the world, especially among Europeans. They see the Last Ideology on the march. A Muslim crescent curls threateningly around the southern and eastern edges of Europe. A new cold war could be on the way. And it may not stop at being a cold war.<sup>1</sup>

مدارس دینیہ: مغرب کے لیے ہم وقت خوف:

اسی لیے مدارس دینیہ مغرب کے حملوں کا سب سے بڑا ہدف اور نشانہ ہیں، اور ہر طرح کے الزامات و اتہامات کی زد میں ہیں۔ سابق برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیر نے مدارس کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا:

There are two views of what is happening in the world today. One view is that what is happening is not qualitatively different from the terrorism we have always lived with ..... We try not to provoke them and hope in time they will wither. The other view is that this is a wholly new phenomenon.

1- "A Survey of Islam" in *The Economist*, Aug 6th 1994, pp. 4-5.

Worldwide terrorism is based on a perversion of the true, peaceful and honourable faith of Islam; that its roots are in the madrassas of Pakistan, the extreme form of wahabi doctrine of Saudia Arabia in the former training camps of al-Qaeda in Afghanistan. If you take this view, the only path to take is to confront the terrorism, remove its roots and branches and at all costs stop its acquiring the weapons to kill on a massive scale. ۱

”آج جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے، اس کے بارے میں دو نقطہ نظر ہیں۔ ایک یہ کہ یہ دہشت گردی کوئی نئی نرالی چیز نہیں۔ یہ ہوتی ہی آئی ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں کہ ان لوگوں کو چھیڑا جائے۔ یہ خود ہی ختم ہو جائیں گے۔ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ ایک بالکل نرالا ظہور ہے۔ یہ عالمگیر نوعیت کی دہشت گردی ایک سچے، پرامن اور معزز دین، اسلام کی تحریف پر مبنی ہے اور اس کی جڑیں ہیں پاکستان کے مدرسوں میں، سعودی وہابیت کی انتہا پسندانہ شکل میں اور القاعدہ کے سابق افغانی ٹریننگ کیمپوں میں۔ اس نقطہ نظر کو قبول کیا جاتا ہے تو پھر واحد راہ عمل یہ ہے کہ اس دہشت گردی سے ٹکرایا جائے، اس کی جڑوں اور شاخوں سب کا صفایا کیا جائے اور کسی بھی قیمت پر یہ نوبت نہ آنے دی جائے کہ اس کے ہاتھ میں وسیع پیمانے پر مار دھاڑ کے ہتھیار آجائیں۔“

مغرب کا یہ خوف و خطرہ کچھ غلط اور بے جا بھی نہیں، مدارس سے فارغ ہونے والے طلباء اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کامل سے لبریز اور ان کی اٹھائی ہوئی ”بنیادوں“ پر پوری شدت اور پورے اخلاص و یقین سے عمل پیرا ہوتے ہیں، خواہ فی الوقت وہ اپنے مقاصد و عزائم کے لیے درکار اہلیت سے لیس نہ ہوں اور آج اپنی بھرپور نمائندگی اور سہرا ہی کا فریضہ بہ احسن وجوہ انجام نہ دے پارہے ہوں، جسے اس عہد میں ان کا خاصہ بننا تھا۔ لیکن یہی بنیاد پرستی مغرب کے لیے اصل خطرہ ہے کہ:

ہونہ جائے اشکارا شرع پیغمبر کہیں

تبلیغی جماعت: مستقبل میں مغرب کے لیے خطرے کا الارم: ۶۵

اسلامی علمیت اور ”نقل کے پیادوں“ سے مغرب کے لیے کیا کیا خطرات پوشیدہ ہیں مغرب کا ہر بڑا مفکر بہ خوبی اس سے واقف اور آگاہ ہے، خواہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب جیسے جدیدیت پسند کتنے ہی اعزازانہ نقطہ ہائے نظر اختیار کر لیں۔ تبلیغی جماعت جیسی بے ضرر اور پرامن جماعت کو جو کسی احتجاج اور تشدد پر یقین نہیں رکھتی، بس دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے ساری انسانیت کو اللہ کی بندگی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اختیار کرنے کی راہ دکھاتی ہے، اس کو مغرب اپنے لیے ایک مستقل خطرہ اور مستقبل میں تصادم کا سبب گردانتا ہے۔ ہندوستان اور امریکہ سے بہ یک وقت شائع ہونے والی

1- The Times, 30 Sep. 2004.

Farhad Khosrokhava کی مرتب کردہ کتاب میں Shireen T. Hunter نے *Reformist and Moderate Voices in European Islam* میں تبلیغی جماعت کے بارے میں مغرب کا نقطہ نظر واضح کرتے ہوئے صاف لکھا ہے:

Yet European publics do not consider these groups to be moderate; they view them as a Trojan horse that might cause a clash between secular European and Islamic values!-

عزت اسلام کے ساتھ غیر مشروط وابستگی اور اطاعت میں ہے:

عقل کے گھوڑوں کی لگام تو خود مغرب یا امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔ جو اپنے عہد کے ہر غالب فکر اور رجحان سے مغلوب و مرعوب ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح ان افکار کی اسلام سازی کی سند مل جائے۔ ان کا منہ تہائے مقصود تسخیر کائنات اور ماڈی ترقی ہے۔ مگر نقل پر ایمان رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے اسباب و علل ہرگز وہ نہیں ہیں جو دیگر اقوام و ملل کے ہیں۔ انھیں اس کی خوب خبر ہے کہ دنیوی ترقی کی ہر راہ علوم نقلیہ سے بے اعتنائی اور امت کے عمل مسلسل کے سودے سے مشروط ہے۔ لیکن علوم نقلیہ ہی نے انھیں خبر دی ہے کہ عزت اور فلاح صرف اور صرف اسلام کے ساتھ غیر مشروط وابستگی میں ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، جنہیں ڈاکٹر منظور احمد صاحب ”علم اسرار الدین“ کا بانی فرماتے ہیں، ان کا ارشاد ہے:

انَا كُنَّا اَذِلَّ قَوْمٍ فَاَعَزَّنَا اللهُ بِالْاِسْلَامِ فَمَهْمَا نَطْلُبُ الْعِزَّ بِغَيْرِ مَا اَعَزَّنَا اللهُ بِهِ اَذَلَّنَا اللهُ.

”ہم قوموں میں ذلیل ترین تھے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کے ذریعے عزت دی جب بھی ہم اسلام کو چھوڑ کر عزت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اللہ تعالیٰ ہمیں ذلیل کرے گا۔“

1- Farhad Khosrokhavar, "Reformist and Moderate Voices in European Islam" in *Reformist Voices of Islam: Mediating Islam and Modernity*, ed., Shireen T. Hunter, New York: M.E. Sharpe, 2009, p.250.

۲- عبد اللہ حاکم نیشاپوری، المستدرک علی الصحیحین، القاہرہ: دار الحرمین، ۱۳۱۷ھ/۱۹۹۷ء، کتاب الایمان، جلد ۱، صفحہ ۱۲۰۔

## علم اور ایمان — نسبت و تعلق

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”میرے نزدیک علم، ایمان کا معاملہ نہیں، بلکہ قضیات سے متعلق ہے، جو اگرچہ صادق ہی کیوں نہ ہوں، کاذب ہونے کا امکان رکھتے ہیں۔ ایسے تمام قضایا جس میں کذب کا امکان نہ پایا جاتا ہو، علم سے متعلق نہیں ہوتے البتہ ایمان سے متعلق ہو سکتے ہیں۔“<sup>۱</sup>

ایک مقام پر مزید لکھتے ہیں:

”ایسے تمام قضایا جن پر صدق اور کذب کا اطلاق نہ ہو سکے، سائنس اور علم کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔“<sup>۲</sup>

ڈاکٹر صاحب کے منقولہ بالا مفروضے پر گفتگو سے قبل ڈاکٹر صاحب کی بیان فرمودہ علم کی تعریف کا ماخذ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بیان ”میرے نزدیک“ کہہ کر ارشاد فرمایا ہے جب کہ منطقی تحلیل [Analytical Philosophy] اور منطقی ایجابیت پسند [Logical Positivism] جیسے فلسفیانہ مکاتب، ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے استاذ فلسفہ بننے سے بھی پہلے بلکہ معرض وجود میں آنے سے قبل یہ مفروضہ پیش کر چکے تھے کہ وہ خبر جس میں شک [doubt] کا امکان نہ ہو علم نہیں ہے۔ اس خیال کو Wittgenstein نے مختلف دائروں اور جہتوں میں استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ”کذب“ کے امکان کو رومانا ہے جب کہ وٹکنسٹائن ”شک“ [Doubt] کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یہاں کذب اور ریب کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا، جن لوگوں نے Munits کی کتاب Introduction of Logical Positivism دیکھ رکھی ہے وہ اس فرق سے بہ خوبی آگاہ ہیں۔ Wittgenstein کے مطابق کسی بھی علمی قضیے کی تین شرطیں، ہیں، یعنی جب کوئی I Know کہتا ہے تو اس میں تین احتمالات پائے جاتے ہیں:

۱- منظور احمد، ”پیش لفظ“، مشمولہ اقبال شناسی، صفحہ ۸۔

۲- منظور احمد، ”چند تعلیمی مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۵۴۔

[۱] امکان ہے کہ وہ قضیہ شک سے لبریز ہو یعنی اس میں Element of Doubt موجود ہو۔  
 [۲] علم پہنچانے والا وہ دائرہ اور منہاج واضح کرے گا، جس پر چل کر مطلوبہ ادراک یا فہم حاصل ہو سکا ہے تاکہ اسے Follow کر کے وہ جانا جاسکے جو وہ جان چکا ہے مطلوب، طالب کی استعداد سے جانا جاسکتا ہو، یعنی learning کے امکانات پائے جاتے ہوں۔

[۳] جس میں بہر حال غلطی کا امکان [possibility of mistake] رہے گا۔ اسی لیے وہ کہتا ہے:

I know I am in pain ..... no one can experience my pain; no one can feel this. ۱

علم کی اس تعریف کو مذہبی علییت پر چسپاں کرنے کا سب سے ہولناک نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شک کرنے کی آزادی ہو، ایسا طریقہ کار وضع کیا جائے جس پر چل کر وحی کا تجربہ اسی طرح ممکن ہو جس طرح رسول کو ہوا تھا۔ اور وہ طریقہ سب کے مشاہدے اور تجربے میں لایا جاسکے۔ ظاہر ہے یہ تو ناممکن ہے اس لیے علم کی اس تعریف نے پوری مذہبی علییت کو ذاتی تجربہ [private experience] قرار دے کر اقلیم علم ہی سے خارج کر دیا۔

مابعد الطبیعیات: مہمل اور جعلی افکار: منطقی ایجابیت پسند:

منطقی ایجابیوں نے پوری مابعد الطبعی علییت کو مہمل [nonsense] گردانتے ہوئے اسے مجہول فکر [idle speculation] کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے جعلی فکر [Pseudo speculation] قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ حقیقت یا اشیا کی ماہیت کو، جو مابعد الطبعی فکر کا بنیادی مقصد ہے، سمجھا جاسکتا ہے نہ جانا جاسکتا ہے اور نہ اس کا تجربہ کیا جاسکتا ہے۔ E.Mach کہتا ہے:

The domain of the transcendent is inaccessible to us ..... I confess, however, frankly that its inhabitants are not able to stimulate my curiosity. I am no philosopher but only a scientist ..... I have no attempted to introduce some new philosophy into science but rather to remove an old and absolute one. ۲

”ماورا کے علاقے تک ہماری رسائی نہیں، میں صاف طور پر کہتا ہوں کہ اس کے باشندے میرے تجسس کو بالکل تحریک نہیں دیتے، میں ایک فلسفی نہیں ہوں بلکہ ایک سائنس دان ہوں..... میں نے سائنس میں کسی نئے فلسفے کی بنیاد نہیں ڈالی بلکہ ایک پرانے اور ناکارہ فلسفے کو ختم کر دیا۔“

- 1- Mark Jago, *Wettgenstein*, Humanities-Ebooks, 2007, p. 66.
- 2- Philipp G. Frank, *Philosophy of Science: The Link Between Science and Philosophy*, Connecticut: Greenwood Press Publishers, 1974, p. xx.



اسی طرح وٹکنسٹائن کہتا ہے:

The correct method in philosophy would really be the following: to say nothing except what can be said, i.e. propositions of natural science ..... whenever someone else wanted to say something metaphysical, to demonstrate to him that he had failed to give a meaning to certain signs in his propositions. ۱

”فلسفہ کا صحیح طریقہ کار یہ ہونا چاہیے کہ صرف وہ کہا جائے جو کہا جاسکتا ہے، یعنی صرف فطری علم [Natural Science] کے قضیات پیش کیے جائیں ..... اگر کوئی شخص مابعد الطبعی بات کہنا چاہے تو اسے بتلایا جائے کہ وہ اپنے قضیوں میں چند اشاروں کو معنی پہنانے میں ناکام رہا ہے۔“

کارنپ کہتا ہے کہ ہم فلسفے کا کوئی مکتب فکر نہیں ہیں ..... ہم فلسفیانہ سوالات کے جوابات نہیں دیتے ہیں بلکہ ان تمام سوالات کو، جو مابعد الطبعیات، اخلاقیات اور عملیات سے متعلق ہوتے ہیں، رد کر دیتے ہیں، کیونکہ ہمارا واسطہ منطقی تحلیل [Logical Analysis] سے ہے، اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

We are not a philosophical school ..... We give no answer to philosophical questions, and instead reject all philosophical questions, whether of Metaphysics, Ethics or Epistemology. For our concern is with Logical Analysis. ۲

ایئر کا موقف یہ ہے کہ مابعد الطبعی بیانات کو اس لیے رد نہیں کیا جاتا کہ وہ ہیجانی ہیں بلکہ یہ کہ وہ علمی ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں، ان کو بے معنی اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کا کسی بھی واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کوئی بھی بیان جو کہ ممکنہ حدود کے پرے کسی حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے، اس کی کوئی لفظی معنویت نہیں ہے، وہ کہتا ہے:

Tautologies and contradictions are degenerate cases of factual statements Metaphysical assertions, on the other hand, are meaningless because they bear no relation to fact They are not constructed out of elementary statements in any way at all. ۳

ایک اور منطقی تجربیت پسند پرس کے نزدیک جعلی [مابعد الطبعی] مسئلے کا حل اس لیے ممکن نہیں کہ کم از کم انسانی تجربے میں اس کا موضوع قطعی ناقابل وقوف ہوتا ہے۔ اس کے برعکس حقیقی تجربہ وہ ہے

- 1- Ludwig Wittgenstein, *Tractatus Logico-Philosophicus*, 6.53., p. 89.
- 2- Rudolph Carnap, *The Unity of Science*, Oxon: Routledge, 2011, pp. 21-22.
- 3- A. J. Ayer, *Logical Positivism*, USA: The Free Press, 1959, p. 12.

جس کی تجرباتی تصدیق ہو سکتی ہے۔ جس چیز کا کسی بھی طرح وقوف ممکن نہیں، اس کا کوئی تصور قائم نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ وہ چیز تجربے میں نہیں آتی۔ پیرس [Peirce] کے الفاظ یہ ہیں:

On the other hand, all our conceptions are obtained by abstractions and combinations of cognitions first occurring in judgments of experience. Accordingly, there can be no conception of the absolutely incognizable, since nothing of that sort occurs in experience. But the meaning of a term is the conception which it conveys. Hence, a term can have no such meaning. ۱

ان تمام اقتباسات سے واضح ہو گیا کہ منطقی ایجابیوں کے نزدیک مابعد الطبیعیات ایک جعلی فکر ہے۔ تاہم یہ ملحوظ رہے کہ ان کا انکار مابعد الطبیعیات کا منہج و اسلوب لا ادویوں [Agnostics] سے مختلف ہے۔ لا ادویوں کے نزدیک خدا کے وجود کا اثبات یا استرداد علم کے محدود ہونے کی بنا پر ممکن نہیں۔ اس لیے کسی بھی حکم کو، خواہ اقراری ہو یا انکاری، معطل رکھنا چاہیے۔ جب کہ منطقی ایجابیوں کے نزدیک مسئلہ ان جملوں یا بیانات کی صداقت یا تکذیب کا نہیں بلکہ ان کے معنی و مفہوم کا ہے۔ ان کی نظر میں یہ دونوں جملے کہ خدا موجود ہے یا خدا موجود نہیں ہے، لغو اور مہمل ہیں۔ ان جملوں کی صداقت کے عدم تعین کا سبب علم کی محدودیت نہیں بلکہ ان کا بے معنی اور مہمل ہونا ہے، جب کہ کسی جملے کی صداقت یا تکذیب کی شرط اس کا بامعنی ہونا ہے اور بامعنی ہونے کے لیے اس کا محسوس و مشاہد ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی جملہ بے معنی، لغو یا مہمل ہے تو اس کی صداقت یا تکذیب کے تعین کا سوال اٹھانا حماقت ہے۔ اگر منطقی ایجابیت پسندوں کے ان بیانات کو درست مان لیا جائے تو سائنس و ٹیکنالوجی اور دیگر بہت سے طبیعی حقائق بھی بے معنی اور مہمل ہو جائیں گے۔ جب کہ اصلاً ایسا نہیں ہوتا، اس طرح تو کوئی شے بھی دائرہ علم میں داخل نہیں ہو سکے گی اور علم محض لاعلمی کا نام رہ جائے گا۔ صدق و کذب کے معیارات کو لسانیات کے حوالے سے جانچنے اور پرکھنے کا واحد مطلب صدق و کذب کے معیارات سے دست بردار ہونا ہے۔ اس لیے کہ لسانیت کی جڑیں منطقی ایجابیت اور ویانا کے مکتبہ فکر میں پیوست ہیں، جن کا واحد مقصد مابعد الطبیعیات کا دائرہ بحث سے اخراج ہے، ان پر بحث اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے مرادف ہے۔ یہ تصورات عام زبان کے استعمال میں کسی منطقی مغالطے کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ معروف فلسفی و لگنڈسٹائن خود اپنے موقف کے بارے میں کہتا ہے:

My propositions serve as elucidations in the following way: anyone who understands me eventually recognizes them as nonsensical. ۲

- 1- Charles Sanders Peirce, *Peirce on Signs: Writings on Semiotic*, [ed., James Hoopes], University of North Carolina Press, 1991, p. 50.
- 2- Ludwig Wittgenstein, *Tractatus Logico-Philosophicus*, 6.54., p. 89.

”میرے قضایا ان معنوں میں تشریحی ہیں کہ جو مجھے سمجھتا ہے وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ سب مہمل ہیں۔“

منطقی ایجابیت پسند: مابعد الطبیعیات پر اعتراضات کی حقیقت: سوالات و اعتراضات:  
سوان نظریات کی بنیاد پر کوئی حتمی اور یقینی بات کہنا کیسے ممکن ہے اور پھر لسانی نظریات ایک دوسرے سے گنجگ اور مختلف ہونے کے علاوہ زبان کو سائنسی اساس پر ریاضی کی طرح سچے تلے انداز میں آسان اور عام فہم بنانے کی دھن میں اس کی قواعدی نحو کو منطق سے مطابقت دے کر اسے ایک بے جان اور خشک ڈھانچے میں تبدیل کر دیتے ہیں، جس میں حقیقت کا دائرہ بس ”بلی کالی ہے“ جیسے حسی جملوں تک ہی محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔

اب سے پہلے زمانے میں یہ ایک مسلمہ امر رہا ہے کہ جملے کے تین لازمی اجزا ہوتے ہیں: اسم، فعل اور حرف۔ اور یہ امر بھی مسلمہ رہا ہے کہ اسم کسی چیز کے نام پر دلالت کرتا ہے، مگر منطقی ایجابیوں اور لسانی نظریہ سازوں کا کہنا ہے کہ اسم کسی چیز پر دلالت نہیں کرتا ہے، بلکہ ہر لفظ اور جملہ کسی مخصوص حالت [situation] میں بولا جاتا ہے۔ چنانچہ جملے میں معنی ڈھونڈنے کی بجائے ہمیں اس صورت حال کا تجزیہ کرنا چاہیے جس میں کوئی جملہ بولا گیا ہے، اس قسم کے تجزیے کے ذریعے یہ لوگ ثابت کرتے ہیں کہ روح یا خدا کے بارے میں جتنے جملے بھی بولے جاتے ہیں، وہ نہ سچے ہیں نہ جھوٹے، بلکہ بے معنی ہیں۔

اچھا، اگر منطقی ایجابیوں اور لسانی نظریہ سازوں کے نزدیک خدا اور روح جیسے مابعد الطبیعیاتی حقائق حسی اور تجربی بنیادوں پر ناقابل مشاہدہ اور ناقابل توثیق و تصدیق ہیں، تو کیا ان کے نزدیک برقیہ [electron]، انرجی [energy]، قوت [force]، قانون تجاذب [Law of Gravitation]، قانون تغلیل [Law of Causality] اور قوانین فطرت [Law of Nature] اسی طرح microcosmos اور Quantum Physics سے متعلق مباحث جیسے مسلمہ سائنسی حقائق بھی اس طور پر اور ان ہی معنوں میں ایمانی وجود نہیں ہیں؟ کیا انھیں حسی اور تجربی بنیادوں پر اثباتی معنوں میں قابل مشاہدہ اور قابل تصدیق قرار دیا جاسکتا ہے؟ اگر معنی کے معروضی نظریے کی رو سے خدا کو اسی طرح وقوفی اور تجربی ہونا چاہیے جیسا کہ ایک پتھر ہے تو کیا حروف عطف [conjunctions]، حروف جار [prepositions]، اعداد اور صفات وغیرہ بھی ایسی چیزیں ہیں جو کسی پتھر کی طرح وقوفی اور تجربی ہوں؟ اگر ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کے مطابق مختلف قسم کے جملے مختلف قسم کے معیارات صدق و کذب سے جانچے جاسکتے ہیں تو وہ ایسے جملوں کو کون سے معیارات صدق و کذب سے جانچیں گے جن میں حروف عطف، حروف جار، اعداد اور صفات وغیرہ کا استعمال ہوا ہو۔

۱۔ جمال پانی پتی، ”نقطہ نظر کی بطن اور موضوع کا خرگوش“، مشمولہ مکالمہ: کراچی: اکادمی بازیافت، شمارہ ۱۳ جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۲ء۔ صفحات ۵۲-۵۳۔

یہ منطقی ایجابیوں کے نزدیک علم اور اس کی صداقت و تکذیب کا تصور ہے جو مابعد الطبیعیات کی لغویت اور بے معنی ہونے کے اصرار پر قائم ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب منطقی ایجابیوں کی اس تعریف و توضیح کو اس علمیت پر چسپاں فرما رہے ہیں جہاں مابعد الطبیعیات علم کے اصول و فروع کا بنیادی مقدمہ ہے۔ غیب مطلق اس علمیت کا اختصاص ہے۔ اس کی حیثیت قانونی اور حجیت بنیادی ہے۔

### منظور احمد: تصور علم: ایک تفصیلی جائزہ:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی بیان فرمودہ تعریف کے اصل ماخذ کی طرف اشارے کے بعد آئندہ صفحات میں اس تعریف کا ایک تحقیقی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے کہ آیا صرف مذہب ہی یقین اور وجوب کے اصول پر استوار ہے جس کے باعث ڈاکٹر صاحب نے اسے اقلیم علم سے خارج فرما دیا ہے اور کیا واقعی سائنس عملاً ہمیشہ نفی و تکذیب کے اصول پر سفر کرتی ہے اور اسے کسی ایقان و مابعد الطبیعیات کی حاجت نہیں جس کی بنا پر ڈاکٹر صاحب نے سائنس اور علم کو ہم معنی اور مترادف قرار دے دیا ہے؟ اور کیا علم اور ایمان میں آپس میں کوئی ربط و تعلق نہیں؟

ڈاکٹر منظور احمد کے دعوے کے مطابق:

[۱] کسی قضیے میں کذب کا احتمال ہی اس کے علمی قضیہ ہونے کی دلیل ہے، اور ایسا چوں کہ صرف سائنسی منہاج ہی میں ممکن ہوتا ہے اس لیے درحقیقت سائنس ہی ”علم“ ہے۔

[۲] دینی منہاج چوں کہ کسی قضیے کی صداقت میں شبہ کے امکان کو بھی روا نہیں سمجھتا، اسی لیے مذہب کا منہاج علمی نہیں ایمانی ہے۔ ایمان کا تعلق انفرادی پسند و ناپسند سے ہے، اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ جس پر ایمان لایا جا رہا ہے وہ فی الحقیقت موجود بھی ہو۔ اس لیے سائنسی منہاج ہی مثالی [ideal] اور عالی [superior] ہونے کے باعث ”علم“ کہلانے کا مستحق ہے۔

غور طلب بات یہ ہے ڈاکٹر صاحب اپنے اس موقف کے حق میں نہ تو کسی علمباتی منہج [Epistemological Discourse] کا حوالہ دیتے ہیں اور نہ ہی ان کا دعویٰ کسی علمی بنیاد پر قائم ہے۔ ان کے تمام دلائل مغربی افکار و اقدار میں اسلامی پیوند کاری [Crafting] کا شاخسانہ ہیں۔

### سائنسی دعویٰ: تین بنیادی شرائط:

سائنس کو ”علم“ اس بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ روایتی حامیان سائنس کے نزدیک، سائنسی دعویٰ تین شرائط سے مشروط ہوتا ہے:

|                      |             |
|----------------------|-------------|
| [Objectivity]        | [۱] معروضیت |
| [Universalizability] | [۲] آفاقیت  |

[۳] مفروضیت سے بالا [Pre-Supposition Less]

معروضیت:

سائنس کا تصور حقیقت معروضیت ہی میں پنہاں ہے۔ معروضی دعویٰ ایسا دعویٰ کہلاتا ہے جو انفرادی احساسات و رویے، خواہشات و جذبات اور نظریات سے ماورا [impersonal] ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر کسی شے کے بارے میں ایسا دعویٰ جس کا وجود یا عدم انسان کے ساتھ نہیں بلکہ اشیا کے ساتھ خاص ہو، معروضی دعویٰ کہلاتا ہے۔

معروضیت کی حقیقت پر ہیوم کے اعتراضات:

علت اور معلول [cause & effect] کے ضمن معروف مغربی فلسفی ہیوم [David Hume, 1711-1776] کے دلائل پڑھ لینے کے بعد معروضیت کے تمام دعویٰ محل نظر معلوم ہوتے ہیں۔ ہیوم کے نزدیک معروضیت کی تلاش ممکن ہی نہیں ہے۔ تجربی علوم کی بنیاد استقرائی استنتاج [Inductive Inference] پر مشتمل ہوتی ہے۔ یعنی چند ایک جزئی مثالوں سے مشاہدات کی یکسانیت اور مشابہت کی بنا پر عمومی اور کلی نتائج اخذ کر لیے جاتے ہیں۔ سائنس دان اپنی تجربہ گاہ میں جو تجربے کرتا ہے وہ اپنی تعداد کے لحاظ سے محدود ہوتے ہیں، لیکن اپنے نتائج کے اعتبار سے عمومی اور ہمہ گیر مانے جاتے ہیں۔ استقرائی ”کچھ“ سے ”تمام“ کی طرف پیش رفت کا نام ہے۔ جب بھی معروضیت کی تلاش کی جاتی ہے تو وہ سبب [cause] اور اثر [effect] کے درمیان موجود تعلق کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس تعلق کی بنیاد فطرت کی یکسانیت [Uniformity of Nature] ہے تجربہ نہیں۔ اسی فطرت کی یکسانیت پر یقین تمام تجربی عمل کی اساس ہے۔ انسانی ذہن میں یہ یکسانیت اس درجے راسخ اور مستحکم ہوتی ہے کہ منفی مثال سامنے آجانے پر بھی یہ یقین متزلزل نہیں ہوتا۔ ہیوم کے مطابق اگر علت اور معلول کا تجربی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ علت و معلول کے درمیان فقط مقارنت اور تسلسل کے اور کوئی ربط و ضبط نہیں۔ ان کے درمیان لزوم اور عالم گیریت فی الحقیقت پائی نہیں جاتی بلکہ یہ محض ہمارے ذہن کا آفریدہ ہے۔ ”رگڑ کی صورت میں پیدا ہونے والی چنگاری حرارت پیدا کرتی ہے“ — یہ دعویٰ ہیوم کے مطابق تجربی بنیادوں پر ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے اندر کوئی منطقی لزوم نہیں ہے، گزشتہ تجربات اور شواہد کی بنا پر ہم نے یہ تعمیم وضع کر لی ہے کہ رگڑ کی صورت میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ ورنہ رگڑ کی صورت میں حرارت کا پیدا ہونا، یہ دو واقعات کے محض تکرار کا نتیجہ ہے۔ اور اس تکرار ہی نے اس لزوم اور عالم گیریت کو ہمارے ذہن میں راسخ کر دیا ہے۔ ماضی میں ہونے والے تجربات کا مستقبل میں ہونے کا یقین قبل تجربی [a-priori] دعویٰ

۱۔ اس سلسلے کی عام فہم اور علمی وضاحت کے لیے دیکھیے:

زاہد صدیق مغل، ”سائنسی طریقہ علم کیا ہے؟“ سائنٹیفک میٹھڈ اور مذہب“ [حصہ اول]؛ زاہد صدیق مغل، سید محبوب الحسن، ”کیا اسلام سائنسی مذہب ہے؟“ سائنسی طریقہ علم کا اسلامی جائزہ“ [قسط دوم]، مشمولہ ”جریدہ“، نمبر ۳، صفحات ۱۱۰-۱۱۶۔  
زیر قلم بحث میں بعض نکات کی تفہیم کے لیے محولہ مضمون سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

ہے۔ تجربہ ہمیشہ A-Posteriori ہوتا ہے جو کبھی *a-priori* دعوے کو روکا نہیں رکھتا۔ علت اور معلول ہیوم کے نزدیک دو ایسے واقعات ہیں جو ڈھیلے ڈھالے اور منفصل [Loose and Separate] ہیں۔ ان کے درمیان صرف ایک ہی تعلق ہے: ربط و تسلسل — اور یہ بھی تقدم [before] اور تاخر [after] کا رشتہ ہے۔ جو واقعہ پہلے وقوع پذیر ہوتا ہے اسے علت [cause] اور بعد والے واقعے کو معلول [effect] کہا جاتا ہے۔ ان کے درمیان لزوم ذہنی عادت ہے۔ اس کا تجربی عمل سے کوئی تعلق نہیں۔ یکساں مثالوں کے اعادے کی بنا پر ذہن کی عادت بن جاتی ہے کہ وہ ایک واقعے کے ظہور پر دوسرے واقعے کی توقع کرے جو پہلے واقعے کے بعد عموماً رونما ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ رابطہ جسے ہم اپنے ذہن میں ”محسوس“ کرتے ہیں اور تخیل کی ایک شے دوسری شے پر منتقل ہونے کی یہ عادت، وہ عاطفہ ہے جو کہ رابطہ لزوم کا باعث بنتا ہے۔ ہیوم لکھتا ہے:

That after a repetition of similar instances, the mind is carried by habit, upon the appearance of one event, to expect its usual attendant, and to believe that it will exist. This connexion, therefore, which we feel in the mind, this customary transition of the imagination from one object to its usual attendant, is the sentiment or impression from which we form the idea of power or necessary connexion.<sup>۱</sup>

آفاقیت:

آفاقی دعویٰ ایک ایسا دعویٰ کہلاتا ہے جس کا ایجاب و سلب یا اثبات و انکار زمان و مکاں سے ماورا اور سب پر ہو۔ ظاہر ہے جب کوئی دعویٰ معروضی نہیں ہوگا، تو اس کا آفاقی اور عالم گیر ہونا بھی ممکن نہیں ہے۔ جو دلائل سائنسی دعوے کی معروضیت کے رد میں پیش کیے جاسکتے ہیں، وہی دلائل کسی دعوے کو ایک مخصوص پس منظر اور زمان و مکاں کے تناظر میں حاصل ہونے والے نتیجے کے طور پر بھی پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس عہد کا قابل ذکر سائنس دان فائن مین اس حقیقت کو مثالوں کے ذریعے واضح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

For example, it is possible to arrange an atom which is ready to emit light, and we can measure when it has emitted light by picking up a photon particle, which we shall describe shortly. We cannot, however, predict when it is going to emit the light or, with several atoms, which one is going to. You may say that this is because there are some

- 1- subsequent to experience.
- 2- prior to experience.
- 3- David Hume, *Enquiries Concerning the Human Understanding and Concerning the Principles of Morals*, Oxford: Clarendon Press, 1902, p. 75.

internal "wheels" which we have not looked at closely enough. No, there are no internal wheels; nature, as we understand it today, behaves in such a way that it is fundamentally impossible to make a precise prediction of exactly what will happen in a given experiment. This is a horrible thing; in fact, philosophers have said before that one of the fundamental requisites of science is that whenever you set up the same conditions, the same thing must happen. This is simply not true, it is not a fundamental condition of science. The fact is that the same thing does not happen, that we can find only an average, statistically, as to what happens. Nevertheless, science has not completely collapsed. Philosophers, incidentally, say a great deal about what is absolutely necessary for science, and it is always, so far as one can see, rather naive, and probably wrong. For example, some philosopher or other said it is fundamental to the scientific effort that if an experiment is performed in, say, Stockholm, and then the same experiment is done in, say, Quito, the same results must occur. That is quite false. It is not necessary that science do that; it may be a fact of experience, but it is not necessary. For example, if one of the experiments is to look out at the sky and see the aurora borealis in Stockholm, you do not see it in Quito; that is a different phenomenon.<sup>1</sup>

مابعد جدیدیت نے کسی بھی دعوے کی معروضیت و آفاقیت پر بہت اہم سوالات اٹھا کر ان کی حقیقت کو معرض سوال بنا دیا ہے۔ مابعد جدیدی مفکرین کے نزدیک کل وجود بیان محض ہے۔ جسے ہم حقیقت کہتے ہیں وہ بھی فقط ایک بیان سے زیادہ کچھ نہیں۔ حقیقت وغیرہ کا کوئی بیان آفاقی وابدی، ہمہ گیر و مستقل اور عمومی و واجب التسلیم نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح طبیعیات کی دنیا میں آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت [Theory of Relativity] کے نتیجے میں خود حقیقت معرض سوال ہو گئی ہے، ہر شے کو اضافیت [Relativity] کے تناظر میں دیکھا جا رہا ہے، کوئی شے مستقل، حتمی اور اٹل نہیں ہے، خیر و شر

1- Richard P. Feynman, *Six Easy Pieces: Essentials of Physics Explained by Its Most Brilliant Teacher*, New York: Basic Books, 2011, p.35.

آگے بڑھتی ہے مگر اس کے باوجود وہ یہ کہنے کی اہلیت نہیں رکھتی کہ:

Whether it is right or wrong, but we do know that it is a *little* wrong, or at least incomplete.<sup>1</sup>

بیسویں صدی کا سب سے بڑا سائنس دان رچرڈ فائن مین [R.P. Feynman]، جسے آئن اسٹائن کے درجے کے سائنس دانوں میں شامل کیا گیا ہے، نے Theory of Subatomic Particles or QED [Quantum Electro Dynamics] میں محیر العقول کام کیا ہے، جس پر اسے نوبل پرائز بھی دیا گیا، وہ اپنی معرکہ آرا کتاب میں لکھتا ہے:

It would be impossible to predict exactly what would happen. We can only predict the odds! This would mean, if it were true, that physics has given up on the problem of trying to predict exactly what will happen in a definite circumstance. Yes! Physics has given up. *We do not know how to predict what would happen in a given circumstance*, and we believe now that it is impossible, that the only thing that can be predicted is the probability of different events. It must be recognized that this is a retrenchment in our earlier ideal of understanding nature. It may be a backward step, but no one has seen a way to avoid it.<sup>2</sup>

اس بحث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ انسانی عقل پر مبنی اور مظاہر پر انحصار کرنے سے کسی ایسے علم کی تشکیل ممکن نہیں جو معرفت [objectivity]، آفاقیت [universalizability] اور پیش فرضیت [Pre-suppositionless] جیسی شرائط پر پورا اتر سکے۔ ایمانیات و تیقنات اور مابعد الطبیعیات کے بغیر علم کا تصور محال ہے۔

استقرا: سائنسی تحقیق کا ابتدائی اصول: بنیادی خامیاں:

راجر بیکن [Regor Bacon, 1214-1294] نے سائنس میں استقرا [Induction] جز کی بنیاد پر کل اخذ کرنے کا طریقہ متعارف کرایا۔ اس کے مطابق سائنس کا آغاز مشاہدے [observation] سے ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کثیر مشاہدات [حواسِ خمسہ] کی بنیاد پر آفاقی نوعیت

1- Richard P. Feynman, *Six Easy Pieces*, p. 39.

2- Ibid., p.135.



کے نظریات قائم کرنے کا طریقہ ہے۔ بادی النظر میں استقرائی طریقہ علم کا یہ دعویٰ بہت خوش نما، تسلی بخش اور فیصلہ کن معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر عمیق اور مبصرانہ نگاہ سے جائزہ لیا جائے تو اس طریقے کی کم زوریاں بہت واضح ہیں۔ اس کی کم زوریاں فلسفے کی ابتدائی کتابوں میں بھی وضاحت کے ساتھ مل جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ مدارس دینیہ میں مبتدی طلباء کے لیے منطق کا جو ابتدائی رسالہ پڑھایا جاتا ہے، اس میں استقرائی بحث میں یہ جملہ ملتا ہے: ”استقرایقین کا فائدہ نہیں دیتا“۔

سب سے پہلے تو یہ طے کر لینا ضروری ہے کہ مشاہدات کی کتنی تعداد ”کثیر“ کہلائے جانے کی مستحق ہے، جن کی بنیاد پر نظریات قائم کیے جاسکیں، ہزار، دس ہزار، لاکھ یا کروڑ؟ اور پھر اس کے برعکس کتنے مشاہدات اس دعوے کو کالعدم قرار دینے کے لیے لائق سمجھے جائیں گے۔ مثلاً ایک دعویٰ یہ ہے کہ دنیا کے تمام کوڑے کالے ہوتے ہیں اور دلیل اس کی یہ ہے کہ مختلف اوقات و مقامات میں کالے کوڑوں کے کثیر مشاہدات نے اس دعوے کو تقویت بخشی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس سے یہ کیسے ثابت ہو جائے گا کہ آئندہ اور اگلا نظر آنے والا کو ابھی کالا ہی ہوگا۔ کیا لاکھوں کوڑوں کا کالا ہونا اس بات کو لازم کر دیتا ہے کہ دنیا کے تمام کوڑے کالے ہوتے ہیں؟

یہ دعویٰ کہ دنیا کے تمام انسان فانی ہیں استقرائی طریق سے ممکن الاثبات نہیں، یہ مفروضہ صرف اسی صورت میں پایہ ثبوت تک پہنچ سکتا ہے کہ ایک انسان دنیا کے تمام انسانوں کو زہر کھلا دے، جب سب مر جائیں تو کمپیوٹر کے بٹن پر ہاتھ رکھ کر خود بھی زہر کھالے، جیسے ہی اس کا دم نکلنے والا ہو تو وہ بٹن دبا کر اپنے دعوے کی تصدیق کر دے کہ دنیا کے تمام انسان فانی ہیں۔ ظاہر ہے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے تو تجربات و مشاہدات، خواہ کتنے ہی کثیر کیوں نہ ہوں، کسی آفاقی نظریے کی منطقی صحت کے لیے کافی نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح حرارت اور حدت کے باعث دھاتیں پھیل جاتی ہیں لہذا اس جزو کی بنیاد پر یہ کلیہ اخذ کر لیا گیا کہ تمام دھاتیں گرمی پہنچانے سے لازماً پھیل جاتی ہیں، جب کہ اس وقت بہت سی دھاتیں دریافت بھی نہیں ہوئی تھیں اور اب بھی ممکن ہے بہت سی دھاتیں عدم دریافت کے باعث پردہ خفا میں ہوں، لیکن چند تجربات و مشاہدات کے باعث مذکورہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا، اسے استقرائی تعمیم [inducting generalization] کہتے ہیں۔ ممکن ہے اگلا مشاہدہ اور تجربہ اس دعوے کو مسترد کرتے ہوئے کالعدم قرار دے دے۔ لہذا سائنسی تعمیم [Scientific Generalization] کی لازمی توثیق [certain verification] نہیں ہوتی۔ کیوں کہ آپ کے تجربات آپ سے خاص [particular] ہیں۔

استقرا: سائنس کی غیر سائنسی بنیاد: برٹریڈ رسل:

اسی لیے برٹریڈ رسل [Bertrand Russel] کا کہنا ہے کہ اگر سائنس کی بنیاد استقرائیت [Inductivism] ہے تو سائنس خود غیر سائنسی بنیادوں پر کھڑی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تجربات کی مسلسل کامیابی کے باوجود آپ کسی دعوے کو حتمی اور ٹھوس حقیقت قرار نہیں دے سکتے، اس کے

لیے رسل نے ایک عمدہ مثال دی ہے:

This turkey found that, on his first morning at the turkey farm, he was fed at 9 a.m. However, being a good inductivist, he did not jump to conclusions. He waited until he had collected a large number of observations of the fact that he was fed at 9. a.m., and he made these observations under a wide variety of circumstances, on Wednesdays and Thursdays, on warm days and cold days, on rainy days and dry days. Each day, he added another observation statement to his list. Finally, his inductivist conscience was satisfied and he carried out an inductive inference to conclude, "I am always fed at 9 a.m.". Alas, this conclusion was shown to be false in no uncertain manner when, on Christmas eve, instead of being fed, he has his throat cut. An inductive inference with true premises has led to a false conclusion. <sup>۱</sup>

”۲۶ دسمبر کو آپ ایک ٹرکی [مرغی کی ایک قسم] خرید کر لائے، صبح نو بجے آپ نے اسے کھانا دیا، اس کے بعد روزانہ آپ کا یہی معمول رہا کہ آپ اسے صبح نو بجے کھانا دیتے رہے، سردی، گرمی، خزاں، بہار، بارش اور طوفان میں اسے وقت مقررہ نو بجے تک کھانا ملتا رہا۔ اس مسلسل تجربے کی کامیابی نے مرغی کے اس یقین کو راسخ کر دیا کہ اگلے سال ۲۵ دسمبر کو بھی اسے نو بجے کھانا ملے گا، اس کا یہ یقین ٹھوس تجربات اور مسلسل تجربات کی کامیابی سے ثابت شدہ حقیقت تھا، لیکن اگلے سال ۲۵ دسمبر کو صبح نو بجے اسے کھانا دینے کے بجائے اس کی گردن پر چھری پھیر دی گئی کیوں کہ کرمس کے دن ٹرکی کے گوشت سے کھانا تیار کیا جانا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تجربات و جزئیات سے اخذ کردہ نتائج کی بنیاد پر بنائے گئے کلیات کی مدد سے قطعیت، [certainty] تک نہیں پہنچا جاسکتا۔“

سائنسی مشاہدہ مفروضے کا محتاج ہے:

سب سے بڑی بات یہ کہ ہر مشاہدہ چند مفروضات یا مابعد الطبیعیات کا مرہون منت ہوتا ہے۔ ایک ہی شے کا مشاہدہ معاشرتی، ثقافتی اور تاریخی تناظر میں پہلے سے حاصل شدہ علم کی تبدیلی سے بدل جاتا ہے۔ نظریات و مزعومات کی محتاجی، ہی فی الاصل سائنس کے امتیازی خصائص کو علمی سطح پر مورد

1- A. F. Chalmers, *What is this Thing Called Science?*, p.14.

سوال بنا دیتا ہے، کیوں کہ سائنس کو آفاقی اور اعلیٰ علم باور کرانے کی اساس اس نکتے پر تھی کہ اس کی بنیاد فقط ”مشاہدہ“ ہے، جس کا تعلق کسی فرد یا جماعت کی خواہشات و نظریات سے نہیں ہوتا، لہذا سائنس ہی حصول علم کا وہ واحد تجربی طریق ہے جو آفاقی ہے۔ اس سے ہٹ کر، بہ شمول وحی الہی، جتنے طریقے ہیں وہ آفاقی طور پر عقلی نہیں ہیں۔ لہذا علم صرف وہ ہے جو استقرائی طریقے سے حاصل ہوتا ہے لیکن اوپر یہ بات بالخصوص بیان ہو چکی ہے کہ سائنس کے استقرائی طریق کی ابتدا نظریات سے ہوتی ہے اور نظریات سے ابتدا اس بات کا از خود اعتراف ہے کہ یہ حصول علم کا کوئی اعلیٰ اور انوکھا طریق نہیں — پھر ہر نظریہ اور مشاہدہ اپنے اظہار میں لفظ اور زبان کا محتاج ہے اور زبان فی الحقیقت مخصوص نظریات ہی کو بیان کرتی ہے خواہ وہ نظریات کیسے ہی معمولی اور فرومایہ ہوں۔

ان سوالات و اشکالات کی عدم جوابی کے باعث استقرائی تعلیمات منطقی اعتبار سے نادرست قرار پائیں کیوں کہ اس دعوے کی رو سے ”معنی“ کی تصدیق پذیری کے نظریے کے لیے بڑی اہم مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جنہیں Problem of Induction کہا جاتا ہے۔ لامتناہی میکی سائنسی نظریات [Unrestricted General Scientific Theories] کی توثیق ممکنہ مشاہداتی شواہد [Possible Accumulation of Observational Evidence] کے اجتماع کے ذریعے ممکن نہیں۔

چامراستقری پر ہیوم کے اعتراضات کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

There are a number of possible responses to the problem of induction. One of them is a sceptical one. We can accept that science is based on induction and Hume's demonstration that induction cannot be justified by appeal to logic or

۱- استقر اور اس کے استعمال میں اٹھنے والے مسائل اور اعتراضات کے لیے دیکھیے:

- [1] David Hume, *A Treatise of Human Nature*, edition by David Fate Norton and Mary J. Norton, Oxford: Oxford University Press 2000.
- [2] Bertrand Russell, *The Problems of Philosophy*, Oxford: Oxford University Press, 1959.
- [3] D.C Stove, *Probability and Hume's Inductive Scepticism*, Oxford: Oxford University Press, 1973.
- [4] K.R. Popper, "Conjectural Knowledge: My Solution of the Problem of Induction", in *Objective Knowledge*, Oxford: Oxford University Press, 1972.
- [5] I. Lakatos, "Popper on Demarcation and Induction" in *The Philosophy of Karl Popper*, [ed., P. A. Schilpp, La Salle, Illinois: Open Cort, 1974, pp. 241-74.

experience, and conclude that science cannot be rationally justified. Hume himself adopted a position of that kind. He held that beliefs in laws and theories are nothing more than psychological habits that we acquire as a result of repetitions of the relevant observations. ۱

تردیدیت: سائنسی تحقیق کے ارتقا کا اہم بنیادی مکتب:

ان مسائل کے حل اور ازالے کے لیے کارل پاپر [Karl Popper, 1902-1994]

نے اپنی کتاب *The Logic of Scientific Discovery*, [London: Hutchinson, 1968]

میں نظریہ تردیدیت [Falsification Theory] کو بیان کیا۔ اس کے مطابق سائنس کا آغاز

مفروضات پر مبنی نظریات سے ہوتا ہے، جن کا مقصد پیش آمدہ حوادث کی توضیحی پیش گوئیوں سے ہوتا ہے۔

نظریے کے بغیر مشاہدہ ممکن نہیں کیوں کہ مشاہدہ نظریے کی تصدیق یا تکذیب کے حق میں حکم لگانے کے لیے

کیا جاتا ہے۔ اس لیے علم کو غیر علم سے ممتاز کرنے کا معیار کسی نظریے، دعوے یا مفروضے یا خیال کی تجربی

تردید ہے۔ جس دعوے یا مفروضے کی تردید نہ ہو سکے وہ ”علم“ نہیں۔ اگر کوئی دعویٰ کاذب قرار دیے جانے

کی مسلسل اور سنجیدہ کوشش کے باوجود برقرار رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی حیثیت ثابت کر

دی، چنانچہ اس دعوے کو عارضی طور پر تسلیم کر لینا چاہیے مگر کوئی ایسا دعویٰ حتمی طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکے گا۔

انکار یا استرداد کی مسلسل کوشش کا پایا جانا ہی فی الاصل نظریے کی تائید یا اس کو استحکام بخشنے کے مترادف

ہے۔ اس سارے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ انفرادی نوعیت کے مشاہدات پر مبنی مقدمات کی تصدیق [یعنی

استقرائی طریقے سے] آفاقی نظریے کی تشکیل ممکن نہیں البتہ اس کی نفی [Falsification] سے ممکن

ہے۔ اس بنیادی نکتے کو ملحوظ رکھتے ہوئے پاپر [Popper] نے کہا کہ سائنسی تحقیقات سے مقصود کسی

دعوے کا اثبات نہیں بلکہ استرداد ہے۔ گویا سائنس نفی کے اصول پر سفر کرتی ہے۔ سائنس دان کسی واقعے کی

وضاحت کے لیے چند نظریات قائم کرتے ہیں اگر وہ نظریات، تجربات و مشاہدات کی روشنی میں غلط ثابت

ہو جائیں تو سائنس دان ان نظریات کو چھوڑ کر نئے نظریات قائم کر لیتے ہیں۔ ۲

1- A. F. Chalmers, *What is this Thing Called Science?*, p.19.

۲- پاپر اپنی کتاب میں اپنے نظریے کی تفصیل سے وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

These considerations led me in the winter of 1919-20 to conclusions which I may now reformulate as follows.

1. It is easy to obtain confirmations, or verifications, for early every theory--if we look for confirmations.

- = 2. Confirmations should count only if they are the result of *risky predictions*; that is to say, if, unenlightened by the theory in question, we should have expected an event which was incompatible with the theory--an event which would have refuted the theory.
3. Every 'good' scientific theory is a prohibition: it forbids certain things to happen. The more a theory forbids, the better it is.
4. A theory which is not refutable by any conceivable event is nonscientific. Irrefutability is not a virtue of a theory [as people often think] but a vice.
5. Every genuine *test* of a theory is an attempt to falsify it, or to refute it. Testability is falsifiability; but there are degrees of testability: some theories are more testable, more exposed to refutation, than others; they take, as it were, greater risks.
6. Confirming evidence should not count *except when it is the result of a genuine test of the theory*; and this means that it can be presented as a serious but unsuccessful attempt to falsify the theory. [I now speak in such cases of 'corroborating evidence'.]
7. Some genuinely testable theories, when found to be false, are still upheld by their admirers -- for example by introducing *ad hoc* some auxiliary assumption, or by re-interpreting the theory *ad hoc* in such a way that it escapes refutation. Such a procedure is always possible, but it rescues the theory from refutation only at the price of destroying, or at least lowering, its scientific status. [I later described such a rescuing operation as a '*conventionalist twist*' or a '*conventionalist stratagem*'.]

One can sum up all this by saying that the criterion of *the scientific status of a theory is its falsifiability, or refutability, or testability.*

At the same time I realized that such myths may be developed, and become testable; that historically speaking all--or very nearly all--scientific theories originate from myths, and that a myth may contain important anticipations of scientific theories. Examples are Empedocles' theory of evolution by trial and error, or Parmenides' myth of the unchanging block universe in which nothing ever happens and which, if we add another dimension, becomes Einstein's block universe [in which, too, nothing ever happens, since everything is, four-dimensionally speaking, determined and laid down from the beginning]. I thus felt that if a theory is found to be non-scientific, or 'metaphysical' [as we might say], it is not thereby found to be =

تردیدیت: حقیقت اور سچ کا حصول ممکن نہیں:

سائنس کے نظریہ تردیدیت کے تحت سائنسی علم اقدام و خطا [trial and error] کے اصول پر ترقی کرتا ہے، جس نظریے کو جتنے زیادہ سائنسی مشاہدات سے غلط ثابت کیا جاسکتا ہو وہ اتنا ہی زیادہ سائنسی ہونے کا استحقاق رکھتا ہے۔ سائنس دان کسی پیش آمدہ واقعے کی تشریح اور وضاحت کے لیے کچھ نظریات پیش کرتے ہیں جنہیں غلط ثابت کیا جاسکتا ہو [نہ کہ فی الحقیقت وہ غلط ہی ہوں]، چنانچہ جو نظریات مزید مشاہدات و تجربات کی روشنی میں غلط ثابت ہو جائیں وہ خارج از سائنس سمجھے جائیں گے اور جو غلط ثابت نہ ہوں وہ اس وقت تک باقی رکھے جائیں گے جب تک وہ غلط ثابت نہ ہو جائیں۔ پاپر کہتا ہے کہ سائنس کوئی معروضی حقیقت نہیں، ہم اپنی غلطیوں سے سیکھتے ہیں، کیوں کہ مشاہداتی بیانات کے ذریعے منطقی طور پر آفاقی قوانین وضع کرنا محال ہے، ہم ہر لمحے سچ کے بارے میں زیادہ جان سکتے ہیں اور سچ کے قریب پہنچ سکتے ہیں، بالفاظ دیگر ہم سچ کو مطلق طور پر پانے کی جدوجہد ہی کرتے رہتے ہیں، حاصل نہیں کر پاتے:

I can therefore gladly admit that falsificationists like myself much prefer an attempt to solve an interesting problem by a bold conjecture, even [and

=unimportant, or insignificant, or 'meaningless', or 'nonsensical'. But it cannot claim to be backed by empirical evidence in the scientific sense--although it may easily be, in some genetic sense, the 'result of observation'.

[There were a great many other theories of this pre-scientific or pseudo-scientific character, some of them, unfortunately, as influential as the Marxist interpretation of history; for example, the racialist interpretation of history--another of those impressive and all-explanatory theories which act upon weak minds like revelations.]

Thus the problem which I tried to solve by proposing the criterion of falsifiability was neither a problem of meaning-fulness or significance, nor a problem of truth or acceptability. It was the problem of drawing a line [as well as this can be done] between the statements, or systems of statements, of the empirical sciences, and all other statements-- whether they are of a religious or of a metaphysical character, or simply pseudo-scientific. Years later--it must have been in 1928 or 1929--I called this first problem of mine the 'problem of demarcation'. The criterion of falsifiability is a solution to this problem of demarcation, for it says that statements or systems of statements, in order to be ranked as scientific, must be capable of conflicting with possible, or conceivable, observations.

Karl R. Popper, *Conjectures and Refutations: The Growth of Scientific Knowledge*, New York: Basic Books Publishers, 1962, pp.36-39.

گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سائنسی ڈھانچے مسائل کے حل میں غیر موثر ہو جاتے ہیں۔ سائنسی ڈھانچوں کے بننے بگڑنے کی حرکیات [Dynamics of Generation and D-Generation] of Scientific Structure کے تحت لوگ سائنس کے ایک منہاج کو ترک کر کے دوسرا اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن سائنس دانوں کی ایک بڑی اکثریت جو عقل اور سائنس کو معروضی اور آفاقی علم نہیں سمجھتی، Lakatos سے اتفاق نہیں کرتی، مغرب کے بڑے فلسفیوں نے سائنس کی آفاقیت و معروضیت کو تسلیم نہیں کیا، وہ اسے ایک خاص تاریخ و تہذیب اور عقلیت و ثقافت کی پیداوار سمجھتے ہیں۔

لے کاٹوش اور کوہن کی ان تمام تصریحات و توجیہات کو سامنے رکھ کر غور فرمایا جائے کہ اگر دینی علمیت کا کوئی نمائندہ مذہبی عقائد و اعمال کی توجیہ و تفہیم کا اتفاقاً یہی اسلوب اور رویہ اختیار کر لے تو جدیدیت پسند اسے جہالت اور خرافات کا نام نہیں دیں گے؟ جب کہ سائنس دانوں کے ان ہی اسلوب اور طریقوں کو ضابطے، قانون، تحقیق اور تفحص پر محمول کیا جاتا ہے۔ یہ رویہ خود ”مذہبی“ اور ”ایمانی“ ہے جس کی پرستش جدیدیت پسند پورے اخلاص و ایثار کے ساتھ بجالاتے ہیں اور اس تقلید و ایقان کو ”تحقیق“ کا نام دیتے ہیں۔ Jacques Barzun لکھتا ہے:

Yet science is an all-pervasive energy, for it is at once a mode of thought, a source of strong emotion, and a faith as fanatical as any in history.

اصولی طور پر جدیدیت پسندوں کو مذہب کی طرح سائنس اور فلسفے پر بھی ایمان نہیں لانا چاہیے۔ کیوں کہ مذہب کی طرح ان دونوں کی اساس بھی مابعد الطبیعی ہے۔ فلسفہ اور سائنس بھی مذہب کی طرح اعتقادات و ایمانیات سے شروع ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سائنسی علمیت کے تحت ایمانیات و اعتقادات کے باب میں ارتداد [apostasy] کی اجازت ہے اور مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا کیوں کہ وہ قولاً اور عملاً قطعی، حتمی اور ابدی ہے۔ جب کہ فلسفہ اور سائنس قولاً خود کو قطعی اور حتمی قرار نہیں دیتے، مگر عملاً سمجھے جاتے ہیں۔

صرف سائنس ہی ”علم“ نہیں:

علامہ اقبالؒ نے علم کے تین دائرے بیان کیے ہیں:

[1] مذہب [Religion]، [2] فلسفہ [Philosophy]، [3] شاعری یا آرٹ — اقبال کا خیال یہ ہے کہ یہ تینوں دائرے یکساں علتی سوالات [etiological questions] اٹھاتے ہیں، اقبال کے مطابق جمالیاتی دائرہ اپنی فطرت میں انفرادیت پسند ہے چنانچہ یہ مبہم اور لامتناہی ہے،

1- Jacques Barzun, Science: The Glorious Entertainment, Harper and Row, 1964, p.15 Chapter II & XII.

دوسری طرف مذہب کو شاعری پر برتری حاصل ہے، اس لیے کہ:

It enlarges his claims and holds out the prospect of nothing less than a direct vision of Reality.<sup>1</sup>

اس حوالے کے درج کرنے سے مقصود صرف اتنا تھا کہ اقبال نے بھی ”سائنس“ کو کسی علیحدہ منہاج علم کی صورت میں ذکر نہیں فرمایا، بلکہ اقبال کے افکار کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ سائنس کو فلسفے کی توسیع و تعمیم شدہ شکل سمجھتے تھے۔

سائنس کے لفظ کی تاریخ، حقیقت اور حدود جانے بغیر سائنس اور علم کو مترادف اصطلاحات سمجھنا علم جیسی ہمہ جہت اور کثیر الاطراف اصطلاح کو ایک محدود دائرے میں بند کر دینا ہے۔ فائن مین صرف سائنس کو علم سمجھنے والوں کو کہتا ہے:

If a thing is not a science, it is not necessarily bad. For example, love is not a science. So, if something is said not to be a science, it does not mean that there is something wrong with it; it just means that it is not a science.<sup>2</sup>

سائنس کی زبان ریاضی سائنس نہیں: فائن مین:

اسی طرح ریاضی [Mathematics] جو سائنس کی زبان ہے اسے بھی سائنس دان Natural Science تسلیم نہیں کرتے، اس لیے کہ اسے تجربے سے ثابت نہیں کیا جاسکتا، Feynman لکھتا ہے:

Mathematics is not a science from our point of view, in the sense that it is not a *natural* science. The test of its validity is not experiment.<sup>3</sup>

گویا سائنس کا انحصار مکمل طور پر غیر سائنس یعنی ریاضی پر ہے جو تجربے سے ماورا ہے۔

سائنسی تجربات غیر سائنسی عناصر پر انحصار کرتے ہیں: فیرابینڈ:

فیرابینڈ کے بقول سائنسی نتائج غیر سائنسی عناصر پر انحصار کرتے ہیں:

And the results of science don't prove its excellence, since these results have often depended on the presence of non-scientific elements.<sup>4</sup>

- 1- Mohammad Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Lahore: Institute of Islamic Culture, 2009, p. 1.
- 2- Richard P. Feynman, *Six Easy Pieces*, p.47.
- 3- Ibid., p. 47.
- 4- Paul Feyerabend, *Science in a Free Society*, p.102.



یہی سبب ہے کہ فیرابینڈ معروضی طور پر سائنس، علم نجوم [astrology] اور جادو [voodoo] میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ اسی لیے وہ لے کاٹوش [Lakatos] کو لکھتا ہے:

Having finished their 'reconstruction' of modern science they turn it against other fields as if it had already been established that modern science is superior to magic or to Aristotelian science, and that it has no illusory results ..... However, there is not a shred of an argument to support this assumption. "Rational reconstructions" take "basic scientific wisdom" for granted, they do not show that it is better than the "basic wisdom" of witches and warlocks. ۱

اٹھارہویں صدی تک سائنس اور نیچرل فلاسفی مترادف اصطلاحات کے طور پر استعمال نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن Scientific Method کے بعد یہ دونوں اصطلاحات ہم معنی ہو گئیں۔ سترہویں صدی تک انگریزی زبان میں لفظ سائنس صرف Aristotelian Concept of Knowledge کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

جدید اور قبل از جدید معاشرے: علم کی تعریف: فرق اور تبدیلی:

۱۸۷۰ء کے بعد Scientific Method عام ہوا اس سے پہلے اس کا استعمال بہت محدود پیمانے پر تھا۔ سترہویں صدی تک لفظ سائنس علم کے معنوں میں صرف Theory اور Philosophy کے لیے مخصوص تھا۔ ان دو علوم کے سوا تمام arts اور technique کہلاتے تھے۔ کچھ Liberal Arts تھے، جن میں خطابت [Rhetoric] ریاضی [Mathematics]، لسانیات [Linguistics] اور منطق [Logic] شامل تھے۔ پیشہ ورانہ فنون [Professional Arts] میں طب [Medicine] اور قانون [Law] کو شامل کیا جاتا تھا۔ باقی ماندہ فنون [Mechanical Arts] کہلاتے تھے، جن کے کارندوں اور کاری گروں کے کام کو قابل قدر نہیں سمجھا جاتا تھا، ان کے معاوضے نہایت قلیل ہوتے تھے۔ اس تقسیم و تحدید و ترتیب سے قبل از جدید معاشروں میں حفظ مراتب کے پاس دلچاظ کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کن علوم کو برتری اور فوقیت حاصل تھی اور کون سے علوم تلچھٹ تصور کیے جاتے تھے۔ مگر عصر جدید میں یہی علوم و فنون یعنی Mechanical Arts, Craft and Technique نہ صرف علوم عالیہ سمجھے جاتے ہیں

1- Imre Lakatos, Robert Sonné Cohen, Paul Feyerabend, Marx W. Wartofsky [eds.], *Essays in the Memory of Imre Lakatos*, Springer, 1976, p. 118.

بلکہ علم کی تعریف ان ہی فنون سے متعین ہونے لگی ہے۔ اب طبعی دنیا میں کمال اور مہارت رکھنے والا آدمی سب سے بڑا اور اہم سمجھا جاتا ہے۔ حفظ مراتب کی یہ تبدیلی کوئی معمولی بات نہیں بلکہ یہ پورے تصور حقیقت اور مابعد الطبیعیات کی تبدیلی ہے۔ اس تبدیلی ہی کی وجہ سے تصورِ خدا و آخرت، تصورِ کائنات، خیر و شر کے معیارات اور اخلاق اور سچائی کے پیمانے غیر اہم ہو گئے، بالفاظِ دیگر معزز علوم حقیر و ذلیل ہو گئے۔

دینی منہاج: علم: تصور اور تعریفات:

مذہبی ایمانیات و علمیات چوں کہ خیر کل، حقیقتِ کبریٰ اور ہستی مطلق کے پاس سے آتی ہیں، جو عالم الغیب والشہادۃ [Knoweth the Unseen and that which is open] اور زمان و مکان سے ماورا ہے۔ اس لیے یہ علم حتمی، قطعی، اٹل اور ناقابلِ تغیر ہے، یہاں علم کی متفق علیہ تعریفات یہ ہیں:

إدراک الشئ بحقیقته۔<sup>۱</sup>

”کسی شے کو اس کی حقیقت کے حوالے سے جان لینا علم ہے۔“

یا امام غزالی [م ۵۰۵ھ] کے الفاظ میں:

معرفة المعلوم علی ما هو بہ۔<sup>۲</sup>

”کسی شے کو اس کی حقیقت و ماہیت کے حوالے سے، جس پر وہ قائم ہو، جان لینا علم ہے۔“

امام سید شریف جرجانی [م ۸۱۶ھ] کے بقول:

هو الاعتقاد الجازم المطابق للواقع۔<sup>۳</sup>

”علم وہ پختہ اعتقاد ہے جو واقعہ کے عین مطابق ہو۔“

حافظ ابن حزم [م ۴۵۶ھ] کے ارشاد کے موافق:

هو یقن الشئ علی ما هو علیہ۔<sup>۴</sup>

”کسی شے کی ایسی حقیقت کا یقین جس پر وہ قائم ہو، علم ہے۔“

یعنی علم ایک ایسا قضیہ کلیہ موجب [nessary and universal judgement]

۱- راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، مکتبۃ نزار، مصطفیٰ الباز، [س-ن]، کتاب العین، علم، جلد ۲، صفحہ ۴۳۶۔

۲- ابو حامد محمد غزالی، المستصفیٰ من علم الأصول، امتحان ثان: اختلاف فی حد العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۴۔

۳- سید شریف جرجانی، معجم التعریفات، قاہرہ: دار الفیصلیۃ، [س-ن]، باب العین، العلم، صفحہ ۱۳۔

۴- علی بن حزم اللاندکی، الإحکام فی أصول الأحکام، بیروت: دار الآفاق الجدیدة، [س-ن]، جلد ۱، صفحہ ۳۶۔

ہے جو خارج میں موجود حقیقت کو صحیح طور پر جان لینے سے عبارت ہے، جو جوہنی اور شک و ظن سے پاک ہو اور اس کا انکار ممکن نہ ہو، یعنی لاریب فیہ [without doubt] ہو، اس کا اطلاق ایسے قضیے پر ہوتا ہے جو محکوم [Subject] اور محکوم بہ [predicate] پر مشتمل ہو اور جس کے متوازی خارج میں معروضی حقیقت موجود ہو۔ وہ قضیہ جو عارضی طور پر ”حقیقت“ مان لیا جائے، جس میں قطعیت و حتمیت کا نہیں بلکہ ہر لمحے شک و ریب اور کذب کا احتمال و امکان پایا جائے، جو بدل جائے اور مسلسل تغیر کے امکانات کو ظاہر کرے، وہ حقیقت اصلی نہیں بلکہ سائنسی حقیقت ہے۔ حقیقت ازل سے ابد تک واحد اور ناقابل تغیر و تبدل ہوتی ہے۔

مذہبی منہاج: علم کی تعریف مذہبی شعور پر منحصر ہے:

مذہبی سیاق میں علم کی تعریف اور علم و ایمان میں تطبیق یا تفریق اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک مذہبی شعور کو واضح اور دو ٹوک الفاظ میں بیان نہ کر دیا جائے۔ دین اور دینی فکر انسانی شعور کی جن بنیادوں پر پرداخت کرتی ہے اور اسے جن علمی مقاصد کی طرف یک سوڑھتی ہے اس سے تربیت پانے والا مذہبی ذہن علم کی اس تعریف کو قبول ہی نہیں کر سکتا جو ڈاکٹر منظور احمد صاحب پیش فرما رہے ہیں۔ مذہبی شعور و وجودی شعور ہے نہ کہ ذہنی شعور۔ مذہبی شعور وہ صلاحیت علم [وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا] ہے جس کے باعث آدم کو فرشتوں پر فوقیت دی گئی۔ ”معلومات“ مذہبی شعور کا ایک جز اور حصہ تو ہو سکتے ہیں، لیکن معلومات مذہبی فکر کا اختصاص، جو ہری حرکت یا مدار و اثبات علم نہیں بن سکتے۔ مذہبی فکر کا سب سے بنیادی جوہر یہ ہے کہ اس کے یہاں مجہول مطلق کا تصور ناپید ہے۔ یہاں حقیقت معلومیت کی قید سے ماورا اور اپنے وجود کی شان سے قائم ہے۔ مذہبی شعور کبھی فکر کو معلوم یا نامعلوم کے تناظر میں نہیں دیکھتا، بلکہ حق و باطل، صحیح و غلط یا مفید و مضر کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ مذہبی شعور ہرگز فلسفیانہ معنوں میں مابعد الطبعی نہیں ہے، اس لیے کہ مابعد الطبعی حقائق یا امور کے بارے میں مذہبی شعور ایک ایسے فیصلہ کن اعتماد پر کھڑا ہے جہاں اسے خود کو کسی بھی علمی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ یہاں حقائق کی معرفت خود حقیقت کے تحریک سے میسر آتی ہے۔

معرفت حق کے باب میں ذہن کا کردار: انفعالی:

حقیقت تک رسائی کے لیے ذہن کا کردار فاعلی نہیں بلکہ انفعالی ہے۔ ذہن فی الاصل انفعال محض ہے۔ یہ انفعال اگر مابعد الطبعی جہت سے ہو تو ایمان ہے اور اگر طبعی رخ سے ہو تو فکر یا تجربہ ہے۔ ایمان ذہن کی تسلیم کے اس عمل کا نام ہے جو وہ اپنی علمی کاوش سے دست بردار ہو کر انبیا و مرسلین پر اعتماد کر کے حاصل کر لیتا ہے۔ اسی لیے مذہبی علم کا اختصاص ہی ”ایمان بالغیب“ ہے، یہ ایمان قلب میں صرف ہو کر وہ یقین فراہم کرتا ہے جو اپنی تاثیر اور قوت میں عقل، تجربے اور مشاہدے سے حاصل ہونے والی معلومات سے بدرجہا اعلیٰ و ارفع ہے۔ ایمان کے نور سے حاصل ہونے والی یہ معرفت شعور کی تمام انواع کے لیے مورد یقین بن جاتی ہیں بلکہ اس میں ایسی شان پیدا ہو جاتی ہے کہ غیب بھی شہود بن جاتا ہے، جس کے باعث مظاہر اور علم کے اعتباری اور معنی اور وجود کے حقیقی ہونے کا مشاہدہ میسر آتا ہے۔

ایمان: علم کی منطقی تعریف احاطے اور کمال سے عاری ہے:

ایمان بالغیب پر قانع شعور علم و فکر کی اس منطقی تعریف کو قبول ہی نہیں کر سکتا جو حاصل معلومات کو ترتیب و تنظیم اور جوڑ توڑ کے عمل سے گزار کر مجہول سے معلوم کی طرف پیش رفت کرے۔ ایمانی شعور اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ حقائق کبھی مظاہر کی سطح تک نزول نہیں کرتے کہ وہ خود بھی ایک ”شے“ بن جائیں، بالفاظ دیگر حقائق کبھی معلومیت کا ہدف بنا قبول نہیں کرتے۔ اس لیے کہ شے کے معلوم ہونے کے لیے اس کا محسوس و مشاہد ہونا ضروری ہے۔ انسانی عقل، فکر اور شعور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو اعلیٰ پیمانے پر استعمال کرنے کے باوجود بھی زمان و مکان، کیفیت و کمیت اور تعینات و تحدیدات کے جبر کو نہیں توڑ سکتے۔ اس کے لیے محسوس و مشاہد ہی حقیقی ہے۔ اس لیے وہ غیب پر کوئی بھی حکم لگانے سے عاجز ہے۔ علم و شعور کا کوئی بھی عمل اسے تشبیہ کی حدود سے باہر نہیں نکال سکتا خواہ اس کی سرگرمی حسی ہو یا عقلی۔ ذات حق حدوث و فنا اور حد و جہت سے ماوراء ہے۔ اس لیے ذہن کو حقیقت کے ادراک میں کھپانے کا نتیجہ سوائے ناکامی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ بالفاظ دیگر علم و فکر کا تمام تر سفر صورت سے شروع ہو کر صورت ہی کے گرد گھومتا رہے گا اور حقیقت تک رسائی اس کے دائرہ حدود سے باہر رہے گی۔

علم، حصول نہیں حضور کا موضوع ہے: مذہبی شعور کا امتیاز:

مذہبی فکر اور دینی شعور جس اساس پر استوار ہے وہ یہ ہے کہ مکمل علم، جس کا معلوم مطلق، مستقل، یقینی، دائمی، اٹل اور غیر متغیر ہو، وہ حصول کا نہیں حضور کا موضوع ہے۔ انسانی ذہن اور شعور کی تمام تر صلاحیت اور استعداد از قبیل تجربہ ہیں، اور مظاہر کے احاطے کے لیے ہیں۔ حقیقت مطلقہ کسی متعین صورت کی اسیر نہیں ہے لہذا اس کی معرفت کے لیے جس نوع کے ادراک کی ضرورت ہے اس کا تعلق ”علم“ سے نہیں انکشاف سے ہے۔ گویا حق کی دو جہات ہیں تشبیہ اور تنزیہ۔ حقیقت حق کی جہت سے تنزیہی ہے اور خلق کی جہت سے تشبیہی۔ تشبیہ حواس کی جولان گاہ ہے اور تنزیہ خبر یعنی وحی کا موضوع ہے۔ معرفت کا عمل بلاشبہ نظر و فکر ہی سے شروع ہوتا ہے لیکن یہ ذریعہ علم کے حصول کی حتمی ضمانت نہیں دیتا، اسے اتمام و تکمیل اور یقین کی سند وحی عطا کرتی ہے۔ حقیقت تشبیہ و تنزیہ کی جامع ہے۔ معرفت حق کے باب میں عقل وحی کے تابع ہے اور یہ معرفت اپنی ماہیت میں ایمانی ہے نہ کہ عقلی و ذہنی۔ عقل کی نارسائی سے تصور سازی کا عمل پیدا ہوتا ہے، جس کی تصدیق کا کوئی ذریعہ عقل کے پاس نہیں ہے۔ مذہبی شعور اپنے اس خلقی نقص کو ایمان کے باعث حقائق

1- عقل کی قدرت تخیل ان اشیا کے ذریعے جو حواس کی حدود رسائی میں آتی ہوں، ایک ایسی شکل کا تصور کر سکتی ہے جس کا وجود نہ ہو، مگر اس کے اجزا کا مختلف جگہوں پر ہونا اس کی لازمی شرط ہے۔ لیکن قوت تخیل ایسے جز کا تصور نہیں کر سکتی جو حواس کی گرفت سے ماوراء ہو۔ عقل کی ایجادات اور اختراعات کا مدار ان اجزا پر ہوتا ہے جس کو وہ حس کی عطا اور عنایت سے معلوم کرتی ہے، پھر ان کو دوسرے اجزا سے [جو اسی دائرہ ادراک میں آتے ہیں] جوڑ کر ایک نئی شکل دے دیتی ہے۔ عقل اس سلسلے میں جوڑ توڑ، ترتیب و تنظیم، تحلیل و تجزیہ اور اضافہ و کمی تو کر سکتی ہے لیکن کسی جز کو تحسنت کے دائرے سے باہر جا کر تشکیل نہیں دے سکتی۔

کے علم، اثبات اور اقرار میں آڑے نہیں آنے دیتا اور نہ ہی اسے کسی علمی مطالبے کی تسکین کا ذریعہ بنانا ہے۔ اس لیے مسلمانوں میں تصور سازی کا عمل معدوم ہے۔ توحید و رسالت کوئی تصور نہیں جسے عقل تشکیل دے بلکہ یہ یقین ہے جو ایمان فراہم کرتا ہے۔ حقیقت بلاشبہ ماورائے علم اور ممتنع العلم ہے، لیکن اس کے باوجود واجب الاثبات اور ممکن الاستدلال ہے۔ عقل اس سے متفق ہے۔ مذہبی شعور اس امر سے بہ خوبی آگاہ ہے کہ حقیقت کا مظاہری اظہار تدریجی اور جزوی ہوتا ہے جو درجات کے اعتبار سے متنوع نوعیت کا ہو سکتا ہے، اس لیے مذہبی شعور حقیقت کو عقل کے لیے اجزا میں توڑ کر قابل فہم بنانے کے بجائے من حیث الکل واجب القبول بناتا ہے۔ جہاں حقیقت اپنی وجودی سطح سے اپنی پوری شان کے ساتھ منکشف ہو کر شعور انسانی کی تمام انواع کو ان کے امتیازات کے ساتھ منور کر دیتی ہیں۔ حقیقت کا یہ کلی ادراک اپنی ماہیت میں ذہنی [conceptual] نہیں بلکہ جوہری [essential] ہے۔ اس حقیقت کی معرفت کا نام ”علم“ ہے اور اسی علم کا نتیجہ ”ایمان“ ہے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ: **وَالرَّسُخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ [۷:۳۱]** ”اور پختہ اور مضبوط علم والے یہی کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لائے، یہ ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو صرف عقل مند ہی حاصل کرتے ہیں۔“ یہی علم والے لوگ سجدہ گزار ہوتے ہیں، گویا علم سجدے سے مشروط ہے: **إِنَّ الدِّينَ أَوْتُوا الْعِلْمَ مِّنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَى عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلذَّكَّانِ سُجَّدًا [۱۰۷:۱۷]** ”جنہیں اس سے پہلے علم دیا گیا، ان کے پاس جب بھی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں۔“ اور ان ہی صاحبان علم راسخ کی یہ علامات بھی بتلائی ہیں کہ: **لَكِنَّ الرَّسُخُونَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ [۱۶۲:۳]** ”لیکن اس میں سے جو کامل اور پختہ علم رکھنے والے ہیں وہ ایمان والے ہیں، جو اس پر ایمان لاتے ہیں، جو آپ کی طرف اتارا گیا ہے اور جو آپ سے پہلے اتارا گیا ہے۔“ ان ہی حاملان علم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کے گواہ کے طور پر اپنے ساتھ پیش فرمایا: **شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ [۱۸:۳]** ”اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور فرشتوں نے بھی اور اہل علم نے بھی راستی و انصاف کے ساتھ یہی گواہی دی ہے۔“ اور صرف دنیا ہی میں نہیں آخرت میں بھی ان کی گواہی قبول کی جائے گی: **قَالَ الدِّينَ أَوْتُوا الْعِلْمَ إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوءَ عَلَى الْكٰفِرِينَ [۲۷:۱۶]** ”[فردائے قیامت] علم والے پکار اٹھیں گے کہ آج تو کافروں کو رسوائی اور بُرائی چٹ گئی۔“ کافروں کے برعکس صاحبان علم و حاملان ایمان کو مژدہ سنایا گیا: **يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ [۱۱:۵۸]** ”تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جنہیں ”العلم“ عطا کیا گیا ہے، اللہ ان کے درجے بلند فرما دیں گے۔“ علم کا تقاضا عمل اور خواہش نفس سے رہائی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے خشیت ربی کو عالم کی

۱- اسلامی منہاج علم میں علم کی تعریف اور اس کی ماہیت و غایت کے سلسلے میں روایتی علما اور راسخ العقیدہ حلقوں کے علمی نمائندوں سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے، مزید برآں اس بحث کے بعض اہم نکات جناب احمد جاوید صاحب کی ایک فکری نشست میں کی گئی گفتگو سے بھی اخذ کیے گئے ہیں۔

پہچان قرار دیا ہے: اِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ [۲۸:۳۵] ”حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے ہی اس سے ڈرتے ہیں۔“ علم کی حقیقت نور ہے جو گناہوں کی کثرت اور خواہشِ نفس کو الہ بنا لینے سے زائل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے ”العلم“ حاصل ہو جانے کے بعد بے علم بننے والے کے قلب پر مہر لگا دینے کی وعید سنائی ہے: وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ [۹۳:۹] ”اور ان کے دلوں پر مہر خداوندی لگ گئی ہے، جس سے وہ محض بے علم ہو گئے۔“ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن نے کہا ہے: قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُونَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُونَ [۱۲۸:۶] ”کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے تو اس کو ہمارے رو بہ رو ظاہر کرو، تم محض گمان [خیالی باتوں] پر چلتے ہو اور نری قیاس آرائیاں [انکل] کرتے ہو۔“ حالاں کہ ظن و گمان معرفتِ حق کے حصول کے لیے کفایت نہیں کرتا اور روح کا بحر ان عقل کی میزان سے زائل نہیں ہو سکتا: بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا اَهُوَ آءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ [۲۹:۳۰] ”یہ ظالم تو بغیر علم کے خواہش پرستی کر رہے ہیں۔“ علم سے متعلق قرآن مجید کی چند آیات سے یہ مسئلہ کھل کر واضح ہو جاتا ہے کہ علم سے مراد حق کی معرفت ہے جو جہل کی ضد ہے۔ علم رب کی عطائے خاص اور انبیائے کرام علیہم السلام کی وراثت ہے۔ اسی علم کو سیکھنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے:

طلب العلم فريضة على كل مسلم.

اور اسی کو جنت کا راستہ قرار دیا ہے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ومن سلك طريقا يطلب فيه علماً سهل الله له طريقاً الى الجنة.  
”جو شخص علم کی جستجو میں کسی راستے پر چلا اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کے لیے جنت کی طرف جانے کا راستہ آسان کر دیتے ہیں۔“

یہاں علم مال کمانے کا راستہ نہیں بتاتا، بلکہ یہ معرفتِ رب اور مقصدِ تخلیق کا شعور حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، باب العلم سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے منسوب ایک قطعے میں اس فرق کو بڑی انفرادیت و بلاغت کے ساتھ واضح کیا گیا:

رضينا قسمة الجبار فينا

لنا علم و للجهال مال

فان المال يفنى عن قريب

و العلم باق لا يزال

”ہم اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم پر راضی ہیں کہ ہم تو علم کے حامل ہو جائیں اور جہلا کو اللہ تعالیٰ مال و دولت عطا کر دیں۔ مال کو عنقریب فنا ہو جاتا ہے، جب کہ علم کو ایسی دائمی بقا حاصل ہے، جس میں زوال کا امکان نہیں۔“

۱- محمد بن یزید القزوی، سنن ابن ماجہ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، صفحہ ۲۰۔

۲- محمد بن عیسیٰ الترمذی، سنن الترمذی، کتاب العلم، باب فضل طلب العلم، جلد ۱، صفحہ ۹۳۔

اس وضاحت سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ گئی کہ فلسفہ ہو یا مذہب یا سائنس ہر علم چند ما بعد الطبعی ایمانیات و تیقنات کا مرہون منت ہوتا ہے۔ فلسفے اور سائنس کا سفر ایسی ایمانیات سے شروع ہوتا ہے جو ذہن انسانی کی تخلیق ہونے کے باعث غیر معتبر ہیں۔ وہ اس لیے بھی غیر معتبر ہیں کہ سائنس اور فلسفہ اپنے علم پر یقین نہیں رکھتے اسے قابل شک، قابل تغیر، قابل اصلاح، قابل غور اور قابل تصحیح و ترمیم سمجھتے ہیں، ایک طرف ایمان سے سفر کا آغاز کرتے ہیں دوسری جانب اپنے ایمان کو ہی غیر معتبر سمجھتے ہیں، اسی لیے ذہنی ارتقا اور حوادث و تجربات سے ثابت ہونے والی غلطی رجوع پر مجبور کرتی ہے۔ اسی لیے فلسفے اور سائنس میں نئے نئے مکتب وجود پذیر ہوتے رہتے ہیں اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے دوچار رہتے ہیں، جب کہ مذہب حق اور اس کے ظہور کی واحد صورت ہے، ما بعد الطبعی معنی میں بھی اور قانونی و شرعی معنی میں بھی۔ لہذا اس کی مطلق اور لاشریک حقانیت کو کسی بھی ضرورت یا تاویل کی بنا پر باطل سے مخلوط کرنا دین کے دائرے سے باہر نکل جانے کے مترادف ہے۔ اسی لیے شیخ سعدی فرماتے ہیں:

سعدی بشوئے لوح دل از نقش غیر حق

علمیکہ راہ حق نہ نماید جہالت است

”سعدی! غیر حق کو دل کی تختی سے دھو دے، جو علم اللہ تعالیٰ کا راستہ نہ دکھائے، جہالت ہے۔“

## مغربی فکر و فلسفے کی خوشہ چینی اور اسلام سے تطبیق

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”میں مغربی فلسفے اور فکر کا مرہون منت ہوں اور علم تفسیر Hermeneutics کے جو

معیارات میری دانست میں آج نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں وہ مغربی فکر سے مستعار ہیں“۔<sup>۱</sup>

مغربی فکر و فلسفے کی خوشہ چینی ہی ڈاکٹر منظور احمد کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اجتہاد، شاہ ولی اللہ اور اقبال تو مغربی فکر و فلسفے اور اقدار و تہذیب کو اسلامیا نے [Islamization] کا ایک بہانہ ہیں۔ اندازہ لگائیے:

[۱] قرآن مجید کے کلام الہی ہونے کو علمی قضیہ ماننے سے انکار کرنا۔<sup>۲</sup>

[۲] سنت کو غیر متبادل اور اٹل نظام نہ تسلیم کرنا۔<sup>۳</sup>

[۳] مسلمانوں کو مغرب کی خوشہ چینی کی دعوت دینا، اور اس ”خوشہ چینی“ کو اسلامی علمی روایت کی فراخ دلی سے تعبیر کرنا۔<sup>۴</sup>

[۴] خود اپنی فکر کو مغربی فکر و فلسفے سے مستعار ہی نہیں گردانا بلکہ مغربی فکر کے معیارات پر اسلام کو سمجھنا اور اسے علم تفسیر کے لیے نتیجہ خیز قرار دینا۔ صورت حال کو واضح کر دیتا ہے۔

مغربی فلسفہ اپنی سرشت میں مذہب مخالف:

منظور احمد کے مغربی فکر سے مستعار نتیجہ خیز معیارات آج جن نظریات مثلاً حقیقت [Realism] نتایجیت [Pragmatism] اور ایجابیت [Positivism] پر استوار ہیں، خود منظور احمد کو اقرار ہے کہ یہ افکار مذہب سے لائق بلکہ: ”بڑی حد تک عناد کا پہلو لیے ہوئے ہیں“<sup>۵</sup> اور:

- ۱- منظور احمد، ”چند تعلیمی مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۸۳۔
- ۲- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۶۹۔
- ۳- ایضاً، صفحہ ۹۲۔
- ۴- منظور احمد، ”چند توجہ طلب مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۳۶۔
- ۵- ایضاً، صفحہ ۱۹۵۔



”ان مابعد الطبیعیاتی تصورات کو کسی طرح قبول کرنے پر تیار نہیں جو مذہب کی جان ہیں“۔  
مغرب دین کو فرد کا پرائیوٹ مسئلہ قرار دے کر:

[۱] زندگی کے ہر شعبے سے عملاً بے دخل کر چکا ہے۔ بالفاظ دیگر مذہب کا افراد کے معاشرتی تعلقات کی تشکیل و ترتیب میں کوئی حصہ نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی معاشرتی صنف بندی میں افراد کے مقام و درجات کے تعین میں مذہبی اقدار کا عمل دخل ہو بلکہ مذہب کو سیاست، معیشت، اخلاق، قانون، علم و فن غرض اجتماعی زندگی کے کسی شعبے میں دخل اندازی کا موقع نہیں دینا چاہیے۔

[۲] مذہب کی طرف سے پیش کی جانے والی ہر حقیقت، خواہ وہ تمدنی و اخلاقی نوعیت کی ہو یا مابعد الطبعی، اسے شک وارتیاب سے خالی اور ماورا نہیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ شک ہی عقل مند کی پہچان ہے۔  
کیا ڈاکٹر منظور احمد ان ہی افکار و نظریات کی بنیاد پر مغربی فکر سے متاثر ذہن کے لیے اسلام کی قبولیت کا دائرہ سرلیج الفہم بنانے کے خواہاں ہیں؟

### منظور احمد: مغربی فلسفے کی خوشہ چینی کا بلا دلیل دعویٰ: ایک چیتان:

منظور احمد کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ مغربی فلسفے کے ”مرہون کرم“ ہیں اور طبیعیات سے لے کر مابعد الطبیعیات تک کے مسائل کے لیے مغربی فلسفے سے آگہی سمیٹتے ہیں۔ یہ دعویٰ نامکمل، غیر واضح، مہمل بلکہ صاف لفظوں میں چیتان ہے۔ مغربی فلسفہ ایک سمندر ہے سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر منظور احمد اس سمندر کے کس قطرے، کس بوند، کس لہر، کس بھنور سے استفادہ و استفادہ کرتے ہیں اور مغربی فلسفے کے کس مکتب سے اپنے اصول و فروع اخذ فرماتے ہیں؟ فلسفے کا ایک مکتب بلا تکلف دوسرے مکتب فلسفہ کو رد کرتا ہے، یہ رد و تردید ہی فلسفیانہ مباحث کو آگے بڑھانے اور نوع بہ نوع عقلی شگوفے کھلانے کا بنیادی ذریعہ ہے۔ اس لیے اس بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب فلسفے کے کس منہاج [Paradigm] میں کھڑے ہیں اور کیا اس منہاج فلسفہ کو قطعی [Absolute] بھی سمجھتے ہیں؟ جب تک ڈاکٹر صاحب کے منہاج، اصول اور ماخذ علم کی وضاحت نہ ہو جائے اس وقت تک فلسفے کے منہاج میں گفتگو ممکن ہی نہیں۔

### مختلف النوع فلسفیانہ مناہج اور مکاتب: منظور احمد کا ماخذ؟

مثال کے طور پر ڈاکٹر صاحب نے مغربی فکر سے مستعار ”علم تفسیر“ [Hermeneutics] کے معیارات کو نتیجہ خیز قرار دیا ہے۔ بلاشبہ ہر میڈیات [Hermeneutics] فلسفے کا ایک اہم مکتب ہے جو اشیا کی تشریح و تعبیر [Interpretation] کو ایک نئے منہاج میں پیش کرتا ہے، لیکن یہ خود دسیوں منہاج اور افکار و نظریات کا رہن ہے، لہذا اس بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب

۱- منظور احمد، ”ثبات، تغیر اور نشاۃ ثانیہ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۹۵۔

ہرمیدیاتی فلسفے کے کس ذیلی مکتب سے وابستہ ہیں؟ کیا ڈاکٹر صاحب Biblical Hermeneutics کو مانتے ہیں یا Romantic Hermeneutics یا Philosophical Hermeneutics کو یا Critical Hermeneutics کو یا Materialist Hermeneutics یا Iconicism کو۔ علم تفسیر جسے علم تشریح و توضیح کہا جاتا ہے۔ اس فلسفے میں:

- [1] Friedrich Daniel Ernst Schleiermacher
- [2] Wilhelm von Humboldt
- [3] Wilhelm Dilthey
- [4] Edmund Husserl
- [5] Martin Heidegger
- [6] Rudolf Bultmann
- [7] Hans-Georg Gadamer
- [8] Jürgen Habermas
- [9] Karl-Otto Apel
- [10] Paul Ricoeur

جیسے فلسفیوں نے کام کیا ہے ڈاکٹر منظور احمد ان میں سے کس فلسفی کے منہاج میں کھڑے ہیں؟  
ڈاکٹر صاحب اپنے مضامین میں فلسفے میں لسانیات [Linguistic] کے حوالے سے بھی گفتگو کرتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب فلسفہ لسانیات [Linguistic Philosophy] کے کس دائرے کو منہاج علم تسلیم کرتے ہیں؟ کیا ڈاکٹر صاحب Structuralist ہیں؟ لاکان لیوس ٹراؤس اور سوشار سے استفادہ کرتے ہیں؟ یا Post Structuralist ہیں جیسے Foucault وغیرہ۔ یا ڈاکٹر صاحب Deconstructionist ہیں جیسے Derrida۔

اگر ڈاکٹر منظور احمد Modernism کو مانتے ہیں تو اس میں ایک مکتب Late Modernism ہے جو Descartes سے شروع ہو کر Marx تک آتا ہے۔ دوسرا Contemporary Modernism ہے جس کا نمائندہ Habermas ہے۔

اگر ڈاکٹر صاحب Post Modernist ہیں تو Neo Marxist Postmodernism کو مانتے ہیں جیسے مارکیوزے [Marcuse] اور اڈارنو [Adorno] وغیرہ یا ڈاکٹر صاحب Genealogical Postmodernism کے منہاج علم کے پروردہ ہیں، جیسے Nietzsche یا Deleuze وغیرہ، یا ڈاکٹر صاحب گوئیٹرے کیپوسٹ ماڈرنسٹ ہیں جو سرمایہ داری کی مابعد الطبیعیات کو پہچاننے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

آخر مغربی فلسفے میں ڈاکٹر منظور احمد کے اخذ و استفادے کا منبع و ماخذ کیا ہے؟ کیا ڈاکٹر صاحب Scholasticism کو مانتے ہیں یا قبل از جدید فلسفیانہ منہاج [Pre Modern Philosophy] میں کھڑے ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب مسلم فلسفے کے منہاج سے وابستہ ہیں تو یہاں کس مکتب کو own کرتے ہیں۔

وہ Islamist Liberal ہیں یا Liberal Islamist؟ Traditionalist؟ ہیں یا  
 Fundamentalist؟ یا Revisionist؟ ہیں یا Occidentalists؟ ہیں، یا Orientalist؟  
 اگر Liberalism کو مانتے ہیں تو اس مکتب فکر کی کس شاخ کو منہاج علم تصور کرتے  
 ہیں یعنی Good Base Liberal؟ یا Theological Liberal؟ ہیں یا  
 Ontological Liberal؟ یا Deontological Liberal؟ ہیں یا Libertarian  
 Liberal؟ ہیں یا Anarchist؟ ہیں۔

اگر مارکسٹ [Marxist] ہیں تو کون سے؟ Western Marxist؟ ہیں؟  
 Russian Marxist؟ ہیں؟ چینی مارکسٹ ہیں؟ لاطینی امریکی مارکسٹ ہیں؟ Western  
 European Marxist؟ ہیں؟ Eastern European Marxist؟ ہیں؟ برعظیم پاک و ہند  
 کے مارکسٹ ہیں؟ یا مشرق وسطیٰ کے مارکسٹ ہیں؟ کیوں کہ عہد جدید تک آتے آتے Marxism کی  
 اتنی قسمیں ہو گئی ہیں جن کا شمار سانپوں کی اقسام گننے سے زیادہ مشکل ہے۔

دو مختلف مابعد الطبعی علمیات کی یک جانی: عبقری فلاسفہ کا کارنامہ:

آج تک ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی تحریروں سے واضح نہ ہو سکا کہ وہ فلسفے کے کس مکتب  
 کے نمائندے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فلسفے کے نامعلوم اور گم نام منہاج میں کھڑے ہو کر اسلام کے معلوم  
 منہاج اور متعین مابعد الطبعیات کو مغربی فلسفے کے کس منہاج و مابعد الطبعیات سے ہم آہنگ  
 کرنا چاہتے ہیں؟ دو مختلف مابعد الطبعیاتی تصورات کی یک جانی کا دشوار گزار کام فلسفے کی تاریخ میں  
 چند ہی عبقری فلاسفہ [King Philosophers] کے ذریعے انجام پذیر ہوا ہے۔ جیسے:  
 افلاطون [Plato]، اگسٹائن [Augustine]، کانٹ [Kant]، ہزرل [Husserl]،  
 ہائیڈگر [Heidegger] وغیرہ۔

[۱] فلسفے کی معلومہ تاریخ میں پہلی مرتبہ افلاطون [Plato] نے Parmenides اور  
 Heraclitus کے مابعد الطبعی مفروضات کو ملا کر ایک نیا فلسفہ پیش کیا — [۲] دوسری مثال عیسائی  
 فلسفی عالم اگسٹائن [Saint Augustine] کی ہے جس نے عیسائیت کی مابعد الطبعیات اور ارسطو  
 کے فلسفے کا آمیختہ تیار کیا جو صدیوں تک مسیحی مذہب کی دست گیری و دل پذیری کرتا رہا۔ یونانی فلسفے اور  
 منطق کے ذریعے دو ہزار برس تک عیسائیت اپنی عقلیت کے زخم چھپاتی رہی — [۳] Kant نے  
 عقلیت [Rationalism] اور تجربیت [Empiricism] کی علمیات کو باہم ملا کر ایک  
 نیا فلسفہ Transcendental Idealism تخلیق کیا — [۴] اسی طرح ہائیڈگر  
 نے Being کی جستجو اور اس سے متعلق سوالات کے جوابات کے لیے دو بالکل متضاد فلسفیانہ  
 تصورات، مظہریات [Phenomenology] اور ہرمینیٹکس [Hermeneutics] کو ملا  
 کر ایک الگ فلسفہ Phenomenological Hermeneutics تشکیل دیا۔

اسلام اور مغرب کے مابعد الطبعی تصورات میں تطبیق محال ہے:

سو یہ کام مغرب کے عبقری فلاسفہ نے انجام دیا، ڈاکٹر صاحب کانٹ کی سطح کے فلسفی ہیں اور نہ آگسٹائن کے درجے کے متکلم — اور نہ ہی اسلام اور فلسفے کی مابعد الطبعیات میں کوئی ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ اگر بالفرض ڈاکٹر منظور احمد تمام فلسفہ ہائے مغرب کی اسلام سے تطبیق و تلفیق کے متمنی ہیں تو اس ”اصطفیائیت“ [Eclecticism] کی اسلام تو درکنار فلسفے کے منہاج میں بھی کوئی خاص وقعت نہیں۔ اس لیے ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا خود کو محض مغربی فکر و فلسفے کا ”مرہون منت“ گرداننے سے بات واضح نہیں ہوگی۔ جب تک ڈاکٹر صاحب مغربی فکر اور فلسفے کے ان گنت جہات میں سے ان بنیادی منابع اور مآخذ کی نشان دہی نہیں فرمادیتے، جن کی ”خوشہ چینی“ ڈاکٹر صاحب کے لیے نتیجہ خیز ہے۔ مآخذ اور منابع کے تعین کے بغیر ڈاکٹر صاحب کے زیر بحث اقتباس اور اس کے زیر اثر اسلام کی تفہیم جدید و تعبیر نو کی بحث پر گفتگو اندھیرے میں تیر چلانے کے مرادف ہے۔

### حاصل بحث:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی پیش فرمودہ نئی الہیات [new analogy] کے تفصیلی مطالعے سے واضح ہو گیا کہ اجتہاد کا حقیقی مقصد اسلام کی ساخت اور بنیادی خدو خال میں مابعد الطبعی سطح کی تبدیلی بلکہ انحراف ہے۔ یہ سوال بہ ہر حال قابل غور ہے کہ اس نئی الہیات میں، جس کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا، کیا چیز نئی ہے؟ کون سا نکتہ تخلیقی ہے؟ کیا یہی وہ نکات اور امور ہیں جن کی بنیاد پر علماء و فقہاء پر اعتراض و طعن کیا گیا تھا کہ فقہاء ”استخراج“ سے کام لیتے ہیں جو ایسے نتائج تک نہیں پہنچاتے جو ”نئے“ ہوں؟ کیا اس ”نئی الہیات“ کا مطالعہ واضح نہیں کر دیتا کہ اس میں کچھ بھی نیا اور تخلیقی نہیں ہے؟ بلکہ سب کچھ فرسودہ اور تقلیدی ہے؟ جو اعتراض علماء پر تھا کہ وہ قرآن و سنت کی خوشہ چینی اور سکہ بند تقلید پر عامل ہیں، کیا یہی صورت حال یہاں نہیں ہے؟ اس ”نئی الہیات“ کے نمونے ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی مغربی فکر و فلسفے اور سائنس کی ”تقلید جامد“ کا مظہر نہیں ہیں؟ قرآن و سنت تو معروضی حقائق ہیں اور تعامل امت اس کی خارجی تجسیم ہے۔ جب کہ یہ ”نئی الہیات“ مغربی فلسفے اور سائنس پر، ان ہی کے عباقرہ کے سنجیدہ اور تازہ و تیز حملوں کا ہدف بننے والے افکار و نظریات ہیں — اب یہ فیصلہ صاحبان انصاف قارئین کے ہاتھوں میں ہے کہ کس کی خوشہ چینی اور تقلید زیادہ بامعنی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جن کے ساتھ ایک مسلمان کی آخرت اور دنیا دونوں وابستہ ہیں یا مغرب کی — تبدیلی، ترقی، وقت کے ساتھ چلنے اور زمانے کا مقابلہ کرنے کا خیال فی الاصل ایک متجددانہ عقیدے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہمارے جدیدیت پسندوں سے زیادہ اسلام کی حقیقت سے تو جرمن مستشرق ہلموت ریٹر [Hellmut Ritte] واقف ہے، وہ کہتا ہے:

ان مفہوم الحقیقة للعصر الحدیث تصاعدی مبدئياً، هو یسمو باستمرار الی مافوق المعروف . ما هذا المفهوم فی الأرتوڈکسیة [یقصد: الاتجاه السنی، أهل السنة] فشی ثابت نهائی ومستقر . وفی العالم الغربی تسيطر ضجة ذهنية دائمة، أما فی الشرق فتسود الطمأنينة المعتاده الخاصة به التي عبر جوتنه عن اشتیاقه الیها احیاناً . ان عدم تبدل العقلية الشرقية یبدو فی أعیننا جموداً . ولكن الأرتوڈکسیة الاسلامیة ترى المستحدثات بدعة مشکوکاً فیها ومشيرة للرب . هي تعتبر عهداً ما متدهوراً لأنه قد تغير بالنسبة للقديم المثالی، بينما نعتبر نحن عهداً من العهود متدهوراً لأنه لم يتغير.

”دور جدید کے لیے حقیقت کا مفہوم بنیادی طور پر ”ارتقائی“ ہے، جو مسلسل معلوم سے بلند ترکی طرف سفر کرتا رہتا ہے، جب کہ اس کا مفہوم اسلامی آرتھوڈوکسی [مراد عقیدہ اہل سنت] میں ایک حتمی اور مستقل شے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغرب میں مسلسل ایک ذہنی غلغلہ برپا رہتا ہے، جب کہ مشرق پر وہی جانی پہچانی آسودگی چھائی رہتی ہے جو اس کا امتیاز ہے اور جس کا اشتیاق گاہے گاہے گوسٹے نے ظاہر کیا۔ مشرقی ذہنیت میں ”تبدیل نہ ہونے“ کی کیفیت ہمیں جمود نظر آتی ہے، جب کہ مسلمانوں کے مسلمہ عقائد میں نئی نئی باتوں کو ”بدعت“ تصور کیا جاتا ہے جن کی حقیقت مشکوک اور مشتبہ ہے، ان کے ہاں ہر وہ عہد رو بہ زوال ہے جو قدیم مثالی معیار سے ہٹ گیا ہو، جب کہ ہم کسی عہد کو اس لیے رو بہ زوال تصور کرتے ہیں کہ اس میں کوئی تغیر ہی پیدا نہیں ہوا۔“

۱- فواد میزگن، محاضرات فی تاریخ العلوم العربیة والاسلامیة، فرانکفرٹ: جمہوریۃ المانیة الاتحادیة، ۱۹۸۲ء، صفحات ۱۷۱-۱۷۲۔

## خطبہ نیاز — تبصرہ و تجزیہ

آئندہ صفحات میں ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے پیش کردہ ”خطبہ نیاز“ کے مندرجات کا ایک تحقیقی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد کی تالیفات، خصوصاً زیر بحث خطبے میں جس طرح انھوں نے ”افکار نیاز“ کی تحسین و ترویج، تشریح و تفہیم، اور تبلیغ و تلقین فرمائی ہے، اس سے یہی تاثر اور خیال قائم ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب بھی ان ہی افکار و خیالات کے حامل اور دل دادہ ہیں۔ لہذا آئندہ صفحات میں ”افکار نیاز“ کو منظور احمد کے خیالات جان کر اس پر رائے کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ورنہ جس شخص کو امت مجموعی طور پر اس کی زندگی میں رد کر چکی اور موت کے بعد بھلا چکی ہو، اس کی موت کے اکتالیس سال بعد ایک بار پھر ان پامال مباحث پر نقد و تبصرہ کرنا دانش مندی نہیں ہے۔

گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سائنسی ڈھانچے مسائل کے حل میں غیر موثر ہو جاتے ہیں۔ سائنسی ڈھانچوں کے بننے بگڑنے کی حرکیات [Dynamics of Generation and D-Generation] of Scientific Structure کے تحت لوگ سائنس کے ایک منہاج کو ترک کر کے دوسرا اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن سائنس دانوں کی ایک بڑی اکثریت جو عقل اور سائنس کو معروضی اور آفاقی علم نہیں سمجھتی، Lakatos سے اتفاق نہیں کرتی، مغرب کے بڑے فلسفیوں نے سائنس کی آفاقیت و معروضیت کو تسلیم نہیں کیا، وہ اسے ایک خاص تاریخ و تہذیب اور عقلیت و ثقافت کی پیداوار سمجھتے ہیں۔

لے کاٹوش اور کوہن کی ان تمام تصریحات و توجیہات کو سامنے رکھ کر غور فرمایا جائے کہ اگر دینی علمیت کا کوئی نمائندہ مذہبی عقائد و اعمال کی توجیہ و تفہیم کا اتفاقاً ہی اسلوب اور رویہ اختیار کر لے تو جدیدیت پسند اسے جہالت اور خرافات کا نام نہیں دیں گے؟ جب کہ سائنس دانوں کے ان ہی اسلوب اور طریقوں کو ضابطے، قانون، تحقیق اور تفحص پر محمول کیا جاتا ہے۔ یہ رویہ خود ”مذہبی“ اور ”ایمانی“ ہے جس کی پرستش جدیدیت پسند پورے اخلاص و ایثار کے ساتھ بجالاتے ہیں اور اس تقلید و ایقان کو ”تحقیق“ کا نام دیتے ہیں۔ Jacques Barzun لکھتا ہے:

Yet science is an all-pervasive energy, for it is at once a mode of thought, a source of strong emotion, and a faith as fanatical as any in history.

اصولی طور پر جدیدیت پسندوں کو مذہب کی طرح سائنس اور فلسفے پر بھی ایمان نہیں لانا چاہیے۔ کیوں کہ مذہب کی طرح ان دونوں کی اساس بھی مابعد الطبیعی ہے۔ فلسفہ اور سائنس بھی مذہب کی طرح اعتقادات و ایمانیات سے شروع ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سائنسی علمیت کے تحت ایمانیات و اعتقادات کے باب میں ارتداد [apostasy] کی اجازت ہے اور مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا کیوں کہ وہ قولاً اور عملاً قطعی، حتمی اور ابدی ہے۔ جب کہ فلسفہ اور سائنس قولاً خود کو قطعی اور حتمی قرار نہیں دیتے، مگر عملاً سمجھے جاتے ہیں۔

صرف سائنس ہی ”علم“ نہیں:

علامہ اقبال نے علم کے تین دائرے بیان کیے ہیں:

[1] مذہب [Religion]، [2] فلسفہ [Philosophy]، [3] شاعری یا آرٹ — اقبال کا خیال یہ ہے کہ یہ تینوں دائرے یکساں علتی سوالات [etiological questions] اٹھاتے ہیں، اقبال کے مطابق جمالیاتی دائرہ اپنی فطرت میں انفرادیت پسند ہے چنانچہ یہ مبہم اور لامتناہی ہے،

1- Jacques Barzun, Science: The Glorious Entertainment, Harper and Row, 1964, p.15 Chapter II & XII.

دوسری طرف مذہب کو شاعری پر برتری حاصل ہے، اس لیے کہ:

It enlarges his claims and holds out the prospect of nothing less than a direct vision of Reality.<sup>1</sup>

اس حوالے کے درج کرنے سے مقصود صرف اتنا تھا کہ اقبال نے بھی "سائنس" کو کسی علیحدہ منہاج علم کی صورت میں ذکر نہیں فرمایا، بلکہ اقبال کے افکار کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ سائنس کو فلسفے کی توسیع و تعمیم شدہ شکل سمجھتے تھے۔

سائنس کے لفظ کی تاریخ، حقیقت اور حدود جانے بغیر سائنس اور علم کو مترادف اصطلاحات سمجھنا علم جیسی ہمہ جہت اور کثیر الاطراف اصطلاح کو ایک محدود دائرے میں بند کر دینا ہے۔ فائن مین صرف سائنس کو علم سمجھنے والوں کو کہتا ہے:

If a thing is not a science, it is not necessarily bad. For example, love is not a science. So, if something is said not to be a science, it does not mean that there is something wrong with it; it just means that it is not a science.<sup>2</sup>

سائنس کی زبان ریاضی سائنس نہیں: فائن مین:

اسی طرح ریاضی [Mathematics] جو سائنس کی زبان ہے اسے بھی سائنس دان Natural Science تسلیم نہیں کرتے، اس لیے کہ اسے تجربے سے ثابت نہیں کیا جاسکتا، Feynman لکھتا ہے:

Mathematics is not a science from our point of view, in the sense that it is not a *natural* science. The test of its validity is not experiment.<sup>3</sup>

گویا سائنس کا انحصار مکمل طور پر غیر سائنس یعنی ریاضی پر ہے جو تجربے سے ماورا ہے۔

سائنسی تجربات غیر سائنسی عناصر پر انحصار کرتے ہیں: فیرابینڈ:

فیرابینڈ کے بقول سائنسی نتائج غیر سائنسی عناصر پر انحصار کرتے ہیں:

And the results of science don't prove its excellence, since these results have often depended on the presence of non-scientific elements.<sup>4</sup>

- 1- Mohammad Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Lahore: Institute of Islamic Culture, 2009, p. 1.
- 2- Richard P. Feynman, *Six Easy Pieces*, p.47.
- 3- Ibid., p. 47.
- 4- Paul Feyerabend, *Science in a Free Society*, p.102.



یہی سبب ہے کہ فیرابینڈ معروضی طور پر سائنس، علم نجوم [astrology] اور جادو [voodoo] میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ اسی لیے وہ لے کاٹوش [Lakatos] کو لکھتا ہے:

Having finished their 'reconstruction' of modern science they turn it against other fields as if it had already been established that modern science is superior to magic or to Aristotelian science, and that it has no illusory results ..... However, there is not a shred of an argument to support this assumption. "Rational reconstructions" take "basic scientific wisdom" for granted, they do not show that it is better than the "basic wisdom" of witches and warlocks. ۱

اٹھارہویں صدی تک سائنس اور نیچرل فلاسفی مترادف اصطلاحات کے طور پر استعمال نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن Scientific Method کے بعد یہ دونوں اصطلاحات ہم معنی ہو گئیں۔ سترہویں صدی تک انگریزی زبان میں لفظ سائنس صرف Aristotelian Concept of Knowledge کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

جدید اور قبل از جدید معاشرے: علم کی تعریف: فرق اور تبدیلی:

۱۸۷۰ء کے بعد Scientific Method عام ہوا اس سے پہلے اس کا استعمال بہت محدود پیمانے پر تھا۔ سترہویں صدی تک لفظ سائنس علم کے معنوں میں صرف Theory اور Philosophy کے لیے مخصوص تھا۔ ان دو علوم کے سوا تمام arts اور technique کہلاتے تھے۔ کچھ Liberal Arts تھے، جن میں خطابت [Rhetoric] ریاضی [Mathematics]، لسانیات [Linguistics] اور منطق [Logic] شامل تھے۔ پیشہ ورانہ فنون [Professional Arts] میں طب [Medicine] اور قانون [Law] کو شامل کیا جاتا تھا۔ باقی ماندہ فنون [Mechanical Arts] کہلاتے تھے، جن کے کارندوں اور کاری گروں کے کام کو قابل قدر نہیں سمجھا جاتا تھا، ان کے معاوضے نہایت قلیل ہوتے تھے۔ اس تقسیم و تحدید و ترتیب سے قبل از جدید معاشروں میں حفظ مراتب کے پاس و لحاظ کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کن علوم کو برتری اور فوقیت حاصل تھی اور کون سے علوم تلچھٹ تصور کیے جاتے تھے۔ مگر عصر جدید میں یہی علوم و فنون یعنی Mechanical Arts, Craft and Technique نہ صرف علوم عالیہ سمجھے جاتے ہیں

1- Imre Lakatos, Robert Sonné Cohen, Paul Feyerabend, Marx W. Wartofsky [eds.], *Essays in the Memory of Imre Lakatos*, Springer, 1976, p. 118.

بلکہ علم کی تعریف ان ہی فنون سے متعین ہونے لگی ہے۔ اب طبعی دنیا میں کمال اور مہارت رکھنے والا آدمی سب سے بڑا اور اہم سمجھا جاتا ہے۔ حفظ مراتب کی یہ تبدیلی کوئی معمولی بات نہیں بلکہ یہ پورے تصور حقیقت اور مابعد الطبیعیات کی تبدیلی ہے۔ اس تبدیلی ہی کی وجہ سے تصورِ خدا و آخرت، تصورِ کائنات، خیر و شر کے معیارات اور اخلاق اور سچائی کے پیمانے غیر اہم ہو گئے، بالفاظِ دیگر معزز علوم حقیر و ذلیل ہو گئے۔

دینی منہاج: علم: تصور اور تعریفات:

مذہبی ایمانیات و علمیات چوں کہ خیر کل، حقیقتِ کبریٰ اور ہستی مطلق کے پاس سے آتی ہیں، جو عالم الغیب والشہادۃ [Knoweth the Unseen and that which is open] اور زمان و مکان سے ماورا ہے۔ اس لیے یہ علم حتمی، قطعی، اٹل اور ناقابلِ تغیر ہے، یہاں علم کی متفق علیہ تعریفات یہ ہیں:

إدراک الشئ بحقیقته<sup>۱</sup>

”کسی شے کو اس کی حقیقت کے حوالے سے جان لینا علم ہے۔“

یا امام غزالی [م ۵۰۵ھ] کے الفاظ میں:

معرفة المعلوم علی ما هو به<sup>۲</sup>

”کسی شے کو اس کی حقیقت و ماہیت کے حوالے سے، جس پر وہ قائم ہو، جان لینا علم ہے۔“

امام سید شریف جرجانی [م ۸۱۶ھ] کے بقول:

هو الاعتقاد الجازم المطابق للواقع<sup>۳</sup>

”علم وہ پختہ اعتقاد ہے جو واقعہ کے عین مطابق ہو۔“

حافظ ابن حزم [م ۴۵۶ھ] کے ارشاد کے موافق:

هو تیقن الشئ علی ما هو علیہ<sup>۴</sup>

”کسی شے کی ایسی حقیقت کا یقین جس پر وہ قائم ہو، علم ہے۔“

یعنی علم ایک ایسا قضیہ کلیہ موجبہ [nessary and universal judgement]

۱- راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، مکتبۃ نزار مصطفیٰ الباز، [س-ن]، کتاب العین، علم، جلد ۲، صفحہ ۳۳۶۔

۲- ابو حامد محمد الغزالی، المستصفیٰ من علم الاصول، امتحان ثانی: اختلاف فی حد العلم، جلد ۱، صفحہ ۷۷۔

۳- سید شریف جرجانی، معجم التعریفات، قلہرہ: دار الفیضیۃ، [س-ن]، باب العین، العلم، صفحہ ۱۳۰۔

۴- علی بن حزم الاندلسی، الاحکام فی اصول الاحکام، بیروت: دار الآفاق الجدیدۃ، [س-ن]، جلد ۱، صفحہ ۳۶۔

ہے جو خارج میں موجود حقیقت کو صحیح طور پر جان لینے سے عبارت ہے، جو جو بی اور شک و ظن سے پاک ہو اور اس کا انکار ممکن نہ ہو، یعنی لاریب فیہ [without doubt] ہو، اس کا اطلاق ایسے قضیے پر ہوتا ہے جو محکوم [Subject] اور محکوم بہ [predicate] پر مشتمل ہو اور جس کے متوازی خارج میں معروضی حقیقت موجود ہو۔ وہ قضیہ جو عارضی طور پر ”حقیقت“ مان لیا جائے، جس میں قطعیت و حتمیت کا نہیں بلکہ ہر لمحے شک و ریب اور کذب کا احتمال و امکان پایا جائے، جو بدل جائے اور مسلسل تغیر کے امکانات کو ظاہر کرے، وہ حقیقت اصلی نہیں بلکہ سائنسی حقیقت ہے۔ حقیقت ازل سے ابد تک واحد اور ناقابل تغیر و تبدل ہوتی ہے۔

مذہبی منہاج: علم کی تعریف مذہبی شعور پر منحصر ہے:

مذہبی سیاق میں علم کی تعریف اور علم و ایمان میں تطبیق یا تفریق اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک مذہبی شعور کو واضح اور دو ٹوک الفاظ میں بیان نہ کر دیا جائے۔ دین اور دینی فکر انسانی شعور کی جن بنیادوں پر پرداخت کرتی ہے اور اسے جن علمی مقاصد کی طرف یک سو رکھتی ہے اس سے تربیت پانے والا مذہبی ذہن علم کی اس تعریف کو قبول ہی نہیں کر سکتا جو ڈاکٹر منظور احمد صاحب پیش فرما رہے ہیں۔ مذہبی شعور و وجودی شعور ہے نہ کہ ذہنی شعور۔ مذہبی شعور وہ صلاحیت علم [وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا] ہے جس کے باعث آدم کو فرشتوں پر فوقیت دی گئی۔ ”معلومات“ مذہبی شعور کا ایک جز اور حصہ تو ہو سکتے ہیں، لیکن معلومات مذہبی فکر کا اختصاص، جو ہری حرکت یا مدار و اثبات علم نہیں بن سکتے۔ مذہبی فکر کا سب سے بنیادی جوہر یہ ہے کہ اس کے یہاں مجہول مطلق کا تصور ناپید ہے۔ یہاں حقیقت معلومیت کی قید سے ماورا اور اپنے وجود کی شان سے قائم ہے۔ مذہبی شعور کبھی فکر کو معلوم یا نامعلوم کے تناظر میں نہیں دیکھتا، بلکہ حق و باطل، صحیح و غلط یا مفید و مضر کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ مذہبی شعور ہرگز فلسفیانہ معنوں میں مابعد الطبیعی نہیں ہے، اس لیے کہ مابعد الطبیعی حقائق یا امور کے بارے میں مذہبی شعور ایک ایسے فیصلہ کن اعتماد پر کھڑا ہے جہاں اسے خود کو کسی بھی علمی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ یہاں حقائق کی معرفت خود حقیقت کے تحریک سے میسر آتی ہے۔

معرفت حق کے باب میں ذہن کا کردار: انفعالی:

حقیقت تک رسائی کے لیے ذہن کا کردار فاعلی نہیں بلکہ انفعالی ہے۔ ذہن فی الاصل انفعال محض ہے۔ یہ انفعال اگر مابعد الطبیعی جہت سے ہو تو ایمان ہے اور اگر طبعی رخ سے ہو تو فکر یا تجربہ ہے۔ ایمان ذہن کی تسلیم کے اس عمل کا نام ہے جو وہ اپنی علمی کاوش سے دست بردار ہو کر انبیا و مرسلین پر اعتماد کر کے حاصل کر لیتا ہے۔ اسی لیے مذہبی علم کا اختصاص ہی ”ایمان بالغیب“ ہے، یہ ایمان قلب میں صرف ہو کر وہ یقین فراہم کرتا ہے جو اپنی تاثیر اور قوت میں عقل، تجربے اور مشاہدے سے حاصل ہونے والی معلومات سے بہر جہا اعلیٰ و ارفع ہے۔ ایمان کے نور سے حاصل ہونے والی یہ معرفت شعور کی تمام انواع کے لیے مورد یقین بن جاتی ہیں بلکہ اس میں ایسی شان پیدا ہو جاتی ہے کہ غیب بھی شہود بن جاتا ہے، جس کے باعث مظاہر اور علم کے اعتباری اور معنی اور وجود کے حقیقی ہونے کا مشاہدہ میسر آتا ہے۔

ایمان: علم کی منطقی تعریف احاطے اور کمال سے عاری ہے:

ایمان بالغیب پر قانع شعور علم و فکر کی اس منطقی تعریف کو قبول ہی نہیں کر سکتا جو حاصل معلومات کو ترتیب و تنظیم اور جوڑ توڑ کے عمل سے گزار کر مجہول سے معلوم کی طرف پیش رفت کرے۔ ایمانی شعور اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ حقائق کبھی مظاہر کی سطح تک نزول نہیں کرتے کہ وہ خود بھی ایک ”شے“ بن جائیں، بالفاظ دیگر حقائق کبھی معلومیت کا ہدف بننا قبول نہیں کرتے۔ اس لیے کہ شے کے معلوم ہونے کے لیے اس کا محسوس و مشاہد ہونا ضروری ہے۔ انسانی عقل، فکر اور شعور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو اعلیٰ پیمانے پر استعمال کرنے کے باوجود بھی زمان و مکان، کیفیت و کمیت اور تعینات و تحدیدات کے جبر کو نہیں توڑ سکتے۔ اس کے لیے محسوس و مشاہد ہی حقیقی ہے۔ اس لیے وہ غیب پر کوئی بھی حکم لگانے سے عاجز ہے۔ علم و شعور کا کوئی بھی عمل اسے تشبیہ کی حدود سے باہر نہیں نکال سکتا خواہ اس کی سرگرمی حسی ہو یا عقلی۔ ذات حق حدوث و فنا اور حدود و جہت سے ماوراء ہے۔ اس لیے ذہن کو حقیقت کے ادراک میں کھپانے کا نتیجہ سوائے ناکامی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ بالفاظ دیگر علم و فکر کا تمام تر سفر صورت سے شروع ہو کر صورت ہی کے گرد گھومتا رہے گا اور حقیقت تک رسائی اس کے دائرہ حدود سے باہر رہے گی۔

علم، حصول نہیں حضور کا موضوع ہے: مذہبی شعور کا امتیاز:

مذہبی فکر اور دینی شعور جس اساس پر استوار ہے وہ یہ ہے کہ مکمل علم، جس کا معلوم مطلق، مستقل، یقینی، دائمی، اٹل اور غیر متغیر ہو، وہ حصول کا نہیں حضور کا موضوع ہے۔ انسانی ذہن اور شعور کی تمام تر صلاحیت اور استعداد از قبیل تجربہ ہیں، اور مظاہر کے احاطے کے لیے ہیں۔ حقیقت مطلقہ کسی متعین صورت کی اسیر نہیں ہے لہذا اس کی معرفت کے لیے جس نوع کے ادراک کی ضرورت ہے اس کا تعلق ”علم“ سے نہیں انکشاف سے ہے۔ گویا حق کی دو جہات ہیں تشبیہ اور تنزیہ۔ حقیقت حق کی جہت سے تنزیہی ہے اور خلق کی جہت سے تشبیہی۔ تشبیہ حواس کی جولان گاہ ہے اور تنزیہ خبر یعنی وحی کا موضوع ہے۔ معرفت کا عمل بلاشبہ نظر و فکر ہی سے شروع ہوتا ہے لیکن یہ ذریعہ علم کے حصول کی حتمی ضمانت نہیں دیتا، اسے اتمام و تکمیل اور تيقن کی سند وحی عطا کرتی ہے۔ حقیقت تشبیہ و تنزیہ کی جامع ہے۔ معرفت حق کے باب میں عقل وحی کے تابع ہے اور یہ معرفت اپنی ماہیت میں ایمانی ہے نہ کہ عقلی و ذہنی۔ عقل کی نارسائی سے تصور سازی کا عمل پیدا ہوتا ہے، جس کی تصدیق کا کوئی ذریعہ عقل کے پاس نہیں ہے۔ مذہبی شعور اپنے اس خلقی نقص کو ایمان کے باعث حقائق

۱- عقل کی قدرت تخیل ان اشیا کے ذریعے جو حواس کی حدود رسائی میں آتی ہوں، ایک ایسی شکل کا تصور کر سکتی ہے جس کا وجود نہ ہو، مگر اس کے اجزا کا مختلف جگہوں پر ہونا اس کی لازمی شرط ہے۔ لیکن قوت تخیل ایسے جز کا تصور نہیں کر سکتی جو حواس کی گرفت سے ماوراء ہو۔ عقل کی ایجادات اور اختراعات کا مدار ان اجزا پر ہوتا ہے جس کو وہ حس کی عطا اور عنایت سے معلوم کرتی ہے، پھر ان کو دوسرے اجزا سے [جو اسی دائرہ ادراک میں آتے ہیں] جوڑ کر ایک نئی شکل دے دیتی ہے۔ عقل اس سلسلے میں جوڑ توڑ، ترتیب و تنظیم، تحلیل و تجزیہ اور اضافہ و کمی تو کر سکتی ہے لیکن کسی جز کو تحسنت کے دائرے سے باہر جا کر تشکیل نہیں دے سکتی۔

علم، اثبات اور اقرار میں آڑے نہیں آنے دیتا اور نہ ہی اسے کسی علمی مطالبے کی تسکین کا ذریعہ بناتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں میں تصور سازی کا عمل معدوم ہے۔ توحید و رسالت کوئی تصور نہیں جسے عقل تشکیل دے بلکہ یہ یقین ہے جو ایمان فراہم کرتا ہے۔ حقیقت بلاشبہ ماورائے علم اور ممتنع العلم ہے، لیکن اس کے باوجود واجب الاثبات اور ممکن الاستدلال ہے۔ عقل اس سے متفق ہے۔ مذہبی شعور اس امر سے بہ خوبی آگاہ ہے کہ حقیقت کا مظاہری اظہار تدریجی اور جزوی ہوتا ہے جو درجات کے اعتبار سے متنوع نوعیت کا ہو سکتا ہے، اس لیے مذہبی شعور حقیقت کو عقل کے لیے اجزا میں توڑ کر قابل فہم بنانے کے بجائے من حیث الکل واجب القبول بناتا ہے۔ جہاں حقیقت اپنی وجودی سطح سے اپنی پوری شان کے ساتھ منکشف ہو کر شعور انسانی کی تمام انواع کو ان کے امتیازات کے ساتھ منور کر دیتی ہیں۔ حقیقت کا یہ کلی ادراک اپنی ماہیت میں ذہنی [conceptual] نہیں بلکہ جوہری [essential] ہے۔ اس حقیقت کی معرفت کا نام ”علم“ ہے اور اسی علم کا نتیجہ ”ایمان“ ہے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ: **وَالرَّسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ [۷: ۳۷]** ”اور پختہ اور مضبوط علم والے یہی کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لائے، یہ ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو صرف عقل مند ہی حاصل کرتے ہیں۔“ یہی علم والے لوگ سجدہ گزار ہوتے ہیں، گویا علم سجدے سے مشروط ہے: **إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَى عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْآذِقَانِ سُجَّدًا [۱۰: ۱۷]** ”جنہیں اس سے پہلے علم دیا گیا، ان کے پاس جب بھی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں۔“ اور ان ہی صاحبان علم راسخ کی یہ علامات بھی بتلائی ہیں کہ: **لَكِنَّ الرَّسِخُونَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ [۱۶۳: ۳]** ”لیکن اس میں سے جو کامل اور پختہ علم رکھنے والے ہیں وہ ایمان والے ہیں، جو اس پر ایمان لاتے ہیں، جو آپ کی طرف اتارا گیا ہے اور جو آپ سے پہلے اتارا گیا ہے۔“ ان ہی حاملان علم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کے گواہ کے طور پر اپنے ساتھ پیش فرمایا: **شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ [۱۸: ۳]** ”اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور فرشتوں نے بھی اور اہل علم نے بھی راستی و انصاف کے ساتھ یہی گواہی دی ہے۔“ اور صرف دنیا ہی میں نہیں آخرت میں بھی ان کی گواہی قبول کی جائے گی: **قَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوءَ عَلَى الْكَافِرِينَ [۲۷: ۱۶]** ”[فردائے قیامت] علم والے پکار اٹھیں گے کہ آج تو کافروں کو رسوائی اور بُرائی چٹ گئی۔“ کافروں کے برعکس صاحبان علم و حاملان ایمان کو مژدہ سنایا گیا: **يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ [۱۱: ۵۸]** ”تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جنہیں ”علم“ عطا کیا گیا ہے، اللہ ان کے درجے بلند فرما دیں گے۔“ علم کا تقاضا عمل اور خواہش نفس سے رہائی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے خشیت ربی کو عالم کی

۱۔ اسلامی منہاج علم میں علم کی تعریف اور اس کی ماہیت و غایت کے سلسلے میں روایتی علما اور راسخ العقیدہ حلقوں کے علمی نمائندوں سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے، مزید برآں اس بحث کے بعض اہم نکات جناب احمد جاوید صاحب کی ایک فکری نشست میں کی گئی گفتگو سے بھی اخذ کیے گئے ہیں۔

پہچان قرار دیا ہے: اِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ [۲۸:۳۵] ”حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے ہی اس سے ڈرتے ہیں۔“ علم کی حقیقت نور ہے جو گناہوں کی کثرت اور خواہشِ نفس کو الہ بنا لینے سے زائل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے ”العلم“ حاصل ہو جانے کے بعد بے علم بننے والے کے قلب پر مہر لگا دینے کی وعید سنائی ہے: وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ [۹۳:۹] ”اور ان کے دلوں پر مہر خداوندی لگ گئی ہے، جس سے وہ محض بے علم ہو گئے۔“ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن نے کہا ہے: قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ [۱۲۸:۶] ”کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے تو اس کو ہمارے رو بہ رو ظاہر کرو، تم محض گمان [خیالی باتوں] پر چلتے ہو اور نری قیاس آرائیاں [انکل] کرتے ہو۔“ حالاں کہ ظن و گمان معرفتِ حق کے حصول کے لیے کفایت نہیں کرتا اور روح کا بحران عقل کی میزان سے زائل نہیں ہو سکتا: بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهْوَاءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ [۲۹:۳۰] ”یہ ظالم تو بغیر علم کے خواہش پرستی کر رہے ہیں۔“ علم سے متعلق قرآن مجید کی چند آیات سے یہ مسئلہ کھل کر واضح ہو جاتا ہے کہ علم سے مراد حق کی معرفت ہے جو جہل کی ضد ہے۔ علم رب کی عطائے خاص اور انبیائے کرام علیہم السلام کی وراثت ہے۔ اسی علم کو سیکھنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے:

طلب العلم فريضة على كل مسلم. ۱

اور اسی کو جنت کا راستہ قرار دیا ہے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ومن سلك طريقا يطلب فيه علماً سهل الله له طريقاً الى الجنة. ۲  
”جو شخص علم کی جستجو میں کسی راستے پر چلا اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کے لیے جنت کی طرف جانے کا راستہ آسان کر دیتے ہیں۔“

یہاں علم مال کمانے کا راستہ نہیں بتاتا، بلکہ یہ معرفتِ رب اور مقصدِ تخلیق کا شعور حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، باب العلم سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے منسوب ایک قطعے میں اس فرق کو بڑی انفرادیت و بلاغت کے ساتھ واضح کیا گیا:

رضينا قسمة الجبار فينا لنا علم و للجهال مال

فان المال يفنى عن قريب والعلم باق لا يزال

”ہم اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم پر راضی ہیں کہ ہم تو علم کے حامل ہو جائیں اور جہلا کو اللہ تعالیٰ مال و دولت عطا کر دیں۔ مال کو عنقریب فنا ہو جاتا ہے، جب کہ علم کو ایسی دائمی بقا حاصل ہے، جس میں زوال کا امکان نہیں۔“

۱- محمد بن یزید القزوی، سنن ابن ماجہ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، صفحہ ۲۰۔

۲- محمد بن یحییٰ الترمذی، سنن الترمذی، کتاب العلم، باب فضل طلب العلم، جلد ۱، صفحہ ۹۳۔

اس وضاحت سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ گئی کہ فلسفہ ہو یا مذہب یا سائنس ہر علم چند مابعد الطبعی ایمانیات و تیقنات کا مرہون منت ہوتا ہے۔ فلسفے اور سائنس کا سفر ایسی ایمانیات سے شروع ہوتا ہے جو ذہن انسانی کی تخلیق ہونے کے باعث غیر معتبر ہیں۔ وہ اس لیے بھی غیر معتبر ہیں کہ سائنس اور فلسفہ اپنے علم پر یقین نہیں رکھتے اسے قابل شک، قابل تغیر، قابل اصلاح، قابل غور اور قابل تصحیح و ترمیم سمجھتے ہیں، ایک طرف ایمان سے سفر کا آغاز کرتے ہیں دوسری جانب اپنے ایمان کو ہی غیر معتبر سمجھتے ہیں، اسی لیے ذہنی ارتقا اور حوادث و تجربات سے ثابت ہونے والی غلطی رجوع پر مجبور کرتی ہے۔ اسی لیے فلسفے اور سائنس میں نئے نئے مکتب وجود پذیر ہوتے رہتے ہیں اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے دوچار رہتے ہیں، جب کہ مذہب حق اور اس کے ظہور کی واحد صورت ہے، مابعد الطبعی معنی میں بھی اور قانونی و شرعی معنی میں بھی۔ لہذا اس کی مطلق اور لاشریک حقانیت کو کسی بھی ضرورت یا تاویل کی بنا پر باطل سے مخلوط کرنا دین کے دائرے سے باہر نکل جانے کے مترادف ہے۔ اسی لیے شیخ سعدی فرماتے ہیں:

سعدی بشوئے لورج دل از نقش غیر حق

علمیکہ راہ حق نہ نماید جہالت است

”سعدی! غیر حق کو دل کی تختی سے دھو دے، جو علم اللہ تعالیٰ کا راستہ نہ دکھائے، جہالت ہے۔“

## مغربی فکر و فلسفے کی خوشہ چینی اور اسلام سے تطبیق

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”میں مغربی فلسفے اور فکر کا مرہون منت ہوں اور علم تفسیر Hermeneutics کے جو معیارات میری دانست میں آج نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں وہ مغربی فکر سے مستعار ہیں“۔<sup>۱</sup>

مغربی فکر و فلسفے کی خوشہ چینی ہی ڈاکٹر منظور احمد کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اجتہاد، شاہ ولی اللہ اور اقبال تو مغربی فکر و فلسفے اور اقدار و تہذیب کو اسلامیانے [Islamization] کا ایک بہانہ ہیں۔ اندازہ لگائیے:

[۱] قرآن مجید کے کلام الہی ہونے کو علمی قضیہ ماننے سے انکار کرنا۔<sup>۲</sup>

[۲] سنت کو غیر متبادل اور اٹل نظام نہ تسلیم کرنا۔<sup>۳</sup>

[۳] مسلمانوں کو مغرب کی خوشہ چینی کی دعوت دینا، اور اس ”خوشہ چینی“ کو اسلامی علمی روایت کی فراخ دلی سے تعبیر کرنا۔<sup>۴</sup>

[۴] خود اپنی فکر کو مغربی فکر و فلسفے سے مستعار ہی نہیں گردانا بلکہ مغربی فکر کے معیارات پر اسلام کو سمجھنا اور اسے علم تفسیر کے لیے نتیجہ خیز قرار دینا۔ صورت حال کو واضح کر دیتا ہے۔

مغربی فلسفہ اپنی سرشت میں مذہب مخالف:

منظور احمد کے مغربی فکر سے مستعار نتیجہ خیز معیارات آج جن نظریات مثلاً حقیقت [Realism] نتایجیت [Pragmatism] اور ایجابیت [Positivism] پر استوار ہیں، خود منظور احمد کو اقرار ہے کہ یہ افکار مذہب سے لاتعلق بلکہ: ”بڑی حد تک عناد کا پہلو لیے ہوئے ہیں“۔<sup>۵</sup> اور:

- ۱- منظور احمد، ”چند تعلیمی مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۸۳۔
- ۲- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۶۹۔
- ۳- ایضاً، صفحہ ۹۲۔
- ۴- منظور احمد، ”چند توجہ طلب مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۳۶۔
- ۵- ایضاً، صفحہ ۱۹۵۔



”ان مابعد الطبیعیاتی تصورات کو کسی طرح قبول کرنے پر تیار نہیں جو مذہب کی جان ہیں“۔  
مغرب دین کو فرد کا پرائیوٹ مسئلہ قرار دے کر:

[۱] زندگی کے ہر شعبے سے عملاً بے دخل کر چکا ہے۔ بالفاظ دیگر مذہب کا افراد کے معاشرتی تعلقات کی تشکیل و ترتیب میں کوئی حصہ نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی معاشرتی صف بندی میں افراد کے مقام و درجات کے تعین میں مذہبی اقدار کا عمل دخل ہو بلکہ مذہب کو سیاست، معیشت، اخلاق، قانون، علم و فن غرض اجتماعی زندگی کے کسی شعبے میں دخل اندازی کا موقع نہیں دینا چاہیے۔

[۲] مذہب کی طرف سے پیش کی جانے والی ہر حقیقت، خواہ وہ تمدنی و اخلاقی نوعیت کی ہو یا مابعد الطبعی، اسے شک وارتیاب سے خالی اور ماورائے نہیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ شک ہی عقل مند کی پہچان ہے۔  
کیا ڈاکٹر منظور احمد ان ہی افکار و نظریات کی بنیاد پر مغربی فکر سے متاثر ذہن کے لیے اسلام کی قبولیت کا دائرہ سرلیج الفہم بنانے کے خواہاں ہیں؟

منظور احمد: مغربی فلسفے کی خوشہ چینی کا بلا دلیل دعویٰ: ایک چیستان:

منظور احمد کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ مغربی فلسفے کے ”مرہون کرم“ ہیں اور طبیعیات سے لے کر مابعد الطبیعیات تک کے مسائل کے لیے مغربی فلسفے سے آگہی سمیٹتے ہیں۔ یہ دعویٰ نامکمل، غیر واضح، مہمل بلکہ صاف لفظوں میں چیستان ہے۔ مغربی فلسفہ ایک سمندر ہے سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر منظور احمد اس سمندر کے کس قطرے، کس بوند، کس لہر، کس بھور سے استفادہ و استفادہ کرتے ہیں اور مغربی فلسفے کے کس مکتب سے اپنے اصول و فروع اخذ فرماتے ہیں؟ فلسفے کا ایک مکتب بلا تکلف دوسرے مکتب فلسفہ کو رد کرتا ہے، یہ رد و تردید ہی فلسفیانہ مباحث کو آگے بڑھانے اور نوع بہ نوع عقلی شگوفے کھلانے کا بنیادی ذریعہ ہے۔ اس لیے اس بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب فلسفے کے کس منہاج [Paradigm] میں کھڑے ہیں اور کیا اس منہاج فلسفہ کو قطعی [Absolute] بھی سمجھتے ہیں؟ جب تک ڈاکٹر صاحب کے منہاج، اصول اور مآخذ علم کی وضاحت نہ ہو جائے اس وقت تک فلسفے کے منہاج میں گفتگو ممکن ہی نہیں۔

مختلف النوع فلسفیانہ مناہج اور مکاتب: منظور احمد کا مآخذ؟

مثال کے طور پر ڈاکٹر صاحب نے مغربی فکر سے مستعار ”علم تفسیر“ [Hermeneutics] کے معیارات کو نتیجہ خیز قرار دیا ہے۔ بلاشبہ ہر میثیات [Hermeneutics] فلسفے کا ایک اہم مکتب ہے جو اشیا کی تشریح و تعبیر [Interpretation] کو ایک نئے منہاج میں پیش کرتا ہے، لیکن یہ خود دسیوں منہاج اور افکار و نظریات کا رہن ہے، لہذا اس بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب

ہرمیثاتی فلسفے کے کس ذیلی مکتب سے وابستہ ہیں؟ کیا ڈاکٹر صاحب Biblical Hermeneutics کو مانتے ہیں یا Romantic Hermeneutics یا Philosophical Hermeneutics کو یا Critical Hermeneutics کو یا Materialist Hermeneutics کو یا Iconicism کو۔ علم تفسیر جسے علم تشریح و توضیح کہا جاتا ہے۔ اس فلسفے میں:

- [1] Friedrich Daniel Ernst Schleiermacher
- [2] Wilhelm von Humboldt
- [3] Wilhelm Dilthey
- [4] Edmund Husserl
- [5] Martin Heidegger
- [6] Rudolf Bultmann
- [7] Hans-Georg Gadamer
- [8] Jürgen Habermas
- [9] Karl-Otto Apel
- [10] Paul Ricoeur

جیسے فلسفیوں نے کام کیا ہے ڈاکٹر منظور احمد ان میں سے کس فلسفی کے منہاج میں کھڑے ہیں؟  
ڈاکٹر صاحب اپنے مضامین میں فلسفے میں لسانیات [Linguistic] کے حوالے سے بھی گفتگو کرتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب فلسفہ لسانیات [Linguistic Philosophy] کے کس دائرے کو منہاج علم تسلیم کرتے ہیں؟ کیا ڈاکٹر صاحب Structuralist ہیں؟ لاکان لیوس ٹراؤس اور سوشلر سے استفادہ کرتے ہیں؟ یا Post Structuralist ہیں جیسے Foucault وغیرہ۔ یا ڈاکٹر صاحب Deconstructionist ہیں جیسے Derrida۔

اگر ڈاکٹر منظور احمد Modernism کو مانتے ہیں تو اس میں ایک مکتب Late Modernism ہے جو Descartes سے شروع ہو کر Marx تک آتا ہے۔ دوسرا Contemporary Modernism ہے جس کا نمائندہ Habermas ہے۔

اگر ڈاکٹر صاحب Post Modernist ہیں تو Neo Marxist Postmodernism کو مانتے ہیں جیسے مارکیوزے [Marcuse] اور اڈارنو [Adorno] وغیرہ یا ڈاکٹر صاحب Genealogical Postmodernism کے منہاج علم کے پروردہ ہیں، جیسے Nietzsche یا Deleuze وغیرہ، یا ڈاکٹر صاحب گوٹھرے کیپوسٹ ماڈرنسٹ ہیں جو سرمایہ داری کی مابعد الطبیعیات کو پہچاننے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

آخر مغربی فلسفے میں ڈاکٹر منظور احمد کے اخذ و استفادے کا منبع و ماخذ کیا ہے؟ کیا ڈاکٹر صاحب Scholasticism کو مانتے ہیں یا قبل از جدید فلسفیانہ منہاج [Pre Modern Philosophy] میں کھڑے ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب مسلم فلسفے کے منہاج سے وابستہ ہیں تو یہاں کس مکتب کو own کرتے ہیں۔

وہ Islamist Liberal ہیں یا Liberal Islamist؟ Traditionalist ہیں یا Fundamentalist؟ Revisionist ہیں یا Occidentalists ہیں، یا Orientalist؟ اگر Liberalism کو مانتے ہیں تو اس مکتب فکر کی کس شاخ کو منہاج علم تصور کرتے ہیں یعنی Good Base Liberal؟ یا Theological Liberal؟ یا Ontological Liberal؟ یا Deontological Liberal؟ یا Libertarian Liberal؟ یا Anarchist؟ ہیں۔

اگر مارکسٹ [Marxist] ہیں تو کون سے؟ Western Marxist؟ ہیں؟ Russian Marxist؟ ہیں؟ چینی مارکسٹ؟ ہیں؟ لاطینی امریکی مارکسٹ؟ ہیں؟ Western European Marxist؟ ہیں؟ Eastern European Marxist؟ ہیں؟ برعظیم پاک و ہند کے مارکسٹ؟ ہیں؟ یا مشرق وسطیٰ کے مارکسٹ؟ ہیں؟ کیوں کہ عہد جدید تک آتے آتے Marxism کی اتنی قسمیں ہو گئی ہیں جن کا شمار ساپنوں کی اقسام گننے سے زیادہ مشکل ہے۔

دو مختلف مابعد الطبیعی علمیات کی ایک جانی: عبقری فلاسفہ کا کارنامہ:

آج تک ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی تحریروں سے واضح نہ ہو سکا کہ وہ فلسفے کے کس مکتب کے نمائندے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فلسفے کے نامعلوم اور گم نام منہاج میں کھڑے ہو کر اسلام کے معلوم منہاج اور متعین مابعد الطبیعیات کو مغربی فلسفے کے کس منہاج و مابعد الطبیعیات سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں؟ دو مختلف مابعد الطبیعیاتی تصورات کی ایک جانی کا دشوار گزار کام فلسفے کی تاریخ میں چند ہی عبقری فلاسفہ [King Philosophers] کے ذریعے انجام پذیر ہوا ہے۔ جیسے: افلاطون [Plato]، اگسٹائن [Augustine]، کانٹ [Kant]، ہزرل [Husserl]، ہائیڈگر [Heidegger] وغیرہ۔

[۱] فلسفے کی معلومہ تاریخ میں پہلی مرتبہ افلاطون [Plato] نے Parmenides اور Heraclitus کے مابعد الطبیعی مفروضات کو ملا کر ایک نیا فلسفہ پیش کیا — [۲] دوسری مثال عیسائی فلسفی عالم اگسٹائن [Saint Augustine] کی ہے جس نے عیسائیت کی مابعد الطبیعیات اور ارسطو کے فلسفے کا آمیختہ تیار کیا جو صدیوں تک مسیحی مذہب کی دست گیری و دل پذیری کرتا رہا۔ یونانی فلسفے اور منطق کے ذریعے دو ہزار برس تک عیسائیت اپنی عقلیت کے زخم چھپاتی رہی — [۳] Kant نے عقلیت [Rationalism] اور تجربیت [Empiricism] کی علمیات کو باہم ملا کر ایک نیا فلسفہ Transcendental Idealism تخلیق کیا — [۴] اسی طرح ہائیڈگر نے Being کی جستجو اور اس سے متعلق سوالات کے جوابات کے لیے دو بالکل متضاد فلسفیانہ تصورات، مظہریات [Phenomenology] اور ہرمینیات [Hermeneutics] کو ملا کر ایک الگ فلسفہ Phenomenological Hermeneutics تشکیل دیا۔

اسلام اور مغرب کے مابعد الطبعی تصورات میں تطبیق محال ہے:

سو یہ کام مغرب کے عبقری فلاسفہ نے انجام دیا، ڈاکٹر صاحب کانٹ کی سطح کے فلسفی ہیں اور نہ آگسٹائن کے درجے کے متکلم — اور نہ ہی اسلام اور فلسفے کی مابعد الطبیعیات میں کوئی ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ اگر بالفرض ڈاکٹر منظور احمد تمام فلسفہ ہائے مغرب کی اسلام سے تطبیق و تلفیق کے متمنی ہیں تو اس ”اصطفیائیت“ [Eclecticism] کی اسلام تو درکنار فلسفے کے منہاج میں بھی کوئی خاص وقعت نہیں۔ اس لیے ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا خود کو محض مغربی فکر و فلسفے کا ”مرہون منت“ گرداننے سے بات واضح نہیں ہوگی۔ جب تک ڈاکٹر صاحب مغربی فکر اور فلسفے کے ان گنت جہات میں سے ان بنیادی منابع اور مآخذ کی نشان دہی نہیں فرمادیتے، جن کی ”خوشہ چینی“ ڈاکٹر صاحب کے لیے نتیجہ خیز ہے۔ مآخذ اور منابع کے تعین کے بغیر ڈاکٹر صاحب کے زیر بحث اقتباس اور اس کے زیر اثر اسلام کی تفہیم جدید و تعبیر نو کی بحث پر گفتگو اندھیرے میں تیر چلانے کے مرادف ہے۔

### حاصل بحث:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی پیش فرمودہ نئی الہیات [new analogy] کے تفصیلی مطالعے سے واضح ہو گیا کہ اجتہاد کا حقیقی مقصد اسلام کی ساخت اور بنیادی خدو خال میں مابعد الطبعی سطح کی تبدیلی بلکہ انحراف ہے۔ یہ سوال بہ ہر حال قابل غور ہے کہ اس نئی الہیات میں، جس کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا، کیا چیز نئی ہے؟ کون سا نکتہ تخلیقی ہے؟ کیا یہی وہ نکات اور امور ہیں جن کی بنیاد پر علماء و فقہاء پر اعتراض و طعن کیا گیا تھا کہ فقہاء ”استخراج“ سے کام لیتے ہیں جو ایسے نتائج تک نہیں پہنچاتے جو ”نئے“ ہوں؟ کیا اس ”نئی الہیات“ کا مطالعہ واضح نہیں کر دیتا کہ اس میں کچھ بھی نیا اور تخلیقی نہیں ہے؟ بلکہ سب کچھ فرسودہ اور تقلیدی ہے؟ جو اعتراض علماء پر تھا کہ وہ قرآن و سنت کی خوشہ چینی اور سکہ بند تقلید پر عامل ہیں، کیا یہی صورت حال یہاں نہیں ہے؟ اس ”نئی الہیات“ کے نمونے ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی مغربی فکر و فلسفے اور سائنس کی ”تقلید جامد“ کا مظہر نہیں ہیں؟ قرآن و سنت تو معروضی حقائق ہیں اور تعامل امت اس کی خارجی تجسیم ہے۔ جب کہ یہ ”نئی الہیات“ مغربی فلسفے اور سائنس پر، ان ہی کے عباقرہ کے سنجیدہ اور تابڑ توڑ حملوں کا ہدف بننے والے افکار و نظریات ہیں — اب یہ فیصلہ صاحبان انصاف قارئین کے ہاتھوں میں ہے کہ کس کی خوشہ چینی اور تقلید زیادہ با معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جن کے ساتھ ایک مسلمان کی آخرت اور دنیا دونوں وابستہ ہیں یا مغرب کی — تبدیلی، ترقی، وقت کے ساتھ چلنے اور زمانے کا مقابلہ کرنے کا خیال فی الاصل ایک متجددانہ عقیدے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہمارے جدیدیت پسندوں سے زیادہ اسلام کی حقیقت سے توجرمں مستشرق ہلموت ریٹر [Hellmut Ritte] واقف ہے، وہ کہتا ہے:

ان مفہوم الحقیقۃ للعصر الحدیث تصاعدی مبدئياً، هو یسمو باستمرار الی ما فوق المعروف . ما هذا المفهوم فی الأرتوڈکسیة [یقصد: الاتجاه السنی، أهل السنة] فشی ثابت نهائی ومستقر . وفی العالم الغربی تسيطر ضجة ذهنية دائمة، أما فی الشرق فتسود الطمانينة المعتاده الخاصة به التي عبر جوته عن اشتياقه اليها احياناً . ان عدم تبدل العقلية الشرقية يبدو في أعیننا جموداً . ولكن الأرتوڈکسیة الاسلامیة ترى المستحدثات بدعة مشکوکاً فیها ومشيئة للريب . هي تعتبر عهداً ما متدهوراً لأنه قد تغير بالنسبة للقديم المثالی، بينما نعتبر نحن عهداً من العهود متدهوراً لأنه لم يتغير<sup>۱</sup>.

”دور جدید کے لیے حقیقت کا مفہوم بنیادی طور پر ”ارتقائی“ ہے، جو مسلسل معلوم سے بلند ترکی طرف سفر کرتا رہتا ہے، جب کہ اس کا مفہوم اسلامی آرتھوڈوکسی [مراد عقیدہ اہل سنت] میں ایک حتمی اور مستقل شے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغرب میں مسلسل ایک ذہنی غلطی برپا رہتا ہے، جب کہ مشرق پر وہی جانی پہچانی آسودگی چھائی رہتی ہے جو اس کا امتیاز ہے اور جس کا اشتیاق گاہے گاہے گوٹے نے ظاہر کیا۔ مشرقی ذہنیت میں ”تبدیل نہ ہونے“ کی کیفیت ہمیں جمود نظر آتی ہے، جب کہ مسلمانوں کے مسلمہ عقائد میں نئی نئی باتوں کو ”بدعت“ تصور کیا جاتا ہے جن کی حقیقت مشکوک اور مشتبہ ہے، ان کے ہاں ہر وہ عہد رو بہ زوال ہے جو قدیم مثالی معیار سے ہٹ گیا ہو، جب کہ ہم کسی عہد کو اس لیے رو بہ زوال تصور کرتے ہیں کہ اس میں کوئی تغیر ہی پیدا نہیں ہوا“۔

۱- فواد سیزگن، محاضرات فی تاریخ العلوم العربیة والاسلامیة، فرانکفرٹ: جمہوریۃ المانیة الاتحادیة، ۱۹۸۳ء، صفحات ۱۷۱-۱۷۲۔

## خطبہ نیاز — تبصرہ و تجزیہ

آئندہ صفحات میں ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے پیش کردہ ”خطبہ نیاز“ کے مندرجات کا ایک تحقیقی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد کی تالیفات، خصوصاً زیر بحث خطبے میں جس طرح انھوں نے ”افکار نیاز“ کی تحسین و ترویج، تشریح و تفہیم، اور تبلیغ و تلقین فرمائی ہے، اس سے یہی تاثر اور خیال قائم ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب بھی ان ہی افکار و خیالات کے حامل اور دلدادہ ہیں۔ لہذا آئندہ صفحات میں ”افکار نیاز“ کو منظور احمد کے خیالات جان کر اس پر رائے کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ورنہ جس شخص کو امت مجموعی طور پر اس کی زندگی میں رد کر چکی اور موت کے بعد بھلا چکی ہو، اس کی موت کے اکتالیس سال بعد ایک بار پھر ان پامال مباحث پر نقد و تبصرہ کرنا دانش مندی نہیں ہے۔

## مذہبی فکر اور مسئلہ تکفیر — حزم و احتیاط یا عجلت و تشدد؟

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”مذہبی فکر کا عام طور پر اور اسلامی فکر کا خاص طور پر یہ خاصہ رہا ہے کہ اگر آپ ایمانیات کی روایتی تفہیم کی بجائے کسی اور تفہیم کی کوشش کریں تو فقہی منطق آپ کو فوراً دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیتی ہے“<sup>۱</sup>

بے دلیل بات کرنا اور ہوائی قلعے بنانا اہل علم کی شان کے شایاں نہیں۔ مجموعی اسلامی فکر مسئلہ تکفیر پر نہایت محتاط رہی ہے۔ اگر منظور احمد صاحب نے فقہاء کی تصریحات دیکھ رکھی ہوتیں تو عدم احتیاط اور عجلت پسندی کا الزام نہ لگاتے۔

مسئلہ تکفیر: فقہاء کی تصریحات:

روایتی علماء، مسئلہ تکفیر پر کس درجے محتاط ہیں، درج ذیل نکات پر غور کیجیے:

[۱] ويقع في اهل المذهب تكفير كثير لكن ليس من كلام الفقهاء الذين هم المجتهدون بل من غيرهم ولا عبرة بغير الفقهاء.<sup>۲</sup>

”اور اہل مذہب کے کلام میں تھوک کے حساب سے تکفیر پائی جاتی ہے جب کہ فقہاء مجتہدین کے کلام اس آلودگی سے پاک ہیں۔ اور یہ امر مسلم ہے کہ اس معاملے میں اعتبار صرف اور صرف فقہاء کے قول کا ہوگا۔“

[۲] والذي تحور أنه لا يفتى بتكفير مسلم أمكن حمل كلامه على محمل حسن أو كان في كفره اختلاف ولو رواية ضعيفة.<sup>۳</sup>

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۶۵۔

۲- ابن نجیم المصری، البحر الرائق، کتاب السیر، باب احکام المرتدین، جلد ۵، صفحہ ۲۰۲۔

۳- ایضاً، صفحہ ۲۱۰۔

مذہبی فکر اور مسئلہ تکفیر — حزم و احتیاط یا عجلت و تشدد؟ —

”اور کتابوں میں لکھا گیا ہے کہ کسی مسلمان پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جائے گا جس کے کفریہ کلمات کی تعبیر اچھے پیرائے میں ہو سکتی ہو اور اسی طرح تکفیر نہیں کی جاسکتی اس شخص کی جس کے کفر میں اختلاف ہو اگرچہ کسی ضعیف روایت کی بنیاد پر ہی کیوں نہ ہو۔“

[۳] لا یفتی بالکفر بشیء منها إلا فیما اتفق المشایخ علیہ۔<sup>۱</sup>

”مذکورہ چیزوں میں سے کسی پر بھی کفر کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا البتہ وہ احوال ان سے خارج ہیں جن میں مشائخ کفر کا فتویٰ دینے میں متفق ہیں۔“

[۴] لا یکفر بالمحتمل۔<sup>۲</sup>

”محض شک کی بنیاد پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔“

[۵] إذا کان فی المسئلة وجوه توجب التكفير ووجه واحد يمنع التكفير فعلى المفتی أن یمیل إلى الوجه الذی یمنع التكفير تحسینا للظن بالمسلم۔<sup>۳</sup>

”جب کسی مسئلے میں کئی وجوہات کی بنا پر کافر ہونا ثابت ہو رہا ہو اور صرف ایک وجہ ہو جو اس [مسئلہ] کے مسلمان ہونے پر دلالت کر رہی ہو۔ تو مفتی کو چاہیے کہ وہ اس کے مسلمان ہونے کا فتویٰ دے کیوں کہ کسی کے مسلمان ہونے کا گمان رکھنا ایک پسندیدہ امر ہے۔“

[۶] ویحکى عن بعض من لا سلف له أنه کان یقول ما ذکر فی الفتاوی أنه یکفر بكذا وکذا فذاک للتخويف والتحويل لا لحقیقة الکفر وهذا کلام باطل إلى اخره والحق أن ما صح عن المجتهد فهو علی حقیقته۔<sup>۴</sup>

”اور یہ قول بھی سراسر غلط ہے جو کسی گم نام شخص سے منسوب ہے کہ ”فتاویٰ کی کتابوں میں جن امور پر کفر کے فتوے دیئے گئے ہیں وہ محض ڈرانے اور ان سے دور رکھنے کی حد تک ہیں۔ کفر کے حقیقی معنی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ جب کہ حق اور سچ یہ ہے مجتہدین کا کفر کا فتویٰ دینا یہ اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے ہوتا ہے۔“

[۷] فلهذا لا یکفر منکرا لاجتہادیات بالإجماع۔<sup>۵</sup>

۱- عبدالعزیز ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، کتاب الجہاد، باب المرتد، جلد ۶، صفحہ ۳۵۸۔

۲- ابن نجیم المصری، البحر الرائق، کتاب السیر، باب احکام المرتدین، جلد ۵، صفحہ ۲۱۰۔

۳- عالم بن العلاء الانصاری الاثری الدہلوی، الفتاوی التاتارخانیة، کراچی: قدیمی کتب خانہ، [س-ن]، کتاب احکام المرتدین، فصل فی اجراء کلمة الکفر، جلد ۵، صفحہ ۳۱۲۔

۴- ابن نجیم المصری، البحر الرائق، کتاب السیر، باب احکام المرتدین، جلد ۵، صفحہ ۲۰۲۔

۵- بدرالدین عینی، عمدة القاری، بیروت: دارالکتب العلمیة، ۲۰۰۹ء، کتاب الایمان، باب الایمان و قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: بنی الإسلام علی خمس، جلد ۱، صفحہ ۱۷۳۔



\_\_\_\_\_ مذہبی فکر اور مسئلہ تکفیر۔ حزم و احتیاط یا عجلت و تشدد؟ \_\_\_\_\_

”یہی وجہ ہے کہ باجماع امت اجتہاد کے منکر کے لیے کفر کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔“

[۸] وینبغی للعالم إذا رفع إليه هذا أن لا يبادر بتكفير أهل الإسلام.  
”اور مفتی کے لیے مناسب ہے کہ جب اس کے سامنے یہ معاملہ پیش آئے تو وہ مسلمانوں کے متعلق کفر کا فتویٰ دینے کی طرف مائل نہ ہو۔“

[۹] وینبغی للعالم أن يبادر بتكفير أهل الإسلام مع أنه يقضي بإسلام المکره تحت ظلال السيوف.<sup>۱</sup>

”عالم کو چاہیے کہ اہل اسلام کی تکفیر میں جلدی کرے، نہ کہ تکفیر میں۔“

امت مسلمہ شروع سے آج تک من حیث الکل وحدت امت کی راہ پر گامزن رہی ہے، مگر ذرائع ابلاغ کے اس جدید دور میں علماء، مدارس، مساجد اور مختلف مسالک کے خلاف تو اترو تسلسل سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ مذہبی عناصر ایک دوسرے کی تکفیر سے آلودہ رہے ہیں لہذا یہ کبھی متحد نہیں ہو سکتے۔ حالاں کہ یہ دعویٰ انتہائی لغو اور مہمل ہے۔ امت مسلمہ، چند مستثنیات سے قطع نظر، اپنے اکابر کی صف میں بلا اختلاف مسالک مختلف علماء کو شامل رکھتی رہی ہے۔

امت مسلمہ: مختلف مسالک کے علماء سے محبت اور کتابوں سے استفادہ: مجموعی رویہ:

اگر تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہو جائے گا کہ امام غزالی، شافعی، شیخ عبدالقادر جیلانی، حنبلی، شیخ ابن عربی، طاہری تھے مگر تمام اہل سنت بلا استثناء و تفریق ان بزرگوں سے بے پناہ محبت و عقیدت رکھتے ہیں۔ تصوف کی امہات الکتب بیش تر شافعی اور مالکی بزرگوں کی تحریر فرمودہ ہیں، حنفی مصنفین میں واحد نام و کتاب شیخ علی ہجویری کی کشف المحجوب ہے، لیکن تمام صوفی حضرات بلا نزاع و اختلاف ان بزرگوں کی کتابوں کو حُر زجان بنائے ہوئے ہیں۔

مدارس عربیہ کا نصاب: مختلف مسالک کی کتابوں کا جامع:

اسی طرح مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل صحاح ستہ کے تمام مرتبین حنبلی و شافعی ہیں مگر تمام حنفی اور مالکی ان کتب کی تدریس و تعلیم کو سعادت جانتے ہیں۔ فقہ کی مشہور کتاب ”ہدایہ“ جو شیخ الاسلام برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی [م ۵۹۳ھ] حنفی کی تالیف ہے بلا استثناء تمام مدارس میں زیر درس ہے۔ فلسفے میں ملا صدرا شیرازی شیعہ کی کتب ”اسفار اربعہ“ اور شرح ”ہدایت الحکمتہ“، تفسیر میں قاضی ناصر الدین بیضاوی شافعی [م ۷۹۱ھ] کی ”تفسیر بیضاوی“ اور جار اللہ محمود زحشری معتزلی [م ۸۱۵ھ] کی ”کشاف“ اور لغات القرآن پر راغب اصفہانی شیعہ کی ”المفردات“، بلاغت میں شیعہ مولف کی

۱- ابن نجیم المصری، البحر الرائق، کتاب السير، باب احکام الموتدین، جلد ۵، صفحہ ۲۱۰۔

۲- ابولیت سمرقندی، فتاویٰ النوازل، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۳۲۵ھ/۲۰۰۴م، فصل فیما یوجب الکفر و فیما لا یوجب، صفحہ ۲۸۸۔

”مطلوب“، ادب عربی میں ”نہجہ الیسین“، طب میں ابن سینا کی ”القانون“، ریاضی میں ”شرح چھینی“ اقلیدس میں ارسطو کی کتاب اور نصیر الدین طوسی شیعہ کی ”تحریر اقلیدس“ اور میراث میں ”سراجی“ مدارس عربیہ کے نصاب کا حصہ رہی ہیں۔ امت مسلمہ کے مجموعی مزاج کو ”تکفیری“ ہونے کا طعنہ دینا بہتان طرازی ہے۔ امت مسلمہ اپنی تاریخ میں خلافت راشدہ سے لے کر سلطنت عثمانیہ اور عہد حاضر تک قرابطہ، فاطمین مصر، عہد صفوی اور سلطنت اودھ کے تشددانہ اور جارحانہ نقطہ نظر کے استثناء کے ساتھ ہمیشہ سنگین اختلاف کے باوجود سماجی احترام کو قائم رکھتی رہی ہے۔ اس امت نے خوارج کی علی الاطلاق تکفیر نہ کی جنہوں نے سیدنا علی اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر اصحاب کی تکفیر کی، ان کو قتل کرنے کی تدبیریں کیں اور گناہ کبیرہ کے ارتکاب کو کفر گردانا، اس امت کے علماء و فقہاء کو اپنے مزاج میں تکفیری گردانا ظلم ہے۔

امام ابوحنیفہ: افتراق و تشتت میں وحدت اور توسط کا استعارہ:

اسلامی تاریخ کا سب سے پر آشوب اور خطرناک دور امام اعظم ابوحنیفہ کا ہے، جب شیعہ، خوارج، معتزلہ، جبریہ، مرجیہ اور قدریہ فرقے وجود پذیر ہوئے، ان کے درمیان سنگین نوعیت کی تاریخی جنگیں برپا ہوئیں، اسی دور میں امام اعظم نے ”الفقہ الاکبر“ جیسی عظیم کتاب تصنیف فرما کر اس میں کفر و اسلام کے پیمانے مقرر کیے، جو بعد میں پوری امت کی میراث بن گئے، اس تالیف سے قبل بھی امت اسی نہج پر گامزن اور اصولوں پر عمل پیرا تھی مگر امام اعظم نے اسلاف کے اسی عمل متواتر کو تحریری صورت دے کر امت کے تکفیری اصولوں کو دائماً محفوظ فرما دیا، اسی اعتدال، توازن اور توسط کے نتیجے میں امت صدیوں تک انتشار، تصادم اور منافرت سے محفوظ رہی۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مسلمانوں کے دوران خطاط میں بعض مواقع پر فتویٰ تکفیر کے تشددانہ استعمال نے اسلامی جمعیت میں تفرقے اور انتشار کی صورت پیدا کر دی جس کے مستقل اسباب ہیں، لیکن بعض طبقوں کے جارحانہ عمل کو بنیاد بنا کر پورے فقہی نظام کو مورد الزام ٹھہرانا بعید انصاف و دیانت ہے۔

اسلاف: غیر اہل سنت کی کتابوں سے استفادے کا رواج: ایک کلیدی وجہ:

اس مقام پر اگر ایک نکتے پر غور کر لیا جائے تو بات مزید واضح ہو جائے گی کہ امت مسلمہ کی اکثریت، باوجود اختلاف مسالک کے، مختلف گمراہ فرقوں کی تصانیف سے، خلافیات سے صرف نظر کر کے، کیوں استفادہ کرتی رہی ہے؟ اور آج کے جدیدیت پسندوں مثلاً چراغ علی، کرامت علی جون پوری، سرسید احمد خان اور نیاز فتح پوری وغیرہ پر اعتماد کرنے کے لیے کیوں تیار نہیں؟ سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی نعمانی سے اس کی بہت ہی درست وجہ نقل فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

”ایک زمانے تک ان [علامہ شبلی نعمانی] کو اس پر تعجب رہا کہ سلف میں بھی بہت سے علماء اور ائمہ گزرے ہیں جن کے بہت سے خیالات اور نظری عقائد جمہور علماء سے مختلف تھے، مثلاً وہ قدری تھے یا مرجی تھے، پھر بھی وہ مقبول تھے اور لوگ ان کی قدر کرتے تھے، پھر وہ خود

ہی مجھ سے اس کی وجہ ظاہر فرمانے لگے کہ بات یہ ہے کہ ان بزرگوں کے یہ نظری خیالات ان کے زہد و عبادت و اتقا کے ساتھ تھے، اس لیے وہ مقبول تھے اور یہاں یہ کیفیت نہیں۔ علامہ شبلی نعمانی کا یہ تجزیہ انتہائی حقیقت پسندانہ اور معروضی ہے، نیاز فتح پوری کے ”حالات و کمالات“ اور ”دیانت و تحقیق“ سے واقفیت اور آگہی رکھنے کے بعد کون سا فاتر العقل ہوگا جو اس کے باوجود بھی ان پر اعتماد کرنے کی حماقت کر سکتا ہے؟

دوسری بات ڈاکٹر صاحب کے ارشاد سے یہ مترشح ہوتی ہے کہ ایمانیات کی غیر روایتی تفہیم صرف ”فقہی منطق“ گوارا نہیں کرتی — کسی بھی روایت یا اصطلاح کی تفہیم کو اس دائرے میں مستند سمجھا جائے گا جو اس روایت کا بنایا ہوا ہے اور اس کی تفہیم کا حق اس روایت کے مستند نمائندوں اور شارحین کو ہوگا۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے جو مذہب سے لے کر فلسفے تک ہر جگہ دائرے ہے۔ اگر کوئی ادیب یا شاعر جس کا فلسفے سے تعلق نہ ہو وہ ڈاکٹر صاحب کے افکار و خیالات کی من مانی تفہیم و توضیح شروع کر دے تو کیا ڈاکٹر صاحب کے لیے یہ طرز عمل قابل قبول ہوگا؟ ظاہر ہے کہ نہیں! پھر ڈاکٹر صاحب ہر کہ وہ ایمانیات کی [کسی اور یعنی غیر روایتی تفہیم کا حق دینے پر کیوں آمادہ ہیں؟ کیا اسلام اور اسلامی عقائد و ایمانیات اتنی ارزاں ہیں؟ ”افکار نیاز“ — انصاف سے فرمائیے کہ وہ ایمانیات کی تفہیم کے ذیل میں آتے ہیں یا تحریف و تکذیب کے ذیل میں؟ اسلام کی وسعت نظری کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا دائرہ ضد اور معکوس تک وسیع ہو جائے۔ کسی شے کی وسعت کو پھیلا کر لامحدودیت تک پہنچا دینا تقاضائے علم کے منافی ہے۔ سورج باوجود بے مثل نورانیت و لمعانیت کے اپنی ضد سے ممتاز ہے، یہ ممکن نہیں کہ تاریکی بھی روشنی سے موسوم ہو کر روشنی کہلائے۔ اسی طرح اسلام اور کفر کے درمیان ایک حد فاصل [critical line] ہے۔ اگر ایک مسلمان کو کافر کہنا جرم ہے تو کسی کافر کو مسلمان گردانا بھی ظلم ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایمانیات کی تفہیم کے حوالے سے ”فقہی منطق“ بہت ہی محتاط رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمانیات فلسفے کی طرح کوئی ذہنی و عقلی سرگرمی نہیں ہے۔ ایمانیات اور اعتقادات پر مسلمانوں کی آخرت اور اس کے نتائج کا انحصار ہے۔ ایمانیات کی تفہیم کو جس قدر شارع کی منشا سے قربت ہوگی اسی درجے یہ تفہیم مستند شمار کی جائے گی۔

۱- سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین [س-ن]، صفحہ ۴۱۔

## مذہب — وقتی یا ہمہ وقتی ضرورت

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”مذہب کسی قوم کی وقتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ایک ذریعے کی حیثیت سے وجود میں آتے ہیں۔“

روئے زمین پر ابتدا سے آج تک مختلف مذاہب کا قیام اور کثیر انسانوں کی مذہب سے وابستگی اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ مذاہب وقتی ضرورت نہیں ہمہ وقتی ضرورت ہیں۔ دنیا کی آبادی اس وقت چھ ارب انسانوں پر مشتمل ہے، ان میں سے صرف دو فی صد لوگ ایسے ہیں جو خدا کو صرف زبان سے نہیں مانتے، لیکن مصیبت کے وقت وہ بھی مانتے ہیں۔ یہ لوگ مشرکین عرب اور اہل کتاب کی طرح ہیں۔ قرآن نے ان کا حال یہ بیان کیا ہے کہ: **وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبَيْهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَّمْ يَدْعُنَا إِلَى ضُرِّمَسَّهُ كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ** [۱۲:۱۰] ”جب ان پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے، مگر جب ہم اس کی مصیبت ٹال دیتے ہیں تو ایسا چل نکلتا ہے کہ گویا اس نے کبھی اپنے برے وقت میں ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔“ **هُوَ الَّذِي يُسِيرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَ تَهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنِ أَنْجَيْتَنَا مِنْ هَذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ** فَلَمَّا أَنْجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ [۲۲:۱۰-۲۳] ”جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحان و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک باو مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف موجوں کے تھپڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے ہیں اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے، مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین پر بغاوت کرنے لگتے ہیں۔“ [۲۲:۱۰]

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۶۶۔

امریکن CIA کی مرتب کردہ کتاب World Fact Book کے مطابق جولائی ۲۰۱۳ء تک دنیا کی آبادی ۶،۹۸۰،۲۱۷،۰۹۵ تھی۔ اس آبادی میں دھریوں [Atheists] کی تعداد ۱۰۰ فیصد، عیسائیوں کی تعداد ۳۹،۳۳ فیصد جس میں پروٹسٹنٹ ۱۵،۶ فیصد، کیتھولک ۸۵،۱۶ فیصد، آرتھوڈوکس ۹۶،۳۳ فیصد، انجلیکن ۲۶،۱۱ فیصد، مسلمان ۲۲،۲۲ فیصد، ہندو ۱۳،۸۱ فیصد، بدھ ۷،۷۶ فیصد، سکھ صفر اشاریہ ۳۵ فیصد، شہودی صفر اشاریہ ۲۲ فیصد، بہائی صفر اشاریہ ۱۱ فیصد، اور دیگر مذاہب کے ماننے والے ۹۵،۱۰ فیصد، غیر مذہبی لوگوں کی آبادی ۶،۹۹ فیصد ہے۔ Huntington نے اپنی کتاب The Clash of Civilization میں بھی اس قسم کے اعداد و شمار مہیا کیے ہیں۔

ہدایت ہر مخلوق کی ازلی، فطری اور بنیادی ضرورت ہے۔ ہدایت کا سلسلہ اپنے مربوط نظام کے تحت مخلوق کی تخلیق کے اول روز سے شروع ہو کر، اس کے اختتام تک جاری رہتا ہے۔ اسی ہمہ وقتی ضرورت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے تاریخ انسانی کے دوش بہ دوش فطرت انسانی میں خیر کی تجدید کے لیے بہ فاصلہ زمان و مکان انبیاء و مرسلین مبعوث فرمائے اور اس ربانی ہدایت کو اپنے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل فرماتے ہوئے اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا اور ذرائع حفاظت میں تکوینی انتظام کے ساتھ عالم اسباب میں ایک جماعت کو حفاظت دین پر متعین فرما دیا۔

ڈاکٹر منظور احمد انکار مذہب اور انکار مابعد الطبیعیات پر استوار ہونے والی تہذیب، جس میں ”انسان“ ناپید ہو گیا ہے، کے نمائندوں اور مفکرین کے بیانات پڑھیں انھیں اندازہ ہوگا کہ انسانی زندگی میں مذہب کا بدل ممکن نہیں ہے اور اس کا خلا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ گھاؤ اندر ہی اندر ناسور بن جاتا ہے۔ مذہب بیزاری [theophobia] اور لادینی [sacularism] پر استوار معاشرے حصول تسکین و یقین کے لیے ہر حربہ و طریقہ آزما چکے۔ مگر قلبی سکون کی معدومیت اور روحانی سرور کا فقدان انھیں کھائے جا رہا ہے۔ یہ مذہب ہی ہے جو انسان پر اس کے مقصد تخلیق اور بنائے حیات کو واضح کرتے ہوئے اسے مقام عبودیت عطا کرتا ہے۔ اس کی بدولت انسان میں دوسروں کے لیے جینے کی امنگ اور خدا تعالیٰ کی راہ میں مرنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، جو افراد کی زندگیوں کو خود احتسابی اور خدا سپردگی کی نعمت عطا کرتا ہے، آلام و نوائب اور رنج و محن کی پر خار وادیوں کو پوری ایمانی معرفت اور عزم و حوصلے کے ساتھ عبور کرنے کی لگن اور جذبہ عطا کرتا ہے۔

۱- یہ بات اہم ہے کہ آزادی، بد معاشی اور عیاشی، ہر طرح کے گناہ، ضلالت، طغیان و عدوان کو انجیل کے نام پر عام کرنے والے عیسائی فرقے پروٹسٹنٹ کو آج بھی کیتھولک فرقے کے مقابلے پر بہت کم مقبولیت حاصل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک خود کو گناہ گار سمجھتا ہے اور نیک زندگی کو معیاری جانتا ہے، اگرچہ وہ اسے اختیار نہیں کرتا، مگر گناہ کو اپنے خبث باطن کی مجبوری قرار دیتا ہے۔ تین سو سال گزر جانے کے بعد بھی راسخ العقیدہ کیتھولک کو آزاد مغرب میں اب بھی عددی برتری حاصل ہے۔ تاریخ مذاہب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ راسخ العقیدگی کبھی شکست نہیں کھاتی وہ رہ رہ کر ابھرتی ہے۔

2- <https://www.cia.gov/library/publications>

[25-12-2013]

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۲۵۵

\_\_\_\_\_ مذاہب — وقت یا ہمہ وقتی ضرورت \_\_\_\_\_

جدید مغربی تہذیب و فکر، ربانی ہدایت سے بے بہرہ، آخرت میں جواب دہی سے بے نیاز ہو کر بلکہ ”خدا کی موت“ کا اعلان کر کے، انسان کو، جو اشرف المخلوقات تھا، گرا کر حیوانیت کی سطح پر لے آئی تو پھر اس میں اخلاق و آداب، شرم و حیا اور معرفت و روحانیت کی تلاش ہی فضول ہے۔ اب ان کے ہاں معیار عملی [realist] اور واقعی [positivist] ہے، جس کے تحت انسان جبلتوں [instincts]، طبیعی خواہشات اور حیوانی خصائص کا نام رہ گیا ہے۔

مذہب کو وقتی ضرورت کہنا، نفس مذہب، اسلام اور خود مغربی فکر، آزادی مذہب کی دل خراش تاریخ سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

## اسلام کی عالم گیریت اور معاشرتی ارتقا

ڈاکٹر منظور احمد مذہب کے ضمن میں نیاز فتح پوری کا یہ اقتباس بلا تنقید نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

..... اور ظاہر ہے کہ معاشرتی ارتقا کے اس سٹیج پر ان کا ظہور ہوا ان کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ دنیا کو عالم گیر اور ابدی اصول دے سکیں، یہاں تک کہ اسلام بھی جس کے بارے میں مذہبی مقتدرہ کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ عالم گیر اور دائمی ہے، اس لیے درست نہیں کہ اسلام نہ اپنے معتقدات دینی کے لحاظ سے سب کے لیے قابل قبول ہے اور نہ شریعت کے اعتبار سے اسے مکمل کہا جاسکتا ہے۔

گفتگو سے قبل اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ ”مذہبی مقتدرہ“ سے مراد کیا ہے؟ اسلامی فکر کی مجموعی روایت کتاب و سنت اور اجماع امت کی اتباع پر کھڑی ہے۔ کیا منظور احمد انھیں مذہبی مقتدرہ مانتے ہیں؟ اگر مانتے ہیں تو نصوص قرآنی، سنت اور اجماع اسلام کو عالم گیر اور دائمی باور کراتے ہیں؟ اور اگر نہیں مانتے تو پھر انھیں اپنے ”منظور احمد“ کہلانے پر اصرار کیوں ہے؟ ظاہر ہے یہ ایمان کی چنگاری ہے جو اپنی تاریخ، اسما اور روایات سے وابستہ کرتی ہے، ڈاکٹر صاحب ہمارے موقف سے اختلاف کریں تو تب ہم ان سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے نام کی اصلاح پر بھی ضرور توجہ دیں۔

دوسرے، مذہب کے عالم گیر اور دائمی ہونے کے لیے اس کا ہر ایک کے لیے قابل قبول ہونے پر اصرار کرنے کا دعویٰ جدیدیت اور مغربی فکر کی بھرپور ترجمانی ہے۔ نگاہ خداوندی میں حقانیت مذہب کی کسوٹی قلت و کثرت نہیں ہے اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ انسانوں کی اکثریت جس دعوے کی مؤید ہو وہی حق ہے۔ تاریخ انسانی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عہد میں اکثریت گمراہ رہی اور اقلیت راہ ہدایت پر۔ اگر حقانیت کا معیار یہی ہے کہ سب اسے قبول کر لیں تو کیا خود منظور احمد اور ان کے مددوچ نیاز فتح پوری کے اقوال و افکار ہر ایک کے لیے قابل قبول ہیں؟ یقیناً نہیں۔ تو کیا فاضل موصوف کو اپنے افکار و نظریات کے غلط ہونے کا کبھی وہم بھی گزرا ہے؟

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۶۶۔

## نیاز اور انکار حدیث

ڈاکٹر منظور احمد صاحب نیاز فتح پوری کی بھرپور وکالت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”نیاز کے خلاف عائد کیے جانے والے الزاموں میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ منکر حدیث ہیں، اس کی وضاحت میں نیاز نے لکھا ہے: یہ کہنا سخت غلط بیانی ہے کہ میں امام بخاری کا مخالف ہوں، میں صرف یہ کہتا ہوں کہ نہ صرف بخاری بلکہ تمام کتب احادیث بہ حالت موجودہ ہرگز اس قابل نہیں کہ ان پر کلیتہً اعتماد کر کے کسی مذہب کے اصول کو پیش کیا جاسکے۔ کیا اس امر کا کوئی ثبوت ہے کہ صحاح ستہ میں جتنی احادیث درج ہیں وہ واقعی وہی ہیں جو ان کے جامعین نے فراہم کی تھیں اور ان میں بعد کو تدلیس و تحریف یا حذف و اضافہ کچھ نہیں ہوا؟ یقیناً اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا، اس لیے میری مخالفت نہ امام بخاری سے ہے نہ ان کے مجموعہ احادیث سے بلکہ صرف اس قول سے کہ کیوں بغیر تنقید کے ہر قول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر کے کیوں مذہب اور رسول کی توہین کی جائے۔ اور کیوں ایک ایسے شخص کو جو بغیر سمجھے ہوئے احادیث ماننے کے لیے تیار نہیں، مذہب کا مخالف قرار دیا جائے“۔

جو شخص قرآن مجید کو کلام اللہ ماننے کو تیار نہ ہو اگر وہ احادیث کو حجت بھی نہ مانے تو اس سے کیا شکوہ کیا جائے؟ حیرت تو منظور احمد صاحب پر ہے جو نیاز کے اس بیان کو، جو ان کی قلت علم پر دلالت کرتا ہے، بلا نقد و جرح نقل فرما رہے ہیں۔ کیوں کہ نیاز صاحب بددیانت ہونے کے ساتھ ساتھ علوم اسلامی خصوصاً علم حدیث اور اصول و نقد حدیث، فن اسماء الرجال اور خدمت حدیث کے باب میں علما کی خدمات و تحریرات سے ناواقف تھے، نہ ہی انہوں نے مستشرقین کی تحریروں کا مطالعہ کیا تھا، مختلف کتابوں میں نقل شدہ مستشرقین کے چلتے حوالوں کو پڑھ کر ان سے متاثر ہو گئے تھے۔ اس بیان کے نقل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر منظور احمد بھی احادیث کے سلسلے میں شک و ارتباب کا شکار ہیں۔ ظاہر ہے مسلمانوں کے معاشرے میں رہنے والا الحاد پرور اور متشکک کبھی اسلام و ماخذ اسلام کا صریحاً انکار نہیں

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۶۸۔



کرتا، اس کی ہمت نہیں پڑتی کیوں کہ وہ اس کی قیمت نہیں چکا سکتا، وہ یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر میں نے صاف لفظوں میں انکار کر دیا تو اس گری پڑی صورت حال میں بھی مسلم معاشرے میں میرا کلمہ و ایمان ہی ناقابل اعتبار و اعتنا قرار پائے گا۔ جس سے میرے عزائم و مقاصد کی تکمیل میں رخنہ پڑے گا۔

حدیثی استناد اور صحت کو معرض شک و اربتیاب ٹھہرانے کے لیے فریب کاری کا عمل برسوں پہلے A. Sprenger نے شروع کیا جو مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے، اور جنھوں نے حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب الاصابۃ فی تمییز الصحابة کو ایڈٹ کر کے کلکتہ سے شائع کرایا، ۱۸۵۱ء میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر تین جلدوں میں کتاب لکھی، اس میں روایت حدیث اور اس کی حیثیت پر گفتگو کی۔ اس کے چند برسوں بعد ۱۸۵۶ء میں ان کی جرمن تحریروں کا انگریزی ترجمہ بھی منظر عام پر آ گیا تھا جن میں حدیثی اسناد کو مشکوک ٹھہرایا گیا تھا۔

اس کے چار سال بعد Theodor Nöldeke کا کام Geschichte des Qorâns, [Göttingen, 1860] منظر عام پر آیا۔ 1875-77 میں Alfred von Kremer نے دو جلدوں میں ایک کتاب Culturgeschichte Des Orients Unter Den Chalifen, [Wilhelm Braumüller, 1875] لکھی۔ اسی طرح یوپی کے لیفٹننٹ گورنر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر مفصل کتاب لکھی جس میں Sprenger ہی کے موقف کی تائید و توسیع کی۔ تاہم یہ موقف معروف یہودی مستشرق Ignác Goldziher تک آتے آتے پوری فنی تنقید و تشکیک کا شاہکار بن کر اس کی کتاب Muhammedanische Studien [Halle a. S, 1889] کی دوسری جلد میں پوری شدت و تفصیل سے ظاہر ہوا، جو 1890 میں طبع ہوئی۔ اس کے بعد آنے والے مستشرقین نے ان موضوعات پر بالعموم گولڈزیہر کا اتباع کیا ہے۔ گولڈزیہر کے ان ہی اصولوں کو اسلامی قانون کی تحقیق میں اس سے بڑھ کر جارحانہ انداز میں پروفیسر شاحٹ [Joseph Schacht] نے اپنی کتاب The Origins of Muhammadan Jurisprudence [ACLS, 2008] میں پیش کیا ہے۔ ان تمام مستشرقین نے بالاتفاق احادیث نبویہ کی اسنادی حیثیت کو مشکوک قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک حدیثی لٹریچر بعد کی پیداوار ہونے کے باعث بہ طور دینی ماخذ ناقابل اعتبار ہے۔

حجیت حدیث: مستشرقین کی مجموعی تحقیق:

مستشرقین کی مجموعی تحقیق کے خلاصے کو درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

[۱] حدیثی لٹریچر زیادہ تر زبانی روایت پر مبنی ہے، جو ایک صدی سے زیادہ عرصہ اسی زبانی روایت سے منتقل ہوتا رہا ہے۔

1- A. Sprenger, On the Origin and Progress of Writing Down Historical Facts among the Muslims. Jornd of the Asiatic Society of Begal, 1856, pp.303-329, 375-381.

۲- خالد علوی، "علامہ اقبال اور حدیث"، مشمولہ، علامہ اقبال کا تصور اجتہاد [مرتبین: ایوب صابر، محمد سہیل عمر]، لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۰۸ء، صفحات ۷۸-۷۹۔

[۲] اسلامی قانون کے ابتدائی مجموعوں میں حدیثوں کی تعداد کم ہے جب کہ بعد کے ادوار میں تعداد بڑھ گئی اور متاخر مجموعوں میں اتنی بڑی تعداد جمع ہو گئی جو ابتدائی دور میں ناقابل تصور تھی۔

[۳] کم عمر صحابہؓ کی روایات بڑی عمر کے صحابہؓ کی مرویات سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس لیے ان کے ساتھ جو سند ملتی کی گئی ہے، وہ قابل اعتماد نہیں۔

[۴] اسناد کا طریق پہلی صدی ہجری کے آخر میں استعمال کیا گیا ہے لہذا یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جس حدیث کو اسی اسناد سے بیان کیا گیا ہے وہ صحیح معنوں میں حدیث ہے۔

[۵] بہت سی احادیث ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

[۶] ایسے یقینی ثبوت موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر اسناد اور متن حدیث موضوع ہیں۔

[۷] مسلم نقادوں نے اپنے تنقیدی اصولوں کو سند تک محدود رکھا ہے اور متن حدیث پر کبھی

تنقیدی نگاہ نہیں ڈالی۔

مسلمانوں کی مضبوط علمی روایت: مستشرقین کو منہ توڑ جواب:

الغرض مستشرقین نے وضع حدیث کو بنیاد بنا کر حدیث کے پورے ذخیرے کو مشکوک قرار دیا، اور سیاسی و کلامی اختلافات کو اشاعت حدیث کا سبب قرار دیا۔ اسی طرح قانونی ضرورتوں کے تحت وضع حدیث کو ایک حقیقت ثابت کیا گیا۔ مستشرقین کی مشکل یہ تھی کہ انھیں مسلمانوں کی مضبوط علمی روایت کا سامنا تھا۔ مسلم تحریری سرمائے میں دینی علوم کو کئی شاخوں میں منقسم کیا گیا تھا اور ہر شاخ پر بہترین ذخیرہ موجود تھا۔ جہاں تک مستشرقین کے اعتراضات کا تعلق ہے تو اس کا جواب قدیم لٹریچر میں بھی موجود ہے اور جدید دور کے مسلمان محققین نے تو ان کے تار و پود بکھیر دیے ہیں۔ انھوں نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ مستشرقین کی تحقیقات بالعموم متون کی غلط تعبیر اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے پر مبنی ہیں۔ اس لیے ایک دیانت دار محقق اصل صورت حال معلوم کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرے گا۔ مسلمانوں کے ہاں نقد حدیث کے سلسلے میں شاندار علمی ذخیرہ موجود ہے حدیث کے بارے میں منحرف گروہوں کے خیالات کا علمی جائزہ ہماری روایت کا حصہ ہے۔ نیاز اور ان کے تتبع میں ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا مجموعہ احادیث پر اعتراض وہاں سے درآمد شدہ ہے۔

حفاظت حدیث: بنیادی اسباب:

جس طرح قرآن مجید کی حفاظت کا تکوینی و غیبی ذریعہ اور سبب تسلسل و تعامل امت ہے۔

احادیث مبارکہ کی بھی حفاظت کے یہی اسباب ہیں۔ جن ہاتھوں سے امت کو قرآن ملا ہے، ان ہی ہاتھوں سے امت کو احادیث بھی ملی ہیں۔ صحابہؓ کی روایت و درایت، فروع فقہیہ، فروع اعمال کی وسعت اور عشق رسولؐ، حفاظت حدیث کے لائق اعتماد ذرائع ہیں۔

جدیدت پسند: انکار حدیث کے پس پشت کار فرما جذبہ:

اگر نیاز یا منظور احمد لائق اعتماد فنی نیچ پر قائم رہتے ہوئے کسی روایت پر جرح و نقد کرتے اور پھر کسی مجموعہ احادیث کی روایات کو رد کرتے تو کسی کو بھی ان سے شکایت نہ ہوتی۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا نقد یہ لحاظ دلائل ہر ایک کے لیے قابل قبول نہ ہوتا، تاہم یہ اہل علم میں مروج ایک سنجیدہ علمی و تحقیقی اسلوب ہے۔ لیکن تدلیس و تحریف اور حذف و اضافے کو بنیاد بنا کر پورے ذخیرہ احادیث کو جس سے مسلمانوں کا ظاہر و باطن متعین ہوتا ہے اور مسلم تہذیب و تمدن کی تشکیل ہوتی ہے [نا قابل اعتبار ٹھہرا دینا کہاں کا انصاف ہے؟ جب کہ ان گنت صحیح اور متواتر احادیث نیاز کے افکار و عقائد کی صریحاً تغلیط کر رہی ہوں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اکثر باتیں کئی پہلو اور مختلف احتمالات رکھتی ہیں، اس کی حقیقی اور راست جہت احادیث و سنت اور آثار صحابہ سے متعین ہوتی ہے، من چاہی خواہشات اور اھوئی پرستی کی راہ میں سنگ گراں حدیث و سنت ہی ہیں۔ اور انہی سے مسلمانوں کی غیر مشروط اور لازوال وابستگی حالات کی عالم گیر تبدیلی اور بگاڑ کے باوجود مسلمانوں کو مذہب اور روایات مذہب سے جوڑے ہوئے ہے۔ اب مسلم معاشرے میں رہتے اور کلمہ اسلام کا دم بھرتے ہوئے صریحاً تو یہ کہا نہیں جاسکتا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اقوال کو بدلتی دنیا اور متمدن سماج کے، نعوذ باللہ، لائق نہیں سمجھتے، اس میں مفت کی سرد روی ہے اور دوسرے ”فقہی منطق“ بھی راہ رو کے کھڑی ہے، لہذا آسمان صورت یہ ہے کہ مجموعہ احادیث کے خلاف ہی شک و ارتباب کا بیج بو دیا جائے۔ اور یہی جدیدیت پسندوں کا محبوب موضوع اور اصل ہدف ہے، Dr. Sheila

Mc Donough نے غلام احمد پرویز پر اپنے مقالے میں یہ تاریخی جملہ لکھا ہے:

Criticism of hadith has been practiced by all the Muslim modernists.

حدیث: مذاہب عالم میں مسلمانوں کا امتیاز:

مذاہب عالم میں مسلمانوں اور اسلام کا امتیاز ہی یہ ہے کہ یہ دیگر مذاہب کے بالمقابل علم حدیث میں ممتاز ہیں۔ دیگر مذاہب کے پاس ان کی مذہبی کتابیں تو تھیں لیکن ان کتابوں کے گرد قوی و عملی روایات کا پہرہ نہ تھا۔ مسلمانوں نے قرآن مجید کے ساتھ اقوال و اعمال نبوت کو بھی مشعل راہ بنایا، علم حدیث کے سائے میں قرآن مجید لفظاً، معنا، تعبیراً ہر طرح کی تحریف اور تدلیس سے محفوظ رہا۔

نیاز: صحیح بخاری پر اعتراض کی حقیقت:

صحیح بخاری کے تذکرے کے ضمن میں نیاز کا یہ کہنا:

”ہر قول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر کے کیوں مذہب اور رسول کی

توہین کی جائے۔“

یہ ایک سنگین جسارت ہے۔ کیا محدثین بالخصوص حضرت امام بخاریؒ نے ہر قول کو ”بلا تنقید“ اپنے مجموعہ احادیث میں داخل و شامل فرمایا ہے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نیاز نقد حدیث اور فن جرح و تعدیل سے بالکل ہی لاعلم اور ناواقف تھے۔ رہی بات امام بخاریؒ کی تو امام بخاریؒ کا اپنا ارشاد ہے:

ما أدخلت في هذا الكتاب إلا ما صحح<sup>۱</sup>

”میں نے اپنی اس کتاب میں صرف صحیح احادیث ہی کو بیان کیا ہے۔“

امام بخاریؒ مزید ارشاد فرماتے ہیں:

ما أدخلت فيه حديثاً حتى استخرت الله تعالى و صليت ركعتين و تيقنت صحته<sup>۲</sup>

”میں نے اپنی ”صحیح“ میں کوئی حدیث اس وقت تک درج نہیں کی جب تک میں نے اللہ

تعالیٰ سے استخارہ نہیں کر لیا اور مجھے اس حدیث کی صحت کا یقین نہیں ہو گیا۔“

مزید فرماتے ہیں:

ما أدخلت في كتابي [الجامع] إلا ما صحح<sup>۳</sup>

”میں نے اپنی کتاب ”الجامع“ میں صرف صحیح احادیث ہی بیان کی ہیں۔“

جب صحیح بخاری کی تالیف و تدوین مکمل ہو گئی تو آپ نے اسے اپنے اساتذہ امام علی بن مدینیؒ

[م ۲۳۳ھ]، امام احمد بن حنبلؒ [م ۲۴۱ھ]، اور امام یحییٰ بن معینؒ [م ۲۳۳ھ] کو دکھائی۔ ملاحظہ فرمانے

کے بعد سب نے تحسین فرمائی اور ”صحیح“ ہونے کی شہادت دی۔<sup>۴</sup>

یہی حال صحیح مسلم کا ہے، امام مسلمؒ کا بیان ہے:

ليس كل شيء عندي، صحيح و وضعته ههنا. إنما وضعت ههنا ما أجمعوا عليه<sup>۵</sup>

”میں نے ہر صحیح حدیث اپنی کتاب میں بیان نہیں کی بلکہ میں نے اس کتاب میں وہ

حدیث بیان کی ہے جس کی صحت پر محدثین کا اجماع ہے۔“

صحاح ستہ خصوصاً صحیح بخاری اور صحیح مسلم اپنے زمانہ تالیف سے لے کر آج تک امت میں

مقبول و مروج رہی ہیں۔ ابتدا ہی سے اہل علم میں اس کی تدریس اور شرح و تفہیم کا سلسلہ جاری رہا ہے اور

۱- شمس الدین الذہبی، سیر اعلام النبلاء، بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۴۰۳ھ، الطبقة الرابعة عشر، أبو عبد الله البخاری، جلد ۱۲ صفحہ ۴۰۲۔

۲- احمد بن حنبل بن حنبل، ہدی الساری مقدمة فتح الباری، الرياض: مكتبة الملك فهد الوطنية، ۱۴۲۱ھ، ذکر فضائل الجامع الصحيح الخ، صفحہ ۵۱۳۔

۳- جمال الدین یوسف المزنی، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۴۱۳ھ، باب المیم من اسمہ محمد، محمد بن اسماعیل..... البخاری الخ، جلد ۲۲، صفحہ ۲۴۲۔

۴- احمد بن حنبل بن حنبل، ہدی الساری مقدمة فتح الباری، ذکر مراتب مشایخہ الذین کتب عنہم وحدث عنہم، صفحہ ۵۰۳۔

۵- مسلم بن حجاج القشیری، صحیح المسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب التَّشَهُد فی الصلوٰۃ، جلد ۱، صفحہ ۱۷۴۔

تاریخ کے کسی عہد میں ان پر گنہگار کا پردہ نہیں پڑا۔ اس لیے نیاز کا یہ کہنا کہ صحاح ستہ یا بخاری شریف کے تحریف و تدلیس سے خالی ہونے پر کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا، علم و انصاف کے منافی ہے۔ جب حدیثی ذخیرے میں تحریف و تدلیس کا دعویٰ نیاز فتح پوری کا تھا تو پھر اس کا ثبوت اور دلیل بھی ان کے ہی ذمے تھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی صحت پر اجماع نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

أما الصحيحان فقد اتفق المحدثون على أن جميع ما فيها من المتصل المرفوع صحيح بالقطع و أنهما متواتران الى مصنفيهما، و أنه كل من يهون أمرهما فهو مبتدع متبع غير سبيل المؤمنين<sup>۱</sup>۔

”صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بارے میں علمائے حدیث کا اتفاق ہے کہ ان دونوں کتابوں میں جس قدر مرفوع متصل احادیث ہیں وہ قطعاً صحیح ہیں اور یہ کہ یہ دونوں کتابیں اپنے مصنفین تک متواتر ہیں اور یہ کہ جو شخص ان کے مرتبے کو بے وزن کرنا چاہتا ہے وہ بدعتی ہے، اہل ایمان کے راستے سے ہٹ کر دوسرے راستے پر چل رہا ہے۔“

الغرض مستشرقین اور منکرین حدیث کے اعتراضات کا جواب اگرچہ مسلمانوں کے قدیم تصنیفی سرمائے میں بھی پوری وضاحت اور سطر کے ساتھ موجود تھا اور عہد جدید کے مسلم محققین نے ان اعتراضات کی ایک ایک شق کا تحلیل و تجزیہ کیا اور ان کے بنائے اعتراض اور اساس استدلال کے صحت و سقم کا جائزہ لے کر اس میں موجود تحریف، خیانت، کذب، فریب اور کتر بیونت کو ایسی صحت اور موثر طریق پر واضح کیا ہے کہ بلا مبالغہ ان اعتراضات کا تار عنکبوت کی طرح کم زور ہونا کسی سنجیدہ اور دیانت دار اہل علم پر پوشیدہ نہیں۔

اگر فاضل معترض نے حجیت و خدمات حدیث کے سلسلے میں تحریر فرمودہ کتابیں دیکھ رکھی ہوتیں تو ان پر نیاز کے ان بیانات کی لغویت و سفاہت واضح ہو جاتی اور وہ کبھی اس حوالے کو اپنے خطبے میں درج نہ فرماتے۔

۱- شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، پشاور: وحیدی کتب خانہ [س-ن]، جلد ۱، صفحہ ۳۰۶۔

۲- ذیل میں اس سلسلے کی تالیفات کی منتخب فہرست مہیا کی جا رہی ہے اگر وقت نکال کر ان کتب سے استفادہ فرمایا جائے تو حدیثی ذخیرے کے تاریخی لحاظ سے ناقابل اعتراض ہونے کا خیال اور شبہ رفع ہو جائے گا:

[۱] جلال الدین السیوطی، مفتاح الجنة في الاحتجاج بالسنة، بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۳۰۷ھ/۱۹۸۷ء۔

[۲] مصطفیٰ السباعی، السنة و مکانتها في التشريع الإسلامی، مصر: المکتب الاسلامی، دار الوراق، ۲۰۰۰ء۔

[۳] حبیب اللہ الخٹا، السنة النبویة و مکانتها في ضوء القرآن الکریم، کراچی: المکتبۃ البنوریہ، ۱۳۰۷ھ/۱۹۸۶ء۔

[۴] مناظر احسن گیلانی، تدوین حدیث، کراچی: ادارہ مجلس علمی، ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء۔

[۵] سید ابوالاعلیٰ مودودی، سنت کی آئینی حیثیت، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء۔

[۶] حبیب الرحمن اعظمی، ”نصرۃ الحدیث“، مشمولہ رسائل اعظمی، کراچی: زمزم پبلشرز، ۲۰۰۹ء، صفحات ۲۱-۲۱۹۔

[۷] پیر کرم شاہ الازہری، سنت خیر الانام، اسلام آباد: دعویہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، [س-ن]۔

[۸] محمد حنیف ندوی، مطالعہ حدیث، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۷ء۔

نیاز: موضوع حدیث سے مرزا قادیانی کے نبی ہونے پر استدلال:

ایک طرف تو نیاز فتح پوری اپنے آپ کو قبولیت حدیث کے معاملے میں اس درجے محتاط اور متشدد باور کراتے ہیں کہ صحیح بخاری تک ان کی نگاہ التفات اور نظر اعتنا میں جگہ نہیں پاسکی۔ دوسری طرف حال یہ ہے کہ جس روایت کو اپنے لیے مفید مطلب پاتے ہیں اسے مطلب براری کے لیے بے کھٹکے نقل کر دیتے ہیں، مثلاً روایت ”علماء امتی کا انبیاء بنی اسرائیل“ سے مرزا قادیانی کے نبی ہونے پر استدلال فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

”رسول اللہ نے خود اپنی امت کے علما کو انبیائے بنی اسرائیل ظاہر کیا ہے اور مرزا صاحب یقیناً امت محمدی ہی سے تعلق رکھتے تھے۔“

جب کہ علم حدیث کے محققین اور فن و نقد حدیث پر نگاہ رکھنے والے علما اس حدیث کو لا اصل لہ قرار دیتے ہیں۔

[9] Muhammad Mustafa Azmi, *Studies in Early Hadith Literature*. Beirut: al-Maktabal-Islami, 1962.

[10] Muhammad Mustafa Azmi, *On Schacht's Origins of Muhammadan Jurisprudence*. New York: John Wiley, 1985.

[11] Fuat Sezgin, *Geschichte des arabischen Schrifttums*, 9 Vol., E.J. Brill, Leiden, 1966.

[12] Weal B. Hallaq, *History of Islamic Legal Theories: An Introduction to Sunni Usual al-Fiaq*. Cambridge: Cambridge University Press, 1997.

۱- نیاز فتح پوری، ”باب الرسالة والمناظرة: احمدی جماعت“، مشمولہ ماہنامہ نگار، نومبر ۱۹۵۹ء، صفحہ ۴۰۔

۲- ملا علی قاری، المصنوع فی معرفة الحدیث الموضوع [الموضوعات الصغری]، بیروت: دار البیشار الاسلامیہ، ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۳م، حدیث نمبر ۱۹۶، صفحہ ۱۲۳۔

## سر سید کا تفسیری منہاج — فطرت روایتی اور مغربی تصور ہائے فطرت سے کامل ناواقفیت

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”نیاز فتح پوری نے، اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے سر سید کا پیرا ڈایم استعمال کیا اور اسلام کو فطرت کے قوانین اور اصولوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی“۔<sup>۱</sup>  
سر سید نے قرآن کو فطرت کی روشنی میں سمجھنے کی کیسے کوشش کی، ڈاکٹر صاحب ہی لکھتے ہیں:  
”سید احمد خان کے نزدیک اس مسئلے کا ایک آسان حل تھا اور وہ یہ کہ موجودہ سائنسی علم قیاسی اور ظنی نہیں ہے، اور فطرت کا علم اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کیا ہے، اس لیے اس کی صحت پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ اگر قرآنی آیات فطرت کے علم کے متضادم معلوم ہو تو اس کی اس طرح تعبیر کر لی جائے گی کہ وہ فطری علوم کے مطابق ہوں“۔<sup>۲</sup>

سر سید احمد خان کے پاس کوئی منہاج تھا ہی نہیں، بس مغربی تہذیب کی برتری پر ایمان اور اس کی اسلام سازی ہی ان کا اصل مقصد اور ہدف تھا، فطرت کا نام تو فقط اس کارروائی کی اسلام سازی کے لیے لیا گیا تھا — سید احمد خان نے جس عہد میں آنکھ کھولی وہ مسلمانوں کے لیے سیاسی طور پر بحران اور سماجی طور پر زبوں حالی اور انتہائی عسرت کے ایام تھے۔ ۱۸۵۷ء میں ناکامی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں سے سخت انتقام لیا، بہ قول بہادر شاہ ظفر:

جسے بھی دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے

سید صاحب حساس طبیعت اور دل دردمند کے حامل تھے، مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت اُن کے لیے ناقابلِ برداشت تھی، انہوں نے طے کیا کہ مسلمانوں کو اس زوال اور پستی سے نکالنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے، کمر ہمت گس لی اور صلاح و فلاحِ مسلم کا علم لے کر میدان میں کود پڑے۔ آزاد طبیعت

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۶۸۔

۲- ایضاً، صفحہ ۸۶۔

کے مالک تھے اور بہ قول حالی: انھوں نے قدیم یا جدید کسی طریقے میں بھی پوری تعلیم نہیں پائی۔ چنانچہ انگریزی زبان سے ناواقف ہونے کی بنا پر وہ مغربی فکر و فلسفہ اور تہذیب و اقدار کی تاریخ سے بے خبر ہونے کے باعث اُس کی ہلاکت آفرینیوں کو نہ جان سکے۔ ساری عمر ان علوم کے پیدا کردہ اشکالات و شبہات سے متاثر اور اُس کے بالمقابل اپنی روایت کے حوالے سے احساسِ کہتری کا شکار رہے۔ وہ مغربی علوم خصوصاً سائنسی اکتشافات سے مغلوبیت و مسحوریت کی حد تک مرعوب تھے، اُسے حرفِ آخر اور کسی بھی چیز کے رد و قبول کی کسوٹی یا سقم و صحت کا معیار سمجھتے تھے۔ اُن کی پوری کوشش تھی کہ کسی طرح اسلام اور جدید سائنس کے درمیان تصادم اور مغایرت کو ختم کر کے جدید علوم کو Islamize کر لیا جائے۔ وہ اپنی اس دُھن اور لگن میں اس حد تک غلو کا شکار ہو گئے تھے کہ اُن کے نزدیک سائنس میں خطا اور غلطی کا امکان ہی نہیں ہے، بھلے وحی کے ذریعے حاصل شدہ علم اُسے صراحتاً غلط گردان رہا ہو۔

ادھوری تعلیم، ماڈی اور سائنسی علوم کے سامنے سرنگوں ہونے، رائے زنی کے معاملے میں عجلت اور اُس پر ڈٹ جانے کی عادت اور مابعد الطبعی شعور کے فقدان، خاص طور پر انگلستان کے سفر اور وہاں سترہ ماہ کے قیام نے اُن کے قلب و ذہن کو ایک الگ راہ پر گامزن کر دیا تھا۔ اُن کی آنکھوں کو مغرب کی ظاہری چمک دمک، جدید علوم اور صنعتی ترقی کے شباب نے خیرہ کر دیا تھا۔ مغربی تہذیب و افکار کی برتری سید صاحب کے دل و دماغ پر چھا گئی اور اعصاب پر سوار ہو گئی تھی، جس نے انھیں یورپیوں کے کمزور پہلوؤں اور تاریک رُخوں پر نظر کرنے کا موقع ہی فراہم نہیں کیا۔ انگلستان سے واپسی پر انھوں نے جو کچھ فرمایا اُس سے اُن کی ذہنی کیفیت کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مغربی محبت کا نشہ دو آتشہ آتشہ ہو گیا تھا، لکھتے ہیں:

”تمام خوبیاں دینی اور دنیوی جو انسان میں ہونی چاہئیں وہ خداوند تعالیٰ نے یورپ کو بالخصوص انگلینڈ کو مرحمت فرمائی ہیں۔“

ان تمام خوبیوں اور کمالات پر مستزاد ”حقیقی اسلام“ پیش کرنے کی دھن اور تفسیر لکھنے کی تحریک نے معاملہ بگاڑ دیا۔

سر سید: حقیقت تک رسائی کے ذرائع: سائنس سے کلیۃً ناواقفیت:

سر سید کے نزدیک حقیقت تک رسائی کے چند ذریعے تھے:

سائنس، جس کے بارے میں اُن کا کہنا ہے:

”پس نیچرل سائنس کی ترقی اور تحقیقات اور دلائل یقینہ سے جو امور ثابت ہوئے وہ سب

اولیات میں داخل ہیں کیوں کہ وہ سب مشاہدہ بالکسریر یا مشاہدہ بالآلات پر مبنی ہیں۔“

۱- مسافرانِ لندن [مرتب: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی]، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۸۵۔



سر سید: مشاہدہ تجربی عمل کا نتیجہ: سائنس سے ناواقفیت کا ثبوت:

[۲] مشاہدہ، جو سائنسی طریقہ کار ہے، کے متعلق لکھتے ہیں:

”اب ہم کو اس بات پر غور کرنا باقی ہے کہ جس چیز کا ہم نے مشاہدہ کیا ہے اور جس کو ہم نے دلیل قطعی یعنی مشاہدے سے واقعی بیان کیا ہے، قرآن مجید یا وہ احادیث صحیحہ جو بہ درجہ یقین یا قریب بہ درجہ یقین یا قریب بہ ظن غالب پہنچی ہیں اور کوئی نقص یا کوئی وجہ ان کے انکار کی بھی نہیں ہے، وہ تو اس کے مخالف ہیں کیوں کہ وہ اگر اس کی مخالف ہوں تو دو کاموں میں سے ایک ضرور کرنا پڑے گا، یا اس مشاہدے کو غلط ماننا پڑے گا یا، نعوذ باللہ، اسلام کو غلط ماننا پڑے گا“۔<sup>۱</sup>

سید صاحب نے عملاً اسلام کو غلط تسلیم کرنا گوارا کیا، لیکن مشاہدے کو غلط کہنے پر راضی نہ ہوئے، اسی لیے انہوں نے جنات و ملائکہ کے وجود، حضرت مسیح علیہ السلام کی بدوں والد پیدائش، معجزات انبیاء، معراج جسمانی، سات آسمانوں اور زمینوں، غرض ہر ایسی دینی حقیقت کا جس کا اثبات بہ ذریعہ نقل ہوتا ہو اور وہ مشاہدے میں نہ آتی ہو یا انیسویں صدی کی سائنس کے لیے ناقابل قبول ہو، نہ صرف انکار، بلکہ استہزا و تمسخر کیا، چنانچہ روز قیامت آسمان کے پھٹنے کا انکار کرتے ہوئے فرشتوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

”جب اڈا ہی نہ رہے گا تو بیٹھیں گے کا ہے پر“۔

سر سید نے ”مشاہدے“ کی بانسری تو خوب بجائی اور اسے اپنی تحقیقات کا آخری اور حتمی درجہ

قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”علوم جدیدہ کے دلائل صرف قیاسی اور فرضی ہی نہیں رہے بلکہ تجربے اور عمل نے ان کو

درجہ مشاہدہ تک پہنچا دیا ہے“۔<sup>۲</sup>

حالاں کہ Scientific Method میں مشاہدہ کسی بھی تجربی عمل کا پہلا قدم ہے، مشاہدے کی سائنسی حقیقت سے ناواقفیت کے باعث سر سید اسے تجربے اور عمل کا نتیجہ اور حاصل قرار دے رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہر مشاہدہ کسی نظریے کا رہین ہوتا ہے۔ لہذا کسی بھی تجربی عمل میں اولیت نظریے یا مفروضے کو ہوتی ہے، جس کی بنیاد پر مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

فطرت: حقیقت تک رسائی کا معیار: جسے مغرب نے مسترد کر دیا:

سر سید کے نزدیک حقیقت تک رسائی کا تیسرا ذریعہ اور معیار ”فطرت“ ہے۔ فطرت کے

میکانکی تصور کو جسے انہوں نے اٹھارویں صدی کی مغربی فکر سے مستعار لیا تھا، اور اسے قرآن نہیں بلکہ

۱- سید احمد خان، مقالات سر سید [مرتب، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی]، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۱ء۔

۲- ایضاً، جلد ۲، صفحہ ۱۹۹۔

مراداتِ خداوندی تک رسائی کا سب سے راست اور محکم ذریعہ قرار دیا۔ جسے خود انیسویں صدی کی سائنسی ترقی نے درہم برہم کر دیا۔ سر سید نے فطرت کو ایک اٹل اور محکم حقیقت بلکہ سچائی کا معیار قرار دے دیا۔ فرمایا: ”جب ہمارے پاس نیچر سچائی کا معیار ہے تو ہم نیچری ہونا کیوں نہ گوارا کریں“۔<sup>۱</sup>

سر سید نظامِ فطرت میں کسی خارجی مداخلت کے قائل نہ تھے، یعنی خدا تعالیٰ بھی اُسے، نعوذ باللہ، تبدیل نہیں کر سکتے۔ اسی لیے ان کے ہاں دعا وغیرہ کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ جزا و سزا کا انحصار مرضی رب پر نہیں بلکہ فطرت پر ہے۔ وہ اسلام اور فطرت میں مکمل یگانگت اور ہم آہنگی کے قائل تھے، اور صاف کہتے تھے کہ: الاسلام هو الفطرة والفطرة هو الاسلام.<sup>۲</sup>

سر سید: لفظ فطرت اور اس کی حقیقت سے قطعی ناواقف:

سر سید چوں کہ انگریزی زبان و ادب پر عبور نہیں رکھتے تھے، اس لیے انہوں نے فطرت کا انگریزی ترجمہ Nature سے کیا اور اس غلط بات پر ڈٹ کر کہا: ”نیچر Nature ایک انگریزی لفظ ہے اور وہ ٹھیک ٹھیک مرادف ہے لفظ ”فطرة اللہ“ اور قانونِ قدرت کے“۔<sup>۳</sup>

سر سید نے قرآن پاک کی ایک آیت مبارکہ میں مذکور لفظ ”فطرت“ سے اپنا مزعومہ مفہوم کشید کیا۔ فطرت کا روایتی اسلامی مفہوم اور تصوّر اُن کی نگاہ میں قابلِ التفات نہ تھا۔ مغرب کی انیسویں صدی کے میکانیکی تصوّرِ فطرت کی پوری حقیقت سے واقف ہوئے بغیر انہوں نے اُسے نہ صرف قبول فرمایا بلکہ اُسے اپنی فکر و نظر کا بنیادی استعارہ قرار دیتے ہوئے پوری کوشش فرمائی کہ کسی طرح اسے Islamize کر لیا جائے۔ تطویل سے بچتے ہوئے سطورِ ذیل میں فطرت کا اسلامی مفہوم اور مغرب کا فطرت سے متعلق ابتدائی و ارتقائی موقف بیان کیا جا رہا ہے جس سے یہ بات کھل جائے گی کہ سر سید، اخلاص کے باوصف، فطرت کے روایتی و غیر روایتی کسی مفہوم سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ اسی لیے مرحوم محمد حسن عسکری [م ۱۳۹۸ھ] لکھتے ہیں:

”سر سید اور دوسرے نیچری یہ بھی نہیں جانتے کہ لفظ ”نیچر“ انگریزی میں کتنے معنی رکھتا ہے۔“<sup>۴</sup>  
خود سر سید کے عزیز ترین رفیق نواب محسن الملک لکھتے ہیں:

”یہاں تک کہ سید صاحب قبلہ نے بھی جن کی زبان پر ہر وقت نیچر مبارک کا لفظ رہتا ہے، اور جن کے قلم سے ہر دم نیچر نکلتا رہتا ہے اور جن کی تفسیر کا مدار نیچر پر ہے، اس لفظ کی حد بتائی نہ تعریف۔“<sup>۵</sup>

۱- سید احمد خان، مقالاتِ سر سید، جلد ۵، صفحہ ۱۵۳۔

۲- سید احمد خان، سفر نامہ پنجاب [مرتب: سید اقبال علی] علی گڑھ: انٹرنیٹ ٹیوٹ، ۱۸۸۲ء، صفحہ ۱۹۸۔

۳- سید احمد خاں، تہذیب الاخلاق [مرتب: منشی فضل دین] لاہور: مصطفائی پریس، ۱۸۹۵ء، جلد ۲ صفحہ ۳۲۸۔

۴- سید حسن عسکری، مجموعہ حسن عسکری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱۱۹۔

۵- نواب محسن الملک، مکاتبات الخللان فی اصول التفسیر و علوم القرآن [مرتب: محمد عثمان مقبول] علی گڑھ: مطبع احمدی، ۱۹۱۵ء، صفحہ ۱۶۔

فطرت: روایتی اسلامی مفہوم:

اسلامی روایت میں فطرت، قبولیتِ حق کی اُس خلقی استعداد کا نام ہے کہ اگر انسان کے قلب و ذہن پر خارجی عوامل اثر انداز ہو کر اُسے مسخ نہ کر چکے ہوں تو اُسے حق، یعنی انبیا و مرسلین کی تعلیمات، کے قبول کرنے میں ذرا بھی تاثر نہ ہو۔ بالفاظِ دیگر فطرت انسان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت شدہ وہ صلاحیت ہے جس کی بنا پر وہ عہدِ الست کو یاد کرنے، سمجھنے اور اُس کے مطابق اپنی زندگی کا رُخ متعین کرنے کی کوشش زندگی کے کسی موڑ پر بھی چاہے تو کر سکتا ہے، جس کی بنیادی شرط ارادہ و عزم اور طلبِ صادق ہے۔ یہ فطرت حیوانی جبلت کی طرح نہیں جس سے انحراف ممکن نہ ہو بلکہ اس کی قبولیت کی صلاحیت و استعداد اور انحراف کا اختیار خلقِ انسان کے پاس موجود ہے۔ اس استعداد، صلاحیت اور اختیار کے باعث ہی انسان پر خیر و شر، نیکی و بدی اور حق و ناحق کی قبولیت اور اُس کے انتخاب و ارتکاب کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اُس سے مسئولیت و جواب دہی کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان اس خلقی استعداد سے محروم رہ جائے تو باز پرس اور جزا و سزا کا سارا تصور ہی مہمل اور بے معنی ٹھہرے گا۔ فطرت کی اس ہدایت کے باوجود دنیا میں انسان کو کسی بھی مثبت یا منفی طرزِ عمل کو اپنانے کا اختیار دے دیا جاتا ہے، قرآن اعلان کرتا ہے: **إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا** [۳: ۷۶] ”ہم نے اس کو راہِ سمجھادی۔ چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔“

فطرت: استفادے کی اہلیت و لیاقت: بنیادی شرائط:

البتہ اس استعداد کا قوت سے فعل میں آنا چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ اہم شرائط یہ ہیں:

[۱] طلبِ حق کی فطری خواہش زندہ ہو اور طالبِ حق بن کر حق کی جستجو کی جائے۔ یعنی وہ پانچ بنیادی سوالات جو ہر ذہن میں اٹھتے ہیں جن کے لیے کسی تعلیم اور مکتب کی ضرورت نہیں ہے کہ: میں کون ہوں؟ یہ کائنات کیا ہے؟ میں کہاں سے آیا ہوں؟ مجھے کس نے بنایا ہے؟ اور مرنے کے بعد میں کہاں جاؤں گا؟ یہ فطری سوالات ایک تنگ و تاریک گھروندے میں رہنے والے سے لے کر تمدنِ بستیوں میں زندگی بسر کرنے والوں کے دلوں میں یکساں قوت کے ساتھ اٹھتے ہیں اور تلاشِ حق کے سفر کا عنوان بن جاتے ہیں۔

[۲] قوتِ مشاہدہ اور اُس کا درست استعمال تاکہ انفس و آفاق میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں نظر آئیں۔

[۳] صحیح الفکر ہونا — تاکہ غور و تدبیر کے بعد عہدِ الست تک رسائی ممکن ہو۔ یہ عہد یاد آتے ہی فطرتِ سلیم اور فکرِ صحیح زندگی کو نور سے بھر دیتے ہیں۔ یعنی دل اور ذہن تعصبات سے ماورا ہو ورنہ مشرکین مکہ کی طرح سب کچھ جان بوجھ کر بھی آدمی حق کو دانستہ جھٹلا دیتا ہے۔ ابو جہل کے بارے میں آتا ہے کہ غلافِ کعبہ سے لپٹ کر، چھپ کر قرآن کی آیات سُنتا تھا، اُس کا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ کلام اللہ ہے۔ مشرکین مکہ اور اہل کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و عظمت کے قائل تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ قرآن مجید کتاب اللہ ہے، وہ آپ کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے: **الَّذِينَ اتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ** [۱۲۶: ۲] ”جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ

تو اُسے ایسا پہچانتے ہیں، جیسے کوئی اپنے بچوں کو پہچانے۔ لیکن قوم پرستی، تعصب، تکبر، ضد، حسد، نفرت، ہٹ دھرمی، بڑائی اور انا نیت قبول حق کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ ابو جہل اور مشرکین مکہ کو یہ دکھ تھا کہ یہ کلام مکہ کے دو بڑے آدمیوں پر کیوں نازل نہ ہوا۔ اہل کتاب کو غم یہ تھا کہ یہ کتاب ہماری قوم کے بجائے بنی اسمعیل کے ایک فرد پر کیوں نازل کی گئی؟ اہل کتاب قرآن اور پیغمبر کو ”الحق“ سمجھتے تھے لیکن انہوں نے کتاب کو پہچاننے اور اطمینان قلب کے باوجود اُس کا انکار کر دیا کہ یہ کتاب ہماری قوم کے کسی فرد پر کیوں نازل نہ ہوئی۔ پیغمبر ہماری ملت میں کیوں نہیں معبود ہوا۔ [۸۹:۲] اہل کتاب نے فخر یہ کہا کہ: قَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ [۸۸:۲] ”ہمارے دل تو بند ہیں“۔ مشرکین اور اہل کتاب کا مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ سنتے، سمجھتے اور جانتے ہی نہ تھے، اُن کا قلب بھی مطمئن تھا کہ قرآن مجید کلام اللہ ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور فرستادہ ہیں۔ لیکن انہوں نے جانتے بوجھتے ہوئے اطمینان قلب کے باوجود ماننے سے انکار کر دیا۔ اُن کا یہ رویہ صرف رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی اپنے انبیاء کے ساتھ یہی کرتے رہے، قرآن نے اُن کے نفس کی خباثت اور ذہانت کو نہایت بلند انداز میں بیان کیا ہے: قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا [۹۳:۲] ”ہم نے سنا اور نافرمانی کی“ اُن کا سُننا نہ سُننا برابر ہے۔ خواہ وہ سُننے بغیر رد کر دیں یا سُن کر نافرمانی کریں۔ اس لیے قرآن وضاحت کرتا ہے: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ، إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ [۲۱:۸-۲۲] ”اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ سنتے نہیں، یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے، گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے“۔ ظاہر ہے مشرکین و کفار نہ بہرے تھے نہ گونگے، نہ عقل سے محروم، بلکہ وہ جانتے بوجھتے حق کا انکار کر رہے تھے۔ قرآن یہ بھی بتاتا ہے مشرکین و اہل کتاب کے مقابلے میں سلیم الطبع اور صحیح الفکر فرد کا رویہ بالکل مختلف ہوتا ہے، وہ کہتا ہے: سَمِعْنَا وَ اطَعْنَا۔ ”ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی“۔ قلبی اقرار کے باوجود اگر اطاعت اور عمل پر دل آمادہ نہ ہو تو یہ نتیجہ ہوتا ہے خواہش نفس کے الہ بن جانے کا، جو دنیا کی دل فریبیوں سے رشتہ توڑنے میں مزاحم ہو جاتی ہے۔ کان، آنکھ اور دماغ سے لے کر قلب تک اگر چہ بہت کم فاصلہ ہے جو حق ان مقامات سے گزر کر واضح ہو جاتا ہے اور توفیق ایمان پھر بھی نصیب نہیں ہوتی تو اُس کی ایک نہایت اہم وجہ اپنی گناہ گار زندگی پر استکبار کی حد تک اصرار ہوتا ہے۔ کتاب اللہ میں واضح کر دیا گیا ہے: بَلَى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ، وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ [۸۱:۲-۸۲] ”یقیناً جس نے بھی بُرے کام کیے، اور اُس کی نافرمانیوں نے اُسے گھیر لیا، وہ ہمیشہ کے لیے جہنمی ہے اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں وہ جنتی ہیں، جو جنت میں ہمیشہ رہیں گے“۔

یعنی بدی کمانا اور اس طرح کمانا کہ وہ پوری زندگی کا احاطہ کر لے، ایسے شخص کا ٹھکانہ جہنم کے سوا کیا ہو؟ اس کے مقابلے میں اہل ایمان کی صفت یہ ہے کہ وہ ہر حال میں نیک عمل کرتے ہیں اور کبھی جب

اُن سے اتفاقاً دانستہ طور پر خطا، گناہ، اثم، سرزد ہو جاتا ہے تو وہ اس گناہ گار زندگی پر ایک لمحے کے لیے بھی اصرار نہیں کرتے، بلکہ انھیں معاذ خدا یاد آ جاتا ہے وہ اُس کی بارگاہ میں استغفار، آنسو اور ندامت کا نذرانہ لے کر حاضر ہو جاتے ہیں: **وَ الدِّينَ اِذَا فَعَلُوا فَا حِشَّةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاَسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَ مَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَ لَمْ يَصِرُوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ** [۱۳۵:۳]

عہد الست یعنی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ انسان دین اسلام قبول کرے، فطرت کے اس تقاضے کی راہ میں اگر ایک اہم رکاوٹ ایک جانب اُس فرد کا حق کی طلب کے ساتھ ساتھ گناہوں پر اصرار ہو سکتا ہے تو دوسری جانب اُمتِ وسط کی بد اعمالیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ جب قرآن کی حامل اُمت اپنے کردار سے غیر مسلموں کے فطرت پر لوٹ جانے میں رکاوٹ بن جائے تو ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اُن کے کردار کے باعث اسلام قبول نہیں کرتے۔ سورۃ ممتحنہ میں اس خطرے سے پناہ مانگی گئی ہے: **رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا** [۵:۶۰]

”اے ہمارے رب ہمیں کافروں کے لیے فتنہ نہ بنا دے“۔ اس صورت میں کفار کی گمراہی کا سبب ہماری بد کرداری ہوگی۔ اس لیے قرآن میں آتا ہے کہ روزِ حشر آپ فریاد کریں گے: **وَقَالَ الرَّسُوْلُ يَرْبِ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا** [۳۰:۲۵] ”اے میرے رب میری قوم نے اس قرآن کو بھلا دیا تھا“۔

[۳] سلیم الطبع اور حق پسند ہونا — یعنی خواہشِ نفسِ کل زندگی کا احاطہ نہ کرے۔ تمنا میں خدائی کے درجے پر فائز نہ ہوں۔ خواہشِ نفسِ کالہ بن جانا شرک کی بدترین شکل ہے۔ جو شخص العلم اور الکتاب کی دولت سے بہرہ یاب ہونے کے باوجود خواہشِ نفس کی غلامی اختیار کرے تو اس کا ٹھکانہ بھی جہنم ہوتا ہے۔ سورۃ کہف میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ اگر خواہشاتِ نفسانی کی غلامی عادتِ اولیٰ یا فطرتِ اولیٰ کے درجے پر فائز نہ ہو یعنی گناہ گار زندگی عزیز و محبوب نہ ہو، معصیت پر رضا مندی نہ ہو تو ہدایت نصیب ہو جاتی ہے لیکن گناہ گار زندگی پر اصرار قبولیتِ حق کی راہ میں حجابِ اکبر ہے۔

[۵] اپنی موجودہ زندگی، نفس کی حالت پر اطمینان قلب میسر نہ ہو — اپنی ذات ہر لمحہ قابلِ اصلاح محسوس ہو اور خیر کی جستجو تڑپ بن جائے۔

[۶] وجدانی قوت کا بیدار ہونا — تاکہ حق شناسی اور معرفتِ خداوندی کے لیے عقلِ استدلالی کا زیادہ مرہونِ منت نہ ہونا پڑے، اور قیاس و استدلال کے جھیلے میں پڑے بغیر اپنے مذہبی وجدان سے جس کا مافوق العقل [Supra-rational] ہونا ضروری ہے، حق کی معرفت حاصل کر سکے۔

**فطرت: وحی کی روشنی میں روحانی و عقلی صلاحیت:**

یہ سمجھنا کہ صرف فطرت، عقل اور وجدان کی صلاحیتوں کے ذریعے کوئی شخص اس کائنات میں جاری و ساری وحدت کو پہچاننے سے عاری نہیں رہ سکتا محض مفروضہ ہے۔ اس تفہیم کی بیان کردہ مندرجہ بالا شرائط میں سے صرف فطرت، عقل اور وجدان کو ماخذِ علم سمجھنا محض واہمہ ہے۔

۱- اس سلسلے میں بنیادی استفادے کے لیے ملاحظہ کیجیے:

سید ابوالاعلیٰ مودودی، تمہیمات، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، حصہ اول، صفحات ۱۹۲-۱۹۷۔

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۲۷۱

فطرت کا یہ تصور اپنی اصل میں سراسر روحانی و عقلی ہے نہ کہ مادی و طبعی، جو روح، عقل اور نفس کے متوازن ربط و تعلق سے وجود میں آتا ہے۔ اور اس کا اظہار اسلامی تہذیب کے کونیاتی علوم [Cosmological Epistemology] میں ایک ایسے نظام ہائے تصور رات کی شکل میں ہوتا ہے کہ جس کی پشت پر ایک طرف وحی کا نور ہوتا ہے اور دوسری طرف یہی نظام ان اصولوں کے عالم امکان و اسباب میں اطلاق و انطباق کا ضامن و ذریعہ بھی ہے۔

فطرت کی اتباع فی الحقیقت اسلام ہی کی پیروی ہے:

کتاب اللہ میں ”فطرت“ کا لفظ صرف ایک مرتبہ استعمال ہوا ہے:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَ لَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ. [۳۰:۳۰]

”سو تم ایک سو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف رکھو، اللہ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو، جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور اللہ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے بدلنا نہیں چاہیے، بس سیدھا دین یہی ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“

اسی فطرت کی ہدایت اور قبولیت کا نام ”اسلام“ ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ تم اپنا رخ اس ”دین“ کی طرف رکھو جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی تخلیق فرمائی ہے اور دین نگاہ خداوندی میں فقط ”اسلام“ ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ [۱۹:۳]

دین تو اللہ کے نزدیک اسلام [۱۹:۳] ہے۔

اور حدیث نبوی میں ہے:

ما من مولود إلا يولد إلا يولد على الفطرة، فأبواه يهودانه أو ينصرانه أو يمجسانه.

منقولہ بالا آیت اور احادیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ فطرت کے معنی فقط اور فقط اسلام کے ہیں، اور اسلام سے مراد وہ دین ہے جس پر تمام انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث و مامور تھے، اور اسی کی آخری اور حتمی شکل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اسی اسلام کے اتباع کا حکم دیا ہے اور اسے تبدیل کرنے سے منع فرمایا ہے۔

فطرت کی عدم اتباع فطری استعداد کے غیر موجود ہونے کی دلیل نہیں:

اگر خارجی عوامل و عوارض کے باعث کوئی شخص اسلام قبول کرنے سے مانع رہتا ہے تو اس سے اس کی خلقی استعداد و صلاحیت پر کوئی فرق اور اثر نہیں پڑتا وہ اپنی جگہ باقی رہتی ہے مگر مستور اور مخفی ہو جاتی ہے۔ یہ اسلامی روایت و تہذیب میں فطرت کا قرآن و حدیث سے ثابت شدہ متواتر و مسلسل مفہوم ہے

۱- محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب قوله لا تبدل لخلق الله، جلد ۲، صفحہ ۷۰۷۔

جس کا سر سید احمد خان کے مغربی نظریے سے مستعار تصورِ فطرت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ جس تصورِ فطرت کو مسلمانوں میں رائج کرنے کے خواہاں تھے، جسے حقیقت و حقانیت کا معیار گردانتے، قرآن و سنت اور دینی مابعد الطبیعیاتی حقائق کے رد و قبول کا معیار جس تصورِ فطرت پر رکھتے تھے وہ مغرب میں اٹھارویں ۱۸ صدی میں قائم ہوا، انیسویں ۱۹ صدی میں مشہور ہوا اور بیسویں ۲۰ صدی میں خود مغرب نے سر سید کی اس آخری حقیقت کی سچائی کا بت پاش پاش کر دیا۔ مذاہب کے جس مشترک تصورِ فطرت کو سر سید رد اور ترک کرنا چاہتے تھے، وہ دنیا کی تمام روایتی تہذیبوں اور سولہویں صدی تک مغرب میں پورے آب و تاب کے ساتھ رائج رہا، اور اسلامی فکر و تہذیب میں آج بھی ہے۔

فطرت کی اساس: مابعد الطبیعی علمیات:

فطرت کا تصور دنیا کی تمام روایتی تہذیبوں میں اپنے اپنے منہاج علم کے مطابق پایا جاتا ہے۔ اس منہاج کا مدار و انحصار اس بنیادی خیال اور مرکزی نقطے پر ہوتا ہے جس کی تشکیل و تعیین اُس تہذیب کی وحی [revelation] اور مابعد الطبیعی علمیات [Metaphysical Epistemology] کرتی ہے۔

روایتی تصورِ فطرت: ربانی مداخلت کے زیر اثر ہمہ وقتی معجزہ:

دنیا کی تمام روایتی تہذیبوں میں، جن کی بنیاد مابعد الطبیعی حقائق اور وحی پر قائم ہیں، تصورِ فطرت کے حوالے سے باوجود اسالیب بیان اور پیرایہ نگارش کے تفاوت و اختلاف کے ایک اساسی مماثلت و وحدت اور اشتراک پایا جاتا ہے کہ: فطرت ایک ہمہ وقتی اور دوامی معجزے کا نام ہے جس کے زیر اثر اس مرتب و منظم کائنات کا ذرہ ذرہ ایک مقررہ قانون کا پابند، لیکن ربانی قدرت و مداخلت کے تابع اور اپنی بقا و تجدید میں کلیہً اسی پر منحصر ہے۔

فطرت خود مختار ہے اور نہ اُس کا وجود بالذات، بلکہ حقیقتِ عظمیٰ سے مستعار اور بالعرض ہے۔ اگر حقیقتِ عظمیٰ اور ہستی مطلق کی قائمیت اُس سے نظر التفات ہٹا لے تو یہ یک لخت فنا اور معدوم ہو جائے۔ حقیقتِ عظمیٰ مادی کائنات سے ماورا و منزہ اگر مربوط و متعلق ہے۔

ازمنہ و سطلیٰ تک مغرب کی عیسوی تہذیب بھی کم و بیش اسی تصورِ فطرت کی حامل تھی جو کہ وحی کی حامل کوئی تہذیب ہو سکتی ہے۔ اُس عہد کا فلسفہ اور سائنس تک دین سے آزاد نہیں تھا۔ بیش تر مفکرین، سائنس داں اور فلسفی راہب اور پادری تھے۔ اس صورتِ حال میں فطرت کی بالذات قائمیت و بقا اور خود مختاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

فطرت کے میکائیکل نظریے کی تشکیل: مابعد الطبیعی تبدیلی: مغرب:

تحریک اصلاح [Reformation] اور نشاۃ ثانیہ [Renaissance] جو دراصل لادینیت اور دنیا پرستی کی بنیاد ہیں، اور جنہوں نے عیسائیت کے مذہبی جوہر کو منہا کر کے یونانی اندازِ تعقل کو نئے بال و پر عطا کیے۔ ان تحریک کی ابتدا تک بھی فطرت کا تصور اپنے مفہوم و معنی میں تدریجی تبدیلی

کے ساتھ کسی نہ کسی حیثیت سے وجود رہا۔ تاکہ انسانیت پرستی [Humanism] کی تحریک شروع ہوئی جس کی بدولت توجہ و التفات کا مرکز اور حقیقت کا انحصار صرف انسان پر رہ گیا کہ علم اشیا کا محور انسان ہے اور مابعد الطبعی حقائق پر ایمان انسانی خود مختاری کا سودا ہے۔ اب کلیسائی علوم و فنون کو انسان کی کامرانی اور ترقی کی راہ کا کانسجا سمجھا گیا، مابعد الطبعی علوم سے بیزاری پیدا ہونے لگی اور یونانی علوم کو اصل حقیقت قرار دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں دین و دنیا کی جدائی کا امکان پیدا ہوا اور مابعد الطبعیات ختم ہو کر صرف طبعیات باقی رہ گئی، Scientific Method اور Nominalism کے باعث فطرت کے نئے نئے مفاہیم پیدا ہونے شروع ہوئے اور کسی ربانی مداخلت کے بغیر فطرت کی خود مختاری اور بالذات قائمیت کا نظریہ پروان چڑھا۔ بالفاظ دیگر فطرت کا میکانیکی تصور قائم ہوا۔ جس کے مطابق: فطرت ایک مشین ہے اور اشیا اس کے پرزے۔ مشین چند مقررہ اصولوں اور طے شدہ گلیوں کے مطابق خود بہ خود چلتی ہے جسے کسی محرک کی ضرورت نہیں بلکہ مادہ خود اپنے اندر حرکت پیدا کرتا ہے۔ اس میں کوئی روحانیت نہیں، تمام اشیا کی حقیقت بہ شمول انسان چند خود کار عمل و رد عمل میں پنہاں ہے۔ اسی لیے Naturlism کہتے ہیں:

The system of thought holding that all phenomena can be explained in the terms of natural causes and laws, without attributing moral, spiritual or supernatural significance of them.<sup>1</sup>

ڈیکارٹ اگرچہ فطرت پسند نہیں تھا، لیکن اس کا مشہور جملہ ہے:

Give me matter and motion and I will construct the universe.<sup>2</sup>

”تم مجھے عناصر ترکیبی اور حرکت دے دو، میں تمہیں کائنات تخلیق کر دوں گا۔“

اُس کا گمان تھا کہ بستر پر پڑے، پڑے تمام کائنات کا نقشہ یا خاکہ بنایا جاسکتا ہے۔<sup>3</sup>

نیوٹن کے زیر اثر میکانیکی کائنات کا تصور رائج ہوا، طبعیات نے بالخصوص کائنات کو ایک ایسی مشین تصور کیا، جو مخصوص اور مستقل قوانین کے تحت کام کرتی ہے۔ یہ قوانین نہ صرف قائم بالذات اور خود مختار ہیں بلکہ کسی بھی قسم کی روحانی تنظیم سے بھی عاری ہیں:

With Newton the Universe acquired an independent

- 1- The American Heritage Dictionary of the English Language.
- 2- John Daintith & Derek Gjertsen, [eds.], A Dictionary of Scientists, New York: Oxford University Press, 1999, p. 136.
- 3- J. Bronowski and Bruce Mezlish, The Western Intellectual Tradition, Great Britain: Penguin Books, 1963, pp.264-66.



rationality quite unrelated to the spiritual order or to anything outside itself.<sup>1</sup>

انجیل کی سند فطرت پر معیار اور حکم نہیں: مغرب:

پھر اس تصور کو مزید ترقی ہوئی اُس نے جسارت پیدا کی کہ خدا کی دو کتابیں ہیں:

[۱] انجیل

[۲] فطرت

اس پر مزید اضافہ یہ ہوا کہ انجیل کا مطالعہ بھی فطرت کی روشنی میں کرنا چاہیے۔ دور بین کے موجد گئی لیونے کرٹینا آف ٹیسکنی کو لکھا:

Met thinks that in the discussion of natural problems, we ought not to begin at the authority of places of scripture, but at sensible experiments and necessary demonstrations. For, from the Divine Word, the sacred scripture and nature did both alike proceed ..... Nature, being inexorable and immutable, and never passing the bounds of the laws assigned her, ..... I conceive that, concerning natural effects, that which either sensible experience sets before our eyes, or necessary demonstrations do prove unto us, ought not, upon any account, to be called into question, much less condemned upon the testimony of texts of scripture, which may, under their words, couch senses seemingly contrary thereto ..... Nor does God less admirably discover himself to us in Nature's actions, than in the Scripture's sacred dictions.<sup>2</sup>

”میں سوچتا ہوں کہ فطرت کے مسائل پر کوئی بھی بحث ہو تو ہمیں یہ نہیں چاہیے کہ کتاب مقدس کی سند پیش کریں، بلکہ ہمیں چاہیے کہ ہماری بحث کا انحصار تجربے اور مشاہدے پر ہو، اس لیے کہ مقدس کتابوں اور فطرت دونوں کا سرچشمہ کلمہ ربانی ہے، فطرت غیر متغیر اور اٹل ہے اور اپنے قوانین سے تجاوز نہیں کرتی، میرا خیال ہے کہ فطری نتائج کے بارے میں جنہیں ہمارے حواس محسوس کرتے ہیں کبھی کوئی شک یا شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ فطری

1- Charles Singer, *A Short History of Science to the Nineteenth Century*, Oxford: Clarendon Press, 1941, p. 252.

2- Edwin Arthur Burt, *The Metaphysical Foundations of Modern Science*, New York: Dover Publication, Inc., 2003, p. 83.

کتابوں کو کبھی بھی الہامی کتابوں کی سند سے رو نہیں کرنا چاہیے، خدا الہامی کتابوں کی نسبت فطرت کے عوائل سے کوئی کم ظاہر نہیں ہوتا۔“

فطرت کا نامیاتی تصور: مغرب کا اگلا قدم:

سر سید کا عقیدہ تھا کہ فطرت کے قوانین اور ضابطے اس قدر محکم، مضبوط اور اٹل ہیں کہ خود خالق فطرت بھی انہیں تبدیل نہیں کر سکتا، حالاں کہ اس مشینی تصور فطرت کو بیسویں صدی کی سائنسی دریافتوں نے درہم برہم کر دیا، سر سید اس سے بالکل لاعلم اور بے خبر تھے۔ اب فطرت کے میکانیکی تصور کی جگہ نامیاتی تصور سامنے آیا جس کے مطابق فطرت ایک جاندار ہستی ہے بیسویں صدی کی شاعری میں اس تصور فطرت کے نمونے اور محامد و مناقب بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔ گویا انیسویں صدی کے جس میکانیکی تصور پر سر سید ایمان لائے اُسے بیسویں صدی میں خود مغرب ہی کے نامیاتی تصور فطرت نے نابود کر دیا:

By the beginning of the 19th century a reaction against the natural law theories had developed for many reasons. First, and chief among them, was the critical spirit of a new scientific age that looked askance at unproved hypotheses. The social contract, in particular, was said to be palpably false, historically untrue. Second, it was asserted that deductive reasoning from a priori assumptions was incapable of yielding solutions to the problems of complex societies. Third, pure reason had been a slogan of the French Revolution with all its attendant excesses, and the reaction against the Revolution caused a reaction against using reason as the exclusive guide to social reform. Fourth, there was a growing conviction that improvement of the law would be more fruitfully approached on a practical basis, and not by appealing to reason. It was thought needful, above all, to understand existing institutions by means of a through analysis of them in order to bring about their improvement.<sup>1</sup>

مادے کی الوہیت: فطرت کے میکانیکی اور نامیاتی تصورات کی اساس: مغرب:

فطرت کا خواہ میکانیکی تصور ہو یا نامیاتی، ان دونوں میں ایک چیز قدر مشترک ہے: مادہ — بالفاظ دیگر ان دونوں تصورات کا مرکزی نقطہ اور قبلہ مقصود ایک ہے۔ اس فطرت پرستی کا بدیہی

1- The New Encyclopædia Britannica, "Natural Law", Fifteenth Edition, 1983, Vol. 12, p. 865.

نتیجہ یہی نکلا کہ خدا کی ماورائے زمان و مکاں ابدیت و ثبات کو تو رد کر دیا گیا، لیکن یہی الوہی حق و اختیار ماڈے کے حق میں تسلیم کر کے اُسے نہ صرف قائم بالذات [Self-Existent] مانا گیا، بلکہ تنہا پرستش کے لائق قرار دیتے ہوئے خدا کا قائم مقام قرار دیا گیا۔ Barond' Holbach لکھتا ہے:

"O Nature! Sovereign of all beings! And you, her adorable daughters, virtue, reason and truth! Be ever our only Divinities." ۱

جدید مغرب: فطرت اب ایک داشتہ ہے: استعمال کرو اور پھینک دو: حسین نصر:

بیسویں صدی کی سائنس اور ٹیکنالوجی نے تو فطرت کی تقدیس اور اس کے زیر اثر تخلیقی اظہار کی معنویت ہی کو یک سر ختم کر دیا ہے۔ قبل از جدید معاشروں میں فطرت کی حیثیت ایک ایسے تخلیقی اظہار کی تھی جس کے پس پشت ایک شاعرانہ یا الہامی شعور کار فرما تھا۔ وہاں اشیا اور فطرت حسن، سچائی اور شان کو عیاں کرنے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ اس کا مقصد فطرت اور کائنات پر ارادہ انسانی کا تسلط نہیں تھا۔ فطرت کی بابت یہ وہ بنیادی مابعد الطبعی تبدیلی ہے جس کے تحت بیسویں صدی کی سائنس اپنے ساتھ ٹیکنالوجی کا ایک بالکل نیا تصور لائی ہے، جس کے مطابق فطرت اب کوئی مقدس شے نہیں بلکہ استعمال کرنے کی ایک چیز ہے اور بے کار ہو جانے کی صورت میں پھینک دینے کے لائق۔ حسین نصر کے الفاظ میں:

Nature has come to be regarded as something to be used and enjoyed to the fullest extent possible. Rather than being like a married woman from whom a man benefits but also towards whom he is responsible, for modern man nature has become like a prostitute — to be benefited from without any sense of obligation and responsibility toward her. The difficulty is that the condition of prostituted nature is becoming such as to make any further enjoyment of it impossible. And, in fact, that is why many have begun to worry about its condition. ۲

”فطرت اب ایک ایسی چیز بن کر رہ گئی ہے جس کا محض استعمال کیا جائے، اور بڑی سے بڑی حد تک فائدہ حاصل کیا جائے۔ ایک محصنہ [شادی شدہ] عورت ہونے کے بجائے کہ جس سے فائدہ اٹھاتے وقت انسان خود کو اس کے تئیں ذمے دار بھی سمجھتا ہے، جدید

1- Franklin Baumer, *Religion and the Rise of Scepticism*, New York: Harcourt, Brace & Company, 1960, p.64.

2- Seyyed Hossein Nasr, *Man and Nature: The Spiritual Crisis in Modern Man*, London: Unwin Paperbacks, 1990, p. 18.

انسان کے لیے فطرت ایک ”طوائف“ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے جس سے احسان مندی اور احساس ذمے داری کے بغیر فائدہ اٹھایا جاتا ہے مشکل یہ ہے کہ عصمت دریدہ فطرت اس حال کو پہنچ چکی ہے کہ مزید لطف اٹھانا محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت لوگ اس کی حالت پر فکر مند رہنے لگے ہیں۔“

سرسید: خدا کا اور چھٹا ہوا نیچری ہے: [نعوذ باللہ]

ان تمام حقائق سے لاعلم ہونے کے باوجود سرسید فطرت کی اتباع و تقلید کا نعرہ لگا رہے تھے۔ سرسید احمد خاں پر فطرت کی تقلید کی دھن ایسی سوار تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ تک کو ”نیچری“ کہنے سے نہیں چوکتے تھے۔ بعض اوقات انتہائی مہکلو پن اور ابتدالی انداز میں یوں گویا ہوتے:

”جو ہمارے خدا کا مذہب ہے وہی ہمارا مذہب ہے، خدا نہ ہندو ہے نہ عرفی مسلمان، نہ

مقلد، نہ لامذہب، نہ یہودی، نہ عیسائی، وہ پگا اور چھٹا ہوا نیچری ہے۔“

عقائد و عبادات کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں بلکہ نیچر کا مقتضی ہے:

”قدیم اصول یہ ہے کہ نیکی یا عبادت حور و تصور و بہشت کے ملنے اور دوزخ کے عذاب

سے بچنے کے لیے یا خدا کی رضا مندی کے لیے اور اس کی خفگی سے بچنے کے لیے کرنی

چاہیے، جدید اصول یہ ہے کہ ہمارے نیچر کا مقتضی یہی ہے کہ ہم کو نیک ہونا چاہیے۔“

سرسید کے نظریہ فطرت کی راہ میں بڑی رکاوٹیں:

سرسید جن اصول و نظریات کو قرآن مجید یا اسلام کے نام پر پیش کرنے کے خواہاں تھے، اُس

کی راہ میں چند بڑی رکاوٹیں تھیں:

تقلید: پہلی رکاوٹ:

امت کا سوادِ اعظم چار فقہی مکاتب فکر میں سے کسی ایک اسکول کی تقلید کا قائل تھا، لہذا تقلید کی

موجودگی میں اپنے مزعومہ افکار و نظریات کے فروغ میں کامیابی کا امکان نہ تھا۔ اس لیے سرسید نے سب

سے پہلے تقلید کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور آج اُن ہی کی تقلید میں ہر متحدہ و کا یہی نعرہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے، اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا، سچے اسلام کے

۱- سید احمد خاں، مقالات سرسید، جلد ۱۵، صفحہ ۱۲۷۔

۲- ایضاً، جلد ۳، صفحہ ۲۷۔

حق میں تقلید سیکھیا سے بھی زیادہ زہر قاتل ہے، بلاشبہ ہم نے علما کو مثل یہود و نصاریٰ ارباً من دون اللہ سمجھ لیا ہے۔<sup>۱</sup>

”بھیٹ اسلام کی رُو سے ہر ایک شخص کو آزادی ہے کہ خود قرآن مجید کے احکام پر غور کرے اور جو ہدایت اُس میں پائے اُس پر عمل کرے، کوئی شخص کسی دوسرے کی رائے اور اجتہاد اور سمجھ کا پابند نہیں.... ہر شخص آپ اپنے لیے مجتہد ہے۔“<sup>۲</sup>

مفسرین سلف کا تفسیری سرمایہ: دوسری رکاوٹ:

تقلید کی مخالفت کے بعد بھی سرسید کو اپنے مزمومہ مقصد میں کامیابی کا امکان نہ تھا، مفسرین سلف کی تفسیری کاوشیں اُس کی راہ میں سنگِ گراں تھیں، لہذا سرسید نے کھل کر تقاسیر و مفسرین سلف کی مخالفت کی اور کہا:

”صرف کتاب اللہ، یعنی قرآن مجید، ایسا تھا جو تمام آفات سے محفوظ تھا، مگر مفسرین نے اُس پر بھی رحم نہیں کیا۔“<sup>۳</sup>

”بعض نا سمجھ یہ بحث کرتے ہیں کہ جو تفسیر تم نے بیان کی ہے بدواً عرب، اور صحابہ و تابعین ان آیتوں کی یہی تفسیر سمجھتے تھے یا نہیں، مگر ایسی حجت کا پیش لانا اصل بات کو نہ سمجھنے کا باعث ہے۔“<sup>۴</sup>

”ترقی علوم خود اس امر کا تصفیہ کرنے والی تھی کہ قرآن مجید کا مقصد اس سے زیادہ اعلیٰ و افضل تھا اور ہرگز مصلحت نہ تھی کہ خدا ایسے باریک مسئلے کو اونٹوں کے چرانے والوں کے سامنے جن کے علم و تجربے نے کافی ترقی نہیں کی تھی بیان کر کے لوگوں کو پریشانی میں ڈالتا اور تعلیم اخلاق کو جو اصلی مقصد مذہب کا ہے، ایسے دقیق مسائل میں ڈال کر برباد کرتا۔“<sup>۵</sup>

احادیث و سنن: تیسری رکاوٹ:

مشکل اب بھی حل نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ سرسید کے تفسیری منہاج کی راہ میں ایک اور بڑی رکاوٹ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ عمل اور آپ کے اقوال و ارشادات تھے جو قرآن کے بعد تفسیر و تفہیم قرآنی کا سب سے محکم اور مستند ذریعہ ہیں، لہذا سرسید نے احادیث مبارکہ کے انکار کا طرز عمل اختیار فرمایا اور اعلان کیا:

- ۱- سید احمد خان، خطوط سرسید [مرتب: اس مسعود]، ہدایوں: نظامی پریس، ۱۹۲۲ء، صفحہ ۱۰۰۔
- ۲- سید احمد خاں، الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرة الاحمدیہ، لاہور: مسلم پرنٹنگ ورکس [س-ن]، صفحہ ۱۸۲۔
- ۳- سید احمد خاں، مقالات سرسید، جلد ۷، صفحہ ۳۱۹۔
- ۴- ایضاً، جلد ۴، صفحہ ۵۶۔
- ۵- سید احمد خان، آخری مضامین [مرتب: امام الدین گجراتی] لاہور: کوآپریٹو پرنٹنگ پریس، [س-ن]، صفحہ ۳۸۔

”تمام علمائے حدیث اس بات پر متفق ہیں کہ حدیثیں بالمعنی روایت کی گئی ہیں نہ باللفظ، اس لیے الفاظ حدیث اس خیر راوی کے متصور ہوتے ہیں جن سے اس نے روایت کی..... اس لیے اس بات میں حدیثوں اور سیر کی روایتوں سے بحث کرنا ہمارے نزدیک محض فضول اور بے فائدہ ہے۔“

ایک جگہ اور فرماتے ہیں:

”حدیثوں پر استدلال کرنے میں لازم ہے کہ علاوہ دیگر اصولِ صحیح حدیث درایتاً بھی اس پر نظر ڈالی جائے از روئے درایت بھی صحیح ہو۔“

سر دست ان عبارات پر بحث کی گنجائش نہیں تاہم اتنا عرض ہے کہ سر سید احمد خاں کے نزدیک احادیث پر درایتاً نظر ڈالنے سے قطعاً وہ منہاج مراد نہیں جو فقہاء و محدثین کی کلاسیکی روایت میں مروج ہے بلکہ یہاں درایتی معیار سے مراد انیسویں صدی کی سائنسی تائید ہے اور بس۔

کلام الہی اور کار الہی کا نظریہ: سر سید:

ان سب سے پیچھا چھڑانے کے بعد اب تنہا قرآن مجید ہی قابل استناد رہ جاتا تھا، مگر یہاں مصیبت یہ تھی کہ قرآن مجید میں جنت و جہنم، وہاں کی نعمتوں اور کلفتوں، ملائکہ اور جنات، معجزات انبیاء مثلاً: حضرت مسیح علیہ السلام کی بدوں والد پیدائش، ناقہ صالح کی خصوصیات، قمیص یوسف کے اوصاف، معجزات موسیٰ علیہ السلام میں عصا کا سانپ بننا، جادو گروں سے مقابلہ کرنا، پید بیضا، پانی کا پھٹ کر راستہ بن جانا، حضرت یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکل آنا، فی الفور سائے دار درخت کا اگنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات میں معراج اور معجزات وغیرہ۔ غرض بے شمار مابعد الطبعی حقائق اور ماوراء البالائے عقل مباحث خود قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں جن کی سائنس سے تصدیق نہیں ہوتی، لہذا اب سر سید نے ان مباحث کا انکار یا باطل تاویل کرتے ہوئے کار الہی [Work of God] اور کلام الہی [Word of God] کا نظریہ پیش فرمایا۔

کار الہی و کلام الہی میں تعارض سے کلام کا جھوٹا ہونا لازم: سر سید:

کار الہی اور کلام الہی کے نظریات کے تحت سر سید نے وحی الہی کو عقل انسانی کے تابع کرنے کی کوشش فرمائی۔ کیوں کہ Word of God یعنی کلام الہی تو اللہ تعالیٰ کے احکامات ہیں جن کے ذریعے خدا نے اپنی مرضی انسان کو بتلا دی، اجمال و اختصار اور ابہام کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی نمونے یا اقوال و ارشاد کے ذریعے دور فرمادیا، اس لیے Word of God میں تو دورائے نہیں ہو سکتی۔ اب رہ گیا Work of God تو وہ خود تو ناطق ہے نہیں، بلکہ انسان مظاہر کائنات میں تدبر و

تفکر اور غور و خوض سے اس میں پوشیدہ و مستور عوامل اپنی عقل و دانست سے دریافت کرتا ہے، جو قطعیت سے خالی اور خطا کے امکان سے مملو ہوتا ہے، سائنسی نظریات میں تغیر و تبدل اس پر گواہ ہے۔ لیکن سر سید احمد خاں اس کے برعکس لکھتے ہیں:

”اب ہمارے سامنے دو چیزیں ہیں ورک آف گاڈ، یعنی خدا کے کام اور ورڈ آف گاڈ یعنی خدا کا کلام یعنی قرآن مجید۔ اور ورک آف گاڈ اور ورڈ آف گاڈ کبھی مختلف نہیں ہو سکتے، اگر مختلف ہوں تو ورک آف گاڈ تو موجود ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ورڈ آف گاڈ جس کو کہا جاتا ہے، اُس کا جھوٹا ہونا لازم آتا ہے، نعوذ باللہ منہا، اسی لیے ضروری ہے کہ دونوں متحد ہوں۔“

یعنی اگر قرآن و سائنس میں کہیں تعارض و تضاد ہو تو سر سید سائنس سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں خواہ قرآن مجید سے دست بردار ہونا پڑے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

”ہمارا یقین کامل ہے کہ ورک آف گاڈ اور ورڈ آف گاڈ کبھی مختلف نہیں ہو سکتے گو ہم نے اپنے نفسِ علم سے کبھی ورڈ کے معنی غلط سمجھے ہوں۔“

اس اصول پر دیکھا جائے تو عہدِ رفتہ کی تمام تفاسیر بہ شمول سر سید کی تفسیر محض خیال آرائی اور ذہنی ورزش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

۱- سید احمد خاں، مقالات سر سید، جلد ۲، صفحہ ۲۰۶۔

۲- ایضاً، جلد ۴، صفحہ ۶۲۔

۳- سر سید کے اس نقطہ نظر کا مقابل مولانا محمد قاسم نانوتوی [م ۱۲۹۷ھ] بانی دارالعلوم دیوبند کے نقطہ نظر سے کرنا خالی از دل چسپی نہ ہوگا۔ سر سید نے سوالات اصول کی صورت میں ڈھال کر مولانا نانوتوی کی خدمت میں ارسال کیے، جن کے جوابات مولانا نے مرحمت فرمائے۔ یہ مکاتیب ایک کتابچے ”تصفیۃ العقائد“ [مطبوعہ کتب خانہ عزیز، دیوبند] کی صورت میں مطبوعہ ہیں۔ سر سید نے اپنا اصول یہ بیان کیا: ”اس کا کلام اور جس کو اس نے رسالت پر مبعوث کیا اس کا کلام ہرگز خلاف حقیقت اور خلاف واقعہ نہیں ہو سکتا“ اس کا جواب دیتے ہوئے مولانا نانوتوی نے لکھا: ”کلام خداوندی اور کلام نبوی جیسے مخالف حقیقت اور مخالف واقعہ نہیں ہو سکتا، ایسے ہی حقیقت اور واقعہ کے دریافت کرنے کی صورت اس سے بہتر کوئی نہیں کہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی طرف رجوع کیا جائے۔ سواگر کوئی طریقہ دربارہ اخبار واقع و حقیقت مخالف کلام اللہ اور احادیث صحیحہ ہو تو کلام اللہ اور احادیث کے وسیلے سے اُس کی تغلیط کر سکیں گی، پر کلام اللہ اور احادیث کی تغلیط اس طریقے کے بھروسے نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں اگر اشارہ عقل معارض اشارہ نقل ہو تو ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ غرض عقل کی بات یہ ہے کہ کلام اللہ اور احادیث صحیحہ نمونہ صحت و سقم دلائل عقلیہ سمجھے جائیں، نہ برعکس۔ علیٰ ہذا القیاس مضمون متبادر کلام اللہ و حدیث کو جو بہ اعتبار قواعد صرف و نحو دلائل مطابقی سمجھے جاتے ہوں، اصل مقرر کر کے دلائل عقلیہ کو اس پر مطابق کریں۔ اگر کھینچ کھانچ کر بھی مطابق آجائے تو فیہا ورنہ قصور عقل سمجھیں۔ یہ نہ ہو کہ اپنے خیالات و اوہام کو اصل سمجھیں اور کلام اللہ اور احادیث کو کھینچ تان کر اُس پر مطابق کریں۔“

سر سید اور حضرت مولانا نانوتوی کے سوال و جواب سے اس تضاد و بعد کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے، جو مذہبی فکر اور سر سید کی نیچری فکر کے درمیان پایا جاتا ہے۔

قانون فطرت کی دریافت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا: سرسید:

کار الہی [Work of God] جسے سرسید سچائی کا معیار سمجھتے ہیں اور اُسے خدا کا عملی عہد قرار دیتے ہیں اُس کی حقیقت کے بارے میں خود ایک جگہ اُن کے قلم سے نکل گیا ہے:

”انسان نے اُن چیزوں کے تجربے سے جو خدا نے پیدا کی ہیں، اُس کی مخلوق کے قانون فطرت کو معلوم کیا ہے اور بے شبہ وہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اُس نے مخلوقات کے قانون فطرت کو دریافت کر لیا ہے۔“

اندازہ کیجیے اس حماقت کا کہ جس امر کی دریافت ہی ابھی محل نظر ہے اُسے سچائی اور کلام الہی کو پرکھنے کا معیار قرار دیا جا رہا ہے۔

دراصل ان سب کے پیچھے سرسید کی انیسویں صدی والی سائنس کی اختیاری عقل پرستی کا جذبہ کار فرما تھا۔ وہ بد قسمتی سے مسلمانوں کے بیدار جذباتی معاشرے میں رہتے تھے جہاں اُن کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ صریح لفظوں میں سائنس یا عقل کے مقابلے میں قرآن مجید کو رد کریں۔ تاہم اُنہوں نے مختلف مقامات پر اس کا دبے لفظوں میں اظہار بھی کیا ہے۔ ایک مقام پر Word of God [جو قطعی ہے] اور Work of God [جسے انسان اپنی کاوش فہم سے اخذ کرتا ہے] میں تقابل کر کے فیصلہ سناتے ہیں:

”اگر ورڈ، ورک کے کسی حیثیت کے مطابق نہیں تو ایسا ورڈ، ورڈ آف گاڈ نہیں ہو سکتا۔“

یہ بالکل وہی بات ہے جو مارٹن لوتھر نے کہی تھی: ”جو بات عقل کے خلاف ہے وہ خدا کے بھی خلاف ہے۔“

سید صاحب کا ارشاد لوتھر کے اس فقرے سے اپنی رکاکت میں کہیں بڑھا ہوا ہے۔ سارا جھگڑا اور نزاع دراصل ”میری دانست“ اور ”میری سمجھ“ کا ہے فرماتے ہیں:

”میں نے بہ قدر اپنی طاقت کے خود قرآن مجید پر غور کیا اور چاہا کہ خود قرآن ہی سے سمجھنا چاہیے کہ اُس کا نظم کن اصولوں پر واقع ہوا ہے اور جہاں تک میری طاقت میں تھا میں نے سمجھا اور پایا کہ جو اصول خود قرآن مجید سے نکلتے ہیں اُن کے مطابق کوئی مخالفت علوم جدیدہ میں نہ اسلام سے ہے اور نہ قرآن سے۔“

اس ”میری سمجھ“ اور ”میری دانست“ نے اُنہیں کہاں تک پہنچا دیا، خود اُن ہی سے سن لیجیے:

”جن مجموعہ مسائل و احکام و اعتقادات وغیرہ پر فی زمانہ اسلام کا اطلاق کیا جاتا ہے، وہ یقیناً مغربی علوم کے مقابلے میں قائم نہیں رہ سکتا۔“

۱- سید احمد خاں، مقالات سرسید، جلد ۲ صفحہ ۲۰۶۔

۲- ایضاً، جلد ۲ صفحہ ۲۳۸۔

۳- ایضاً، جلد ۲ صفحہ ۲۳۶۔

۴- ایضاً، جلد ۲ صفحہ ۲۰۰۔

۵- سید احمد خان، تہذیب الاخلاق، جلد ۲ صفحہ ۱۳۸۔



سر سید کے تصور فطرت اور قرآن کی تفسیر: اثرات و نتائج: دور فقہ کی شہادت: یہ ہے سر سید کا نظریہ فطرت اور جذبہ عقل پرستی جس کو رائج کرنے کے لیے انہوں نے سُنّت، فقہ، احادیث، تفسیر سب کو داؤ پر لگا دیا۔ وہ اپنی محنت میں کس درجے کا میاب ہوئے اس پر سید صاحب ہی کے دور فقہ کی شہادت ملاحظہ کیجیے:

نواب محسن الملک سید صاحب کے نام گرامی نامے میں لکھتے ہیں:

”آپ ایک اصل کو بھی اصول دین سے اور ایک اعتقاد کو مجملہ معتقدات مذہب کے ماڈرن سائنس اور زمانہ حال کے فلسفے کی رُو سے لاء آف نیچر کے مطابق ثابت نہ کر سکیں گے۔“

”بس میرے نزدیک آپ دو مصیبتوں میں سے ایک سے بھی نہ نکل سکے، کہیں قرآن کے معنی سمجھنے میں غلطی کی اور کہیں نیچر اور لاء آف نیچر کے ثابت کرنے میں — بعض جگہ تو آپ قرآن کا وہ مطلب سمجھے جو نہ خدا نے سمجھا، نہ جبرئیل، نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، نہ صحابہؓ، نہ اہل بیتؑ، نہ عام مسلمان — اور کہیں نیچر کے دائرے سے نکل گئے اور مذہبی آدمیوں کی طرح پرانے خیالات اور پرانی دلیلوں اور پرانی باتوں کا گیت گانے لگے۔“

ڈپٹی نذیر احمد مرحوم سید صاحب کی قرآن فہمی اور تفسیر دانی کے متعلق فرماتے ہیں:

”سر سید احمد خاں صاحب کی تفسیر ایک دوست کے پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میرے نزدیک وہ تفسیر ”دیوان حافظ“ کی ان شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنفین نے چوڑوں سے کان گانٹھ کر سارے دیوان کو کتاب تصوف بنا چاہا ہے۔ جو معنی سر سید احمد خان صاحب نے منطوق آیات قرآنی سے اپنے چندار میں استنباط کیے [اور میرے نزدیک زبردستی مڑھے اور چپکائے] قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے، اور ان معانی کو ماننا مشکل..... یہ وہ معانی ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا، نہ جبرئیل حامی وحی کا، نہ رسول خدا کا، نہ قرآن کے کتاب ومدون کا، نہ اصحاب کا، نہ تابعین کا، نہ جمہور مفسرین کا۔“

ڈاکٹر مظفر اقبال لکھتے ہیں:

In his attempts to re-interpret Islam to accommodate modern Western Science, Ahmed Khan exposed his weaknesses in both domains of knowledge. He was severely criticized by the 'ulama' for the lack of qualifications to interpret the Qur'an and Hadith and shallowness of his

۱- سید محسن الملک، مکاتبات الخللان فی اصول التفسیر وعلوم القرآن، صفحہ ۱۶۔

۲- نذیر احمد، موعظہ حسنہ، دہلی: مطبع انصاری، ۱۸۹۰ء، صفحہ ۱۷۵۔

knowledge of Western science and its philosophical underpinnings was apparent from his own writings. He had no training in any natural science or in philosophy of science and he had never finished his traditional education.<sup>1</sup>

نواب محسن الملک کے بقول سر سید احمد خاں اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہے، وہ جس مغربی نظریہ فطرت کے [اس کی حقیقت سے واقف ہوئے بغیر] قائل تھے اور جسے اہل حقیقت سمجھتے تھے، آج خود مغرب میں اس کی حیثیت ”سقطۃ المتاع“ سے زیادہ نہیں ہے — عامۃ المسلمین مذہبی معاملات میں سر سید کی رائے کو پرکھنے کے برابر بھی وزن نہیں دیتے، دوسری طرف جس نظام تعلیم کو انھوں نے مغرب سے مستعار لے کر ہمارے یہاں رائج کیا، وہ کسی بلند مقصد حیات سے عاری اور اس طرز احساس سے مبرا تھا جو کسی قوم کے باطن میں قرار پکڑ کے اسے اعلیٰ نصب العین عطا کرتا ہے، بلکہ اس کا مقصد انگریزوں کی حکومت چلانے کے لیے ان کے دفتری نظام کے کل پرزے، یعنی کلرک، پیدا کرنا تھا، اسی لیے سر سید کے دیرینہ رفیق حالی نے کہا تھا:

کمال کفش دوزی علم افلاطون سے بہتر ہے<sup>۲</sup>

خیر نظام تعلیم اور اس کی مقصدیت تو رہی ایک طرف — سر سید کے دینی معاملات میں تصرف، قرآن کی جسارت کے ساتھ تاویل و تشریح سے اہل زلیغ اور گمراہ فرقوں کو صفِ اسلام میں داخل ہونے کی راہ فراہم ہوئی، خود رائی، اعجاب بالنفس اور آزادہ روی کا جو بیج انھوں نے بویا، اخلاص اور کیفیات قلبی سے قطع نظر، اس کے نتائج بد ہی نکلے، ان گنت گمراہ فرقے قادیانی اور منکرین حدیث در پردہ ان ہی کے فیض یافتہ اور اسی دبستان کے پروردہ ہیں۔<sup>۳</sup>

1- Muzaffar Iqbal, *Islam and Science: Explorations in the fundamental Questions of the Islam and Science Discourse*, Lahore: Suhail Academy, 2004, p. 249.

۲- جمال پانی پتی، ”سر سید کا نظام تعلیم اور ہم“، مشمولہ اختلاف کے پہلو، صفحات ۱۹۰-۲۰۴۔

۳- سید ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، کراچی: مجلس نشریات اسلام، [س-ن]، صفحہ ۱۰۰۔

## نیاز — جدید سائنس سے ناواقفیت کے باوجود ایمان

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”اس میں شک نہیں کہ نیاز انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں سائنسی علوم کے زیر اثر مذہب کی متداول تشریحات سے سرسید کی طرح بے حد متاثر ہیں“۔<sup>۱</sup>

نیاز: سائنس مادیت و روحانیت کا امتحان: ایک سفیہانہ دعویٰ:

منظور احمد کے اس بیان نے نیاز فتح پوری اور سرسید احمد خاں دونوں کے علم و فضل کی قلعی کھول کر رکھ دی اور یہ حقیقت واضح کر دی کہ دونوں حضرات قرآن و حدیث تو گنجا، سائنس کی حقیقت و حدود سے بھی ناواقف تھے اور اس زعم میں مبتلا تھے کہ سائنس زندگی اور کائنات کے ہر عقدے کو حل کر سکتی ہے۔ جس شعبے کا دائرہ کار ہی حسی اور طبیعی ہو وہاں مابعد الطبیعی دلالت کی تلاش ہی عبث ہے۔ پھر طبیعی دنیا میں بھی سائنس کا مطالعہ جزوی ہے کئی نہیں۔ مگر نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

”عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ علم یا سائنس کا تعلق صرف مادی چیزوں سے ہے اور مذہب چوں کہ روحانی چیز ہے، اس لیے سائنس کی رسائی وہاں ممکن نہیں، لیکن یہ غلط ہے کیوں کہ سائنس کا تعلق جس طرح مادی چیزوں سے ہے اسی طرح غیر مادی اشیا سے بھی ہے، اگر وہ کمیت سے بحث کرتا ہے تو کیفیت بھی اُس کی دسترس سے باہر نہیں..... سائنس فی الحقیقت نام ہے ایک صحیح اور بے لاگ انتقادی مطالعے کا خواہ اس کا موضوع کوئی مادی چیز ہو یا غیر مادی“۔<sup>۲</sup>

کانٹ: حقیقت مطلقہ تک رسائی ممکن نہیں:

یہ بیان اگر کانٹ کے فلسفے کے ظہور سے پہلے دیا جاتا تو شاید علمی دنیا اس پر غور بھی کرتی۔ مگر کانٹ کی معرکہ آرا کتاب *Critique of Pure Reason* کے بعد کہ سائنس کے ذریعے ماوراء

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۶۶۔

۲- نیاز فتح پوری، من و یزداں، صفحہ ۲۳۲۔

الطبیعیات یا حقیقتِ مطلقہ [absolute reality] تک رسائی ممکن ہے، ایک مسترد اور ناقابلِ قبول فلسفہ ہے۔ تا حال کوئی بڑی علمی اور تنقیدی بحث وجود میں نہیں آئی جو کانٹ کے اس نقطہ نظر کی علمی بنیادوں پر تردید کر سکے کہ دنیا میں دو ہیں: *phenomena* اور *noumenon*۔ ایک دنیا وہ ہے جو ہمارے محسوسات کے دائرے میں ہے اور مرئی و معلوم ہے جب کہ دوسری دنیا وہ ہے جو ماورائے محسوسات موجود مگر غیر مرئی ہے۔ جس تک ذہن و عقلِ انسانی کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ ماوراء الطبیعیات کی دریافت عقل کی استعداد و صلاحیت سے باہر کی چیز ہے۔ بالفاظِ دیگر عقل اس خاص استعداد سے محروم ہے جو حقیقتِ شے کے ادراک کی متحمل ہو سکے، کانٹ اپنی دو معروف اصطلاحات مظاہر [*phenomena*] اور حقیقتِ فی نفسہ [*noumenon*] کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

If by "noumenon" we mean a thing so far as it is *not* an object of our sensible intuition, and so abstract from our mode of intuiting it, this is a noumenon in the *negative* sense of the term. But if we understand by it an object of a *non-sensible* intuition, we thereby presuppose a special mode of intuition, namely, the intellectual, which is not that which we possess, and of which we cannot comprehend even that possibility. This would be 'noumenon' in the *positive* sense of the term.<sup>1</sup>

کانٹ کا اصل امتیاز ہی یہ ہے کہ اس نے عقل کی ان حدود کا تعین کر دیا جن میں رہتے ہوئے وہ اپنا خلقی وظیفہ انجام دے سکتی ہے۔ ان سے ماوراء عقل کی کار فرمائی کا کوئی امکان نہیں:

The critique of pure reason can be regarded as the true tribunal for all disputes of pure reason; for it is not involved in these disputes--disputes which are immediately concerned with objects--but is directed to the determining and estimating of the rights of reason in general, in accordance with the principles of their first institution.

In the absence of this critique reason is, as it were, in the state of nature, and can establish and secure its assertions and claims only through *war*. The critique, on the other hand, arriving at all its decisions in the light of fundamental principles of

1- Immanuel Kant, *Critique of Pure Reason*, [trans., Norman Kemp Smith], London: Macmillan and Co. Ltd., 1929, p. 268, B307.

its own institution, the authority of which no one can question, secures to us the peace of a legal order, in which our disputes have to be conducted solely by the recognised methods of *legal action*. In the former state, the disputes are ended by a victory to which both sides lay claim, and which is generally followed by a merely temporary armistice, arranged by some mediating authority; in the latter, by a *judicial sentence* which, as it strikes at the very root of the conflicts, effectively secures an eternal peace. The endless disputes of a merely dogmatic reason thus finally constrain us to seek relief in some critique of reason itself, and in a legislation based upon such criticism. As Hobbes maintains, the state of nature is a state of injustice and violence, and we have no option save to abandon it and submit ourselves to the constraint of law, which limits our freedom solely in order that it may be consistent with the freedom of others and with the common good of all.<sup>1</sup>

عقل کی فعالیت کی اس تحدید کے باعث ہی کانٹ کے نزدیک حقیقت اشیا [noumenon] کے بارے میں سوچا تو جاسکتا ہے، جانا نہیں جاسکتا۔<sup>2</sup> یہی سبب ہے کہ کانٹ کے نزدیک تمام روایتی مابعد الطبیعیات واہموں [illusions] پر مشتمل ہیں کیوں کہ وہ عقل پر انحصار کر کے اور اس کی حدود کا تعین کیے بغیر تمام اشیا بہ شمول روح، کائنات اور خدا کا علم حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔<sup>3</sup>

کانٹ: حقیقت دریافت کا موضوع نہیں، تخلیق کا عنوان ہے:

کانٹ کے فلسفے نے عملاً تلاش حقیقت کے بجائے تخلیق حقیقت [Creation of Reality] کے فلسفہ کو جنم دیا کہ انسان کے لیے حقیقت، جیسی کہ وہ ہے، کی تلاش تو ممکن نہیں البتہ حقیقت کو دینا بنا دینا ممکن ہے جیسا کہ وہ بنا نا چاہے، حقیقت ذہن انسانی میں ہوتی ہے لہذا ارادہ انسانی ہی حقیقت کی تخلیق کرتا ہے۔ کائنات کو اپنے ذہن میں موجود تصور حقیقت کے مطابق ڈھال دینا ہی تخلیق ہے اور یہ تخلیق ہر آن بدلتی رہتی ہے، لہذا کانٹ کے بعد سائنس اور سائنسی ترقی حقیقت کی تلاش نہیں بلکہ اس کی تخلیق میں مصروف ہے گویا سائنسی تخلیق کے ذریعے انسان حقیقت کو جیسا چاہتا ہے بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

1- Immanuel Kant, *Critique of Pure Reason*, p. 601-602, A752, B780.

2- Ibid., p. 170, B160-1.

3- Ibid., p. 297-300, A293-8, B350-5.

جدید سائنس: کائنات پر ارادہ انسانی کا تسلط:

جدید سائنس کا مقصد اور تسخیر کائنات کا جدید الحادی نظریہ و فلسفہ یہی ہے کہ کائنات پر ارادہ انسانی کو مسلط کیا جائے، Marx کے الفاظ میں:

The philosophers have only interpreted the world, in various ways; the point is to change it. ۱

مغرب کے نہایت اہم مفکرین E.F. Schumacher، Carolyn Merchant اور Theodor Adorno، وغیرہ نے نہایت صاف اور واضح الفاظ میں اس بات کو بیان کر دیا ہے کہ سترھویں صدی کے سائنسی انقلاب نے سائنس کے اہداف و مقاصد کو فہم و فطرت کے حصول اور روشنی سے ہٹا کر اپنے مقاصد کے استحصال کی حد تک استعمال پر مرکوز کر دیا ہے:

17th century scientific revolution shifted science from a focus on understanding nature, or wisdom, to a focus on manipulating nature i.e. power and the science's emphasis on manipulating nature leads it inevitably to manipulate people as well. ۲

سائنس اور اس کی حدود کار:

نیاز فتح پوری صاحب نے اگر بیکن، ڈیکارٹ، اور کانت کو پڑھ رکھا ہوتا تو ایسی غیر علمی، بے بنیاد اور بے پرکی باتیں ہرگز نہ کرتے۔ خود ڈاکٹر منظور احمد کا درج ذیل اقتباس نیاز فتح پوری کی سائنس اور اس کے دائرہ کار سے واقفیت اور مطالعے کے فقدان کی حقیقت آشکار کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”سائنس کیا ہے اور اس کے حدود کار کیا ہیں؟ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ سائنس کے حدود کار ان سوالوں سے متعین ہوتے ہیں جن کے جواب دینے کا سائنس دعویٰ کرتی ہے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا جب کوئی یہ بیان دریافت کرتا ہے کہ پانی کیسے بنا؟ اور اس سوال سے اس کی منشا یہ ہوتی ہے کہ جواب دینے والا پانی کے وقوعے کا تجزیہ کر کے یہ بتلائے کہ جس مرکب کا نام پانی ہے اس کی ترکیب کن عناصر سے ہوتی ہے؟ اور ان عناصر کو باہم ملانے کا طریقہ کیا ہے؟ وغیرہ، تو سوال کا یہ منشا جواب کو واقعات، ان کے مشاہدے اور ان کے درمیان علت و معلول کے رشتوں کی دریافت تک محدود کر دیتا ہے۔ سائنس کا کام فی الحقیقت یہی ہے۔ ان حدود سے آگے بڑھ کر جب کوئی سائنس دان ان مسائل

1- Karl Marx, *Karl Marx: A Reader*, Jon Elster [ed.], UK: Cambridge University Press, 1986, p. 23.

2- Fritjof Capra, *Uncommon Wisdom: Conversation with Remarkable People*, London: Fontana, 1989, p. 213.

نیاز — جدید سائنس سے ناواقفیت کے باوجود ایمان —

کے بارے میں کلام کرتا ہے جو واقعات اور اُن کے تحلیل و تجزیے کے علاوہ ہیں تو وہ ایک دوسرے میدان میں قدم رکھتا ہے جو سائنس کا میدان نہیں ہے۔ اس دوسرے میدان میں اُس کے ادعا کی صحت یا عدم صحت سائنسی واقعات سے متعین نہیں کی جاسکتی، دوسرے الفاظ میں سائنس جو کچھ ”ہے“ اُس کا تحلیل و تجزیہ نہیں کر سکتی، اُس کا مدار اُن معلومات پر ہے جو انسان کے حواس اُس کو فراہم کرتے ہیں اور اُن اشیا سے متعلق ہے جو اس کے بالواسطہ یا بلا واسطہ مشاہدے میں آتی ہیں، مذہب کے بنیادی حقائق مثلاً خدا، آخرت، نبوت، سائنس کے دائرہ کار سے باہر ہیں اور سائنس خود اپنی شہادت کے زور پر اُن کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتی۔<sup>۱</sup>

ایک مقام پر مزید لکھتے ہیں:

”یوں بھی سائنسی معلومات نہ تو خدا کی ہستی کا ثبوت بن سکتے ہیں اور نہ اُس کی تردید میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ سائنس کی کوئی ایجاد، اُس کا کوئی نیا انکشاف، کائنات میں سلسلہ اسباب و علل کی کوئی نئی دریافت خدا کے وجود کے خلاف یا موافق بنا کر پیش نہیں کی جاسکتی۔ سائنس کا دائرہ مذہب اور الہیات کے دائرہ کار سے بالکل مختلف ہے۔“<sup>۲</sup>

سائنس ایک کامیاب عملی مفروضہ:

سائنس کی بنیاد بھی پہلے سے طے شدہ نظریات ہیں، جنہیں حقیقتات یا مزعمومات کہا جاسکتا ہے، مشاہدہ کسی بھی نظریے کی تصدیق یا تردید میں حکم لگانے کے لیے کیا جاتا ہے، پھر جن حقائق کو مشاہداتی حقائق [Observed Facts] کہا جاتا ہے وہ فی الحقیقت مشاہدات کی تعبیریں ہیں جو مشاہدے کی ترقی سے تبدیل ہو سکتی ہیں۔ J.W. Sullivan لکھتا ہے:

It is evident, even from this brief survey of scientific ideas, that a true scientific theory merely means a successful working hypothesis. It is highly probable that all scientific theories are wrong. Those that we accept are verifiable within our present limits of observation. Truth, then, in science, is a pragmatic affair.<sup>۳</sup>

”سائنسی نظریات کے اس جائزے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ایک صحیح نظریہ محض یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایک کامیاب عملی مفروضہ [successful working hypothesis]

۱- منظور احمد، ”مذہب کی صداقت“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۲۱۔

۲- منظور احمد، ”ثبات، تغیر اور نشاۃ ثانیہ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۲۰۰۔

3- John William Navin Sullivan, *The Limitations of Science*, New York: The Viking Press, 1933, p. 158.

نیاز — جدید سائنس سے ناواقفیت کے باوجود ایمان —

ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ تمام سائنسی نظریات اصلاً غلط ہوں۔ جن نظریات کو ہم آج تسلیم کرتے ہیں، وہ محض ہمارے موجودہ حدودِ مشاہدہ کے اعتبار سے حقیقت ہیں۔ حقیقت [truth] اب بھی سائنس کی دنیا میں ایک علمی اور افادی مسئلہ [pragmatic affair] ہے۔“

مزعومات و نظریات: سائنسی علم کی واحد اساس:

ہر سائنسی حقیقت اولاً ایک مفروضہ ہوتی ہے۔ اگر مشاہدات، مفروضات کی تائید کر دیں تو وہ ”سائنسی حقیقت“ بن جاتی ہے اور اگر نہ کریں تو رد ہو جاتی ہے۔ مفروضات اور نظریات کی محتاجی ہی دراصل سائنسی دعوے کی موت ہے، کیوں کہ سائنس کے استقرائی طریقہ علم کے مطابق سائنس کی ابتدا و آغاز مشاہدہ و تجربہ ہے جو ایک ایسی معروضی بنیاد فراہم کرتا ہے جس کی اساس پر آفاقی نظریات قائم کیے جاسکتے ہیں۔ معروضی دعویٰ، ایسے دعوے کو کہتے ہیں جس کا تعلق subject سے نہیں بلکہ object سے ہوتا ہے، اس لیے اس کا تعلق کسی شخص کے خیالات و خواہشات اور نظریات سے ماورا [impersonal] ہوتا ہے، لہذا سائنس ہی حصولِ علم کا واحد عقلی [rational] اور آفاقی [universal] طریقہ کار سمجھا جاتا ہے۔ یہی وہ خیال ہے جس کی بنیاد پر تمام طریقہ ہائے علوم کو غیر عقلی [irrational] اور غیر آفاقی [non universal] قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ سائنسی علوم کی بنیاد مشاہدہ نہیں ہے مشاہدہ تو خود نظریے یا مفروضے [theoretical knowledge] کا رہنما ہے۔

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”سائنس کچھ ”مزعومات“ کی بنیاد پر اس کائنات میں سلسلہ اسباب کی تلاش کا نام ہے اور ان ”مفروضات“ یا ”مزعومات“ میں خدا سے انکار یا اقرار ایک بالکل بے تعلق سی بحث ہے۔“

سائنسی علوم کے زیر اثر مذہب کی تشریح: سائنس اور مذہب سے ناواقفیت:

سائنسی علوم کے زیر اثر مذہب کی متداول تشریحات سے متاثر ہونے کا مروجہ اسلوب، علم و تقویٰ کے استثنائے ساتھ، ٹھیک اسی راہ پر گامزن ہے جس پر عہدِ عباسی میں معتزلہ تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں یونانی فلسفے کی اسلام سازی [Islamization] کا معاملہ تھا اور یہاں مغربی سائنس کی۔ یہ دونوں طریقے اپنی بنیاد میں کج اور غلط ہیں۔ غور فرمایا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے عہدِ عروج میں جب زبردست سائنسی سرگرمیوں اور فتح یابیوں کا مظاہرہ کیا، اس وقت کسی کلاسیکی مفسر کے ذہن میں قرآن

۱- منظور احمد، ”ثبات، تغیر اور نشاۃ ثانیہ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۲۰۰۔

۲- اس سلسلے میں ایک مغربی مفکر کا اعتراف ملاحظہ کیجیے:

The West owes a debt to the medieval Muslim world, for both its custodianship of classical wisdom and its generation of new knowledge in cartography medicine and philosophy as well as in =



مجید کی سائنسی تفسیر لکھنے یا بہ قول ڈاکٹر صاحب ”سائنس کے زیر اثر مذہب کی متداول تشریحات سے متاثر“ ہونے کا خیال نہیں پیدا ہوا۔ آج جب مسلمانوں کی سائنسی سرگرمیاں معطل ہیں تو جدیدیت پسند مؤلفین و مصنفین نے اسلامی اقدار و روایات اور عقائد و نظریات کے تحفظ کا ضامن سائنس کو سمجھ لیا ہے۔ سائنس تغیر پذیر ہے اور قرآن حکیم اٹل اور ناقابل تغیر و تبدیل۔ سائنس اپنے اصول و نظریات میں جدید انکشاف و اکتشاف پر انقلاب کی نئی کروٹ سے عبارت ہے۔ جو نظریات و مباحث آج درست معلوم ہو رہے ہیں، ہو سکتا ہے کہ کل ہونے والے تجربات کی روشنی میں وہ غلط ثابت ہو جائیں اور پرانی بحث نا درست اور کالعدم قرار دے دی جائے۔ اس قبیل کے لوگ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اس صورت حال میں ان حضرات کی تحریریں پڑھنے والا یہ نہ سمجھ بیٹھے گا کہ قرآنی بیانات اور حدیثی مباحث بھی سائنس کی طرح ادا لتے بدلتے رہتے ہیں۔ اگر سائنس کی اسلام سازی کے حق میں مطبوعہ لٹریچر کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج سے ایک صدی قبل بعض آیات کی تشریح کے ضمن میں جن سائنسی نظریوں کا حوالہ دیا جاتا تھا، اب ان حوالوں سے اجتناب کیا جاتا ہے کیوں کہ اب وہ متروک ہو چکے ہیں۔ اس لیے یہ بات بعینہ از قیاس نہیں کہ آج سے ایک صدی بعد قرآنی آیات کی جو سائنسی توضیح، توجیہ اور تفسیر پیش کی جائے گی، ان میں آج کے سائنسی نظریات کے حوالے سے احتراز کیا جائے گا۔

سائنس اور مذہب میں تطبیق: سائنس کی مذہب پر برتری کا شاخسانہ:

جب بھی دو چیزوں میں تطبیق کا عمل ہوگا تو فریق ثانی، یعنی جس سے تطبیق دی جا رہی ہے، فریق اول پر، یعنی جس کو تطبیق دینا مقصود ہے، مرکزی، غالب اور فائق حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اسلام اور سائنس میں تلفیق و تطبیق کا ہر عمل، سائنس کی اسلام پر برتری اور فوقیت پر منتج ہوگا، تطبیق سے پیدا ہونے والی مشابہت محض التباس ہے، جس پر کسی شعوری موقف کی تشکیل ممکن نہیں۔ جدید سائنس کی مجموعی فکر، مذاہب سے عموماً اور اسلام سے خصوصاً متصادم و متغایر ہے۔ اس تصادم اور غیریت کی کم از کم معنویت یہ ہے کہ ایک کے بنیادی تصورات کی تشکیل و تہذیب میں دوسرے کا عمل دخل ممکن نہیں۔ تہذیبی اور معاشرتی سطح پر جدید سائنس اور اس کے لامحدود اور نوع بہ نوع مظاہر سرمایہ دارانہ نظام کا مرہونِ منت، عقل کی بے لگام اور خود سر حکمرانی کے مدعی، انکارِ وحی اور علومِ نقلیہ کے تمسخر، مذہبی مابعد الطبیعیات، احکامِ اسلام کی عدم ابدیت و حمیت کا مؤید اور محض انسان کی سفلی خواہشات اور حیوانی خصائص کی تکمیل کے مظاہر ہیں۔ اس سائنس کی اسلام سے تطبیق کا ہر سوال بے معنی ہے — ہائیڈر کے مطابق انسان "they" سے متعین ہوتا ہے اور اس کا واحد مقصد Every Day Life کو معنویت عطا کرنا ہے۔ زندگی اس

= mathematics and optics. The English thinker Roger Bacon acknowledged it: 'Philosophy is drawn from the Muslims'.

Niall Ferguson, *Civilization: The West and The Rest*, Penguin Books, 2011, pp. 51-52.

بات کی مہلت ہی فراہم نہیں کرتی کہ کسی اور بات، مقصد یا کچھ اور ہونے کی جستجو کی جاسکے۔ شخصیت کا تعین بڑی حد تک اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ "they" the انسان پر کس حد تک غالب آتا ہے۔ اسی لیے بہت سے فلسفی یہ کہہ دیتے ہیں کہ دنیا میں آنکھ کھولنے سے پہلے میں کہاں تھا، یہ سوال میرے شعور میں آنے سے پہلے کا ہے، میں اس سوال کا جواب دینے کا مکلف نہیں، جب میں حالت شعور میں نہیں تھا تو اس کا جواب کیسے دے سکتا ہوں؟ اسی طرح موت شعور کی موت کا نام ہے، جب شعور ہی نہ رہے گا تو اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ سوال بھی غیر اہم ہے Some one thrown me in the world۔

لہذا دنیا میں آنے اور جانے کے درمیان کا وقفہ اہم ہے اور اسی کو با معنی بنا دینا مقصود ہے۔

مذہب کو کسی فلسفے یا سائنس کے زیر اثر رکھنا ہی عملاً مذہب سے بغاوت، علوم اسلامی کے مسلمہ اصولوں سے انحراف، جدید سائنس، اُس کی ہلاکتوں اور سائنس اور سرمایہ داری کے تعلق سے ناواقفیت کا ثبوت پیش کرنا ہے۔ آج دنیا کا کوئی سائنس دان اشیا کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے تحقیق نہیں کرتا، اربوں کھربوں روپے سائنس پر اشیا کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے خرچ نہیں کیے جا رہے۔ مذہب کی قبولیت یا عدم قبولیت کے فیصلے میں کسی پر جبر واکراہ نہیں ہے۔ لیکن اگر قبول کرنا ہی ہے تو پھر پوری ایمانی یک سوئی اور عملی وابستگی کے ساتھ کہ مذہب خیالات انسانی کے ہر زاویے اور حیات انسانی کے ہر گوشے پر اپنی قانونی حاکمیت وحمیت چاہتا ہے ورنہ:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ [۲۹:۱۸]

”اور کہہ دو کہ [لوگو!] یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے برحق ہے تو جو چاہے ایمان

لائے اور جو چاہے کافر رہے۔“

## نیاز — ایک غیر جانب دار مبصر؟

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”نیاز کا مذہب کے بارے میں رویتہ غیر جانب دار مبصر کا ہے“۔<sup>۱</sup>

ایک صفحے پہلے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ نیاز مذہب کی متداول تشریحات کے معاملے میں سائنسی علوم سے متاثر تھے اور اب فرما رہے ہیں کہ مذہب کے بارے میں نیاز کا رویتہ ”غیر جانب دار مبصر“ کا ہے۔ جو شخص مذہب کو سائنس کی عینک لگا کر دیکھنے کا عادی ہو، وہ غیر جانب دار کیسے ہو سکتا ہے؟ اب یہ بھی معلوم نہیں کہ منظور احمد صاحب کے نزدیک غیر جانب داری کا مفہوم کیا ہے؟ آیا وہی مغربی مفہوم کہ انسان، کائنات، زندگی، آخرت اور دیگر مابعد الطبیعی امور پر اپنا نقطہ نظر وضع کرنے کے لیے انسان کو آزادی ہونی چاہیے، وہ کسی الہامی ضابطے کا پابند نہیں، اُسے چاہیے کہ اپنا مذہب اور اخلاق خود وضع کرے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ کیا دنیا کا کوئی انسان صحیح اور حقیقی معنوں میں ”غیر جانب دار“ ہو سکتا ہے؟ ماں کی گود سے لے کر مکتب کی دہلیز تک اور پھر وہاں سے اعلیٰ تعلیم کے حصول تک علم و تہذیب کا سفر کر کے، اپنے ماحول اور معاشرے میں زندگی کا سارا حصہ بسر کر کے کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں ”غیر جانب دار“ ہوں؟ انسان اپنی زندگی کے ابتدائی سفر سے لے کر انتہائی سفر تک، غیر ارادی ولا شعوری طور پر کسی نہ کسی متداول رجحان و فکر کا حامل ضرور ہوتا ہے خواہ مذہب بیزاری کا ہو یا مذہب پسندی کا۔ لیکن یہ کہنا کہ آدمی غیر جانب دار ہے خوش گمانی و خام خیالی ہے، واقعیت و حقیقت نہیں۔ جہاں تک نیاز فتح پوری کی بات ہے تو ڈاکٹر صاحب نے خود فرما دیا کہ وہ سائنسی علوم سے متاثر تھے اور جدید سائنس اپنی اصلیت اور ترقی کی تاریخ کے باوصف مغربی تہذیب کا مکمل شاخسانہ ہے۔<sup>۲</sup>

اس لیے نیاز اسلام کے مقابلے میں مغرب سے مرعوب و مسحور تھے۔

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۶۷۔

2- Ziauddin Sardar, Explorations in Islamic Science, London: Mansell Pub., 1989, p. 6.

## کیا روایتی علما کا تفسیری منہاج محض لغت عرب پر منحصر ہے؟

ڈاکٹر منظور احمد لکھتے ہیں:

”علمائے جس طریق تفسیر کو اختیار کیا وہ اس [یعنی سرسید احمد خان کے طریق] سے مختلف ہے، انہوں نے کلام کی تفہیم لغت عرب اور الفاظ کے ان معروف معنوں کی مدد سے کی جو اس زمانے میں مستعمل تھے۔“<sup>۱</sup>

سرسید کا علمی اثاثہ: معتزلی مکتب کی خوشہ چینی:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب یہاں اصول تفسیر کے مباحث پر گفتگو فرما رہے ہیں۔ اجماع امت اور سرسید احمد خان کے تفسیری اصولوں کے اختلاف کو بیان کرتے ہوئے سرسید کی تائید کر رہے ہیں۔ سرسید کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ معتزلہ سے بے حد متاثر تھے اور معتزلہ کے علاوہ عالم اسلام کے تمام تفسیری سرمائے کو بے سند، بلا تحقیق اور افواہی روایتوں سے مملو قرار دیتے تھے۔ سرسید کا تمام تر فکری و مذہبی ورثہ، ان کا اجتہاد، علمی بدعات اور ان کی جدیدیت کے تمام سوتے فی الحقیقت صرف اور صرف معتزلی مکتب کی ناقص خوشہ چینی سے زیادہ کچھ نہیں۔

قرآن میں تدبیر سے مراد صرف لفظی موٹھگانی نہیں:

علمائے تفسیر نے کلام کی تفہیم صرف لغت عرب اور اپنے زمانے میں معروف و مستعمل معنوں کی مدد سے نہیں کی۔ یہ خالص پرویزی نقطہ نظر ہے کہ کلام اللہ کے مختلف الفاظ کے لغوی معانی اور اس کے پس منظر کو کھنگال کر اس کا مفہوم متعین کیا جائے۔ علمائے تفسیر کے اصول تفسیر سے سرسری واقفیت بھی ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کی تردید کے لیے کافی ہے۔

کلام اللہ کے علوم و معارف صرف اس کے منطوق اور ظاہر ہی میں منحصر نہیں، اگر ایسا ہوتا تو اس میں تدبیر و تفکر کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ لیکن قرآن اس ضرورت کا اعلان کرتا ہے:

۱- منظور احمد، ’نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام‘، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۶۹۔

کیا روایتی علما کا تفسیری منہاج محض لغت عرب پر منحصر ہے؟

وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ [۲۴:۱۶]  
 ”اور یہ ذکر [قرآن] ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے کہ لوگوں کی جانب جو نازل فرمایا گیا ہے، آپ اُسے کھول کھول کر بیان کر دیں، شاید کہ وہ غور و فکر کریں۔“

وَ مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَ هُدًى وَ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ [۲۴:۱۶]

”اور ہم نے آپ پر یہ کتاب صرف اس واسطے نازل کی ہے کہ جن امور میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں، آپ لوگوں پر اس کو ظاہر فرمادیں اور ایمان والوں کی ہدایت اور رحمت کی غرض سے۔“

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبْرَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَ لِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ [۲۹:۳۸]  
 ”یہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف اس لیے نازل فرمایا ہے کہ لوگ اس کی آیتوں پر غور و فکر کریں اور عقل مند اس سے نصیحت حاصل کریں۔“

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا [۲۴:۳۷]

”کیا یہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ یا ان کے دلوں پر ان کے تالے لگ گئے ہیں۔“

قرآن حکیم میں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض رسالت میں یہ بات شامل کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پیش فرمانے کے ساتھ ساتھ اس کی شرح و تفصیل بھی بیان فرمائیں:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ [۲:۱۲۹]

”وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔“

اہل عرب صحابہؓ نے قرآن کو علم و عمل کے ساتھ سیکھا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو صرف الفاظ قرآن ہی کی تعلیم نہیں فرمائی، بلکہ آپ ان کے سامنے کلام پاک کی شرح و تفصیل بھی بیان فرمایا کرتے تھے۔ حضرات صحابہؓ نے قرآن مجید کی تفہیم و تدبر تک رسائی میں بڑی مدتیں اور ریاضتیں صرف کی ہیں، انہیں ایک سورۃ پڑھتے ہوئے بسا اوقات کئی کئی برس لگ جاتے تھے، امام مالک رحمہ اللہ کی بلاغات میں ہے:

أن عبد الله بن عمر، مكث على سورة البقرة، ثمانين سنين يتعلمها.

”حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما آٹھ برس تک صرف سورۃ بقرہ ہی سیکھتے رہے۔“

اس ”سیکھنے“ سے مراد ظاہری اخذ و حفظ نہیں بلکہ علوم و معارف قرآنی میں غواصی ہے۔ مشہور

تابعی حضرت عبد الرحمن اسلمیؓ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے ہمیں قرآن کی تعلیم دی جیسے سیدنا عثمان غنی اور

۱- مالک بن انس، الجوط اللامام مالک، کتاب القرآن، باب ما جاء في القرآن، صفحہ ۱۹۰۔

کیا روایتی علما کا تفسیری منہاج محض لغت عرب پر منحصر ہے؟

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما، انہوں نے ہمیں بتلایا:

أنهم كانوا إذا تعلموا من النبي صلى الله عليه وسلم عشر آيات لم يتجاوزوها حتى يعلموا ما فيها من العلم والعمل، قالوا: فتعلمنا القرآن والعلم والعمل جميعاً. ولهذا كانوا يبقون مدة في حفظ السورة<sup>١</sup>.  
”جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات سیکھ لیتے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے، جب تک جان نہ لیتے کہ ان میں علم و عمل کا تقاضا کیا ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ ہم نے قرآن کریم، علم اور عمل تینوں کو اکٹھے سیکھا تھا، اسی بنا پر وہ مدت تک ایک سورۃ کے حفظ میں مشغول رہتے تھے۔“

معلوم ہوا کہ کلام کی تفہیم محض لغت عرب یا صرف اس عہد میں معروف و مروج معنوں کی مدد سے ممکن نہیں۔ حضرات صحابہؓ خود اہل زبان تھے، عربی زبان و ادب اپنی ہر تعبیری جہت اور تشریحی پہلو سے ان کے سامنے کھلی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود انہیں قرآن فہمی میں طویل مدت لگی ہے۔

فن تفسیر: مستقل ریاضتوں کا مسلسل علمی ثمر:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرات صحابہؓ کلام اللہ شریف کی تفہیم و تفسیر کا مرجع بنے۔ اس کے بعد مکہ معظمہ میں ان ہی صحابہؓ کے تلامذہ نے قرآن فہمی کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا فریضہ ادا کیا۔ یوں علم تفسیر کی محنت انتہائی مشقت و مجاہدے سے گزر کر آج ہمارے سامنے ایک مدون و مہذب فن کی صورت میں موجود ہے۔ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ان بزرگوں کی محنت و سعی کی بدولت جس طرح الفاظ قرآنی محفوظ رہے اسی طرح تعبیر و تشریح بھی۔

تفسیر قرآنی کے بنیادی ماخذ:

علمائے تفسیر کے نزدیک تفہیم و تفسیر قرآنی کا طریق یا ماخذ کیا اور کن کن منابع کا رہن ہے، مختصر اذکرہ کیا جاتا ہے:

قرآن: تفسیر قرآن کا ماخذ اول:

قرآن فہمی کا سب سے بڑا ماخذ خود قرآن مجید ہے۔ ایسا بہ کثرت ہوتا ہے کہ کلام اللہ شریف میں ایک ہی مضمون کو مختلف انداز و عنوان سے بیان کیا جاتا ہے۔ ایک مضمون ایک جگہ مجمل ہوگا تو دوسری جگہ مفصل، ایک جگہ مختصر ہوگا تو دوسری جگہ مطول، ایک جگہ مطلق ہوگا تو دوسری جگہ مقید۔ اسے تفسیر القرآن بالقرآن کہتے ہیں۔ یفسر بعضہ بعضاً کا یہ پہلا اصول ہے۔

۱- جلال الدین السيوطي، الاتساع، شرح علم القرآن، النوع الثامن والسبعون في معرفة شروط المفسر و آدابہ، صفحہ ۷۶۲۔

حدیث و سنت: تفسیر قرآنی کا دوسرا ماخذ:

یہ بات، بیان ہو چکی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض رسالت میں سے تھا کہ آپ امت کے سامنے قرآن مجید کو پوری شرح و تفصیل سے بیان فرمائیں۔ آپ نے اپنے اقوال و اعمال دونوں سے یہ فریضہ بہ احسن وجوہ ادا فرمایا۔ اسی حقیقت کو ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ بنت صدیق رضی اللہ عنہا نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

كان خلقه القرآن.<sup>۱</sup>

”آپ کا اخلاق قرآن تھا“۔

مطلب یہ ہے کہ آپ کے اخلاق و عادات، سیرت و کردار، اقوال و ارشادات سب سانچہ قرآنی میں ڈھلے ہوئے تھے۔ آپ کا ہر عمل، ارشاد یا حکم قرآن ہی کی شرح تھا، حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

كل ما حكم به رسول الله صلى الله عليه وسلم فهو مما فهمه من القرآن،  
قال تعالى: إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ  
اللَّهُ. [۱۰۵:۳]<sup>۲</sup>

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی فیصلے فرمائے وہ آپ نے قرآن سے ہی سمجھے تھے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”یقیناً ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی ہے، تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلادیا ہے۔“  
اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارکہ یا اعمال طیبہ سے قرآن مجید کی تفہیم و تفسیر، بہ شرط صحت، فہم قرآنی کا دوسرا ماخذ ہے۔

اقوال صحابہ کرام: تفسیر قرآنی کا تیسرا ماخذ:

حضرات صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتگان اور بہ راہ راست تعلیم کتاب و سنت پانے والے ہیں۔ وہ نزول وحی کے موقعوں پر حاضر و موجود رہے ہیں۔ آپ سے بار بار مطالب و مفہوم قرآنی دریافت کرنے والے اس کی حفاظت و نشر و اشاعت کرنے والے ہیں۔ مؤید بارگاہ خداوندی اور نبوی علم و تزکیہ کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ظاہر ہے ان سے بڑھ کر کتاب اللہ شریف کو سمجھنے کا سلیقہ اور تفسیر قرآنی کا حق دار کون ہو سکتا ہے؟ فقیہ الامۃ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے:

والذي لا إله غيره ما نزلت آية من كتاب الله إلا وأنا أعلم فيمن

۱- احمد بن حنبل، مسند أحمد، مسند النساء، حديث السيدة عائشة، جلد ۶، صفحہ ۹۱۔

۲- جلال الدین السيوطی، الاتقان في علوم القرآن، النوع الثامن والسبعون في معرفة شروط المفسر و آدابہ، صفحہ ۶۳۔

کیا روایتی علما کا تفسیری منہاج محض لغت عرب پر منحصر ہے؟

نزلت، واین نزلت؟ ولو اعلم مکان أحد اعلم بكتاب الله مني تناله المطايا لا تيته<sup>۱</sup>

”معبود حقیقی کی قسم! کتاب اللہ کی جو آیت بھی نازل ہوئی ہے مجھے اس کے متعلق علم ہے کہ کس کے حق میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی اور اگر میری دانست میں کتاب اللہ کا مجھ سے زیادہ کوئی جاننے والا موجود ہوتا اور وہاں تک سواری جاسکتی تو میں ضرور اس کی خدمت میں حاضر ہوتا“۔

اس لیے جس آیت کی تفسیر پر حضرات صحابہ کا اتفاق ہو اس کے خلاف کوئی اور تفسیر بیان کرنا مفسرین کے نزدیک ناجائز ہے اور اگر خود صحابہ میں اختلاف ہو تو پھر دیگر دلائل، قرآن، شواہد کی بنیاد پر راجح اور مرجوح کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

بہر حال، تیسرا ماخذ اقوال وارشادات صحابہ کرام ہے۔

تابعین کے اقوال: تفسیر قرآنی کا چوتھا ماخذ:

جس طرح صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم کتاب و سنت پائی، اسی طرح تابعین نے صحابہ سے کسب فیض کیا۔ صحابہ کے بعد تفسیر قرآن کے دو مراکز تھے، مکہ معظمہ اور کوفہ۔ مکہ مکرمہ میں سیدنا ابن عباس کے تلامذہ مجاہد [م ۱۰۰ھ] سعید بن جبیر [م ۹۵ھ] عکرمہ [م ۱۰۷ھ] طاؤس بن کیسان [م ۱۰۵ھ] اور عطاء بن ابی رباح [م ۱۱۵ھ] تفسیر کا درس دیتے تھے۔ اور کوفہ کا تفسیری حلقہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ حضرت علقمہ بن قیس [م ۶۱ھ]، اسود بن یزید اور ان کے تلامذہ علامہ شعبی، امام ابراہیم نخعی کے دم قدم سے آباد تھا۔ علم تفسیر میں تابعین کے اقوال بڑی اہمیت کے حامل ہیں اگرچہ حجت ہونے میں اختلاف ہے۔

لغت عرب تفہیم قرآنی کا ماخذ نہیں، صرف ایک ذریعہ:

قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لیے قرآن فہمی کے لیے عربی زبان پر عبور و مہارت بہت ضروری ہے۔ لغت و ادب کی ضرورت ان آیات کی تفسیر میں زیادہ پڑتی ہے جن کے پس منظر میں کوئی شان و اسباب نزول یا فقہی و کلامی مسئلہ نہیں ہوتا۔ لہذا ان آیات کی تفسیر کا ایک ذریعہ لغت عرب ہو سکتی ہے۔ لیکن جن آیات کی تفسیر میں خود قرآن و سنت یا صحابہ و تابعین و مفسرین کے اقوال سے رہنمائی ملتی ہو وہاں لغت و ادب کی حیثیت باوجود اپنی اہمیت کے ثانوی تو کیا ثالث بھی نہیں رہ جاتی ہے اس حد تک تو ڈاکٹر منظور احمد بھی ہمارے ہم نوا ہیں، لکھتے ہیں:

”قرآن و حدیث یا کسی بھی کلام کے منشا کو معلوم کرنے کے لیے لغت کافی نہیں“۔<sup>۲</sup>

۱- جلال الدین السيوطي، الاتقان في علوم القرآن، النوع الثمانون في طبقات المفسرين، صفحہ ۷۸۳۔

۲- ”مکالمہ“ [کراچی]، جولائی-دسمبر ۲۰۰۲ء، نمبر ۱۳، صفحہ ۱۹۔



## تاویل: تفہیم قرآنی کا ایک ذریعہ:

متذکرہ مآخذ اور ذریعے کے علاوہ کلام اللہ شریف کی تفہیم کا ایک ذریعہ اور بھی ہے، جسے تدبر یا تاویل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی الفاظ قرآن جتنے معنی کے محتمل ہو سکیں، بہ ذریعہ قرآن کسی ایک معنی کی طرف رجوع کرنا۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے: لكل آية منها ظهر و بطن۔ یعنی کتاب اللہ کی ہر آیت کے لیے ایک ظہر ہے اور ایک بطن، جن میں سے ہر ایک تک رسائی اور ہر ایک کا منبع و طریق اطلاع جدا گانہ ہے۔ مدلول ظاہری کے لیے علوم عربیہ کی ضرورت ہے اور مدلول باطنی کے لیے قوت فہمیہ کی۔ اس بطن سے عارف محققین نے ایسے حقائق و اسرار اور نکات و علل دریافت کیے ہیں جن سے قرآن مجید کی شان اعجاز کا ثبوت نمایاں ہوتا ہے۔ اس کی اتھاہ گہرائیوں میں اتنا خزانہ دفن ہے جس کی کوئی حد نہیں، عارف بصیر ہی اس کو دریافت کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، لیکن مخلوق کی کاوش کبھی بھی خالق کے کلام کا احاطہ نہیں کر سکتی، اس کے عجائب اور کنوز مخفیہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ اس لیے قرآن مجید میں تدبر و استنباط سے کبھی علمائے مذہب اور مفسرین نے منع نہیں کیا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو عادی ہے:

اللهم فقهه في الدين، و علمه التاويل.

”اے اللہ! اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور تاویل کتاب کا علم عطا فرما۔“

یہاں تاویل سے مراد مدلول مخفیہ اور اسرار پوشیدہ میں تدبر کرنا ہے، حضرت علامہ خازن رحمہ اللہ تاویل اور تدبر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فاما التاويل وهو صرف الآية على طريق الاستنباط الى معنى يليق بها محتمل لما قبلها وما بعدها وغير مخالف الكتاب والسنة فقد رخص فيه اهل العلم فان الصحابة رضی اللہ عنہم قد فسروا القرآن و اختلفوا في تفسيره على وجوه وليس كل ما قالوه سمعوه من النبي صلی اللہ علیہ وسلم ولكن على قدر ما فهموا من القرآن تكلموا في معانيه وقد دعا النبي صلی اللہ علیہ وسلم لابن عباس فقال: اللهم فقهه في الدين و علمه التاويل.

”وہ تاویل جس میں قرآن پاک کی آیت کو استنباط و استدلال کے طریق سے کسی ایسے معنی کی طرف لوٹایا جائے جس کی وہ آیت بہ لحاظ سیاق و سباق محتمل ہے اور گنجائش رکھتی ہے، تو اس قسم

- ۱- محمد بن حبان، صحیح ابن حبان بترتیب ابن بلبان، بیروت: مؤسسة رسالۃ، [س-ن]، کتاب العلم، ذکر العلة التي من أجلها قال النبي: ”وما جهلتم منه فردوه الى عالمه“، جلد ۱، صفحہ ۲۷۶۔
- ۲- احمد بن حنبل، مسند احمد، مسند آل العباس، مسند عبد اللہ بن العباس، جلد ۱، صفحہ ۳۲۸-۳۲۹۔
- ۳- علی بن محمد الخازن، تفسیر الخازن المسمیٰ لباب التاویل في معاني التنزيل، مصر: دار الكتب العربية الكبرى، [س-ن]، مقدمة الكتاب، الفصل الثاني في وعيد من قال في القرآن براه، جلد ۱، صفحہ ۵۔

کیا روایتی علما کا تفسیری منہاج محض لغت عرب پر منحصر ہے؟

کی تاویل کی اہل علم نے اجازت دی ہے۔ صحابہ کرامؓ جب تفسیر کرتے تھے تو اس میں ہر ایک بات نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے تو سنی ہوئی نہ ہوئی تھی بلکہ وہ اپنے اپنے فہم کی روشنی میں ان مطالب و معانی میں کلام فرماتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابن عباسؓ کے حق میں دعا فرمائی تھی کہ: ”اے اللہ! اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور تاویل کتاب کا علم عطا فرما۔“

تاویل سے مراد الفاظ قرآن کو من مانے معنی پہنانا نہیں ہے:

تاویل و تدبر سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ دلالت الفاظ کے اصل رُخ کو ظاہر سے پھیر کر خود ساختہ معانی کی طرف موڑ دیا جائے، چاہے وہ مفہوم منشاءً متکلم سے صراحتاً متصادم ہو۔ اگر قرآن مجید کی ”تفہیم“ یا ”تاویل“ کتاب و سنت، اجماع، اقوال صحابہؓ و تابعینؓ، لغت کے خلاف ہو یا کسی شرعی اصول سے ٹکراتی ہو وہ ہرگز قابل قبول نہیں۔ قرآن لا وارث کتاب نہیں ہے، نعوذ باللہ، کہ اسے باطل کیش اپنی من چاہی مرادات، نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات کی آماجگاہ بنا ڈالیں اور امت اس کا تماشا کھلی آنکھوں دیکھتی رہے، ایسا پہلے کبھی ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من قال في القرآن برأيه فأصاب فقد أخطأ۔<sup>۱</sup>

”جو شخص اپنی خواہش کے مطابق قرآن کی تفسیر کرے اگر وہ صحیح بات بھی کہہ جائے تو بھی اس نے صحیح طریقہ تفسیر سے انحراف کیا۔“

آٹھویں صدی ہجری کے جلیل القدر مفسر حضرت علامہ علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم البغدادی، لکھتے ہیں:

النهي عن القول في القرآن بالرأى إنما ورد في حق من تناول القرآن على مراد نفسه وما هو تابع لهواه وهذا لا يخلوا ما أن يكون عن علم أولاً فان كان عن علم كمن يحتج ببعض آيات القرآن على تصحيح بدعته وهو يعلم أن المراد من الآية غير ذلك لكن غرضه أن يلبس على خصمه بما يقوى حجته على بدعته كما يستعمله الباطنية والخوارج وغيرهم من أهل البدع في المقاصد الفاسدة ليغروا بذلك الناس وان كان القول في القرآن بغير علم لكن عن جهل وذلك بان تكون الآية محتملة لوجوه فيفسرها بغير ما تحتمله من المعاني والوجوه فهذان القسمان مدمومان و كلاهما داخل في النهي والوعيد الوارد في ذلك۔<sup>۲</sup>

۱- محمد بن عيسى الترمذی، سنن الترمذی، ابواب تفسیر القرآن عن رسول اللہ، باب ما جاء في الذي يفسر القرآن برأيه، جلد ۲ صفحہ ۱۲۳۔

۲- علی بن محمد الخازن، تفسیر الخازن المسمى لباب التاويل في معاني التنزيل، مقدمة الكتاب، الفصل الثاني في وعيد من قال في القرآن برأيه، جلد ۱، صفحہ ۵۔

کیا روایتی علماء کا تفسیری منہاج محض لغت عرب پر منحصر ہے؟

”تفسیر بالزائے کی یہ نہی اس شخص کے حق میں وارد ہے جو قرآن پاک کو اپنی خواہش اور نفسانی مراد کے مطابق پھیرتا ہے، پھر اس کی دو صورتیں ہیں: [۱] علم کے سہارے، جیسے وہ لوگ جو اپنی بدعات کی تائید کے لیے بعض آیات قرآنیہ کا سہارا لیتے ہیں حالاں کہ انہیں پتا ہوتا ہے کہ آیت کی یہ مراد نہیں لیکن ان کا مقصد اپنے مخالف کو مغالطہ دینا اور اپنی من گھڑت بات کو ثابت کرنا ہوتا ہے، یہ طریق فرقہ باطنیہ، خوارج اور دوسرے بدعتی فرقوں کا ہے، اس کا مقصد لوگوں کو محض دھوکا دینا ہے۔ [۲] تفسیر بالزائے کی دوسری صورت ”بغیر علم“ [زائے زنی ہے] مثلاً ایک آیت کئی مطالب کی محتمل ہے مگر کوئی شخص ایسی تفسیر کرتا ہے جس کی اس آیت میں کوئی گنجائش نہیں۔ تفسیر بالزائے کی یہ دونوں صورتیں مذموم ہیں اور دونوں اس نہی اور وعید میں داخل ہیں جو اس باب میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام سے وارد ہے۔“

ہاں! قرآن پاک کے حقائق و معارف پر نظر و تدبر اور استدلال جو ائمت کے اجماعی عقیدے سے ہٹا ہوا نہ ہو، خواہ سلف سے منقول بھی نہ ہو، اس سے کبھی علمائے تفسیر نے منع نہیں فرمایا، کسی آیت مبارکہ کی تفسیر میں اختلاف فہم، تعبیر مفہم قرآن میں استنباط و تدبر ہی کا نتیجہ ہے ورنہ تفسیری اقوال میں سلف و خلف کا کوئی اختلاف ہی نہ ہوتا۔ حضرت علامہ طاہر گجراتی لکھتے ہیں:

من قال في كتاب الله برأيه فأصاب فقد أخطأ، لا يجوز أن يراد أن لا يتكلم أحد في القرآن إلا بما سمعه، فإن الصحابة رضي الله عنهم قد فسروه واختلفوا فيه على وجوه وليس كل ما قالوه سمعوه منه، ولأنه لا يفيد حينئذ دعاؤه: اللهم فقهه في الدين وعلمه التأويل، فالنهي لوجهين: أحدهما يكون له رأي وإليه ميل من طبعه وهو اه فيتأول على وفقه ليحتج على تصحيح غرضه ..... وقد يكون له غرض صحيح كمن يدعو إلى مجاهدة القلب القاسي ويستدل بقوله ”اذهب إلى فرعون إنه طغي“ ويشير إلى قلبه، ويستعمل الوعاظ تحسیناً وترغيباً، وهو ممنوع.

”من قال في كتاب الله برأيه“ کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص قرآن کے متعلق سوائے سنے ہوئے کے اور کچھ نہ کہے کیوں کہ حضرات صحابہ نے قرآن کریم کی تفسیر بیان کی اور اس میں اختلاف بھی کیا، اور تفسیر میں وہ جب بھی کچھ کہتے ایسا نہ تھا کہ ہر بات انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ہو، اور اس لیے بھی تفسیر بالزائے کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کا مطلب کہ:

۱- محمد طاہر گجراتی، مجمع بحار الأنوار فی غرائب التنزیل و لطائف الأخبار، المدینۃ المنورۃ: مکتبۃ دار الایمان، ۱۳۱۵ھ/۱۹۹۲ء، قول، جلد ۴، صفحہ ۳۴۳۔

کیا روایتی علما کا تفسیری منہاج محض لغت عرب پر منحصر ہے؟

”یا اللہ! اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور قرآن کی مرادات سمجھا“ کچھ باقی نہیں رہتا، پس رائے سے تفسیر کرنے کی ممانعت دو صورتوں میں ہے، ایک یہ کہ کسی شخص کی کوئی رائے پہلے سے قائم ہے اور اس کی طرف اس کا طبعی میلان ہے اور وہی اس کی غرض ہے اور وہ تفسیر اس لیے کر رہا ہے کہ اپنی غرض کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دلیل لائے..... اور کبھی تفسیر بالرائے کرنے والے کی غرض صحیح بھی ہوتی ہے جیسے کوئی شخص مجاہدہ قلبی کی دعوت دیتے ہوئے ”اذھب الی فرعون انہ طغی“ کہ فرعون طاغی سے مراد سخت ہوا دل ہے اور واعظ لوگ ایسی باتیں بہت کہتے ہیں، ایسی تفسیر بالرائے صحیح غرض کے لیے بھی منع ہے۔“

قرآن مجید کی تفہیم اور اس کے منابع کا اجمالی تذکرہ یہ واضح کر دیتا ہے کہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا علما کے تفسیری منہاج کو محض لغت عرب اور عربوں میں مستعمل الفاظ کے معروف معنوں میں منحصر کر دینا ٹھیک نہیں۔ علما کے نزدیک بلاشبہ لغت اور عرب معاشرت میں مستعمل الفاظ تفہیم قرآنی کا ایک اہم سبب ہے لیکن فہم و تفسیر قرآنی کو محض لغت اور عرب معاشرت میں استعمال ہونے والے الفاظ میں منحصر اور محدود کر دینا علما کے نزدیک ٹھیک نہیں۔

## دینی الفاظ کی تفہیم پر معاشرتی ارتقا اور علمی ترقی کا اثر

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”وہ سارے مسائل جن کا احاطہ نیاز نے اپنی کتاب ”من ویزداں“ میں کیا ہے، اب سے چودہ سو سال پہلے کے عربوں نے ان کو جس طرح سمجھا وہ نہ تھے جو نیاز سمجھتے تھے اور یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ الفاظ کی تفہیم کوئی جامد عمل نہیں بلکہ علم و معرفت کی ترقی کے ساتھ وہ نئے مفہیم اختیار کر لیتے ہیں۔“

صحابہ و تابعین نے قرآن مجید کو علم و تزکیے کے ساتھ سیکھا:

نیاز فتح پوری اور ڈاکٹر منظور احمد دونوں اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہیں کہ ”چودہ سو سال پہلے کے عربوں“ [یعنی حضرات صحابہ کرام و اہل بیت عظام اور تابعین رضی اللہ عنہم] نے کتاب اللہ کو محض اپنی عقلیت و عربیت کی بنیاد پر نہیں سمجھا تھا، بلکہ خود قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ و ارشاد کی روشنی میں ظاہر و باطن کے تزکیے و تصفیے اور معنی و صورت کی یک جائی و یک رنگی کے ساتھ سمجھا تھا۔

۱- ”اب سے چودہ سو سال پہلے کے عرب“ اخلاقی طور پر انتہائی تضحیک و توہین آمیز جملہ ہے۔ جب مسلمان اصطلاح ”خیر القرون“ استعمال کرتے ہیں تو اس عہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے افراد، آپ کے صحبت یافتگان، آپ سے علم و حکمت کی باتیں سیکھنے والوں اور نفوس کا تزکیہ کرنے والوں کو صرف ”عرب“ نہیں کہا جاتا، بلکہ انھیں ”صحابہ کرام“ جیسی متبرک اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے۔ جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طوبیٰ لمن رانی و آمن بی [احمد بن حنبل، مسند احمد، مسند ابی الخضر، جلد ۳، صفحہ ۱۷۱] کی نوید سنائی اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جماعت صحابہ کو ”امام“ قرار دیا، جن کی لوگ اتباع و تقلید کریں گے: انکم ایہا الرہط ائمة یقتدی بکم الناس [مالک بن انس، المؤطا للامام مالک، کتاب الحج، باب لبس الثیاب المصبغة فی الاحرام، صفحہ ۳۳۲] صحابہ کے مرتبے، مقام، فضائل اور علم و تقویٰ کو نظر انداز کر کے انھیں محض ”چودہ سو سال پہلے کے عرب“ جیسے الفاظ سے خطاب کرنا انتہائی قابل افسوس ہے۔

۲- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۶۹۔

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۳۰۳

سنت نبوی اور تعامل امت: فہم قرآنی کا حتمی ماخذ:

ڈاکٹر منظور احمد لکھتے ہیں: ”الفاظ کی تفہیم کوئی جامد عمل نہیں بلکہ علم و معرفت میں ترقی کے ساتھ وہ نئے مفہیم اختیار کر لیتے ہیں“ — یہ بات اپنی جگہ درست اور مبنی بر حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان کے محاورے، ضرب الامثال اور الفاظ کے استعمال کے دائرے، وقت کے ساتھ تنوع اور تغیر کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ مگر کلام اللہ کو سمجھنے کے لیے سب سے اہم ضرورت متکلم کی منشا سے واقفیت ہے۔ لغت کچھ کہے، شعریات کسی لفظ کے کوئی معنی بیان کریں، ادب جاہلی کسی حرف کی کوئی توجیہ کرے لیکن اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی لفظ یا اصطلاح کے معنی اپنے قول، فعل یا تائید و تصویب سے متعین فرمادیے ہیں تو اس کے بعد لغت، زبان، ادبیات اور شعریات کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہے گی۔ کیوں کہ قرآن صرف لغت سے سمجھی جانے والی کتاب نہیں، اس کا فہم شارع متعین کریں گے اور جہاں شارع کی رائے کا علم نہ ہو وہاں صحابہ، صلحائے امت، فقہائے عابدین شارع کے متعین کردہ اصولوں اور طے شدہ مفہیم کی روشنی میں سنت و حدیث کے ذریعے ان مقامات کا فہم بیان کریں گے۔ لغت و ادب کا درجہ یہاں بھی ثانوی ہوگا۔ اس لیے کلام اللہ کے فہم میں اصل دار و مدار و اعتبار لغت عرب پر نہیں منشاے متکلم پر رہے گا۔

رسول اللہ دینی مرادات کی تفہیم کا حتمی و دائمی ماخذ نہیں: جدیدیت پسندوں کا المیہ:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”زبان سے مراد ایک تو الفاظ، محاورے، جملوں کی تشکیل ہے، جو کوئی زبان استعمال کرتی ہے، لیکن زبان دوسرے معنوں میں ایک حقیقت کی عکاس ہوتی ہے۔ جب ہم سائنسی زبان کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد محض سائنس میں استعمال ہونے والے الفاظ سے نہیں ہوتی بلکہ اس سائنسی نظام سے ہوتی ہے جس کی بنیاد پر کوئی سائنسی مفروضہ درست یا نادرست ثابت ہو سکتا ہے“۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان بالکل ٹھیک ہے، اسی اصول پر عرض ہے کہ جب ہم ”دینی زبان“ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد محض مذہب میں استعمال ہونے والے الفاظ سے نہیں ہوتی بلکہ اس دینی نظام سے ہوتی ہے جس کی بنیاد پر کوئی دینی مقدمہ درست یا نادرست ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو مختلف آرا میں اپنی مراد و منشا بتلانے کے لیے ہمارے پاس نہیں آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول [صلی اللہ علیہ وسلم] کے اسوہ و ارشاد کو انسانوں کے لیے معیار اور نمونہ بنا دیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی منشا و مراد اس سے باہر ہے ہی نہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیں یا جس پر عمل کریں اور امت کا تعامل جس پر چلا آ رہا ہو وہی افعال و اعمال نگاہ شارع میں مقبول و منظور ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی العارف، صفحہ ۶۷۔

علیہ وسلم اس دینی نظام کی تفہیم و تعبیر کے واحد مستند نمائندے ہیں اور ان ہی کا بیان فرمودہ طریق حتمی ہے جس کی تعبیر اس سے مطابقت رکھے گی وہ درست قرار پائے گی۔ روایتی کلاسیکی علما و فقہا کا نیاز فتح پوری اور سرسید احمد خاں اور اس قبیل کے دیگر جدیدیت پسندوں سے اختلاف اسی وجہ سے تو ہے کہ یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا پیغمبر ماننے کے باوجود دینی مرادات کی راست تعبیر و تفہیم میں آپ کے اسوہ و ارشادات کو آخری سند [final authority] تسلیم نہیں کرتے۔

اعتقادات، عبادات اور معاملات: بعد زمانی اور ارتقا سے ماورا امور:

اسلام اعتقادات، عبادات اور معاملات کے مجموعے کا نام ہے جس کی تفصیل قرآن و سنت میں موجود ہے۔ کیا بعد زمانی اور بہ قول ڈاکٹر منظور احمد: ”علم و معرفت میں ترقی“ کے ساتھ وہ نئے مفہیم اختیار کر سکتے ہیں؟ کیا توحید، رسالت، معاد اور وحی و قرآن حالات کی تبدیلی کے باعث نئے مفہیم اختیار کر لیں گے؟ کیا عبادات کا تصور تبدیل ہو جائے گا؟ کیا معاملات و اخلاقیات کی تعلیمات بدل جائیں گی؟ قرآن مجید کسی انسان کا کلام نہیں، کلام اللہ ہے جو بہ ذریعہ وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اس لیے اس کی سند پر متعین ہونے والے اعتقادات و احکام کسی ایسی حرکت و تغیر کو قبول نہیں کرتے جس سے اس کی نسبت مخدوش ہو جائے اور دلالت تبدیل، اس لیے یہ غیر زمانی و مکانی ہے۔ ایسی آفاقی صداقت ہے جو ناقابل تغیر و تبدیل ہے اور یہی اس کا وصفِ اعجاز ہے کہ زمانی بعد اور فہم انسانی کے تدریجی تغیر کے باوصف اس کے صورت و معنی یا تصور و تصدیق یا ایمان و عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک انسانی فکر اس حوالے سے یکساں اصولوں پر استوار رہی ہے۔ ورنہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کے عہد میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے توحید، رسالت اور معاد کے علاوہ کسی اور عقیدے کی تعلیم دی تھی حالاں کہ یہ ایک لغوبات ہے، قرآن کا اعلان ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ

إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا [۱۳:۴۲]

”اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی ”دین“ مقرر کیا، جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا، اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعے بھیجا اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو [مع ان سب کے اتباع کے] حکم دیا تھا کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔“

حضرت امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ [م ۶۰۶ھ] لکھتے ہیں:

فيجب أن يكون المراد منه الأمور التي لا تختلف باختلاف الشرائع، وهي الإيمان بالله و ملائكته و كتبه و رسله و اليوم الآخر، و الإيمان

یوجب الإعراض عن الدنيا والإقبال على الآخرة والسعي في مكارم الأخلاق والاحتراز عن رذائل الأحوال<sup>۱</sup>

”الدین — سے مراد وہ امور ہیں جو شریعتوں کے اختلاف سے نہیں بدلتے اور وہ یہ ہیں: اللہ اور اس کے فرشتوں پر ایمان، اس کی کتابوں، پیغمبروں اور قیامت پر ایمان لانا اور ایمان دنیا سے اعراض کرنے اور آخرت کی طرف متوجہ ہونے اور اچھے اخلاق کی کوشش اور برے احوال سے بچنے کا نام ہے۔“

سیرت رسول: قرآن کے مفاہیم تک رسائی کا لازمی ذریعہ: منظور احمد:

سطور بالا میں یہ بات لکھی گئی ہے کہ مراد و منشائے الہی کو اگر کوئی متعین کر سکتا ہے تو وہ ذات رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد بھی یہی بات ذرا بدلے ہوئے انداز میں یوں لکھتے ہیں:

”پیغام رسالت کے اصل معنی اس رشتے میں ملتے ہیں جو کتاب اور صاحب کتاب کے مابین ہے۔ سیرت رسول، پیغام رسول کے معنی میں ہے اور اس کے بغیر قرآن کے الہامی مفاہیم تک رسائی نہیں ہو سکتی۔“

اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ”صاحب کتاب“ کہنا محل نظر ہے۔ اس سے قرآن مجید کے کلام الہی ہونے کے انکار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، نعوذ باللہ، ”مصنف قرآن“ ہونے کا تاثر ملتا ہے، مگر یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اعمال و ارشادات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کتاب اللہ کے ”الہامی مفاہیم“ تک رسائی کا سب سے راست، محکم اور حتمی ماخذ ہے۔

سیرت رسول عملاً نہیں الفاظ کی صورت میں محفوظ ہے:

آج سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوۂ مبارک عملاً ہمارے سامنے موجود نہیں ہے بلکہ بعینہ کلام اللہ کی طرح ”الفاظ“ کی صورت میں محفوظ و مدون ہے۔ جس طرح مفاہیم قرآن تک رسائی کے لیے اسوہ و ارشاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ضروری ہے، جو کہ الفاظ ہی میں مقید و محفوظ ہے، اسی طرح الفاظ قرآن سے قطع نظر کر کے مسلمان کا کتاب اللہ سے ربط و تعلق استوار نہیں رہ سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

إني قد تركت فيكم شيئين لن تضلوا بعدهما: كتاب الله، وسنتي، ولن يتفرقا حتى يردا علي الحوض<sup>۲</sup>

۱- فخر الدین الرازی، مفاتیح الغیب أو التفسیر الكبير، بیروت: دار الفکر، ۱۴۰۱ھ، سورة الشوری، الآیات ۱۳-۱۹، جلد ۲، صفحہ ۱۵۷۔

۲- منظور احمد، ”ثبات، تغیر اور نشاۃ ثانیہ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحات ۲۱۱-۲۱۲۔

۳- عبداللہ حاکم نیشاپوری، المستدرک علی الصحیحین، کتاب العلم، جلد ۱، صفحہ ۱۶۱۔



دینی الفاظ کی تفہیم پر معاشرتی ارتقا اور علمی ترقی کا اثر

”بے شک میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جن کے بعد تم ہرگز گم راہ نہ ہو گے کتاب اللہ اور میری سنت۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ دونوں حوض کوثر پر میرے پاس آ جائیں۔“

کتاب اللہ اور اسوہ و ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم دونوں ہمارے پاس ”مجموعۃ الفاظ“ ہی کی شکل میں ہیں، اس لیے قرآن پاک کے الہامی مفہیم تک رسائی کا ذریعہ ”الفاظ“ ہی ہیں خواہ وہ الفاظ کتاب اللہ کے ہوں یا اسوہ و ارشادات رسول کے۔

سیرت رسول کو حتمی ماخذ ماننے کے باوجود اس سے اختلاف: منظور احمد:

ایک طرف ڈاکٹر منظور احمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر قرآن مجید کے الہامی مفہیم تک رسائی کو غیر ممکن بتلا رہے ہیں۔ دوسری طرف ڈارون کی Theory of Evolution کا دفاع کرتے ہوئے مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ پر یوں نقد فرماتے ہیں:

”مذہب اسلام میں مولویوں کا ایک گروہ حیاتی ارتقا کا قائل نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت آدم کی جسمانی تخلیق سے متعلق احادیث نظریہ ارتقا کی نفی کرتی ہیں۔“

ایک جگہ مزید لکھتے ہیں:

”[سنت] دین کی تفہیم کا ایک بہت اہم اور مقبول نظام ہے لیکن یہ دعویٰ کہ یہ واحد نظام ہے اور اس کا متبادل ممکن نہیں ہے، قرین قیاس نہیں۔“

سر دست اس سے بحث نہیں کہ نظریہ ارتقا کیا ہے؟ اور خود مغرب میں اس پر کیا نقد ہو چکا ہے اور منظور احمد صاحب اس سے واقف ہیں یا نہیں۔ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ علوم و معارف کی نام نہاد ترقی کے بل پر اور مفہیم کی تبدیلی کی دہائی دیتے ہوئے ایک طرف الفاظ قرآن سے جان چھڑانے کی کوشش کرنا، دوسری طرف سنت نبوی کو مطالب و تفہیم قرآن کا ذریعہ قرار دینے کے باوجود واحد، غیر متبادل نظام تسلیم کرنے سے انکار اور مغربی فکر کے معیارات پر قرآن کو ”سمجھنا“ اور اسے علم تفسیر کے لیے ”نتیجہ خیز“

۱- منظور احمد، ”روایت، جدیدیت اور لسانیات“، مشمولہ ماہ نامہ صریح، صفحہ ۷۱۔

۲- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ ماہی المعارف، صفحہ ۹۲۔

۳- جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فإن خیر الحدیث کتاب اللہ. وخیر الہدی ہدی محمد صلی اللہ

علیہ وسلم. [مسلم بن حجاج القشیری، صحیح المسلم، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبۃ، جلد ۱، صفحات ۲۸۵-۲۸۶] ”بہترین بیان اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سب سے اچھا طریقہ، طریق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔“

سیدنا انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: فمن رغب عن سنتی فلیس منی.

[محمد بن اسمعیل بخاری، صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح، جلد ۲، صفحات ۷۵۷-۷۵۸۔]

”جو شخص میری سنت سے منھ موڑے وہ مجھ سے نہیں ہے۔“

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۷۰

قرار دینا صورت حال کو واضح کر دیتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک وحی اور اس سے ثابت شدہ حقائق اسی وقت معتبر ہوں گے جب وہ عقلی و سائنسی اصولوں کے مطابق ہوں۔ حالاں کہ عقل زمان و مکان اور تاریخ و تہذیب و ثقافت میں محصور و محدود ہوتی ہے جب کہ وحی اور اس کی اساس پر تشکیل پانے والا علم اور اس کے سائے میں پروان چڑھنے والی شخصیت ان حدود سے ماورا ہوتی ہے اسی لیے وہاں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسا شخص جو صحابہ میں اپنے علم و فضل کے اعتبار سے سب سے افضل ہیں ان سے منقول ہے:

”ای أرض تقلني؟ وأي سماء تظلني؟ إذا قلت في كتاب الله ما لا أعلم.  
”مجھے کون سی زمین اٹھائے گی؟ اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ فلگن ہوگا؟ اگر میں کتاب اللہ کے بارے میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں۔“

بعد زمانی سے الفاظ کی تفہیم: قرآن اور انجیل سے متعلق منظور احمد کے دو علیحدہ موقف:

منظور احمد لکھتے ہیں:

”الفاظ کی تفہیم کوئی جامد عمل نہیں بلکہ علم و معرفت کی ترقی کے ساتھ وہ نئے مفہیم اختیار کر لیتے ہیں۔“

اسی بات کو ذرا بدلے ہوئے انداز میں ایک اور جگہ یوں لکھتے ہیں:

”کسی پیغام اور الفاظ کے کسی مجموعے کو محفوظ کر کے آگے پہنچا دینے سے ان کے معنی آگے نہیں پہنچتے۔ الفاظ معنوں کے بوجھ سے لمبی مسافت طے کرتے ہوئے شکست و ریخت کا شکار ہو جاتے ہیں اور وہ اس مفہوم تک انسان کو نہیں پہنچاتے جو صاحب لفظ کا منشا ہوتے ہیں۔“

”اگر منظور احمد کی اس بات کو مان لیا جائے کہ کسی بھی مذہبی صحیفے کے الفاظ بعد زمانی کے بڑھنے سے معنوں کے بوجھ تلے لمبی مسافت طے کرتے ہوئے شکست و ریخت کا شکار ہو جانے کی وجہ سے اس مفہوم کو انسانوں تک نہیں پہنچا سکتے جو صاحب لفظ کا منشا تھا تو پھر عہد نامہ عتیق بھی تو الفاظ ہی کا مجموعہ ہے۔ ان الفاظ کے معانی کا بھی بعد زمانی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بدلنا لازمی ہے۔ ان الفاظ کا بھی معنوں کے بوجھ تلے ایک بہت طول طویل مسافت طے کرتے ہوئے شکست و ریخت کا شکار ہونا

= امام شافعی کا قول ہے: أجمع المسلمون على أن من استبانت له سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم؛ لم يكن له أن يدعها لقول أحد، من الناس. [ابن القيم الجوزية، اعلام الموقعين عن رب العالمين، خطبة الكتاب، ليس المتعصب من العلماء، جلد ۲، صفحہ ۱۱۔] ”مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب کسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت واضح ہو جائے تو پھر اس کے لیے کسی قول کی وجہ سے اس کو چھوڑنا جائز نہیں۔“

اسی لیے حضرت شاہ ولی اللہ، [م ۶، ۱۱ھ] کا ارشاد ہے: أقول: انتظام الدين يتوقف على اتباع سنن النبي. [شاہ ولی اللہ، حجتہ اللہ البالغہ، جلد ۱، صفحہ ۳۸۵۔] ”میں کہتا ہوں کہ دین کا انتظام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے اتباع پر موقوف ہے۔“

۱- ابی الفداء اسمعیل ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، الرياض: دار طیبیہ، ۱۳۲۰ھ/۱۹۹۹ء، مقدمہ ابن کثیر، جلد ۱، صفحہ ۱۱۔  
۲- منظور احمد، ”ثبات، تغیر اور نشاۃ ثانیہ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۲۱۲۔

لازمی ہے۔ لہذا ان الفاظ کے ذریعے بھی اس مفہوم تک رسائی ناممکن ہونی چاہیے جو صاحب الفاظ کا منشا تھا۔ اگر ایسا ہے تو منظور احمد خدا اور حضرت نوح علیہ السلام یا خدا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان ہونے والے مکالمے کے الفاظ عہد نامہ عتیق کی کتابوں سے نقل کرتے ہوئے یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ ”تکوین“ اور ”خروج“ کے ان الفاظ پر سینکڑوں سال کی نہیں، ہزاروں سال کی گرد پڑ چکی ہے۔ لہذا اتنے بڑے بعد زمانی کے بعد ان کے معنی کا بدل جانا بہ درجہ اولیٰ لازمی ہے۔ اسی طرح خدا کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہونا ڈاکٹر صاحب نے ”خروج“ کے جن الفاظ سے نقل کیا ہے اور ان تمام باتوں سے جو نتائج نکالے ہیں ان نتائج کا اظہار بھی تو ”تکوین“ اور ”خروج“ کے الفاظ پر ہی ہے اور خدا کے تصور کے تاریخی ارتقا کو انہوں نے عہد نامہ عتیق کے جن الفاظ سے اخذ کیا ہے وہ الفاظ بھی تو شروع سے لے کر آخر تک اپنے معنی و مفہوم کو بدلے بغیر ڈاکٹر صاحب تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے معانی و مفہوم کا بھی امتدادِ زمانہ کے ساتھ بدل کر کچھ سے کچھ ہو جانا لازمی ہے۔ حتیٰ کہ موسیٰ بن میمون کے حوالے سے جو کچھ انہوں نے خدا اور اس کی ذات کے بارے میں لکھا ہے اس کے مطالب کا انحصار بھی تو اس کی کتاب ”دلالت الحائرین“ کے الفاظ ہی پر ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو الفاظ و معنی کے بدلتے ہوئے رشتے قرآن میں تو نظر آتے ہیں، لیکن خروج اور تکوین سمیت عہد نامہ عتیق کی کتب محرفہ سے لے کر ”دلالت الحائرین“ تک کسی کتاب میں نظر نہیں آتے۔ ڈاکٹر صاحب اس کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے عہد نامہ عتیق وغیرہ کے الفاظ سے جو معانی و مطالب اخذ کیے ہیں وہ ان اصل الفاظ کا اصل الہامی مفہوم نہیں بلکہ یہ وہ بدلا ہوا مفہوم ہے جو عہد عتیق سے لے کر آج تک بدلتے ہوئے وقت اور انسانی فہم میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ اپنی بدلی ہوئی صورت میں ان تک پہنچا ہے۔ لیکن اس صورت میں سوال یہ ہوگا کہ جب وہ بعد زمانی کے بڑھنے سے الفاظ کے بدلتے ہوئے معنوں کے پیش نظر قرآنی الفاظ کے اصل الہامی مفہوم کو قرآنی الفاظ کی بجائے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے سمجھنے پر زور دیتے ہیں، تو عہد نامہ عتیق کے الفاظ کے اصل الہامی مطالب کو بھی ان کے بدلے ہوئے مفہوم و معانی کی بجائے حضرت نوح، حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کی سیرتوں کے حوالے سے سمجھنا کیوں ضروری نہیں سمجھتے؟ یہ صورت دیگر اگر وہ یہ فرمائیں کہ انہوں نے عہد نامہ عتیق اور اس کی کتابوں کے الفاظ سے جو معانی و مفہوم مراد لیا ہے وہی ان الفاظ کا اصل الہامی مفہوم بھی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ انہیں قرآنی الفاظ کے اصل الہامی مفہوم کو خود قرآن ہی کے الفاظ سے اخذ کرنے میں کیا قباحت نظر آتی ہے؟ جب کہ نہ تو قرآن عہد نامہ عتیق کی کتابوں کی طرح، نعوذ باللہ، کوئی کتاب محرفہ ہے اور نہ ہی ان تحریف شدہ کتابوں کی طرح اس کے الفاظ کسی بھی قسم کی ترمیم یا تبدیلی کے عمل سے گزرے ہیں۔“

۱۔ جمال پانی پتی، ”ڈاکٹر منظور احمد کا اسلام“ مضمون ”مکالمہ“ کراچی: اکادمی بازیافت، شمارہ ۳ جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۲ء، صفحات ۳۹۹-۴۰۰۔

علم تفسیر اور ہرمیڈیات: دو متضاد مابعد الطبیعیات سے ماخوذ تصورات علم:

ڈاکٹر منظور احمد کلام خالق اور مخلوق میں فرق کو نظر انداز کر کے فلسفے میں موجود علمی رویے hermeneutics اور لسانیاتی فلسفے کے مباحث و نتائج پر اپنے مقدمے کی بنیاد اٹھاتے ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ hermeneutics کے اصول اور اسلامی علم تفسیر کے اصول اپنی بنیاد سے اطلاق تک یک سر مختلف ہیں۔ لغت ایک قسم کی زبان بولنے والے افراد استعمال کرتے ہیں، اگر کسی لسانی گروہ کی مذہبی مابعد الطبیعیات یا عقلی و دینی شناختیں الگ ہو جائیں تو الفاظ اور اس کے استعمال کے طریقے بھی الگ ہو جائیں گے لیکن اس اصول کا اطلاق مذہبی اصطلاحات یا دینی زبان پر نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہ ایک متعین ذریعہ علم سے اخذ کیے گئے ہیں اور جس کا خالق کامل ہے۔ کلام اللہ کی تفسیر کے اصول، کلام کے شارح، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جنہیں خدا کی جانب سے عصمتِ فکر و عمل حاصل تھی، سے عطا ہوئے ہیں۔ اس کے بالمقابل hermeneutics کے اصول یونانی اساطیر اور ملحد و زندیق فلاسفہ کے ارتقائی سفر کے نتیجے میں اخذ و ترتیب پائے ہیں۔ ایک کلیۃً نقل کا دائرہ ہے دوسرا خالص عقل کا۔ دو مختلف اور متضاد مناجح علمی میں فلسفیانہ تقابل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تقابل اور موازنے کی بنیادی شرط متقابل اصول، افکار یا علوم کی مابعد الطبیعی اساسیات کا مشترک ہونا ہے۔

قرآن: لغت پر منحصر کتاب نہیں:

لغت کی سطح پر تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ: ”الفاظ کی تفہیم کوئی جامد عمل نہیں بلکہ علم و معرفت کی ترقی کے ساتھ وہ نئے مفاہیم اختیار کرنے چلے جاتے ہیں“ دیگر زبانوں کی طرح عربی زبان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ متر و کات کے مطالعے کے دوران الفاظ کے ارتقا کے بے شمار آثار و شواہد ملتے ہیں۔ خود قرآن مجید کی زبان اور جدید عربی میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن قرآن مجید کے ضمن اور سیاق میں ڈاکٹر منظور احمد کا یہ بیان اس لیے محل نظر ہے کہ قرآن مجید کی تفہیم و تفسیر کا انحصار صرف لغت عرب پر نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس بات کا جواب دیں کہ خدائے ہی و قیوم جو اس وقت بھی موجود ہے، جس کا کلام اب تک محفوظ ہے، جس کی حفاظت کا ذمہ اس نے خود لیا ہے، لفظ کا بھی اور معنی کا بھی۔ ایک کی نگرانی اللہ تعالیٰ براہ راست کرتا ہے اور دوسرے کی حفاظت تکوینی طور پر پیغمبر کی سنت، تعامل صحابہؓ، اجماع اور تسلسل امت کے ذریعے قیامت تک ممکن بنا دی گئی ہے۔ تو کیا ان تمام اسباب و انتظام کے باوجود کلام اللہ کے الفاظ زمانے کے تغیر و تبدل کا شکار ہو سکتے ہیں؟ اگر ڈاکٹر صاحب یہ عقیدہ رکھتے ہیں تو انھیں اپنے عقیدے کا اصول اور ماخذ بتانا ہوگا اور اگر یہ عقیدہ نہیں رکھتے تو یہ گفتگو منطقی طور پر خود یہاں ختم ہو جاتی ہے۔

الفاظ کے ارتقا اور نئے مفاہیم کے ادراک کا ماخذ:

خود یہ تصور کہ الفاظ، انسانی علوم و معرفت میں ترقی کے ساتھ نئے مفاہیم اختیار کر لیتے ہیں۔ اسلام کو سائنسی اصولوں پر پرکھنے کا منطقی نتیجہ کہ کوئی چیز بھی حتمی و قطعی نوعیت کی نہیں بلکہ عارضی نوعیت کی

ہے۔ اس میں ارتقا [progress] کا عمل اور تغیر کا امکان جاری رہتا ہے۔ انسان کا اجتماعی ذہن فکری اعتبار سے اپنے عہد طفولیت سے گزرتا ہوا اور ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف، کہتر سے بہتر کی طرف اور فروتر سے برتر کی طرف رواں دواں ہے جس میں روز بہ روز ترقی کا عمل جاری ہے۔ یہ فکر Hegel کے فلسفے سے ماخوذ و مستعار ہے۔ تاریخ کے جدلیاتی نظریے کے مطابق Hegel یہ سمجھتا ہے کہ عقل کے بہ حیثیت مجموعی ارتقا پذیر ہونے اور تاریخ کے آگے بڑھنے سے آنے والا دور پہلے سے بہتر اور اس کے پیمانے عہد گزشتہ کے مقابلے میں فائق حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ہر آنے والے دور میں ذات مطلق اپنی تخلیق اور تکمیل کے اگلے اور برتر مرحلے میں داخل ہو چکی ہوتی ہے۔ Thesis اور Anti Thesis کے نتیجے میں Synthesis برآمد ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے تاریخ کا پہیہ رواں دواں رہتا ہے۔ Anti Thesis کے نتیجے میں پتہ چل جاتا ہے کہ گزشتہ زمانے کا سچ اب سچ نہیں رہا، اس ”سچ“ کی خامیاں، کمزوریاں اور عیوب، اگلے دور میں واضح ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کے اس ارتقا کے نتیجے میں نہ صرف عقل اور ذہن ارتقا پذیر ہوتے ہیں بلکہ نئے نئے ادارے، نوبہ نو ایجادات اور جدید طریقے وجود میں آتے ہیں، انسان مستقل ارتقا کی جانب رواں دواں رہتا ہے اور مسلسل فتوحات کے گھوڑے دوڑاتا چلا جاتا ہے۔ گویا عقلیت اشخاص کے ذریعے World spirit روح کائنات کا اظہار کرتی ہے۔ اسی کا نام Progress اور Development ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے یہ ایک گم راہ کن تصور ہے اس کے نتیجے میں روئے زمین پر انبیائے کرام کے تمام ادوار اور مسلمانوں کے یہاں ”خیر القرون“ کا تصور سب احقمانہ اور لایعنی معلوم ہوتا ہے۔ عہد حاضر کا انسان چوں کہ تمام سابقہ زمانوں سے بہتر، اعلیٰ اور ارفع ہے لہذا تمام جدید انسان انبیائے کرام سے بہتر، زیادہ بالغ النظر، عقل مند اور سمجھ دار ہو جاتے ہیں [نعوذ باللہ]۔

دینی تناظر میں علم و معرفت کی ترقی کا اصول: مضمرات و اثرات:

غور فرمایا جائے کہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب دینی سیاق میں علم و معرفت کی ترقی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تغیر سے مفاہیم میں تبدیلی کی بات فرما رہے ہیں۔ یہ بیان اپنی جگہ خود محل نظر ہے کہ یہ دور علم و معرفت کی ترقی کا دور ہے۔ اور اس عہد کا انسان [Modern Man] تاریخ انسانی کا سب سے عقلیت پسند [rational] انسان ہے؟ نو کو یا ما کی کتاب Trust: The Social Virtues and Creation of Prosperity کے مطابق عہد حاضر کا انسان اعتماد پر چلتا ہے، یہ اعتماد brand پر ہوتا ہے۔ مارکیٹ کی قوتیں اس برانڈ کی ضمانت ہوتی ہیں جب کہ فی الحقیقت سب ضمانتیں جعلی ہیں۔ اس بحث سے قطع نظر اس طرز فکر کا یہ کس قدر خطرناک اور مہلک نتیجہ ہے کہ اسلام کا قرن اول [جس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں۔ حضرات صحابہؓ و تابعینؓ ہیں] قلیل العلم اور ترقی و معرفت سے محروم قرار پاتا ہے۔ اور جوں جوں زمانہ قرن نبوت سے دور ہوتا گیا، مادی آسائشوں کا

دینی الفاظ کی تفہیم پر معاشرتی ارتقا اور علمی ترقی کا اثر

دور دورہ ہوا، تمدنی ترقیات اور سائنسی اکتشافات، جن کا سرچشمہ عقلِ معاش اور خالص مادیت ہے، کا طوفان اٹھ آیا تو گویا ڈاکٹر صاحب کے فرمانے کے مطابق علم و معرفت میں ترقی ہوئی اور عہدِ نبوت سے دور ہونا، نعوذ باللہ، باعثِ رحمت ہوا یعنی جس عہد کو لسانِ نبوت نے خیر القرون قرار دیا وہ اپنی عدم ایجادات اور مادی ترقی نہ کرنے کے باعث، بہ لحاظ علم و معرفت ”شر القرون“ بن گیا۔ حالاں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

خیر الناس قرنی ثم الذین یلو نھم ثم الذین یلونھم۔  
”سب سے بہتر لوگ میرے زمانے کے ہیں، پھر جو ان سے متصل ہوں، پھر وہ جو ان سے متصل ہوں۔“

قرونِ ثلاثہ کو ”خیر القرون“ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس وقت آخرت ہر رویے پر غالب، فائق اور حاکم تھی۔ دنیا سب سے حقیر شے تھی، اللہ تعالیٰ کی رضا اور معرفتِ الہی حاصل زندگی اور مقصدِ بندگی تھا۔ دنیا سے تمتع کم سے کم تھا، کوئی انسان، ترقی، دنیا طلبی، لذات و آسائش کی تلاش میں سرگرداں نہیں تھا، فکر کی خود اختیار کردہ زندگی معیار اور باعثِ فضیلت تھی۔ اس کا بنیادی وصف مصائب پر صبر اور اللہ تعالیٰ سے بہترین مستقبل کی امید تھی۔ تمام صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کو حرزِ جاں اور زندگی کا نصب العین بنائے ہوئے تھے:

ما من مسلم تصیبه مصیبة فیقول: ما أمرہ اللہ: إنا لله وإنا الیہ راجعون۔  
اللہم! أجرنی فی مصیبتی وأخلف لی خیراً منها! لا أخلف اللہ لہ خیراً منها۔<sup>۱</sup>

۱- محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح البخاری، باب فضل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد ۱، صفحہ ۵۱۵۔

۲- مسلم بن حجاج القشیری، صحیح المسلم، کتاب الجنائز، فصل فی الاسترجاع عند المصائب الخ، جلد ۱، صفحات ۳۰۰۔

## قوانین اسلامی — اقدار اور اطلاق دونوں ابدی و دائمی

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”عملاً اگرچہ نیاز اور سرسید دونوں یہ تسلیم کرتے تھے کہ جو بنیادی اصول مذاہب عام طور پر اور اسلام خصوصاً فراہم کرتا ہے، وہ دائمی اور ابدی ہیں لیکن اقدار کا اطلاق مختلف زمانی و مکانی ادوار میں ایک ہی طرز پر نہیں ہو سکتا۔ چوری روکنے کے لیے ممکن ہے پھانسی کی سزا ضروری ہو۔ لیکن دوسرے زمانے میں ملزم کی نفسیاتی اصلاح سے چوری روکنا ممکن ہو سکتا ہے۔ ان قوانین میں جو شے مستقل ہے وہ قدر ہے جس کی حفاظت قانون کرتا ہے اگر کسی قدر کی حفاظت دوسرے قانون سے ممکن ہو سکتی ہے تو اس کو بلا خوف تردد استعمال کیا جاسکتا ہے“۔<sup>۱</sup>

قانون اور اس کی روح — ڈاکٹر منظور احمد کے خیال میں یہ دو الگ الگ دائرے ہیں۔

ایک دائرہ دائمی اور ابدی ہے اور دوسرا زمانی و مکانی۔ ڈاکٹر صاحب کے افکار یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کو اصل مطلوب ”روح“ ہے ڈھانچہ نہیں۔ بنیادی سوال یہی ہے کہ فی الاصل اسلام کو مطلوب ہے کیا؟ اس مطلوب کی نشان دہی کون کرے گا؟ سرسید یا نیاز فتح پوری؟ کیا اس مطلوب کا تعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ و ارشاد، صحابہ کرام، تابعین و تبع تابعین، ائمہ مجتہدین اور تعامل امت کے ذریعے ہوگا؟ کیا تمام دینی، علمی، تاریخی اور روحانی اجتماعیتوں کو نظر انداز کر کے ہنوات نیاز اور افکار سرسید پر پورے علمی منہاج کو منحصر کر دینا علمی طور پر خود غیر علمی اور فلسفیانہ طور پر غیر فلسفیانہ طریقہ نہیں ہے؟

قوانین کے عالم گیر نہ ہونے پر اصرار: مغربی نظریہ ارتقا کا چرہ بہ:

شرعی قوانین و احکام کی عدم حمیت و ابدیت پر یقین رکھنا اور انہیں بھی معاشرتی و سماجی حیثیت سے ثقافت کی پیداوار سمجھتے ہوئے زمانی و مکانی قیود و تحدیدات کا پابند جاننا دراصل مغرب سے مستعار اس نظریے کا داعی ہے کہ قانون کا زیادہ تر تعلق زمان و مکان کے مخصوص احوال و ظروف سے ہے اور اسے

۱۔ منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مضمون سہ ماہی المعارف، صفحات ۶۹-۷۰۔

اپنے معاشرے کی ضروریات کا ضامن اور کفیل ہونا چاہیے۔ چوں کہ ضروریات، تقاضوں اور ثقافت میں بہ لحاظ زمان و مکان تبدیلی آ جاتی ہے، اس لیے قانون کو بھی تبدیل ہوتے رہنا چاہیے، لہذا قانون کے لیے آفاقی و کائناتی بنیاد فراہم کرنا کارِ عبث ہے۔ یہ بھی وہی ارتقائی نقطہ نظر ہے جس کی رو سے ماضی ہمیشہ اور ہر حال میں ناقص ہوتا ہے۔ Köhler کہتا ہے:

There is no eternal law. The law that is suitable for one period is not so for another: we can only strive to provide every culture with its corresponding system of law. What is good for one would mean ruin to another.<sup>1</sup>

”قانون کو ہرگز کوئی ازلی و ابدی یا دوامی حیثیت نہیں دی جاسکتی، اگر کوئی قانون ایک زمانے یا عہد کے لیے موزوں ہے تو وہ ہرگز کسی دوسرے عہد کے لیے یکساں طور پر موزوں نہیں ہو سکتا۔ ہم صرف اس بات کی سعی کر سکتے ہیں کہ ہر طرز ثقافت کو مختلف ادوار و مقامات پر ایک مناسب حال اور موزوں تر قانون بنا کر دیں، کوئی چیز اگر ایک حالت کے لیے مفید ہوگی تو دوسری صورت کے لیے تباہ کن اور مہلک بھی ہو سکتی ہے۔“

اسلامی فلسفہ احکام: ذات انسانی کی طرح قوانین بھی دائمی:

ظاہر ہے یہ فکر اپنی ہر جہت سے اسلامی تصورِ قانون اور فلسفہ احکام سے متغایر ہے۔ تغیر کا بہت شور اور غلغلہ ہے اور اس سے انکار ممکن بھی نہیں کہ انسانی معاشرے میں تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے، لیکن کیا یہ تغیر ذات اور فطرتِ انسانی میں بھی آیا ہے؟ کیا سارا وجود انسانی تغیر کا شکار ہو گیا ہے؟ ہرگز نہیں! ہزاروں سال پہلے کے انسانوں کی جو جسمانی ساخت اور مطالبات تھے، آج بھی بعینہ وہی ہیں، جبستوں، جذبات و عواطف اور تقاضوں تک میں کوئی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوئی۔ تغیر انسان کے داخل میں نہیں بلکہ خارج، یعنی تمدن، میں آیا ہے، جب ذات دائمی ہے تو قانون دائمی کیوں نہیں ہو سکتا؟

دائمی قانون سازی کا حق ظاہر ہے اسی کو ہو سکتا ہے جس کی نظر تمام انسانوں کے احتیاجات، مطالبات اور تقاضوں پر ہو اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، ارشاد باری ہے:

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبْرَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ. [۵۴:۷]

”آگاہ ہو جاؤ! اسی کی خلق ہے اور اسی کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت بابرکت ہے، سارے

جہانوں کا پالنے والا۔“

آیت مبارک میں تخلیق و امر دونوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ چوں کہ وہ خالق ہے اس لیے

1- Josef Köhler, *Philosophy of Law*, [trans., Adalbert Albrecht], New York: The Macmillan Company, 1921, p. 5.



بہ یک وقت تمام انسانوں کے ہر ہر تقاضے اور احتیاجات بہ یک آن اس کی نگاہ میں ہیں۔ وہ انسانوں کی ساری صلاحیتوں کو پروان چڑھانا چاہتا ہے، عقائد و اعمال، تہذیب و معاشرت اور اخلاق و تمدن ہر سطح پر انسانوں کی کامیابی و ترقی اسے مطلوب ہے۔ اس لیے قانون سازی کا اہل بھی وہ ہی ہے نہ کہ انسان خود۔ جس کی تلون مزاجی ضرب المثل ہے۔

اسلامی قانون کی سازگاری: قانون کے دو اجزا ایک دائمی دوسرا متغیر:

اسلامی قانون دو اجزا پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ دائمی اور مستقل [rigid] ہے جب کہ دوسرا تغیر پذیر [flexible] ہے۔ قانون کا وہ حصہ جو rigid ہے ان احکام اور سزاؤں پر مشتمل ہے جو مختلف جرائم میں کتاب و سنت میں طے کر دی گئی ہیں۔ انھیں فقہی اصطلاح میں ”حدود“ کہا جاتا ہے، جب کہ سزاؤں کا وہ حصہ جن میں کمی بیشی کا اختیار اسلامی حکومت، مقننہ [Legislative] اور عدلیہ [Judiciary] کو حاصل ہے ”تعزیرات“ کہلاتا ہے۔ یہ تقسیم عہد رسالت ہی سے ثابت ہے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ بعد میں حضرات فقہانے متعین فرمائی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کون سے احکام اور سزائیں ”حد“ ہیں اور کون سی تعزیر۔ کتاب و سنت میں غور کرنے سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے:

قرآنی احکام: زمان و مکاں کی قیود سے ماورا اور دائمی:

جو احکام کتاب اللہ میں صراحتہ مذکور ہیں خواہ ان کا تعلق عقائد سے ہو یا عبادات و معاملات سے ان کا قبول کرنا لازم ہے اور اس سے انحراف کی کسی کو گنجائش نہیں، ارشاد باری ہے:

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ [۱۸:۴۵]

”پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقے پر کر دیا سو آپ اسی طریقے پر چلے جائیے اور ان جہلا کی خواہشوں پر نہ چلیے۔“

امت کی انحراف کی کیا مجال، یہاں نبی کو کہا جا رہا ہے:

بَلِّغْ حُدُودَ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ [۲۲۹:۲]

”یہ اللہ کی حدود ہیں، خبردار! ان سے آگے نہ بڑھنا اور جو لوگ ان حدود سے تجاوز کر جائیں وہ ظالم ہیں۔“

بَلِّغْ حُدُودَ اللَّهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ [۱:۶۵]

”یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں جو شخص اللہ کی حدود سے آگے بڑھ جائے اس نے یقیناً اپنے اوپر ظلم کیا۔“

قوانین اسلامی — اقدار اور اطلاق دونوں ابدی و دائمی —

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ [۴۴:۵]  
 ”اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی وحی کے ساتھ فیصلے نہ کریں وہ کافر ہیں۔“  
 وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ [۴۵:۵]  
 ”اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے مطابق حکم نہ کریں، وہ ہی لوگ ظالم ہیں۔“  
 وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ [۴۷:۵]  
 اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ سے حکم نہ کریں، وہ فاسق ہیں۔“

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ [۵۰:۵]  
 ”کیا یہ لوگ پھر سے جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں یقین رکھنے والوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلے اور حکم کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔“

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أَنزَلَ إِلَيْكَ وَمَا أَنزَلَ مِنْ قَبْلِكَ  
 يُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ  
 الشَّيْطٰنُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا [۶۰:۴]

”کیا آپ نے انہیں نہیں دیکھا؟ جن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ جو کچھ آپ اور جو کچھ آپ سے پہلے اتارا گیا ہے اس پر ان کا ایمان ہے، لیکن وہ اپنے فیصلے غیر اللہ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں، حالاں کہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ شیطان کا انکار کریں، شیطان تو چاہتا ہے کہ انہیں بہکا کر دور ڈال دے۔“

یہ تمام آیات شریفہ اس امر پر صراحتاً دلالت کر رہی ہیں کہ دین و شریعت مع اپنی مابعد الطبیعیات کے آفاقی و ابدی ہے۔ اسلام کی نگاہ خداوندی میں پسندیدگی کی وجہ اور عقیدہ ختم نبوت کا اقتضا ہی یہ ہے کہ دین اور ما انزل اللہ احکام کو زمان و مکاں کی تحدیدات و قیود سے ماورا رکھا گیا ہے۔ فکر و فہم انسانی لاکھ تغیر کا شکار ہو، حیات انسانی، معاشرے اور تمدن میں ہزاروں تبدیلیاں ہوں لیکن اس سے انحراف ممکن نہیں۔ ایک مسلمان اس محکم عقیدے پر ایمان لانے کا قانونی طور پر پابند ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: بہ طور شارع نافذ کی گئی سزائیں حدود — دائمی ہیں:  
 جو سزائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ حیثیت شارع و رسول متعین فرمادی ہیں وہ بھی حد ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ  
 مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا [۳۶:۳۳]  
 ”اور کسی مومن مرد و عورت کو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کے بعد اپنے کسی امر کا اختیار باقی نہیں رہتا، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جو بھی نافرمانی کرے گا وہ صریح گم راہی میں پڑے گا۔“

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۳۱۶

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

”أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله ويؤمنوا بي وبما جئت به.“  
 ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں، یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کی گواہی  
 دیں اور مجھ پر اور ان تمام امور پر جو میں لے کر آیا ہوں ایمان لائیں۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: بہ طور قاضی نافذ کردہ سزائیں تعزیریں:

وہ سزائیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ حیثیت شارع و رسول نہیں بلکہ بہ حیثیت قاضی  
 یا حاکم عملادی ہیں، یا دینے کا حکم دیا ہے، وہ تعزیر ہے۔

غیر منقول سزائیں تعزیر کے حکم میں ہیں:

جن جرائم کی کوئی متعین سزا کتاب و سنت سے ثابت نہیں اور نہ ہی ان کے بارے میں  
 حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا فیصلہ سنا منے آیا ہو، ان جرائم کی سزا بھی تعزیر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: بہ یک وقت شارع اور قاضی: فرق کی وضاحت:

ان چاروں نکات میں اول و آخر دو نکتے تو بالکل واضح اور صریح ہیں، البتہ دوسرا اور تیسرا نکتہ  
 محتاج وضاحت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہ یک وقت شارع بھی ہیں اور حاکم بھی۔ جب بہ حیثیت  
 شارع کوئی حکم جاری فرمائیں گے یا سزا تجویز فرمائیں گے تو وہ ابدی، دائمی اور ناقابل ترمیم و تغیر ہوگا۔ اور  
 بلاشبہ ”حد“ کے زمرے میں آئے گا۔ مگر جب آپ بہ حیثیت قاضی اور حاکم کوئی حکم یا سزا تجویز فرمائیں  
 گے تو وہ حد نہیں تعزیر ہوگی۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ [م ۵۱۷ھ] آپ کی ان حیثیتوں کے متعلق لکھتے ہیں:

أن النبي صلى الله عليه وسلم كان هو الإمام، والحاكم، والمفتي، وهو  
 الرسول، فقد يقول الحكم بمنصب الرسالة، فيكون شرعاً عاماً إلى يوم  
 القيامة كقوله: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد..... وقد يقول  
 بمنصب الفتوى، كقوله لهند بنت عتبة امرأة أبي سفيان، وقد شكت إليه  
 شح زوجها، وأنه لا يعطيها ما يكفيها: خذي ما يكفيك وولدك  
 بالمعروف، فهذه فتيا لا حكم، إذ لم يدع بأبي سفيان، ولم يسأله عن  
 جواب الدعوى، ولا سألها البينة. وقد يقوله بمنصب الإمامة، فيكون

- ۱- مسلم بن حجاج القشيري، صحيح المسلم، كتاب الإيمان، باب الأمر بقتال الناس حتى يقولوا لا إله إلا الله محمد رسول الله الخ، جلد ۱، صفحہ ۳۷۔
- ۲- حضرات صحابہ کا عہد استنباطات و اجتہادات سے مقدم ہے، کیوں کہ وہ مفہوم و مرادات قرآنی کو بہ راہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے اور سمجھنے والے ہیں۔ اس لیے نزاع و تعارض کے وقت ان کا تعامل حتمی حجت ہے۔

مصلحة للأمة في ذلك الوقت، وذلك المكان، و على تلك الحال، فليلتزم من بعده من الأئمة مراعاة ذلك على حسب المصلحة التي راعاها النبي صلى الله عليه وسلم زماناً ومكاناً وحالاً<sup>١</sup>۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سربراہ حکومت بھی تھے اور قاضی، مفتی بھی تھے اور رسول بھی۔ چنانچہ بعض اوقات آپ کوئی حکم منصب رسالت کی حیثیت سے دیتے ہیں تو وہ قیامت تک کے لیے عام شریعت بن جاتا ہے، مثلاً آپ کا یہ ارشاد: ”جو ہمارے اس دین میں کوئی بدعت پیدا کرے تو وہ مردود ہے“..... اور کبھی آپ مفتی کے منصب سے کوئی بات ارشاد فرماتے تھے، مثلاً جب حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ حضرت ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے خاوند کے بخل کی شکایت کی تو آپ نے ان سے فرمایا ”تم اپنی اور اپنے لڑکے کی ضرورت کے لیے مناسب رقم ان کے مال میں سے لے لیا کرو“۔ یہ آپ کا فتویٰ تھا، عدالتی فیصلہ نہیں۔ اسی لیے آپ نے اس موقع پر نہ حضرت ابوسفیان کو بلایا، نہ ان سے جواب دعویٰ طلب کیا..... کبھی کوئی بات آپ سربراہ حکومت کے منصب سے ارشاد فرماتے تو ایسی بات امت کے لیے صرف اُس زمانے، اُس مقام اور اُن حالات کی مصلحت کے مطابق ہوتی تھی، اب آپ کے بعد آنے والے سربراہان پر لازم ہے کہ اس ارشاد کی رعایت ان مصلحتوں کے مطابق کریں، جن کی آپ نے اُس زمانے، مقام اور حالات میں رعایت رکھی تھی“۔

غور طلب نکتہ یہ ہے کہ ان دونوں حیثیتوں میں امتیاز کس طرح ہو؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امتیاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے الفاظ، اسلوب بیان، سیاق و سباق، مجموعی طرز عمل، صحابہ کرام کے اقوال و اعمال اور امت کے متواتر عمل کے ذریعے بہ آسانی قائم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ بعض سزاؤں کے بارے میں آپ نے یہ واضح فرما دیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں یا بہ ذریعہ وحی بتلائی گئی ہیں، یا آپ نے ان سزاؤں پر مواظبت فرمائی ہو اور اُس کے ترک یا تغیر پر خفگی کا اظہار فرمایا ہو، یا حضرات صحابہ کرام فرماتے ہوں کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تو ان تمام صورتوں میں یہ بات سمجھی جائے گی کہ آپ نے یہ سزائیں بہ حیثیت شارع دی ہیں اور یہ ”حد“ ہیں جس میں کوئی ترمیم یا تبدیلی ممکن نہیں۔ حضرات فقہاء اس پر متفق ہیں۔

اس کے برعکس بعض سزاؤں کے بارے میں ان کے سیاق و سباق میں غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سزائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ حیثیت قاضی یا حاکم تجویز فرمائی تھیں۔ چنانچہ تمام

١- ابن القیم الجوزی، زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، بیروت: مؤسسة الرسالة، ١٣١٨ھ، فصل فی غزوة حنین النخ، فصل فی الإشارة الی بعض ما تضمنته النخ، فصل هل الأسلاب مستحقة بالشرع أو بالشرط؟، جلد ٣، صفحہ ٢٢٩۔

فقہا اُس کو حد نہیں بلکہ تعزیر قرار دیتے ہیں۔ مثلاً آپ نے ایک فحش گونجٹ کو مدینہ طیبہ سے شہر بدر کرنے کی سزا تجویز فرمائی تھی، مگر بعد میں اُسے ہفتے میں ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں داخل ہونے کی اجازت مرحمت فرما دی۔ یہ وقت سزا بعض حاضرین نے اُس کے قتل کا مشورہ دیا تو رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا:

إني نهيت عن قتل المصلين۔<sup>۱</sup>

”مجھے نمازیوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔“

اس واقعے کا سیاق و سباق صاف بتلا رہا ہے کہ یہ حکم بہ حیثیت شارع نہیں بلکہ بہ حیثیت حاکم دیا گیا تھا، اس لیے حضرات فقہاء اس کو تعزیر قرار دیتے ہیں۔

لیکن جو سزائیں قرآن و سنت سے واضح اور قطعی طور پر متعین ہو جاتی ہیں اُن میں تبدیلی یا تغیر کا حق و اختیار کسی کو نہیں ہے۔ ان امور میں کتاب و سنت میں غور و خوص کر کے ان کا حکم دریافت کرنا اجتہاد ہے، اسی طرح جن مسائل میں تعارض ہے وہاں بھی کسی ایک جانب کو اختیار کرنے کے لیے اجتہاد کی ضرورت ہے۔

پھانسی کے لیے یہ طور مثال قطع ید کی سزا: ڈاکٹر منظور احمد:

ان تمام تر تفصیلات کو نظر انداز کر کے ڈاکٹر صاحب قطع ید کی سزا، جو قرآن کی نص سے ثابت ہے، پر ”اجتہاد“ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

”چوری روکنے کے لیے ممکن ہے پھانسی کی سزا ضروری ہو لیکن دوسرے زمانے میں ملزم کی نفسیاتی اصلاح سے چوری روکنا ممکن ہو۔“

ایک عامی کو بھی یہ معلوم ہے کہ اسلامی علیت میں چوری کے لیے پھانسی کی سزا نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے مفروضے کو مضبوط اور مؤکد کرنے کے لیے خواہ مخواہ پھانسی کی سزا کا جملہ استعمال فرما رہے ہیں۔ کیا انھیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ بہت سی چوریوں پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جاسکتی، کوئی تعزیر بھی نہیں دی جاسکتی، کجا کہ پھانسی دے دی جائے؟

ڈاکٹر منظور احمد: چوری کا انسداد بہ ذریعہ ”نفسیاتی اصلاح“: ایک سوال:

دوسرا نکتہ ڈاکٹر صاحب نے ملزم کی ”نفسیاتی اصلاح“ کے حوالے سے اٹھایا ہے۔ یہ نکتہ در پردہ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض عائد کرتا ہے کہ جس چیز کا فہم خدا اور اس کے رسول کو حاصل نہ تھا، نعوذ باللہ، اس کا فہم نیاز اور سرسید کی تقلید میں ڈاکٹر صاحب پر منکشف ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس اس بات کے یقینی ہونے کا کیا ذریعہ ہے کہ ملزم کی ”نفسیاتی اصلاح“ اسے مستقبل میں

۱۔ حسین بن علیؑ، السنن الکبریٰ، کتاب الحدود، باب ماجاء فی نفی المخنثین، جلد ۸، صفحہ ۳۹۱۔

چوری کے ارتکاب سے باز رکھے گی؟ اور اس بات کے لیے ان کے پاس کون سا طریقہ ہے کہ جو لوگ مستقبل میں چور بن سکتے ہوں، چوری کی سزا کا خوف انہیں ارتکاب جرم سے مانع رکھے گا؟ کیوں کہ نفسیاتی اصلاح کا بنیادی اصول اصلاح کے عمل کو ”خفیہ“ رکھنا ہوتا ہے جو نفسیاتی معالج اور مریض کے درمیان کلینک میں انجام پاتا ہے اور کسی کو اس کے نتائج سے آگاہ نہیں کیا جاتا۔

چوری کی سزا کا سبب ایک مخلصہ: منظور احمد:

ایک مقام پر مزید لکھتے ہیں:

”چور کی سزا معاشرے سے چوری کو ختم کرنے یا اس کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے ہے اور جو سزا بھی اس مقصد کے حصول میں سربلج الاثر ہو اور جرم و سزا میں توازن قائم کرتی ہو وہ مقاصد الشریعہ کو پورا کر دیتی ہے۔“

ڈاکٹر صاحب مقاصد الشریعہ کا علم اور فہم کس ذریعے سے حاصل کرتے ہیں انہیں اس کا تعین کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب نے چوری کی سزا کے دو مقاصد بتائے ہیں: [۱] چوری ختم کرنا، [۲] چور کی حوصلہ شکنی کرنا۔ ان دونوں مقاصد کے تعین کا ماخذ کیا ہے؟ اور کیا ان ”مقاصد“ کا دیگر سزاؤں پر بھی اطلاق کیا جاسکتا ہے؟ مثلاً رجم کی سزا کا مقصد زنا کو ختم کرنا ہے؟ یا زنا کے مجرم کو ختم کرنا ہے؟ ڈاکٹر صاحب پہلے اپنے بیان کردہ ”مقاصد“ کی روشنی میں رجم کے حوالے سے رہ نمائی فرمائیں تو چوری سے متعلق ان ”مقاصد“ پر غور کیا جاسکتا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ ”مقاصد“ کی روشنی میں ان کے علمی منہاج میں رجم کی سزا کا تجزیہ کیا جائے تو وہ صرف دو نکات پر محیط ہوگا: [۱] زنا کو ختم کرنا، [۲] زانی کی حوصلہ شکنی کرنا، یعنی ”جو سزا بھی اس مقصد کے حصول کے لیے سربلج الاثر ہو اور جرم و سزا میں توازن قائم کرتی ہو وہ مقاصد الشریعہ کو پورا کر دیتی ہے۔“ کیا اس بیان سے مقاصد الشریعہ پورے ہو جاتے ہیں؟ اگر ایسا فی الواقع ہے تو پھر یہ امت نہ ”خیر امت“ ہے اور نہ ہی ”امت وسط“۔ جو پندرہ سو سال سے ڈاکٹر صاحب کے منہاج سزا کے برخلاف بے چارے مجرموں پر رجم اور کوڑے جیسی ظالمانہ سزائیں نافذ کرتی رہی ہے، حالاں کہ ملزم کی ”نفسیاتی اصلاح“ یا جرم و سزا میں توازن پیدا کرنے والی معمولی سزاؤں سے مقاصد الشریعہ بہ آسانی پورے کیے جاسکتے تھے۔ تو کیا یہ بات درست ہوگی کہ اسلام کے نظام حدود و تعزیرات اور امت کی تاریخ و تواتر کو محض ڈاکٹر صاحب کے انفرادی علمی ادعا پر قربان کر دیا جائے؟

اہل سنت کو اجماع کے خلاف شیعہ فقہیہ کی بلا حوالہ رائے قبول کرنے کا مشورہ: منظور احمد:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب ایک مقام پر شیعہ فقہیہ نجم الدین الطوفی کی رائے کو ”زیادہ عقلی و

منطقی“ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مصلحت، اجماع تو درکنار خود قرآن و سنت کی تخصیص کر سکتی ہے۔ اگر کسی زمانے میں انسانی مصالح قرآن و سنت کے نصوص سے حاصل نہ ہوتے ہوں تو ان پر مبنی احکامات کی مناسب تعبیر اور تاویل ممکن ہے۔“

یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جس منہاج علم میں گفتگو ہو رہی ہے، اس منہاج علم کے مآخذ و منابع اور معتبر شارحین و مستند نمائندوں ہی کی گفتگو قابل اعتبار اور لائق اعتماد سمجھی جاتی ہے۔ اجماع امت سے جب قوانین اخذ کیے جاتے ہیں تو اس بحث میں کسی شیعہ مجتہد یا مفکر کی رائے قابل اعتماد نہیں۔ کیوں کہ شیعہ مذہب سقیفہ بنی ساعدہ میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت اور اس پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع سے لے کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری، سیدنا معاویہ کے خلیفہ برحق ہونے اور اس سال کے ”عام الجماعة“ ہونے تک انکار اجماع سے عبارت ہے۔ اگر شیعہ مذہب اپنے اصول اور منہاج میں اجماع امت کو جگہ دے تو بہ طور مذہب تشیع کا تشخص مخدوش اور جواز ختم ہو جائے گا۔ وہ اجماع امت کو ”حق“ مان کر اہل سنت و جماعت ہی میں ضم ہو جائیں گے۔ عہد صدیق اکبر سے لے کر تا حال انکار اجماع ہی شیعیت کی انفرادیت ہے۔

۱- منظور احمد، ”اسلام، قانون اور اخلاقیات“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحات ۹۴-۹۵۔

۲- اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے فرمودات ہی ملاحظہ فرمائیے جائیں تو خرق اجماع کی جڑ کٹ جاتی ہے، سیدنا علیؑ، سیدنا معاویہؓ کے نام اپنے گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں: انه بايعنى القوم الذين بايعوا ابا بكر و عمر و عثمان على ما بايعوهم عليه، فلم يكن للشاهد ان يختار، ولا للغائب ان يرد، وانما الشورى للمهاجرين والانصار، فان اجتمعوا على رجل وسموه اماما كان ذلك لله رضى؛ فان خرج عن امرهم خارج بطعن او بدعة ردوه الى ما خرج منه؛ فان ابي قاتلوه على اتباعه غير سبيل المؤمنين وولاة الله ما تولى. [الشرىف الرضى، نبع البلاغة، بيروت: دار الاسلامية، ۱۴۱۴ھ، الباب الثانى: فصل الكتب، كتاب له الى معاوية ارسله مع جريو بن عبد الله البجلي، صفحہ ۶۲۔] ”مجھ سے ان حضرات نے بیعت کی ہے، جنہوں نے حضرات ابو بکر و عمر و عثمان [رضی اللہ عنہم] سے بیعت کی تھی۔ لہذا اب نہ شاہد کو قبول و عدم قبول کا اختیار رہا اور نہ غائب اس کو مسترد کر سکتا ہے، انتخاب خلیفہ کے لیے مشورے کا حق صرف مہاجرین اور انصاری کو حاصل ہے۔ جس شخص پر یہ حضرات متفق ہو جائیں اور اسے ”امام“ مقرر کر لیں، وہی اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ ”امام“ ہوگا۔ پھر اگر کوئی شخص ”طعن“ یا ”بدعت“ کی بنا پر ان کے فیصلے سے انحراف کرتا ہے تو یہ حضرات اس کو اس چیز کی طرف واپس لائیں گے جس سے وہ انحراف کر رہا ہے اور اگر وہ اس کے باوجود آمادہ اطاعت نہیں ہوگا تو یہ حضرات اس سے قتال کریں گے، کیوں کہ وہ ”المؤمنین“ کا [اجماعی] راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے پر ہولیا ہے، اور جس طرف اس نے منہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اسی طرف دھکیل دیں گے۔“

اس گرامی نامے کا آخری فقرہ جو قرآن حکیم کی آیت مبارکہ: وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصَلِّهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا [۱۱۵:۴] سے مستفاد ہے اس میں اجماع امت ہی کی طرف لوٹنے کی دعوت دی گئی ہے اور اس سے انحراف کرنے والوں کو ”يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ“ فرمایا گیا ہے۔

نجم الدین الطوفی کا تفرّد شیعہ منہاج کا نمائندہ نہیں:

جہاں تک نجم الدین الطوفی کے متذکرہ فقرے کا تعلق ہے کہ: ”مصلحت، اجماع تو درکنار کتاب و سنت کی تخصیص کر سکتی ہے“۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے حسب معمول اس بیان کو نقل فرمانے کے بعد کوئی حوالہ نہیں دیا اس لیے اس کی تحقیق نہیں کی جاسکی۔ اصولاً شیعہ منہاج علم کے مطابق ڈاکٹر

= ایک خطبے میں سیدنا علیؑ ارشاد فرماتے ہیں: ولعمري لئن كانت الإمامة لا تعقد حتى تحضرها عملة الناس، فما إلى ذلك سبيل، وليكن أهلها يحكمون علي من غاب عنها؛ ثم ليس للشاهد أن يرجع، ولا للغائب أن يختار. الشريف الرضي، نهج البلاغة، الباب الاول: فصل الخطب، خطبة له عن مسير أصحاب الجمل إلى البصرة، صفحہ ۲۲۳۔ ”مجھے قسم ہے! اگر امامت اس طرح منعقد ہوا کرتی کہ ہر ہر فرد حاضر ہو تو یہ ناممکن الوقوع ہے، بلکہ اس کا طریقہ یہی ہے کہ اہل حل و عقد جس کو بھی رئیس مقرر کر لیں، وہ ”امام“ قرار پائے گا، پھر نہ تو وہ شخص جو موجود تھا وہ اس سے سرتابی کر سکتا ہے اور نہ اس شخص کو، جو خلیفہ کے انتخاب کے وقت موجود نہیں تھا، اس کے رد و قبول کا اختیار حاصل رہتا ہے۔“ امیر المؤمنین سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کے گرامی نامے اور خطبہ مبارکہ سے اجماع کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ شیعہ ان امور کو نظر انداز کر کے اجماع کو اپنے ماخذ علمی میں شامل نہ کریں۔

1- اس سلسلے میں نجم الدین الطوفی کے معروف دلائل کا خلاصہ اور اس کے جوابات درج ذیل ہیں:

[۱] طوفی کا کہنا ہے کہ جو لوگ اجماع کے منکر ہیں، وہ بھی مصالح کے قائل ہیں، پس جس بات میں لوگوں کا اختلاف ہو اس کی نسبت اس چیز کو فوقیت ہے، جس میں لوگ متفق ہوں۔

قائلین اجماع اس کا جواب یہ فراہم کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا دعویٰ ہی غلط ہے، کیوں کہ اجماع کی تمام امت قائل ہے، سوائے نظام معتزلی اور امامیہ کے ایک گروہ کے۔ اس کے برعکس مصالح مرسلہ تو درکنار استحسان کے بھی کثیر لوگ قائل نہیں ہیں۔ استحسان سے متعلق امام شافعی کا قول مشہور ہے کہ: من استحسن فقد شرع۔ یعنی جس نے استحسان سے کام لیا، وہ گویا خود شارع بن بیٹھا۔ اسی طرح یہ قول بھی معروف ہے: من استصلح فقد شرع۔

تاریخ بغداد اور تہذیب التہذیب وغیرہ میں امام ابو حنیفہؒ سے منقول ہے کہ: میں پہلے مسئلہ کتاب اللہ سے لیتا ہوں، وہاں نہ ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں، اور اگر کتاب اللہ اور سنت رسول دونوں میں نہ ملے تو صحابہؓ کے قول کو اختیار کر لیتا ہوں اور اقوال صحابہؓ سے تجاوز کر کے دوسروں کے اقوال نہیں لیتا۔

[خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، جلد ۱۳، صفحہ ۳۶۸، بحوالہ محمد ابو زہرہ، ابو حنیفہ: حياته وعصره - آراؤه الفقه، دار الفکر العربی، [س-ن] صفحہ ۲۶۶۔]

جب ”اہل الرائے“ کہلا کر امام ابو حنیفہؒ کے ماخذ تشریحیہ میں مصالح مرسلہ کا ذکر نہیں ملتا تو بھلا اہل حدیث اور سلفی حضرات کے ہاں مصالح مرسلہ کا قاعدہ کیسے مقبول ہو سکتا ہے؟ وہ تو رائے ہی کے خلاف ہیں۔ پس طوفی کا یہ کہنا کہ اجماع میں اختلاف ہے اور مصالح مرسلہ میں اتفاق ٹھیک نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اجماع متفق علیہ امر ہے اور مصالح مرسلہ میں اختلاف ہے۔

[۲] طوفی کا کہنا ہے کہ نصوص متعارض ہیں اور مصالح مرسلہ میں اتفاق ہے، اس لیے مصالح مرسلہ کا اتباع نصوص سے زیادہ ضروری ہے۔ یہ وجہ بھی بالکل غلط ہے اور غلطی بالکل واضح ہے۔

[۳] طوفی کا کہنا ہے کہ یہ بات ثابت ہے کہ مصالح کی بنا پر نصوص سے معارضہ کیا جاتا رہا ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے طوفی کا کہنا ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن مسعودؓ نے نص اور اجماع کے باوجود تیمم کو قبول نہیں کیا۔ اس کی وجہ عبادت میں مصلحت ان کے پیش نظر تھی۔ [مصطفیٰ زید، المصلحة في التشريع الاسلامي ونجم الدين الطوفی، قاہرہ: دار الفکر العربی، ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴م، صفحہ ۲۳۱۔]



صاحب کا یہ بیان درست معلوم نہیں ہوتا یا یہ شرط درست حوالہ یہ نجم الدین طوفی کی ذاتی رائے تو ہو سکتی

متذکرہ واقعہ یوں ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود کا خیال تھا کہ تیمم وضو کا بدل تو ہے، لیکن غسل جنابت کا بدل نہیں۔ کیوں کہ یہ انہیں مستبعد نظر آتا تھا۔ لیکن ابن ابی شیبہ کی روایت کے مطابق ابن مسعود نے اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا اور سیدنا عمران بن حصین کی روایت کو قبول فرمایا تھا۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری [جلد ۱، صفحات ۳۶۷-۳۷۵] میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔ پس یہ مثال خود طوفی کے خلاف ثبوت مہیا کرتی ہے۔ سیدنا ابن مسعود کی رائے منفرد تھی جس سے انہوں نے رجوع فرمایا تھا۔

اس سلسلے میں طوفی ایک اور مثال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام اتارنے اور قربانی کا حکم دیا تو لوگوں نے توقف کیا، کیوں کہ ان کی عادت تھی کہ مناسک حج ادا کرنے سے پہلے قربانی نہ کرتے تھے اور احرام نہ اتارتے تھے۔ آپ نے جب لوگوں کو قربانی کا حکم دیا تو کوئی نہ اٹھا۔ آپ نے فرمایا کیا بات ہے میں حکم دیتا ہوں تو بجا نہیں لاتے؟ اس واقعے میں لوگوں کے توقف کو مصالح مرسلہ کی بنا قرار دینا ٹھیک نہیں۔ خود طوفی اسے عادت قرار دے رہے ہیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ صلح حدیبیہ چوں کہ بظاہر دہرے کی گئی تھی اس لیے لوگ مغموم تھے، مزید توقف اس وجہ سے تھا کہ شاید حکم بدل جائے۔ لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود قربانی فرمائی اور بال منڈوائے، تو پھر لوگوں کو یقین ہو گیا کہ فیصلے میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، تو سب لوگوں نے حکم کی تعمیل کی — حیرانی اس بات پر ہے کہ اس مثال سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ ”مصلحت کی بنا پر نصوص کی خلاف ورزی [تخصیص] کی جا سکتی ہے“؟ یہ مثال تو خود طوفی اور ان کے موقف و استدلال کے قائلین کے خلاف جاتی ہے کیوں کہ توقف کے بعد سنت پر فوراً عمل کر لیا گیا۔ قائلین مصلحت نے اس واقعے کے آخری حصے کو حذف کر دیا اور اس سے ثابت کیا کہ مصلحت کی بنا پر نصوص کی خلاف ورزی کی جا سکتی ہے۔

حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

والمقصود هنا أن الرسول بين جميع الدين بالكتاب والسنة، وأن الإجماع - إجماع الأمة - حق؛ فإنها لا تجتمع على ضلالة، وكذلك القياس الصحيح حق يوافق الكتاب والسنة. والآية المشهورة التي يحتج بها على الإجماع قوله: وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ. [نقی الدین ابن تیمیہ، معارج الوصول، فی مجموع فتاویٰ، المجلد التاسع عشر، صفحہ ۱۹۲]۔

”ہمارا مقصود یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کل دین کو کتاب و سنت کے ذریعے بیان فرما دیا ہے۔ اجماع امت حق ہے، کیوں کہ امت گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتی۔ یہی بات قیاس صحیح کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے جو کتاب و سنت سے موافقت رکھتا ہو۔ وہ آیت مشہور ہے جس کے ذریعے اجماع کو ثابت کیا جاتا ہے: اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں کے رستے کے سوا اور رستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اُسے ادھر ہی چلنے دیں گے۔“

مزید لکھتے ہیں:

”اس سارے بیان سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اجماع، قیاس، مصالح مرسلہ سب کی بنیاد قرآن و سنت ہے۔

جس سے اعراض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

تفصیل کے لیے دیکھیے: عدنان محمد جمعہ، دفع الحرج فی التشريعية الاسلامیة، صفحات ۱۰۰-۱۰۳، بحوالہ ریاض الحسن نوری، ”نصوص اور مصالح مرسلہ“، مشمولہ سہ ماہی منہاج، لاہور: مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور، جنوری ۱۹۸۶ء، مصادر شریعت نمبر، حصہ سوم، صفحات ۱۳۵-۱۳۸۔

ہے، شیعہ منہاج کی نمائندہ نہیں بن سکتی۔ اثنا عشریوں نے حضرت امام باقر رحمہ اللہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے:

ما وجدتم فی کتاب اللہ عزوجل فالعمل بہ لازم ولا عذر لکم فی ترکہ،  
وما لم یکن فی کتاب اللہ عزوجل وکان فی سنة منی فلا عذر لکم فی  
ترک سنتی، وما لکم یکن فیہ سنة منی فما قال اصحابی فقولوا بہ فانما  
مثل اصحابی فیکم کمثل النجوم بایہا اخذ اھتدی وبای اقاویل اصحابی  
اخذتم اھتدیتم، واختلاف اصحابی لکم رحمة<sup>۱</sup>۔

”جو تم کتاب اللہ میں پاؤ اس پر عمل کرنا ضروری ہے اسے کسی صورت ترک نہیں کیا جاسکتا،  
اور جو کتاب اللہ میں موجود نہ ہو اور اس میں میری سنت موجود ہو تو تمہیں میری سنت  
ترک کرنے کا کوئی عذر نہیں، اور جو امر میری سنت میں بھی نہ ہو تو جو کچھ میرے صحابہؓ نے  
کہا، وہ لے لو کیوں کہ تم میں میرے صحابہؓ تاروں کی مانند ہیں، جس کو بھی پکڑا جائے راستہ  
مل جائے گا، اسی طرح میرے صحابہؓ میں جس کے قول کو اختیار کر لو گے ہدایت پا جاؤ گے  
اور میرے صحابہؓ کا اختلاف تمہارے لیے رحمت ہے۔“

یہ روایت صرف علامہ مجلسی ہی نے نہیں دیگر شیعہ راویوں نے بھی روایت کی ہے، علامہ مجلسی لکھتے ہیں:

أقول: روی الصدوق فی کتاب معانی الأخبار، عن ابن الولید، عن الصفار،  
عن الخشاب، عن ابن کلوب، عن إسحاق بن عمار، عن الصادق، عن  
آبائہ علیہم السلام الی آخر ما نقل ورواہ الصفار فی البصائر<sup>۲</sup>۔

”شیخ صدوق نے اپنی کتاب ”معانی الاخبار“ میں اپنی سند کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم کا یہی ارشاد آخر تک نقل کیا ہے، اور اس حدیث کو شیخ محمد بن حسن الصفار نے اپنی  
کتاب ”بصائر الدرجات“ میں روایت کیا ہے۔“

شیعہ منہاج علم میں احکام کا استنباط اگرچہ چار ماخذ پر مشتمل ہے: قرآن، سنت، اجماع اور  
عقل — لیکن بنیادی ماخذ اور مستقل مصدر احکام قرآن و سنت ہی ہیں۔ واضح رہے مکتب تشیع میں سنت  
سے مراد معصوم کا قول، فعل اور تقریر ہے۔ اجماع کی حجیت اسی وقت ہے جب اس سے معصوم کا قول کشف  
ہوتا ہو۔ اگر تمام فقہا کسی مسئلے پر اتفاق قائم کر لیں، لیکن قول معصوم اس عزم و اتفاق سے کشف نہ ہوتا ہو تو اس  
اجماع کی کوئی وقعت نہیں۔ اسی طرح چند فقہا کسی مسئلے پر اتفاق کریں اور جمہور فقہا اس کی مخالفت کریں، لیکن  
چند فقہا کی رائے معصوم کے قول سے مطابقت رکھتی ہو تو یہ اجماع حجت ہوگا۔ محقق حلی لکھتے ہیں:

۱- محمد باقر مجلسی، بحار الأنوار، بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱۴۰۳ھ، کتاب العلم، باب ۲۹، علل  
اختلاف الاخبار و کیفیت الجمع الخ، جلد ۲، صفحہ ۲۲۰۔

۲- ایضاً۔

۳- شیعہ مذہب میں معصوم سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا علیؑ، سیدہ فاطمہ الزہراءؑ اور ان کے گیارہ فرزند ان ہیں۔

واما الإجماع: فعندنا هو حجة بانضمام [المعصوم] فلو خلا المائة من فقہائنا عن قوله لما كان حجة، ولو حصل في اثنين لكان قولهما حجة لاعتبار اتفاقهما بل باعتبار قوله<sup>١</sup>.

”یعنی جہاں تک اجماع کا تعلق ہے تو وہ صرف معصوم کی شمولیت کے باعث حجت ہے۔ لہذا اگر پورے سو عدد فقہاء میں معصوم کا قول شامل نہ ہو تو وہ اجماع امت نہ ہوگا اور اگر صرف دو شخصوں میں معصوم کا قول شامل ہو جائے تو وہ اجماع ہو جائے گا، ان کے اتفاق کی وجہ سے نہیں بلکہ معصوم کی شمولیت کی وجہ سے۔“

مکتب تشیع اجماع کو مستقل اور بالذات مدرک اور مصدر تسلیم نہیں کرتا۔ ان کے یہاں حجیت ملزمہ فقط دو ہیں: قرآن اور اقوال معصوم — ایسی صورت میں جب اقوال معصوم کے بالمقابل ۱۰۰ اعداد فقہاء کے اقوال وقعت کے حامل نہیں تو نجم الدین الطوفانی کا تفرکہ ”مصلحت قرآن وسنت کی بھی تخصیص کر سکتی ہے“ کیسے درست ہو سکتا ہے؟

شیعہ کتب کی ان واضح عبارات و روایات کی روشنی میں نجم الدین الطوفانی کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر اس بحث میں ڈاکٹر صاحب کے مخاطب اہل تشیع ہوتے تو بحث کی کوئی گنجائش نکل بھی سکتی تھی۔ اجماع کی بحث میں شیعہ مکتب و منہاج سے اخذ و استفادہ کر کے ایک شیعہ مفکر کے تفرکہ کو بنیاد بنا کر اہل سنت و جماعت کو کتاب و سنت کی تخصیص کا مشورہ دینا خلط و محث اور انتہائی کم علمی پر دلالت کرتا ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے خود کو کبھی اہل تشیع سے وابستہ اور منسوب نہیں فرمایا، اجماع و اجتہاد کی بحث میں ان کے مخاطب سنی مکتب فکر ہی کے لوگ ہیں تو پھر اس بحث میں اہل تشیع کا حوالہ کیا معنی رکھتا ہے؟ گفتگو اور بحث میں ہمیشہ مخاطبین کے مسلمہ مناہج سے استدلال کیا جاتا ہے، ورنہ کل کوئی یا خود ڈاکٹر صاحب مرزا غلام احمد قادیانی، آغا خان، برہان الدین سے اخذ و استفادہ کر کے اہل سنت و جماعت کو مزید نظر ثانی کے نئے مشورے دیں گے تو کیا انھیں بھی قبول کر لیا جائے گا؟ جیسے نیاز فتح پوری کے ہفتوات کو ڈاکٹر صاحب نے بیسویں صدی کی روشن خیال عقلیت کا نمونہ بنا کر پیش فرمایا اور انھیں قبول کرنے کی دعوت دی ہے۔<sup>٢</sup>

۱- نجم الدین الحلی، المعبر فی الشرح المختصر، ایران: مؤسسۃ سید الشہداء، ۱۳۶۴ھ، فی حجة خبر الواحد، جلد ۱، صفحہ ۳۱۔

۲- جہاں تک اہل سنت و جماعت کا تعلق ہے تو اس نام کا اختصاص ہی یہ ہے کہ اس میں سنت اور اجماع دونوں کی حجیت و حتمیت کا اثبات موجود ہے۔ اگر سنت اور اجماع دائمی اور ابدی نہیں ہیں تو پھر یہ طور مذہب اہل سنت و جماعت کا وجود ہی بے معنی ہے۔ بالفاظ دیگر جو شخص سنت اور اجماع کو حجت نہیں مانتا، وہ اہل سنت و جماعت میں داخل نہیں:

فان اهل السنة تتضمن النص، والجماعة تتضمن الإجماع، فأهل السنة والجماعة هم المتبعون للنص والإجماع. [نقی الدین ابن تیمیہ، منہاج السنة النبویة فی نقص الکلام الشیعة والقدریة، لاہور: المکتبۃ السلفیة، [س-ن]، مفصل کلام الرافضی ان اللہ تعالیٰ قادر علی نصب امام معصوم الخ، جلد ۳، صفحہ ۲۷۳۔]

دینی سزائیں: دو قابل لحاظ امور:

سزاؤں کی سرلیج الاثری اور مقاصد الشریعہ کی تکمیل پر ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے متذکرہ تمام بیانات محض مفروضہ ہیں۔ اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ فلاں سزا سرلیج الاثر ہے اور فلاں نہیں؟ جب کہ شارع نے جو سزا [قطع ید] متعین فرمائی ہے اگر شریعت کے بیان فرمودہ اصولوں اور قواعد کے مطابق سزا کے نفاذ و اطلاق کی کوشش کی جائے تو اس سے جرائم [مثلاً چوری] کا سد باب امر واقعہ ہے۔

احکام شریعہ اور سزاؤں کی عدم ابدیت و آفاقیت اور مخصوص زمان و مکان تک محدودیت کے پس پشت دو باتیں کارفرما ہیں:

دینی سزائیں: حق اللہ، یعنی شارع کا حق ہیں:

ان احکام اور سزاؤں کو حق العباد یعنی عدل و انصاف پر مبنی معاشرے کے قیام اور جرائم کی روک تھام کا ضامن و ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”ان تمام معاشرتی اعمال میں اخلاقی اصول کارفرما ہیں اور مقصود و مطلوب ایک اخلاقی معاشرہ کا قیام ہی ہے۔ سزاؤں کا مقصد قطع ید یا کوڑے نہیں بلکہ معاشرے کو ان جرائم سے پاک کرنا ہے۔“

فکر کی مسلسل دینی روایت جو احکام و سزاؤں کی ابدیت و آفاقیت پر یقین رکھتی ہے وہ ان احکام و سزاؤں کو ”حق اللہ“ کی حیثیت سے قبول کرتے ہوئے اس کے نفاذ و اطلاق کی مکلف ہے۔ امام شمس الدین السرخسی لکھتے ہیں:

وفي الشرع الحد اسم العقوبة مقدرة تجب حقا لله تعالى ولهذا لا يسمي به التعزير لانه غير مقدر ولا يسمي به القصاص لانه حق العباد.

”اہل سنت کا لفظ نص کو متضمن ہے اور جماعت کا لفظ اجماع کو شامل ہے، پس اہل سنت و جماعت وہ لوگ ہیں جو نص اور اجماع کی پیروی کرنے والے ہیں۔“

کتاب و سنت تو رہے ایک طرف، یہاں اجماع سے انحراف بھی ضلالت اور گمراہی تصور کیا جاتا ہے اور اسے کسی مصلحت سے قربان نہیں کیا جاسکتا، حافظ ابن حزم اندلسی لکھتے ہیں:

فان الاجماع قاعلة من قواعد الملة الحنيفية، يرجع اليه ويفزع نحوه ويكفر من خالفه اذا قامت عليه الحجة بانه اجماع. [علی بن حزم الاندلسی، مراتب الاجماع فی العبادات والمعاملات والمعتقدات، بیروت: دار الآفاق الجدیدة، ۱۴۰۲ھ، صفحات ۱۱-۱۲۔]

”جس کی طرف [استنباط مسائل میں] رجوع کیا جاتا ہے اور جس کی پناہ لی جاتی ہے۔ کسی مسئلے میں اگر اجماع کا انعقاد ثابت ہو جائے تو اس کے منکر کو کافر قرار دیا جائے گا۔“

۱- منظور احمد، ”چند توجہ طلب مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۳۹۔

۲- شمس الدین السرخسی، المبسوط، بیروت: دار المعرفۃ، ۱۳۹۸ھ، کتاب الحدود، جلد ۹، صفحہ ۳۶۔

قوانین اسلامی — اقدار اور اطلاق دونوں ابدی و دائمی —

”شریعت میں ”حد“ اس مقرر سزا کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے حق کے طور پر واجب ہوتی ہے۔ اس لیے ”تعزیر“ کو ”حد“ سے موسوم نہیں کیا جاتا کہ وہ غیر مقررہ سزا ہے اور نہ ہی ”قصاص“ کو ”حد“ کا نام دیا جاتا ہے کہ وہ حق اللہ نہیں، حق العبد ہے۔“

علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

الحد: في الشرع عبارة عن عقوبة مقدرة واجبة حقا لله تعالى عز شأنه۔  
”شریعت میں حد کے معنی مقررہ سزا کے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حق کے طور پر واجب ہوتی ہے۔“

علامہ شوکانیؒ لکھتے ہیں:

وفي الشرع: عقوبة مقدرة لأجل حق الله۔

”شریعت میں حد ایسی مقررہ سزا کو کہا جاتا ہے جو بہ طور حق اللہ متعین کی گئی ہو۔“

قرآن مجید کے متعلقہ نصوص کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان احکام اور سزاؤں کو شارع نے اصلاً اپنے حق کی حیثیت سے بیان فرمایا ہے۔ اس کا مقدمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی جان و مال اور عزت و آبرو کو حرمت بخشی ہے۔ اب اگر کوئی اس پر تعدی کرتا ہے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کی عطا فرمودہ حرمت پر دست اندازی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔ چنانچہ کسی بھی جرم پر اللہ تعالیٰ کی بیان فرمودہ سزا اور اصل اللہ تعالیٰ کا حق ہے جس کے اطلاق و نفاذ کا مکلف اس نے اپنے بندوں کو ٹھہرایا ہے۔ بلاشبہ پُر امن معاشرے کا قیام اور جرائم کا سدباب ان احکام اور سزاؤں کا ایک اہم پہلو ہے مگر اس کی حیثیت اضافی اور ثانوی ہے۔ اصل رُخ یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے جسے تبدیل یا منسوخ کرنے کا اختیار کسی کو نہیں۔ یہی سبب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدود کے معاملے میں سفارش کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ بنو مخزوم کی فاطمہ نامی ایک خاتون چوری کے مقدمے میں پیش ہوئیں جن کے ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ ہوا تو بنو مخزوم نے سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو ان کے حق میں سفارش پر آمادہ کیا، جب حضرت اسامہؓ نے بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اتشفع في حد من حدود الله؟

”کیا تم اللہ تعالیٰ کی مقرر فرمودہ حدود میں سے ایک حد کے معاملے میں سفارش کر رہے ہو؟“

پھر آپؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا:

ايها الناس انما اهلك الدين من قبلكم انهم كانوا اذا سرق فيهم

۱- علماء الدين الكاساني، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع، بيروت: دار الكتاب العربي، ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۲ء، کتاب الحدود، جلد ۷، صفحہ ۳۳۔

۲- محمد بن علی الشوکانی، نیل الأوطار من أسرار منتقى الأخبار، المملكة العربية السعودية: دار ابن الجوزی، ۱۴۲۷ھ، کتاب الحدود، باب ماجاء في رجم الزاني النخ، جلد ۱۳، صفحہ ۲۲۷۔

الشریف ترکوہ و اذا سرق فہم الضعیف اقاموا علیہ الحد وایم اللہ لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت یدھا<sup>۱</sup>

”تم میں سے قبل بہت سے لوگ محض اس لیے ہلاک ہو چکے ہیں کہ جب ان میں سے کوئی با اثر آدمی چوری کرتا تو چھوڑ دیا جاتا، مگر جب یہی جرم کم زور سے سرزد ہوتا تو ان پر حد قائم کی جاتی، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] بھی چوری کرتیں تو ان کے ہاتھ بھی کاٹ دیے جاتے۔“

ان سزاؤں کا بالذات مقصود معاشرے میں قیام امن نہیں بلکہ شارع کے حق کی ادائیگی ہے جس میں خود اس کے حکم کے بغیر تبدیل و تغیر کا کسی کو اختیار نہیں۔ یہ بات اتنی بدیہی ہے کہ مسلمان فقہا تو رہے ایک طرف، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار A. M. Goichon لکھتے ہیں:

The hadd is a right or a claim of Allah (hakk Allahi), therefore no pardon or amicable settlement is possible once the case has been brought before the Kadi.<sup>۲</sup>

”حد حق اللہ ہے، لہذا جب ایک مرتبہ مقدمہ قاضی کی عدالت میں پیش ہو جائے تو پھر اس میں کسی قسم کی معافی یا صلاح کی گنجائش نہیں۔“

دینی سزائیں: جدید ذہن کی وحشت کا اصل سبب اور ماخذ:

چوں کہ جدید ذہن مغربی پروپیگنڈے کے زیر اثر مذہبی سزاؤں سے نامانوسیت بلکہ وحشت محسوس کرتا ہے اس لیے جدیدیت پسندوں کے نزدیک عہد حاضر میں ان سزاؤں کا اطلاق و نفاذ خلاف مصلحت ہے۔ مگر یہاں اہم سوال یہ ہے کہ جدید ذہن تو صرف ان قوانین اور سزاؤں ہی سے تو حش نہیں محسوس کر رہا بلکہ وہ ان کو غیر مہذب، وحشیانہ اور ظالمانہ بتلا رہا ہے۔ مغربی افکار کا پروردہ جدید ذہن ان سزاؤں کو انسانی عظمت اور وقار کے منافی تصور کرتا ہے۔ زاویہ نگاہ کا یہ فرق صرف قانون کے اطلاق و نفاذ تک محدود نہیں بلکہ یہ اس کی اعتقادی و مابعدا لطبعی بنیادوں سے جڑا ہوا ہے۔ اسلام خالص بندگی اور کامل سپردگی کا نام ہے۔ یہ سپردگی محض قانونی و اعتقادی سطح تک محدود نہیں بلکہ جذبات و احساسات تک خالق کے مقرر کردہ حدود کے پابند اور اس کے دائرے میں اظہار کے مکلف ہیں۔ زمان و مکاں کے بدل جانے اور ضرورت و مصلحت کے نام پر ان قوانین میں تبدیلی کا مطالبہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اجتہاد کے دائرے کو ایمان و اعتقاد تک وسیع کر دیا جائے، جب کہ دین و شریعت محل اجتہاد نہیں بلکہ محل اتباع ہیں۔

۱- مسلم بن حجاج القشیری، صحیح المسلم، کتاب الحدود، باب قطع السارق الشریف وغیرہ، جلد ۲، صفحہ ۶۴۔

2- E.J. Brill, [ed.], The Encyclopaedia of Islam, London: Luzac & Co. 1971, Vol. III, p. 20.

جرائم کے سدباب کے لیے سنگین سزائیں: حکمت و مصلحت:

مغرب کی پیروی میں جو ہمارے جدیدیت پسند حضرات اخلاق اور انسانی حقوق کے نام پر جرائم کی روک تھام کے لیے سزاؤں کی تبدیلی کا مطالبہ فرما رہے ہیں انھیں غور کرنا چاہیے کہ اسلامی معاشروں اور روایتی تہذیبوں میں جہاں جنسی آزادی پر بے تحاشہ پابندیاں ہیں وہاں جنسی جرائم کی شرح کم ہے لیکن مغربی ممالک میں جہاں مکمل جنسی آزادی ہے، جہاں اسکولوں میں مباشرت کی سہولیات میسر ہیں، بیت الخلاء میں مردوں کے لیے مانع حمل غلاف [condoms] مفت مہیا کیے جاتے ہیں، اس کے باوجود ان ممالک میں بدترین جنسی جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں شر کا ایک قوی عنصر موجود ہے، جس کے زیر اثر وہ دوسروں کے جان و مال اور عزت و آبرو پر تعدی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ ان جرائم کا سدباب سخت اور سنگین سزاؤں کی ہی مدد سے ممکن ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

أعلم: أن من المعاصي ما شرع الله فيه الحد، وذلك: كل معصية جمعت وجوهاً من المفسدة، بأن كانت فساداً في الأرض، واقتضاباً على طمأنية المسلمين، وكانت لها داعية في نفوس بني آدم لا تزال تهيج فيها، ولها ضراوة لا يستطيعون الأقلاع منها بعد أن اشربت قلوبهم بها، وكان فيه ضرر لا يستطيع المظلوم دفعه عن نفسه في كثير من الأحيان وكان كثير الوقوع فيما بين الناس، فمثل هذه المعاصي لا يكفى فيها الترهيب بعذاب الآخرة، بل لا بد من إقامة ملامة شديدة عليها وإيلاء ليكون بين أعينهم ذلك، فيرد عنهم عما يريدونه.

”جان لو کہ بعض معاصی کے ارتکاب پر شریعت نے حد مقرر کی ہے، وہ ایسے معاصی ہیں جن کے ارتکاب سے زمین پر فساد پھیلتا ہے، نظام تمدن میں خلل پیدا ہوتا ہے اور مسلم معاشرے کی طمانیت اور سکون قلب رخصت ہو جاتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ وہ معاصی کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ دو چار بار کے ارتکاب سے ان کی لت پڑ جاتی ہے اور پھر ان سے پیچھا چھڑانا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے معاصی میں محض آخرت کے عذاب کا خوف دلانا اور نصیحت کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ ایسی عبرت ناک سزا دی جائے کہ اس کا مرتکب تاحیات معاشرے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور معاشرے کے دیگر افراد کے لیے سامان عبرت بنے تاکہ اس کے انجام کو دیکھ کر بہت کم لوگ اس قسم کے جرم کے ارتکاب کی جرأت کریں۔“

اگر ڈاکٹر منظور احمد صاحب مغربی ممالک میں ہونے والے جرائم کے سلسلے میں European Crime and safety Survey [ECS] کی روداد ملاحظہ فرمائیں تو ان کے ہوش اڑ جائیں۔ مغربی تہذیب جرم و سزا کے باب میں مجرم کے ساتھ اخلاق و ہم دردی کا غیر متوازن رویہ اپنا کر تضاد کا شکار ہو گئی ہے۔ ایک طرف ۱۹۶۵ء میں سویڈن میں اس کو جرم قرار دیا گیا کہ شوہر اپنی بیوی کی رضا کے بغیر اس سے ہم بستر نہیں ہو سکتا۔ یہ جرم Hidden Hurt اور Marital Rape بھی کہلاتا ہے۔ اسی سلسلے کی نادر ترین تحقیق کے مطابق:

Researchers estimate that 10-14 percent of married women in the United States have been raped by their husbands.<sup>1</sup>

دوسری طرف ہر طرح کی جنسی آزادی اور آبرو باختگی کی اجازت کے باوجود European Crime and Safety Survey کے مطابق آئر لینڈ، سویڈن، جرمنی، آسٹریا، ہنگری، اسپین، فرانس، پرتگال وغیرہ میں عورتوں کو جنسی دہشت گردی [Sexual Terrorism] کا سامنا ہے، ایک برطانوی مصنفہ Joanna Bourke کی کتاب "Rape: A History From 1860 to the Present" [London: Virgo Press] میں اعداد و شمار کے مطابق برطانیہ میں زنا بالجبر کے رپورٹ ہونے والے واقعات میں سے صرف پانچ فی صد مقدمات میں مجرم کیفر کردار تک پہنچتا ہے۔ اس کے باوجود مصنفہ جب سید باب کی بابت گفتگو کرتی ہیں تو سخت سزا دینے کے بجائے دواؤں اور نفسیاتی بحالی کے ذریعے ان کا علاج تجویز کرتی ہیں۔

ان حالات و واقعات کی روشنی میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ شریعت اسلامی نے ان جرائم کے سید باب کے لیے جو سزائیں متعین فرمائی ہیں وہ سریع الاثر بھی ہیں اور جرم و سزا کے متوازن ربط و تعلق کا مظہر بھی۔ بہ شرط یہ کہ اس کا درست طور پر نفاذ ہو۔

حدود: چند محدود سزائیں ہی دائمی اور ابدی ہیں:

کتاب و سنت نے ان گنت جرائم کی سزاؤں میں سے صرف پانچ جرموں کی سزا کو حدود میں شامل فرما کر انہیں کسی قسم کی ترمیم و تہنیک سے محفوظ فرما دیا ہے، ان حدود کی تفصیل یہ ہے:

[۱] حد زنا، [۲] حد قذف، [۳] حد سرقہ، [۴] حد حرابہ، [۵] حد شرب خمر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک پوری امت ان حدود کو کسی بھی قسم کی تبدیلی و ترمیم سے ماورا سمجھتے ہوئے اس پر عمل کی مکلف رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی متعدد صحابہؓ سے منقول ہے:

1- Vincent N. Parrillo, Encyclopedia of Social Problems. Vol. 2, California: SAGE Publications, 2008, p. 751.



اقامة حد من حدود الله خير مطر اربعين ليلة في بلاد الله عز وجل.  
”اللہ تعالیٰ کی زمین پر کسی ایک حد کا عملی نفاذ چالیس روز کی بارش سے بہتر ہے۔“

چند مخصوص سزاؤں کا دوام انسانیت اور معاشرے کی حفاظت کا ضامن:

قابل غور نکتہ یہ ہے کہ شریعت اسلامی نے بے شمار جرائم کی سزاؤں میں سے چند صرف سزاؤں ہی کو حدود میں کیوں شامل فرمایا؟ تاریخ اقوام عالم پر نظر رکھنے والے اس بات سے بہ خوبی واقف ہیں کہ ان امور پر انسانی فکر و عمل بڑی تلون مزاجی کا شکار رہے ہیں۔ کہیں ان کا ارتکاب ہی قابل مواخذہ اور لائق عقوبت نہیں، کہیں اس سنگین نوعیت کی سزا ہے جس کا مجرم حق دار نہیں۔ مثلاً بدھ بھشکوؤں اور مسیحی راہبوں کے ہاں عورت سے ازدواجی تعلقات تو دور کی بات ہے اسے ہاتھ لگانا بھی معصیت کی علامت تھی۔ دوسری طرف رومی سلطنت میں عورت محض جنسی تسکین کا ایک آلہ تصور کی جاتی تھی جس کے لیے کسی قانونی رشتے کی تحدید کی ضرورت نہیں یہی حال بالعموم موجودہ مغربی تہذیب کا ہے۔ ہندی تہذیب کا حال یہ تھا کہ اعلیٰ ذات کا ہندو کم ذات کی عورت سے زنا کرے تو اسے معمولی تنبیہ کے بعد چھوڑ دیا جاتا، ادھر جنوبی افریقہ میں سفید فام مرد سیاہ فام عورت سے زنا کرے تو محض چند ماہ کی سزا۔ دوسری طرف کم تر ذات کا ہندو اعلیٰ ذات کی عورت سے یا سیاہ فام مرد سفید فام عورت سے زنا کا ارتکاب کرے تو کہیں اسے قتل کر دیا جاتا، کہیں [منوسمرتی] قطع عضو تناسل کی سزا تجویز تھی، اور کہیں اسے گائے کے گوبر اور پیشاب میں رکھا جاتا اور وہی اسے کھلایا پلایا جاتا۔

کہیں چوری کی سزا میں مجرم کے ہاتھ پر کھولتا ہوا تیل ڈال دیا جاتا اور کہیں چوری کرنے کے بعد فرار ہو جانے کا نام مردانگی قرار پاتا۔ ایک جانب اٹلی اور یورپ کے بعض دوسرے ممالک میں سرے سے قتل کی سزا ہی نہیں ہے۔ دوسری طرف جنوبی امریکہ میں ایک گورے کے بدلے دو تین کالے قتل کیے جاتے تھے۔ بہت عرصہ نہیں گزرا کہ امریکہ میں عوام کو کالوں کو سنگسار کرنے کا حق حاصل تھا۔

اس تلون مزاجی کا علاج حدود اللہ ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بنیادی جرائم کی سزا میں از خود متعین فرما کر معاشرے کی بنیادوں کو دائماً محفوظ و مامون فرما دیا ہے تاکہ انسانوں کی تلون مزاجی اس میں مداخلت کر کے اسے نقصان نہ پہنچا سکے۔

حدود: ثبوت جرم شریعت کے ضابطہ شہادت کے مطابق لازمی ہے:

ایک نکتہ مزید قابل غور یہ ہے کہ ان متعین حدود میں بھی اگر جرم کا ثبوت شریعت کے مقرر کردہ ضابطہ شہادت سے نہ ہو سکے یا جرم کا ثبوت تو ملے مگر اس جرم پر جن شرائط کے ساتھ یہ سزا دی جاتی ہے وہ شرائط مکمل نہ ہوں اور نفس جرم قاضی یا حج کے نزدیک ثابت نہ ہو تو اس صورت میں بھی حد شرعی جاری نہ ہوگی بلکہ تعزیری سزا دی جائے گی۔ اس کے ساتھ یہ شرعی ضابطہ اور قاعدہ بھی مقرر اور مسلم ہے کہ شہیے کا فائدہ مجرم کو پہنچتا ہے۔ ثبوت جرم یا جرم کی شرائط میں سے کسی چیز میں شبہہ پڑ جائے تو حد شرعی ساقط ہو

۱- محمد بن یزید القزوی، السنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، باب اقامة الحدود، جلد ۵، صفحہ ۱۸۵۔

قوانین اسلامی — اقدار اور اطلاق دونوں ابدی و دائمی —

جاتی ہے مگر نفس جرم کا ثبوت ہو جائے تو تعزیری سزا دی جائے گی۔

تعزیر: احوال و ظروف کے مطابق قابل تبدیل سزائیں:

جو سزائیں اس لائق تھیں کہ انھیں زمان و مکان اور احوال و ظروف کی تبدیلی سے بدلا جاسکتا ہو، شارع نے انھیں از خود تعزیر قرار دیتے ہوئے اس کا فیصلہ قاضی اور عدالت کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے۔ اسلامی قانون میں شارع کی نگاہ بہت وسیع اور عمیق ہے۔

قوانین اسلامی میں صرف اقدار مستقل ہیں: ایک موہوم بیان:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”ان قوانین میں جو شے مستقل ہے وہ قدر ہے۔“

قدر کہاں سے برآمد ہوگی؟ اُسے متعین کون کرے گا؟ اُس کی معرفت و تفہیم کا منہاج کیا ہوگا؟ نزاع کی صورت میں رفع اختلاف اور تصفیے کی کیا صورت ہوگی؟ ڈاکٹر صاحب نے ان امور کی کوئی وضاحت نہیں فرمائی۔ اسلامی سیاق میں ڈاکٹر صاحب کا منقولہ بالا فقرہ محض ایک مفروضہ ہے اور مستقل اقدار کی بات موہوم ہے۔ اسلامی علمیات میں اقدار ہی نہیں بلکہ مابعد الطبیعی مآخذ [وحی الہی] کے ذریعے بیان شدہ اقدار اور اس کے نفاذ و اطلاق کے طریقے بھی مستقل ہیں۔ یہی وصف اسلام کو ادیان ماسبق اور مقدم و معاصر تہذیبوں سے ممتاز و ممتاز ثابت کرتا ہے۔

مصلحت: مفہوم اور اقسام:

ڈاکٹر منظور احمد نے ”مصلحت“ پر گفتگو کے باوجود اس کا مطلب واضح نہیں فرمایا۔ کہ مصلحت سے ان کی مراد کیا ہے؟ مصلحت کے متعلق ہر ایک کا اپنا نقطہ نظر ہے، مثلاً تاجر کی مصلحت اور ہے، خریدار کی مصلحت اور ہے، مالک کی مصلحت اور ملازم کی مصلحت اور ہے۔ اگر مصلحت کا تعین افراد کی صواب دید پر چھوڑ دیا جائے تو دنیا کا سارا نظام ہی تباہ ہو جائے گا۔ اسی لیے کسی بھی مصلحت کے حقیقی یا غیر حقیقی ہونے کا تعین ایسی بنیاد پر استوار ہونا چاہیے جو ہر ایک کے لیے یکساں اور معروضی ہو۔ وہ بنیاد صرف شریعت الہی ہو سکتی ہے، جو تمام مصالح سے ماورا ہے۔ اس لیے وہ تواتر اور غیر جانب داری سے فیصلے کر سکتی ہے کہ کون سی مصلحت قابل قبول ہے اور کون سی نہیں۔ اس اعتبار سے مصلحت کی تین اقسام ہیں:

[۱] مصلحت معتبرہ: وہ مصلحت جس کو شریعت نے قابل اعتبار قرار دیا ہے، یعنی کتاب و سنت یا کسی معتمد استنباط سے مستند فقیہ نے اسے معتبر قرار دیا ہو۔ حضرت امام شاطبیؒ لکھتے ہیں:

كل اصل شرعی لم یشهد له نص معین و كان ملائماً لتصرفات الشرع  
وما خوداً معناه من أدلتہ ، فهو صحیح یبنی علیہ ویرجع الیہ۔<sup>۱</sup>

۱- ابوالفتح ابراہیم الشاطبیؒ، الموافقات، المقدمة الثالثة، فصل إلماحة المصالح المرسله والاستحسان الخ، جلد ۱ صفحہ ۳۲۔

”ہر وہ اصل شرعی جس کی متعین نص [کتاب، سنت اور اجماع] سے تائید نہ ہوتی ہو اور وہ شرعی تصرفات کے موافق ہو اور اس کا مفہوم دلائل شرعیہ سے ماخوذ ہو تو وہ اصل صحیح قرار پائے گی جس پر بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ اور [احکام کے استنباط کے لیے] اس کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔“

[۲] مصلحت ملغاة: وہ مصلحت جسے شریعت نے باطل اور لغو قرار دیا ہو، اسے مصلحت غیر معتبرہ بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی مصلحت کی بنیاد پر اگر احکام کا استنباط نص یا اجماع سے ثابت شدہ حکم سے متصادم ہو تو ایسی مصلحت قابل اعتبار نہ ہوگی۔ مثال کے طور پر کوئی ایسی مصلحت جس سے وراثت میں بیٹے اور بیٹی کے درمیان مساوات لازم آتی ہو، نص قرآنی سے معارض ہونے کے باعث ایسی مصلحت قابل اعتبار نہ ہوگی۔

[۳] مصلحت مرسلہ: وہ مصلحت جسے شریعت نے چھوڑ دیا ہے بالفاظ دیگر جس بارے میں شریعت خاموش ہو۔ یعنی ان کے مطابق وہ امور جن پر کتاب و سنت یا اجماع سے کوئی اصل شرعی، خواہ معتبر یا نامعتبر، موجود نہ ہو، امام مالکؒ، جن کے نزدیک ”مصلحت“ بھی ایک دلیل شرعی ہے وہ اس کا یہ مفہوم متعین فرماتے ہیں کہ:

”کسی حکم کو ایسے ضابطہ معنوی سے منسلک کر دیا جائے جو مصلحت عامہ اور منشاء شریعت دونوں کے موافق ہو، یا بالفاظ دیگر ایسا اصول قائم کیا جائے جس میں رفاہ عامہ اور منشاء شریعت دونوں کا لحاظ رکھا جائے اور اسی کے مطابق حکم لگایا جائے۔“

اس نئی دلیل کے لیے تین شرائط ہیں: ایک یہ کہ مسئلہ عبادات کا نہ ہو بلکہ معاملات یعنی امور دنیاوی سے تعلق رکھتا ہوتا کہ اس میں نظر و فکر کے ذریعے مصلحت کا تعین کیا جاسکے۔ دوسرے یہ کہ مصلحت عامہ روح شریعت کے موافق ہوتا کہ دلائل شرعیہ کے مخالف نہ ہو۔ اور تیسری شرط یہ ہے کہ مصلحت عامہ کا تعلق ضروریات زندگی یا حاجیات [امور عامہ] سے ہونہ کہ کمالیات [تعیشات] سے۔ ضروریات زندگی سے یہ مراد ہے کہ ان سے مذہب، جان، عقل، نسل اور مال کی حفاظت مقصود ہو۔ حاجیات سے مراد وہ امور عامہ ہیں جو معاش کی بہتری کے لیے ضروری ہیں، اور کمالیات سے وہ امور مراد ہیں جن کا تعلق سامان تعیش اور آرائش سے ہو۔<sup>۱</sup>

امام شاطبیؒ مزید وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

المصالح المرسله: وهي التي لم يشهد لها أصل شرعي من نص أو إجماع، لا بالاعتبار ولا بالإلغاء.<sup>۲</sup>

- ۱- عبد الوہاب خفاف، علم اصول الفقہ، القاہرہ: مکتبۃ الدعوة الاسلامیۃ، ۱۳۷۶ھ، القسم الأول فی الأدلۃ الشرعیۃ، الدلیل السادس: المصلحة المرسله، صفحہ ۸۷۔
- ۲- ڈاکٹر سنجی محمدصانی، فلسفہ شریعت اسلام، [مترجم: مولوی محمد احمد رضوی]، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۹ء، صفحات ۱۷۲-۱۷۳۔
- ۳- ابوالحسن الشاطبیؒ، الموافقات، المقدمة الثالثة، فصل، جلد ۱ صفحہ ۳۲۔

قوانین اسلامی — اقدار اور اطلاق دونوں ابدی و دائمی —

”مصلح مرسلہ وہ ہیں، جن کی کوئی شرعی اصل [کتاب و سنت اور اجماع] شہادت نہ دے، نہ لغو قرار دے اور نہ اعتبار کرے۔“

امام شاطبیؒ ایک مقام پر وضاحت کے ساتھ ایک فصل کا عنوان قائم فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:  
المراد بالمصالح و المفسد ما كانت كذلك في نظر الشرع لا ما كان ملائماً او منافراً للطبع.

”مصلح اور مفسد سے مراد یہ ہے کہ وہ شارع کی نگاہ میں مصلح اور مفسد ہوں، اشخاص کی طبیعت کے مناسب ہونے کا اعتبار نہیں۔“

اب یہ فقہیہ کی جہد کا میدان ہے، وہ دیکھے کہ اگر اس سے شریعت کا کوئی حکم پورا ہوتا ہے یا مصلحت معتبرہ کو اس سے جلا ملتی ہے اور کوئی بھی حکم شریعت پامال نہیں ہوتا تو یہ مصلحت قابل قبول ہو جاتی ہے اور اس مصلحت کی بنیاد پر احکام مرتب کیے جاسکتے ہیں۔ مصلحت کے یہ تینوں تصورات ہمارے کلاسیکی فقہاء کے ہاں مروج رہے ہیں۔

مقاصد شریعت کا تحفظ: مصلحت کے معتبر ہونے کی علامت ہے:

حضرت امام غزالیؒ [م ۵۰۵ھ] اور حضرت امام شاطبیؒ [م ۹۰ھ] نے شریعت اسلامی کے پانچ مقاصد بیان کیے ہیں۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں:

فان جلب المنفعة و دفع المضرة مقاصد الخلق و صلاح الخلق في تحصيل مقاصدهم ولكننا نعني بالمصلحة المحافظة على مقصود الشرع من الخلق خمسة وهو ان يحفظ عليهم دينهم و نفسهم و عقلهم و نسلهم و مالهم فكل ما يتضمن حفظ هذه الاصول الخمسة فهو مصلحة و كل ما يفوت هذه الاصول فهو مفسدة و دفعها مصلحة۔

”جلب منفعت اور دفع مضرت مقاصد خلق میں سے ہیں۔ مخلوقات کی اصلاح ان مقاصد کے حصول میں دائر ہے۔ مصلحت سے مراد شریعت کے پیش نظر مخلوقات کے پانچ مقاصد ہیں: تحفظ دین، تحفظ نفس، تحفظ عقل، تحفظ نسل اور تحفظ مال۔ جو امر ان اصول خمسہ کی حفاظت کرنے والا ہو وہ مصلحت ہے اور جس سے ان اصولوں کو نقصان پہنچتا ہو وہ مفسدہ ہے اور اس کو دور کرنا مصلحت ہے۔“

امام غزالیؒ کے بیان فرمودہ اصول خمسہ کی روشنی میں جب حدود اسلامی کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شرعی سزائیں اور حدود ان اصول خمسہ کے تحفظ ہی پر مبنی ہیں۔

۱- محمد الغزالی، المستصفی من علم الاصول، مسئلة لا آكل مثلاً يفيد العموم، جلد ۱، صفحات ۲۸۶-۲۸۷۔

امام شاطبیؒ [۷۹۰ھ] کے الفاظ میں: مسلم معاشرے کے افراد کو اعتداء علی المال، اعتداء علی النسل، اعتداء علی العقل، اعتداء علی الدین اور اعتداء علی النفس کے جرائم سے پاک رکھنا اسلامی نظام حدود و تعزیرات کا اہم مقصد ہے۔ ہر وہ امر جس سے ان مقاصد خمسہ کو تقویت یا ترقی حاصل ہوتی ہو وہ مصلحت ہے۔ اور جس شے سے یہ مقاصد مجروح یا فوٹ ہوتے ہوں وہ مفسدہ ہے اور اس مفسدہ کا انسداد مصلحت ہے۔ مصلحت، منصوص حکم کو بھی ساقط کرنے کی اہلیت رکھتا ہے: منظور احمد:

ظاہر ہے مصلحت کے اس روایتی تصور کے تو ڈاکٹر منظور احمد صاحب قائل نہیں ہیں، وہ اس مصلحت کے قائل ہیں جس کا انھوں نے شیعہ اصولی نجم الدین الطوننی کے موقف کو ”زیادہ عقلی و منطقی“ قرار دے کر اظہار کر دیا ہے کہ: ”مصلحت اجماع تو درکنار کتاب و سنت کی بھی تخصیص کر سکتی ہے۔“ یعنی کتاب و سنت کے بیان فرمودہ احکام اور قوانین ابدی و دائمی نہیں، انھیں معاشرتی و سماجی ضروریات کے تقاضوں اور نفسیاتی و تمدنی حالات کے لحاظ سے ”مصلحت“ کے نام پر تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ ایک مقام پر ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے صاف لفظوں میں اس کا اقرار بھی فرما دیا ہے:

”انسان حکم کے پیچھے مقصد اور مصلحت معلوم کرے اگر وہ مقصد اور مصلحت، قرن اول کے کسی حکم سے قرن آخر میں پوری نہیں ہو رہی تو مصلحت کو باقی رکھے کہ وہ دوامی ہے اور حکم کو بدل دے کہ وہ وقتی ہے اور اگر سرے سے مصلحت ہی تبدیل ہو جائے تو وہ حکم بھی ساقط ہو جائے گا۔“

ایک ہی عبارت میں ڈاکٹر صاحب مصلحت کو ”دوامی“ بھی قرار دے رہے ہیں اور ”متغیر“ بھی، یہ عجیب تضاد ہے۔ سوال یہ ہے کہ شریعت کی حکمتوں کا تعین کون کرے گا؟ شریعت کی حکمتیں صاحب شریعت، اُن کے فیض یافتہ صحابہ اور اُن کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں ”فقہائے عابدین“ کے ذریعے اُمت پر آشکارا ہوتی رہیں گی۔ مصلحت، حکمت، قدر اور یسر کے نام پر اُمت کو شریعت ہی سے رخصت دے دی جائے یہی جدیدیت پسندوں کا اصل مقصد ہے۔

مصلحت کے نام پر منصوص احکام کی تبدیلی: چند اہم سوالات:

غور فرمایا جائے کہ مسجد روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، اسے محض عمارت، ادارے اور دیوار و در سے تعبیر کرنا درست نہیں۔ یہ اس روح کا نام اور علامتی اظہار ہے جسے ایمان کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر یہی مسجد ایمان کے راستے میں رکاوٹ بن جائے اور اہل ایمان کے دشمنوں کی پناہ گاہ میں تبدیل ہو جائے تو ایسی مسجد ڈھادینے کے قابل ہے، زمانہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں مسجد ضرار کو اسی حکمت کے پیش نظر ڈھادیا گیا: وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِزْوَاجًا لِمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ وَ

۱۔ منظور احمد، ”روایت، جدیدیت اور لسانیات“، مشمولہ ماہ نامہ صریح، صفحہ ۲۵۔

اللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ . لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا لَمَسْجِدَ أُسَسَ عَلَى التَّقْوَى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ [۹: ۱۰۷-۱۰۸] — اسی طرح شراب کی حرمت و ممانعت کے ابتدائی دور میں ان برتنوں تک میں پانی پینے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی جن میں شراب پی جاتی تھی تاکہ شراب کی یاد نہ آئے، لیکن جب یہ علت باقی نہ رہی تو ان ہی برتنوں کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ حضرات صحابہؓ نے شکوہ بھی کیا کہ ہم چمڑے کے برتنوں کو استعمال کرتے ہیں، چوہے انھیں کتر جاتے ہیں۔ صحابہؓ تکلیف میں تھے، دشواری درپیش تھی لیکن سہولت کو ایمان پر مقدم نہیں رکھا گیا — مقاصد الشریعہ کے منافی کسی سہولت کی اجازت نہیں دی جاسکتی — اگر مقاصد الشریعہ محفوظ و مامون رہیں تو سہولت دی جاسکتی ہے، سہولتوں کی اجازت مقاصد الشریعہ کے تابع ہے۔ زمانے کی تبدیلی کی آڑ، اجتہاد کی گنجائش کا بہانہ اور یسر کے نام پر مقاصد الشریعہ کو پامال کر دینے کا واحد مقصد تحریف دین اور اسلام کو زمانہ حاضر میں ناممکن العمل ثابت کرنا ہے۔

دین میں اجتہاد اور یسر کے نام پر تحریف کرنے والے جدیدیت پسند مفکرین درج ذیل امور کے متعلق کوئی رہنمائی نہیں کرتے کہ اگر اجتہاد ”خصوصی روایت کے تغیر کو بے جا نہیں سمجھتا“ تو پھر:

[۱] عہد جدید میں خواتین کی ایام حیض میں نمازوں سے رخصت بھی منسوخ کر دینی چاہیے کیوں کہ سائنس کی جدید طبی سہولیات کے ذریعے حیض کو روکا جاسکتا ہے لہذا عورتیں حیض روک کر نمازیں پڑھیں۔  
[۲] سفر کی دشواریوں کے باعث زمانہ قدیم میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی تھی اب سفر کی جدید سہولتوں سے فائدہ اٹھا کر سفر میں روزے اور قصر کی رخصت ختم کر دی جائے کیوں کہ مقیم اور مسافر کی تقسیم اب بے معنی ہے۔

[۳] زمانہ قدیم میں بینک نہ ہونے کے سبب اموال باطنہ کا اندازہ ممکن نہ تھا اب بینک کی سہولت سے فائدہ اٹھا کر بیت المال اموال باطنہ پر بھی زکوٰۃ لے۔

[۴] گزشتہ ادوار میں صحابہؓ و صلحا اونٹ اور گھوڑے کی پیٹ پر تپتے ہوئے صحرا اور جھلستی ہوئی ریت میں پیر اور جمعرات کے روزے رکھتے تھے اب جدید سہولتوں کے ہوتے ہوئے مسلمان ہفتے میں چار دن روزے رکھیں۔

[۵] قرضہ جدید معیشت کا اہم ترین جز ہے جس کے بغیر معیار زندگی، کاروبار اور حکومت و ریاست کا تصور محال ہے اب بینکوں سے قرضہ بھی مل جاتا ہے اور معاف بھی کرایا جاسکتا ہے لہذا قرضے کی تمام احادیث منسوخ سمجھی جائیں۔

[۶] جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے مگر اب یہ ذمے داری فوج کے سپرد ہو گئی ہے اور مسلمان افواج کی تیاری پر اربوں روپے خرچ کرتے ہیں لہذا غیر فوجی مسلمین سے جہاد ساقط کر دیا جائے۔

[۷] نکاح کی حکمت و مصلحت شریعت نے حفظ فروج اور افزائش نسل بتلائی ہے۔ یہ دونوں مصلحتیں جدید سائنس کی طبی تحقیقات کے ذریعے بہ سہولت حاصل ہو سکتی ہیں۔ شہوت جو حفظ فروج کے

لیے خطرہ ہے اسے شہوت کش جدید ادویات کے ذریعے دبایا جاسکتا ہے اور بقا و افزائش نسل ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے ذریعے بھی ہو سکتی ہے یا جہاں آبادی زیادہ ہو وہاں سے بچے لیے جاسکتے ہیں۔ جدید سائنسی ایجادات کے باعث یہ دونوں مصلحتیں پوری ہو رہی ہیں۔ اب نکاح کی کیا ضرورت ہے، اس لیے شریعت کو یہاں مزاحم نہیں ہونا چاہیے۔

جدیدیت پسند: مصلحت کی آڑ میں تحریف دین کی کوشش:

یہ تمام باتیں اسی نکتے کا ثمر ہیں، جسے جدیدیت پسند، حکمت، حکم، مصلحت اور اصل روح قرار دے کر احکام اسلامی کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ اجتہاد کے نام پر جدیدیت پسندوں کی دور از کار تاویلات تحریف دین کے نئے نئے طریقے وضع کر رہی ہیں۔ سیاق و سباق سے کاٹ کر اس بحث کے دائرے کو پھیلانے اور ان ”مصلحتوں“ کو اختیار کر لینے کے بعد دین ایک کھلونا بن جائے گا۔ اگر مصلحت کو اصل قرار دے دیا جائے جیسا کہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا ارشاد ہے تو ایک ہی معاملے میں اشخاص کے مختلف ہونے سے حکم مختلف ہو جائے گا۔ ایک ہی حکم ایک شہر میں جائز ہوگا اور دوسرے میں ناجائز۔ ایک چیز ایک شخص کے لیے حلال ہوگی دوسرے کے لیے حرام۔ اس طرح شریعت اسلامی، جو تمام انسانوں کے لیے ہے، کا حلیہ بگڑ جائے گا جو جدیدیت پسندوں کا خواب ہے۔

مصلحت کے اسی خیال کو ولیم پٹ نے یوں بیان کیا ہے:

Necessity is the plea for every infringement of human freedom: It is the argument of tyrants; it is the creed of slaves!-

”یعنی ہر انسانی آزادی چھیننے کے لیے ضرورت و مصلحت کا سہارا لیا جاتا ہے، یہ جابروں کی دلیل اور غلاموں کا مذہب ہے۔“

1- Elizabeth M. Knowles, *The Oxford Dictionary of Quotations*, New York: Oxford University Press, 1999, p. 577.

## روشن خیالی اور قدامت پرستی — اصل جھگڑا

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”اس وقت روشن خیالی اور قدامت پرستوں کے درمیان مابہ النزاع مسئلہ یہی ہے، کیا آج ہم اسلامی تعلیمات کو ایک نئے اور جدید انداز سے سمجھ سکتے ہیں اور اس کو اپنی زندگی سے با معنی طور پر متعلق کر سکتے ہیں؟ قدامت پرستوں کا کہنا ہے کہ زمانے میں ایسی کوئی نوعیتی [qualitative] تبدیلی واقع نہیں ہوئی جو اسلامی اصولوں کے پرانے اطلاقی طریقوں کو بے معنی بنا دیں۔“

روشن خیالی: مبدا و مرجع:

سارا جھگڑا ”روشن خیالی“ [Enlightenment] ہی کے باعث ہے۔ یہ وہی نزاع ہے جو ایک زمانے میں کیتھولک [قدامت پرستوں] اور پروٹسٹنٹ [روشن خیالوں] کے مابین تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب جیسے ”روشن خیالوں“ کے ”قدامت پرستوں“ پر تمام اعتراضات پروٹسٹنٹ دینیات کے مختلف اسکولوں کی تقلید پر مبنی ہیں۔ اس تقلید کو ”اجتہاد“ کے نام پر مسلمانوں میں رواج دینے کی باضابطہ کوشش کی جا رہی ہے۔ عیسائیت کو شکست دینے اور اسلام کو مسخ کرنے کی اس کاوش میں دونوں جگہ سائنس سے مرعوبیت، مذہبی اقدار و روایات کے تسلسل سے بیزاری اور روایتی فکر پر عدم اعتماد کی لہر کا فرما ہے۔

روشن خیالی: ہر مقتدرہ پر عقل کی حاکمیت اور برتری کا اعلان:

روشن خیالی کے اصول و مبادی سے سرسری واقفیت رکھنے والے بھی یہ جانتے ہیں کہ انسان کے قائم بالذات ہونے کا تصور روشن خیالی فکر کا خاصہ ہے۔ Kant کے مطابق جب انسان اپنی عقل کو کسی مقتدرہ [authority] کے تابع کیے بغیر بہ ذاتِ خود استعمال کرے تو وہ ”روشن خیالی“ ہے: وہ لکھتا ہے:

Enlightenment is man's emergence from his self-imposed immaturity. Immaturity is the

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی العارف، صفحہ ۷۰۔



inability to use one's understanding without guidance from another. This immaturity is self-imposed when its cause lies not in lack of understanding, but in lack of resolve and courage to use it without guidance from another. ۱

”روشن خیالی اس ذہنی ناپختگی سے انسان کی نجات کا نام ہے جو اس نے خود پر مسلط کر رکھی تھی۔ یہ ذہنی ناپختگی فی الاصل دوسروں کی رہنمائی کے بغیر اپنے عقل و فہم کو استعمال نہ کر سکنے کی کیفیت ہے، مگر اس کی وجہ انسانی عقل و فہم کا عدم وجود نہیں بلکہ انسان میں اس جرأت اور پختہ ارادے کی کمی ہے جو اسے کسی اور کی رہنمائی کے بغیر اپنی عقل استعمال کرنے کے قابل بنا سکے۔“

اس سے پتا چلتا ہے کہ عقل، ایمان سے مقدم ہے۔ عقل ہی کا موثر استعمال انسانی ذہن اور ارادے کی بلوغت [maturity] کو یقینی بناتا ہے۔ عدم بلوغت [immaturity] سے بلوغت [maturity] تک کا یہ عمل ”روشن خیالی“ ہی کے ذریعے ممکن ہوا ہے۔ عدم بلوغت [immaturity] سے کانٹ کی مراد انسانی ارادے کی وہ مخصوص کیفیت ہے، جہاں انسان اپنی عقل کے استعمال کے بجائے [بلکہ اسے فراموش کر کے] کسی اور مقتدرہ کے حق اور اختیار کو تسلیم کر لیتا ہے۔ اس فکر کا تعلق اسلام سے ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

عقل کی خدائی: انسان کی بدترین غلامی کا نتیجہ:

”روشن خیالی“ ہر جہت سے وحی الہی یا کسی بھی خارجی ذریعہ علم [external authority] کے انکار سے عبارت ہے۔ روشن خیالی کی حقیقت سے نقاب کشائی کے لیے خود مغرب ہی میں بعض اہم اور سنجیدہ مبصرانہ اور تجزیاتی کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ ۲ اگر انھیں توجہ سے پڑھ لیا جائے تو کوئی صاحب شعور روشن خیالی کو ”اسلامیانے“ کی بات نہ کرے۔ یہ کتابیں روشن خیالی کے دور کی پرسوز اور دل دوز داستانیں ہیں کہ عقل کی خدائی نے انسانیت کو بدترین غلامی میں جھونک دیا ہے۔ ہر شخص سائنسی و صنعتی ترقی کی بیڑی میں جکڑا ہوا ہے اور انسان سرمایہ داری کے اہنی قفس میں محبوس و محصور ہو گیا ہے۔ فکر معاش ہر فکر پر غالب،

1- Immanuel Kant, "What is Enlightenment", in *Perpetual Peace and Other Essays on Politics, History, and Moral Practice*, [ed., Ted Humphrey], Indianapolis: Hackett Publishing, 1983, p. 41.

2- Ibid.

۳- اس سلسلے کی دوا ہم اور لائق مطالعہ کتابیں یہ ہیں:

[1] Herbert Marcuse, *One-Dimensional Man: Studies in the Ideology of Advanced Industrial Society*, Boston: Beacon Press, 1991.

[2] Max Horkheimer & Theodor W. Adorno, *Dialectic of Enlightenment: Philosophical Fragments*, Stanford University Press, 2002.

برتر اور فائق ہوگئی ہے۔ مغربی فلاسفہ کی نظر میں روشن خیالی [Enlightenment] کے اہداف و مقاصد آزادی، آزادی اور آزادی کے سوا کچھ نہیں ہیں:

For this Enlightenment, however, nothing is needed but freedom; and indeed the most harmless of anything that could be called freedom: namely, freedom to make public use of one's own reason in all matters.<sup>1</sup>

Kant in fact describes Enlightenment as the moment when humanity is going to put its own reason to use, without subjecting itself to any authority.<sup>2</sup>

اسلامی سیاق میں ”روشن خیالی“: مقاصد، اثرات، نتائج:

متذکرہ اقتباس روشن خیالی [جدیدیت پسندوں۔ یا پروٹسٹنٹ] اور روایتی مسلمانوں [قدامت پرستوں۔ یا کیتھولک] کے درمیان مابہ النزاع کو واضح کر دیتا ہے۔ جس میں جدیدیت پسندوں کی طرف سے، الا ماشاء اللہ، نیک نیتی کا کوئی جذبہ موجود نہیں ہے، بلکہ یہ غیر اسلامی نظریات، مغرب اور سائنس کی مرعوبیت اور اس کے لیے دلوں میں پوشیدہ محبت و ستائش کا نتیجہ ہے۔ اس کے پس پردہ یہی خواہش اور تمنا کارفرما ہے کہ کسی طرح شریعت مطہرہ کو انسان کی نفسانی خواہشات کے مطابق ڈھال دیا جائے اور قرآن و سنت کے نصوص قطعاً کو تبدیل کر کے ان خیالات و تصورات کو اسلام سے ہم آہنگ کر دیا جائے، جنہیں غیر اسلامی نظریات و افکار، سے بہ نظر استحسان دیکھتے ہوئے، اخذ کیا گیا ہے اور ان افکار کو علما کی طرف سے اسلامیانے [Islamization] کی سند مل جائے۔ اسلام کی ”کمی“ کو ان افکار و اقدار کی قبولیت سے دور کیا جائے اور اس ”حکمت و فرزانگی“ سے مزین کیا جائے جس سے اب تک اسلام محروم رہا ہے۔ بالفاظ دیگر ان تنصرت کے نزدیک اسلام کے پاس چند ایسے ابدی اصول موجود ہیں، جنہیں کسی ماورائے اسلام نظام زندگی میں سمو کر اور تحلیل کے عمل سے گزارنے کے بعد ”اسلامی“ بنایا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اسلام ہر عہد کے تقاضوں کے ساتھ چلنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ اس فکر کے حامل لوگ مغربیوں سے بڑھ کر مغربی ہوتے ہیں۔ حسین نصر نے مغربی فکر سے ماخوذ بلکہ اس کی اسیر مشرقی ذہنیت پر بہت اچھا تبصرہ کیا ہے:

The most intelligent students at Oxford or Harvard are far less confident in the West and its future than those modernized Orientals who for some time

- 1- Immanuel Kant, *Groundwork for the Metaphysics of Morals*, [ed., Lara Denis], Canada: Broadview Press, 2002, p. 120.
- 2- Michel Foucault & Sylvère Lotringer, *The Politics of Truth*, Los Angeles: Semiotext(e), 2007, p. 104.

have sacrificed everything at the altar of modernism and are now suddenly faced with the possibility of the total decomposition of their idol. Therefore, they try ever more desperately to cling to it. For the modernized Muslims, especially the more extreme among them, the "true meaning" of Islam has been for some time now what the West has dictated. If evolution is in vogue, "true Islam" is evolutionary. If it is socialism that is the fashion of the day, the "real teachings" of Islam are based on socialism ..... Now suddenly this group, who were willing to sell their soul to emulate the West, see before their eyes the unbelievable sight of the floundering of the spiritual and ethical foundations of Western civilization itself. What a painful sight it must be for such men! Therefore they try, in the face of all evidence, to defend the Western "value system" and become ferociously angry with those Westerners who have themselves begun to criticize the modern world!-

”آکسفورڈ یونیورسٹی اور کیمبرج کے ذہین ترین طلباء بھی مغرب اور اس کے مستقبل کے بارے میں اتنے پر اعتماد نہیں ہیں جتنے جدید ذہن رکھنے والے مشرقی جنھوں نے اپنا سب کچھ جدیدیت کی قربان گاہ پر چڑھا دیا ہے اور اب اچانک ان کے بت کی مکمل شکست و ریخت کا امکان ان کے سامنے ہے لہذا وہ شدت کے ساتھ اس سے چمٹ جانا چاہتے ہیں۔ جدید مسلمانوں اور خصوصاً ان میں انتہا پسندوں کے اسلام کا سچا مطلب وہی ہے جو مغرب انھیں بتا رہا ہے۔ اگر ارتقایت فیشن میں ہے تو سچا اسلام ارتقائی ہے، اگر سوشلزم کا دور دورہ ہے تو اسلام کی حقیقی تعلیمات سوشلزم پر مبنی ہیں ..... اب اچانک یہ گروہ جس نے اپنی روح مغرب کے ہاتھوں فروخت کر دی ہے، اپنی آنکھوں سے ناقابل یقین نظارہ دیکھتا ہے کہ مغربی تہذیب لڑکھڑا رہی ہے، ان کے لیے یہ کس قدر تکلیف دہ امر ہے۔ چنانچہ تمام شہادتوں کے علی الرغم وہ مغربی نظام اقدار کا دفاع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ان مغربیوں سے شدت کے ساتھ ناراض ہو جاتے ہیں جنھوں نے دنیائے جدید پر تنقید شروع کر دی ہے۔“

1- Seyyed Hossein Nasr, *Islam and the Plight of Modern Man*, Chicago: ABC International Group, 2001, pp.205-206.

اس فکر کے لوگ بس مغرب سے کسی نقش یا احکام کے منتظر رہتے ہیں۔ مگر چوں کہ زندگی مسلمانوں کے معاشرے میں گزر رہی ہوتی ہے اس لیے کھل کر انکار دین کی جرأت و ہمت نہیں کر پاتے، لہذا ”اصلاح“، ”تفہیم“، ”اجتہاد“، ”تشکیل نو“ کے نام سے اپنے عزائم کی تکمیل کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ایسے حضرات کے طرز عمل اور انداز تحقیق پر بہت پہلے نہایت عمدہ اور جامع تبصرہ فرمایا تھا:

والزنادقة یجیلون علی الفہم الأبترا لا یستطیعون التحقیق التام الذی قصدہ صاحب الملة، ولا یقلدونہ، ولا یسلمونہ فیما أخبر، فہم فی ربہم یترددون علی خوف من ملئہم، والناس ینکرون علیہم، یردونہم خارجین من الدین خالعیں ربقة الملة عن أعناقہم، واذا کان الأمر علی ما ذکرنا من الإنکار وقبح الحال فخر وجہم لا یضر<sup>۱</sup>۔

”اور زندیق لوگ فطرۃ فہم ناقص رکھتے ہیں اور اس امر کی پوری تحقیق نہیں کر پاتے جو صاحب ملت کا مقصود ہوتا ہے نہ وہ صاحب ملت کی تقلید کرتے ہیں، نہ ان امور کو تسلیم کرتے ہیں جن کی خبر صاحب ملت نے دی ہے، چنانچہ وہ اپنے شکوک و شبہات میں سرگرداں رہتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ماحول کے لوگوں سے خوف زدہ رہتے ہیں [اس لیے علانیہ انکار دین کی جرأت نہیں کرتے] اور لوگ ان کو برا جانتے ہیں۔ اور دین سے خارج سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ان لوگوں نے مذہب کا جو اپنی گردن سے اتار پھینکا ہے اور جب ان کے انکار اور بد حالی کا معاملہ اس نقطے پر پہنچا ہوا ہے جو ہم نے بیان کیا ہے تو ان لوگوں کا دین سے خارج ہونا قطعاً مضرب نہیں۔“

اسلام کی عالم گیریت اور جدیدیت پسندوں کی کوشش:

اسلام زندگی کو خود اپنے اصول و اقدار پر اس طرح مرتب کرتا ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس کی گرفت سے باہر نہیں رہتا۔ اگر اسلام کی آفاقیت و عالم گیریت کا مطلب یہ ہے کہ وہ دیگر نظام ہائے زندگی میں مدغم ہو جانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ”اسلام“ کسی معین [definite] شے کا نہیں محض چند اصولوں کا نام ہے اور وہ بھی مبہم [ambiguous] کہ جن کی تطبیق کسی بھی نظام کے ساتھ ممکن ہے۔ یہ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ جدیدیت پسند مسلم مفکرین موجودہ دور کے ہر مغربی اور باطل مظہر کو اسلام ثابت کرنے کی فکر میں مبتلا ہیں، یعنی اگر آج دنیا جمہوریت پر فدا ہے تو وہ اسلام سے جمہوریت نکال لاتے ہیں، اگر آج کا انسان سائنس کو علم سمجھتا ہے تو ان کے نزدیک یہ سائنس اسلام ہی کی عطا ہے، اسی طرح اس غلط مفروضے کی بنا پر اسلام کو کبھی اشتراکیت [socialism] اور کبھی لبرل ازم

۱- شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، جلد ۱، صفحات ۲۸۵-۲۸۶۔

سے نتھی کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک اجتماعی غلطی ہے کہ ان حضرات نے مغرب سے درآمد شدہ ہر خیال و فکر کی اسلام سازی شروع کر رکھی ہے، حالاں کہ اگر یہ لوگ ان درآمدات کے اصل تاریخی، تہذیبی و مابعد الطبیعی تناظر کا مطالعہ فرماتے اور پھر ان ”مقاصد“ کو مقاصد الشریعہ کے منہاج پر جانچ کر اسے رد کر کے اسلامی، معاشرتی و سیاسی تنظیم سازی کی کوشش کرتے تو یہ محنت ایجابی اور بار آور ہوتی۔ لیکن ہمارے مصلحین اس کا اسلامی متبادل [parallel] پیش کرنے میں مصروف ہیں۔ ظاہر ہے باطل تقاضے کی تکمیل کا جو بھی حیلہ اپنایا جائے گا وہ بہر حال باطل ہی کے فروغ کا سبب بنے گا۔

اسلام: کامیاب زندگی اور معاشرے کا منفرد تصور:

اسلام کامیاب انسانی زندگی کا اپنا ایک مکمل تصور رکھتا ہے، جس کے اپنے مخصوص تقاضے ہیں، اور اسلام اس تصور میں کسی غیر نظام اور اس کے تقاضوں کی آمیزش کو قبول کرنے پر تیار نہیں۔ موجودہ دور کے بہت سے باطل تقاضوں پر اسلام اپنے متبعین کو ”صبر“ کی تلقین کرتا ہے۔ شادی کی استطاعت نہ ہونے کی صورت میں اس کا حل متعہ یا زنا کرنے کا شرعی طریقہ ایجاد کرنا نہیں بلکہ صبر اور روزے رکھنا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے۔ عہد جدید کے جدیدیت پسند دانشوروں کا المیہ یہی ہے کہ وہ مغربی تہذیب، اداروں اور فلسفے کے پیدا کردہ مسائل کا حل یا متبادل اسلام میں ڈھونڈنا چاہتے ہیں، جب کہ اس کا واحد حل یہی ہے کہ اس تہذیب سے برأت کا اعلان کر کے اپنے تشخص، تہذیب، روایات اور اقدار کے بقا کی کوشش حالات و زمانے کی رعایت رکھتے ہوئے مستقل و مسلسل بنیادوں پر جاری کی جائے اور افراد کو اس جدوجہد کے لیے تیار کیا جائے۔ بہ صورت دیگر متبادل دیتے دیتے دین کا چہرہ مسخ ہو جائے گا..... پھر متبادل کا مطالبہ کرنے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ باطل کی نفی اثبات حق پر نہ صرف مقدم بلکہ اس کی پیشگی شرط ہے۔ [لا پہلے ہے اور الا اللہ بعد میں]۔ کسی شے کے متبادل کی فراہمی میں یہ چیز فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے کہ معاشرے میں اس متبادل کی طلب کتنی شدت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ اور شدت طلب کا انحصار اس بات پر ہے کہ لوگ کس قدر حاضر و موجود نظام سے نالاں اور اس سے برأت چاہتے ہیں۔ متبادل کی نوبت تب ہی تو آئے گی کہ جب معاشرے کا موثر طبقہ حاضر و موجود سے بے زار ہوگا۔ اگر معاشرے کو موجود سے بے زار ہونے ہی نہ دیا جائے اور متبادل نہ ہونے کے باعث خاموشی اختیار کی جائے تو متبادل کی نوبت آئے گی ہی کیوں کر؟ [جب حق خود باطل میں تحلیل ہونے پر آمادہ ہو، خیر، شر کے ساتھ زندگی بسر کرنے کو عار نہ سمجھے، نیکی، بدی کے ساتھ بہ خوشی مدغم ہو جائے اور روشنی، اندھیرے کو اپنا حریف نہ جانے بلکہ اصل حلیف قرار دے تو تبدیلی کا آغاز کیسے ممکن ہو سکے گا؟] چنانچہ جس شے کی عدم موجودگی کو دلیل بنا کر ہمارے جدیدیت پسند دانش ور اپنے ناقدین کو خاموش کرانے کی کوشش کر رہے ہیں، اس کی موجودگی کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ معاشرے پر اثر انداز ہونے والے طبقے میں اس کے طلب گار پیدا ہو جائیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی شے

روشن خیالی اور قدامت پرستی — اصل جھگڑا —

کی معاشرے میں بالکل یہ طلب نہ ہو مگر اس کی پیداوار کے ڈھیر لگ جائیں۔ اس کی پیداوار اسی وقت ممکن ہے جب معاشرہ اسے اپنی ناگزیر ضرورت سمجھے۔

اصل کام: لوگوں کو دین کے قریب کرنا، نہ کہ دنیا کو دین کی راہ سے سند جواز عطا کرنا:

دین، دینی مزاج اور شخصیت کی تعمیر اور معاشرے میں دین کی طلب، آرزو، جستجو، پیاس پیدا کرنا اصل کام ہے نہ کہ دین سے بڑھتی ہوئی دوری اور بے رغبتی کے باعث طبیعتوں میں دین سے پیدا ہونے والے نفور کو اسلامی جواز عطا کرنے کے لیے یسر کی احادیث کو آڑ بنا کر تحریف دین کا کام کیا جائے، اور دین سے متنفر طبائع کے لیے ایک جدید دین تشکیل دیا جائے اور پھر سوال اٹھایا جائے کہ یہ حرام تو نہیں ہے۔ اگر اس دور میں لوگوں کا دین پر قائم رہنا ممکن بنانا ہے تو ان تبدیلیوں اور تقاضوں کو رو بہ عمل لانا ناگزیر ہے۔ اس مطالبے کا واحد مقصد یہ ہے کہ علما کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ اجتہاد کے نام پر موجودہ حالات کو فطری و حقیقی، منطقی و عقلی، دائمی اور ابدی سمجھتے ہوئے ایسی فتویٰ نویسی کی جائے کہ دین جدید طرز زندگی سے ہم آہنگ ہو کر نص سے اس طرح آزاد ہو جائے کہ عصر جدید ہی ”الحق“ قرار پائے، تاکہ زمانے کو دین کے مطابق نہیں بلکہ دین کو زمانے کے مطابق ڈھال دینے کی راہ ہموار ہو سکے۔

زمانے میں ”نوعیتی تبدیلی“ سے مراد:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ قدامت پرستوں کا کہنا ہے کہ زمانے میں کوئی ایسی نوعیتی [qualitative] تبدیلی واقع نہیں ہوئی جو اسلامی اصولوں کے پرانے اطلاقی طریقوں کو بے معنی بنا دیں۔

qualitative تبدیلیوں سے مراد یہ ہے کہ انسانی عقل ایک خاص ذہنی ارتقا کے باعث اب ان قدیم دلائل اور اسالیب سے متاثر و متفق نہیں ہوتی جن سے قبل از جدید معاشروں میں متاثر ہوتی تھی۔ اس ارتقا کے باعث زندگی کے معانی و مقاصد، مطالب و مقاصد اور اہداف و ارادے سب کچھ تبدیل ہو گئے ہیں۔ حیرت ہے ہر بڑا مفکر اس دور کو معیار کے اعتبار سے ناقابلِ تحسین گردان رہا ہے۔ اور بتلا رہا ہے کہ یہ اعداد و شمار [quantification] کا دور ہے۔ مگر منظور احمد نوعیتی [qualitative] تبدیلی کی بات فرما رہے ہیں اس معاشرے میں خدا، خیر اور شر لا یعنی باتیں ہیں، خود ڈاکٹر صاحب بھی لکھتے ہیں:

”یہ کوئی باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا کہ اس ترقی یافتہ دور میں وہ [انسان] اس قسم کے سوال کر رہا ہوگا کہ سچائی کیا ہے؟ خیر کسے کہتے ہیں؟ انصاف کیا ہوتا ہے؟ جمال سے ہماری مراد کیا ہے؟ اور خود انسان کیا ہے؟ اس جدید دور میں فلسفے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

۱- زاہد صدیق مغل، اسلامی بینکاری اور جمہوریت، صفحات ۷۱-۷۲۔

۲- منظور احمد، ”چند تعلیمی مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۷۲۔

منظور احمد: اسلامی اصولوں کے پرانے طریقے اب بے معنی ہیں: بلا دلیل دعویٰ:  
جہاں تک اسلامی اصولوں کے پرانے اطلاقی طریقوں کے بے معنی ہونے کی بات ہے۔ ذرا  
ان مسائل کی ایک فہرست مہیا فرمادیجیے، جو ان اسلامی اصولوں کے پرانے اطلاقی طریقوں سے حل نہ ہوئے  
ہوں۔ وہ فہرست عنایت فرماتے ہوئے یہ خیال بھی ضرور ملحوظ رکھیں کہ آیا ان قدیم اصولوں کے ذریعے جدید  
مسائل کا حل نہیں ملا، یا حل آپ کے نفس پر گراں گزرا!

پرانے طریقوں کے نئے طریقوں سے تبدیلی کا مطالبہ: نتائج و مضمرات:

پرانے اصولوں سے جان چھڑانے کا مطلب اور مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ماخذ  
دلائل میں کتاب و سنت کی جو حکمیت، قطعیت اور حتمیت ہے اسے نئے اصولوں کے ذریعے بے معنی بنا دیا  
جائے اور اسلامی شریعت کو جدید، یعنی مغربی یا سائنسی، انداز میں سمجھا جاسکے اور اسے اپنی زندگی سے با معنی  
طور پر متعلق کیا جاسکے۔ ظاہر ہے یہ فکر دین کو ایک بالکل نئی تعبیر دینے کے مترادف ہے، جس کا دائرہ محض  
قانونی امور تک محدود نہیں رہے گا بلکہ ان امور میں بھی دخل اندازی کا سبب بنے گا جس کی بنیاد پر مسلم  
تہذیب کی تشکیل ہوئی ہے۔ اگر اس مزعومہ ”روشن خیالی“ کا انجذاب مسلم معاشرے میں ہو گیا تو پھر اس  
کی ماہیت بدل جائے گی۔

## اسلام — ثبات و تغیر کا امتزاج

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”زمانہ ہر لمحہ متغیر ہوتا رہتا ہے۔ اور تغیر نہ دوری ہوتا ہے اور نہ معکوس اور رجعی۔ یہ ایک بڑھنے والا عمل ہے۔ جس میں معاشرے رفتہ رفتہ تبدیل ہوتے ہیں اور تبدیلی کے اس عمل میں ان کی قدر مشترک اسی طرح باقی رہتی ہے کہ بڑی تبدیلیوں کے بعد بھی وہ ان ہی ناموں سے پکارے جاتے ہیں، جن سے وہ پہلے پکارے جاتے تھے۔ فرقوں اولیٰ کے مسلمانوں اور آج کے مسلمانوں میں تفاوت کسی درجے کا بھی کیوں نہ ہو، آج بھی قدر مشترک اسلام کے نام سے جانی جاتی ہے، اور اسلامین گروپوں، فرقوں اور ملکوں میں تقسیم ہونے کے باوجود مسلمانوں کے مجموعی نام ہی سے پکارے جاتے ہیں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ معاشرتی حالات، رہنے سہنے کے ڈھنگ، اقدار کی تفہیم، سیاسی اور معاشی عمل پہلے کی بہ نسبت اب منقلب نہ ہو گئے ہوں“۔

تبدیلی و تغیر: عہد جدید اور اسلام: فرق اور امتیاز:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا خیال ہے چوں کہ زمانہ ہر لمحے متغیر ہے اس لیے معاشرے تبدیل ہوتے ہیں، لہذا اسلام کو بھی اپنے فہم نو کے لیے تبدیلی کے عمل سے گزرنا چاہیے۔ عہد جدید تبدیلی اور تغیر کے جس منہاج کو تسلیم کرتا ہے اس اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کا مقدمہ درست ہے، لیکن اسلام جس منہاج، زندگی، معاشرے اور ضابطے کا دعوے دار اور علم بردار ہے وہاں تغیر پر ثبات کو فوقیت اور دوام کو جوہری حیثیت حاصل ہے۔ سیدنا آدم علیہ السلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کے عقائد اور عبادات کا نظام ایک ہی رہا۔ کسی پیغمبر کے گزر جانے کے بعد اگر اس کی امت نے اس کے کلام یا پیغام میں تحریف کی تو اگلے پیغمبر نے آکر اس تحریف کا خاتمہ کر کے حق و باطل کو الگ کر دیا۔ انبیاء کا اختصاص ہی یہ ہے

ڈاکٹر احمد امتیاز، مشورہ خیالی، اجتہاد اور اسلام، شمولہ، ماہی المعارف، صفحہ ۷۰۔

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۳۲۶



کہ وہ تاریخ کے پیچھے کو آگے کی بجائے پیچھے کی طرف گھمادیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی کی حیثیت سے مبعوث ہوئے، لیکن اس کے باوجود اسلام کا ارتقا نہیں ہوا، نہ ہی نظام عقائد و عبادات نے کوئی ارتقائی شکل اختیار کی بلکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہنے کا حکم دیا ہے کہ: قُلْ مَا كُنْتُ بَدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ [۹:۳۶] ”آپ کہہ دیجیے کہ میں کوئی انوکھا پیغمبر نہیں ہوں“۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملتِ ابراہیمی کے ساتھ ملحق کر کے آپ کو تینوں مذاہب، یہودیت، عیسائیت اور اسلام، اور پوری دنیا کے لیے آخری پیغمبر کے طور پر پیش کیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا الحاق خدا کی اس مشیت کاملہ کا مظہر ہے کہ تینوں آسمانی مذاہب سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع اور محبت میں متفرق نہیں ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد و بعثت کے بعد اسلام آگے نہیں بڑھا بلکہ ماضی کی طرف پلٹا گیا اور دین ابراہیمی میں جو کچھ بدعات، تلپسات، تحریفات اور خرافات پیدا ہو گئے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تفسیح یا تطہیر بخش کر پھر سے اصل صورت پر قائم فرما دیا۔ اب انبیائے ماسبق کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر ایمان اور صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع فی الاصل انبیائے ماسبق کی اتباع ہے۔ بالفاظ دیگر دین محمدی کی صورت میں وہ اصول جامعیت ظاہر ہو گیا جو تمام آسمانی مذاہب کو ایک سلک میں منسلک کر دیتا ہے اور قصر نبوت کی تکمیل کرتا ہے۔

ماضی سے الحاق یا انقطاع:

دنیا کی ہر قوم اپنا سفر کرتے اور منزل کی جانب بڑھتے ہوئے آگے کی طرف دیکھتی ہے، اس کے بالقابل اسلام کا اختصاص یہ ہے کہ وہ اپنی سمت سفر طے کرتے ہوئے نگاہ پیچھے کی طرف رکھتا ہے۔ اسلامی فکر و تش کے آئینے میں فردا کو دیکھنے کی خوگر ہے۔ ایک فقیہ یا مجتہد جب اجتہاد کرتا ہے تو قرآن و سنت اور اجماع امت کی جانب اس کا رجوع ماضی کو آواز دینا ہے۔ اسلام کا وصف اعجاز ماضی سے الحاق ہے جب کہ ماضی سے انقطاع اور اس کی تضحیک و توہین جدیدیت کا خاصا ہے۔ اسی لیے انبیائے کرام نے حاضر و موجود تہذیبوں اور تمدنوں سے کسی سطح پر بھی اتحاد و اتفاق نہیں کیا، وہ ایک مختلف علمیات و مابعد الطبیعیات، مختلف نظام زندگی اور طرز و اسلوب حیات ساتھ لائے، جو باطل سے ادنیٰ درجے کی مصالحت پر بھی راضی نہ تھا۔ فرعون کے جسم میں موسوی روح، نحوذ باللہ، داخل کر کے اسلام اور کفر میں ہم آہنگی تلاش نہیں کی جاسکتی۔

اسلام اور جدیدیت: بنیادی جھگڑا:

ڈاکٹر صاحب نے تبدیلی اور تغیر پر بہت زور دیا ہے، لیکن اس بات کی وضاحت نہیں فرمائی کہ جو کچھ تبدیلی ہو رہی ہے کیا وہ فطرت سے ہم آہنگ ہے؟ کیا اس کے مطالبے اور تقاضے فطری ہیں؟ یا اس کو اختیار کرنا فطرت کو مسخ کرنے کے مرادف ہے۔ جو لوگ اسے فطری ترقی سمجھ رہے ہیں وہ عصر جدید سے کس قدر ناواقف ہیں؟ تبدیلی اور تغیر کا پیمانہ، معیار، نہاج اور کسوٹی کیا ہے؟ جب زمانہ، وقت، حرکات سب مسلسل متغیر ہیں تو وہ خود کسی علم، عمل، رویے، احساس اور نظریے کے لیے پیمانہ کیسے بن سکتے ہیں؟ کیا یہ اصول نہیں ہے کہ پیمانہ ہمیشہ باہر ہوتا ہے اندر نہیں؟

## تاریخ: تین معروف نظریات:

ڈاکٹر صاحب نے زمانے کو صرف ”آگے بڑھنے والا عمل“ قرار دیا ہے، یہ ادھورا بیان ہے۔ تاریخ سے متعلق تین نظریات معروف ہیں، ایک یہ کہ تاریخ YoYo کی شکل میں حرکت کرتی ہے کبھی آگے بڑھتی ہے کبھی پیچھے ہٹتی ہے۔ دوسرے یہ کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے یعنی پیچھے کی طرف سفر کرتی ہے۔ تیسرے یہ کہ تاریخ کا سفر ہمیشہ آگے کی طرف رہتا ہے اور ہر اگلا زمانہ پچھلے سے بہتر ہے۔ ان تینوں تصورات تاریخ کی مابعد الطبیعیات ایک دوسرے سے یک سر مختلف ہیں — حضرات انبیائے کرام علیہم السلام زمانے اور تاریخ کا جو تصور پیش کرتے ہیں وہ بالکل جدا اور تمام تصورات تاریخ سے الگ ہوتا ہے کہ سب سے بہتر زمانہ نبی اور ان کے اصحاب کا ہے، پھر تابعین کا، پھر تبع تابعین کا۔ ان ہی تین زمانوں کو لسان نبوت نے ”خیر القرون“ قرار دیا ہے اور بعد کے زمانوں کو زمانہ رسول، اصحاب، تابعین اور تبع تابعین کے زمانوں سے دوری کے اعتبار سے بہتر تاریخ ثم یفسو الکذب۔ [پھر جھوٹ عام ہو جائے گا] کی پیشین گوئی کا مصداق ٹھہرایا ہے۔ لہذا ”خیر القرون“ کی طرف لوٹنا، اسی سے مراجعت، اسی سے قربت اور اسی کی جستجو اسلامی تصور تاریخ سے ہم آہنگ حرکت اور بامعنی رویہ ہے۔

اسلام کا ماضی سے وہی تعلق جو جدید مغرب کا روم و یونان سے ہے: جدیدیت پسند:

ڈاکٹر منظور احمد کی خواہش ہے کہ مسلمان جدیدیت سے ہم رنگ و ہم آہنگ ہو کر اپنا رشتہ اپنی تاریخ سے منقطع کر لیں اور جس طرح مغربی فکر و فلسفے نے اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے رومی و یونانی فکر و فلسفے سے کچھ کلاسیک لے لیے تھے اسی طرح مسلمان بھی اپنے سابقہ دینی، روحانی، اقداری اور تہذیبی ورثے سے کچھ کلاسیک لے کر پوری شریعت اسلامی اور اس کے اطلاق و نفاذ سے دست کش ہو جائیں۔ بالفاظ دیگر ڈاکٹر صاحب مسلمانوں کا ماضی سے وہی تعلق چاہتے ہیں جو مغرب جدید کا روم و یونان سے ہے — ڈاکٹر صاحب کو یہ جان رکھنا چاہیے کہ جب اسلامی علمیت اجماع اور تعامل امت کی بات کرتی ہے تو فی الاصل وہ تاریخ کے تسلسل پر اصرار کرتی ہے جسے کسی صورت منقطع نہیں کیا جاسکتا۔ جدیدیت پسندوں کی خواہش یہی ہے کہ اسلامی علمیت کے وارثین بدلتے ہوئے زمانے کے تناظر میں اپنی تاریخ کے دھاروں کو بدل کر ماضی سے زندہ و محسوس رشتہ ختم کر دیں — اسی کا نام جدیدیت اور قدامت کی کش مکش ہے۔

عقل اور وحی کے ذریعے پروان چڑھنے والی تاریخ: جوہری فرق:

یہ بات تو جدیدیت پسندوں کے نقطہ نظر اور روایتی فکر کے تناظر میں اصولی فرق کے حوالے سے تھی، تاہم تاریخ کے اصول تبدیلی سے ایسی ہم آہنگی جو استقلال و استحکام کے ساتھ بے مہار اور لاہدف تغیرات سے آزاد رکھے تاریخ عالم میں اقوام کی بقا اور معاشرے کی مجموعی تشکیل کا اہم سوال رہا ہے اور

۱- عبداللہ حاکم نیشاپوری، المستدرک علی الصحیحین، کتاب العلم، جلد ۱، صفحہ ۱۸۶۔

ظاہر ہے مسلمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسانی علم و فہم کی استعداد اور لیاقت سے پیدا ہونے والا علم اور تاریخ، وحی الہی کے ذریعے پیدا اور پروان چڑھنے والے علم و تاریخ سے اپنی ماہیت میں بھی مختلف ہوتا ہے اور غایت میں بھی۔ ان دونوں کے اصول تبدیلی اور حرکت میں اپنے قانون اثبات سے لے کر فعلیت کے نظام، معنویت کے مرتبے اور حقیقت کے درجات تک زمین و آسمان کا فرق ہے۔ انسانی علم سے جو تاریخ پیدا ہوتی ہے وہ اپنی حرکت و تبدیلی میں نظام اسباب کی منطق کے تابع ہوتی ہے، مگر وحی چوں کہ ورائے عقلی اور مافوق الفطری مظہر ہے لہذا اس کی تبدیلی یا حرکت کا اصول نظام اسباب کی لگی بندھی منطق کے تابع نہیں ہوتا۔ وہ عالم امکان و اسباب میں الہی تدبیر کے تحت خاص اصول کے ساتھ ظہور کرتی ہے، جس کے عوامل و مظاہر تکوین الہی سے جمع کر دیے جاتے ہیں، اس سے ایک مخصوص ذہنیت اور نائپ تشکیل پاتا ہے۔ جو پھر ایک مستقل تاریخ کو جنم دیتی ہے اور معاشرے میں پہلے سے موجود حرکت پر اثر انداز ہو کر، اس کے جبر سے فاتحانہ لا تعلقی پیدا کر کے اس کی معنویت کو یک سر تبدیل کر دیتی ہے۔ یہ تاریخ اپنے تہذیبی اوضاع، علمی تصورات اور عملی مقاصد میں ارضیت سے بلند اور زمانیت و مکانیت کے عنصر سے ماورا ہوتی ہے۔

اسلام: مطلق سکون، مستقل حرکت:

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ثبات اور قرار کے باوصف زمانہ پیہم حرکت و تغیر سے بھی عبارت ہے ایک مقام اور کیفیت پر ٹھہر جانے کا نام نہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہر آن بدلتی ہوئی زندگی اور مسلسل تغیر پذیر دنیا کی رہ نمائی کا فریضہ ایک ہی قانون، یعنی شریعت، انجام دے؟ کیا ایسی صورت میں حقیقت سے منہ موڑ کر تغیر و حرکت کا انکار کر دیا جائے؟ ظاہر ہے نہیں، اس سے تو دین اور زندگی میں ربط و تعلق کا حقیقی سبب معدوم ہو جائے گا۔ تو کیا پھر خود کو تغیر کے حوالے کر کے شریعت ہی سے جان چھڑالی جائے؟ اس لیے کہ شریعت تو ہر جگہ بے لگام حرکت و تغیر کی راہ میں مزاحم ہے۔ اگر حرکت و تغیر ہی سبب کچھ ہے تو پھر دین و شریعت اور اس کی قیود و تحدید کی ضرورت ہی نہیں جیسے مغرب میں ہوا کہ وہ حواس اور عقل کے سوا حصول علم کے دیگر تمام ذرائع سے انکاری ہو گئے جس کی زد بہ راہ راست مذہب پر پڑی اور وحی الہی کا از خود انکار ہو گیا۔

مسلمانوں کے لیے یہ دونوں صورتیں ممکن العمل نہیں۔ تغیر سے آنکھ چرانا حماقت اور تغیر محض کی لہر میں بہہ جانا گم راہی ہے۔ بالفاظ دیگر حرکت و تغیر ایک حقیقت ہے، مگر تاریخیت [Historicism]

1- لیکن اس سے پیش تر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ تغیر کی نوعیت کیا ہے؟ یہ تغیر از خود فطری طریقے سے برپا ہوا؟ یا یہ مصنوعی تغیر ہے جو مسلط کیا گیا ہے مثلاً تاریخی طور پر انسان سردی میں گرم شروبات اور گرمیوں میں ٹھنڈے شروبات استعمال کرتا تھا، یہ فطرت کا تقاضا تھا مگر صنعت اشنہ ساز کی کے ذریعے یہ تغیر پیدا کر دیا گیا کہ سردی میں بھی سرد شروبات گرمیوں کی طرح استعمال کی جاتی ہیں۔ غور کرنا چاہیے کہ کیا یہ ”تغیر“ درست ہے؟ وہ تغیر جسے جبراً مسلط کیا جائے، کیا اسے ”تغیر“ کہنا روا ہے؟ یا یہ ایک طرز کی استعماریت اور استیلا ہے، جسے تغیر کا خوب صورت نام دیا جا رہا ہے۔

اسلام کی بنیادی ترکیب اور مسلمانوں کی تہذیبی تشکیل کا بنیادی عنصر ہے۔ اس کے تحت مسلمانوں کا ماضی ان کے حال و استقبال پر ہمیشہ غالب اور فائق حیثیت سے موجود رہا ہے۔ مسلمان اپنے عہد عروج یا زوال میں تاریخ کے کسی مرحلے پر اپنے ماضی سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ ان کا ماضی ہمیشہ ان کے قلب و نظر اور ذہن و فکر پر تقدیراً حاوی رہا ہے۔ علمی و عملی فکر و نظام کے تواتر و تسلسل اور اجتماعی تعامل کا یہی وہ حصار ہے جو حالات کی یک سر تبدیلی اور عالم گیر بگاڑ کے باوجود مسلمانوں کو من حیث المجموع ”جدیدیت“ کے تند و تیز سیلاب میں بہہ جانے سے روکے ہوئے ہے۔ تمام تر علمی لغزشوں اور عملی کوتاہیوں کے باوجود آج بھی مسلمانوں کا اجتماعی معاشرہ اپنے اس زوایتی فریم ورک سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ بلکہ شدید مخالفت اور روایت پرستی و تنگ نظری کے طعنوں کے باوجود اس کی حفاظت پر کمر بستہ بلکہ بقا کے لیے کوشاں ہے۔ خواہ اس حفاظت اور پہرے کی انہیں کتنی ہی بڑی قیمت چکانا پڑے اور دنیوی آسائش و آسودگی سے ہاتھ کیوں نہ دھونا پڑے۔

اگر تغیر محض، اصل الاصول ہو تو پھر کسی چیز کے دائمی وابدی ہونے کا جواز ہی عبث ہے، کیوں کہ تغیر تو ہر آن اپنی اصل سے دور ہو جانے اور اس کے نتیجے میں کسی نئی چیز کے بننے کا نام ہے۔ اس میں سوائے تغیر کے کسی کو ثبات نہیں، اگر اس حرکت و تغیر محض کو دین سے متعلق کر دیا جائے تو اولاً: ”تکمیل دین“، ”دائمی شریعت“ اور ”ختم نبوت“ کا دعویٰ ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ ثانیاً: دین اس حرکت و تغیر کے ہاتھوں تبدیل ہوتے ہوتے اپنی حقیقت و ماہیت ہی کھو بیٹھے گا۔ ظاہر ہے ایسے تغیر اور نظام حرکت کو جو شے کی نسبت و ماہیت ہی بدل دے، اسلام کسی طور قبول نہیں کرتا۔ لیکن بدلتے ہوئے حالات اور حضارۃ جدیدہ کے تقاضوں کے پیش نظر ثبات محض بھی ممکن نہیں، اس لیے کہ جامعیت و کاملیت ہی اسلام کا اعجاز و کمال ہے کہ وہ خارجی تغیر کے رد و قبول کی پوری اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلام کے سیاق میں تغیر محض ممکن ہے اور نہ ثبات محض، بلکہ زندگی حرکت و تغیر اور ثبات و دوام کے متوازن ربط و تعلق سے عبارت ہے اور اسلام اسی توازن و توسط کا جامع و مانع مظہر اور نمونہ ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام اگر ایک طرف مطلق سکون [absolute rest] ہے تو دوسری جانب مستقل حرکت [constant dynamism] بھی ہے۔ مطلق سکون ان معنوں میں ہے کہ اس کے معتقدات و ایمانیات، الہیات و مابعد الطبیعیات اور ماخذ علم [Sources of Knowledge] یعنی کتاب و سنت اور اجماع و اجتہاد کسی صورت میں تبدیل نہیں ہو سکتے۔ یہ اصول عالم گیر اور ابدی ہیں۔ مستقل حرکت اس وجہ سے ہے کہ بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں میں دینی احکام و قوانین بدلنے، دینی ذہن کو مسخ ہونے سے محفوظ رکھنے اور غیر فطری تغیرات کو پہچاننے کی صلاحیت پیدا کرنا اس کا اختصاص ہے۔ اسلام تغیر کو ”مرکز گریز قوت“ کے ماتحت کرنے کے بجائے ”مرکز مائل قوت“ کے ساتھ وابستہ کرتا ہے۔ اس کی مثال اس کشتی کی سی ہے جو سمندر میں ہچکولے تو کھار ہی ہے مگر ملاح کی نظر ہمہ وقت ساحل کی طرف ہے، وہ طوفانوں سے مقابلہ کرنے، گرداب میں گھرنے اور بھنور میں پھنسنے کے باوجود اپنا رخ اور اپنی سمت اپنے مرکز کی طرف مسلسل بڑھنے کی کوشش کرتا

رہتا ہے۔ مجتہد کا کام حضارۂ جدیدہ کے تقاضوں کے مطابق دین کو ڈھال دینا نہیں بلکہ ہر طرح کے حالات اور عہد میں اسلامی الہیات و مابعد الطبیعیات کی حفاظت کے ساتھ دین پر عمل کو ممکن بنانا اور امت کو دین سے وابستہ و پیوستہ رکھنا ہے۔ بالفاظِ دیگر ”اجتہاد“ دین کو زمانے کی لہر اور دھارے کے ساتھ بہا دینے کا نام نہیں بلکہ زمانے کے دھارے کو دین کے مطابق موڑ دینے کا نام ہے۔

اجتہاد اور تجدید: تغیر آفریں ثبات اور ثبات آفریں تغیر:

اسلام نے تغیر آفریں ثبات اور ثبات آفریں تغیر کا امتزاج ”اجتہاد“ اور ”تجدید“ کی دورخی حرکت کی صورت میں مہیا کیا ہے۔ اجتہاد بدلتے ہوئے حالات میں کتاب و سنت اور سابقہ فقہی ذخیرے کی روشنی میں نئے پیش آمدہ مسائل کی موثر قانونی تعبیر کا نام ہے، اور جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ تغیر اپنے مرکز سے دوری کا نام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اجتہاد و تفقہ تعبیر شریعت کا نام ہے جس میں خطا و صواب دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ جب کہ شریعت میں خطا کا امکان و احتمال نہیں کیوں کہ وہ ما انزل اللہ، اٹل اور دائمی ہے۔ البتہ مجتہد کی خطا بھی از روئے حدیث موجب اجر ہے۔ اسی لیے کتب اصول فقہ میں مجتہد کا قول مندرج ہے:

القیاس مظهر لا مثبت۔<sup>۱</sup>

”ہم احکام کے موجد نہیں صرف مظہر ہیں“۔

اس کے بالمقابل بدلتے ہوئے حالات میں اپنی اصل کی طرف واپس لوٹنے کا عمل ”تجدید“ ہے۔ یعنی تغیر مرکز سے دوری اور تجدید مرکز کی طرف رجوع کا نام ہے اسی لیے مجدد کا مرتبہ مجتہد سے بلند ہے۔ تجدید پر نبوت کا سایہ ہے اور یہ اس کا نہایت روشن اور درخشاں پر تو ہے۔ جب زمانے کی تیز رفتاری کے ساتھ تغیر پذیری کا عمل بڑھتا جائے گا اور مرکز کی طرف واپسی کی رفتار سست ہو جائے گی، بالفاظِ دیگر ”آزاد اجتہاد“ تو جاری رہے گا مگر تجدید کا عمل رک جائے گا، اجتہاد کے نام پر دین سے دوری بڑھ جائے گی اور بڑھتے بڑھتے اس حد تک جا پہنچے گی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اتخذ الناس رؤوساً جهالاً، فسئلوا فأفتوا بغير علم فضلوا وأضلوا۔<sup>۲</sup>

”لوگ جہاں کو سردار بنا لیں گے، ان سے سوالات کیے جائیں گے، وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں

۱- بدرالدین الزرکشی، البحر المحیط فی اصول الفقہ، الفرقتہ، دارالعرفۃ، ۱۴۱۳ھ، کتاب القیاس، مسالۃ:

القیاس مظهر لا مثبت، جلد ۵، صفحہ ۱۴۔

۲- زمانے کی غلط تیز رفتاری اور غیر فطری تغیرات کا اصل سبب مسلمانوں کا اختلاف فی الارض کے جذبے اور اس کی باطنی اور ظاہری پوششوں سے محرومی ہے۔ مسلمان اپنے ہمہ افتداری میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہ تدریج اس فریضے اور مقصد سے غافل ہوتے گئے جس کے باعث خلافتِ ارض کے حق دار ٹھہرانے گئے تھے، یعنی دعوتِ دین۔ امامت کبریٰ چھین جانے کے بعد امت مسلمہ کی حیثیت محض ان تکوں کی مانند ہو گئی ہے جو سیلاب میں بہ جانے کے خوف سے خود کو سیلاب کی موجوں سے آزادی اور نجات دلانے کے بجائے اس کی اندر اہلی موجوں سے ہم آہنگی کے لیے اختیاری فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

۳- محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح البخاری، کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم، جلد ۱، صفحہ ۲۰۔

گے، وہ خود بھی گم راہ ہوں گے دوسروں کو بھی گم راہ کریں گے۔

یعنی جب اجتہاد کے نام پر اھوئی پرستی اپنے عروج کو جا پہنچے گی اور تجدید کا عمل کلیہً مفقود ہو جائے گا تو دین و شریعت لوگوں کی نفسانی خواہشات کی بھینٹ چڑھ جائیں گے اور قیامت برپا ہو جائے گی۔

خارجی اثرات کے تحت رونما ہونے والی تبدیلی: اجتہاد نہیں محض تجدید:

خارجی اثرات کے تحت جو فکر ہمارے ہاں پروان چڑھ رہی ہے وہ اجتہاد کا تقاضا کرتی ہے اور نہ تجدید کا۔ یہ فکر جدیدیت یا تجدید ہے۔ اس کی غایت [purpose] بس اتنی ہے کہ اجتہاد کے نام پر غیر اسلامی یا مغربی افکار و اقدار کو اسلامیانے [islamization] کی سند مل جائے۔ سود کے مسئلے پر قرآن کی نص قطعی کو رد کرتے ہوئے ڈاکٹر منظور احمد نے جو کچھ ”اجتہاد“ فرمایا ہے وہ شریعت کو بالکل نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات کا کھلونا بنا دینے کے مرادف ہے۔

حقیقت تغیر محض ہے: جدیدیت پسند:

متجددانہ فکر کے قائلین کے نزدیک تغیر محض ہی اصل ہے، اسی لیے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”حقیقت یا تو تغیر ہے یا دوام، یہ بات کہ تغیر اور دوام دونوں صحیح ہو سکتے ہیں، یہ ظاہر غیر منطقی معلوم

ہوتی ہے۔ لیکن اس کو کسی نہ کسی صورت میں تقریباً بعد الطبیعیاتی نظام نے تسلیم کیا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب نے یہاں اگرچہ تغیر اور حقیقت میں سے کسی ایک کے ہی امکان کو تسلیم کیا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کا مجموعی طرز فکر صرف ”تغیر“ ہی کو حقیقت ماننے پر اصرار کرتا ہے حالانکہ تغیر محض موجود سے نسبت نہ رکھنے کے باعث ایک مہمل تصور ہے۔ تغیرات کے مقابل کوئی چیز ایک مستقل تحدید و تخصیص کے بغیر عارضی معنوں میں بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ ممکن الوجود کی ذات زمان و مکان کی تحدید و تعیین کا تقاضا کرتی ہے، جس سے محذوف و فاقہ واجب الوجود کی لامحدودیت کا بھی اثبات ہوتا ہے، جہاں موجود اور وجود میں دوئی نہیں ہے۔ خیر یہ ایک الگ بحث ہے۔ دیگر جدیدیت پسندوں کی طرح ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا بھی بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ وہ حرکت اور تغیر کو اتنی مثبت چیز سمجھتے ہیں کہ اس کے تصور کے ساتھ ہی ان پر گویا سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور وہ اس بات پر غور کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے کہ زندگی میں حرکت کے مقابلے پر سکون، تغیر کے مقابلے پر ثبات اور زمانیت کے مقابلے پر غیر زمانیت کی کیا اہمیت اور کیا مقام ہے؟

تغیر پر اصرار: دین کو عمرانی علوم کی طرح سمجھنا: ماضی بہ مقابلہ حال ناقص ہے:

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہر چیز کا مطالعہ مستشرقین کے طرز پر تاریخی اور ارتقائی نقطہ نظر سے کرنے کے عادی ہیں اور دین اور شریعت کو بھی عمرانی علوم کی طرح سمجھتے ہیں کہ ماضی، حال کے مقابلے میں ناقص ہوتا ہے۔ اس تجدید کی افزائش کی آسان صورت تو یہی ہے کہ بہ راہ راست شریعت

میں تحریف و کتر بیونت کر دی جائے۔ مگر اس راہ میں ایک تو ”مُلا کی فقہی منطق“ راہ رو کے کھڑی ہے۔ دوسرے ہر وقت ”بنیاد پرستوں“ کی طرف سے بہ قول خود ”مہلک جسمانی ضرر“ [grievous bodily harm] کا خطرہ الگ جی دہلائے ہوئے ہے۔ آسان طریقہ یہی ہے کہ کبھی بدلتے ہوئے حالات اور وقت کی ضرورت کے نام پر اور کبھی اجتہاد کے نام پر دین کے عملی نظام کو اس طرح مختل کیا جائے کہ دین اور زندگی کا تطابق و توافق ہی مخدوش ہو جائے اور معنی و صورت میں دلالت و استناد کا حقیقی رخ اپنے مرکز و مدار سے ہٹ جائے اور اسلام ایک سرحدی نشان اور قومی لقب بن کر رہ جائے۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب ان ہی خیالات کا ظہار یوں فرماتے ہیں:

”مذہب، کبھی اپنی اصلی حالت پر برقرار نہیں رہتے، بلکہ ایک معنی میں کسی مذہب کی کوئی اصلی حیثیت نہیں ہوتی۔ صرف ایسے سرحدی نشان ہوتے ہیں جن کے باہر نکلنے سے کوئی شخص کسی مذہب کے دائرے سے نکل جاتا ہے۔“<sup>۱</sup>

تغیر کے نام پر تبدیلی کا مطالبہ: اسلام سے عملاً دستبرداری:  
ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں:

”تبدیلی کے اس عمل میں ان کی قدر مشترک اسی طرح باقی رہتی ہے کہ ”بڑی تبدیلیوں“ کے بعد بھی وہ انھیں ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔“  
ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی مجوزہ ”بڑی تبدیلیاں“ یہ ہیں:

[۱] وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق قرآنی احکام میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔

[۲] سنت نبوی کو واحد متبادل نظام سمجھنا قرین قیاس نہیں۔

[۳] زمانے میں ایسی qualitative تبدیلیاں واقع ہو گئی ہیں جنہوں نے اسلامی

اصولوں کے پرانے اطلاقی طریقوں کو بے معنی بنا دیا ہے۔

ظاہر ہے امت مسلمہ کا متواتر مجموعی مزاج ان ”بڑی تبدیلیوں“ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

تبدیلی کے دو اسباب: داخلی و خارجی: فرق اور تضاد:

تبدیلی کے دو اسباب ہوتے ہیں۔ ایک سبب داخلی ہوتا ہے دوسرا خارجی۔ داخلی سبب جن تبدیلیوں کا تقاضا کرتا ہے کہ مقاصد و حکمت شریعت کی رُوح کو برقرار رکھتے ہوئے ہر طرح کے حالات میں اسلامی طرز حیات کو ممکن بنانا، اسے دین و شریعت نے ”اجتہاد“ کے نام سے پورا کر دیا۔ خارجی سبب جن تبدیلیوں کا بہ زور تقاضا پیدا کر رہا ہے، اس کا واحد مقصد اسلامی طرز حیات و فکر کو کفار کے مقاصد کے ہم رنگ و آہنگ کرنا ہے۔ یہ ذہن مغربی فکر اور مادی ترقی کی مرعوبیت نے پیدا کیا ہے، جو غیر فطری اور مصنوعی

۱۔ منظور احمد، ”پیش لفظ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۹۔

ہے۔ اس کا مطالبہ پھر صرف نئی فقہی و قانونی تعبیرات تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ ایک ”نئی الہیات“ کا مطالبہ کرتا ہے، جس میں فقہ و حدیث تو رہے ایک طرف، پورا قرآن بھی ابدی و دائمی نہیں ہے۔ بس یہ ہم تغیر کی لہر کے ساتھ بہتے ہوئے ”مسلمان“ کہلانا ہی کافی ہے۔ یہ فکر اپنی ہر جہت سے منافی اسلام ہے اور یہ طرز ”اجتہاد“ نہیں بلکہ انحراف اور زمانی تغیرات کے نام پر دین و شریعت کو تبدیل کرنے کی ایک سازش ہے۔

قرون اولیٰ کے مسلمان عہد حاضر میں معیار نہ رہیں: جدیدیت پسندوں کی خواہش:

جہاں تک ڈاکٹر صاحب کے اس ارشاد کا تعلق ہے:

”قرون اولیٰ کے مسلمانوں اور آج کے مسلمانوں میں تفاوت کسی درجے کا بھی کیوں نہ ہو

آج بھی قدر مشترک اسلام ہی کے نام سے جانی جاتی ہے۔“

قرون اولیٰ کے مسلمانوں اور آج کے مسلمانوں کے عقائد و نظریات میں سرسوفرق نہیں، ہاں اعمال اور طرز حیات میں بہ اعتبار درجات، اخلاص اور مراتب، تفاوت ضرور ہے۔ آج جدیدیت پسندوں اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کا بنیادی نزاع اور اختلاف اسی امر میں تو ہے کہ عصر حاضر کے مسلمانوں کے افکار و عقائد کو صدر اول کے مسلمانوں سے کاٹ دیا جائے، اور مسلمان بار بار جو صدر اول کے مسلمانوں کے اقوال و ارشاد کو بہ طور استناد پیش کرتے ہیں اور ان کے نمونہ زندگی اور طرز حیات کو بہ طریق معیار اپنے سامنے رکھتے ہیں کسی طرح ان کے اس تقدیسی حصار کو توڑ دیا جائے۔ مسلمانوں کی مجموعی فکر اسلاف کا دامن چھوڑنے کو تیار نہیں، کیوں کہ اعننا و علی السلف اور فکر آخرت کے بغیر ایمان کی سلامتی اور دین پر استقامت ممکن نہیں۔ جب تک اخلاف، اسلاف سے مربوط و متعلق رہیں گے ان کا دین و ایمان، باوجود علمی کوتاہیوں اور عملی لغزشوں کے، محفوظ رہے گا۔ پیران پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ [م ۵۶۱ھ] کا شعر ہے:

و من یتروک الآثار قد ضل سعیه

وہل یتروک الآثار من کان مسلماً

”جو شخص سلف صالحین کے نشان قدم کو چھوڑ دے اس کی محنت رائیگاں گئی، اور کیا کوئی

مسلمان اسلاف کے آثار و نشانات کو چھوڑ سکتا ہے؟“

اصل دین اور ایمان وہی ہے جو اسلاف سے ثابت ہو۔



## شاہ ولی اللہؒ — شریعتِ اسلامی میں تبدیلی کے امکان کی حقیقت

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں دین و شریعت کے عنوان سے جو بحث کی ہے وہ بھی اس بات کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ شرایع انسانی ضرورتوں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ البتہ وہ بنیادی اقدار جو ”دین“ ہیں تمام انبیاء کی تعلیمات میں مشترک ہیں اور باقی رہتی ہیں“۔

منظور احمد: شریعت کی تبدیلی: شاہ ولی اللہ کا نامکمل حوالہ:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے شاہ ولی اللہ کا نامکمل حوالہ نہایت اختصار و اجمال کے ساتھ پیش فرماتے ہوئے مزید تفصیل کے لیے احمد حسن صاحب کی کتاب *The Early Development of Islamic Jurisprudence*. [Islamic Research Institute, 1970] کی طرف مراجعت کا مشورہ دیا ہے۔ اس مختصر اقتباس سے حضرت شاہ صاحب کا مدعا تو واضح نہیں ہوتا البتہ منظور احمد صاحب کی خواہش اور تمنا ضرور جھلکتی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ: دین اور شریعت کی حقیقت:

شاہ صاحب کی محولہ کتاب مشہور و متداول ہے اس لیے ان کا مدعا جاننے کے لیے بجائے اس کے کہ احمد حسن صاحب کی مذکورہ کتاب کی طرف رجوع کیا جائے، خود شاہ صاحب کی عظیم تصنیف حجۃ اللہ البالغہ ہی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے کہ آیا اس سے ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا کشید کردہ مفہوم ثابت بھی ہوتا ہے یا نہیں؟

شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں عنوان قائم فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان اصل الدین واحد والشرائع و المنہاج مختلفه.  
”دین کی اصل ایک اور آئین اور طریقے مختلف ہیں۔“

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ ماہی المعارف، صفحہ ۷۱۔

اس عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

اعلم: أن أصل الدين واحد، اتفق عليه الأنبياء، و إنما الاختلاف في الشرائع والمنهاج و تفصيل ذلك: أنه أجمع الأنبياء عليهم السلام على توحيد الله تعالى عبادة واستعانة، و تنزيهه عمالاً يليق بجنابه، و تحريم الألحاد في أسمائه، و أن حق الله على عباده: أن يعظموه تعظيماً لا يشوبه تفريط، و أن يسلموا وجوههم و قلوبهم اليه و أن يتقربوا بشعائر الله الى الله و انه قدر جميع الحوادث قبل ان يخلقها و ان الله ملائكة لا يعصونه فيما أمر، و يفعلون ما يؤمرون و انه ينزل الكتاب على من يشاء من عباده، و يفرض طاعته على الناس و أن القيامة حق، و البعث بعد الموت حق، و الجنة حق و النار حق.

و كذلك اجمعوا على أنواع البر من الطهارة و الصلوة و الزكاة و الصوم و الحج و التقرب الى الله بنوافل الطاعات: من الدعاء و الذكر و تلاوة الكتاب المنزل من الله.

و كذلك اجمعوا على النكاح و تحريم السفاح و اقامة العدل بين الناس و تحريم المظالم و اقامة الحدود على أهل المعاصي و الجهاد من أعداء الله و الاجتهاد في اشاعة أمر الله دينه.

فهذا أصل الدين، و لذلك لم يبحث القرآن العظيم عن لمية هذه الأشياء، الا ماشاء الله فانها كانت مسلمة فيمن نزل القرآن على ألسنتهم. و إنما الاختلاف في صور هذه الامور و اشباحها، فكان في شريعة موسى عليه السلام الاستقبال في الصلوة الى بيت المقدس، و في شريعة نبينا صلى الله عليه وسلم الى الكعبة. و كان في شريعة موسى عليه السلام الرجم فقط، و جاءت شريعتنا بالرجم للمحصن و الجلد لغيره. و كان في شريعة موسى عليه السلام القصاص فقط، و جاءت شريعتنا بالقصاص و الدية جميعاً، و على ذلك اختلافهم في اوقات الطاعات و آدابها و أركانها.

و بالجملة فالأوضاع الخاصة التي مهدت و بينت بها أنواع البر و الارتفات هي الشريعة و المنهاج.

”آگاہ رہو کہ دین کی اصل [بنیاد] ایک ہے، جس پر تمام انبیا کا اتفاق ہے۔ اختلاف محض قوانین اور طریقوں میں ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ دین اسلام کی بنیادی باتیں جن پر تمام انبیا علیہم السلام کا اتفاق ہے یہ ہیں:

[۱] ایمانیات: [۱:۱] توحید، یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا۔ عبادت بھی اسی کی کرنا، ہر قسم کی مدد بھی اسی سے طلب کرنا، اور جو امور اس کی مقدس بارگاہ کی شان کے شایاں نہیں ان سے اللہ تعالیٰ کو پاک ماننا [یعنی صفاتِ ثبوتیہ کے ساتھ صفاتِ سلبیہ کو بھی ماننا]، اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں میں کج روی سے بچنا [یعنی اس پر ایسے ناموں کا اطلاق کرنا جس کی اس کی شریعت نے اجازت نہیں دی اور جو حق تعالیٰ کی تعظیم و اجلال کے لائق نہیں یا اس کے مخصوص ناموں کا غیر اللہ پر اطلاق کرنا یا صفات کے معانی میں بے اصل تاویل کرنا]، اور اللہ تعالیٰ کا بندوں پر یہ حق ہے کہ وہ غایت درجے تعظیم کا مستحق ہے، ایسی تعظیم جو کوتاہی کی آلائش سے پاک ہو اور لوگ اپنے منہ اور دلوں کو اس کے سپرد کر دیں اور اس کے شعائر کے ذریعے قرب الہی حاصل کریں۔ [۱:۲] تقدیر پر ایمان لانا، یعنی جمیع حوادث کی تخلیق سے قبل ہی اللہ تعالیٰ نے ان کا اندازہ ٹھہرا لیا ہے۔ [۱:۳] فرشتوں پر ایمان لانا، یعنی وہ ایسی مخلوق ہیں جو کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے، اور جو حکم دیے جاتے ہیں، بجالاتے ہیں۔ [۱:۴] کتابوں پر ایمان لانا: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے کتاب نازل فرما کر اپنی اطاعت لوگوں پر فرض کر دیتا ہے۔ [۱:۵] اور اس پر کہ قیامت حق ہے۔ [۱:۶] مرنے کے بعد جی اٹھنا حق ہے۔ [۱:۷] جنت حق ہے۔ [۱:۸] جہنم حق ہے۔

[۲] عبادات: اسی طرح انبیاء علیہم السلام متفق ہیں نیکی کے تمام کاموں، یعنی: [۲:۱] طہارت، [۲:۲] نماز، [۲:۳] زکوٰۃ، [۲:۴] روزہ، [۲:۵] اور حج، [۲:۶] اور نفل عبادات یعنی دعا، ذکر اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کتاب کی تلاوت کے ذریعے اس کی بارگاہ میں تقرب حاصل کرنے پر۔

[۳] معاملات: اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام متفق رہے ہیں: [۳:۱] مشروعیت نکاح پر، [۳:۲] حرمت زنا پر، [۳:۳] اقامتِ عدل، یعنی لوگوں کے درمیان انصاف قائم کرنے پر، [۳:۴] حرمتِ مظالم پر، [۳:۵] مجرموں کے لیے اجرائے حدود پر، [۳:۶] دشمنانِ الہی سے جہاد پر [۳:۷] اور اشاعتِ دین کے لیے سعی تبلیغ کرنے پر۔ پس امور بالا اصل دین ہیں، اسی لیے قرآن حکیم نے ان چیزوں کی علتوں سے بحث نہیں کی مگر شاذ و نادر۔ پس بے شک یہ باتیں [تمام انبیاء و ملل کے ساتھ ان مشرکین کے لیے بھی متفق علیہ تھیں جن کی زبان میں قرآن حکیم نازل ہوا۔]

[۴] شریعت و آئین کا اختلاف: البتہ اختلاف صرف امور کی صورتوں میں تھا پس [۴:۱] حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں نماز کے وقت بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا دستور تھا۔ اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں کعبہ شریف کی طرف۔ [۴:۲] سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں زنا کی سزا صرف رجم [سنگسار کرنا] تھی، اور ہماری شریعت میں شادی شدہ کے لیے رجم [سنگسار کرنا] ہے اور کنوارے کے لیے کوڑے کی سزا ہے۔ [۴:۳] حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں [قتل عمد کی سزا میں] قصاص کا حکم تھا اور ہماری شریعت میں قصاص اور دیت دونوں ہیں۔ [۴:۴] اسی طرح انبیاء میں عبادات کے اوقات و آداب اور ارکان میں بھی اختلاف رہا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ نیکی اور تدابیر نافعہ کی جو خاص صورتیں اختیار کی گئی ہیں، ان ہی کا نام شریعت اور منہاج ہیں۔

شرايع کی تبدیلی: شاہ ولی اللہ اور منظور احمد: دو علیحدہ اور متضاد موقوف:

یہ ہے حضرت شاہ ولی اللہ کا طویل اقتباس جس سے منظور احمد صاحب کا مزعومہ مفہوم ہرگز ثابت نہیں ہوتا، جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

”اقبال۔ سے قبل شاہ ولی اللہ جب اپنی کتاب ”حجتہ اللہ البالغہ“ میں جہاں نزول شرايع کے اسباب اور دین کی اصل سے بحث کرتے ہیں یا اس سے قبل اصولیین جب ”مصلحت“ یا ”مصالح شریعت“ کی بات کرتے ہیں تو اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان حکم کے پیچھے مقصد اور مصلحت معلوم کرے اور اگر وہ مقصد اور مصلحت قرن اول کے کسی حکم سے قرن آخر میں پوری نہیں ہو رہی تو مصلحت کو باقی رکھے کہ وہ دوامی ہے اور حکم کو بدل دے کہ وہ وقتی ہے۔ اور اگر سرے سے مصلحت ہی تبدیل ہو جائے تو وہ حکم بھی ساقط ہو جائے۔“

شاہ ولی اللہ: سزائیں شرايع سماویہ سے متواتر ہیں: مضبوطی سے پکڑو ترک نہ کرو:

اگر منظور احمد صاحب کو تحقیق و ذہانت کی اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ عمر نوج بھی عطا ہو جائے تو بھی وہ حضرت شاہ ولی اللہ سے اپنا مزعومہ مدعا ہرگز ثابت نہ فرما سکیں گے۔ شاہ صاحب شرعی احکام اور سزاؤں کو اہل عرب کی مخصوص عادات پر مبنی سمجھتے ہیں اور نہ ہی مصلحت و مصالحت کے نام پر احکام و شرايع کی عدم ابدیت و غیر آفاقیت کے قائل ہیں۔ بلکہ ان کے نزدیک یہ احکام و سزائیں تمام اقوام کے لیے لازم اور ناقابل ترک ہیں۔ شاہ صاحب حدود [ان من المعاصی ما شرع اللہ فی الحد] یعنی وہ گناہ جن کی سزا اللہ تعالیٰ نے مقرر کی ہے، پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

واعلم انه كان من شريعة من قبلنا القصاص في القتل، والرجم في الزنا و القطع في السرقة، فهذه الثلاث كانت متوارثة في الشرائع السماوية واطبق عليها جماهيرا الانبياء و الامم، ومثل هذا يجب أن يؤخذ عليه بالنواجد، ولا يترك.

”آگاہ رہو کہ ہم سے پہلی شریعتوں میں قتل میں قصاص، زنا میں رجم اور چوری کی صورت میں ہاتھ کاٹنے کی سزائیں موجود تھیں۔ یہ سزائیں شرايع سماویہ میں متواتر چلی آتی تھیں۔ اور تمام انبیا اور ان کی امتیں اس پر متفق تھیں۔ چنانچہ اس قسم کی سزاؤں کو خوب مضبوطی سے تھامے رکھنا چاہیے۔ رکھی ان کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔“

۱۔ منظور احمد، روایت جدیدیت اور ایمانیات، شمولہ ماہ نامہ صریح، صفحہ ۲۵۔

۱۔ شاہ ولی اللہ، حجتہ اللہ البالغہ، جلد ۲، صفحہ ۲۷۔

دائی سزاؤں کی خاصیت اور فہرست: شاہ ولی اللہ:

سزاؤں ہی کے بارے میں شاہ صاحب آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

فانما اللائق بالشرائع اللازمة التي جعلها الله تعالى بمنزلة الأمور الجبلية

ان يجعل كما لمؤثر بالخاصية، و بعض عليها بالنواجذ، و أيضاً فان فيه

بعض الالم والميسور لا ضرورة في تركه.

”شرائع لازمی جن کو اللہ تعالیٰ نے بہ منزلہ خلقی امور کے لازم کیا ہے، ان کی شان سے یہ

بات ہے کہ ان احکام کو موثر بالخاصیت [یعنی خاصیت کے ذریعے اثر انداز ہونے والی چیز

کی طرح] گردانا جائے اور ان کو ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑا جائے اور نیز جس چیز میں

تھوڑی سی تکلیف اور آسانی ہو اس کو ترک کرنے کی ضرورت نہیں۔“

وہ سزائیں جنہیں شاہ صاحب مضبوطی سے تھامے رکھنے کی وصیت فرما رہے ہیں اور انہیں کبھی

نہ ترک کرنے کی نصیحت فرما رہے ہیں وہ یہ ہیں:

[۱] زنا: محسن کے لیے رجم [سنگسار] اور غیر محسن کے لیے کوڑوں کی سزا۔

[۲] قذف: اسی [۸۰] کوڑوں کی سزا۔

[۳] چوری: قطعید [ہاتھ کاٹنا]

[۴] راہ زنی: قطع اعضاء، تصلیب [سولی دینا]، جلا وطنی، قتل۔

[۵] شراب نوشی: اسی [۸۰] کوڑے۔

[۶] قتل: قصاص یا دیت۔

مذکورہ بالا بحث اور فہرست سے حضرت شاہ ولی اللہ کا موقف سامنے آ گیا کہ یہ سزائیں بعینہ

وہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تھیں، آج بھی ان کا نفاذ اسی طرح ہوگا کیوں کہ

یہ بہ منزلہ خلقی امور کے ہیں، جزو شریعت ہیں، واجب العمل ہیں، انہیں ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑنا چاہیے

اور کبھی ترک نہ کرنا چاہیے۔ قطع نظر اس کے کہ ان سزاؤں کے نزول کے وقت بنو اسماعیل کے عرف و

عادات کا لحاظ رکھا گیا تھا کیوں کہ ان کا عرف خود ساختہ نہ تھا بلکہ یہ سزائیں [متوارثة في الشرائع

السماوية واطبق عليها جماهير الانبياء والامم] ”شرائع سماویہ سے متوارث چلی آ رہی تھیں اور

اس پر تمام انبیاء و امم متفق چلے آ رہے تھے۔“

قرآن کے برعکس شریعت کی تبدیلی یا تنسیخ کا الوہی اختیار اب انسان کے پاس ہے: منظور احمد:

اس مقام پر ایک اور قابل لحاظ بات یہ ہے کہ چلیے کچھ دیر کے لیے ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا مزعومہ مفہوم مان لیا جائے کہ شریعتیں بدلتی رہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ شرائع انبیاء میں اختلاف و تبدیلی خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی یا بندوں کی طرف سے؟ اس پر خدا کے بندوں کا کوئی تصرف نہیں تھا، یہاں نبی کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ مقررہ شریعت پر چلے جائے اور جہلا کی خواہشوں پر نہ چلیے۔ اب مجتہد کی کیا مجال ہے کہ ما انزل اللہ میں تصرف و تغیر کرے، یا اس کے خلاف فیصلہ صادر کرے؟ ڈاکٹر منظور احمد ان تمام قابل لحاظ امور سے صرف نظر کرتے ہوئے اور شریعت کی تبدیلی یا تنسیخ کا الہی حق انسانوں کو سپرد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”شرائع زمانے کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہی ہیں اور اگر یہ اصول دنیا کی تاریخ سے پہلے صحیح تھا تو آج بھی صحیح ہوگا۔ [مسلمانوں] کے بقول سابقہ شریعتیں خدا نے نازل کی تھیں اور بعد کی بھی۔ اب شریعت [قانون] کی افادیت کو جانچنے کا کام نبی اور پیغمبر نہیں کریں گے بلکہ انسان خود کرے گا۔“

اس عبارت میں ڈاکٹر صاحب نے انسانوں کو بہ یک وقت دو امور کا حق اور اختیار بخش دیا ہے۔ ایک احکام کی تبدیلی اور تنسیخ جو خالصہ الوہی اختیار ہے۔ دوسرا شریعت کو جانچنے کا، جو ڈاکٹر صاحب کے بقول، انبیاء کرتے تھے۔ حالاں کہ انبیاء اللہ تعالیٰ کی طرف سے شریعت کی ترسیل، تبلیغ، تفہیم اور تبیین پر مامور تھے۔ اسے جانچنے، پرکھنے یا کمی بیشی کا اختیار تو ان کے پاس بھی نہیں تھا۔ اس سلسلے میں اگر قرآن مجید کی ایک ہی آیت ملاحظہ کر لی جائے تو بات واضح ہو جائے گی، قرآن نے مشرکین کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اللہ شریف کے محتویات میں ترمیم و تنسیخ کا اختیار رکھتے ہیں، صاف تصریح کی ہے کہ:

وَ إِذَا تُلِيٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا اِنَّتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ  
هٰذَا اَوْ بَدَلُهٗ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَائِيْ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا  
يُوحٰى اِلَيَّ اِنِّيْ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ [۱۵:۱۰]

”اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں، جو بالکل صاف صاف ہیں، تو یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کی امید نہیں ہے یوں کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی دوسرا قرآن لائیے، یا اس میں کچھ ترمیم کر دیجیے۔ آپ [صلی اللہ علیہ وسلم] یوں کہہ دیجیے کہ مجھے یہ حق نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کر دوں، بس میں تو اس کا اتباع کروں گا جو میرے پاس وحی کے ذریعے پہنچا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔“

۱- منظور احمد، پس چہ باید کرد؟ ”لوگ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟“ بش / مسلمان، صفحہ ۲۱۔

اسلام کی تکمیل اور دائمیت: امتیاز و اختصاص:

ادیانِ ماسبق انسانوں کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھ کر نازل ہوتے رہے مگر اسلام کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے پہلی اور آخری بار، بالتفصیل، اپنے بندوں کو اپنی رضا بتلا دی۔ ادیانِ ماسبق میں سے کسی نے اپنی ابدیت و دائمیت اور تکمیل کا اعلان نہیں کیا۔ اسلام دینِ انبیا کی مسلسل روایت کی وہ محفوظ اور آخری کڑی ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے تکمیل کا اعلان فرماتے ہوئے اپنے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر رسالت و نبوت کے سلسلے کو ختم فرمادیا۔ تکمیل کا مطلب یہی ہے کہ جو چیز جیسی بنی تھی وہ بن چکی اب اس میں اضافے کی گنجائش ہے نہ کمی کی۔ زیادتی کا نام بدعت ہے اور کمی کا الحاد۔ اسلام بجائے خود نیا دین ہونے کا مدعی نہیں نہ ہی کوئی شے عدم سے وجود میں لاتا ہے بلکہ یہ شرائعِ ماسبق کی تجدید اور حقائقِ ماسبق کے اثبات سے عبارت ہے۔ اس کا تصور خاتمیت دراصل اس کی ”جامعیت“ سے وابستہ ہے، یعنی چوں کہ یہ آخری دین اور شریعت ہے لہذا اسے زمانی انقلابات و تغیرات کی رعایت اور ضروریاتِ انسانی کا لحاظ کر کے نازل فرمایا گیا ہے۔ اسے تھلب اور لچک اور استحکام اور سازگاری کا امتزاج عطا فرماتے ہوئے ایسے نادر قواعد و ضوابط سے نوازا گیا ہے کہ الحاد و بدعت سے دامن محفوظ رکھتے ہوئے قیامت تک ہر قسم کے تغیرات، حالات اور انقلابات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

حدود میں تبدیلی یا تنسیخ تحریف دین کے مرادف ہے:

رہی یہ بات کہ تکمیل شریعت کے بعد ان جرائم کی سزائیں جنہیں اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمادیا ہے کیا زمان و مکاں یا اعراف و عادات کی تبدیلی سے متغیر و متبدل ہو جانے کی مستعمل ہیں؟ کیا ان کی تنفیذ میں تخفیف یا درجہ بندی کی گنجائش ہے؟ اسلام کی مسلسل و متواتر تاریخ اس کی نفی کرتی ہے۔ حد یا تو نافذ ہوگی یا نہیں نافذ ہوگی۔ تکمیل دین کے بعد متعین احکام و حدود میں تخفیف اور نرمی بعدِ زمانی یا عرف و عادت سے اجنبیت کے نام پر تبدیلی کا مطالبہ دین میں تحریف کے مرادف ہے۔ مولانا محمد تقی امینی [سابق ناظم دینیات علی گڑھ یونیورسٹی] اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

”لیکن یہ بات انتہائی غور و فکر کے باوجود بھی سمجھ نہ آ سکی کہ ان حدود کو عرب کے رسوم و عادات کے مطابق قرار دے کر بہ طور یادگار پیش کیا جائے جیسا کہ بعض حضرات نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی عبارتوں کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ اگر حدود جیسے نصوص قطعیہ میں رسوم و عادات کا چکر چلایا گیا تو قرآن حکیم کی کون سی نص اس زد سے محفوظ رہ سکے گی؟“

۱- محمد تقی امینی، احکام شرعیہ میں حالات و زمانے کی رعایت، لاہور: سندھ ساگر اکادمی، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۸۶۔

شاه ولی اللہ — شریعت اسلامی میں تبدیلی کے امکان کی حقیقت —

الغرض حضرت شاہ ولی اللہ شریعت محمدی کے سیاق میں زمان و مکان کی تبدیلی اور انسانی سماج کے تہذیبی مزاج میں تنوع کی بنیاد پر احکام و سزاؤں کی تبدیلی یا تنسیخ کے ہرگز قائل نہیں، ان کا نقطہ نظر مسلمانوں کے متفقہ اور مجمع علیہ موقف کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اصولی طور پر اسلامی شریعت کے بارے میں شاہ صاحب کے اس موقف کو ڈاکٹر منظور احمد نے بھی، نادانیتہ طور پر ہی سہی، ایک جگہ تسلیم کر لیا ہے:

”شاہ ولی اللہ اس قسم کی تاریخی تبدیلی کے قائل ہیں اور اس کو شرائع کے اختلاف کا سبب بتاتے ہیں البتہ اسلامی شریعت کے باب میں وہ خاموش ہیں“۔<sup>۱</sup>

۱- منظور احمد، ”حواشی“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحات ۶۷-۲۶۶۔

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۳۶۲



## قانونِ اسلامی — ترمیم و تفسیح یا ابدیت و دائمیت اسلامی اور مغربی تصورِ قانون کا ایک تقابلی جائزہ

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”یہ بات کہ کسی قانون میں ترمیم یا تفسیح کی ایک لمبے عرصے تک یا کبھی ضرورت نہ ہو اپنی جگہ، لیکن اس کی تبدیلی کا امکان ایک ایسا مفروضہ ہے، جس سے انکار عقلاً ممکن نہیں۔ بہ ظاہر یہ بات اسلام کی اس تفہیم سے، جو ہمارے فقہانے پچھلے تیرہ سو سال میں فراہم کی ہے، متناقض معلوم ہوتی ہے۔ تناقض کا احساس اس لیے شدید تر ہو جاتا ہے کہ عامۃ الناس پر فقہا اور فقہی نقطہ نظر کا ایسا گہرا تسلط ہے کہ وہ ہر بات جو کسی طور پر اس نقطہ نظر کی تائید کرتی نظر نہیں آتی، اس کے خلاف علما جو فقہ کو عین اسلام سمجھتے ہیں بڑے سخت ردِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں، اور نوبت یہاں تک آ جاتی ہے کہ وہ ہر تناقض رائے کو کفر کی مانند شمار کرنے لگتے ہیں“۔

منظور احمد صاحب کا مندرجہ بالا ارشاد [بلکہ درست لفظوں میں مفروضہ] تین حصوں پر مشتمل ہے:

[۱] معاشرتی تنظیم کا ہر قانون ایک عرصے کے بعد تبدیلی کا مطالبہ کرتا ہے یا تفسیح کا۔

[۲] فقہا اپنے نقطہ نظر کی تائید نہ کرنے والی بات اور ہر تناقض رائے کو کفر گرداننے لگتے ہیں۔

[۳] علما، فقہی استنباط و استخراج کو عین اسلام سمجھتے ہیں۔

ان تینوں نکات پر نمبر وار گفتگو کی جاتی ہے:

منظور احمد: معاشرتی تنظیم کے ہر قانون میں تبدیلی کا مطالبہ: مغربی فلسفہ قانون سے مستعار فکر:

اس مفروضے پر کچھ گفتگو صفحات گزشتہ میں کی جا چکی ہے — ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا یہ ارشاد اسلامی قانون کو مغربی تصورِ قانون پر قیاس کرنے کا نتیجہ ہے۔ اسلامی اور مغربی قانون اپنے تصورات سے لے کر نفاذ تک اپنی ہر نوع اور جہت میں ایک دوسرے سے اس قدر متضاد و متخالف ہیں کہ ان کی غیریت و عینیت کی کم از کم معنویت یہ ہے کہ ایک کی ماہیت اور بنیادی تشکیل میں دوسرے کا دخل ممکن ہی نہیں۔

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۷۲۔

مغربی فلسفہ قانون سرتاسر انسانی فکر و نظر اور عقل و دانش کے استعمال کا مظہر ہے۔ تعقل کا کوئی عمل زمانیت اور مکانیت کو اپنے اندر سے خارج نہیں کر سکتا۔ عقل خود مختاری و خود انحصاری کے ساتھ فقط ان ہی اہداف کی طرف پیش قدمی کر سکتی ہے جو زمانی و مکانی ہوں۔ اس لیے اس نسبت سے حاصل ہونے والا علم اور اس علم سے پیدا ہونے والا عمل اپنی ساخت میں نامکمل ہوتا ہے اور زندگی کے تمام گوشوں پر محیط نہیں ہو سکتا، ایسے قانون میں وقت گزرنے کے ساتھ تبدیلی کا تقاضا ناگزیر ہے، اس میں دوام ہوتا ہے نہ یکسانیت۔ مغربی نظام قانون کے مآخذ اور مغربی مفکرین کی کتابوں کے مطالعے سے یہ بات بہ خوبی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ وہ اب تک تصور قانون پر کوئی متفقہ اور قبول عام نقطہ نظر پیش نہیں کر سکے۔ حتیٰ کہ ان کے ہاں قانون کی تعریف تک متفقہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”قانون کی کوئی جامع تعریف ممکن نہیں اور نہ لغوی اعتبار سے اس کا کوئی مفہوم متعین کیا جاسکتا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب نے قانون کی تعریف اور مفہوم کے عدم تعین کا تذکرہ فرما کر اس بات کو بالکل واضح کر دیا ہے کہ وہ اسلامی تصور قانون پر مغربی فلسفہ قانون کے منہاج میں کھڑے ہو کر گفتگو فرما رہے ہیں۔ ورنہ اسلامی قانون کی تعریف، مفہوم، نفاذ اور اطلاقات سب اپنی جگہ نہایت مستحکم اور متعین ہیں۔

مغرب کا فلسفہ قانون بلکہ تصور عدل تک متبائن ماورائی نظریات اور فلسفیانہ موشگافیوں کی نذر ہو گیا ہے۔ Black، Savingny، Kant، Richard Hooker، ST. Thomas، Sidney Hartland، Fedrick Pollee، Holland، John Austin، Stone، G.C. Lee اور Salmond ہر ایک کی بیان کردہ تعریف دوسرے سے مختلف ہے، تطویل کے خوف سے محض ناموں پر اکتفا کرتے ہوئے اقتباسات کو تلیم زد کر دیا گیا ہے، اس اختلاف پر W.A. Robson کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے جس میں اس نے وضاحت کر دی ہے کہ اگر قانون کی اطمینان بخش تعریف ممکن نہیں ہے تو اس کے آغاز کے متعلق بھی گفتگو مشکل تر ہے۔ قانون کے ابتدائیات ابہام کے دبیز پردوں میں پوشیدہ ہیں اور انھیں منصفہ شہود پر لانا ناممکن نہیں:

It is difficult to define law in a satisfactory manner it is still harder to find the beginnings of it. The origins of law are shrouded in obscurity and are, perhaps, impossible to discover.

اس اختلاف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ اپنے تصور سے نفاذ تک انسانی کاوش ہے جو فطرت انسانی اور اس کی totality پر حاوی نہیں ہے۔ یہ تمام کاوشیں اقدام و خطا کی سمت میں ہوئی ہیں۔ ایسی

1- منظور احمد، ”اسلام، قانون اور اخلاقیات“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۷۱۔

2- W.A. Robson, Civilization and the Growth of Law. London: Macmillan & Co. 1935, p.10.

صورت حال میں جب معاشرہ اپنے اقدار کی نسبت نقطہ نظر کی تبدیلی سے روشناس ہوتا ہے تو تصور قانون کلیتہً متزلزل ہو جاتا ہے۔ مگر ان سب کے باوجود مغرب میں "Natural Law" کی حیثیت بنیادی ہے جس کے خلاف بالعموم قانون سازی نہیں کی جاسکتی۔

وحی الہی: اسلامی قانون کی دائمیت کا اصل سبب:

اس کے برعکس اسلامی فقہ کے تمام اسکول آغاز سے آج تک تصور قانون سے اطلاق و نفاذ قانون تک متفق رہے ہیں، کیوں کہ یہاں معاملہ خود روی اور خود وضعی کا نہیں بلکہ یہ قانون بالواسطہ یا بلاواسطہ وحی ربانی سے ماخوذ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

أَفْحَكَمَ الْجَاهِلِيَّةَ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ [۵۰:۵]  
 ”کیا یہ لوگ جاہلیت کے قوانین کی تلاش میں ہیں؟ یقین رکھنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ اچھا قانون دینے والا کون ہو سکتا ہے۔“

قوانین اسلامی کے احکام انفرادی و اجتماعی زندگی کے ظاہر و باطن دونوں پر دائر و سائر ہیں۔ یہاں law یعنی حکم شرعی کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے:

الحکم قبیل خطاب اللہ تعالیٰ المتعلق بأفعال المكلفين بالاقتضاء أو  
 التخيير وقد زاد البعض أو الوضع.<sup>۱</sup>

”قانون وہ ضابطہ عمل ہے جو وحی الہی سے نمونپاتا ہے، جو بعض امور کے کرنے یا نہ کرنے کی طلب، یا ان میں اختیار و اباحت یا محض استقرا و اعلان پر مبنی ہوتا ہے۔“

اور حکم، قرآن کی صورت میں نازل شدہ الفاظ کو نہیں بلکہ اس قانونی ضابطے [doctrine] یا قدر [value] کو کہتے ہیں جو الفاظ وحی سے ثابت [establish] ہوتی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

ان الحكم المصطلح ما ثبت بالخطاب لاهو.<sup>۲</sup>

”اور حکم [اپنے تکنیکی تناظر میں] وحی الہی سے ثابت ہونے والا امر ہے، الفاظ وحی بذاتہ حکم نہیں کہلاتے۔“

یعنی اگر صرف خدائی احکام کے متن ہی کو قانون کا درجہ حاصل ہوتا، تو پھر وہ تمام قانونی ضابطے اور فقہی اقدار جو سنت نبوی، اجماع اور فقہ اسلامی سے مستنبط ہوتے ہیں، ان کی قانونی حیثیت ختم ہو جاتی۔ اسلامی قانون کی تشکیل و ترتیب نصوص قرآنی [وحی جلی] سے ہوتی ہے یا سنت نبوی [وحی خفی]

۱- سعد الدین الفتازائی، التوضیح والتلویح، لاہور: مکتبہ جمالیہ، [س-ن]، تعریف الحکم، صفحہ ۳۰-۳۲۔

۲- ایضاً، صفحہ ۳۵۔

سے۔ دونوں صورتوں میں اس کا ماخذ [origin] وحی ہے۔ اجتہاد کے ذریعے مستنبط ہونے والے قوانین بھی قرآن و سنت ہی سے ماخوذ ہوتے ہیں اس لیے بالواسطہ ہی سہی ان کا ماخذ بھی وحی الہی ہے، اگرچہ اس میں خطا کا امکان ہے۔

اسلامی اور مغربی قانون: بنیادی فرق:

مغربی قانون حیاتِ انسانی کے فقط حسی و مادی پہلوؤں سے متعلق ہے۔ جب کہ قانونِ اسلامی ان پہلوؤں کے ساتھ اخلاقی و روحانی پہلوؤں سے بحث کرتے ہوئے اسے توازن و اعتدال عطا کرتا ہے۔ مغربی قانون اپنی ماہیت کے اعتبار سے Do's اور Don'ts کے اصول پر کھڑا ہے، جس میں لچک کی کوئی گنجائش نہیں، اس سے قانونی اقدار کا دائرہ محدود اور سخت ہو جاتا ہے اور معمولی اضطرابی کیفیت میں قانون کی خلاف ورزی سزا کا مستوجب بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی فقہ میں نہ تو ہر مثبت حکم فرض و واجب ہے اور نہ ہر منفی حکم حرام۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان نو [۹] مزید قانونی درجات ہیں۔ اس سے قانونِ اسلامی میں وسعت اور لچک کے ساتھ تمامیت و کمالیت کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

اسلامی قانون سازی کا دائرہ:

اب قانون سازی کا دائرہ کار کیا ہے، مختصراً تذکرہ کیا جاتا ہے:

[۱] ایک تو قانون یا قاعدہ وہ ہے جس میں قرآن و سنت نے واضح اور قطعی حکم بیان فرما دیا ہے یا خاص اصول بیان فرما دیا ہے، اب اسے کوئی فقہیہ یا اصولی اور تاقضی یا قانون ساز ادارہ نہیں بدل سکتا۔ قانون سازی کا دائرہ عمل حسب ذیل ہوگا:

[۱:۱] مسئلے کا حکم معلوم کرنا۔

[۱:۲] حالات و واقعات اور قرائن کی روشنی میں اس کا منشا معلوم کرنا۔

[۱:۳] اگر کوئی اجمال ہے تو تفصیل معلوم کرنا۔

[۱:۴] استثنائی حالت کا پتہ لگانا، اگر ہے تو۔

۱- وہ امور جہاں صحابہ کوئی عمل کریں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تائید و توثیق فرمائیں یا سکوت اختیار فرمائیں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمل فرمائیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی قسم کی ترمیم و تصحیح نہ ہو تو اس سے تائید الہی ثابت ہوتی ہے، اس کے سوا اللہ تعالیٰ کا سکوت تمام امور کی عملاً تائید و توثیق کرنا ہے، یہ الہی معنوں میں عصمت انبیاء ہے۔

۲- اسلامی فقہ کی رو سے حکم کی دو اقسام ہیں: حکم تکلیفی [Primary Law] اور حکم وضعی [Declaratory Law] شدت طلب اور اباحت کی بنا پر احکام تکلیفی کے گیارہ درجات ہیں:

[۱] فرض [Obligatory]، [۲] واجب [Imperative]، [۳] سنت مؤکدہ [Mandatory]، [۴] سنت غیر مؤکدہ [Directory Recommendation]، [۵] مستحب [Commendable]، [۶] حرام [Forbidden]، [۷] مکروہ تحریمی [Condemned]، [۸] اسانت [Disproved]، [۹] مکروہ تنزیہی [Improper]، [۱۰] خلاف اولیٰ [Uncommendable]، [۱۱] مباح [Indifferent / Permissible / Discretionary]۔

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۳۶۶

[۲] شریعت نے پیش آمدہ مسئلے میں کوئی متعین حکم تو نہیں دیا البتہ اس سے ملتے جلتے حالات و واقعات اور احوال و ظروف موجود ہیں۔ اب ضروری ہے کہ علتوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر، مستثنیات کو رفع کر کے، قانون سازی کے لیے اس کو جاری کیا جائے۔ نصوص کی علت اپنی رائے سے دریافت نہیں کی جاسکتی بلکہ حقیقی علت کے ادراک کے لیے تنقیحات سے کام لیا جائے گا۔ بالفاظ دیگر، بہ ذریعہ اجتہاد اصل کو فرع تک لانے کے لیے علت کو تین مرحلوں سے گزرنا ہوگا۔

[۲:۱] تخریج المناط: کتاب و سنت کے اس حکم میں کون کون سے وصف علت بن سکتے ہیں، یعنی مجتہد سب سے پہلے نص میں سے امکانی اوصاف کی تخریج کرے گا۔

[۲:۲] تنقیح المناط: پھر ان اوصاف کی تنقیح، کہ ان میں حقیقی سبب اور موثر وصف کون سا ہے؟ اس سے وہ وصف جو علت بن سکتا ہے متعین ہو جائے گا۔

[۲:۳] جس پر شریعت نے کوئی حکم لاگو نہیں کیا، بلکہ وہ معاملات بعض بیان شدہ اصول و ضوابط کے ذیل میں آتے ہیں، ان میں شریعت کی منشا اور اصولوں کو سمجھ کر قانون سازی کا عمل کیا جائے گا۔

[۲:۴] ایسے معاملات، جن میں شریعت کے اصول و فروع میں کوئی حکم یا نظیر موجود نہیں۔ ایسی صورت میں خود شریعت نے اجتہاد برائے کی راہ فراہم کی ہے۔ یہ رائے آزادانہ اور بے باکانہ نہیں ہے، مجتہد کا عابد ہونا ضروری ہے، اجتہاد ایک روحانی عمل ہے، اسے محض فکری، عقلی اور تخلیقی کاوش یا حرکت محض نہیں کہا جاسکتا، یہ ایک مومن کی جانب سے ہر قسم کے حالات میں اہل ایمان کو ایمان پر قائم رکھنے اور ایمان کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی جدوجہد کا نام ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی نیا مسئلہ آئے تو ذاتی رائے قائم نہ کرو فقہاء اور عابدین سے مشورہ کرو:

شاوروا فیہ الفقہاء والعبادین، ولا تمضوا فیہ رأی خاصۃ۔ رواہ الطبرانی فی الأوسط ورجالہ موثقون من اہل الصحیح۔<sup>۱</sup>

یہاں قانون سازی کا عمل اگرچہ عرفی لحاظ سے آزادانہ کہلائے گا مگر شریعت کی روح، مقاصد اور اصول عامہ کو سامنے رکھتے ہوئے۔ بالفاظ دیگر قانون سازی کا عمل قرآن و سنت کی مجموعی تعلیمات، حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے فیصلے و اعمال اور فقہائے اُمت کے فہم کو سامنے رکھ کر ہی ممکن ہے۔

نوٹ: یہ ہے قانون سازی کا اسلامی منہاج۔ واضح رہے کہ اجتہاد کے لیے علم و فہم کے ساتھ سب سے کلیدی شرط فقیہہ کا تدین و تقویٰ کی صفات سے متصف ہونا ہے۔ اس کے بغیر شریعت کی روح تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ قانون سازی کا حق محض حامل شریعت کو نہیں حاصل شریعت کو ہے۔ جدیدیت پسند حضرات تغیر و حرکت کے عنوان سے اخلاف کو اسلاف سے کاٹ کر، جس قانون سازی کے خواہاں ہیں اس کا نام ہرگز ”اجتہاد“ نہیں۔

۱۔ ابی بکر الصدیقؓ، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، کتاب العلم، باب فی الاجماع، جلد ۱، صفحہ ۱۳۲۔

فقہاء پر تکفیر میں عجلت کا الزام: آرا کا اختلاف فطری امر:

نکتہ دوم: ”حضرات فقہاء ہر متناقض رائے کو کفر گردانتے ہیں“، یہ بیان یا تو تصریحات فقہاء سے بے خبری پر مبنی ہے یا پھر ان پر الزام ہے۔

نظری مسائل میں آرا کا اختلاف افتراق و تقسیم امت کا سبب ہے اور نہ مضروب باعث ہلاکت۔ بہ شرط یہ کہ اختلاف اصول کے مطابق ہو اور قواعد کے موافق۔ صحت مند ذہنی و علمی معاشرے میں بہ شرط دیانت و حمیت اختلاف نہ صرف ایک فطری و طبعی امر ہے بلکہ عقل سلیم اور سلامتی فہم کا عین مقتضی بھی۔ اس کے بغیر علم کے مخفی گوشے، تدبیر و تفکر کی پوشیدہ قوت، استنباط و استخراج کے مختلف پہلو اور تحقیق و تنقیح کے نئے رخ بلکہ علم کا وجود و ثبوت ہی نمایاں اور واضح گف نہیں ہو سکتا۔ صالح معاشرے کی تشکیل کے لیے جس قدر عملاً اتحاد و اتفاق ضروری ہے بالکل اسی طرح معاشرے کی تکمیل اور اہل معاملہ کے لیے اپنی مذکورہ قیود و شرائط کے ساتھ اختلاف فی ذلہ محمود ہے۔ اسی لیے اسلام میں باہمی مشاورت کا حکم ہے، جب تک کسی زیر بحث مسئلے کے مختلف پہلو اور متفرق آرا سامنے نہ آجائیں نتیجے تک زیادہ بصیرت و اعتماد کے ساتھ نہیں پہنچا جاسکتا۔

بنیادی مسائل میں اختلاف: مذموم اور قبیح:

اس کے برعکس دین کے بیناتی مسائل میں اختلاف مذموم اور قابل ترک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے اختلاف اور متناقض آرا غیر منصوص اور ظنی مسائل میں تلاش و تحقیق حق کے لیے محمود ہے جو دین کے بنیادی عقائد اور ضروریات دین سے نہ ٹکراتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے اسی لیے منع فرمادیا ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ. [۱۰۵:۳]

”اور مت ہو ان کی طرح جو متفرق ہو گئے اور اختلاف کرنے لگے، بعد اس کے کہ پہنچ چکے ان کو ”البینات“ [صاف صاف حکم]، اور ان کو بڑا عذاب ہے۔“

ایسے ہی اختلاف میں [قرآن و سنت کے واضح بیان فرمودہ عقائد و احکام سے] متناقض رائے کفر قرار پاتی ہے۔ کیوں کہ ان مسائل میں اجتہاد ہوتا ہے نہ تقلید۔ ایسے کھلے کھلے احکام میں اگر کوئی شخص اختلاف و انتشار کا بیج بوئے تو مفتی مجبور ہے کہ اس کی حیثیت کو واضح کرے، کیوں کہ یہاں اس کا اختلاف کسی عالم یا مجتہد سے نہیں بہ راہ راست کتاب و سنت سے ہے۔

صحابہ و تابعین میں نظری و فقہی اختلاف: نظائر اور مثالیں:

عہد خیر القرون میں حضرات صحابہ کے درمیان اور بعد میں تابعین و ائمہ مجتہدین کے درمیان جہاں بیناتی و منصوصی احکام میں کامل ارتباط و اتفاق تھا، وہیں بیسیوں غیر بیناتی، نظری اور فروعی مسائل میں لاکھ اختلاف کے باوجود باہمی احترام قائم رہا اور مسلمانوں کی جمعیت و اتحاد پیش نظر۔ یہی سبب ہے کہ اختلافات کے باوجود ان کے درمیان گروہ بندی نہیں تھی۔ یہی اختلاف محمود ہے اور کسی قوم کے عدم فکری

جمود اور زندہ ہونے کی علامت ہے۔ حضرت امام شاطبیؒ لکھتے ہیں:

فكل مسألة حدثت في الإسلام فاختلف الناس فيها، ولم يورث ذلك الاختلاف بينهم عداوة ولا بغضاء ولا فرقة؛ علمنا أنها من مسائل الإسلام، وكل مسألة طرأت فأوجبت العداوة والتنافر والتباين والقطيعة؛ علمنا أنها ليست من أمر الدين في شيء. ۱

”ہر نیا مسئلہ جو اسلام میں پیدا ہوا ہو اور لوگ اس میں مختلف ہو جائیں، اگر اختلاف کی وجہ سے نہ عداوت ہو، نہ بغض و کینہ اور نہ ایک دوسرے سے جدا ہوں تو ہم جان لیتے ہیں کہ وہ اسلام ہی کے مسئلوں میں سے ایک مسئلہ ہے، مگر جو مسئلہ ایسا چھڑے کہ اس کے باعث دلوں میں عداوت اور باہمی منافرت پیدا ہو جائے، لوگ ایک دوسرے کو برے القاب سے ملقب اور برے ناموں سے پکارنے لگیں۔ اس اختلاف کے باعث اخوت باہمی کا رشتہ منقطع ہو جائے تو ہم جان لیں گے کہ اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔“

ذیل میں حضرات صحابہؓ و تابعینؒ اور مجتہدین و فقہاء کے درمیان ہونے والے اختلافات کی وسعت پر بیانات و واقعات میں سے چند ایک نقل کیے جا رہے ہیں، جس سے واضح ہو جائے گا کہ وسعتِ عمل اور غیر بیناتی مسائل میں اختلاف ہرگز انتشار و افتراق کا موجب نہیں۔ باعثِ انتشار وہ امور ہیں جو اعتقادی الحاد پر قائم ہیں نہ کہ فقہی اختلاف پر۔ کیوں کہ فروعی مسائل میں اختلاف نص کا نہیں، نص سے استنباط کا ہے جس میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال ہے۔

[۱] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے علم و فضل کے اس درجے قائل تھے کہ فرماتے تھے: ان کنا لنحسب عمر قد ذهب بتسعة اعشار العلم. ”عمر علم کے ۹/۱۰ حصوں پر حاوی ہیں۔“ اس کے باوجود ڈاکٹر رواں قلعہ جی کی تحقیق کے مطابق جن مسائل میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ میں اختلاف تھا ان کی تعداد سو [۱۰۰] ہے۔ ۲

[۲] حضرت قاسم بن محمد ابو بکر رحمہ اللہ [م ۷۰ھ] صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پوتے، اور مدینے کے ممتاز فقیہ تھے، بچپن میں یتیم ہو جانے کے باعث ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی آغوشِ عاطفت میں تربیت پائی، آپ کا شمار مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ میں ہوتا ہے۔ آپ اختلاف کے متعلق فرماتے ہیں:

لقد نفع الله باختلاف اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم في أعمالهم، لا يعمل

- ۱- ابوالخلیف ابراہیم الشاطبیؒ، الموافقات، کتاب الاجتهاد، الطرف الأول في الاجتهاد، فصل علامات وخواص أهل البدع، جلد ۵ صفحات ۱۶۳-۱۶۳۔
- ۲- محمد بن سعد، کتاب الطبقات الکبیر، تذکر من کان یفتی بالمدينة و یقتدی به من اصحاب رسول اللہ الخ، جلد ۲، صفحہ ۲۹۰۔
- ۳- رواں قلعہ جی، فقہ عبداللہ بن مسعود، لاہور: ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، ۱۹۹۲ء، صفحہ ۱۹۔

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۳۶۹

العامل بعمل رجل منهم إلا رأى أنه في سعة، ورأى أن خيراً منه قد عمله.<sup>١</sup>  
 ”حضرات صحابہ کرامؓ کے اعمال میں جو اختلافات تھے اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ نفع پہنچا دیا  
 کہ مسلمانوں میں سے جو کوئی صحابہ نہیں سے کسی صحابی کے طرز عمل کے مطابق عمل کرتا ہے،  
 وہ اپنے آپ کو وسعت اور گنجائش میں پاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس نے جو کام کیا اسے  
 اس سے بہتر آدمی نے کیا تھا۔“

[۳] حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ [م ۱۰۱ھ] کا یہ ارشاد کس علم دوست اور صاحب نظر  
 سے پوشیدہ ہوگا:

مايسرني أن لي باختلافهم حمر النعم ..... ما أحب أن أصحاب رسول الله  
 لم يختلفوا.<sup>٢</sup>

”سرخ اونٹ مجھے اتنا مسرور نہیں کر سکتا جتنا صحابہ کرامؓ کے اختلافات ..... اگر صحابہؓ  
 مختلف الرائے نہ ہوتے تو میرے لیے یہ بات پسندیدہ نہ ہوتی۔“

اس کی ایک وجہ بیان فرمائی کہ:

لأنه لو كان قولاً واحداً كان الناس في ضيق.<sup>٣</sup>

”اگر ان امور میں ایک ہی فتویٰ ہوتا تو لوگ تنگی میں پڑ جاتے۔“

[۴] حضرت امام مالک رحمہ اللہ [م ۱۷۹ھ] سے عباسی خلیفہ منصور نے کہا کہ میں نے پختہ ارادہ  
 کر لیا ہے کہ جو کتابیں آپ نے تحریر فرمائی ہیں، ان کی نقلیں کروا کر ہر شہر میں حکومتی فرمان جاری کر دوں کہ لوگ  
 صرف ان کتابوں کے مطابق عمل کریں اور ان کے حدود سے متجاوز نہ ہوں، لیکن حضرت امام مالکؒ نے فرمایا:

لا تفعل ذلك يا أمير المؤمنين فإن الناس قد سيقت إليهم أقاويل  
 وسمعوا أحاديث ورووا روایات وأخذ كل قوم بما سبق إليهم ودانوا إلى  
 الله تعالى به فدع الناس وما اختاروا لأنفسهم في كل بلد.<sup>٤</sup>

”امیر المؤمنین آپ ایسا ہرگز نہ کیجیے، مسلمانوں کے پاس دوسرے علما کے اقوال پہلے پہنچ  
 چکے ہیں، حدیثیں وہ سن چکے ہیں، روایات، روایت کر چکے ہیں، لوگوں کے پاس جو بات

۱- ابوالحسن ابراہیم الشاطبی، الموافقات، کتاب الاجتهاد، الطرف الأول في الاجتهاد، المسألة الثالثة:

الشریعة في أصولها وفروعها الخ، جلد ۵ صفحہ ۶۷۔

۲- ایضاً، جلد ۵ صفحہ ۶۸۔

۳- ایضاً، جلد ۵ صفحہ ۶۸۔

۴- عبدالوہاب شعرائی، کتاب المیزان، فصل ومما یؤید هذه المیزان عدم إنكار أكابر العلماء الخ،  
 جلد ۱، صفحہ ۱۷۷۔



پہلے پہنچ چکی ہے، اسی پر وہ عمل پیرا ہو چکے ہیں۔ پس چاہیے کہ ہر آبادی کے باشندے جو باتیں اپنے لیے اختیار کر چکے ہیں ان ہی کے ساتھ ان کو چھوڑ دیا جائے۔“

[۵] حضرت امام شافعی رحمہ اللہ [م ۲۰۴ھ] جو خود ایک فقہی مکتب کے بانی ہیں، صد ہا مسائل میں ان کا حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ [م ۱۵۰ھ] سے اختلاف ہے، وہ ہر متناقض رائے کو کفر کی مانند شمار کرنے کی بجائے فرماتے ہیں:

من أراد أن يعرف الفقه فليزوم أبا حنيفة وأصحابه، فإن الناس كلهم عيال عليه في الفقه.<sup>۱</sup>

”جو علم فقہ جاننا چاہے اسے امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کی مجلس لازم پکڑنا ہوگی، کیوں کہ سب لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ کے عیال ہیں۔“

جب امام شافعی، حضرت امام اعظم کے مزار کی زیارت کو حاضر ہوئے تو:

ترك القنوت لما زار قبره وأدركته صلوة الصبح عنده. وقال كيف أقنت بحضرة الإمام وهو لا يقول به.<sup>۲</sup>

”آپ نے صبح کی نماز میں قنوت ترک فرمادی اور فرمایا میں امام کے سامنے کیسے قنوت پڑھوں؟ وہ اس کے قائل نہ تھے۔“

[۶] حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ [م ۲۴۱ھ] کے نزدیک وضو کے بعد نکسیر پھوٹ جائے یا وہ پچھنا لگوائے، اس سے وضو ٹوٹ جائے گا لیکن صحابہ و تابعین کی ایک جماعت اس کی قائل نہ تھی، جن میں حضرت سعید بن المسیب بھی شامل تھے۔ امام احمد سے پوچھا گیا آپ ان کی اقتدا میں نماز ادا کر لیں گے، تو فرمایا:

كيف لا أصلي خلف سعيد بن المسيب.<sup>۳</sup>

”سعید بن المسیب کی اقتدا میں نماز کیسے نہ پڑھوں گا؟“

[۷] حضرت امام ابو یوسف [م ۱۸۲ھ]، حضرت امام محمد [م ۱۵۹ھ] اور حضرت امام زفر [م ۱۵۸ھ] جو حضرت امام اعظم کے اخص تلامذہ میں سے ہیں۔ باوجود قواعد و اصول میں امام اعظم کی تقلید کے بے شمار فروعی مسائل میں ان حضرات کا اپنے اُستاد امام اعظم سے اختلاف ہے۔ اور فقہ حنفی کا مفتی بہ قول ان حضرات کے فتوے پر ہے۔

۱- احمد بن علی الخطیب البغدادی، تاریخ مدینة السلام، بیروت: دار الغرب الاسلامی، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱م، ذکر من اسمه النعمان، النعمان بن ثابت، ما قبل في فقه أبي حنيفة، جلد ۱، صفحہ ۳۷۵۔  
 ۲- عبد الوہاب شعرائی، کتاب المیزان، فصل فيما نقل عن الإمام الشافعي من ذم الرأي، جلد ۱، صفحہ ۲۱۵۔  
 ۳- تقی الدین ابن تیمیہ، مجموع فتاویٰ، باب الإمامة، سنن أهل المذاهب الأربعة الخ، جلد الثالث والمشرور، صفحہ ۳۷۵۔

واقعات و نقول کی فہرست طویل ہے۔ بیان کردہ واقعات اور بیانات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ غیر منصوصی و غیر بیناتی مسائل میں اختلاف نے کبھی مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ نہیں کیا بلکہ وسعتِ عمل و ظرف اور اتفاق و اتحاد کی راہیں کھول دیں۔ امام شاطبی کا ارشاد ہے:

وجدنا أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم من بعده قد اختلفوا في أحكام الدين، ولم يفتروا ولم يصيروا شيعاً.

”ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو پایا کہ آپ کے بعد دین کے احکام میں ان کے اندر اختلاف پیدا ہوا مگر باوجود اس اختلاف کے وہ جد اجد اہوئے نہ فرقہ فرقہ بنے۔“

اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے امام شاطبی لکھتے ہیں:

إنما اختلفوا فيما أذن لهم من اجتهاد الرأي، والاستنباط من الكتاب والسنة فيما لم يجدوا فيه نصاً، واختلفت في ذلك أقوالهم؛ فصاروا محمودين، لأنهم اجتهدوا فيما أمروا به.

”وہ ان ہی امور میں مختلف ہوئے جن میں اپنی رائے سے اختلاف کی اجازت ملی ہوئی تھی، یعنی جن حوادث کے متعلق نص میں کوئی صراحت نہ ملے تو کتاب و سنت سے استنباط کریں۔ اور اسی میں ان کے اقوال و آراء مختلف ہو گئے اور وہ اپنے اس اختلاف میں تحسین و مدح کے مستحق ہیں کیوں کہ جس باب میں انھیں اجتہاد کا حکم دیا گیا تھا انھوں نے اسی میں حکم کی تعمیل کی۔“

وكانوا مع هذا أهل مودة وتناصح [و] أخوة الإسلام فيما بينهم قائمة. اس اختلاف کے باوجود وہ باہمی الفت و محبت رکھنے والے لوگ تھے۔ ایک ایک کا بہی خواہ اور خیر اندیش تھا۔ اسلام کا قائم کردہ بھائی چارہ اپنے حال پر باقی تھا۔“

تکفیر مفتی کی ذمے داری ہے شوق نہیں:

غیر منصوصی و غیر بیناتی مسائل میں حضرات فقہاء کی وسعتِ تصریحاتِ بالا سے واضح ہے۔ مگر جب ان اختلافات کے ڈانڈے منصوصی و بیناتی مسائل سے ملنے لگیں اور باطل کیش اور فتنہ پرور لوگ تفہیم و اجتہاد کے نام پر اسلام ہی کی بیخ کنی پر اتر آئیں تو پھر ایسے آدمی یا گروہ کی نہ صرف گوشمالی بلکہ اگر بات ضروریاتِ دین کے انکار یا اس کی باطل تاویل تک پہنچ گئی ہو تو پورے جم و احتیاط اور چھان بین کے بعد اس کی ”تکفیر“ حضرات فقہاء و علما کی ذمے داری ہے یعنی وہ بتلا دیں کہ اب یہ شخص اپنے اقوال و اعمال کے

۱- ابوالخلیف ابراہیم الشاطبی، الموافقات، کتاب الاجتهاد، الطرف الأول في الاجتهاد، فصل علامات وخواص أهل البدع، جلد ۵ صفحہ ۱۶۰۔

۲- ایضاً، جلد ۵ صفحہ ۱۶۰۔

۳- ایضاً، جلد ۵ صفحہ ۱۶۳۔

باعث ”کافر“ ہو گیا۔ کیوں کہ کسی کے کہنے سے کوئی کافر نہیں ہوتا بلکہ خود اپنے افکار و اعمال کی بنیاد پر کافر ہوتا ہے۔ مفتی کافر ”بناتا“ نہیں، کفر ”بتاتا“ ہے جس طرح طبیب مریض بناتا نہیں بلکہ مرض بتا دیتا ہے۔ ورنہ غیر منصوصی و استنباطی مسائل میں اختلاف میں ہر متناقض رائے کو کفر کیسے کہا جاسکتا ہے؟ حضرت امام شعرانی رحمہ اللہ [م ۹۷۳ھ] حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ [م ۱۶۱ھ] کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لا تقولوا تختلف العلماء في كذا وقولوا قد وسع العلماء على الأمة بكذا.<sup>۱</sup>

”یہ نہ کہا کرو کہ علمائے فلاں مسئلے میں اختلاف کیا بلکہ کہو کہ علمائے توسع اور گنجائش پیدا کی۔“

منظور احمد: علماء فقہی استنباط کو اسلام سمجھتے ہیں: ایک الزام:

نکتہ سوم: علماء و فقہاء ہر فقہی استنباط کو عین اسلام سمجھتے ہیں۔

جس طرح کتاب اللہ کے بعد سنت کی ضرورت ہے، اسی طرح کتاب و سنت کے بعد مسائل غیر منصوصہ کی دریاقت یا منصوصہ متعارضہ میں تطبیق کی راہ ڈھونڈنے کے لیے ”فقہ“ کی ضرورت ہے۔ جس قوم کے پاس نصوص کی بھرمار ہو اور تفقہ و اجتہاد کی دولت نہ ہو وہ کبھی اپنا ضابطہ قانون مکمل نہیں کر سکتی۔ نصوص محدود ہیں اور تقاضے اور ضرورتیں لامحدود۔ آخر ان کا بھی تو کوئی حل ہونا چاہیے۔ قرآن مجید اس فطری تقاضے کو پورا کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَآفَّةً فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا

فِي الدِّينِ وَ لِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ [۱۲۲:۹]

”اور ایسے تو نہیں ہو سکتا کہ سب مسلمان جہاد میں نکل کھڑے ہوں، سو کیوں نہ نکلے ہر طبقے سے ایک گروہ جو دین میں تفقہ پیدا کریں اور پھر جب اپنے لوگوں کے پاس پہنچیں تو انھیں خبر دیں تاکہ وہ بچیں۔“

آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ فقہ قرآن و سنت کا غیر نہیں بلکہ اس کی تہ میں غواصی اور لپٹے مضامین کا نمایاں کردینا ہے۔ یہ کتاب و سنت پر اضافہ نہیں بلکہ اسی کا پھیلاؤ ہے۔ اب رہی بات کہ فقہا فقہی استنباط کو عین اسلام سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب اگر ان علماء و فقہاء کے بیانات یا کم از کم ناموں ہی کی تصریح فرمادیتے تو بات واضح ہو جاتی۔ درج ذیل وجوہ کی بنا پر ان کا بیان درست نہیں:

[۱] اصول فقہ کی ہر کتاب میں یہ قول مندرج ہے: القیاس مظهر لا مثبت یعنی فقہا احکام

کے موجد نہیں ہوتے۔

[۲] حضرات ائمہ مجتہدین کا یہ قول ہے کہ جب بھی ہماری کوئی رائے یا فتویٰ کتاب و سنت

سے ٹکرا جائے تو اسے دیوار پردے مارو۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ سے پوچھا گیا:

۱- عبد الوہاب شعرانی، کتاب المیزان، فصل فان قلت فاماذا اجیب من نازعنی الخ، جلد ۱، صفحہ ۱۳۷۔

إذا قلت قولاً وكتاب الله يخالفه؟ قال: اتركوا قولی بكتاب الله. فقيل:  
 إذا كان خبر رسول صلى الله عليه وسلم يخالفه؟ قال: اتركوا قولی بخبر  
 رسول الله صلى الله عليه وسلم. فقيل: إذا كان قول الصحابة يخالفه؟  
 قال: اتركوا قولی بقول الصحابة.

”اگر آپ کا قول کتاب اللہ کے مخالف ہو تو کیا کریں؟ امام ابوحنیفہؒ نے کہا میرا قول کتاب اللہ  
 کے مقابلے میں ترک کر دو، سائل نے پھر پوچھا اگر آپ کا قول حدیث کے خلاف ہو؟ فرمایا  
 میرا قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں ترک کر دو، سائل نے پھر پوچھا اگر آپ کا  
 قول صحابہ کے قول کے خلاف ہو؟ فرمایا میرا قول صحابہ کے مقابلے میں ترک کر دو۔“  
 حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں:

إنما أنا بشر أخطيء وأصيب، فانظروا في رأيي، فكلما وافق الكتاب  
 والسنة فخذوا به، وكلما لم يوافق الكتاب والسنة فاتركوه.<sup>١</sup>  
 ”بے شک میں بھی ایک آدمی ہوں، کبھی میری رائے درست ہوتی ہے اور کبھی غلط۔ پس تم  
 میری رائے کو دیکھو جو کتاب و سنت کے موافق ہو اس کو لے لو اور جو مخالف ہو اس کو چھوڑ دو۔“  
 حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

إذا صح الحديث فهو مذهبي وفي رواية: إذا رأيتم كلامي يخالف  
 الحديث فاعملوا بالحديث واضربوا بكلامي الحائط.<sup>٢</sup>  
 ”جب حدیث صحیح مل جائے، پس وہی میرا مذہب ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اگر تم دیکھو  
 کہ میرا کلام حدیث کے خلاف ہے تو حدیث پر عمل کرو اور میرے کلام کو دیوار پر دے مارو۔“  
 امام احمدؒ فرماتے ہیں:

ليس لأحد مع الله ورسوله كلام.<sup>٣</sup>

”کسی کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کلام کی گنجائش نہیں۔“

[۳] فقہ کا ماخذ کتاب و سنت اور اجماع ہے۔ جہاں تک قیاس اور استنباط کی بات ہے، اس

- ۱- شاہ ولی اللہ، عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، فصل فی المتبحر فی المذہب وهو الحافظ  
 لکتب مذہبہ فیہ مسائل، صفحہ ۵۷۔
- ۲- یوسف بن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضلہ، المملكة العربية السعودية: دار ابن الجوزی، ۱۴۱۴ھ، باب معرفة  
 اصول العلم وحقائقه الخ، جلد ۱، صفحہ ۷۵۔
- ۳- شاہ ولی اللہ، عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، فصل فی العامی، باب فی ما سار علیہ  
 جماہیر العلماء من التخذین بالمذہب الأربعة الخ، صفحہ ۷۶۔
- ۴- ایضاً، صفحہ ۷۶۔

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۳۷۳

میں گنجائش ہے۔ اسی بنا پر کسی مجتہد کے مسلک کو بالکل غلط نہیں کہا جاسکتا۔ چند تصریحات دیکھیے:

[۳:۱] در مختار میں ہے:

• إذا سئلنا عن مذهبنا وعن مذهب مخالفنا قلنا وجوباً: مذهبنا صواب يحتمل الخطأ، ومذهب مخالفنا خطأ يحتمل الصواب، وإذا سئلنا عن معتقدنا ومعتقد خصومنا. قلنا وجوباً: الحق مانحن عليه، والباطل ما عليه خصومنا.<sup>۱</sup>

”اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ تمہارا [حنفی] فقہی مسلک ٹھیک ہے یا تمہارے مخالفین [موالک، شوافع اور حنابلہ] کا؟ تو ہم جواب دیں گے کہ ہمارا مسلک صحیح ہے مگر خطا کے احتمال کے ساتھ۔ اور ہمارے مخالفین کا مسلک خطا ہے مگر درستگی کے امکان کے ساتھ اور اگر ہمارے اعتقادات کے متعلق پوچھا جائے کہ تم [اہل سنت و جماعت] حق پر ہو یا تمہارے مخالفین [ردافض، خوارج، معتزلہ وغیرہ] کے اعتقادات حق ہیں؟ تو ہم پورے یقین کے ساتھ کہیں گے کہ ہمارے اعتقادات حق ہیں اور ہمارے مخالفین کے اعتقادات باطل ہیں [اس لیے کہ ان کا ثبوت نصوص قطعی اور بیناتی دلائل سے ثابت ہے جس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں]۔“

[۳:۲] منار اور اس کی شرح نور الانوار میں ہے:

وحكمه الإصاۓة بغالب الرأي [ای حکم الاجتہاد اصاۓة الحق بغالب الرأي دون اليقين] حتى قلنا ان المجتهد يخطى ويصيب والحق في موضع الخلاف واحد [ولكن لا يعلم ذلك الواحد باليقين فلهذا قلنا بحقية المذاهب الاربعة].<sup>۲</sup>

”اجتہاد کا حکم بہ ظن غالب یہ ہے کہ مجتہد حق کو پالیتا ہے، مگر حق تک اس کی اجتہادی رسائی محض ظنی ہے یقینی نہیں [یہی وجہ ہے کہ اس میں خطا کا احتمال بھی رہتا ہے] اسی لیے ہم کہتے ہیں مجتہد خطی بھی ہو سکتا ہے اور مصیب بھی۔ نیز موضع اختلاف میں حق نفس الامری میں ایک ہی ہوتا ہے مگر چوں کہ وہ قطعی طور پر معلوم و متعین نہیں ہوتا [بلکہ بہ صورت اختلاف تمام اجتہادی اقوال میں دائر ہوتا ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں چاروں ہی [فقہی] مذاہب حق ہیں۔“

[۲:۳] علامہ شوکانی [۱۲۵۰ھ] لکھتے ہیں:

وذهب أبو حنيفة ومالك والشافعي، وأكثر الفقهاء إلى أن الحق في أحد الأقوال، ولم يتعين لنا، وهو عند الله متعين.<sup>۳</sup>

- ۱- عبدالعزیز ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، المقدمة، جلد ۱، صفحات ۱۳۹-۱۴۰۔
- ۲- شیخ احمد ملا جیون، نور الانوار شرح رسالة المنار، کراچی: المکتبۃ البشری، ۱۴۳۳ھ/۲۰۱۱ء، باب القیاس، جلد ۲، صفحہ ۶۰۔
- ۳- محمد بن علی الشوکانی، إرشاد الفحول إلى تحقیق الحق من علم الأصول، الرياض: دار الفصیلة، ۱۴۲۱ھ، المسألة لسابعة: في المسائل التي كل مجتهد فيها مصيب الخ، الفرع الثاني المسائل الشرعية، جلد ۲، صفحہ ۱۰۶۔

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۳۷۵

”ائمہ اربعہ کا مذہب یہ ہے کہ مختلف اجتہادی اقوال میں حق تو کوئی ایک ہی قول ہوتا ہے، لیکن وہ ہمارے لیے قطعی طور پر متعین نہیں ہوتا، البتہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ متعین ہوتا ہے۔“

علماء فقہاء کی تصریحات ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے بیان کی صریح لفظوں میں تغلیط کر رہی ہیں۔ علمائے کبھی فقہی استنباط کو کتاب و سنت کی طرح قطعی نہیں سمجھتا، اس سے اختلاف و مناقض رائے کو کفر گردانا ہے۔

## روایتی علما اور شیخ عبدہ کا اجتہادی نقطہ نظر — بنیادی فرق

ڈاکٹر منظور احمد لکھتے ہیں:

”ہمارے اکثر روایتی علما اور اسلام پسند اسکالروں نے فکر اسلامی کی تشکیل نو پر اصرار تو کیا ہے لیکن ان کی غالب اکثریت مفتی محمد عبدہ کے اجتہادی نقطہ نظر کو بھی قبول کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتی۔ تشکیل نو کے کام میں وہ اس بنیادی پیراڈائم پر نظر ثانی کرنے کو تیار نہیں جس پر اجتہاد کی عمارت قائم ہے۔“<sup>۱</sup>

انیسویں صدی میں شیخ محمد عبدہ [1849-1905] مصر کی ایک انتہائی مقتدر علمی شخصیت تھے۔ آپ مفتی مصر بھی رہے۔ عالم عرب میں جدیدیت کے اثرات و نفوذ کی ابتدا آپ کی وجہ سے ہوئی۔ عبدہ نے ۱۸۷۰ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے مصر کو خیر باد کہا اور فرانس تشریف لے گئے۔ فرانس میں قیام کے دوران عبدہ کی ملاقات جمال الدین افغانی [م ۱۸۹۷ء] سے ہوئی۔ عبدہ نے افغانی کے فکری اثرات کو پوری طرح قبول کیا جس کا سب سے کلیدی نقطہ یہ تھا کہ مغربی فکر و تہذیب کو مصر میں داخل کیا جائے۔ عبدہ کا خیال تھا کہ عصر جدید میں اسلام کی بقا کی واحد صورت نظام تعلیم میں عقلی [rational] اور سائنسی [scientific] علوم کو پوری طرح شامل کر لیا جائے۔ اگرچہ اس تجدید کی آبیاری اور اظہر کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کے باعث ابتداً عبدہ کو جامعہ اظہر کی طرف سے شدید مزاحمت اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن عبدہ، اپنے ایک مغربی سوانح نگار کے مطابق، اس یقین پر قائم رہے کہ:

If the Azhar were reformed, Islam would be reformed.<sup>۲</sup>

یعنی اگر جامعہ اظہر نے اس تجدید [modernity] اور اصلاح کو قبول کر لیا تو پھر مصر کو تبدیل ہونے میں زیادہ دیر

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۷۶۔

2- Charles C. Adams, *Islam and Modernism in Egypt: A Study of the Modern Reform Movement Inaugurated by Muhammad 'Abduh*, New York: Russell & Russell, 1968, pp. 70-71.

نہیں لگے گی — رفتہ رفتہ عبدہ کی فکر کو قبولیت حاصل ہوتی گئی اور عبدہ مصر میں جدیدیت کے بانی قرار پائے۔ عبدہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے لیکن ان کی فکر کی نمائندہ کتاب ”رسالة التوحید“ ہے۔ رشید رضا کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ ”المنار“ بھی آپ کی فکر کا ترجمان تھا۔ مفتی عبدہ کو مصر میں حکومتی سطح پر نہایت اہمیت حاصل ہوئی اور مصر میں سرکاری سطح پر جدیدیت پر مبنی افکار کی آبیاری آپ ہی کی مرہون منت ہے۔ عبدہ ہی کی کاوشوں کے باعث اس وقت اسلامی دنیا میں مصر کو تجدید پسندی میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، وہاں جدیدیت پسندی کو اصل عروج شیخ عبدہ ہی کی وجہ سے حاصل ہوا۔ شیخ عبدہ کے تلامذہ کی کثیر تعداد درس گاہوں سے ایوانوں تک نفوذ رکھتی تھی۔ مصر میں جدیدیت کی افزائش نے روایتی اسلامی فکر بلکہ خود اسلام ہی کے لیے سنگین ترین مسائل پیدا کیے — مغربی فکر و فلسفے اور سائنس کی تاریخ سے گہری واقفیت نہ رکھنے کے باعث عبدہ، اپنے تمام تر اخلاص کے باوصف، مغرب سے حد درجے مرعوب و مسحور تھے۔ وہ مغربی فلسفے کا عمیق ادراک نہ کر سکے جس کے باعث ان کا اخلاص ان کے تلامذہ میں لادینیت کے نفوذ کو نہ روک سکا۔ مریم جمیلہ لکھتی ہیں:

Shaikh Muhammad Abduh was an enthusiastic admirer of Europe and its civilization. So stimulating and valuable did he find his travel in England and France that he returned again and again "to renew my soul." He said: "I never once went to Europe when I failed to renew my dream of transforming the lives of my people into something better." He went on to say that whenever he became filled with discouragement in Egypt because of the unyielding opposition he faced, he would go back to Europe "and there within a month or two, these hopes would return to me and the attainment of what I had thought impossible now seemed easy."

اسی لیے مشہور مستشرق گولڈزیہر نے عبدہ کے بارے میں لکھا ہے کہ: ”محمد عبدہ کا ذہن ان خیالات سے ازاول تا آخر شرار بور ہے جو انھوں نے قیام یورپ کے زمانے میں اخذ کیے اور بعد میں کتابوں سے حاصل کیے۔“ عبدہ نے تقلید کی مخالفت کی، اجماع کا انکار کیا، اجتہاد پر زور دیا، اور مغرب کی تمام اصطلاحات کو عین اسلامی ثابت کیا۔ عبدہ عقل کی حاکمیت کے اس درجے قائل تھے کہ انھوں نے لکھا:

How then can reason be denied its right, being, as it is, the scrutineer of evidences so as to reach the truth within them and know that it is Divinely

1- Maryam Jameelah, *Islam and Modernism*, Lahore: Mohammad Yusuf Khan, 1968, p. 128.



given? Having, however, once recognised the mission of a prophet, reason is obliged to acknowledge all that he brings, even though unable to attain the essential meaning within it or penetrate its full truth. Yet this obligation does not involve reason in accepting rational impossibilities such as two incompatibles or opposites together at the same time and point. For prophecies are immune from bringing such follies. But if there comes something which appears contradictory reason must believe that the apparent is not the intended sense. It is then free to seek the true sense by reference to the rest of the prophet's message in whom the ambiguity occurred, or to fall back upon God and His omniscience. There have been those among our forebears who have chosen to do either one or the other. ۱

شیخ عبدہ کی تاریخ، افکار، نظریات، اہداف اور اثرات و نتائج کا بہت بہترین خلاصہ محترمہ مریم جمیلہ صاحبہ نے پیش کیا ہے وہ لکھتی ہیں:

His aim was to interpret the Shariah in such a way as to free it from the classical interpretations and prove that Islam and modern Western civilization were compatible. Two of his best known *Fatwas* declared it lawful for Muslims to indulge in picture and statue making "where there is no danger of idolatry" and the other which allowed Muslims to deposit their money in banks where it would draw interest. He also declared it permissible for Muslims to adopt Western dress. ۲

علمائے مفتی عبدہ کے "اجتہادی نقطہ نظر" کو اس لیے قبول نہیں کیا کہ وہ اجتہاد کے لیے کتاب و سنت کی طرف کم مغرب اور سائنس کی طرف زیادہ دیکھتے ہیں اور اسلام اور مغرب میں تطبیق کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، بس کسی طرح اسلام، مغربی اقدار سے میل کھانے لگے۔ مریم جمیلہ لکھتی ہیں:

Shaikh Muhammad Abduh was hypnotized by modern science which he tried to read into the Quran. Here is one example of his reasoning at work:

- 1- Muhammad 'Abduh, *The Theology of Unity*, [trans., Ishaq Musa'ad & Kenneth Cragg], London: George Allen & Unwin, 1966, pp. 107-108.
- 2- Maryam Jameelah, *Islam and Modernism*, p. 130.

The ulema say that the *Djinn* are living bodies which cannot be seen. But it is permissible to assert that the minute living bodies only recently, discovered by means of the microscope and called microbes may well be identified as the *Djinn* ..... Consequently we Muslims in regard to the new scientific discoveries, must revise and correct traditional interpretations. The Quran is far too elevated in character to be contrary to modern science. --- quoted from *Islam and Modernism in Egypt*, Charles Adams, Oxford University Press, London, 1933.

Shaikh Muhammad Abduh was convinced not only of the supremacy of the physical sciences but also of the social sciences as interpreted by the leading Western philosophers of his day. He tried to convince his followers that Darwin's theory of evolution could be found in the Quran. ۱

مفتی عبدہ کے متعلق سب سے درست بات مصر کے برطانوی ناظم اعلیٰ لارڈ کرومر نے کہی ہے:

Mohammed Abdu's life lies in the fact that he may be said to have been the founder of a school of thought in Egypt very similar to that established in India by Syed Ahmed, the creator of the Alighur College. ۲

”محمد عبدہ مصر کے جدید ذہنی مکتب خیال کے بانی تھے، یہ مکتب خیال ہندوستان کے اس مکتب خیال سے بہت مشابہت رکھتا ہے جو علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خان نے قائم کیا تھا۔“

1- Maryam Jameelah, *Islam and Modernism*, p. 130.

2- Evelyn Baring Earl of Cromer, *Modern Egypt*, New York: Macmillan Company, 1916, Vol. II, Part IV, Chapter XXXV, p. 180.

## خلفائے راشدین کا اجتہادی مسلک — تخلیقی یا تقلیدی؟

ڈاکٹر منظور احمد لکھتے ہیں:

”قرن اول میں اگر یہ تخلیقی اجتہاد ممکن تھا اور خلفائے اربعہ نے اس کو رواجا جانا تو یہ اس امر کی مزید دلیل ہے کہ زمانے کا تغیر قوانین میں تبدیلی لاسکتا ہے۔“

پتا نہیں ڈاکٹر صاحب کی ”تخلیقی اجتہاد“ سے کیا مراد ہے؟ اگر حضرات خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کے فقہی منہاج اور اصول و ماخذ اجتہاد کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں اور روایتی علما کے اصول و طریق اجتہاد میں سرموفرق نظر نہیں آئے گا۔ خلفائے اربعہ کے اصول و طریق اجتہاد کا مطالعہ اس بات کا واضح ثبوت فراہم کر دیتا ہے کہ روایتی علما کے فقہی اور اجتہادی مناہج اور مسالک کے تشکیلی عناصر خلفائے راشدین ہی کے آثار اور خطوط سے مستعار اور ماخوذ ہیں۔

[۱] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وإن أبا بكر نزلت به قضية فلم يجد في كتاب الله منها أصلاً، ولا في السنة أثراً فاجتهد برأيه، ثم قال: هذا رأيي، فإن يكن صواباً فمن الله، وإن يكن خطأ؛ فمني وأستغفر الله.

”حضرت ابوبکرؓ کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا اور نہ وہ کتاب اللہ میں اس کے لیے حکم پاتے اور نہ سنت میں اس کی نظیر ملتی تب وہ اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرتے اور فرماتے یہ میری رائے ہے، اگر صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔“

عن ميمون بن مهران قال: كان أبو بكر الصديق إذا ورد عليه حكم؛ نظر في كتاب الله تعالى، فإن وجد فيه ما يقضي به قضى به، وإن لم يجد في كتاب الله نظر في سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم فإن وجد فيها ما

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ ماہی المعارف، صفحہ ۷۸۔

۲- ابن القیم الجوزی، اعلام الموقعین عن رب العالمین، فصل فیما روی عن صدیق الأمة وأعلمها من إنكار الرأي، جلد ۲، صفحہ ۱۰۱۔

يقضي به قضي به، فإن أعياه ذلك سأل الناس: هل علمتم أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قضي فيه بقضاء؟<sup>١</sup>

”میمون بن مہران کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا طریق یہ تھا کہ اگر کسی معاملے کا فیصلہ انہیں کرنا ہوتا تو پہلے کتاب اللہ میں دیکھتے، اگر وہاں اس کا حکم نہ ملتا تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تلاش کرتے، اگر وہاں حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے اور اگر انہیں اس مسئلے میں سنت کا علم نہ ہوتا تو لوگوں سے پوچھتے تھے کہ کیا تم میں سے کسی کو معلوم ہے کہ اس طرح کے کسی معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی فیصلہ فرمایا ہے؟“

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں اپنی تحقیق ان الفاظ میں رقم فرماتے ہیں:

لا يحفظ للصدیق خلاف نص واحد أبداً.<sup>٢</sup>

”صدیق اکبرؓ کی زندگی میں نص کی خلاف ورزی کی ایک مثال بھی موجود نہیں ہے۔“

[۲] حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا طریق ان کے اس خط سے معلوم ہو جاتا ہے جو انہوں

نے قاضی شریح رحمہ اللہ کے نام لکھا ہے:

وفي كتاب عمر بن الخطاب إلى شريح: إذا وجدت شيئاً في كتاب الله فاقض به، ولا تلتفت إلى غيره، وإن أتاك شيء ليس في كتاب الله فاقض بما سن رسول الله صلى الله عليه وسلم، فإن أتاك ما ليس في كتاب الله [ولم يسن رسول الله صلى الله عليه وسلم فاقض بما أجمع عليه الناس، وإن أتاك ما ليس في كتاب الله ولا سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يتكلم فيه أحد قبلك، فإن شئت أن تجتهد رأيك فتقدم، وإن شئت أن تتأخر فتأخر، وما أرى التأخر إلا خيراً لك].<sup>٣</sup>

”اگر تم کوئی حکم کتاب اللہ میں پاؤ تو اس کے مطابق فیصلہ کرو اور اس کی موجودگی میں کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کرو اور اگر ایسا کوئی معاملہ آئے جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں جو حکم ملے اس پر فیصلہ کرو اور اگر معاملہ ایسا ہو کہ جس کا حکم کتاب اللہ میں ہو اور نہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تو اس کا فیصلہ اس قانون کے مطابق کرو جس پر اجماع ہو چکا ہو۔ لیکن اگر کسی معاملہ میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ

۱- ابن القیم الجوزی، اعلام الموقعین عن رب العالمین، فصل تاویل ما روی عن الصحابة من الأخذ بالرأي، طريقة أبي بكر وعمر في الحكم على ما يرد عليهما، جلد ۲، صفحہ ۱۱۵۔

۲- ایضاً، فصل القول فی جواز الفتوی بالآثار السلفية، رجحان أقوال الصديق، جلد ۵، صفحہ ۵۳۷۔

۳- ایضاً، فصل تاویل ما روی عن الصحابة من الأخذ بالرأي، جلد ۲، صفحہ ۱۱۵۔

خلفائے راشدین کا اجتہادی مسلک — تخلیقی یا اٹھیدی؟ —

دونوں خاموش ہوں اور تم سے پہلے کوئی اجماعی فیصلہ بھی نہ ہوا ہو، تو تمہیں اختیار ہے کہ یا تو پیش قدمی کر کے اپنی اجتہادی رائے سے فیصلہ کر دو یا پھر ٹھہر کر انتظار کرو [تاکہ اس معاملے میں کوئی اجماعی فیصلہ ہو جائے] اور میرے نزدیک تمہارا انتظار کرنا زیادہ بہتر ہے۔

[۳] سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بیعت کے بعد سب سے پہلا خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

الوا انی متبع و لست بمبتدع، الا وان لکم علی بعد کتاب اللہ عزوجل و سنة نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثاً: اتباع من کان قبلی فیما اجتمعتم علیہ و سنتکم، و سن سنة اهل الخیر فیما لم تسنوا عن ملای، و الکف عنکم الا فیما استوجبتم۔<sup>۱</sup>

”آگاہ ہو جاؤ! میں پیروی کرنے والا ہوں، نئی راہ نکالنے والا نہیں، میرے اوپر کتاب اللہ اور سنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمہارے تین حق ہیں، جن کی میں ذمے داری لیتا ہوں۔ ایک یہ کہ میرے پیش رو خلفاء کے زمانے میں تمہارے اتفاق و اجتماع سے جو فیصلے طریقیے ہو چکے ہیں ان کی پیروی کروں گا۔ دوسرے یہ کہ جو امور اہل خیر کے اجتماع و اتفاق سے طے ہوں گے ان پر عمل درآمد کروں گا۔ تیسرے یہ کہ تمہارے اوپر دست درازی کرنے سے باز رہوں گا، جب تک تم از روئے قانون مواخذہ کے مستوجب نہ ہو جاؤ۔“

[۴] سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں اہل مصر سے بیعت لینے کے

لیے قیس بن سعد بن عبادہ کے ہاتھ جو سرکاری فرمان بھیجا، وہ یہ تھا:

الا وان لکم علینا العمل بکتاب اللہ و سنة رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم، و القیام علیکم بحقہ و التنفیذ لسننتہ۔<sup>۲</sup>

”آگاہ رہو! ہمارے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ ہم اللہ عزوجل کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق عمل کریں اور تم پر وہ حق قائم کریں جو کتاب و سنت کی رو سے حق ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو جاری کریں۔“

یہ ہے حضراتِ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے تخلیقی اجتہاد کا منہاج۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ ان حضرات نے اپنی رائے اور قیاس سے پہلے ہمیشہ نص کو فیصلہ کن مانا ہے۔ جس سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زمانے کا تغیر منصوص اور متعین قوانین میں تبدیلی لاسکتا ہے۔<sup>۳</sup>

۱- محمد بن جریر الطبری، تاریخ الأمم والملوک [تاریخ الطبری]، السعویة: بیت الافکار الدولیة، [س-ن ۱]، السنة الخامسة والثلاثون، ذکر بعض خطب عثمان، صفحہ ۷۸۹۔

۲- ایضاً، السنة السادسة والثلاثون، بعثة علی بن ابی طالب قیس بن سعد بن عبادہ امیراً علی مصر، صفحہ ۸۳۵۔

۳- اس سلسلے کی بعض مثالیں ڈاکٹر صاحب نے سیدنا عمر کی طرف منسوب کی ہیں، عن قریب ان کی کتاب ”اسلام۔ چند فکری مسائل“ کا تحقیقی جائزہ لے کر اس انتساب کی حقیقت واضح کی جائے گی۔

خلفائے راشدین کا اجتہادی مسلک — تخلیقی یا تقلیدی؟

باقی ڈاکٹر صاحب کی نظر میں جو اجتہاد ”تخلیقی“ ہے، وہ فی الاصل اجتہاد کی آڑ میں الحاد کا فروغ اور تقلید فرنگی کا بہانہ ہے، اس کے بنیادی خدو خال یہ ہیں:

[۱] متعین کو متغیر کر دیا جائے اور اُسے ”الحق“ مانا جائے۔

[۲] صرف معقول ہی کو حقیقت مانا جائے، منقول کی حیثیت صرف معقول کی تائید ہو اور بس۔ بہ صورتِ نزاع معقول کو لے لیا جائے اور منقول کو ترک کر دیا جائے۔

[۳] موجود ہی کو مطلوب و مقصود قرار دے کر اس کے حصول کو منشاء شریعت گردانا جائے۔

[۴] جدید علوم کی روشنی میں دین کی از سر نو تعمیر و تشکیل۔ یعنی عہدِ حاضر کی سائنس اور سوشل سائنس کو ناقابل تردید حقیقت اور معیار جان کر علوم اسلامی کو اُس منہاج میں پرکھنا۔ جو میل کھا جائیں انہیں قبول کر لیا جائے اور باقی کو فقہاء و علما کی خرافات یا زیادہ محتاط الفاظ میں عہدِ رفتہ کی ضرورت کہہ کر اسلامی علییت سے خارج کر دیا جائے۔

[۵] عہدِ جدید کے تقاضوں کو سرعت سے ممکن الحصول بنانے کی کاوش۔ بالفاظِ دیگر گناہ گار طرزِ زندگی کا دین و شریعت میں سمودینے کے امکانات کا فروغ۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اجتہاد کا دعویٰ عموماً وہ لوگ کرتے ہیں جو علوم اسلامی اور مغربی فلسفہ دونوں سے نابلد ہیں۔ اسی لیے ان کا مطالبہ ہمیشہ علما سے ہوتا ہے کہ وہ اجتہاد کریں — اجتہاد کے لیے جس علم کی اشد ضرورت ہے اور جس کے بغیر اجتہاد کا عمل مکمل نہیں ہو سکتا وہ دنیا کو حقیر سمجھنا ہے۔ احادیث کی کتب میں قائم ”ابواب الرقاق“ دنیا کی حقیقت واضح کرتے ہیں کہ جب نگاہ مومن میں دنیا حقیر ہو کر اسے صرف آخرت مطلوب و مقصود ہو جاتی ہے تو اسے علم خشیت عطا ہوتا ہے اور اس علم سے وہ اجتہاد برآمد ہوتا ہے جو امت کی تاریخ بدل دیتا ہے، وہ دل جو دنیا کی محبت سے معمور ہو اس کا اجتہاد الحاد اور فساد کے سوا کچھ نہیں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یمن کا قاضی بنا کر بھیجا چاہا تو میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! آپ مجھ کم سن کو اس عہدے پر بھیج رہے ہیں؟ مجھے تو فنِ قضا کا کچھ علم ہی نہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إن اللہ سیہدی قلبک، و یثبت لسانک۔<sup>۱</sup>

”اللہ تمہارے قلب کو راستہ سمجھا دے گا اور تمہاری زبان کو ثبات عطا کرے گا۔“

جب تمہارے سامنے جھگڑے آئیں تو جب تک مدعی کی طرح مدعا علیہ کا بیان بھی بہ اطمینان نہ سن لو، فیصلہ مت دو، اس طرح درست فیصلہ تمہارے سامنے روشن تر طریق پر آجائے گا۔ سیدنا علی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں برابر قاضی رہا اور مجھے کبھی کسی فیصلے میں شک و تذبذب پیدا نہیں ہوا۔

۱- سلیمان بن اشعث ابی داؤد، سنن ابی داؤد، کتاب القضاء، باب کیف القضاء، جلد ۱، صفحہ ۱۲۸۔

خلفائے راشدین کا اجتہادی مسلک — تخلیقی یا تہلیدی؟ —

معلوم ہوا کہ اجتہاد کے لیے عمر اور علم سے زیادہ خشیت، معرفت رب اور مسئولیت آخرت کی ضرورت ہے، یہی اصل اور علم حقیقی کا سرچشمہ ہے۔ جس دل میں خشیت نہ ہو وہ دل نہیں پتھر کی سل ہے، ایک طالب دنیا کا دل ہے جس سے حکمت کے سرچشمے نہیں پھوٹ سکتے۔ علامہ عبدالوہاب شعرائی [م ۹۷۶ھ] شیخ اکبر محی الدین ابن عربی [م ۶۳۸ھ] کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام اور انبیاء کرام علیہم السلام کی باتوں کو سمجھنے کے لیے ورع اور زہد فی الدنیا شرط ہے، پھر فرماتے ہیں:

و اما مع ميله إلى الدنيا فلا سبيل له إلى فهم الغوامض أبداً.<sup>۱</sup>  
 ”جو شخص دنیا کی طرف مائل ہو اسے باریکیوں کو سمجھنے کی توفیق ہی میسر نہیں آسکتی۔“

امام جلال الدین السيوطی [م ۹۱۱ھ] لکھتے ہیں:

قال في البرهان: اعلم أنه لا يحصل للناظر فهم معاني الوحي، ولا يظهر له أسرارہ، وفي قلبه بدعة أو كبر أو هوى أو حب الدنيا، أو وهو مصر على ذنب، أو غير متحقق بالایمان أو ضعيف التحقيق، أو يعتمد على قول مفسر ليس عنده علم، أو راجع إلى معقوله؛ وهذه كلها حجب و موانع بعضها أكد من بعض.<sup>۲</sup>

”برہان میں کہا ہے کہ جاننا چاہیے کہ ناظر اس وقت تک معانی وحی کی تحصیل نہیں کر سکتا نہ اس پر اسرار وحی آشکار ہو سکتے ہیں جب تک اس کے دل میں بدعت، تکبر، اپنی رائے اور دنیا کی محبت جاگزیں ہو، یا وہ گناہ پر مصر ہو، یا ایمان پر ثابت نہ ہو، یا تحقیق میں کمزور ہو، یا کسی ایسے مفسر پر اعتماد کرتا ہو جو علم صحیح کا حامل نہ ہو۔ یہ امور سب کے سب موانع ہیں، ان کی موجودگی میں معانی وحی تک رسائی ممکن نہیں، ہاں! ان موانع میں بہ اعتبار درجہ فرق ضرور ہے۔“

امت مسلمہ کے زوال کا اصل سبب اجتہادی روح کا فقدان نہیں ہے بلکہ حاملان و داعیان اجتہاد کے قلوب کا خشیت الہی کے حصول اور معرفت رب کے جذبے سے خالی و عاری ہونا ہے۔ اسی سبب سے امت مسلمہ اس وقت اندرونی و بیرونی یلغار کی زد میں ہے، اس کا جسم لہولہو اور جبین خون کے قطروں سے تر بہ تر ہے۔

- ۱- عبدالوہاب شعرائی، الیواقیت و الجواهر فی بیان عقائد الأكابر، بیروت: دار احیاء التراث العربی، [س-ن ۲]، الفصل الرابع: مجموعة من القواعد والضوابط التي يحتاج إليها من يريد التبحر في علم الكلام، جلد ۱، صفحہ ۵۳۔
- ۲- جلال الدین السيوطی، الاتقان فی علوم القرآن، النوع الثامن والسبعون في معرفة شروط المفسر و آدابہ، صفحہ ۷۷۳۔

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۳۸۵

## اسلام کا تصور تجدید — ”ایک اجتماعی غلط فہمی“

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”ہم عصر مغربی اور سیکولر دنیا اسلامی طرزِ اظہار کی اس تبدیلی کو سیاسی اسلام کے تصور کا ظہور سمجھتی ہے، اور اُن کی دانست میں تصادم تہذیبوں کے مابین وقوع پذیر ہوگا اور میدان میں فوری طور پر موجود متقابل قوت جو مغربی تہذیب کے خلاف ہے وہ اسلام ہے۔ یہ دوری تبدیلیوں کے بارے میں ایک ایسی غلط فہمی ہے جو اسلامی دنیا میں بالکل ابتدا سے پیدا ہوئی ہے..... مسلمانوں میں یہ عام عقیدہ ہے کہ ہر ہزار سال بعد ایک مصلح پیدا ہوتا ہے جو پہلے جیسی دینی پاکیزگی کو بحال کرتا ہے اور دنیا کے خاتمے کے قریب آخری نجات دہندہ آئے گا..... حاشیہ“۔

اس چند سطرے اقتباس سے درج ذیل نکات مترشح ہوتے ہیں:

[۱] ڈاکٹر صاحب اسلام کے تصور مجددیت کو ایک ”غلط فہمی“ تصور کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ ”غلط فہمی“ مسلمانوں میں ابتدا ہی سے پیدا ہو گئی تھی۔

[۲] اُن کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق مجتہد کا ظہور ہر ”ہزار سال“ کے بعد ہوتا ہے۔

[۳] چوں کہ وہ مجتہدیت کے ظہور ہی کو غلط فہمی تصور کرتے ہیں اس لیے اُمتِ مسلمہ کے

آخری مجتہد ”الامام المہدی“ کی آمد بھی اُن کے نزدیک ایک مشکوک تصور ہے۔

مجتہد کے تصور کو ڈاکٹر صاحب غلط فہمی قرار دے رہے ہیں وہ مسلمانوں کا خود وضع کردہ نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

ان اللہ یبعث لہذہ الامۃ علی راس کل مئۃ سنة من یجدد لہا دینہا۔<sup>۱</sup>

”بے شک اللہ تعالیٰ اس اُمت کے لیے ہر صدی کے سرے پر ایسے لوگ اُٹھاتا رہے گا جو

اُس کے لیے اُس کے دین کو تازہ کرتے رہیں گے۔“

۱- منظور احمد، نظریہ اور پاکستان، کراچی: شوکت ٹریڈنگ پارکھ فاؤنڈیشن (س۔ن۔)، صفحات ۲۴-۲۶۔

۲- سلیمان بن اشعث ابی داؤد، سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، باب ما یذکر فی قرن المئۃ، جلد ۲، صفحہ ۲۳۳۔



ڈاکٹر صاحب کے اقتباس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مسلمانوں میں مجتہد دیت کا تصور کوئی دیومالائی کہانی یا ظلم ساقی داستان ہے۔ اسلام میں مجتہد دیت کا مقصد اور تصور فقط اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے حضرات انبیاء و مرسلین علیہم السلام کا جو مبارک سلسلہ شروع فرمایا تھا اُسے اپنے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم فرماتے ہوئے دین کی تکمیل کا اعلان فرمایا، اور دین کو ہر عہد کی کثافتوں اور آمیزشوں سے مامون و مصنون فرمانے اور اسلام کی صداقت و ابدیت پر از سر نو اعتماد و اعتقاد بحال کرنے کے لیے عالم امکان و اسباب میں کچھ افراد و اشخاص متعین فرما دیے جو امت کی صلاح و فلاح اور اسلام کی بقا و تقویت کے لیے کوشش کرتے رہیں گے تاکہ اسلام اپنی تصویر اور تعبیر دونوں اعتبار سے جاہلیت و احداث سے محفوظ رہے۔ اور وعدہ الہی انا لہ لحفظون کا عہد و تکوینی انتظام محسوس و مشاہد ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مقصد بس امت کو اس ربانی انتظام سے بہ طور پیشین گوئی آگاہ فرمادینا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوگا کہ تعلیمات اسلامی جاہلیت کے مقابلے میں مغلوب ہو جائے اور اُس کے معانی و مبانی میں انفکاک [breakup] پیدا ہو جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہر عہد و قرن میں اس دین کو امانت دار اور نیک لوگوں کے ذریعے غلو اور افراط کرنے والوں کی تحریفوں، کھوٹے سکے چلانے والے لوگوں کی ملمع کاریوں اور جہلا کی فاسد تاویلوں سے محفوظ رکھے گا۔ دین نہ کبھی محرف و مغلوب ہو سکتا ہے اور نہ مرورِ ایام سے بوسیدہ۔ مجتہد دیت نبوت کے مثل کوئی امر تشریح سے تفویض فرمودہ منصب نہیں اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ مجتہد کو اپنے مجتہد دہونے کا علم ہو۔ البتہ تجدید پر نبوت کا سایہ ہوتا ہے اور مجتہد اپنے مزاج کی ہر کیفیت اور اعمال کی ہر حالت میں نبی کا کامل تتبع ہوتا ہے۔ اکابر علمائے اسلام کی کتابیں مجتہد دین کے تذکرے اور کارناموں سے پڑ ہیں۔ ان تمام متواتر دلائل اور شواہد کے باوجود ڈاکٹر منظور احمد صاحب مسلمانوں کے تصور مجتہد دیت کو ایک ”غلط فہمی“ سے تعبیر فرماتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ مجتہد کا ظہور ہر ہزار سال کے بعد ہوتا ہے، یہ بھی ڈاکٹر صاحب کی حدیث تجدید، مجتہد دیت کی حقیقت اور تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

ان الله يبعث لهذه الأمة على رأس كل مئة سنة من يجدد لها دينها.

”اللہ تعالیٰ ہر سو سال کے سرے پر ایسے کو اٹھائے گا جو اس امت کے لیے اُس کے دین

کو تازہ کرے گا۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجتہد کی آمد ”سوسال“ پر فرما رہے ہیں اور ڈاکٹر صاحب ”ہزار سال“ کہہ رہے ہیں۔ امت کی تاریخ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بالاتفاق پہلے مجتہد دین ہیں، جن کی فہرست اور کار تجدید پر علمائے اپنی تالیفات میں بڑی سیر حاصل بحشیں کی ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کو تسلیم کر لیا جائے تو امت کی پندرہ سو سالہ تاریخ میں اب تک صرف ایک مجتہد ہو سکتا ہے۔ غالباً عربی

اسلام کا تصور تجدید — ”ایک اجتماعی غلط فہمی“ —

نہ جاننے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو یہ مغالطہ لاحق ہو گیا ہے۔ صدی کے مجتہد و متوحد دہوئے البتہ الف کا مجتہد دامت کی پندرہ سو سالہ تاریخ میں ایک ہی ہوا اور وہ شیخ احمد سرہندی المعروف مجتہد الف ثانی ہیں۔ الف ثانی کا آغاز امت کے حق میں بہ نص حدیث شیوع فتن کے لحاظ سے فتح باب تھا اس لیے اس سرے پر کوئی معمولی مجتہد نہیں بلکہ رئیس المجتہدین کی ضرورت تھی۔

آخری بات یہ کہ چونکہ ڈاکٹر صاحب مجتہد دیت ہی کو مسلمانوں کی غلط فہمی پر محمول کرتے ہیں اس لیے الامام المہدی [جو بہ قول ڈاکٹر منظور احمد صاحب مسلمانوں کا ”آخری نجات دہندہ“ ہوگا] اسے بھی ایک مشکوک نظریہ ہی سمجھتے ہیں۔ بہ طور جملہ معترضہ یہاں یہ عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ ظہور مہدی سے متعلق ڈاکٹر صاحب کی یہ تشکیک کسی تحقیق پر مبنی نہیں بلکہ اپنے ممدوح علامہ نیاز فتح پوری صاحب کی تقلید پر استوار ہے۔<sup>۱</sup>

۱- نیاز فتح پوری، من ویزداں، صفحہ ۲۲۷۔

## امر بالمعروف ونہی عن المنکر — مفہوم، حدود اور شرائط

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”پاکستان کے بارے میں اگر صرف اتنا کہا جائے کہ یہاں کے باشندے اپنے اوپر خود

۱- پاکستان کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے اجمالی تاثر پر گفتگو اس وقت پیش نظر نہیں ہے۔ [ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے پاکستان کے متعلق اپنے خیالات کا مفصل اظہار ایک مضمون بہ عنوان ”پاکستان“ میں فرما دیا ہے جو روزنامہ نوائے وقت کی مسلسل تین اشاعتوں [۲۳، ۲۵، ۲۶ اگست ۲۰۰۸ء میں] شائع ہوا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

[۱] پاکستان نیا نام ہے۔ تاحال یہ ایک خارجی تصور ہے جو ہمارے تشخص کی علامت نہیں بن سکا۔

[۲] پاکستان نہ بنا تو اچھا تھا۔

[۳] پاکستان بنانے کا مقصد اسلام تھا تو اس کے خدو خال کیا تھے۔

[۴] قائد اعظم نے اپنے مقاصد کے لیے اسلام کو بہ طور آگے کار استعمال کیا۔

[۵] اسلامی تہذیب بہ طور اکائی کا تصور بیسویں صدی کی اختراع ہے۔

[۶] خدا کے مالک و خالق اور قانون دہندہ کے تصور کو سیاسی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا۔

[۷] نیابت الہیہ ایک استعارہ ہے، اس لیے انسان اللہ کا نائب نہیں ہے۔

[۸] اسلام وحدت پیدا نہیں کرتا۔

[۹] اسلام میں سیکولرزم کوئی مسئلہ نہیں یہ مسئلہ تو تھیو کریسی نے پیدا کیا ہے۔

[۱۰] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے میں مصلح تھے [یعنی رسول نہیں تھے] اور مدینہ پہنچ کر سیاسی بن گئے۔

[۱۱] مسلمانوں کے ذہن میں سمع و اطاعت کا فلسفہ ہی سیاسی اور مذہبی اعتبار سے محکم تاریخی اسلوب رکھتا ہے، جو شخصی

آزادی اور جمہوریت کے تصور کے یک سرخلاف ہے۔

[۱۲] مسلمانوں میں اخلاقی یا غیر اخلاقی قدریں بہ ذات خود کوئی شے نہیں ہیں بلکہ یہ خدا کا حکم ہیں۔ جس پر عمل سے فرد

کی شخصی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔

[۱۳] قانون سازی محدود ہو گئی ہے جس کی وجہ سے شریعت سے بہتر قانون نہیں بنایا جاسکتا اور نہ اجتہاد سے مکمل

تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر منظور صاحب کے ان خیالات پر ایک عمدہ نقد جناب طارق جان صاحب کے قلم سے نوائے وقت ہی میں

شائع ہو چکا ہے جسے بعد ازاں ”دانش وری یا تخریب کاری“ [ادارہ پاکستانیات ۲۸۶ سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ] =

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۳۸۹

امر بالمعروف ونہی عن المنکر — مفہوم، حدود اور شرائط —

حکومت کرنا چاہتے ہیں تو درست، لیکن اسلام اور نظریے کے نام پر عوام کی جذباتیت سے فائدہ اٹھانا صحیح نہیں ہے۔ اسلامی نظریے سے متعلق جتنا شور و غوغا پاکستان میں ہوتا ہے شاید کسی ملک میں نہ ہوتا ہوگا۔ لیکن اس سارے شور کا نتیجہ یہ ہے کہ سارے ”نظریاتی“ لوگ اب ایک ہی کام میں مصروف ہو گئے ہیں اور وہ ہے اسلامی حکومت کا قیام، وہ جو معاشرے میں ایک جماعت ہونی چاہیے جو دنیا کے طالب نہ ہوں جو اپنے عمل اور اخلاق سے دوسروں کے لیے قابل تقلید نمونہ بنیں، جو اپنی اخلاقی قوت سے معاشرے میں اُمید کی قندیل کو روشن رکھیں، افسوس ان سے معاشرہ خالی ہوتا جا رہا ہے، دنیا کی اخلاقی طاقت آج بھی حکومتیں نہیں ہیں، بلکہ وہ لوگ ہیں جو حکومت کے طالب نہیں بلکہ اپنے کردار، بے لوث خدمت سے اور کسی حد تک ترک دنیا سے لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی آیت کہ تم میں کچھ لوگ ہونے چاہئیں جو معروف کا حکم کریں اور منکر سے روکیں کی تفسیر بھی آج کل یہ ہو گئی ہے کہ ”معروف“ کو بہ زور نافذ کریں اور منکر کو بہ زور ختم کریں۔ ہمارے مصلحین یہ بات بھول گئے کہ اخلاق کا نفاذ بہ زور نہیں ہوتا بہ رضا و رغبت ہوتا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب نے منقولہ بالا اقتباس میں تین نکات پر گفتگو فرمائی ہے:

[۱] پاکستان کے تمام ”نظریاتی“ لوگ، پاکستانی مسلمانوں کی اسلامی جذباتیت سے فائدہ اٹھا کر بس ایک ہی کام میں لگ گئے ہیں اور وہ ہے اسلامی حکومت کا قیام۔ گویا یہ کوئی اہم کام نہیں ہے۔

[۲] معاشرے میں مثالی اخلاق و کردار کی حامل ایک جماعت ایسی بھی ہونی چاہیے جو اقتدار و حکومت کی طالب نہ ہو بلکہ ترک دنیا کی علم بردار ہو۔

[۳] قرآن حکیم میں بیان فرمودہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے احکام محض دعوتِ اخلاق میں محدود و محصور ہیں جن کا نفاذ بہ رضا ہوتا ہے بہ زور نہیں، اور عہد حاضر کی مذہبی جماعتوں نے اسے بہ زور نافذ کرنے کی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔

تینوں نکات کے سلسلے میں چند باتیں اختصار کے ساتھ لکھی جاتی ہیں:

اسلامی حکومت کا قیام: اہم ترین دینی مقصد:

جہاں تک پہلے نکتے کا تعلق ہے تو پتا نہیں ڈاکٹر صاحب کس دنیا میں رہتے ہیں، کبھی خواب و خیال اور تصورات کی دنیا سے باہر نکل کر حقیقت پسندی اور واقعیت کا بھی ثبوت دینا چاہیے۔ اگر واقعہ

= کے نام سے علیحدہ بھی طبع کر دیا گیا ہے۔ اب یہ رسالہ طارق جان کی معرکہ آرا کتاب سیکولرزم: مغالطے اور مباحث [اسلام آباد: ایمل مطبوعات، ۲۰۱۲ء، صفحات ۱۳۶-۱۶۳] میں شامل ہے۔ اس رسالے کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب نے اسلام پر مشق ناز کے ساتھ ساتھ اب فلسفہ تاریخ کو بھی موضوعِ سخن بنالیا ہے، ان تخریبی افکار کی آبیاری روشن خیالی اور آزادی افکار کے نام پر کی جا رہی ہے۔

۱- منظور احمد، نظریہ اور پاکستان، صفحہ ۲۸۔

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۳۹۰

امر بالمعروف ونہی عن المنکر — مفہوم، حدود اور شرائط —

پاکستان کے تمام ”نظریاتی“ لوگ بس اسی ایک کام میں بخت چکے ہوتے تو یہاں اب تک اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہوتی — رہی اسلامی حکومت کے قیام کی بات تو اگر قرآن و حدیث اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ فرمایا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اسلامی حکومت کے قیام کے مکلف پوری دنیا کے مسلمان ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں سے ایک مقصد حکومت الہیہ کا قیام اور دنیا میں ربانی سیاست و معاشرت اور اخلاق و اعمال کا نفاذ تھا۔ ڈاکٹر صاحب اسے پاکستان کے نظریاتی لوگوں کی نفسیات قرار دے رہے ہیں، جب کہ امام ابن حزم رحمہ اللہ [م ۴۵۶ھ] لکھتے ہیں:

اتفق جميع أهل السنة و جميع المرجئة و جميع المعتزلة و جميع الشيعة و جميع الخوارج على وجوب الامامة، وأن الأمة فرض واجب عليها الانقياد لامام عادل يقيم فيهم أحكام الله، ويسوسهم بأحكام الشريعة التي أتى بها رسول الله صلى الله عليه وسلم.

”تمام اہل سنت، مرجیہ، معتزلہ، شیعہ، خوارج سب کا اتفاق ہے کہ نصب امام واجب ہے اور یہ کہ امت پر ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے جو احکام الہی کو قائم کرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے احکام شریعت کے مطابق ان کا سیاسی نظام قائم کرے۔“  
حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ [م ۶۸۷ھ] لکھتے ہیں:

يجب أن يعرف أن ولاية أمر الناس من أعظم واجبات الدين، بل لا قيام للدين اء لا بها.

”اس بات کا جاننا ضروری ہے کہ ریاست و حکومت کا قیام دین کے عظیم ترین فرائض میں سے ہے، اور قیام دین اس کے بغیر ممکن نہیں۔“  
حضرت امام قرطبی رحمہ اللہ [م ۶۷۱ھ] لکھتے ہیں:

ولا خلاف في وجوب ذلك بين الأمة و لا بين الأئمة.

”نصب امامت کی فرضیت میں امت اور ائمہ کے مابین کوئی اختلاف نہیں۔“

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ [م ۸۰۸ھ] لکھتے ہیں:

إن نصب الامام واجب، قد عرف وجوبه من الشرع باجماع الصحابة و

۱- علی بن حزم الاندلسی، الفصل في الملل والأهواء والنحل، بیروت: دار الجلیل، ۱۴۱۶ھ، الکلام في الامامة والمفاضلة، جلد ۴، صفحہ ۱۴۹۔

۲- تقی الدین ابن تیمیہ، السياسة الشرعية في إصلاح الراعي والرعية، بیروت: دار الآفاق الجديدة، ۱۴۰۳ھ، القسم الثاني: الحدود والحقوق، الباب الثاني: الحدود والحقوق التي لا دمي معين، الفصل الثامن: وجوب اتخاذ الامارة، صفحہ ۱۳۸۔

۳- محمد بن احمد القرطبی، الجامع لأحكام القرآن، جلد ۱، صفحہ ۳۹۵۔

التابعین ..... و کذا فی کل عصر بعد ذالک. ولم یتروک الناس فوضی فی عصر من الأعصار. و استقر ذالک إجماعاً دالاً علی وجوب نصب الامام.<sup>۱</sup> ” بے شک امام [خلیفہ] کا مقرر کرنا فرض ہے، اس کا وجوب، شریعت، صحابہؓ و تابعین کے اجماع سے ثابت ہے..... اور اسی طرح ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے اور اس بات پر اجماع ہو گیا جو نصب امامت کے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔“

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ [م ۱۱۷۶ھ] ارقام فرماتے ہیں:

واجب بالكفایہ است بر مسلمین الی یوم القیامہ نصب خلیفہ مستجمع شروط.<sup>۲</sup> ”مسلمانوں پر ایسے خلیفہ کا مقرر کرنا، جو جامع شرائط خلافت ہو، روز قیامت تک فرض کفایہ ہے۔“

اسلام کی برکت سے مسلمانوں کا خمیر ہی اس سے اٹھا ہے کہ پورا معاشرہ فرد اور اجتماع سمیت کلیۃً الہی نظام و قانون کا تابع ہو جائے۔ دین زندگی کے ہر شعبے اور حیات کے ہر گوشے میں عملاً داخل و نافذ ہو جائے۔ اس کے قیام و نفاذ میں دیگر اجزا کے ساتھ ساتھ سیاست شرعیہ بھی اسلام کا اہم ترین جز ہے۔ دین کے تمام اجزاء مل کر اسلام کو من حیث الکل بہ طور نمونہ اور معیار عالم انسانیت کے سامنے پیش کرتے ہیں، انہیں اپنے دامن رافت میں آنے اور دین حق کے قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اسلام باطل نظاموں کی چاکری اور ان سے give and take کی مصالحت کے لیے نہیں آیا۔ اسے رعایت نہیں حاکمیت مطلقہ مطلوب ہے کہ ملک بھی اللہ تعالیٰ کا اور حکم بھی اللہ تعالیٰ کا۔ مسلمانوں کی غلامی اور آزادی کی ہر تعریف اسی قول فیصل سے متعین ہوتی ہے، اگر یہ ہے تو ہم آزاد ہیں ورنہ غلام، چاہے دنیا کے نقشے میں کتنے ہی وسیع رقبے پر ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے ہمارے ملک کا نام موجود ہو۔ اسلام جس معاشرے کے قیام کا ضامن ہے وہاں موانع کی احتمالی بالادستی بھی غلامی ہی کی ایک شکل ہے۔ اپنا ایک مستقل قانون شہادت اور فوج داری و دیوانی قانون رکھتا ہے، تجارت و معاملات، نکاح و طلاق، وراثت و وصیت اور بیع و ہبہ وغیرہ کے لیے اس کا اپنا ایک نظام قانون و ہدایت ہے۔ جس کو بہ روئے کار آنے کے لیے بجا طور پر اقتدار و حکم درکار ہے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو شریعت کا ایک بڑا حصہ معطل اور ناقابل عمل ہو جائے گا۔ راسخ العقیدہ اسلام جہاں بھی موجود ہے، چاہے وہ خود پر جدت و جدیدیت کے کتنے ہی نقاب ڈالے، اصلاً وہ ریاست کا طالب ہے۔ شریعت کا کامل نفاذ اور شریعت کی کامل پابندی کا تصور ریاست و حکومت کے بغیر ناممکن ہے۔ اسلام جہاں جہاں اور جس جس شکل میں موجود ہے آخر کار وہ سیاسی غلبے اور ریاستی تسلط کا پیغام بربن جاتا ہے۔ اس کے بالقابل ہندومت، عیسائیت اور یہودیت میں مذہب ریاست کے بغیر بھی قابل عمل ہے۔ اسلامی طرز زندگی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک وہ

۱- عبدالرحمن ابن خلدون، المقدمۃ، الفصل الثالث من الكتاب الاول، في اختلاف الامة في حكم الخلافة وشروطها، جلد ۱، صفحہ ۳۳۔

۲- شاہ ولی اللہ، ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء، کراچی: قدیمی کتب خانہ [س-ن] جلد ۱، صفحہ ۱۷۔

نجی خانے سے بالا خانے تک سرایت نہ کر جائے۔ اسلام نجی [private] اور عوامی [public] دائروں کی تقسیم روا نہیں جانتا۔ یہاں ایک ہی دائرہ ہے جو خاندان سے ایوان تک محیط ہے۔ اسی غلبے کے عدم وجود نے مسلمانوں کو اپنی آزادی اور غلامی کو سیاسی و معاشی نقطہ نظر سے دیکھنے کا عادی بنا رکھا ہے۔ زوال سے دوبارہ کمال تک کی خوابیدہ طلب میں آج مسلمانوں کا قبلہ مقصود اور صحیح نظر بس دنیا ہی ہے۔ عبادات و اذکار کے لگے بندھے نظام اور نماز روزے کی رسمی پابندی نے مسلمانوں کے وجود کو غلامی کے احساس کی شدت سے بڑی حد تک بیگانہ و انجان بنائے رکھا ہے۔ دوسری طرف باطل کیشوں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ اسلامی اصطلاحات کی آڑ میں لادینیت [Sacularism] اور باطل اقدار کو مسلم معاشرے میں نہایت چابک دستی اور مخفی طریق پر کاشت کر سکیں۔ اگرچہ اس سے بد عقیدگی، عملی اختلال اور تہذیبی انتشار و تموج کے کئی مظاہر سامنے آئے مگر معاشرہ مجموعی طور پر کبھی بھی دیدہ بینا اور گوش شنوا رکھنے والے لوگوں سے خالی نہیں رہا۔ اس کی خاکستر میں ”شرار آرزو“ رکھنے والے ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ امت مسلمہ میں اپنی مضمحل سے مضمحل حالت میں بھی دینی بیداری اور شدت تعلق کا اتنا مہمہ، دبدبہ اور طنطنہ موجود ہے، جس نے آج بھی جدیدیت پسندوں کو اپنے نفس کے مکمل اظہار سے خائف کر رکھا ہے۔ آج تک لوگ خود کو دینی نظام استناد یا ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی اصطلاح میں ”نیت خدا کے شارجین“ سے آزاد نہیں کر سکے۔ من حیث الکل آج بھی معاشرے میں ان ہی کا چلن ہے۔

### پاکستان: نفاذ اسلام کی کوشش نا جائز مطالبہ؟

ڈاکٹر منظور احمد صاحب پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے مطالبے کو پاکستانی عوام کی اسلامی جذباتیت سے فائدہ اٹھانے کے مرادف گردان رہے ہیں۔ سب سے پہلا سوال تو یہی اٹھتا ہے کہ یہاں اسلامی حکومت کے قیام کی حقیقی کوشش اور جدوجہد کون رہا ہے؟ بلکہ ہم تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اور دیگر جدیدیت پسند حضرات ایک مشن کے تحت حدود و تعزیرات میں تغیر اور اسلامی قوانین میں تبدیلی کی جو کوشش اجتہاد کے نام پر فرما رہے ہیں یہ بھی کار عبث اور تضحیح اوقات ہے کیوں کہ انباحث و مذاکرات کا موضوع تو وہ معاشرہ ہے جہاں اسلامی نظام نافذ ہو۔ کاش یہ محنت اور وقت ڈاکٹر صاحب کسی اور نادرا اور طبع زاد موضوع کی تحقیق و تفہیم اور تفتیش میں صرف فرماتے، مغربی افکار و اقدار ہی کا تحلیل و تجزیہ فرمادیتے تو اس ایجابی علمی خدمت سے بہتوں کا بھلا ہو جاتا۔

اس بات کے ساتھ ایک سوال مزید قابل غور ہے کہ پاکستان کس لیے بنایا گیا تھا؟ سیکولر ازم کی آبیاری کے لیے یا ملت کے انفرادی تشخص کی حفاظت اور اسلامی معاشرے کے قیام کی عملی کوشش کے لیے، جہاں اسلام اپنی حقیقی تعلیم و تعبیر کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہو اور مسلمانوں کے انفرادی و اجتماعی اعمال اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ سے زندہ و محسوس تعلق پر استوار ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع اور حقیقی غلامی ہی زندگی کا نصب العین متعین کر سکے۔

جس نعرے کی بنیاد پر پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا وہ پاکستان کا مطلب کیا: لا الہ الا اللہ ہے۔ اگر یہ بنیاد اور مقصود نہیں تو پھر یہ پاکستان نہیں ہندوستان ہی ہے، چاہے لاکھ بار اسے پاکستان گردانا جائے، اس مسئلے کے اثبات میں حوالے اور اقتباسات سے مضمون کو گراں بار کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ سمر دست پروفیسر کینٹ ول اسمتھ کا فقط ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ایک ”پاکستانی“ جدیدیت پسند اور سیکولر کی سوچ اسے تاریخ کو اپنے مخصوص افکار کی عینک لگا کر دیکھنے کے باعث حقیقت و واقعیت سے دور کر کے کس طرح دیانت کا خون کروا دیتی ہے جس سے ایک غیر پاکستانی مغربی بہرہ ور ہے:

Ideologically it was not a territorial or an economic or a linguistic or even, strictly, a national community that was seeking a state, but a religious community. The drive for an islamic state in India was in origin not a process by which a state sought Islamicness but one by which Islam sought a state.<sup>1</sup>

جب تحریک پاکستان سے لے کر قیام پاکستان تک اسلام اور نظریے کی جذباتیت قائدین کے بیانات اور عوام کی کیفیات سے ظاہر ہے تو نفاذ اسلام کے سلسلے میں جذباتیت [اول تو ہے نہیں اور اگر بالفرض ہے بھی تو] کیوں بڑی ہو گئی ہے؟ جس مقصد کے لیے یا جس بنیاد پر یہ ملک حاصل کیا گیا تھا، اس کی تعمیر و تشکیل ان ہی خطوط پر ہونی چاہیے جو اس مقصد کا تقاضا ہے۔

### صوفیہ کرام اور ریاست و حکومت:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب اسلامی معاشرے میں ایک ایسی جماعت کی موجودگی کے خواہاں اور متمنی بھی ہیں جو ترک دنیا کی علم بردار ہو، جو اپنے بے مثل اخلاق اور رفعت کردار سے دوسروں کے لیے قابل تقلید نمونہ بن سکیں اور جو حکومت کے طالب نہ ہوں۔

یہ بات ٹھیک ہے کہ دنیا کی محبت اور دین ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے اور زمانہ ایسے لوگوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب یہاں دراصل دین اور دنیا کی دوئی کا تصور پیش فرما رہے ہیں۔

1- قائد اعظم محمد علی جناح نے قیام پاکستان سے قبل اور اس کے بعد متعدد مرتبہ پبلک اعلانات میں واضح کیا کہ قیام پاکستان کا مقصد کیا ہے۔ ان کے یہ اعلانات خورشید احمد خان یوسفی کی مرتبہ کتاب *Speeches, Statements & Messages of the Quaid-e-Azam: 1941 [April 14]-1945, [Bazm-e-Iqbal, 1996]* میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں، جس میں حوالوں کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ جمیل الدین احمد صاحب کی کتاب *Some Recent Speeches and Writings of Mr. Jinnah, [S. M. Ashraf, 1947]* بھی اس سلسلے کی اہم کتاب ہے۔

2- Wilfred Cantwell Smith, *Islam in Modern History*, New American Library, 1959, p. 216.



جیسے صدیوں پہلے مغرب میں کلیسا نے City of God اور City of Man کے تحت مادی و روحانی دنیا کو دو الگ حصوں میں تقسیم کر کے دین کو دنیا سے الگ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مغرب خصوصاً امریکہ کے اس اقدام کو درست قرار دیتے ہوئے عقل کا فیصلہ یوں سنایا ہے: ”..... عقل کی عدالت تسلیم کرتی ہے کہ مغرب نے بہ شمول امریکہ مذہب کو ریاستی فیصلوں سے علیحدہ رکھنے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ درست تھا۔“ یہ اس سوچ کا اظہار ہے کہ دین کا تعلق فرد کے ذاتی دائرے اور نجی زندگی سے ہے، اجتماعیت میں دخل اندازی اور زندگی کے مرکزی دھارے میں شمولیت اس کا حق نہیں، اس کی جگہ مسجد و خانقاہ اور مدرسہ و مکتب ہے اور اس سے مقصود محض ذکر و تسبیح۔ جب ہماری مذہبیت انگلیخت کرے گی تو ہم خود گھٹنے دو گھٹنے کے لیے وہاں حاضر ہو جائیں گے، لیکن اسے ہرگز یہ حق نہیں کہ اپنے جامے سے قدم باہر نکال کر ہمارے بالا خانوں، ایوانوں اور درباروں کا رخ کرے۔ — ورنہ اخلاق حمیدہ کا اکتساب و اتصاف اور رذائل کا ترک کسی ایک طبقے یا گروہ کی ذمے داری نہیں بلکہ کل امت مسلمہ کا ان اوصاف و کمالات سے آراستہ ہونا ضروری اور اسلام کا مقتضی ہے۔ تزکیہ باطن، تصفیہ قلب اور اخلاقی صفات سے معمور و مزین ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آدمی رُہبانیت اختیار کرتے ہوئے ترک دنیا کا علم بردار بن جائے۔ اسلام آدمی کو رُہبانیت، تعطل و بے عملی، حالات سے شکست خوردگی اور کارزار سے فرار نہیں سکھاتا، بلکہ افراد، ریاست، معاشرت اور حکومت و اقتدار تک ہر جگہ حقیقی تشخص کے حامل و مصداق افراد کی موجودگی و فراہمی کا مطالبہ کرتے ہوئے اسے متوازن و منضبط تنوع عطا کرتا ہے۔ آخرت میں مسئولیت و جواب دہی کا مستقل استحضار صوفیت و سیاست اور شریعت و طریقت میں کوئی منافات باقی نہیں رہنے دیتا۔ اس استحضار کے اطلاقی جہات مسلمانوں کی تاریخ میں دربار سے لے کر درگاہ تک ہر جگہ نظر آتے رہے ہیں۔ بہت دور جانے کی ضرورت نہیں اگر بر عظیم ہی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو درگاہ و دربار کے درمیان اس ربط و تعلق اور اس کے نتیجے میں میسر آنے والے تہذیبی توازن کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ اگر خدا اساسی طبیعت کا داعیہ بن جائے اور مزاج اطاعت پر ڈھلا اور قائم ہو تو اقتدار و حکومت بھی دائمی کامیابی و کامرانی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اور اس اقتضا اور داعیے کی معدومیت علائق دنیا سے ترک کے توغل کے باوجود خذلان و ہلاکت سے نہیں روک سکتی۔ بالفاظ دیگر طبیعت اور مزاج میں یک سوئی ہو تو اسباب کے خلقی اختلاف میں وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔ خلفائے راشدینؓ اس متنوع امتزاج کا حقیقی مصداق اور وحدت کا کامل نمونہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنے فضائل و کمالات اور علم و عمل کے اعتبار سے سب سے بڑی چار شخصیتیں جو اپنے وجود و عمل کی ہر جہت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا مثالی نمونہ اور معجزاتی مظہر ہیں۔ جن کی اتباع کامل سے راہ دین متعین ہوئی اور بعد والوں کے لیے معیار قرار دی گئی۔ جن کے اعمال اور فیصلوں کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”سنت“ قرار دیا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد امور دنیا سے منقطع ہو کر، نعوذ باللہ، سنیاں نہیں لے بیٹھے تھے، بلکہ انھوں نے

آگے بڑھ کر امت کی ناؤ کو سنبھالا اور اپنے معیاری کردار و اعمال اور اخلاق کے ساتھ مسند خلافت کو بھی جائے عبادت بنا دیا۔ اور دنیا کو یہ اصول عطا فرمایا کہ اگر طلبِ آخرت اور رضائے الہی کا حصول پیش نظر اور شامل عمل ہو تو کارِ دنیا کی انجام دہی بھی دین بن کر باعثِ خیر اور موجبِ آخرت ہو جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر دین کا آسمان پوری زندگی اور معاشرے پر سایہ فگن رہے تاکہ زندگی کا ہر شعبہ اور حیات کا ہر گوشہ اپنی تمام تر وجودی معنویت اور امتزاجی تنوع کے ساتھ فرد اور قوم ہر سطح پر اپنی انفرادیت کا اظہار و اثبات کر سکے۔ اسلام عبادت و سیاست کے درمیان کسی خط متارکہ کا قائل نہیں۔ یہ بات اتنی بدیہی ہے کہ مسلمان تو مسلمان مستشرقین بھی اس حقیقت سے بہ خوبی آگاہ ہیں۔ مشہور مورخ نکلسن لکھتا ہے:

Islam allows no distinction between Church and State ..... it is impossible to treat with the politics apart from religion<sup>1</sup>

ایک اور مغربی مفکر تو دین و سیاست کی عدم تفریق کو نبوت کے جوہر سے تعبیر کرتا ہے، وہ لکھتا ہے:

What is the distinguishing characteristic of the prophetic idea? It is the notion that religion and politics are inseparable.<sup>2</sup>

”تصور نبوت کی ممتاز اور نمایاں خصوصیت کیا ہے؟ وہ یہ حقیقت ہے کہ دین اور سیاست میں تفریق ممکن نہیں۔“

ڈاکٹر صاحب کا موقف اس مفروضے پر قائم ہے کہ اقتدار کی طلب اور حکومت کا جذبہ ہمیشہ حب دنیا کے داعیے سے پیدا ہوتا ہے، اور اخلاقی کردار کا حامل ہمیشہ اقتدار و حکومت کو قابلِ نفرت سمجھتا ہے۔ اس مفروضے کے ازالے کے لیے سطور گزشتہ میں اصولی نکات کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ لیکن ہماری موجودہ سیاسی فضا کو سامنے رکھتے ہوئے بات کچھ غلط بھی نہیں بلکہ یہ مفروضہ جزوی واقعیت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ آج ہماری مجموعی سیاسی لیڈر شپ اعلیٰ سے اسفل تک اپنا کوئی ایک ایسا قابل ذکر نمائندہ پیش نہیں کر سکتی جو فکر و عمل، تہذیب و سیاست، قانون و معاش اور نظریہ و علم کی سطح پر بلا تاویل اسلامیت کا عامیانا مظہر بھی بن سکتا ہو جس کے معیاری اور منتہائی نمونے ہماری تاریخ میں موجود رہے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ فرد کی تبدیلی کے بغیر حالات کی تبدیلی کا خواب ہے۔ تاہم عہد حاضر میں اس حقیقی اور مطلوب شخص کا فقدان اسلام کے اس بنیادی مقصد، یعنی حکومتِ الہیہ، کے قیام سے مانع نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اسے نفسِ مسئلہ کے انکار کا زینہ بنایا جاسکتا ہے۔ ہمارے جدیدیت پسند بد قسمتی سے جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں نظریہ عمل سے نہیں بلکہ عمل نظریے سے پیدا ہوتا ہے۔ انھیں جان رکھنا چاہیے کہ کسی بھی معاشرتی نظام کی سیاسی تشکیل جن

1- Reynold Alleyne Nicholson, A Literary History of Arabs, Cambridge University Press, 1953, pp. 170, 182.

2- Hermann Cohen, Religion of Reason: Out of the Sources of Judaism, London: Continuum International Publishing Group, Ltd., 1972, p.25.

امر بالمعروف ونہی عن المنکر — مفہوم، حدود اور شرائط —

معیارات پر کی جانی چاہیے وہ اپنی غایت کے اعتبار سے دنیوی نہیں ہوتے۔ ان کے بنیادی اہداف اور اساسی مقاصد محض حصول آزادی اور اقتصادی بہبود پر انحصار نہیں کرتے بلکہ ان کا مقصد آدم گری و مردم سازی ہوتا ہے۔ اور سیاست دنیا کے راستے سے اس مقصود کے حصول کو ممکن بناتی ہے۔

جس طبقے کے نام پر ڈاکٹر صاحب نظر یاتی لوگوں کو ترک دنیا کا مشورہ دے رہے ہیں، یعنی صوفیہ، تو انہوں نے کبھی ترک دنیا کا درس نہیں دیا، نہ ہی دنیا سے بہ قدر ضرورت انشباع سے منع فرمایا، بلکہ دنیا سے تمتع کی حدود متعین فرماتے ہوئے اس کی محبت میں افراط سے روکا ہے، زہد و تقشف ترک دنیا کا نہیں بلکہ حب دنیا سے اغماض کا نام ہے، مسلمانوں کی صوفیانہ روایت کے مسلم امام سے اس امر کی شہادت ملاحظہ کیجیے، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ [م ۵۶۱ھ] کا ارشاد ہے:

”دنیا ہاتھ میں رکھنی جائز۔ جیب میں رکھنی جائز۔ کسی اچھی نیت سے اس کو جمع کر رکھنا جائز، باقی قلب میں رکھنا جائز نہیں [کہ دل سے بھی محبوب سمجھنے لگے] دروازے پر اس کا کھڑا ہونا جائز، باقی دروازے سے آگے گھسنا جائز ہے اور نہ تیرے لیے عزت“۔  
صوفیہ بہ قدر ضرورت دنیا کے استعمال سے کیسے منع کر سکتے ہیں؟ جب کہ قرآن نے حکم دیا ہے:

وَلَا تَنْسَ نَفْسِيكَ مِنَ الدُّنْيَا [۷۷:۲۸]

”اور دنیا سے اپنا حصہ لینا نظر انداز نہ کرو“۔

حضرت عارف رومی نے کہا:

چیت دنیا از خدا غافل بدن  
نئے تماش و نقرہ و فرزند وزن

ڈاکٹر منظور احمد: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر: فاش غلطیاں:

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے:

”قرآن کریم کی آیت، کہ تم میں کچھ لوگ ہونے چاہئیں جو معروف کا حکم کریں اور منکر سے روکیں، کی تفسیر آج کل یہ ہو گئی ہے کہ معروف کو بہ زور نافذ کریں اور منکر کو بہ زور ختم کریں۔ ہمارے مصلحین یہ بات بھول گئے کہ اخلاق کا نفاذ بہ زور نہیں ہوتا بہ رضا و رغبت ہوتا ہے۔“  
اس سلسلے میں صورت مسئلہ اس وقت تک واضح نہیں ہو سکے گا جب تک درج ذیل امور تنقیح کے ساتھ سامنے نہ آجائیں:

۱- عبدالقادر الجیلانی، فیوض یزدانی ترجمہ الفتح الربانی، مترجم: عاشق الہی میرٹھی، کراچی: مدینہ پبلسنگ کمپنی، ۱۹۸۲ء، مجلس ۵۱، صفحہ ۳۷۱۔

\_\_\_\_\_ امر بالمعروف ونہی عن المنکر \_\_\_\_\_ مفہوم، حدود اور شرائط \_\_\_\_\_

[۱] امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کیا مراد ہے؟ آیا محض اخلاق یا کچھ اور؟

[۲] امر معروف اور انکار منکر محض دعوت و تلقین سے ہوگا یا قوت و نفاذ سے بھی۔

سورۃ آل عمران کی آیت مبارکہ [نمبر ۱۰۴] کے ضمن میں منقولہ بالا نکتہ آفرینی کرتے ہوئے

ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے مندرجہ بالا دونوں نکات کو نہ صرف نظر انداز کیا ہے، بلکہ دعوت اور امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر کے فرق کو ملحوظ نہ رکھتے ہوئے اسے مجرد دعوت و ترہیب اور وعظ و تلقین تک محدود فرما دیا ہے۔

اگر ڈاکٹر صاحب نے اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں موجود احادیث [کے ترجمے] اور اردو تفاسیر ہی لے لیں

علمائے سلف کے تفسیری اقوال دیکھ رکھے ہوتے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو محض دعوت و تلقین تک

محدود کرتے ہوئے اس کے حاکمانہ نفاذ کی تفسیر کو ”آج کل“ کی تفسیر ہونے کا طعنہ نہ دیتے۔

معروف و منکر: مفہوم و مراد:

معروف و منکر کی تعین کوئی فلسفیانہ بحث تو ہے نہیں جس پر بے لاگ نکتہ آفرینی کی جائے، یہ تو

شرعی اصطلاحات ہیں جن کا مطلب بھی شریعت ہی طے کرے گی اور تعین بھی۔ اصطلاح شریعت میں

معروف وہ نیکیاں ہیں جو اسلامی معاشرے میں جانی پہچانی ہیں اور جس سے شریعت نے روکا ہو، و

مفسدات اور برائیاں منکر کہلاتی ہیں۔ حافظ ابن جریر الطبری [م ۳۱۰ھ] لکھتے ہیں:

أصل المعروف كل ما كان معروفاً ففعله جميلاً مستحسناً، غير مستقبح في

أهل الإيمان بالله. و إنما سميت طاعة الله معروفاً؛ لأنه مما يعرفه أهل الإيمان

ولا يستنكرون فعله، وأصل المنكر ما أنكره الله، ورأوه قبيحاً فعله، ولذلك

سميت معصية الله منكراً؛ لأن أهل الإيمان بالله ويستنكرون فعلها.

”معروف کے اصل معنی یہ ہیں کہ ہر وہ چیز جس کا کرنا جانا پہچانا ہو اور اہل ایمان کے

نزدیک اچھا اور مستحسن ہو اور وہ اس کو قبیح نہ سمجھتے ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو بھی

معروف اس لیے کہتے ہیں کیوں کہ یہ ان چیزوں میں سے ہے جنہیں اہل ایمان پہچانتے

ہیں اور اس کے کرنے کو پسند کرتے ہیں اور منکر کی اصل یہ ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے ناپسند

جانا ہو، اور اہل ایمان بھی اس کے کرنے کو ناپسند خیال کرتے ہوں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ

کی نافرمانی کو منکر کہا جاتا ہے، کیوں کہ اہل ایمان اس کے کرنے کو ناپسند کرتے ہیں۔“

امام ابو بکر جصاص رازی [م ۳۷۰ھ] لکھتے ہیں:

المعروف هو أمر الله... والمنكر هو ما نهى الله عنه.

۱- محمد بن جریر الطبری، تفسیر الطبری جامع البیان عن تأویل آی القرآن، القاہرہ: م ۱۳۲۲ھ، جلد ۵، صفحات ۶۷۶-۶۷۷

۲- ابو بکر جصاص، احکام القرآن، بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱۳۱۲ھ/۱۹۹۲م، سورۃ آل عمران [۱۰:۳]

باب فرض الأمر بالمعروف والنہی عن المنکر، جلد ۲، صفحہ ۳۲۲۔

\_\_\_\_\_ امر بالمعروف ونہی عن المنکر \_\_\_\_\_ مفہوم، حدود اور شرائط \_\_\_\_\_

”معروف سے مراد احکام الہی ہیں... جب کہ منکر سے ہر وہ شے مراد ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہو“۔

امام شوکانیؒ لکھتے ہیں:

انہم یا مروون بما هو معروف فی هذه الشريعة، وینہون عما هو منکر فیہا، فالدلیل علی کون ذلك الشیء معروفاً أو منکراً هو الكتاب أو السنة<sup>۱</sup>۔

”وہ ہر اس شے کا حکم دیتے ہیں جو اس شریعت میں معروف ہیں اور اس سے منع کرتے ہیں جو منکر [قتیح] ہے، پس اس چیز کے منکر ہونے کی دلیل قرآن و سنت ہے“۔

علامہ محمود آلوسی بغدادیؒ [م ۱۲۷۰ھ] لکھتے ہیں:

والمبتادر من المعروف الطاعات ومن المنکر المعاصی التي أنکرها الشرع<sup>۲</sup>۔

”بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ معروف میں تمام اطاعتیں شامل ہیں اور منکر سے مراد وہ تمام معاصی ہیں جن کو شریعت نے ناپسند سمجھا ہے“۔

امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:

المعروف اسم لكل فعل يعرف بالعقل أو الشرع حسنه والمنکر ما ینکر بہما<sup>۳</sup>۔

”معروف سے ہر وہ فعل مراد ہے جس کا اچھا ہونا عقل سے معلوم ہو یا شریعت سے۔ اور منکر وہ جسے عقل و شریعت دونوں ناپسند کرتے ہوں“۔

معلوم ہو گیا کہ ”معروف“ سے مراد شریعت کے پسندیدہ اور مروج احکام ہیں، جب کہ ”منکر“

غیر پسندیدہ، اور قبیح افعال کا نام ہے جس کا تعین شریعت اور اس کی بنیاد پر استوار مسلم معاشرہ کرتا ہے۔ اس تعریف و تعین پر امت مسلمہ شروع سے آج تک متفق چلی آ رہی ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب اس کے دائرے کو تنگ کرتے ہوئے اسے محض ”دعوت اخلاق“ تک محدود فرماتے ہیں، اور پھر اپنی خود وضع فرمودہ، تعریف ہی کو اصل قرار دیتے ہوئے اسے کل امت مسلمہ کا موقف قرار دیتے ہیں اور عصر حاضر کے علما کو طنزاً سمجھاتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مراد ”اخلاق“ ہیں۔ حالاں کہ متقدمین کی عبارات سے یہ واضح ہو گیا کہ اس وسیع اور ہمہ جہات حکم کو محض ”اخلاق“ تک محدود کر دینا غلط ہے۔

امرو نہی: قرآن کے اعتبار سے مختلف مفاہیم:

گفتگو شروع کرنے سے قبل ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ لفظ ”امر“ عربی زبان

میں کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ زبان و ادب کا ذوق رکھنے والے حضرات اس قاعدے سے واقف

۱- محمد بن علی الشوکانیؒ، ارشاد الفحول إلى تحقیق الحق من علم الأصول، المقصد الثالث: الإجماع،

البحث الثاني: فی امکان الإجماع فی نفسه، جلد ۱، صفحہ ۳۶۸-۳۶۹۔

۲- محمود آلوسی بغدادیؒ، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، بیروت: إدارة الطباعة

المیریة، ۱۰-۱۱-ن | جلد ۲، صفحہ ۲۸۔

۳- راغب اصفہانیؒ، المفردات فی غریب القرآن، کتاب العین، عرف، جلد ۲، صفحہ ۳۳۱۔

ہیں کہ مختلف مقامات پر ان کا مفہوم قرآئین و شواہد سے متعین ہوتا ہے۔ ”امر“ عام طور پر وجوب کے لیے آتا ہے لیکن کبھی کبھی استحباب اور اباحت کے لیے بھی آتا ہے، جیسے: فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا [۳۲:۲۳] میں استحباب کے لیے، اور: كُلُوا وَاشْرَبُوا [۳۱:۷] میں اباحت کے لیے ہے۔ غیر وجوب کے معنی کے لیے قرآن کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی یہ امر کے صیغے سے ہوتا ہے اور کبھی غیر فعل امر کے صیغے سے، جیسے: وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ [۲۳۳:۲] میں يُرْضِعْنَ مضارع ہے مگر یہاں طلب کے مفہوم میں ہے، کبھی مصدر بھی بہ طور امر استعمال ہوتا ہے جسے: فَضْرَبَ الرَّقَابِ [۴:۴۷] میں ضْرَبَ اضرب بوا کے معنی میں ہے۔ امر کبھی مطلق ہوتا ہے، جس میں وقت کی پابندی نہ ہو، زکوٰۃ مال نصاب پر سال گزرنے سے زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے، لیکن اس کی ادائیگی کے لیے کوئی وقت متعین نہیں ہے۔ جب امر مقید ہو تو اسے اپنے وقت پر عمل میں لایا جائے گا، جیسے دن کی پانچ نمازیں اور تراویح صرف رمضان میں ادا کی جاتی ہے۔ مقید میں وقت اس کا سبب وجوب ہوتا ہے، رمضان ہوگا تو روزے فرض ہوں گے اور رمضان میں تراویح ہوگی۔ وقت پر احکام بجلائے جائیں تو اس کا نام ”ادا“ ہے اور وقت گزر جانے کے بعد حکم باقی رہے اور اسے بجلا لیا جائے تو یہ اس کی ”قضا“ ہے۔ ”نہی“ کبھی ماضی کی صورت میں ہوتی ہے، جیسے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ [۲۳:۴] اور کبھی نفی اور انکار سے بھی حکم دیا جاتا ہے جیسے: لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرِهًا [۱۹:۴] اسلام میں جس چیز سے روکا گیا وہ منہی عنہ ایک قبیح چیز ہوگی، لیکن یہ قباحت کبھی لذتہ ہوگی اور کبھی لغیرہ۔ شراب بیچنا قبیح لذتہ ہے اور اذان جمعہ سے لے کر اختتام تک خرید و فروخت کرنا: وَذَرُوا الْبَيْعَ [۹:۶۲] کے خلاف ہے، یہ کاروبار حرام لغیرہ ہوگا، یہ قبیح لغیرہ ہے، قباحت اس کی ذات میں نہیں ایک خارجی سبب سے وجود میں آئی ہے۔

اب ڈاکٹر صاحب کی گفتگو کے دوسرے حصے کو دیکھتے ہیں کہ آیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نفاذ محض دعوتِ اخلاق ہی کے ذریعے ہونا چاہیے؟ ڈاکٹر صاحب نے یہ بات قرآن مجید کی درج ذیل آیت کے ضمن میں ارشاد فرمائی ہے:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ [۱۰۴:۳]

”اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے، انہیں معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“

آیت مبارکہ کے الفاظ اس قرینے کی وضاحت کے لیے کافی ہیں کہ اس میں خطاب اجتماعی ہے اور یہ حکم ارباب اقتدار سے متعلق ہے۔ یہ آیت مبارکہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصے میں دعوت

۱- خالد محمود، آثار التشریح، لاہور: دار المعارف، ۱-۱-۱۰۰، جلد ۲، صفحات ۹۹-۱۰۰۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر — مفہوم، حدود اور شرائط —

دین کے فریضے کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے میں اقامتِ دین کی طرف۔ الفاظِ قرآنی میں تدبر اس قرینے کو واضح کر دیتا ہے کہ یہاں وعظ و تلقین اور تبلیغ و ترغیب کے ساتھ ساتھ اقتدار و اختیار کی قوت و سطوت سے اس کو نفاذ کرنا بھی مطلوب ہے۔ اگر محض دعوتِ اخلاق مراد ہوتی تو یَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ [جو امور خیر کی دعوت دیتے ہیں] کے الفاظ کافی تھے۔ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ [جو اچھے کاموں کا حکم کرتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں] کی ضرورت نہ تھی۔ آیت میں امر [حکم] اور نہی [ممانعت] کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ عربی جاننے والے اس سے بہ خوبی واقف ہیں کہ امر و نہی کے ان الفاظ میں درخواست و عرض گزاری نہیں بلکہ اقتدار و حکم کی شان ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسلامی حکومت کے ارباب اقتدار کی صفات میں سے ایک صفت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نفاذ کو قرار دیا ہے:

الَّذِينَ اِنْ مَكَّنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَآمَرُوْا  
بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ. [۲۲:۳۱]

”یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو اس سر زمین میں حکومت عطا کر دیں تو نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، اچھے کاموں کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔“

حضرت امام نوویؒ [م ۶۷۶ھ] لکھتے ہیں:

قد تطابق على وجوب الامر بالمعروف والنهي عن المنكر الكتاب  
والسنة وإجماع الأمة..... ووجوبه بالشرع لا بالعقل خلافاً للمعتزلة.<sup>۱</sup>  
”امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فرضیت پر کتاب و سنت اور اجماع امت سب ہی شاہد ہیں۔ اور اس کی فرضیت شرعاً ہے نہ کہ عقلاً جیسا کہ معتزلہ کا خیال ہے۔“

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر: قیام و نفاذ کا طریق:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قیام و نفاذ کا طریق کیا ہونا چاہیے، اس سلسلے میں دو

احادیث پیش خدمت ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من رأى منكم منكراً فليغيره بيده. فإن لم يستطع فبلسانه. فإن لم يستطع  
فبقلبه. وذلك أضعف الإيمان.<sup>۲</sup>

”جو بھی تم میں سے کسی منکر کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے تبدیل کر دے،

۱- مکی الدین النوویؒ، شرح النووی علی مسلم، بیت الافکار الدولیة [س-ن]، کتاب الإیمان، باب بیان

کون النہی عن المنکر من الإیمان الخ، جلد ۱، صفحہ ۱۲۳۔

۲- مسلم بن حجاج القشیریؒ، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الإیمان

الخ، جلد ۱، صفحہ ۵۱۔

\_\_\_\_\_ امر بالمعروف ونہی عن المنکر \_\_\_\_\_ مفہوم، حدود اور شرائط \_\_\_\_\_

اگر اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو زبان سے روکے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہیں رکھتا تو دل سے برا سمجھے اور یہ آخری درجہ ایمان کا سب سے کم زور درجہ ہے۔

تغییر بالید [ہاتھ سے بدل دینے اور عملی اصلاح] میں ”ہاتھ“ کنایہ ہے قوت و طاقت سے، جس کا تعلق ہر مسلمان کے دائرہ اختیار سے ہے۔ شوہر، باپ اور حکمران بلاشبہ اسی کے مکلف ہیں کہ اپنے دائرہ اختیار میں رہتے ہوئے منکر کو اپنی طاقت اور قوت سے مٹادیں۔ اس لیے شریعت کہتی ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سے دور کیا جائے اور اس کی جگہ معروف کو قائم کیا جائے۔ اسی طرح زبان سے روکنے کے لیے بات اور آزادی کی ضرورت ہے۔ اگر ان دونوں کی استطاعت و قدرت سے محروم ہو تو پھر دل سے برا سمجھنا اور اسے تبدیل کر دینے کی خواہش اور عزم ضرور رکھنا چاہیے، جو ایمان کا آخری درجہ ہے اور جس کے بعد ایک اور حدیث کے مطابق:

ولیس وراء ذلك من الايمان حبة خردل<sup>۱</sup>

”اور اس کے بعد رانی کے دانے برابر بھی ایمان نہیں۔“

لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر صاحب عزیمت پر یہ بات لازم کر دی ہے کہ اگر وہ معاشرتی یا ریاستی سطح پر منکر کا ارتکاب دیکھے تو اپنے پیروکاروں کا جھٹالے کر اس منکر کے ازالے کے لیے حکومت کے خلاف بغاوت، خروج اور جہاد کے لیے نکل کھڑا ہو، بلکہ اس سے مراد ہے کہ ہر شخص اس بات کا مکلف ہے کہ وہ اپنی رعیت [دائرہ اختیار] میں رہنے والوں کے تمام معاملات کے لیے مسئول قرار پائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ<sup>۲</sup>

”تم میں سے ہر ایک اپنے حلقے کا نگران ہے اور ہر ایک کو اپنے زیر نگرانی حلقے کی بابت اللہ کے سامنے جواب دہی کرنا ہے۔“

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ امر معروف اور ازالہ منکر کے نام پر کوئی بھی فرد یا گروہ یوں ہی ریاست کے خلاف خروج یا بغاوت کا علم بلند کرے<sup>۳</sup> حادثہ مبارکہ میں اسے بدترین قسم کا شر اور فساد قرار دیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عوام کو تاکید فرمائی ہے کہ جب تک حاکم وقت کسی گناہ کا حکم نہ دے اس وقت تک حتی الامکان اس کی اطاعت کریں اور اپنے حقوق کے لیے ہتھیار نہ اٹھائیں، خواہ اس

۱- مسلم بن حجاج اقصیری، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان الخ، جلد ۱، صفحہ ۵۲۔

۲- ایضاً، کتاب الإمارة، باب فضیلة الامام العادل و عقوبة الجائر الخ، جلد ۲، صفحہ ۱۲۲۔

۳- راقم کی تمام تر گفتگو اسلامی ریاست یا خلافت اسلامیہ کے خلاف خروج یا بغاوت سے متعلق ہے۔ اس بحث کا تعلق دور حاضر کی سرمایہ دارانہ ریاستوں سے جوڑنا خلطِ بحث ہوگا۔ سرمایہ دارانہ ریاستیں اپنے اصول سے لے کر نفاذ اور اطلاق تک خلافت اسلامیہ یا امارت اسلامی سے متضاد اور متغایر ہیں۔ اسلامی شریعت میں خروج اور بغاوت کا کلمہ ”اسلامی ریاست“ کے فاسق و فاجر حکمران کے خلاف ہے۔



\_\_\_\_\_ امر بالمعروف ونہی عن المنکر \_\_\_\_\_ مفہوم، حدود اور شرائط \_\_\_\_\_

کے لیے کیسی بھی بڑی مصلحت کیوں نہ قربان کرنی پڑے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من کرہ من امیرہ شیئاً فلیصبر علیہ. فإِنَّہ لیس احد من الناس خرج من السلطان شبراً، فمات علیہ، إلا مات میتةً جاہلیةً.<sup>۱</sup>

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہے:

والذي نفس محمد بيده لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر، ولتأخذن على يدي الظالم ولتأطرنه على الحق أطراً أو ليضربن الله قلوب بعضكم على بعض ثم ليلعنكم كما لعنهم.<sup>۲</sup>

”اس رب کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، تم پر لازم ہے کہ معروف کا حکم کرو اور برائی سے روکو اور برائی کا ارتکاب کرنے والے کا ہاتھ پکڑو اور اسے حق کی طرف موڑ دو، ورنہ اللہ تعالیٰ برائی کرنے والے کے دلوں کی معصیت کا زنگ حق پرستی کے دعوے داروں کے قلوب پر بھی چڑھا دے گا، یا تم پر بھی اسی طرح لعنت کر دے گا جس طرح یہود پر کی۔“

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ معروف کی تلقین اور منکر سے انکار باب اقتدار کی صفات کے ساتھ ساتھ اپنی بساط و حالات اور حدود استطاعت کی رعایت سے فرد پر بھی لازم ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ [۷۱:۹]

”اور مومن مرد اور عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، بھلائی کی نصیحت کرتے ہیں اور بُرائی سے منع کرتے ہیں۔“

آیت مبارکہ میں بھلائی کی تلقین کے لیے ”امر“ کا لفظ آیا ہے، اوپر وضاحت کی جا چکی ہے کہ یہ لفظ اپنی وسعت کے لحاظ سے حکم، ترغیب، مشورے، نصیحت اور تلقین وغیرہ سب کو حاوی ہے، یہاں یہی فرمایا گیا ہے کہ انسان اپنی استعداد اور علم کے مطابق اپنے دائرہ اختیار میں معروف کی نصیحت اور منکر کے ازالے کی کوشش کرے، اس آیت کی رو سے پتا چلا کہ یہ فریضہ عام ہے، جس میں ریاست و حکومت اور علماء و عوام برابر ہیں۔ یہ بھی آج کی تفسیر نہیں، سلف سے منقول ہے، حضرت امام نوویؒ [م ۶۷۶ھ] لکھتے ہیں:

قال العلماء: ولا يختص الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر بأصحاب الولايات، بل ذلك جائز لأحد المسلمين. قال إمام الحرمين: والدليل عليه إجماع المسلمين، فإن غير الولاية في الصدر الأول، والعصر الذي

۱- مسلم بن حجاج القشيري، صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب وجوب ملازمة جماعة المسلمين عند ظهور الفتن الخ، جلد ۲، صفحہ ۱۲۸۔

۲- سليمان بن احمد الطبراني، المعجم الكبير، القاهرة: مكتبة ابن تيمية، [س-ن]، الاختلاف عن الاعمش في حديث عبد الله ان النبي قال ”عليكم بالباءة“، باب، جلد ۱، صفحہ ۱۸۰-۱۸۱۔

\_\_\_\_\_ امر بالمعروف ونہی عن المنکر \_\_\_\_\_ مفہوم، حدود اور شرائط \_\_\_\_\_

یلیہ کا نوا یا مروون الولاية بالمعروف، وینھونہم عن المنکر، مع تقریر المسلمین ایہم، وترک تو بیخہم علی التشاغل بالأمر بالمعروف والنہی عن المنکر من غیر ولاية۔<sup>۱</sup>

”علمائے کہا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اصحاب اقتدار کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ یہ عام مسلمانوں کے لیے بھی ثابت ہے۔ امام الحرمین کا قول ہے اس بات کی دلیل مسلمانوں کا اجماع ہے، کیوں کہ صدر اول اور اس سے متصل زمانوں میں عوام الناس حکمرانوں کو معروف کا حکم دیتے تھے اور منکر سے منع کرتے تھے، اور اس پر تمام مسلمانوں کی تقریر شاہد ہے۔ علاوہ ازیں تمام مسلمانوں کا حکمرانوں کے علاوہ افراد امت کے امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں مشغول نہ ہو جانے پر کوئی انکار نہ کرنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ غیر حکمران کے لیے بھی روا ہے۔“  
امام غزالی لکھتے ہیں:

هذا الاشتراط فاسد فان الآيات والأخبار التي أوردناها تدل على أن كل من رأى منكر فسكت عليه عصى إذا يجب نهيه أينما رآه و كيفما رآه على العموم فالتخصيص بشرط التفويض من الامام تحکم لا أصل له..... استمرار عادات السلف على الحسبة على الولاية قاطع باجماعهم على الاستغناء عن التفويض بل كل من أمر بمعروف فان كان الوالى راضياً به فذاك وإن كان ساخطاً له فسخطه له منكر يجب الانكار عليه فكيف يحتاج إلى اذنه الانكار عليه.<sup>۲</sup>

”یہ شرط لگانا [کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے حکومت کی اجازت ضروری ہے] ہی فاسد ہے، کیوں کہ آیات اور احادیث جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے، اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جس نے بھی کسی منکر کو دیکھا اور اس پر سکوت اختیار کیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی کیوں کہ اس پر اس منکر سے روکنا واجب تھا۔ خواہ جہاں بھی اس نے منکر کو دیکھا ہو اور جس حالت میں بھی دیکھا ہو، پس اس حکم عام میں اس شرط کے ساتھ تخصیص پیدا کرنا کہ نہی عن المنکر اس وقت فرض ہوگا جب کہ امام کی اجازت ہو بے دلیل ہے جس کی بنیاد نہیں..... حضرات سلف کا مسلسل طرز عمل کہ وہ حکمرانوں کا احتساب کرتے رہے، اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اس

۱- محی الدین النووی، شرح النووی علی مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الإیمان الخ، جلد ۱، صفحہ ۱۲۳۔

۲- ابو حامد محمد الغزالی، إحياء علوم الدين، انذونیشیا: کریاط فو ترا، ۱-۳-ن، کتاب الأمر بالمعروف والنہی عن المنکر، المحتسب فی الأمر بالمعروف وشروطه، جلد ۲، صفحہ ۳۱۲۔

\_\_\_\_\_ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے۔ مفہوم، حدود اور شرائط \_\_\_\_\_

فریضے کی ادائیگی کے لیے حکمرانوں کی طرف سے مامور ہونا قطعاً ضروری نہیں، پس جس نے بھی معروف کا حکم دیا اور حکمران نے اس کو پسند کیا تو یہی چیز مطلوب ہے اور اگر حکمران نے اس معروف کے حکم کرنے سے ناراض ہوا تو حکمرانوں کی یہ ناراضگی خود ایسا منکر ہے کہ جس کا انکار واجب ہے۔ اس صورت میں یہ شخص حکمران سے صادر ہونے والے اس منکر کے انکار کے لیے کیسے اس کی اجازت کا محتاج ہوگا۔

مذکورہ بحث سے واضح ہو گیا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ارباب اقتدار سے لے کر عام مسلمان تک کی ذمہ داری ہے۔ بلکہ اس کے وجوب پر اجماع ہے۔ امام ابو بکر صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھتے ہیں:

أكد الله تعالى فرض الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر في مواضع من كتابه، وبينه رسول الله صلى الله عليه وسلم في أخبار متواترة عنه فيه، وأجمع السلف وفقهاء الأمصار على وجوبه<sup>١</sup>

”اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فرضیت کو قرآن مجید میں کئی مقامات پر تاکیداً بیان کیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی فرضیت کو ان احادیث میں بیان فرمایا ہے جو آپ سے متواتر منقول ہیں اور سلف اور فقہائے بلاد اسلامیہ کا اس کی فرضیت پر اجماع ہے۔“

منکر کے ازالے کا یہ طریق علما کا نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان فرمودہ ہے۔ ان تمام آیات و احادیث کی موجودگی میں علما کا حق بنتا ہے کہ وہ یہ فرمائیں:

أجمع المسلمون - فيما ذكر ابن عبد البر - أن المنكر واجب تغييره  
على كل من قدر عليه<sup>٢</sup>

”حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے علما کا اجماع نقل فرمایا ہے کہ ہر اس شخص پر منکر کی تغیر واجب ہے جو اس کی قدرت رکھتا ہو۔“

اسلامی ریاست کے مسلم حکمرانوں کو امر معروف: آداب و شرائط:

حکمرانوں کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کیا طرز عمل ہونا چاہیے، سیدنا غیاض بن غنم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من اراد أن ينصح لسلطان بأمر فلا يبدله علانية، ولكن ليأخذ بيده  
فيخلوبه، فإن قبل منه فذاك، وإلا لا كان قد أدى الذي عليه له<sup>٣</sup>

١- ابو بکر صلی اللہ علیہ وسلم، احکام القرآن، سورة المائدة [١٠٣:٥]، باب الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر، جلد ٢، صفحہ ١٥٢۔

٢- محمد بن احمد القرطبي، الجامع لأحكام القرآن سورة آل عمران: ٢١-٢٢، جلد ٥، صفحہ ٤٢۔

٣- احمد بن حنبل، مسند احمد، مسند المكيين، حديث هشام بن حكيم بن حزام، جلد ٣، صفحہ ٢٠٢۔

\_\_\_\_\_ امر بالمعروف ونہی عن المنکر \_\_\_\_\_ مفہوم، حدود اور شرائط \_\_\_\_\_

”جو شخص کسی صاحب اقتدار کو نصیحت کرنا چاہے تو اُسے چاہیے کہ اُسے علانیہ رسوا نہ کرے بلکہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر تنہائی میں لے جائے پھر اگر وہ قبول کر لے تو خیر، ورنہ اُس کے ذمے جو حق تھا وہ اُس نے ادا کر دیا۔“

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں زید بن وہبؒ کہتے ہیں کہ لوگ اس زمانے میں امیر کی بعض باتوں سے ناراض تھے، ایک شخص نے آکر حضرت حذیفہؒ سے کہا: آپ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیوں نہیں کرتے؟ حضرت حذیفہؒ سمجھ گئے کہ اشارہ امیر کے خلاف بغاوت کی طرف ہے، آپ نے فرمایا:

إن الأمر بالمعروف والنہی عن المنکر لحسن، ولیس من السنة أن تشهر السلاح علی امیرک۔<sup>۱</sup>

”امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بلاشبہ اچھی بات ہے، لیکن یہ کوئی سنت نہیں کہ تم اپنے امیر پر ہتھیار لے کر چڑھ دوڑو۔“

مسلم ریاست کے جابر اور فاسق حکمرانوں کے خلاف بغاوت: نتائج و مضمرات:

تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب بھی کسی صاحب اقتدار کے خلاف مسلح بغاوت ہوئی ہے، اُس کے نتائج بالعموم اچھے نہیں نکلے بلکہ اس کے نتیجے میں امت پہلے سے زیادہ بدتر حالات کا شکار ہوئی، حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ایسی بغاوتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقل من خرج علی امام ذی سلطان إلا کان ماتولد علی فعله من الشر أعظم مما تولد من الخیر، کالذین خرجوا علی یزید بالمدينة، وکابن الأشعث الذی خرج علی عبد الملک بالعراق، وکابن المهلب الذی خرج علی ابنه بخراسان، وکابی مسلم صاحب الدعوة الذی خرج علیهم بخراسان أيضاً، وکالذین خرجوا علی المنصور بالمدينة والبصرة، وأمثال هؤلاء. وغایة هؤلاء إما أن یغلبوا، وإما أن یغلبوا، ثم یزول ملکهم فلا یكون لهم عاقبة؛ فإن عبد الله بن علی وأبامسلم قتلاً خلقاً کثیراً، وکلاهما قتله أبو جعفر المنصور. وأما أهل الحرة وابن الأشعث وابن المهلب فهزموا وهزم أصحابهم، فلا أقاموا دیناً ولا أبقوا دنیاً. واللہ تعالیٰ لا یأمر بأمر لا یحصل به صلاح الدین، ولا صلاح الدنیا، وإن کان فاعل ذلك من أولیاء اللہ المتقین ومن أهل الجنة..... وكذلك أهل الحرة کان فیهم من أهل العلم والدین خلق. وكذلك أصحاب ابن الأشعث..... کان

۱- ابی بکر الصدیقؓ، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، کتاب الخلافة، باب منه لزوم الجماعة الخ، جلد ۵ صفحہ ۲۹۰۔

الحسن البصري يقول: إن الحجاج عذاب الله، فلا تدفوا عذاب الله بأيديكم، ولكن عليكم بالاستكانة والتضرع، فإن الله تعالى يقول: وَلَقَدْ أَخَذْنَاهُم بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ [٤٦:٢٣] ..... ولهذا استقر أمر أهل السنة على ترك القتال في الفتنة للأحاديث الصحيحة الثابتة عن النبي صلى الله عليه وسلم، وصاروا يذكرون هذا في عقائدهم، ويأمرون بالصبر على جور الأئمة.

”جب کسی نے بھی کسی [مسلمان] صاحب اقتدار حکمران کے خلاف بغاوت کی ہے، تو اُس کے نتیجے میں ایسا شر پیدا ہوا ہے جو خیر کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا، مثلاً مدینہ منورہ میں جن لوگوں نے یزید کے خلاف بغاوت کی، اور جیسے ابن الاشعث جس نے عراق میں عبد الملک کے خلاف بغاوت کی، اور جیسے ابن المہلب جس نے خراسان میں اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی، اور جیسے ابو مسلم جس نے خراسان ہی میں حکمرانوں کے خلاف بغاوت کی، اور جیسے وہ لوگ جنہوں نے مدینہ منورہ اور بصرہ میں منصور کے خلاف بغاوت کی، اور ان جیسے دوسرے لوگ۔ اور ان لوگوں کا انجام یا تو یہ ہوتا ہے کہ یہ مغلوب اور ناکام ہو جاتے ہیں، یا غالب آتے ہیں تو کچھ ہی عرصے کے بعد ان کی حکومت ختم ہو جاتی ہے، اور انجام ان کے حق میں نہیں ہوتا۔ چنانچہ عبد اللہ بن علی اور ابو مسلم نے بڑی مخلوق کو قتل کیا اور پھر یہ دونوں ابو جعفر منصور کے ہاتھوں قتل ہوئے، اور جہاں تک اہل حرہ، ابن اشعث اور ابن مہلب کا تعلق ہے، وہ اور ان کے ساتھی تو شکست ہی کھا گئے، لہذا نہ وہ دین کو قائم رکھ سکے اور نہ دنیا کو باقی رکھ سکے، اور اللہ تعالیٰ کسی ایسے کام کا حکم نہیں دیتے جس میں نہ دین کی بہتری ہو نہ دنیا کی، چاہے اُس کام کا کرنے والا اللہ تعالیٰ کے متقی بندوں اور اہل جنت میں سے ہو..... اور یہی اصحاب حرہ کا حال ہے کہ ان میں بڑے بڑے اہل علم اور دین دار لوگ موجود تھے، نیز ابن اشعث کے ساتھیوں میں بھی اہل علم و دین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی..... اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے تھے کہ حجاج بن یوسف اللہ کا عذاب ہے، اس لیے اس عذاب کو تم اپنے ہاتھوں سے روکنے کی کوشش نہ کرو، بلکہ تمہیں چاہیے کہ اللہ کے سامنے عاجزی اور گریہ و زاری کرو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اُن کو [ایک مرتبہ] عذاب میں پکڑا تھا تو اُس وقت بھی یہ لوگ اپنے پروردگار کے سامنے نہ جھکے اور یہ تو عاجزی کی روش اختیار کرتے ہی نہیں“..... اسی

۱- تقی الدین ابن تیمیہ، منهاج السنة النبویة فی نقض الکلام الشیعة والقدریة، فصل قال الرافضی وتمادی بعضهم فی التعصب الخ، جلد ۲، صفحہ ۲۳۱۔

\_\_\_\_\_ امر بالمعروف ونہی عن المنکر \_\_\_\_\_ مفہوم، حدود اور شرائط \_\_\_\_\_

بنا پر اہل سنت و جماعت کا مسلک یہ قرار پایا کہ فتنے میں قتال نہ کیا جائے، کیوں کہ صحیح احادیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، اُن کا یہی تقاضا ہے، اور اہل سنت اس بات کو اپنے عقائد میں ذکر کرتے ہیں اور حکمرانوں کے ظلم پر صبر کرنے اور مسلح کارروائی نہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔“

حافظ ابن تیمیہؒ مزید لکھتے ہیں:

وهذا كله مما يبين ان ما امر به النبي صلى الله عليه وسلم من الصبر على جور الائمة وترك قتالهم والخروج عليهم هو اصلح الامور للعباد في المعاش والمعاد، وان من خلف ذلك متعمداً او منخطئاً لم يحصل بفعله صلاح بل فساد. ولهذا اثنى النبي صلى الله عليه وسلم على الحسن بقوله:

ان ابني هذا سيد وسيصلح الله به بين فئتين عظيمتين من المسلمين<sup>١</sup>.

”ان تمام واقعات سے یہ بات پابہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظالم حکمرانوں کے ظلم پر صبر کرنے اور مسلح لڑائی نہ کرنے کا جو حکم دیا تھا وہی بندوں کی دنیا و آخرت کے لحاظ سے بہتر ہے، اور جس کسی نے جان بوجھ کر یا غلطی سے اس کے خلاف خروج کیا، تو اس کے فعل سے کوئی اصلاح نہیں ہوئی، بلکہ نقصان ہوا، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی تعریف فرمائی کہ: ”میرا یہ بیٹا سردار ہے اور اللہ تعالیٰ اُس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔“

آگے لکھتے ہیں:

وان كان الفاعلون لذلك يرون ان مقصودهم الامر بالمعروف والنهي عن المنكر، كالذين خرجوا بالحررة وبدير الجماجم على يزيد والحجاج وغيرهما، لكن اذا لم يزل المنكر الا بما هو انكر منه، صار ازالته على هذا الوجه منكراً، واذا لم يحصل المعروف الا بمنكر مفسدته اعظم من مصلحة ذلك المعروف، كان تحصيل ذلك المعروف على هذا الوجه منكراً. وبهذا الوجه صارت الخوارج يستجليون السيف على اهل القبلة، حتى قاتلت عليا وغيره من المسلمين.<sup>٢</sup>

”اگرچہ مسلح بغاوت کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کا مقصد نیکی کا حکم دینا اور برائی سے

١- تقی الدین ابن تیمیہؒ، منهاج السنة النبویة فی نقض الکلام الشیعة والقدریة، فصل قال الرافضی

وتمادی بعضهم فی التعصب الخ، جلد ٢، صفحہ ٢٢٢۔

٢- ایضاً، صفحہ ٢٢٢۔

— امر بالمعروف ونہی عن المنکر — مفہوم، حدود اور شرائط —

روکنا ہے، مثلاً جن لوگوں نے حرۃ اور دیر الجماعہ میں یزید اور حجاج وغیرہ کے خلاف خروج کیا، اُن کا مقصد یہی تھا، لیکن اگر کسی برائی کا ازالہ کسی ایسی چیز کے بغیر نہ ہو جو اُس سے زیادہ بری ہے تو پھر اس طرح کا ازالہ کرنا بہ ذات خود برا ہو جاتا ہے اور اگر کوئی اچھائی کسی ایسی برائی کے بغیر حاصل نہ ہو سکے جس کے نقصانات اس اچھائی کے ازالے سے زیادہ ہوں تو اس اچھائی کو اس طریقے سے اختیار کرنا بھی برائی بن جاتا ہے، خوارج نے اسی طرح اہل قبلہ کے خلاف تلوار اٹھانے کو حلال سمجھا، یہاں تک کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے مسلمانوں سے مسلح لڑائی لڑی۔

ان ہی اصولوں اور مصلحتوں کے پیش نظر سلف صالحین نے بدتر سے بدتر حکمرانوں کے مقابلے پر مسلح بغاوت سے اجتناب کیا ہے، چنانچہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے زمانے میں معتزلہ حکومت پر مسلط ہو گئے تھے اور اپنے عقیدے سے اتفاق نہ کرنے والوں کو وہ بدترین ظلم و ستم کا نشانہ بناتے تھے، خود حضرت امام احمد بن حنبل کو اٹھائیس مہینے قید خانے میں رکھا گیا اور لرزہ خیز کوڑے لگائے گئے جس سے ان کا تمام جسم لہولہان ہو گیا اور بعد قید وہ مدتوں بیمار ہے، اس وقت چوں کہ باطل افکار و نظریات کو رواج دینے کے لیے حکومتی سرپرستی میں ظلم و ستم کا بازار گرم تھا، اس لیے بغداد کے بہت سے علما امام احمد بن حنبل کے پاس آئے اور عرض کی کہ معاملہ اب حد سے تجاوز کر چکا ہے، لہذا اب حکومت کے خلاف بغاوت کرنی چاہیے، خود امام احمد بن حنبل حکومت وقت کے عقائد کو کھلی گمراہی تصور کرتے تھے بلکہ کفر کے قریب سمجھتے تھے، اور ایسے عقائد کے حامل امیر کی اقتدا میں پڑھی ہوئی نمازوں کو لوٹایا کرتے تھے، لیکن آپ نے اس قسم کی ہر تجویز کو بر ملا رد فرما دیا اور خانہ جنگی کو گوارا نہیں کیا، اور فرمایا:

علیکم بالنکرة بقلوبکم، ولا تخلعوا یدایا من طاعة، ولا تشقوا عصا المسلمین۔  
 ”آپ کو چاہیے کہ آپ کے دلوں میں جو بات ہے اُسے برا سمجھیں، حکومت کو تسلیم کرنے سے ہاتھ نہ کھینچیں اور مسلمانوں میں تفرقہ نہ ڈالیں۔“

کفر بواح کی صورت میں بھی مسلمانوں کی حفاظت کا یقین: خروج کی لازمی شرط:  
 علما نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ کفر بواح [صریح کفر] کی جن صورتوں میں مسلح کارروائی کی اجازت ہے اس میں بھی یہ شرط ہے کہ اس بغاوت کے نتیجے میں مسلمان بدتر صورت حال سے دوچار نہ ہوں۔  
 کفر بواح کے نتیجے میں امیر یا خلیفہ کے خلاف خروج کے حوالے سے ایک حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے: سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے حسب ذیل امور پر بیعت لی:

۱- ابی یعلیٰ محمد بن الحسین، الاحکام السلطانیة، بیروت: دار الکتب العلمیة، ۱۴۲۱ھ، فصول فی الإمامة، صفحہ ۲۱۔

\_\_\_\_\_ امر بالمعروف ونہی عن المنکر \_\_\_\_\_ مفہوم، حدود اور شرائط \_\_\_\_\_

بايعنا على السمع والطاعة في منشطنا ومكرهنا وعسرنا ويسرنا وأثرة علينا وأن لا ننازع الأمر أهله، قال: الا ان تروا كفراً بواحا عندكم من الله فيه برهان<sup>١</sup>۔  
 ”ہم نے بیعت کی اس بات پر کہ ہم امیر کا حکم مانیں گے، اس کی اطاعت کریں گے خواہ اس میں ہماری خوشی ہو یا ناخوشی، اس میں ہمیں تنگی ہو یا آسانی، اور اس میں ہم پر دباؤ ڈالا جائے۔ اور یہ کہ ہم اہل حکومت سے جھگڑانہ کریں گے مگر اس وقت کہ تم دیکھو کھلا ہوا کفر۔ اور اس میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت و دلیل ہو۔“

درج ذیل حدیث میں اہل سنت و جماعت کے نزدیک ”کفر بواح“ سے مراد آیا ”صریح کفر“، ”کفر حقیقی“ یا ”کفر اصطلاحی“ مراد ہے یا کھلی ہوئی معصیت امام نوویؒ اس حدیث کی وضاحت میں لکھتے ہیں:  
 والمراد بالكفر هنا المعاصي ومعنى عندكم من الله فيه برهان أي تعلمونه من دين الله تعالى<sup>٢</sup>۔

”اس حدیث میں کفر سے مراد معاصی [گناہ] ہیں اور عندکم من اللہ فیہ برہان کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین [کے اصول و قواعد] سے تمہیں اس کا اہل معصیت میں ہونا معلوم ہو جائے۔“

علماء کے اس استدلال کی بنیاد وہ احادیث و روایت ہیں جن میں معصیت اور گناہ پر لفظ کفر کا اطلاق کیا گیا ہے اور ایک حدیث سے خود ہی زیر بحث حدیث کی مراد متعین ہو جاتی ہے:

وروق عند الطبراني من رواية أحمد بن صالح عن ابن وهب في هذا الحديث كفراً صراحاً بصاد مهملة مضمومة ثم راء، ووقع في رواية حبان أبي النضر المذكورة: الا أن يكون معصية لله بواحا<sup>٣</sup>۔  
 ”اور طبرانی کے نزدیک اس حدیث میں احمد بن صالح عن ابن وهب کی روایت میں کفر صراح کے الفاظ آتے ہیں اور حبان ابی النضر کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں: ”مگر یہ کہ اللہ کی کھلی نافرمانی کی جائے۔“

اگر حدیث عبادہ سے مراد کفر صریح لیا جائے تو یہ بات اصول اور شرائط خلافت ہی کہ منافی ہے اور خلیفہ یا امام کے کافر ہو جانے کے بعد اس کے خلاف خروج کا جواز ہی عبث ہے۔ اسلام خلیفہ کی انعقاد

١- محی الدین النووی، شرح النووی علی مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوہ طاعة الأمراء فی غیر معصیة و تحريمها فی المعصیة، جلد ٢، صفحہ ١٢٥۔

٢- ایضاً۔

٣- احمد بن حجر العسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، بیروت: دار المعرفۃ، ٩، ١٣٤٤ء، کتاب الفتن، باب قول النبی سترون بعدي أموراً تنكرونها، جلد ١٣، صفحہ ٨۔



\_\_\_\_\_ امر بالمعروف ونہی عن المنکر \_\_\_\_\_ مفہوم، حدود اور شرائط \_\_\_\_\_

خلافت کی شرط اول ہے اور کفر اختیار کر لینے کے بعد وہ خلیفہ رہا ہی نہیں۔ اس لیے اس امیر سے منازعت یا اس کے خلاف جواز و عدم جواز کی بحث اس کے مسلمان ہونے کی صورت میں ہے۔ علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

قال القاضي عياض: أجمع العلماء على أن الإمامة لا تنعقد للكافر، وعلى أنه لو طرأ عليه الكفر انعزل، قال: وكذا لو ترك إقامة الصلوات والدعاء اليها، قال: وكذلك عن جمهورهم البدعة..... قال القاضي: فلو طرأ عليه كفر وتغيير للشرع أو بدعة خرج عن حكم الولاية، وسقطت طاعته، ووجب على المسلمين القيام عليه، وخلعه ونصب امام عادل ان امكنهم ذلك، فان لم يقع ذلك الا لطائفة وحب عليهم القيام بخلع الكافر، ولا يجب في المبتدع الا اذا ظنوا القدرة عليه، فان تحققوا العجز لم يجب القيام، وليها جر المسلم من أرضه الى غيرها، ويفر بدينه.

”قاضی عیاض“ فرماتے ہیں کہ علما کا اس پر اجماع ہے کہ کافر کی امامت منعقد ہی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر امامت کے بعد اس پر کفر طاری ہو جائے تو وہ از خود معزول ہو جاتا ہے اور ایسے ہی جب کہ وہ اقامتہ صلوٰۃ چھوڑ دے، اس کی طرف بلانا ہی ترک کر دے۔ اور فرمایا ایسے ہی جمہور علما کے نزدیک بدعت کا یہی حکم ہے [کہ اسے راجح کرنے لگے]..... قاضی عیاض نے فرمایا اگر امام پر کفر طاری ہو جائے تو امام از خود ولایت مسلمین سے خارج ہو جائے گا [اور والی باقی نہ رہے گا]، اور اس کی اطاعت ساقط ہو جائے گی، اور مسلمانوں پر اس کے خلاف کھڑا ہونا اور دوسرا امام عادل مقرر کرنا واجب ہو جائے گا۔ بہ شرط یہ کہ ان میں قدرت ہو۔ اور اگر یہ بات کسی چھوٹی جماعت ہی سے بن پڑے تو اس پر ہی یہ واجب ہوگا کہ اس کام کو علیحدہ کریں۔ ہاں مبتدع امام کی علیحدگی اس وقت تک واجب نہ گی جب تک انھیں اپنی قدرت کا ظن غالب نہ ہو جائے۔ اگر عجز محسوس ہو تو پھر یہ واجب نہیں ہوگا، مگر اس صورت میں چاہیے کہ مسلمان اس سرزمین سے ہجرت کر جائیں اور اپنے دین کو [بہ حفاظت] لے کر بھاگ نکلیں۔“

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر: فرد اور ریاست کی علیحدہ علیحدہ ذمے داری:

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ، بلاشبہ معروف کا قیام اور منکر کی نہی فرد اور ریاست دونوں کے ذمے داری ہے، لیکن دونوں کے طریق اجرا اور دائرہ عمل میں فرق ہے۔ قاضی، ادارے، حکومت اور ریاست کا کام عام آدمی نہیں کر سکتا۔ زنا پر رجم کرنا اور چور کا ہاتھ کاٹنا عوام کا کام نہیں بلکہ اگر کسی نے زنا یا

۱- محی الدین النوویؒ، شرح النووی علی مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوه طاعة الامراء في غير معصية وتحريمها في المعصية، جلد ۲، صفحہ ۱۲۵۔

\_\_\_\_\_ امر بالمعروف ونہی عن المنکر \_\_\_\_\_ مفہوم، حدود اور شرائط \_\_\_\_\_

چوری کا ارتکاب کیا تو اس پر حد یا تعزیر حکومت یا امام کی ذمے داری ہے، ابو بکر الجصاص لکھتے ہیں:

وقد علم من قرع سمعه هذا الخطاب من أهل العلم أن المخاطبين بذلك هم الأئمة دون عامة الناس فكان تقديره فليقطع الأئمة والحكام ايديهما وليجلدهما الأئمة والحكام ولما ثبت باتفاق الجميع أن المأمورين بإقامة هذه الحدود على الأحرار هم الأئمة<sup>١</sup>

”اہل علم میں سے جو شخص بھی یہ حکم سنتا ہے وہ جان لیتا ہے کہ اس حکم کے مخاطبین عوام الناس نہیں بلکہ حکمران ہیں۔ اور اس کا طریقہ کار یہ مقرر کیا گیا ہے کہ ائمہ اور حکام چوری کا ارتکاب کرنے والوں کے ہاتھ کاٹ دیں اور حکمران و حکام زنا کرنے والوں کو کوڑے لگائیں۔ اہل علم کے مجموعی اتفاق سے یہ بات ثابت ہے کہ آزاد لوگوں پر نفاذ حدود کے لیے حکمرانوں ہی کو مامور کیا گیا ہے۔“

ابن شہاب زہریؒ سے دریافت کیا گیا کہ اگر آدمی کو اپنے بھائی کے قاتل پر قدرت حاصل ہو جائے اور اسے یہ خوف ہو کہ مجرم حکمران تک پہنچنے سے قبل ہی اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا تو کیا اسے خود قتل کر دینے سے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں گناہ گار گنا جائے گا؟ ابن شہابؒ نے جواب میں فرمایا:

مضت السنة أن لا يغتصب في قتل النفوس دون الإمام<sup>٢</sup>

”یہ سنت جاری ہے کہ حکمران کے علاوہ کوئی شخص از خود کسی دوسرے کی جان لینے کا اقدام نہ کرے۔“

قدرت و استطاعت انسداد منکر کی شرط لازم:

اگر کوئی شخص کسی معصیت یا منکر کے ارتکاب کے وقت موجود ہو تو بہر حال شریعت کی رو سے بہ شرط قدرت و بہ لحاظ استطاعت اس پر واجب ہوگا کہ ہاتھ یا زبان سے اس کا ازالہ کر دے۔ لیکن اگر قدرت کے باوجود اس منکر کے ازالے سے کسی بڑے منکر یا فتنے کا اندیشہ ہے تو علماء اس کو جائز نہیں قرار دیتے، حافظ ابن قیم رحمہ اللہ [م ۵۱۷ھ] لکھتے ہیں:

انكار المنكر أربع درجات؛ الأولى: أن يزول ويخلفه ضده، الثانية: أن يقل وان

لم يزل بجملته، الثالثة: أن يخلفه ما هو مثله، الرابعة: أن يخلفه ما هو شر منه؛

فالدرجتان الأولتان مشروعتان، والثالثة موضع اجتهاد، والرابعة محرمة<sup>٣</sup>

۱- ابو بکر جصاص، احکام القرآن، سورة النور [۲۲: ۱۳]، فیمن یقیم الحد علی المملوک، جلد ۵، صفحہ ۱۳۱۔

۲- الحسین بن علی البیهقی، السنن الکبریٰ، کتاب الجراح، باب الولی لا یتبد بالقصاص دون الإمام، جلد ۸، صفحہ ۱۰۷۔

۳- ابن قیم الجوزی، اعلام الموقعین عن رب العالمین، فصل فی تغیر الفتوی الخ، انکار المنکر أربع درجات، جلد ۲، صفحہ ۳۳۹۔

\_\_\_\_\_ امر بالمعروف ونہی عن المنکر \_\_\_\_\_ مفہوم، حدود اور شرائط \_\_\_\_\_

”منکر کے انکار کے چار درجے ہیں: [۱] منکر ختم ہو جائے اور اس کی جگہ معروف قائم ہو جائے۔ [۲] منکر کم ہو جائے اگرچہ کلیۃً زائل نہ ہو۔ [۳] ایک منکر ختم ہو کر اس کی جگہ ویسا ہی منکر اور آجائے۔ [۴] اس منکر کے خاتمے کے بعد اس سے بدتر منکر آجائے۔ پس ابتدائی دو درجے مشروع ہیں، تیسرا درجہ اجتہاد کا میدان ہے اور چوتھا درجہ حرام ہے۔“

یہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مفہوم، تعین اور اس کا طریق نفاذ۔ جو کتاب و سنت اور اجماع امت پر مبنی ہے۔ مگر ڈاکٹر منظور احمد اس پورے نظام کو رد کر کے اسے محض دعوتِ اخلاق تک محدود فرمادیتے ہیں اور اپنے اس عامیانہ، غیر علمی اور سطحی موقف ہی کو اصل قرار دیتے ہوئے علما پر پھبتی کتے ہیں کہ معروف کا حکم اور منکر سے انکار کی تفسیر ”آج کل“ یہ ہو گئی ہے کہ معروف کو بہ زور نافذ کریں اور منکر کو بہ زور ختم کریں۔ کاش ڈاکٹر صاحب ”آج کل“ سے پہلے کے یعنی متقدمین ہی کی کتابوں کا مطالعہ فرمالتے تو اس صورتِ حال کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

## مابعد الطبیعیات — وجودیات، کونیات اور اخلاقیات کی اساسی شناخت

ڈاکٹر منظور احمد اپنے مقالے ”قرآن کے فلسفیانہ پہلو“ میں لکھتے ہیں:

”اسلام بھی دوسرے ادیان کی طرح خدا، روح اور آخرت جیسے مابعد الطبیعیاتی تصورات کی بات کرتا ہے اور بہر حال ان تصورات کے فلسفیانہ پہلو بھی ہیں اور شاید مابعد الطبیعیاتی بھی“۔<sup>۱</sup>  
یقین نہیں آتا کہ یہ عبارات ڈاکٹر منظور احمد کے قلم سے نکلی ہیں۔ یہ خیال بھی گزرتا ہے کہ مذہبی مابعد الطبیعیات کو فلسفیانہ یا سائنسی مابعد الطبیعیات کے مقابلے میں فروتر گردانتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے شاید یہ جملے طنز آ یا استہزا تحریر فرمائے ہیں۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ڈاکٹر صاحب ”مابعد الطبیعیات“ [metaphysics] جیسی معروف فلسفیانہ اصطلاح، جو کسی مذہب یا تہذیب کی شناخت [identity] ہے، کے درست فہم سے غیر آشنا اور ناواقف ہوں۔ مابعد الطبیعیات اپنی لغوی اور اصطلاحی جہات کے لحاظ سے کثیر معانی اور مفاہیم کا حامل ہے۔ ارسطو نے مابعد الطبیعیات کے لفظ کو وجودیات [Ontology] کے معنی میں استعمال کیا ہے:

Metaphysics was ontology, the study of being as being, a science that attempted to set down the common characters of everything that existed.<sup>۲</sup>

افلاطون اور ارسطو کے ادوار میں مابعد الطبیعیات کا لفظ وجودیات کے معنی میں استعمال ہوتا رہا لیکن بعد میں یہ اصطلاح حقیقت کے فہم کی ہر کوشش کے لیے استعمال ہونے لگی، گویا سائنس، فلسفہ اور مذہب تینوں ہی کے آغاز سفر کا ابتدائی نکتہ بلکہ ہر لفظ، زبان، سائنس، عقیدہ، نظام زندگی، معاشرت اور ثقافت سب کی ابتدا مابعد الطبیعی اساس ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ میں deontological ہوں یعنی میں کسی مابعد الطبیعی بنیاد کو نہیں مانتا تو یہ خود ایک مابعد الطبیعی دعویٰ [metaphysical claim]

۱- سہ ماہی ”تہذیب و روایت“، لاہور: مکتبہ روایت، جنوری ۱۹۹۰ء، صفحہ ۶۱۸۔

2- William Darrach Halsey & Emanuel Friedman, Collier's Encyclopedia, London: Macmillan Educational Corp., 1981, Vol. 16, p. 31.

ہے۔ جس کی ایک الگ مستقل بنیاد ہے۔ یہ ما بعد الطبیعیات ہی ہے جس کی بنیاد پر حقیقتوں کی ترتیب [Cosmological Order] وضع ہوتی ہے۔ معلومہ تاریخ کی کوئی تہذیب، سائنس، مذہب و معاشرہ، فلسفہ اور عقیدہ ما بعد الطبیعیات سے آزاد، عاری اور مبرا نہیں۔<sup>۱</sup> ما بعد الطبیعیات اور وجودیات کی معطلی [Suspension of Metaphysics or Ontology] کا دعویٰ ایک نئی ما بعد الطبیعیات کا ظہور ہوتا ہے۔ deontological اُس منہاج میں دوبارہ Ontological ہو جاتے ہیں۔ مغربی فلسفے نے تمام ما بعد الطبیعی تصورات کو رد کر کے ایک نئی ما بعد الطبیعیات ”مذہب سرمایہ داری“ بذریعہ فلسفہ مذہب بنیادی حقوق [Religious Philosophy of Human Rights] وضع کر کے مارکیٹ شناخت کو واحد شناخت بنا دیا ہے۔ بالفاظ دیگر ہر شخص کی شناخت اور حیثیت اب مارکیٹ میں متعین ہوتی ہے۔<sup>۲</sup>

۱- ما بعد الطبیعیات کی اصطلاح کی مختصر وضاحت کے بعد اس سلسلے کی منتخب کتابوں کی ایک فہرست دی جا رہی ہے، صاحبان ذوق استفادہ کر سکتے ہیں:

- [1] Brian Garrett, *What is this Thing Called Metaphysics?*, New York: Routledge, 2011.
- [2] Helen Beebe, Nikk Effingham & Philip Goff, *Metaphysics: The Key Concepts*, New York: Routledge, 2010.
- [3] Richard M. Gale, *The Blackwell Guide to Metaphysics*. Oxford: Blackwell, 2000.
- [4] E. J. Lowe, *A Survey of Metaphysics*. Oxford: Oxford University Press, 2000.
- [5] M. J. Loux, *Metaphysics: A contemporary Introduction*. [3rd ed.] London: Routledge, 2006.
- [6] J. Kim and Ernest Sosa Ed. *Metaphysics: An Analogy*. Blackwell Philosophy Anthologies, 1999.
- [7] Jaegwon Kim, Ernest Sosa, and Gary S. Rosenkrantz [eds.], *A Companion to Metaphysics*, UK: Blackwell Publishing Ltd, 2009.
- [8] E.E. Harris, *The Foundation of Metaphysics in Science*. London: George Allen and Unwin, 1965.
- [9] E.E. Harris, *The Restitution of Metaphysics*. New York: Humanity Books, 2000.

اردو میں ”ما بعد الطبیعیات“ پر مختصر اور جامع مطالعے کے لیے ملاحظہ کیجیے:  
ڈاکٹر فریحہ نگہت، ”ما بعد الطبیعیات کے بنیادی مباحث“، مشمولہ مجلہ دریافت، اسلام آباد: نمل یونیورسٹی، شمارہ نمبر ۱۲، صفحات ۲۲۶-۲۳۱۔

- 2- Julie Owen, "Human Rights as Civil Religion : the Glue for Global Governance?", in *Criticizing Global Governance*, [ed., Markus Lederer], 2005, New York: Palgrave Macmillan, pp. 221-241.

\_\_\_\_\_ مابعد الطبیعیات — وجودیات، کونیات اور اخلاقیات کی اساسی شناخت \_\_\_\_\_

جناب منظور احمد صاحب نے مذکور بالا اقتباس میں لفظ ”شاید“ استعمال کر کے فلسفے کی پچیس سو سالہ تاریخ میں مابعد الطبیعیات [Metaphysics]، علمیات [Epistemology] اور قدریات [Axiology] سے متعلق زیر بحث آنے والے تین بنیادی سوالات:

[۱] حقیقت کیا ہے؟

[۲] حقیقت تک رسائی کیسے ممکن ہے؟

[۳] کیا اچھا ہے اور کیا برا؟

جو حقیقت کُلّی، حقیقتِ ازلی، حقیقتِ ابدی، حقیقت الحقائق، حقیقتِ مطلقہ، علتِ اولیٰ یا علتِ العلل [absolute reality] کے تصور، اُس کے حصول کے ذرائع اور اُس کے نتیجے میں خیر و شر کے معیارات اور تعینات سے متعلق بحث کرتے تھے، پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔

## غزالی اور ڈیکارٹ کے فلسفیانہ افکار میں تشکیک بہ طور منہاج: ایک ادعا

ڈاکٹر منظور احمد صاحب ڈیکارٹ [Descartes] کے [Methodic doubt] کو حضرت امام غزالی رحمہ اللہ کے طریق تشکیک کے مماثل قرار دیتے ہوئے یہ تاثر فراہم کرتے ہیں کہ گویا اس طریق میں غزالی ڈیکارٹ کے پیش رو ہیں، وہ لکھتے ہیں:

”Rene Descartes نے اُس طریق علم سے بحث کی ہے جو انسانی علم کو ریاضیاتی یقین تک پہنچا سکے۔ اس کو طریق تشکیک کہتے ہیں، یعنی انسان جن باتوں کی صداقت پر یقین رکھتا ہے سب غلط ہو سکتی ہیں۔ مثلاً اس دنیا میں جن اشیا کو وہ دیکھتا ہے کہ وہ موجود ہیں، انسانی نظر کا دھوکا ہو سکتا ہے، لیکن جس چیز پر شک نہیں کیا جاسکتا وہ خود انسان کے شک کرنے کا عمل ہے۔ شک کرنے کا یہ عمل ایک فکری عمل ہے اور اس فکری عمل کا خالق یعنی انسانی ذہن بھی موجود ہونا چاہیے۔ اس سے ڈیکارٹ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ جو شے علم میں یقینی ہے، وہ فکر کا فاعل، یعنی خود انسانی ذہن، ہے۔ اس طرح ڈیکارٹ کو علم یقینی کا وہ سنگ بنیاد مل جاتا ہے جس پر وہ علم کی عمارت تعمیر کرتا ہے..... امام غزالی نے بھی اس طریق تشکیک کو ڈیکارٹ سے بہت پہلے اپنایا۔“<sup>۱</sup>

یہ چلتا ہوا خیال ہے جسے بعض مصنفین نے دہرایا ہے۔<sup>۲</sup> ایک عامیانہ اور سطحی نقطہ نظر سے

۱- منظور احمد، ”حواشی“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۲۷۱۔

2- Mohammad Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 201; M.Saeed Shaikh, "Al-Ghazzali: Metaphysics" in *A History of Muslim Philosophy* [ed., M.M. Sharif], Wiesbaden, 1963, Vol. 1, pp. 587-88; Sami M. Najm, "The Place and Function of Doubt in the Philosophies of Descartes and al-Ghazali", *Philosophy East and West*, Vol. 16, No. 3/4 (Jul. - Oct., 1966), pp. 133-141; W. Montgomery Watt, *The Faith and Practice of al-Ghazzali*, Chicago: Kazi Publications, 1982, p.12.

غزالی اور ڈیکارٹ کے فلسفیانہ افکار میں تشکیک بہ طور منہاج ایک اذعا

غزالی اور ڈیکارٹ کے افکار کا مطالعہ اسی نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ غزالی کی تشکیک اور ڈیکارٹ کی ارتیابیت مماثل و مشابہ ہیں۔ فی الحقیقت ان دونوں کے علمی تناظر ایک دوسرے سے یک سر مختلف ہیں۔<sup>۱</sup>

ڈیکارٹ کو اسی لیے جدیدیت [Modernism] کا بانی کہا جاتا ہے کہ اُس نے اپنے منہاج علم کی بنیاد، تشکیک پر رکھی ہے اور فلسفے کی تاریخ میں موجود منہاج علم کی ترتیب کو تبدیل کر دیا۔ ڈیکارٹ سے پہلے فلسفہ سب سے پہلے مابعد الطبیعیاتی سوالات سے بحث کرتا تھا، پھر اُس مابعد الطبیعی حقیقت کی بنا پر علمیات [Epistemology] کا تعین ہوتا تھا اور پھر اقدار [Axiology] کا۔ مگر ڈیکارٹ نے I think therefore I am کہہ کر وجود انسانی کے سوا ہر وجود کو موجب شک اور ناقابل اعتبار گردانتے ہوئے مابعد الطبیعیاتی سوالات کو فلسفے کی اقلیم سے خارج کر دیا جس نے قدیم فلسفیانہ منہاج میں زیر بحث آنے والے سوالات کو مہمل قرار دیتے ہوئے فلسفے کی قدیم بنیادوں کی پوری عمارت منہدم کر دی۔ ڈیکارٹ نے کہا کہ سب سے پہلے علم کی بنیاد تلاش کر لینی چاہیے کہ میں کیا جان سکتا ہوں اور کیا نہیں جان سکتا، اُس کی بنیاد پر علم کی جو عمارت تعمیر ہوگی وہ ایک ایسی سچائی پر استوار ہوگی:

[۱] جو ہر انسان کے لیے قابل قبول ہو۔

[۲] جس کی صداقت کے اثبات کے لیے دوسری صداقت پر انحصار نہ کرنا پڑے۔

[۳] اگر آپ چاہیں کہ اُس پر شک کر سکیں، تو ممکن نہ ہو۔

جدیدیت کا بنیادی مقدمہ یہی ہے کہ اس میں علمیات نے مابعد الطبیعیات کو takeover کر لیا ہے۔ ڈیکارٹ کے افکار کا مطالعہ واضح کر دیتا ہے کہ اس کی تشکیک خود ماہیت علم اور نفس علم کے متعلق ہے، وہ کہتا ہے کہ:

That in order to seek truth it is necessary once in the course of our life, to doubt, as far as possible, of all things.<sup>۲</sup>

”زندگی میں ایک بار یہ لازمی ہے کہ ممکنہ حد تک ہر شے پر شک کیا جائے۔“

اس کے بالعکس حضرت امام غزالی رحمہ اللہ اپنی زندگی کے بحرانی دور میں حصول علم کے مختلف ذرائع اور منہاج کو ”شک“ کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ غزالی کی تشکیک کی نوعیت، طریقہ کار اور اس کی روح کا تجزیہ یہ واضح کر دیتا ہے کہ وہ فلسفیانہ یا لادریہ [Agnostic] نوعیت کی قطعاً نہیں تھی ان کی تشکیک کا آغاز

۱- اہل علم کے اس طبقے کی فکری غلطی کی تردید اور تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے:

Osman Bakr, "The Place of Doubt in Islamic Epistemology: Al-Ghazzali's Philosophical Experience", in *The History and Philosophy of Islamic Science*, Cambridge: Islamic Texts Society, 1999.

2- René Descartes, *The Principles of Philosophy*, [tr., John Veitch], Kessinger Publication, 2004, p. 15.



ایقان کی اس جستجو کا نتیجہ تھا جب وہ حقائق الامور یا بالفاظ دیگر حقیقت جیسی کہ وہ ہے [thing-in-itself] کی جستجو میں سرگرداں تھے۔ اسی کو غزالی "علم الیقین" کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسے مردِ حقانی اور مومن کی تشکیک ہے جس کی پاس کتاب و سنت کا متاعِ گراں بہا موجود تھا اور وہ اُس کی حقانیت کو پوری قطعیت اور صراحت کے ساتھ عالم پر ایسے آشکارا کر دینا چاہتا ہے کہ پھر کبھی تشکیک و ارتباب کے حملے اور ظلمت کی گھنگھور گھٹائیں اُس کی لمعانیت و نورانیت اور تابانی و تابناکی کو دھندلا نہ سکیں۔ بالفاظ دیگر غزالی کی تشکیک ایک متشکک کی نہیں، بلکہ ایک علم کے ناقد کی تشکیک ہے۔ امام غزالی اپنے تشکیکی سفر کا حال بیان کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

أنا فيهما على السفسطة بحكم الحال، لا بحكم النطق و المقال. حتى  
شفى الله تعالى من ذلك المرض.<sup>1</sup>

"میری یہ تشکیک ذہن کی ایک کیفیت اور قلب کے اضطراب سے تعبیر تھی۔ نطق و مقال میں اس کا اعتبار نہیں ہوا تھا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس مرض سے شفا بخشی۔"

امام غزالی کے افکار کی تحقیق و جستجو کرنے والے بڑے محققین بھی اس "تشکیک" کو محض بحرانی کیفیت اور اضطرابی حالت قرار دیتے ہیں۔ میکارتھی [McCarthy] کے نزدیک یہ تشکیک یا بحران فی الاصل ایک علمیاتی بحران [epistemological crisis] ہے۔ جب کہ اس کے برعکس غزالی کا دوسرا بحران اس کے بیان کے مطابق ضمیر کا بحران ہے اور روح سے متعلق ہے۔<sup>2</sup> Father Poggi، جس کی کتاب *Un Classico della Spiritualità Musulmana* کو میکارتھی نے نفیس ترین مطالعات میں سے ایک قرار دیا ہے، کے مطابق غزالی کی نوعمری کی یہ تشکیک غیر حقیقی اور محض ایک طریقہ کار ہے۔<sup>3</sup> اٹلی کے معروف مستشرق کے مطابق غزالی کی تشکیک ایک متشکک کی نہیں بلکہ علم کے ناقد کی تشکیک ہے۔<sup>4</sup> غزالی کو کبھی مابعد الطبعی حقائق پر تشکیک و شبہ نہیں رہا، وہ حقیقت پر بالقوة ایمان کے ہمیشہ قائل اور معترف رہے، ان کی تشکیک خود حقیقت کے بارے میں نہیں، بلکہ حق کو تسلیم کرنے اور

1- ابوحامد محمد الغزالی، المنقذ من الضلال، صفحہ ۱۳۰۔

- 2- R. Joseph McCarthy, *Freedom and Fulfilment: An Annotated Translation of al-Ghazzali's al-Munqidh min al-dalal and other Relevant Works of al-Ghazzali*, Boston, 1980, p. xxix.
- 3- Vincenzo M. Poggi, *Un classico della spiritualità musulmana: Saggio monografico sul Munqid di al-Gazali*, Roma: Gregorian Biblical BookShop, 1967, p. 171.
- 4- Giuseppe Furlani, "Dr. J. Obermann, Der philos. und religiose Subjektivismus Ghazalis" [Recensione] in *Rivista trimestrale di studi filosofici e religiosi*, Vol. III, No. 2, pp.340-53 [Perugia, 1922]; see also McCarthy, op.cit., pp. 388-90.

غزالی اور ڈیکارٹ کے فلسفیانہ افکار میں تشکیک بہ طور منہاج ایک اذعا

معلوم کرنے کے انداز سے متعلق تھی۔ امام غزالی لکھتے ہیں کہ اسلام کے تین بنیادی اور اساسی عقائد پر وہ ہمیشہ غیر متزلزل، حتمی اور یقینی ایمان رکھتے تھے:

وكان قد حصل معي - من العلوم التي مارستها، والمسالك التي سلكتها، في التفتيش عن صنفى العلوم الشرعية، والعقلية — إيمان يقينى بالله تعالى، وبالنبوة، وباليوم الآخر. فهذه الاصول الثلاثة من الايمان كانت قدر سخت فى نفسى، لا بدليل معين محرر، بل بأسباب، وقرائن، وتجاريب لا تدخل تحت الحصر تفاصيلها.

”علوم شریعہ اور علوم عقلیہ کی تحقیق، تفتیش کے سلسلے میں جن علوم میں مجھ کو مشق اور مزوالت تھی اور دین و فکر کے جن راستوں پر چل چکا تھا اس سے مجھے تین امور یقینی طور پر حاصل ہو چکے تھے: [۱] اللہ تعالیٰ پر محکم ایمان، [۲] نبوت کے ذریعے تنزیل وحی، [۳] اور روزِ آخرت پر یقینی ایمان — ایمان کے یہ تین اصول کسی معین دلیل سے نہیں، بلکہ مختلف اسباب قرآن اور تجربات کے باعث میرے نفس کی گہرائی میں جاگزیں ہو چکے تھے، جو تفصیل کے متحمل نہیں۔“

غزالی بتاتے ہیں کہ اپنی زندگی کے بحرانی سفر میں بھی وہ اپنے اعمال و افعال کے اعتبار سے معمول اور ترتیب کے مطابق ہی رہے اور تشکیک میں مبتلا ہو کر بھی توحید، وحی اور آخرت پر ایمان و ایقان سے دست بردار نہیں ہوئے۔ کیا تحقیق و جستجو اور تلاش حقیقت کے اس عمل کو مغربی فلسفے کی ارتیابیت یا ڈیکارٹ کی تشکیک سے دور کا بھی واسطہ ہے؟

۱- ابو حامد محمد الغزالی، المنقذ من الضلال، صفحہ ۱۷۴۔

۲- میکا تھی نے اس کا انگریزی مفہوم اس طرح پیش کیا ہے:

From the sciences which I had practiced and the methods which I had followed in my inquiry into the two kinds of knowledge, revealed and rational, I had already aquared a sure and certain faith in God Most High, in the prophetic mediation of revelation, and in the Last Day. These three fundamentals of our Faith had become deeply rooted in my soul, not because of any specific, precisely formulated proofs, but becuase of reasons and circumstance and experiences too many to list in detail.

R. Joseph McCarthy, *Freedom and Fulfilment*, pp.90-91.

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۴۲۰

## نیاز فتح پوری

بر عظیم کی علمی اور ادبی تاریخ میں سنسنی خیزی اور سرتے کے علمبردار

ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے اپنے مقالے ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“ میں نیاز فتح پوری [۱۸۸۴ء-۱۹۶۶ء] کے افکار و خیالات کی تائید و تحسین اور ان کی جرأت و ہمت کو سلامی پیش کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا ہے:

”ان کو بیسویں صدی میں اسلام کے روشن خیال مفکروں کی صفِ اول میں شمار کیا جانا چاہیے۔“

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے اس مطالبے پر ایک انصاف پسند قاری حیرت و استعجاب میں ڈوب جاتا ہے۔ جدیدیت کی تاریخ میں آج تک نیاز فتح پوری کو کبھی بہ طور ”اسلامی مفکر“ پیش نہیں کیا گیا۔ پروفیسر عزیز احمد نے ”برصغیر میں اسلامی جدیدیت“ کے موضوع پر ایک کتاب *Islamic Modernism in India & Pakistan: [1857-1964]*, [India: Oxford University Press, 1970] تحریر فرمائی ہے اس ضخیم کتاب میں نیاز فتح پوری کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں۔ اسی طرح محترمہ مریم جمیلہ نے بھی اسلام اور جدیدیت کے عنوان سے ایک معرکہ آرا کتاب بہ عنوان *Islam and Modernism* تحریر فرمائی ہے، نیاز صاحب اس کتاب میں بھی بہ طور جدیدیت پسند اسلامی مفکر جگہ نہیں پاسکے۔

اس میں شک نہیں کہ نیاز فتح پوری اردو ادب کے ایک مشہور ادیب و مصنف، افسانہ نگار اور صاحب طرز انشا پرداز و نقاد تھے۔ لیکن جہاں تک دینی و مذہبی معاملات میں مداخلت اور خامہ فرسائی کا

۱- منظور احمد، نیاز، روشن خیالی اجتہاد اور اسلام، صفحہ ۶۴۔

۲- نیاز فتح پوری کے یہاں شعرِ نبی کے معاملہ میں بڑی شتر گریگی اور بلندی کے ساتھ پستی بھی پائی جاتی ہے۔ بعض اوقات وہ شعر کی کم زوری پر صحیح گرفت بھی کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ایسے بچگانہ اعتراضات بھی کر جاتے ہیں، جن سے ان کے شاعرانہ ذوق کے بارے میں بُری رائے قائم ہوتی ہے۔

الہلال جب نکلنا شروع ہوا ہے تو مولانا ابوالکلام آزاد عربی آمیز اردو لکھتے تھے۔ نیاز فتح پوری اس اسلوب سے متاثر ہوئے۔ یہ تاثر ان کی تحریروں میں ملتا ہے، لکھتے ہیں:

تعلق ہے، ان کی علمی سطح ہرگز ایسی نہ تھی کہ وہ دین و مذہب کی اساسی و قانونی حیثیت پر کلام کریں۔ وہ مذہب اور مغرب دونوں سے کلی طور پر ناواقف تھے۔ وہ محض ایک صحافی تھے جو لکھتا زیادہ ہے پڑھتا کم ہے۔ وہ مکمل طور پر ایک مادہ پرست اور عقلیت زدہ انسان تھے، ماورائے مادہ و طبیعیات ان کی نگاہ میں کوئی چیز ہی نہ تھی۔

☆ = ”دنیا کے شاعری مشکل سے ایسے ایجاز سدید، بیان جزیل اور عبارات ایتق کی مثال پیش کر سکتی ہے۔  
☆ میرے کوائف سے استبعاد حقیقی ہے۔  
☆ ”جسارت مستمرہ اور سلاست مقالی عود کر آئی۔“

افسانہ نگاری میں انھوں نے سجاد حیدر یلدرم کے طرز نگارش کا اثر شروع شروع میں قبول کیا، جن کے یہاں ”احساسات اور انجذابات“ جیسے بوجھل الفاظ اور روزنی ترکیبیں ملتی ہیں۔ اس کے بعد نیاز صاحب کا اسلوب تحریر سہل اور سلیس ہوتا گیا۔ وہ کوئی شک نہیں انشا پرداز ہیں مگر سرسید، شبلی نعمانی، حالی، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریا بادی اور آغا حیدر حسن کی طرح ”صاحب طرز“ انشا پرداز نہیں ہیں۔ نیاز تحریر و انشا میں قاضی عبدالغفار کے درجے کے ادیب اور صاحب قلم ہیں۔ نیاز صاحب کے یہاں ایسے مہمل جملے بھی ملتے ہیں۔ ”وہ آنکھیں جن کی گہرائی میں سمندر کا عمق ڈوب جاتا تھا“۔ مگر قاضی عبدالغفار کی تحریریں اس قسم کے اہمال سے پاک ہیں۔ [ماہر القادری، یاد رفتگان، لاہور: البدر پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء، صفحات ۴۲۷-۴۲۸]۔

1- نیاز صاحب کے نام کے ساتھ بعض لوگ ”علامہ“ لکھتے ہیں۔ یہ غلط قسم کی مرعوبیت ہے۔ علامہ کے لیے جس جامع قابلیت اور علم و فضل کے لوازم ضروری ہیں۔ ان سے نیاز صاحب بڑی حد تک کورے تھے۔ ان کو ”مولانا“ بھی نہیں کہنا چاہیے کہ ”مولانا“ کے لیے لازمی شرط ہے ”دین و مذہب“ کا رنگ اور روش اختیار کرنا۔ مگر نیاز صاحب نے اس کے برعکس اپنی زندگی کا خاصہ حصہ دین و مذہب کی تنقیص و تکذیب میں گزارا اور اس روش و رنگ کا مذاق اڑایا۔

نیاز صاحب اس کا سلیقہ رکھتے تھے کہ کسی فن پر کوئی کتاب یا مقالہ پڑھا اور اس کا خلاصہ اردو میں منتقل کر دیا۔ نگار کے ”باب المرسلات“ میں نہ جانے کتنے سوالات انھوں نے مرتب کیے اور خود ہی جواب دیے۔ مثلاً سامنے کی اور روزمرہ کے برتنے کی چیز ”دیاسلانی“ ہے۔ مگر اس کی تاریخ کون جانتا ہے، ہاں! انسائیکلو پیڈیا یا اس قسم کی دوسری کتابوں اور قاموسوں میں ”دیاسلانی“ کی تاریخ مل سکتی ہے، اب کوئی شخص انسائیکلو پیڈیا میں دیاسلانی کی تاریخ پڑھ کر اپنے رسالہ میں دیاسلانی پر کسی فرضی نام سے استفسار کرے اور جواب میں انسائیکلو پیڈیا کی عبارت کا ترجمہ حوالہ کے بغیر درج کر دے تو ایسے ناقل اور مترجم کو محقق ہرگز نہیں کہہ سکتے! ہاں جن لوگوں کا مطالعہ محدود ہے یا مضمون نگاری کی قابلیت و استعداد سے واقف نہیں ہیں وہ ضرور مرعوب ہو جائیں گے۔ یہی حال نیاز فتح پوری کی ”باب المرسلات“ والی تحریروں کا ہے! جن کو پڑھ کر لوگ انھیں علامہ اور محقق سمجھنے لگے ہیں۔

ایک تو وہ شخص ہوتا ہے جو کسی فن میں عبور یا درک رکھتا ہے اور ایک شخص وہ ہے جس نے کسی فن پر کوئی مضمون یا کتاب پڑھی اور جو باتیں اس کی سمجھ میں آئیں انہیں اپنی زبان میں منتقل کر دیا، نیاز صاحب کا شمار بھی اسی دوسری صف کے لوگوں میں ہوتا ہے، مثلاً فن عروض پر وہ بہت کچھ لکھتے رہے ہیں مگر اس کی زیادہ تر نوعیت عروض کی کتابوں سے اخذ و نقل کی ہے۔ اگر وہ عروض جانتے ہوتے تو رباعیوں کے ایک ایسے مجموعے کی دیباچے میں تعریف نہ کرتے جس کی ڈیڑھ سو رباعیوں میں کم از کم ۴۸ رباعیاں ساقط الوزن ہیں۔

نظام رام پوری کا تذکرہ لکھا تو ان کے بارے میں ایک آدھ مضمون یا کتاب کو پڑھا۔ حالات کی تحقیق نہیں کی، اس ناقص مطالعہ اور سرسری معلومات کا یہ نتیجہ نکلا کہ اول تو شاعر کا نام غلط لکھا پھر ان کو ”مجرد“ بتایا حالانکہ نظام رام پوری کی شادی بھی ہوئی اور اولاد بھی! ہاں! یہ ضرور ہوا کہ ان کی اولاد زندہ نہیں رہی۔ [ماہر القادری، یاد رفتگان، صفحات ۴۲۸-۴۲۹]۔

الفاظ کی بازی گری، خلطِ مبحث، تضادِ بیانی، ابلہ فریبی، مغالطہ انگیزی، جنسیت زدہ ذہنیت [جس کا اندازہ ان کی مسروقہ تالیف ”ترغیبات جنسی“ کے مطالعے سے لگایا جاسکتا ہے] اور سنسنی خیزی میں وہ یگانہ روزگار تھے: ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

[نیاز] طبعاً حد درجے رومان پسند واقع ہوئے تھے اور جیسا کہ خود انہوں نے کئی جگہ اس کا اظہار کیا ہے عورت ان کی کمزوری تھی۔ لیکن یہی کمزوری ان کی تحریر کا حسن و زور بن گئی، عورت اور اس کے حسن و جمال پر انہوں نے افسانے کی شکل میں ”نقاد“ میں مسلسل لکھا اور ایسی جادو اثری کے ساتھ کہ نوجوان طبقے کا ہر فرد عورت ہو یا مردان کی تحریروں پر ”مجھ گیا“۔<sup>۱</sup>

افکار و خیالات سے لے کر حالات و کمالات تک نیاز فتح پوری بالکل مذہبی معاملات اور دینی امور پر لکھنے کے حق دار نہ تھے، مجنوں گھور کھپوری نے نیاز کو کہا تھا:

”مذہبی مباحث کو علمائے دین اور ہادیانِ متین کے لیے چھوڑ دیا جائے اور ”نگار“ کے صفحات کو ان سے پاک رکھا جائے، لیکن نیاز کی طبیعت میں کچھ ایسا چلبلا پن بھی ہے۔ دوسرے وہ سنسنی خیز باتوں کی تجارتی قیمت کو ایک معاملہ سنج کی حیثیت سے مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے میری بات سنی ان سنی کر دی“۔<sup>۲</sup>

کاش کہ نیاز فتح پوری اپنے معاصر مجنوں گور کھپوری کا مخلصانہ مشورہ قبول فرمالتے مگر افسوس کہ اپنے ماہ نامے کی کثیر اشاعت کے لیے انہوں نے مذہبی معاملات اور دینی افکار و عقائد پر ”نگار“ کے صفحات میں کھل کر لکھا، جو ان کے لیے تو یقیناً ایک تجارتی مقصد ہوگا، لیکن اس کی وجہ سے سادہ لوح اور کم علم افراد کا ایمان، اسلام پر سے متزلزل ہوا ہوگا۔

ذیل میں نیاز فتح پوری پر درج ذیل نکات کے تحت گفتگو کی جاتی ہے:

[۱] سرفے و چرے۔

[۲] قمرزمانی بیگم — نیاز کا ایک بہروپ۔

[۳] نیاز — افکار و عقائد کی ایک جھلک۔

[۴] قرآن کلام اللہ نہیں، کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

[۵] مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی — مجاہد اسلام اور عاشق رسول۔

۱- نیاز فتح پوری، قمرزمانی بیگم: علامہ نیاز فتح پوری کی انوکھی داستانِ معاشقہ، [مرتب: ڈاکٹر فرمان فتح پوری]، کراچی: اردو اکیڈمی، ۱۹۷۹ء، صفحہ ۱۵۔

۲- سالنامہ ”نگار“ [کراچی]، نیاز نمبر حصہ اول، ۱۹۶۳ء، صفحہ ۱۰۳۔

## سرفے وچرے

نیاز فتح پوری پران کی زندگی ہی میں دوسروں کا کام اپنے نام سے چھپوا دینے کا الزام رہا ہے، جس کی انھوں نے یا ان کے احباب و معتقدین نے کبھی تردید نہیں فرمائی۔ ڈاکٹر عقیلہ شاہین کی ڈاکٹریٹ کے مقالے ”نیاز فتح پوری۔ شخصیت اور فن“ پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر سلیم منصور خالد صاحب لکھتے ہیں:

”نیاز فتح پوری کے بارے میں ان کے ذہنی مرید بڑے فخر و انبساط سے یہ کہتے ہیں کہ یہی وہ شخصیت ہے جس نے خرد افروزی اور روشن خیالی کی شمع روشن کی ہے..... ہمارا خیال ہے کہ مبالغہ آمیزی کرنے اور دوسروں کی تخلیقات کو اپنے نام سے چھپوانے والا فرد ”بڑا“ انسان نہیں ہو سکتا۔ ان کی تاریخ الدولتین“ مشہور مستشرق جرجی زیدان کی عربی کتاب ”التمدن الاسلامی“ [ج ۴] کی تلخیص ہے، نگار کا مشہور ”خدا نمبر“ [۱۹۵۶ء] اصل میں محمد اسحاق صدیقی کی تالیف ہے، مصطفیٰ کامل مصری کی کتاب ”المسئلۃ المشرقیہ“ کو مولانا مودودی نے نوعمری میں ترجمہ کیا، اشاعت کے لیے پہنچا تو انھوں نے اسے اپنے نام سے شائع کر دیا..... اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ نیاز کے جاری کردہ رسالے ”جن“ میں تحریریں مجنوں گور کھپوری کی ہوتی تھیں مگر نام چھپتا تھا نیاز کا“۔  
ڈاکٹر سفیر اختر صاحب لکھتے ہیں:

”نیاز صاحب دوسروں کا کام اپنے نام سے چھپوانے کے ملزم رہے ہیں، ۱۹۲۳ء میں نیاز صاحب کے نام سے ایک کتاب ”صحابیات“ شائع ہوئی تھی۔ دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ کے ذمے داروں نے شکایت کی ہے کہ ”صحابیات“ ان کے ادارے کی چھپی ہوئی ”سیر الصحابیات“ [تالیف سعید انصاری اعظم گڑھ: دارالمصنفین۔ ۱۳۴۱ھ] کے مضامین کا سرفہ ہے [ماہ نامہ ”معارف“ اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۳۲، نیز دیکھیے: معارف، اکتوبر ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۹۲]، مگر حالیہ تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی کہ ”صحابیات“ اصل میں نیاز

۱۔ ماہ نامہ ”ترجمان القرآن“ [لاہور]، اکتوبر ۱۹۹۷ء، صفحات ۷۸-۷۹۔

صاحب کے داماد مرحوم قمر الحسن کی تالیف تھی جسے قمر الحسن کی رحلت پر نیاز صاحب نے مقدمہ لکھ کر اپنے نام سے شائع کر لیا۔ [امیر عارفی، نیاز فتح پوری، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند اپریل ۱۹۷۷ء صفحات، ۳۲۳-۳۶۵]

دوسروں کی کاوش کو اپنے نام سے چھاپ لینے کی، نیاز صاحب کی عادت کے بارے میں ان کے ایک اور معاصر مجنوں گورکھپوری کی شہادت دیکھیے، وہ لکھتے ہیں:

”۱۹۲۹ء میں ایک صحبت میں ذکر چھڑ گیا کہ اردو میں باطنیت اور روحانیت پر کوئی رسالہ نہیں ہے، اور یہ ایک بہت بڑی کمی ہے۔ سب کی متفقہ رائے یہی تھی کہ ایسا رسالہ نکلنا چاہیے۔ نیاز نے کہا ان موضوعات پر لکھے کون؟ اور رسالے کی ترتیب کا ذمہ کون لے؟ میں نے کہا کہ نیاز صاحب اصل مہم یہ ہے کہ سرمایہ کہاں سے آئے؟ رسالے کے مصارف کا ذمہ دار کون ہو؟ اگر یہ مہم سر ہو جائے تو میں عمر بھر کے لیے اس کی ترتیب اور ادارت اور مضامین کا خود ذمہ لیتا ہوں۔ نیاز فوراً مصارف برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ رسالے کا نام ”جن“ اور اسی کی رعایت سے ایڈیٹر کا نام ”جان“ قرار پایا، اور میں نے شروع کے چار رسالے لکھ کر، ان کو ترتیب دے کر نیاز کے حوالے کر دیا۔ رسالہ جنوری ۱۹۳۰ء سے نکلنا شروع ہو گیا۔ رسالہ ”جن“ جب شائع ہوا تو ایڈیٹر ”جان“ کی جگہ ”نیاز فتح پوری“ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور میں نے لکھ کر دریافت کیا تو انھوں نے مختصر سا جواب مجھے یہ دیا کہ رسالے کے خریداروں کی تعداد بڑھانے کے لیے انھوں نے اپنا نام دینا ضروری سمجھا اور یہ کہ میں نے جتنے مقالے اور افسانے لکھے ہیں ان کو جب چاہوں، اپنے نام سے منسوب کر سکتا ہوں، میں چپ ہو رہا اور پھر دوسری مصروفیات میں کھو گیا۔ رسالہ ”جن“ شاید ایک سال سے زیادہ نہ نکل سکا۔“ [مجنوں گورکھپوری، خود نوشت، مشمولہ ”ارمغان مجنوں“ مرتبہ صہبا لکھنوی، شبنم رومانی، کراچی: مجنوں اکیڈمی، ۱۹۸۰ء، صفحہ ۷۹]

ماہ نامہ نگار [لکھنؤ] کے ”خدا نمبر“ [۱۹۵۷ء] نے بڑی شہرت پائی ہے اور اسے نیاز صاحب کے قاموسی علم کا نچوڑ قرار دیا گیا ہے، مگر جناب محمد اسحاق صدیقی نے واضح کیا ہے کہ یہ ان کی کاوش ہے۔ [محمد اسحاق صدیقی، ”کچھ نگار کے ”خدا نمبر“ کے بارے میں“ مشمولہ ماہنامہ فروغ اردو، لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۶۴ء، نیز دیکھیے: ماہر القادری، یاد رفتگان، لاہور: البدر پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء حصہ دوم، صفحات ۴۱۸-۴۲۷]۔ محمد اسحاق صدیقی نے اسے اپنی تصنیف کے طور پر ”خدا کا تصور اور اس کا ارتقاء“ [لکھنؤ: احباب پبلشرز، ۱۹۶۴ء] کے نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا تھا۔

۱۔ سفیر اختر، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کا سرمایہ قلم، واہ کینٹ: ادار المعارف، ۲۰۰۴ء، صفحات ۲۷-۲۸۔

کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تصنیف و تالیف کی طرف سے شائع ہونے والے موقر مجلے ”جریدہ“ کا ستائیسواں شمارہ ”چہ دلا وراست“ مشرق و مغرب میں سرتے بازی کی تاریخ اور سرگزشت کے حوالے سے خاصے کی چیز ہے۔ اس میں سید خالد جمعی صاحب ”سرتے کی روایت تاریخ و تحقیق کی روشنی میں“ کے عنوان سے ”نیاز فتح پوری کے سرتے“ کے ذیلی عنوان سے لکھتے ہیں:

”سرقہ نگاری میں جناب علامہ نیاز فتح پوری نے عالم گیر شہرت حاصل کی، ان کی سرقہ نویسی کے چرچے ان کے دور عروج میں عام ہو گئے تھے۔ اس باب میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے انھیں سلسلہ وار مضامین کا مسودہ اشاعت کے لیے دیا تو شروع کے مضامین انھوں نے اپنے نام سے شائع کر لیے۔ مولانا مودودی نے احتجاج کیا لہذا البقیہ مضامین ان کے نام سے شائع کر دیے گئے۔

”فراست الید“ کیرو کی کتاب کا چرچہ ہے، ہاتھوں کے عکس اور متن کیرو سے لیے گئے ہیں، مختلف دائرہ ہائے المعارف [انسائیکلو پیڈیا] کے تراجم کر کے باب ”استفسارات“ میں وہ علم کے موتی بکھیرتے تھے۔ یوسف بخاری صاحب کی روایت ہے کہ کئی بار علامہ کی خواہش پر انھوں نے ان کا گھڑا ہوا سوال باب استفسارات کے لیے بھیجا اور اس کا تفصیلی جواب، جو پہلے سے سرقہ یا ترجمہ شدہ تھا، شائع ہو گیا۔

”ترغیبات جنسی“ ہیولاک ایلیس کی شہرہ آفاق کتاب Studies in the Psychology of Sex کا چرچہ ہے۔ نیاز کی کتاب ”انتقادیات“ کا مضمون ”ادبیات اور اصول نقد“ ولیم ہنری ہڈسن کی کتاب An Introduction to the Study Literature کا سرقہ ہے..... اردو میں سرتے بازی کی تاریخ میں نیاز صاحب کو خاص مقام حاصل ہے اور ان کے سرقوں کی تعداد ان گنت ہے۔ انگریزی زبان سے ان کے بیش تر سرقہ شدہ مضامین کا ماخذ بیرسٹر حسن امام کا کتب خانہ تھا، جہاں وہ اکثر تشریف لے جاتے اور انگریزی کتابیں پڑھتے ہوئے متعلقہ حصوں کو قلم زد کرتے اور ان کا جیسا تیسرا ترجمہ کر کے مضامین شائع کر لیتے۔ عموماً یہ ترجمہ بھی ناقص اور نامکمل ہوتا۔ انگریزی متن کے جو حصے مشکل ہوتے یا جن کی تفہیم نیاز صاحب کے لیے مشکل ہوتی انھیں چھوڑ کر خالی جگہ اپنی بلند خیالی اور الیبلی انشا پردازی سے اس طرح پر کر لیتے تھے کہ سرتے پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔ ان ہی غلط سلسلے محرف سرقوں سے وہ کتابیں مرتب کر ڈالتے۔ حسن مٹنی ندوی صاحب کے پاس ذخیرہ حسن امام کی وہ تمام کتابیں موجود تھیں جن سے نیاز صاحب نے سرقہ کیا تھا اور ان کتابوں پر نیاز صاحب کے اشارات و نشانات بھی محفوظ تھے۔ اب یہ کتب بیدل لاہوری



سرتے دچے بے  
شرف آباد میں محفوظ ہیں۔ حسن ثنیٰ ندوی صاحب کی تحقیق تھی کہ عربی، اردو، فارسی،  
ترکی اور انگریزی میں نیاز فتح پوری سے بڑا سارق پیدا نہیں ہوا۔<sup>۱</sup>

۱- چہ دلا اور است، [مرتبہ: سلمان چشتی، ریحان چشتی، خالد جامعی] کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی،  
۲۰۰۷ء، صفحات، ۸۷-۸۸۔

## نگار: خدا نمبر — ایک مسروقہ تالیف<sup>۱</sup>

اردو کے مشہور اور مقتدر جریدوں میں ”نگار“ کا جو مقام ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ رسالہ ۱۹۲۲ء سے حضرت نیاز فتح پوری کی ادارت میں جاری ہے جو اردو کے صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ درجنوں علمی و ادبی کتابوں کے مصنف ہیں جنہیں ان کے تبحر علمی کی بنا پر ”علامہ“ کہا جاتا ہے اور جنہیں حکومت ہند نے اپریل ۱۹۶۲ء میں ان کے علمی و ادبی خدمات سے متاثر ہو کر سب سے بڑا ادبی اعزاز ”پدم بھوشن“ عنایت کیا تھا، لیکن مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اتنے بڑے ادیب اور عالم میں جو علمی دیانت داری ہونی چاہیے وہ نہیں ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ہفتہ وار ”سرفراز“ [لکھنؤ] میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ ”علامہ کیسے بنتے ہیں“۔ جس میں علامہ نیاز فتح پوری کے ادبی سرقوں کی متعدد مثالیں پیش کی گئی تھیں۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ ان کا دامن شہرت زیادہ داغ دار نہ ہونے پائے اور اس کے لیے میں نے حضرت نیاز سے ان کے کراچی جانے کے بعد خط و کتابت بھی کی لیکن افسوس کہ انہوں نے مجھ ناچیز کی درخواست کو قابل اعتنا نہ سمجھا، اس لیے مجھے مجبوراً اس حقیقت کو ظاہر کرنا پڑ رہا ہے جسے میں نے اب تک ظاہر نہیں کیا تھا۔

حضرت نیاز فتح پوری عرصے سے ہر سال اپنے رسالے ”نگار“ کا ایک خصوصی شمارہ بہ طور سال نامہ پیش کرتے رہے۔ ۱۹۶۵ء کا سال نامہ ”خدا نمبر“ تھا جس میں عہد وحشت سے عہد حاضر تک مختلف مذاہب میں خدا کے تصور کا جائزہ لیا گیا تھا۔ یہ نمبر تمام تر اس خاکسار نے درجنوں کتابوں کے مطالعے کے بعد نیاز صاحب کی فرمائش پر تیار کیا تھا اور نیاز صاحب نے پہلے اس کا تحریری طور پر اعتراف بھی کیا تھا۔ لیکن بعد میں انہوں نے مختلف [اور مجھے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ”نا پسندیدہ“] طریقوں سے اُسے اپنانے اور میری ساری محنتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی یہ سب کیسے ہوا، اس کا جاننا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

”نگار“ کے سالنامہ ۱۹۵۶ء ”خدا نمبر“ لکھنے سے پہلے میرے حسب ذیل مضامین نگار میں شائع ہو چکے تھے:

۱- محمد اسحاق صدیقی، ”کچھ نگار کے ”خدا نمبر“ کے بارے میں“ مشمولہ ماہنامہ فروغ اردو۔ ماہر القادری، یاد رفتگان، صفحات ۳۱۸-۳۲۷۔

۲- مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۶۳ء۔

- [۱] آدمی نے لکھنا کیسے سیکھا..... جون سے اگست ۱۹۷۲ء تک  
 [۲] اظہار اعداد کے طریقے زمانہ قدیم سے لے کر اب تک..... اگست سے دسمبر ۱۹۵۰ء تک  
 [۳] مذاہب عالم کی تخلیق اور قطب شمالی [نامکمل]..... اگست سے نومبر ۱۹۵۲ء تک  
 [۴] پیدائش عالم اور اساطیری روایات کا تقابلی مطالعہ..... دسمبر ۱۹۵۲ء  
 [۵] فن تحریر کی تاریخ [نامکمل]..... جون سے نومبر ۱۹۵۳ء تک، جولائی سے دسمبر ۱۹۵۴ء تک، مارچ سے اکتوبر ۱۹۵۵ء تک

اگر اسے خود ستائی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ نیاز صاحب میرے مضامین سے بہت متاثر تھے، اسی لیے ۱۹۵۵ء میں جب انھوں نے ”خدا نمبر“ نکالنے کا ارادہ کیا تو ساری ذمہ داری میرے سپرد کرنا چاہی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دن میں اس نمبر کی تیاری کے سلسلے میں نیاز صاحب کی خواہش پر انھیں امیر الدولہ پبلک لائبریری [لکھنؤ] لے گیا اور انھیں وہ تمام کتابیں دکھائیں جن سے اس سال نامے کی تیاری میں مدد مل سکتی تھی۔ ان میں سے پیش تر کتابیں کتب محفوظہ [Reserved] تھیں۔ کتابوں کی کثیر تعداد کو دیکھ کر اور ان سے مفید طلب معلومات اخذ کرنے میں جو غیر معمولی محنت کرنا پڑتی اس کے پیش نظر نیاز صاحب کو ”خدا نمبر“ نکالنے میں تامل ہوا اور بولے! مجھ سے بڑھاپے میں اتنی محنت نہیں ہو سکتی کہ یہاں آکر سب کتابیں پڑھوں اور اتنے باریک ٹائپ کی۔ اگر آپ اس کام کا پورا ذمہ لیں تو میں ”خدا نمبر“ نکالوں گا۔ ورنہ کوئی دوسرا نمبر نکالنے کے متعلق سوچوں گا۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں، لیکن میری دو شرطیں ہیں: ایک تو یہ کہ ”خدا نمبر“ رسالے کی صورت میں نیوز پرنٹ پر شائع نہ ہو بلکہ کتابی صورت میں اچھے سفید کاغذ پر شائع ہو، اور دوسرے یہ کہ پوری کتاب میرے نام سے چھپے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ پیش لفظ میں یہ لکھیں کہ ”اگر اسحاق صدیقی میری مدد نہ کرتے تو شاید سال نامہ منظر عام پر نہ آتا۔ ظاہر ہے کہ آپ مشہور ادیب ہیں آپ کی شہرت کے آگے میرا نام ماند پڑ جائے گا۔“ نیاز صاحب اس پر راضی ہو گئے کہ پورا ”خدا نمبر“ میں مرتب کروں گا اور رسالے پر مرتب کی حیثیت سے میرا نام دیا جائے گا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ وعدہ کیا کہ وہ مجھے اس محنت کے لیے معقول معاوضہ بھی دیں گے البتہ انھوں نے ”خدا نمبر“ کو کتابی صورت میں شائع کرنے سے معذوری ظاہر کی کیوں کہ اس طرح لاگت زیادہ آتی اور نگار کے خریداروں کو بھیجنے میں ڈاک خرچ بھی زیادہ لگتا۔ بات معقول تھی اس لیے میں نے اس پر اصرار نہ کیا۔ کچھ عرصے کے بعد میں نے نیاز صاحب سے جا کر کہا: ”آپ نے لائبریری میں جو کتابیں دیکھی تھیں، وہ سب پرانی ہیں۔ یہ چند نئی کتابوں کی فہرست ہے ان کا خریدنا نہایت ضروری ہے تاکہ جدید ترین تحقیقات سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔“

۱- نیاز صاحب کا سنہ پیدائش ۱۸۸۳ء ہے اور میر ۱۹۲۹ء گویا وہ مجھ سے عمر میں ۴۵ سال بڑے ہیں، میں نے نگار کا ”خدا نمبر“ ۱۹۵۵ء میں لکھا تھا اس وقت نیاز صاحب کی عمر ۷۱ سال تھی اور میری ۲۶ سال۔

نیاز صاحب فہرست دیکھ کر خوش ہوئے اور بولے ”ضرور منگوائیے“ اور اسی وقت سو روپے کا چیک لکھ کر دیا۔ میں نے ایک مقامی کتب فروش کے ذریعہ کتابیں منگوائیں اور مطالعے میں غرق ہو گیا۔ اب میرا روز کا یہ معمول تھا کہ دفتر کے بعد سیدھا لاہری پینچتا اور جب تک وہ بند نہ ہو جاتی مختلف کتابوں سے نوٹس تیار کرتا۔ مجھے امیر الدولہ پبلک لاہری کے علاوہ رام کرشنا مشن آشرم [لکھنؤ] کے کتب خانے سے بھی بڑی مدد ملی، جہاں ہندو مذہب کے متعلق کافی کتابیں تھیں۔ میں ان دونوں کتب خانوں سے گھر بھی کتابیں پڑھنے کے لیے لایا کرتا تھا۔ گھر آ کر کھانے کے بعد رات گئے تک لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رہتا اور صبح کو ۶ بجے سے ۹ بجے تک بھی لکھتا پڑھتا اس کے بعد کھانا کھا کر دفتر چل دیتا۔

سال نامے کی تیاری کے سلسلے میں پہلا کام میں نے یہ کیا کہ مذاہب کی قدامت کے لحاظ سے عنوانات کی ایک فہرست مرتب کی اور پھر ہر مذہب پر سلسلہ وار متعلقہ کتابوں کا مطالعہ کرنا اور مضمون لکھنا شروع کیا۔ جب ایک عنوان پر مضمون تیار ہو جاتا تو وہ نیاز صاحب کے حوالے کر دیتا۔ اور وہ اُسے دیکھنے کے بعد کاتب کے حوالے کر دیتے۔ یہ سلسلہ آٹھ نو ماہ تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ ”خدا نمبر“ مکمل ہو گیا اور جب وہ شائع ہو گیا تو میں بڑی اُمیدوں کے ساتھ نیاز صاحب کے پاس پہنچا اور معاوضہ طلب کیا۔

میرا خیال تھا کہ اس شبانہ روز کی محنت کے لیے نیاز صاحب مجھے کئی سو روپے معاوضہ دیں گے کیوں کہ وہ اس سے پہلے بھی نگار میں مضامین لکھنے کے لیے کئی سال سے خصوصی معاوضہ دیا کرتے تھے یعنی فی صفحہ ایک روپیہ [لیکن بقول نیاز یہ معاوضہ نہ تھا بلکہ جن نامساعد حالات میں میں کام کر رہا تھا، اسے جاری رکھنے کے لیے میری مدد تھی۔] لیکن نیاز صاحب نے صاف انکار کر دیا اور کہا: ”معاوضہ کیسا؟ جو کچھ مجھے دینا تھا دے چکا“ میں اپنے اس وقت کے جذبات کو ٹھیک طور سے بیان نہیں کر سکتا لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سامنے ایک ادیب اور عالم نہیں ہے بلکہ ایک سرمایہ دار ہے جو مزدور کو اُس کی مزدوری بھی نہیں دینا چاہتا۔ اُنہوں نے دوران گفتگو میں یہ بھی فرمایا کہ ”معاوضہ تو آپ کو تب دیتا، جب ”خدا نمبر“ آپ کے نام سے شائع نہ ہوتا، اس سے آپ کی کتنی شہرت ہوگی یہ سوچیے۔“ میرے اور ان کے درمیان اور کیا گفتگو ہوئی اس کا ذکر نہایت تکلیف دہ ہے۔ اخیر میں انہوں نے کہا کہ ”فی الحال میں باہر جا رہا ہوں اور وہاں سے واپسی پر کچھ اور دوں گا۔“ اس کے کئی مہینے کے بعد جب میں اُن سے ملنے گیا تو انہوں نے ۵۰ روپے عنایت کیے، لیکن یہ رقم پا کر میں اور بھی دل برداشتہ ہو گیا اور یہ طے کر لیا کہ آئندہ نگار میں کوئی مضمون نہ لکھوں گا۔ حالاں کہ میرے بعض مضامین نامکمل تھے۔

نیاز صاحب نے نگار کے ”خدا نمبر“ کی کچھ فالتو کاپیاں بھی اس خیال سے چھپوائی تھیں کہ نگار کے مستقل خریداروں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس خصوصی پرچے کو خریدنا چاہیں گے اور جیسے جیسے مانگ آتی رہتی تھی رسالے بھیجے جاتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ نیاز صاحب کے کاتب میرے پاس آئے اور بولے ”آج شاید نگار کے ”خدا نمبر“ کی مانگ اور آئی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ”نگار“ کی کاپیاں اندرونی سرورق پھاڑ کر بھیجی جا رہی ہیں۔ اُس کے پہلے صفحے پر میرا نام تھا اور دوسرے صفحے پر نیاز

صاحب کا تعارف، جس میں میری بڑی تعریف تھی [معلوم نہیں کہ اس سے قبل جو کاپیاں خریداروں کو بھیجی گئی تھیں ان کا اندرونی سرورق پھاڑ دیا گیا تھا یا نہیں؟ لیکن آج تو میں خود دیکھ کر آ رہا ہوں۔ معاوضے کے سلسلے میں آپ کے ساتھ جو زیادتی ہوئی اُس کا مجھے افسوس ہے۔ لیکن اس سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ نیاز صاحب آپ کا نام مٹانے کے درپے ہیں اور ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ”خدا نمبر“ اُن کا لکھا ہوا ہے۔“ میں نے ارادہ کیا کہ نیاز صاحب سے جا کر دریافت کروں کہ آخر یہ کیا حرکت ہے؟ لیکن کاتب صاحب نے منع کر دیا۔ اُن کی روزی کا سوال تھا اس لیے میں نے بھی نیاز صاحب کے وہاں جانا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن کاتب صاحب کے بیان کی تصدیق کرنے کے لیے سوچا کہ کسی مقامی کتب فروش کے وہاں جا کر دیکھ کر آؤں گا کہ ان کے وہاں نگار کی جو کاپیاں بکنے کے لیے گئی تھیں شاید ان میں کچھ بچ گئی ہوں اور ان کا اندرونی سرورق پھٹا ہوا ہے یا نہیں۔ چنانچہ میں ایک مقامی پبلشر اور بک سیلر ”کتابی دنیا“ [نظیر آباد] لکھنؤ کے یہاں گیا۔ نگار کی کچھ کاپیاں یہاں موجود تھیں۔ انھیں دیکھا، اندرونی سرورق غائب تھا۔ میں نے دریافت کیا: ”یہ رسالے آپ نے کہاں سے منگوائے؟“ ”بولے“ کیوں؟ ظاہر ہے کہ نگار کے دفتر سے۔ جب میں نے وجہ بتائی تو انھیں نیاز صاحب کی حرکت پر سخت تعجب ہوا۔ میں نے ایک سال نامہ خرید لیا اور رسید پر لکھوا لیا۔ ”پہلا ورق پھٹا ہوا“ تاکہ ثبوت رہے۔ اس کے بعد میں گھر چلا آیا لیکن نگار کی ان کاپیوں کو دیکھ کر مجھے جو ذہنی اذیت پہنچی ہوگی اور میرے قلب کی جو حالت ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ بہر حال میں نے اپنے چند احباب سے اس کا ذکر کیا اور انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ تم اخبار میں سارے واقعات لکھو لیکن باوجود اس امر کے کہ میرے ساتھ انتہائی زیادتی کی گئی تھی میری مروت نے اس اقدام کو پسند نہ کیا اور سوچا کہ ایک مشہور ادیب اور عالم کی شہرت کو داغ دار کرنے سے کیا فائدہ، جو چیز میری ہے وہ میری رہے گی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں نیاز صاحب سے جا کر ملتا اور اس بارے میں اُن سے گفتگو کرتا لیکن میں ان کی نیت سمجھ چکا تھا۔ اس لیے میں نے اُن کے پاس جانا مناسب نہ سمجھا اور یہ خیال کیا کہ یہ گفتگو محض لا حاصل ہوگی بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ بات چیت کے دوران مزید بے لطفی پیدا ہو جائے۔

کچھ دنوں کے بعد نیاز صاحب سے نظیر آباد میں ایک کتاب کی دوکان ”بک ٹورز کارز“ پر ملاقات ہو گئی [جہاں وہ انگریزی ناویس کرائے پر لے کر پڑھا کرتے تھے اور میں پرانی کتابیں اور رسائل خریدنے کے شوق میں جایا کرتا تھا] میں نے سلام کرنا اپنا فرض سمجھا۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اس دوکان پر دو چار بار پھر اُن سے اسی طرح ملاقات اور گفتگو رہی۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے

۱- نیاز صاحب کے کاتب شہنشاہ صاحب کو جو اُن ہی کے گھر میں بیٹھ کر نگار کی کتابت کیا کرتے تھے سارے واقعات معلوم تھے اور انھیں مجھ سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔

۲- جن صاحبان کے پاس ایسے رسالے موجود ہوں اگر وہ مجھے مطلع فرمائیں تو عین نوازش ہوگی۔

فرمایا کہ ”بہت دنوں سے آپ آئے نہیں؟“ میں نے اُن سے اس وقت بھی اصل سبب بتانا مناسب نہ سمجھا۔ البتہ میں اُن کے یہاں حسب سابق آنے جانے لگا۔ اس واقعے کے کئی سال بعد نیاز صاحب جب ”پدم بھوشن“ ہو کر ۱۹۶۲ء میں پاکستان تشریف لے گئے تو ان سے خط و کتابت کرنے لگا۔ اسی دوران نگار میں کئی اشتہار نظر سے گزرے جن سے پتا چلا کہ ”خدا نمبر“ پھر شائع ہونے والا ہے لیکن ان اشتہاروں میں کہیں میرا نام نہ تھا اس لیے مجھے شبہہ ہوا کہ اس مرتبہ کہیں نیاز صاحب یہ نمبر اپنے ہی نام سے نہ شائع کر دیں۔ میرا یہ شبہہ یقین میں بدل گیا۔ جب نگار کا سال نامہ ۱۹۶۳ء ”نیاز نمبر“ حصہ دوم مجھے ملا۔ اس میں فرمان فتح پوری صاحب کا ایک مضمون ہے۔ ”نگار اور نگار کے خاص نمبر“ اس سلسلے میں وہ صفحہ ۳۳۲ پر فرماتے ہیں :

”جنوری، فروری ۱۹۵۶ء۔ ”خدا نمبر“ کے نام سے شائع کیا گیا۔ پورا نمبر نیاز کا غنچہ فکر ہے۔ اس میں نیاز فتح پوری نے دنیا کے مختلف مذاہب کا تاریخی و تحقیقی جائزہ لے کر بتایا ہے کہ مختلف عہدوں اور مختلف قوموں میں خدا کا تصور کیا تھا اور کیا ہے۔ اس نمبر سے جہاں مدیر نگار کی وسعت مطالعہ اور مذاہب عالم سے ان کی گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں مذاہب پر ایسا وافر مواد ہاتھ آ جاتا ہے۔“ [جملہ نامکمل ہے۔ غالباً یہ کہنا چاہتے تھے ”جو کہیں اور دستیاب نہیں ہو سکتا“۔]

مجھے اس تحریر سے جو تکلیف ہوئی، وہ بیان سے باہر ہے میں نے فرمان صاحب اور نیاز صاحب کو کئی خط لکھے کہ ایک تردیدی بیان نگار کی کسی قریبی اشاعت میں شائع کیجیے کہ نگار کا ”خدا نمبر“ اسحاق صدیقی کا لکھا ہوا تھا نہ کہ نیاز فتح پوری کا اور جب ”خدا نمبر“ دوبارہ شائع ہو تو اس کا خیال رکھیے کہ اس میں مؤلف کی حیثیت سے میرا نام ہو اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو مجھے مجبوراً اخبارات کے ذریعے صداقت کو بے نقاب کرنا پڑے گا جو علامہ نیاز کے لیے کشفِ ساق کا باعث ہوگا۔ میں اپنی چیز کو اپنا ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دوں گا اور میرے پاس اس کے لیے کافی ثبوت موجود ہے۔ میرے دل میں علامہ نیاز کے لیے بے پناہ عقیدت ہے لیکن آپ لوگ مجھے اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ میری عقیدت اور محبت نفرت میں بدل جائے اور وہی زبان اور قلم جو نیاز کی تعریف سے کبھی نہ تھکتا تھا اُن کے خلاف حرکت میں آئے۔ ظاہر ہے کہ علامہ نیاز کی شہرت کو داغ دار کر کے مجھے خوشی نہ ہوگی لیکن یہاں سوال اندھی شخصیت پرستی کا نہیں ہے بلکہ یہ خیر و شر کی قدیم جنگ ہے اور مجھے اُمید ہے کہ آخر میں جیت سچ کی ہوگی۔“

۱۲ اگست ۱۹۶۳ء کو نیاز صاحب نے مجھے ایک خط لکھا:

”عزیزم، فرمان کے نام رجسٹری ملی۔ آپ کا اضطراب دیکھ کر تعجب ہوا۔ میں آپ کو لکھ چکا ہوں کہ ”خدا نمبر“ میں آپ کے نام کا اظہار کر دیا جائے گا اور آئندہ ستمبر کے اشتہار میں بھی۔ فرمان صاحب کا سہو تھا کہ انھوں نے مجھ سے پوچھے بغیر اشتہار شائع کر دیا۔ میں خود اب کسی کام کو نہیں دیکھتا بالکل فرصت نہیں ہے۔ ”خدا نمبر“ آپ کو ضرور بھیجا جائے گا۔ ”نیاز“

نگار: خدا نمبر — ایک مسروقہ تالیف —

یہ خط مجھے ۱۷ اگست ۱۹۶۳ء کو ملا۔ اس سے دو روز قبل مجھے فرمان صاحب کا ایک تار ملا تھا:  
1915 APM 156 KARACHI 12 12/13 ISHAQUE  
SIDDIQUI 26 GWYNNE TABLE LUCKNOW  
DONT WORRY SEE NEXT ISSUE.

FARMAN.

ترجمہ:

۱۹۱۵ء اے پی ایم ۱۵۶ کراچی ۱۲/۱۳، اسحاق صدیقی ۲۶ گوئن تالاب لکھنؤ، پریشان نہ  
ہوں آئندہ شمارہ دیکھیے۔

فرمان۔

غالباً تار دینے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ کہیں میں اخبارات میں سارا واقعہ نہ لکھ  
دوں۔ بہر حال، فرمان صاحب نے ستمبر ۱۹۶۳ء یا اس کے بعد نگار کے کسی پرچے میں کوئی بیان اپنی غلط فہمی  
کے بارے میں شائع نہیں کیا۔ مارچ ۱۹۶۳ء میں ”خدا نمبر“ کا جدید ایڈیشن مل گیا جس کے دیکھنے سے  
معلوم ہوا کہ نیاز صاحب نے میری اصل تالیف میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے لیکن شروع کے چند صفحات  
میں بعض اہم تبدیلیاں مصلحتاً کی ہیں۔ مثلاً — سال نامہ ۱۹۵۶ء کے اندرونی سرورق کے پہلے صفحے کی  
عبارت حسب ذیل تھی:

خدا کا تصور

اور

اس کا ارتقاء

[عہد وحشت سے عہد حاضر تک]

مرتبہ: محمد اسحاق صدیقی

ناشر: نگار بک ایجنسی لکھنؤ

قیمت: تین روپیہ

اسی سرورق کے دوسرے صفحے پر نیاز صاحب نے ”تعارف“ لکھا تھا جو یہ ہے:

تعارف

”مذہب بڑے دلچسپ وسیع مطالعے کی چیز ہے، علم الانسان، جغرافیہ، تاریخ، نفسیات اور

ہیئت و علم النجوم سب ہی علوم اس سلسلے میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔“

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۲۳۳

نکار: خدا نمبر — ایک مسروقہ تالیف —

مذہب فطری چیز ہو یا غیر فطری، لیکن اخلاقیات مذہبی یقیناً فطری چیز ہے کیوں کہ متمدن انسان کی تمدنی تنظیم و ترقی اس کے بغیر ممکن نہیں۔

مذہب کی اساس خدا کے تصور پر قائم ہے اور گو وہ ایک منطقی نتیجہ ہے انسان کے جہل و مجبوری کا، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ اس تاریکی و بے اختیاری نے انسان میں خود آگہی پیدا کی اور خدا کی جستجو میں انسان خدا تک پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو لیکن اُس نے اپنے آپ کو ضرور دریافت کر لیا۔

انسان کا جمادات، نباتات و حیوانات سے گزر کر قوتِ مجردہ تک پہنچ جانا اور فطرت کے سر بستہ رازوں کو واشکاف کر دینا عقل انسانی کا بڑا کارنامہ ہے، لیکن انسان کو اس منزل تک صرف خدا کی جستجو نے پہنچایا۔

مذہب عالم کا تقابلی مطالعہ دراصل جغرافیہ، تاریخ و ماحول سے پیدا ہونے والے نفسیاتی رجحان کا مطالعہ ہے اور اس لیے گونا گوں دلچسپیاں اپنے اندر رکھتا ہے۔

عہدِ قدیم سے عہدِ حاضر تک انسان نے کس کس طرح خدا کا تصور کیا، اس راہ میں اس نے کتنی ٹھوکریں کھائیں اور پھر کس طرح آہستہ آہستہ وہ کائنات پر چھا گیا۔ یہ داستان بہت منتشر و طویل ہے، لیکن بے انتہا دلچسپ اور ان ہی منتشر اجزاء کو ہمارے عزیز دوست محمد اسحاق صاحب صدیقی نے یکجا کر کے اس محلے میں شائع کیا ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ اس موضوع پر کسی ایشیائی زبان میں اتنی جامع و موجز کتاب اس سے قبل شائع ہوئی ہو اور قابلِ مؤلف یقیناً قابلِ مبارک باد ہیں کہ انہوں نے غیر معمولی جستجو سے کام لے کر بہت تھوڑے زمانے میں ایسی قیمتی چیز پیش کر کے زبان کی پیش بہا خدمت انجام دی۔

نیاز

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۴۳۴



نگار: خدا نمبر — ایک مسروقہ تالیف —

۱۹۶۳ء کے کراچی کے ایڈیشن میں نیاز صاحب نے یہ جدت کی کہ اندرونی سرورق کے پہلے صفحے سے میرا نام یک قلم اڑادیا اور تعارف کے آخری دو پیرا گراف کے جلی الفاظ جن میں میرا ذکر ہے نکال دیے یعنی اب سرورق کے پہلے صفحے کی عبارت حسب ذیل ہے:

”خدا نمبر“

نگار پاکستان

مدیر اعلیٰ

نیاز فتح پوری

قیمت فی کاپی

زر سالانہ

تین روپے

دس روپے

نگار پاکستان ۳۲ گارڈن مارکیٹ کراچی نمبر ۳

نیاز صاحب کی ادبی زندگی کا یہ رُخ ہے جس پر جب بھی نظر پڑتی ہے تو ان کی شخصیت ”سوالیہ نشان“ کی طرح ”بڑی عجیب“ نظر آتی ہے! اتنا مشہور ادیب اور دوسرے اہل قلم کی کاوش و تحقیق کو ”اپنانے“ میں اس قدر مشاق اور بے باک!

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۴۳۵

## قمر زمانی بیگم — نیاز کا ایک بہروپ

نیاز فتح پوری کا تعلق اردو افسانہ نویسوں کے اس حلقے یا طبقے سے تھا جو رومان پسند یا رومانی افسانہ نگار کہلاتے تھے۔ ان ادیبوں کے نزدیک حسن بہ ذاتہ مقصود ہے اور زندگی و فور حسن۔ بالفاظ دیگر حسن و شباب ہی سب کچھ ہے اور عورت ہی حاصل کائنات۔ نیاز فتح پوری ادیبوں کے اس حلقے کے سرخیل تھے، وہ اپنے افسانے کیو پڈ اور سائیکسی، کی تمہید میں لکھتے ہیں:

”جس وقت میں نے لکھنا شروع کیا [بلا لحاظ اس کے کہ زمانہ کیا چاہتا ہے] میں نے ہمیشہ اپنے ان ہی حسیات کی پابندی کی ہے اور نظم ہو یا نثر ان ہی خیالات کے اظہار کو اپنا محبوب مشغلہ خلوت قرار دے رکھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے بہت سے احباب نے اس کو ناپسند کیا، بعض نے عریاں و فحش کہہ کر شرم دلانی، بعض نے خلاف متانت و تہذیب کے الفاظ سے میرے عزم کو متزلزل کرنا چاہا، لیکن باور کیجیے کہ میں نے ان باتوں کو کبھی سمجھنا بھی نہیں چاہا۔ کیوں کہ میرا مقصد اس سے داد لینا یا دوسروں کو نفع پہنچانا نہیں ہے، بلکہ خود لطف اٹھانا ہے۔ پھر دوسروں کی وجہ سے میں اپنی لذت کھو بیٹھوں؟ ایسا خلق تام مجھ میں کہاں سے آیا؟ اور سنیے سب سے بڑا اعتراض جو اس نوع کے لٹریچر پر کیا جاتا ہے یہ کہ اس میں عورت اور اس کے متعلقات کا ذکر غالب ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے کہ عورت اور اس کے ذکر کو نکال دینے کے بعد آپ کے پاس کیا رہ جائے گا؟ کائنات میں کون سی دوسری چیز ایسی ہے، جس سے آپ اس کی رونق کو قائم رکھ سکیں۔“

ذکر تھا قمر زمانی بیگم کا — دلی میں قیام کے دوران رومانوی ادب سے تعلق رکھنے والوں کا ایک حلقہ نیاز فتح پوری کو میسر آ گیا تھا۔ یہ حلقہ ”یاران نجد“ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس حلقہ یاران نجد نے رومانوی تحریروں اور افسانوں پر مشتمل ایک پرچہ ”نقاد“ کے نام سے ۱۹۱۳ء میں جاری کیا جو ۱۹۲۰ء تک نکلتا رہا۔ شاہ نظام الدین دلگیر [جو ”یاران نجد“ کے ایک فرد فرید اور] اس کے مدیر تھے۔ نوجوان انشا پردازوں کے امام نیاز فتح پوری تھے۔ رسالہ بڑی کامیابی سے نکلتا رہا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۴۳۶

”یہ رسالہ [نقاد۔ آگرہ] بہت جلد اردو میں رومانوی تحریروں کا دلکش مرقع اور ادب لطیف یا انشائے لطیف کی تحریک کا نمائندہ بن گیا۔ بات یہ تھی کہ اس رنگ کے بڑے انشا پرداز مثلاً مہدی افادی، نیاز فتح پوری، خلتی ضیا، عباس ہاشمی اور خود نقاد کے مدیر دلگیر اکبر آبادی، جن کی نثر رومان کا جادو جگاتی تھی، سب کے سب حسن و عشق یا جمالیات کے سلسلے میں سقراط کے ایک شاگرد اور مشہور یونانی مفکر زینوفن کے فلسفہ حسن و عشق سے متاثر تھے۔ اس فلسفے میں حسن و عشق اور عورت ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں اور اسی کو یہ رومان نگار اپنے فکروں کا محور بنائے ہوئے ہیں“۔

فرمان فتح پوری کے بیان کے مطابق ”نقاد“ دو سال [۱۹۱۳ء۔ ۱۹۱۵ء] تک بڑی کامیابی سے نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔ مدیر، دلگیر اکبر آبادی نقصان اور خسارے کے باعث دوبارہ اجرا پر آمادہ نہ تھے، ”یارانِ نجد“ اسے دوبارہ جاری کروانا چاہتے تھے۔ نیاز فتح پوری نے دوبارہ اجرا کی ذمہ داری اپنے سر لی اور لڑکی بن کر ”قمرزمانی بیگم“ کے نام سے مدیر نقاد دلگیر اکبر آبادی کو عشقیہ خطوط لکھے اور نقاد کے دوبارہ اجرا پر آمادہ کر لیا۔ جب نقاد دوبارہ جاری ہوا تو سرورق پر ”قمرزمانی بیگم“ کا نام بہ حیثیت نائب مدیرہ تحریر تھا۔ دلگیر اکبر آبادی [مدیر نقاد] اور قمرزمانی بیگم [نیاز فتح پوری] کے درمیان عاشقانہ مکاتبت کا سلسلہ ۳ نومبر ۱۹۱۶ء سے ۱۹ فروری ۱۹۱۸ء تک جاری رہا۔ بالآخر خود دلگیر کو اس کی خبر ہو گئی اور مکاتبت منقطع ہو گئی۔ یہ خطوط نیاز فتح پوری کے انتقال کے بعد ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ”قمرزمانی بیگم“ کے نام سے اپنے تفصیلی دیباچے کے ساتھ شائع کر دیے ہیں۔ فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

”آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ دلگیر اور نقاد فی الواقع زندہ ہو گئے..... یہی خطوط اس وقت میرے سامنے ہیں اور قمرزمانی اور شاہ دلگیر کی عشقیہ داستان کا مواد فراہم کرتے ہیں۔ یہ خطوط ادبی لحاظ سے بہت دل چسپ ہیں اور بیش تر نیاز کی تخلیق ہونے کے سبب اردو صحافت کی تاریخ میں ایک نایاب اور انمول خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں“۔

یہ خطوط بھلے ادبی حیثیت سے ”نایاب اور انمول خزانے“ ہوں، لیکن اخلاقی اور تہذیبی حیثیت سے ایک انتہائی پست اور رذیل حرکت ہے۔ وہ شخص جسے ڈاکٹر منظور احمد صاحب ”بیسویں صدی کا روشن خیال اسلامی مفکر“ باور کرانے کے خواہاں ہیں اس کی کج ذہنی اور شقی القلمی تو ملاحظہ کیجیے۔ محض ایک رسالے کے اجرا کے لیے ایک ایسے انسان کو، جو نیاز فتح پوری کا دوست بھی تھا، عشقیہ خطوط لکھنا، اس کے اضطراب اور جذبات و احساسات سے لطف اندوز ہونا شرافت و انسانیت ہے؟ ملاقات کی امید پر اسے مختلف شہروں میں گھمانا، اسلام اور اخلاق تو بہت دور انسانیت سے بھی گری ہوئی حرکت ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

۱- نیاز فتح پوری، قمرزمانی بیگم [مرتب: ڈاکٹر فرمان فتح پوری]، کراچی: اردو اکیڈمی، ۱۹۷۹ء، صفحہ ۱۳۔

۲- ایضاً، صفحات ۲۱-۲۲۔

”لیکن جیسے ہی راز فاش ہوا شاہ دلیگیر کو کچھ ایسا صدمہ لگا کہ وہ اندر سے بالکل بچھ گئے۔“  
 کتاب ”قمرزمانی بیگم“ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نیاز فتح پوری نے دیگر فرضی عورتوں [مثلاً  
 ناہید، کوثر، بلقیس اور کہکشاں وغیرہ] کے نام سے بھی نقاد میں مضامین لکھے۔ یہ حرکت مذہب و جہت پرستی کی  
 مریض ذہنیت اور نفسیاتی مفعولیت پر دلالت کرتی ہے۔ ان حرکتوں کے باوجود نیاز کا علماء پر سب و شتم کرنا اور  
 دنیا کا ہر بے ہودہ الزام اور نا کردہ جرم ان سے منسوب کر دینا انھیں زیب دیتا ہے؟ جس شخص کا اپنا کردار یہ  
 ہو وہ بلا تخصیص و تحدید دنیا کے تمام علماء کو روئے زمین کی بدترین مخلوق قرار دیتا ہے۔ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

”آج کل اکابر اسلام کو دیکھیے جو اپنے بڑے بڑے عمالوں اور لمبی لمبی عباوں کے ساتھ  
 تقدسِ اسلامی کا قد آدمِ اشتہار بنے پھرتے ہیں۔ ان علمائے کرام اور صوفیائے عظام کو  
 دیکھیے جو اپنی طویل الذیل داڑھیوں اور ڈھیلے ڈھالے خرقوں کے ساتھ ہیبتِ اسلامی کا دیو  
 پیکر مجسمہ نظر آتے ہیں کہ اگر کسی ایسی بستی میں جو انسانی عصیاں کاری سے تباہ و برباد ہو چکی  
 ہے، عدوان و معصیت کا کوئی صحیح مجسمہ نصب کیا جانا مقصود ہو تو ان سے بہتر ”ماڈل“ مل ہی  
 نہیں سکتا۔ ان کے جسم کے ایک ایک ریشے کی پرورش اور ان کے خون کے ہر قطرے کی  
 روانی ایک مستقل یادگار ہے اس بد باطنی و کور نفسی کی، ایک طویل داستان ہے اس مکرو  
 فریب اور زور و ریا کی جس کو اسلام نے بدترین لعنت قرار دے کر دنیا سے ہٹانا چاہا اور اس  
 جماعت نے بہترین ذریعہٴ فلاح و کامیابی سمجھ کر اختیار کر لیا۔“

آج نیاز فتح پوری کے معتقدین و احباب ان کے نام کے ساتھ ”مولانا“ — ”علامہ“ کا سابقہ  
 لگاتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا یہ گالیاں بجا طور پر نیاز پر ہی نہیں لوٹ آتیں؟

۱- نیاز فتح پوری، قمرزمانی بیگم [مرتب: ڈاکٹر فرمان فتح پوری]، صفحہ ۱۴۱۔

۲- نیاز فتح پوری، من و یزداں، صفحہ ۱۱۴۔

## نیاز — افکار و عقائد کی ایک جھلک

ڈاکٹر منظور احمد صاحب لکھتے ہیں:

”نیاز فتح پوری اسلام سے منحرف تھے اور نہ اس کو انسانی زندگی کے لیے غیر اہم سمجھتے تھے۔“<sup>۱</sup>  
منظور احمد صاحب کے اس ارشاد کی تردید میں زور قلم صرف کرنے کی بجائے نیاز فتح پوری کی کتابوں کے چند اقتباسات پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے فیصلہ خود ہو جائے گا کہ ڈاکٹر صاحب کے بیان میں کتنی واقعیت ہے؟ اور نیاز مذہب سے کس درجے قریب تھے اور اسے انسانی زندگی کے لیے کتنا اہم سمجھتے تھے؟  
[۱] سب سے پہلے مذاہب کو لیجیے، نیاز لکھتے ہیں:

”میں اس سے قبل بھی بارہا لکھ چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ جب تک مذہب کا وجود باقی ہے دنیا کا امن و سکون خطرے میں ہے۔“<sup>۲</sup>

”بہر حال مذہب کسی زمانے میں مفید ہو یا مضر، بہ حالات موجودہ اس کے نقصانات کھلے ہوئے ہیں، اور اس کو ذریعہ نجات قرار دینا حماقت ہے البتہ اگر ملتوں کا امتیاز مٹا دینے کے بعد [کہ نہ کوئی مسلمان رہے اور نہ کوئی یہودی، عیسائی یا ہندو..... ناقل] کوئی ایسا دین رائج کیا جائے جو اپنا نصب العین ماورائے مسجد و مندر قرار دے تو بے شک چل سکتا ہے ورنہ مذاہب کی عمر اب ختم ہو چکی ہے اور تجربے نے ان کو بہت نا کامیاب ثابت کیا ہے۔“

”اگر دنیا یہ سمجھ لے کہ مذہب کا وجود انسانی زندگی کے لیے ضروری نہیں ہے اور ہم خدا کو مانے بغیر بھی اچھی زندگی بسر کر سکتے ہیں تو بے شک یہ ایک ایسے نقطے کی طرف قدم بڑھانا ہوگا جو عقائد مذہبی کے تمام لغو اختلافات کو دور کر کے مذہبی رنگ اختیار کر سکتا ہے۔“<sup>۳</sup>

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۶۵۔

۲- نیاز فتح پوری، من و یزداں، صفحہ ۳۰۳۔

۳- ایضاً، صفحہ ۲۳۸۔

”مذہب عالم کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ مذہب انسان کی ترقی میں حائل ہے اور اسے ہونا بھی چاہیے کیوں کہ مذہب عالم کی پیداوار نتیجہ تھی صرف مقامی و نسلی اقتضا کا، اور اس کے ذہن میں تمام نوع انسانی کی فلاح و ترقی کا سوال آ ہی نہیں سکتا تھا اب اسی کے ساتھ ایک سوال اور بھی غور طلب ہے، یعنی یہ کہ اگر آج دنیا سے مذہب یک سرفنا ہو جائے اور مذہبی عصیت بالکل محو کر دی جائے تو کیا مدعا حاصل ہو جائے گا اور کیا کرہ ارض کے تمام باشندے ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بن کر رہنے لگیں گے؟ اس کا جواب یہ ہے یقیناً مدعا اس وقت بھی حاصل نہ ہوگا کیوں کہ مذہب کے علاوہ دو بلائیں اور نوع انسانی پر نازل ہوئی ہیں [یعنی ایک بلا مذہب بھی ہے..... ناقل] ایک امتیاز رنگ و نسل کی اور دوسری جذبہ سرمایہ داری، یعنی جس طرح مذہب لوگوں میں جذبہ منافرت کی پرورش کر رہا ہے، بالکل اسی طرح گورے کالے کے امتیاز اور فراہمی دولت کی حرص نے انسانیت کو پامال کر رکھا ہے..... وہ اہل نظر جن کی نگاہ ان تمام مسائل پر ہے ان میں بعض کا خیال یہ ہے کہ رنگ و نسل کا امتیاز بھی مذہب ہی نے پیدا کیا ہے، اور سرمایہ دارانہ ذہنیت بھی نتیجہ ہے مذہبیت کا، جس نے اخلاقیات کی آڑ میں سلطنت و حکومت کی بنیادیں قائم کی ہیں اس لیے مذہب کے ساتھ ان کو بھی ختم ہو جانا چاہیے تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ جب تک کلیہ تمام امراض کے دور کرنے کی صورتیں نہ پیدا ہو جائیں کسی ایک مرض کا بھی مداوانہ کیا جائے، ہو سکتا ہے کہ ایک کا اندفاع دوسری بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی اہلیت ہم میں پیدا کر دے اور اس لیے اگر دنیا سب سے پہلے مذہبیت ہی کو دور کرنا چاہتی ہے تو بے جا نہیں جب کہ حقیقتاً سب سے زیادہ سخت اور سنگین مرض یہی ہے۔“

[۲] معتقدات مذہبی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

”بعض لوگ کہتے ہیں کہ معتقدات مذہبی سے ہم کو کیا نقصان پہنچتا ہے اگر ہم دوزخ و جنت، حور و قصور، جن و ملک، معجزہ و خرق عادات وغیرہ پر عقیدہ رکھتے ہیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ جب کہ ان عقائد کا مقصود بھی اصلاح اخلاق ہے؟ بہ ظاہر یہ بات قرین عقل معلوم ہوتی ہے لیکن فی الحقیقت ان عقائد کے نقصانات حد درجے مہلک ہیں، یہ معتقدات چوں کہ یک سر روایات پر مبنی ہیں اور عقل و درایت کا ان سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے ان کو صحیح سمجھ لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا ذہن حقائق

کی جستجو سے منحرف ہو جاتا ہے، اسباب و نتائج کے رابطے کو سمجھنے کی اہلیت ہم میں باقی نہیں رہتی۔ انسان کے تمام قوائے ذہنی مضمحل ہو جاتے ہیں اور ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔<sup>۱</sup> ”الغرض بقائے روح اور عذاب و ثواب کا عقیدہ خدا کی بے نیازی اور علم و عقل کو دیکھتے ہوئے ضرورت و مصلحت اور قانون قدرت و دنوں کے خلاف ہے اور اس کو تسلیم کرانے کے لیے نہ کوئی ربانی دلیل پیش کی جاسکتی ہے نہ اخلاقی و علمی۔“<sup>۲</sup>

”ہر چند دوسرے عالم سے حیات بعد الممات کا عالم مراد لینا میرے نزدیک درست نہیں اور اس سے مقصود صرف یہ کہنا ہے کہ کوشش کرتے رہو، اگر آج نہیں تو کل کامیاب ہو گے۔“

”اس میں شک نہیں کہ کلام مجید میں دوزخ جنت کا بیان اسی طرح کیا گیا ہے، جیسے وہ کوئی مادی چیزیں ہوں، لیکن اس بیان کو حقیقت سمجھنا سخت غلطی ہے۔ ان میں اکثر جگہ تو مقصود دنیا ہی کی کامیابی و ناکامی کو ظاہر کرنا ہے اور یہیں کے نعم و لذائذ اور شدائد و مصائب کو خاص انداز سے بیان کیا ہے اور کہیں کہیں اگر یہ بیانات حیات بعد الموت سے متعلق ہیں تو صرف بہ طریق مجاز ہیں اور لوگوں کو سمجھانے کے لیے۔“<sup>۳</sup>

[۳] عبادات سے متعلق لکھتے ہیں:

”میں کہتا ہوں بہ آواز بلند کہتا ہوں اور بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ یہ وقت اس بات کے دیکھنے کا نہیں ہے کہ مسلمان نماز پڑھتا ہے یا نہیں، روزے رکھتا ہے یا نہیں؟ دوزخ و جنت کا قائل ہے یا نہیں؟ بلکہ صرف یہ سوچنے کا ہے کہ مسلمان کے پاس کھانے کو بھی ہے یا نہیں۔“<sup>۴</sup>

[۴] علمائے کرام کے متعلق فرماتے ہیں:

”پاکستان کے عوام..... کیوں اپنی قوتِ احتساب سے اس جماعت کو ختم کر دینے کا کام نہیں لیتے جس کے طویل جبہ و عمامہ کی تباہیوں کے جراثیم اور اخلاق کی بربادیوں کے اسباب ہزار ہزار پنہاں ہیں اور وہ سب سے پہلے ان علمائے کرام اور مولویانِ عظام کو صفحہ زمین سے محو کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے، جنہوں نے اپنے اعمال، رویے اور افعالِ نحیفہ سے عالمِ اخلاق کو سو گوارا اور دنیا سے نہفت و عمل کی حزیں و ملول بنا رکھا ہے۔“

۱- نیاز فتح پوری، من و یزداں، صفحہ ۳۰۲۔

۲- ایضاً، صفحہ ۳۲۵۔

۳- ایضاً، صفحہ ۵۳۰۔

۴- نیاز فتح پوری، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، صفحہ ۱۰۔

[۵] خدا کے متعلق لکھتے ہیں:

”خدا کو آگ برساتے ہوئے، خون پیپ پلاتے ہوئے، آتشیں کوڑوں سے سزا دیتے ہوئے بہت زمانہ ہو چکا ہے، اب ضرورت ہے کہ وہ صرف زخموں پر مرہم رکھے، ٹوٹے دلوں کو ڈھارس پہنچائے اور بجائے کسی خاص قوم پر لطف کرنے کے وہ تمام بنی نوع انسان کو اپنا ہی بندہ سمجھے اور نجات کا دروازہ بغیر کسی شرط [یعنی ایمان و کلمہ وغیرہ..... ناقل] کے سب کے لیے کھول دے، لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک مذاہب کا عقائدی اختلاف دور نہ ہو خدا کا کوئی ایسا کائناتی تصور قائم ہی نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی شخص ان اختلاف عقائد کو مہمل قرار دیتا ہے تو اسے ملحد و کافر کہا جاتا ہے، اس لیے میری رائے میں اب خدا کی خدائی اگر صحیح معنوں میں قائم ہو سکتی ہے تو اس کی توقع ہم کو صرف کافروں اور ملحدوں ہی سے کرنا چاہیے۔“

[۶] معجزات کے متعلق لکھتے ہیں:

”سب سے بڑی واہمہ پرستی جو سرچشمہ ہے اور بہت سے اوہام کا معجزہ ہے۔“

سیدنا عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات پر طنزاً تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اسی طرح مسیح نے بہت سے معجزے پیش کیے، لیکن بالکل بے نتیجہ، وہی مردے جن کو انہوں نے زندہ کیا، وہی اندھے جن کو انکھیاں بنا دیا اور وہی کوڑھی جنہیں اچھا کیا ان پر ایمان نہ لائے، آپ کو معلوم ہے کہ اس کا سبب کیا تھا؟ صرف یہ کہ معجزے کبھی ظاہر نہیں ہوئے، بلکہ یہ سب داستانیں ہیں جو صدیوں بعد گھڑی گئیں۔“

[۷] قرآن مجید کے بارے میں لکھتے ہیں:

”کلام مجید کو میں نہ کلام خداوندی سمجھتا ہوں اور نہ الہام ربانی بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں، اس مسئلے پر اس سے قبل کئی بار مفصل گفتگو کر چکا ہوں۔“

”عام مسلمانوں اور مولویوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن اپنے الفاظ اور اپنی ترتیب کے لحاظ سے بہ تمام پہلے لوح محفوظ میں منقوش تھا، اور فرشتہ جبرئیل یہی محفوظ و منقوش کلام رسول اللہ کو آ کر سنا تا تھا، اور رسول اللہ ان ہی آسمانی الفاظ کو دہرا دیتے تھے، حد درجہ مضحکہ خیز ہے اگر قرآن کی زبان عربی نہ ہوتی تو بھی خیر کچھ کہا جاسکتا تھا لیکن جب کہ وہ اس زبان میں نازل ہوا تھا جو عام طور پر عرب میں رائج تھی تو اس کے الفاظ کو کیوں کر

۱- نیاز فتح پوری، من ویزداں، صفحہ ۳۳۰۔

۲- ایضاً، صفحہ ۳۰۱۔

۳- ایضاً، صفحہ ۲۸۹۔

۴- ایضاً، صفحہ ۷۰۱۔



خدائی الفاظ کہا جاسکتا ہے؟ بہر حال قرآن کو خدا کا کلام اس حیثیت سے تسلیم کرنا کہ اس کا ایک ایک نکتہ ایک ایک لفظ خدا کا بتایا ہوا ہے اور خود رسول اللہ کے عقل و دماغ کو اس سے کوئی تعلق نہیں تھا تو خدا کو اس کے منصب سے گرا کر انسان کی حد تک کھینچ لانا ہے اور رسول اللہ کو سطح انسانیت سے بھی نیچے گرا دینا ہے۔<sup>۱</sup>

[۸] احادیث کے متعلق لکھتے ہیں:

”[مولویوں] کے نزدیک اسلام نام ہے صرف کو را نہ تقلید کا اور تقلید بھی رسول و احکام رسول کی نہیں بلکہ بخاری و مسلم و مالک وغیرہ کی..... اولین بیزاری اسلامی لٹریچر کی مجھ میں احادیث نے پیدا کی ہے۔“<sup>۲</sup>

[۹] ایک جگہ ”وحدتِ ادیان“ کا نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”میرے نزدیک فتوے کا صحیح جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ایک بدکار مسلمان قطعاً ناری ہے اور ایک نیکو کار برہمن یقیناً ناجی۔“<sup>۳</sup>

[۱۰] اسلام کے متعلق لکھتے ہیں:

”دنیا میں سب سے آخری قابل ذکر مذہب اسلام ہوا ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مذاہب کی دنیا میں آخری لفظ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ نہ اپنے معتقدات دینی کے لحاظ سے وہ سب کے لیے قابل قبول ہے اور نہ شریعت کے اعتبار سے اسے مکمل کہا جاسکتا ہے۔“<sup>۴</sup>

۱- نیاز فتح پوری، من و یزداں، صفحات ۳۳۹-۳۴۰۔

۲- ایضاً، صفحہ ۳۳۷۔

۳- ایضاً، صفحہ ۴۷۔

۴- نیاز فتح پوری، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، صفحات ۵-۶۔

## قرآن مجید کلام اللہ نہیں، کلام رسول اللہ ہے۔ [نعوذ باللہ]

قرآن کا تعارف خود قرآن ہی سے:

قرآن مجید اس کلام الہی کا نام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ قرآن مجید نے خود اپنا واضح تعارف ایک آیت مبارکہ میں اس طرح کرایا ہے:

وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ. [۱۹۶-۱۹۲:۲۶]

”اور یہ [قرآن اللہ] رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ [یعنی اس نے] تمہارے دل پر [القا] کیا ہے تاکہ [لوگوں کو] نصیحت کرتے رہو۔ [اور القا بھی] فصیح عربی زبان میں [کیا ہے]۔ اس کی خبر پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں [لکھی ہوئی] ہے۔“

یہ آیت مبارکہ اپنے مفہوم اور مدعا میں کسی تفسیر کی محتاج نہیں۔ اس سے صاف طور پر یہی مفہوم نکلتا ہے کہ یہ کلام اپنے لفظ لفظ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا نازل کردہ ہے جسے جبرئیل امین علیہ السلام آپ کے قلب مطہر پر لے کر نازل ہوئے ہیں۔

اگر قرآن مجید، معاذ اللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہوتا تو آپ کو اس میں تصرف اور تبدیلی کا اختیار ہوتا، مگر ایسا نہیں تھا، چنانچہ قرآن نے مشرکین کے اس خیال کو رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَإِذَا تُلِيٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا إِنَّا بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ لَمِنْ تَلْقَائِي نَفْسِي إِنْ أَتَّبَعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابٌ عَظِيمٌ [۱۵:۱۰]

”اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں جو بالکل صاف صاف ہیں تو یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کی امید نہیں ہے یوں کہتے ہیں کہ اس کے سوا دوسرا قرآن لایئے یا اس میں کچھ ترمیم کر دیجیے۔ آپ یوں کہہ دیجیے کہ مجھے یہ حق نہیں کہ

قرآن مجید کلام اللہ نہیں، کلام رسول اللہ ہے۔ [نعوذ باللہ]

اپنی طرف سے اس میں ترمیم کر دوں، بس میں تو اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے پاس وحی کے ذریعے پہنچا ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔“

اس آیت مبارکہ میں اس خدشے اور اندیشے کا ہمیشہ کے لیے ازالہ کر دیا گیا کہ قرآن اپنے الفاظ و مضامین دونوں میں وحی الہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اتباع پر مامور ہیں اور اس میں ترمیم و تصرف کا قطعاً کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ البتہ اس کی تبیین و تشریح بہ طور فریضہ رسالت آپ کو سونپی گئی ہے۔ یہاں بہ طور نمونہ دو آیات نقل کی گئی ہیں ورنہ قرآن مجید میں اس موضوع کی بے شمار آیتیں موجود ہیں۔

قرآن کا لفظ لفظ کلام اللہ ہے: مستشرقین کی تصریحات:

قرآن مجید کا الفاظ خداوندی [Word of God] ہونا ایسی بدیہی بات ہے کہ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے، چند ایک مستشرقین کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

H.A.R. Gibb لکھتا ہے:

Well then, if the Koran were his own composition other men could rival it. Let them produce ten verses like it. If they could not [and it is obvious that they could not], then let them accept the Koran as an outstanding evidential miracle. ۱

Harry Gaylord Dorman کے الفاظ ہیں:

It [Qur'an] is an ever-present miracle witnessing to itself and to Muhammad, the Prophet of God. Its miraculous quality resides partly in its style, so perfect and lofty that neither men nor jinn could produce a single chapter to compare with its briefest chapter, and partly in its content of teachings, prophecies about the future, and amazingly accurate information such as the illiterate Muhammad could never have gathered of his own accord. ۲

- 1- H.A.R. Gibb, *Mohammedanism: An Historical Survey*, New York: A Galaxy Book, 1962, p.42.
- 2- Harry Gaylord Dorman, *Toward Understanding Islam: Contemporary Apologetic of Islam and Missionary Policy*, New York: Columbia University, 1948, p.3.

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۴۴۵

قرآن مجید کلام اللہ نہیں، کلام رسول اللہ ہے۔ [نعوذ باللہ]

James لکھتا ہے:

Muslims believe that the ultimate word of God is represented in the Koran. These are believed to be the actual words, in essence dictated verbatim to Muhammad. ۱

قرآن مجید کلام اللہ نہیں انسانی کلام ہے: نیاز فتح پوری:

لیکن ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے مدوح نیاز فتح پوری ان تمام آیات و تصریحات کے بالعکس الفاظ قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام بلکہ الہام نہیں مانتے اسے بے جھجک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دماغی کاوش کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام باور کراتے ہیں۔ تمیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

”کلام مجید کو میں نہ کلام خداوندی سمجھتا ہوں نہ الہام ربانی، بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں“۔ ۲

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

”یہ ہے میرا عقیدہ قرآن پاک اور رسول اللہ کی رسالت کے متعلق اور میں سمجھتا ہوں کہ رسول کی عظمت کا اقتضا یہی ہے کہ قرآن کو ان ہی کا کلام سمجھا جائے“۔ ۳

1- James Mannion, *Essential Philosophy: Every thing You Need to Understand the World's Greatest Thinkers*, p. 192.

۲- نیاز فتح پوری نے جس زمانے میں قرآن مجید کے کلام الہی [Word of God] ہونے کے خلاف ”نگار“ میں لکھا تو ان کی اس شراکتی سے مسلمانان ہند میں سخت ہيجان برپا ہو گیا۔ اس فتنے کی سرکوبی و گوشمالی کے لیے ملک بھر کے علمائے حق اور صحیح العقیدہ دانش ور میدان میں نکل آئے، اور اپنے قلمی جہاد سے اس فتنے پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ دم توڑ کر رہ گیا۔ اس سلسلے میں امرتسر سے شائع ہونے والے ایک ماہ نامے ”البيان“ نے ایک قابل قدر دینی خدمت یہ انجام دی کہ اپریل ۱۹۳۱ء کے شمارے کو ”براہین وحی“ [مرتبہ: محمد اقبال سلیمانی، امرتسر: مکتبہ امت مسلمہ ہند] شائع کر دیا اور اس میں ان مشاہیر اہل قلم کے وہ معرکہ آرا مضامین جمع و محفوظ کر دیے جو انھوں نے ہفتوات نیاز کے جواب یارڈ میں سپرد قلم کیے تھے۔ لکھنے والے ارباب علم و دانش میں علامہ اقبال، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریا بادی، مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا محمد حسین عرشی، مولانا حسین ندوی بکراچی، مولانا محمد منظور نعمانی اور محمد دین تاثیر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ عرصہ دراز کے بعد [۲۰۰۳ء میں] اس خصوصی اشاعت کو بعض ضروری اضافوں کے ساتھ آواز کتاب گھر نے ”قرآن مجید کلام رسول یا کلام اللہ“ کے نام سے دوبارہ شائع کر دیا ہے۔

۳- نیاز فتح پوری، من ویزداں، صفحہ ۷۰۔

۴- ایضاً، صفحہ ۳۱۶۔

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۴۴۶

مزید لکھتے ہیں:

”خدا کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے تو قطعی اس امر کی ضرورت نہیں کہ وہ انسان کی طرح چلتا پھرتا بولتا چلتا فرض کیا جائے اور رسول کی برتری اخلاق کے ثبوت کے لیے بھی ضروری نہیں کہ خدا اس سے باتیں کرے یا اس کی زبان میں کوئی کتاب تصنیف کر کے اپنے فرشتے کے ذریعے اس کے پاس بھیج دے، بلکہ سچ پوچھیے تو یہ رسول کی عظمت کے منافی ہے کہ جو کچھ وہ کہے وہ خود اس کے دماغ کا نتیجہ نہ ہو۔“

نیز:

”قرآن کو اس معنی میں خدا کا کلام کہنا کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کی زبان سے ادا کیا ہوا لفظ ہے، حد درجے جاہلانہ عقیدہ ہے، جس سے ایک طرف خدا کے تصور وحدانیت کو صدمہ پہنچتا ہے اور دوسری طرف رسول کی عظمت کو۔“

رسول اللہ پر کذب کی تہمت: کلام اللہ کو انسانی کلام باور کرنے کا نتیجہ:

نیاز فتح پوری صاحب کے محولہ بالا اقتباسات سے واضح ہو گیا کہ وہ تصریحات قرآنی کے برعکس قرآن مجید کو ”انسانی کلام“ سمجھتے ہیں۔ مشرکین کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ قرآن مجید کلام ربانی نہیں، بلکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، نعوذ باللہ، خود گھڑ کے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ قرآن نے مشرکین کے اس اعتراض کو افتراء علی اللہ [اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا] قرار دیا ہے۔ ظلم یہ ہے کہ مشرکین تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا فرستادہ اور رسول تسلیم نہ کر کے یہ بہتان عائد کر رہے تھے اور نیاز فتح پوری خود کو مسلمان ہی نہیں بلکہ عقائد اسلامی کو تمام علمائے اسلام سے بہتر سمجھنے والا باور کر کے افتراء علی اللہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ جس سے نعوذ باللہ، قرآن مجید کے ”انسانی کلام“ ہونے کے دعوے کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کذب کی نسبت و تہمت بھی عائد ہوتی ہے۔ یعنی وہ رسول [صلی اللہ علیہ وسلم] جس کی صداقت اور راست بازی کفار کے نزدیک بھی مسلم ہے، اس نے اپنے کلام کو بار بار اللہ تعالیٰ کا کلام کہہ کر انسانوں کے سامنے پیش کیا۔ اس سلسلے میں قرآن ہی کی چند آیات کا مطالعہ کافی رہے گا۔

۱- نیاز فتح پوری، من ویزداں، صفحہ ۳۱۵-۳۱۶۔

۲- ایضاً، صفحہ ۷۰۔

۳- نیاز فتح پوری کے اس افتراء علی اللہ کی بنیاد کسی تحقیق پر مبنی تھی؟ کیا ان کی علمی سطح اس لائق تھی کہ وہ قرآن مجید کے متعلق خالق اور مخلوق کے کلام کے فرق پر گفتگو کر سکیں؟ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کتاب ”براہین وحی“ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”اس کتاب کے شروع میں خود نیاز صاحب کے اقوال و دلائل بھی درج ہیں۔ ان کو پڑھ کر کوئی صاحب علم نیاز صاحب کی علمیت پر ماتم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو شخص ما یسطق عن الہوی میں ”ہوئی“ کا ترجمہ ”ایک تختی میں محفوظ ہے“ کرے۔ اس کو قرآن کریم کے اعجازی کلام پر رائے زنی کا کیا حق ہے؟ منافقین کے جس استدلال بالقرآن سے رسول نے امت کے لیے پناہ مانگی تھی، نیاز صاحب نے اس کی ایک نمایاں اور تازہ مثال پیش کی ہے“ [ترجمان القرآن، جولائی-اگست، ۱۹۴۵ء، جلد ۲، عدد ۱، ۲]۔

قرآن مجید کلام اللہ نہیں، کلام رسول اللہ ہے۔ [نعوذ باللہ]

منافقین کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلِمَ اللَّهِ [۱۵:۲۸]  
 ”وہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو بدل دیں۔“

مشرکین کے حوالے سے ارشاد فرمایا:

وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلِمَ اللَّهِ ثُمَّ ابْلِغْهُ  
 مَا آمَنَهُ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ [۶:۹]

”اور اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ کلام الہی سننے لگے پھر اس کو امن کی جگہ واپس پہنچا دو اس لئے کہ یہ بے خبر لوگ ہیں۔“

ان آیات سے واضح ہوا کہ قرآن ”کلام اللہ“ ہے۔ بار بار اس کی نسبت تنزیل [اتارا ہوا]

کالفظ استعمال ہوا ہے۔

وحی متلو اور غیر متلو: حقیقت اور فرق:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب نیاز فتح پوری کے ان اقوال کے حامی اور مؤید ہیں، وہ اپنے زیر بحث

مقالے میں نیاز صاحب کی وکالت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

”اسی طرح قرآن مجید کو وہ [نیاز] خدا کا کلام ان ہی معنوں میں سمجھتے تھے جن معنوں میں  
 انسان کا کلام ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے وحی متلو کی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔“

غور فرمایا جائے تو ڈاکٹر صاحب کی ان ہی عبارات میں نیاز فتح پوری صاحب کی وکالت کے باوجود  
 ان کے نظریات کا ابطال موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات بابرکات کا لمحہ لمحہ ربانی حفاظت و  
 صیانت کی آغوش میں گزرا ہے۔ قرآن نے دو ٹوک الفاظ میں اس کی شہادت دی ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ [۳:۵۳-۳]

”اور نہ وہ اپنی خواہش سے کوئی بات کہتے ہیں وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے۔“

اس آیت مبارکہ سے پتا چلا کہ آپ قطعی انداز میں جو بات بھی ارشاد فرمادیں سب اللہ تعالیٰ کی وحی  
 ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن مجید کے علاوہ بھی آپ شرف وحی سے نوازے جاتے تھے مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر  
 وحی، وحی قرآن ہو۔ آیات قرآنی کا مطالعہ اس امر کو واضح کر دیتا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں نازل کرنے  
 کے ساتھ کتاب، ذکر یا فرقان وغیرہ کی تصریح کی گئی ہے، تو وہاں اس سے مراد وحی قرآن ہے، جسے  
 اصطلاح میں ”وحی متلو“ یا ”وحی جلی“ کہا جاتا ہے۔ اور جہاں کوئی قرینہ ان الفاظ کو قرآن مجید کے لیے  
 مخصوص نہ کر رہا ہو تو اس سے مراد ”وحی رسالت“ ہے جو محض کتاب تک محدود نہیں بلکہ یہ آپ کی مجموعی  
 تعلیمات و ہدایات کو حاوی ہے، جسے اصطلاح میں ”وحی غیر متلو“ یا ”وحی خفی“ کہتے ہیں۔

اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ [۱۷:۲۲]

”اور اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب نازل کی اور میزان بھی۔“

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۲۲۸

قرآن مجید کلام اللہ نہیں، کلام رسول اللہ ہے۔ [نعوذ باللہ]

وَ أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ [۱۱۳:۴]

”اور اللہ تعالیٰ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور تمہیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے۔“

ان تصریحات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ”الکتاب“ کے نزول کے ساتھ مبداء فیض سے دیگر انوار کا بھی نزول ہوتا تھا، جس کے لیے حکمت، میزان، نور وغیرہ کی اصطلاحات قرآن میں موجود ہیں۔ البتہ علماء اور اصولیین نے اس کی تصریح ضرور فرمادی ہے کہ وحی کی وہ قسم جس کی ”تلاوت“ کی جاتی ہے وہ ”الکتاب“ وحی مقلوبہ ہے۔ جس میں کسی انسانی کاوش کا دخل یا دماغ کا تصرف نہیں اور وہ قرآن ہے۔ وحی کی دوسری قسم جس میں معانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتے تھے اور آپ ان کو اپنے الفاظ میں بیان فرمادیا کرتے تھے وہ وحی غیر مقلوبہ حدیث و سنت ہے۔ نفس حجیت میں، باوجود فرق مراتب کے، دونوں برابر ہیں۔

وحی کسی داخلی احساس یا بلند خیالی کا نام نہیں:

یہاں ایک نکتے کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے، وحی پیغمبر کی کسی داخلی کیفیت کا نام نہیں ہے، بلکہ خارج سے نازل ہونے والی ایک حقیقت ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے اپنی معرکہ آرا کتاب ”اللبوات“ میں اور مجد الف ثانی نے اپنے مکتوبات میں مختلف انداز اور اسلوب سے اس موضوع پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ وحی کسی ارفع ذہانت یا کسی گہرے داخلی احساس کا نام نہیں ہے کیوں کہ اس صورت میں وہ خطا کے امکان سے ماورا نہیں ہو سکتی۔ دوسرے، جو چیز کسی فرد کی اعلیٰ ذہنی و عقلی کاوش یا گہرے داخلی احساس کا نتیجہ ہو اس پر اس فرد کی شخصیت کی پرچھائیں ضرور پڑتی ہے۔ اس صورت میں وحی ایک معروضی حقیقت نہ رہے گی بلکہ ایک موضوعی معاملہ بن جائے گی۔ مجد صاحب کی تصریح کے مطابق وحی کی حجیت کی بنیادی وجہ ہی یہ ہے کہ وہ خطا کے امکان سے پاک ہوتی ہے اور اس میں فرد کے ذاتی رجحانات، داخلی کیفیات اور درونی احساسات کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ وحی کے بالمقابل داخلی کیفیات اور باطنی احساسات کی مثالیں شاعری اور صوفیانہ جذب و حال میں ملتی ہیں۔ قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر ہونے کی جو نفی کی گئی ہے اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن مجید بلند پروازی تخیل یا گہرے داخلی احساسات کا نتیجہ نہیں ہے۔

قرآن کا کلام اللہ ہونا عربوں کے فہم کا نتیجہ: منظور احمد:

ان تمام تصریحات کو نظر انداز کر کے ڈاکٹر منظور احمد، نیاز فتح پوری کی اس ملحدانہ فکر کہ قرآن، نعوذ باللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے کو سند جواز عطا فرماتے ہوئے، قرآن مجید کے لفظ لفظ کو کلام الہی ماننے والوں کے موقف کو ”ایمانی“ یعنی غیر علمی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”بات دراصل یہ ہے کہ انسان اپنے زمان و مکان کی کلی علمی کائنات [Universe of

Knowledge] سے باہر نکل کر نہیں سوچ سکتا، جس طرح اب سے چودہ سو سال پہلے

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۴۴۹

قرآن مجید کلام اللہ نہیں، کلام رسول اللہ ہے۔ [نعوذ باللہ]

عربوں کے لیے ناممکن تھا کہ وہ قرآن کو خدا کا کلام اسی طرح مانیں جس طرح ان کا اپنا کلام ہوتا ہے، اس طرح آج کے ذہن کے لیے اس بات کو عربوں کی طرح تسلیم کرنا بعید از قیاس ہے۔ یہ ایمانی عمل کی حیثیت سے تو تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن اس بات کو ایک علمی قضیے کے طور پر پیش کرنا آج کی علمی فضا میں ممکن نہیں۔<sup>۱</sup>

قرآن مجید کے کلام الہی ہونے کا عقیدہ کوئی استنباطی و استخراجی قضیہ نہیں ہے، جو زمان و مکاں میں محصور ہو اور جس میں خطا و صواب دونوں کا احتمال و امکان پایا جائے۔ قرآن کے لفظ لفظ کا ما انزل اللہ ہونا قرآن کی عبارت النص سے ثابت ہے اور امت مسلمہ متواتر اور مسلسل اس عقیدے پر ایمان رکھتی چلی آرہی ہے اور آئندہ بھی اسی کی مکلف ہے۔ مگر ڈاکٹر منظور احمد صاحب اس عقیدے کی صراحت اور حتمیت کی شدت کو ہلکا باور کرانے کے لیے اسے زمان و مکاں میں محصور و محدود محض عربوں کے فہم کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں۔

دوسرے، ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کے مطابق قرآن مجید کے لفظ لفظ کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمودہ ہونا ”ایمانی عمل“ کی حیثیت سے تو تسلیم کیا جاسکتا ہے مگر اس بات کو علمی قضیے کے طور پر پیش کرنا آج کی علمی فضا میں ممکن نہیں۔ اس سے بہ ظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر منظور احمد صاحب بھی نیاز فتح پوری کی طرح ”آج کی علمی فضا“ کے مطابق قرآن مجید کو کلام اللہ نہیں بلکہ کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے ہیں۔ واضح رہے کہ کسی قضیے کے ایمانی ہونے کا مفہوم ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ ہے کہ اس کا تعلق حقیقت سے نہیں بلکہ انسان کی ذاتی پسند و ناپسند سے ہوتا ہے اور ایمان کے لیے تو یہ بھی ضروری نہیں کہ جس پر ایمان رکھتا ہو اس کا وجود بھی ہے یا نہیں۔<sup>۲</sup>

کیا اس سے اس خیال کو تقویت نہیں ملتی کہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب بھی نیاز فتح پوری کی طرح قرآن مجید کو کلام اللہ نہیں بلکہ کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے ہیں۔ نعوذ باللہ۔

۱- منظور احمد، ”نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام“، مشمولہ سہ ماہی المعارف، صفحہ ۶۹۔

۲- منظور احمد، ”چند تعلیمی مسائل“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۱۸۰۔



## مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی — ”مجاہد اسلام اور عاشق رسول“ [نعوذ باللہ]

حریف نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے ”بیسویں صدی کے صف اول کے روشن خیال اسلامی مفکر“ نیاز فتح پوری کے افکار و ارشادات ماہ نامہ ”نگار“ سے ملاحظہ کیجیے:

[۱] ”سب سے بڑا الزام احمدیوں پر یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الرسل تسلیم نہیں کرتے۔ یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی، کیوں کہ اگر یہ سچ ہو تو بھی کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اس جرم میں انہیں وار پر چڑھا دے، جب کہ پاکستان کی غیر مسلم لاکھوں آبادی رسول اللہ کو رسول ہی تسلیم نہیں کرتی چہ جائیکہ انہیں خاتم الرسل سمجھنا۔ اور ان کو [قابل] گردن زدنی نہیں سمجھا جاتا۔ اس سلسلے میں مجھے احمدی جماعت کے لٹریچر دیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور میں نے جب مرزا صاحب کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا تو میں اور زیادہ حیران ہوا کیوں کہ مجھے ان کی کوئی تحریر ایسی نہیں ملی جس سے اس الزام کی تصدیق ہو سکتی، بلکہ برخلاف اس کے میں نے ان کو ختم رسالت کا اقرار کرنے والا اور صحیح معنی میں عاشق رسول پایا۔ اسی کے ساتھ میں نے مرزا صاحب کی زندگی کا مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ یقیناً بڑے مخلص، بڑے باعمل، بڑے عزم و ہمت والے انسان تھے اور انہوں نے مذہب کی صحیح روح کو سمجھ کر اسلام کی وہی عملی تعلیم پیش کی جو عہد نبوی اور خلفائے راشدین کے زمانے میں پائی جاتی تھی۔ میں نے ان کے مخالفین کی بھی تحریریں پڑھیں، جن میں مرزا صاحب کو کافر، ملعون اور مکاروغدار کہا گیا ہے، لیکن میں نے ان کی تحریروں میں مطلقاً کوئی وزن نہیں پایا۔“

[۲] ”پھر جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس جماعت کی یہ عزیمت و تنظیم نتیجہ ہے صرف مرزا صاحب کی بلند شخصیت کا تو پھر وہ مجھے مہدی موعود سے بھی زیادہ اُونچے نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ اول تو ظہور مہدی کا عقیدہ ہی سرے سے بے معنی سی بات ہے لیکن اگر کبھی وہ تشریف بھی لائے تو شاید اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکیں گے جو مرزا صاحب نے کر دکھایا۔“

۱- نیاز فتح پوری، ”ملاحظات“ مشمولہ ماہ نامہ ”نگار“، نومبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۳۳؛ عکسی نقل کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا صفحہ ۲۷۸۔

۲- ایضاً۔

مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی ————— ”مجاہد اسلام اور عاشق رسول“

[۳] ”مرزا غلام احمد صاحب نے اسلام کی مدافعت کی اور اس وقت کی جب کوئی بڑے سے بڑا عالم دین بھی دشمنوں کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا، انھوں نے سوتے ہوئے مسلمانوں کو جگایا، اٹھایا اور چلایا، یہاں تک کہ وہ چل پڑے اور ایسا چل پڑے کہ آج روئے زمین کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ان کے نشاتِ قدم سے خالی ہو اور جہاں وہ اسلام کی صحیح تعلیم نہ پیش کر رہے ہوں..... میں تو یہ کہنے اور سمجھنے پر مجبور ہوں کہ یقیناً بہت بڑا انسان تھا وہ جس نے ایسے سخت وقت میں اسلام کی جاں بازانہ مدافعت کی اور قرونِ اولیٰ کی اُس تعلیم کو زندہ کیا جس کو دنیا بالکل فراموش کر چکی تھی“۔

[۴] ”رہا یہ امر کہ مرزا صاحب نے خود اپنے آپ کو کیا ظاہر کیا۔ سو یہ چنداں قابلِ لحاظ نہیں، کیوں کہ اصل سوال یہ نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو کیا کہا، بلکہ صرف یہ کہ کیا کیا اور یہ اتنی بڑی بات ہے کہ اس کے پیش نظر [قطع نظر روایات و اصطلاحات سے] مرزا صاحب کو حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو مہدی کہیں کیوں کہ وہ ہدایت یافتہ تھے، مثیلِ مسیح کہیں کیوں کہ وہ روحانی امراض کے معالج تھے اور ظنِ نبی کہیں کیوں کہ وہ رسول کے قدم بہ قدم چلتے تھے“۔

[۵] ”رہی برنی صاحب کی کتاب سوا اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ جس حد تک بانی احمدیت کی زندگی و تعلیم احمدیت کا تعلق ہے وہ تلبیس و کتمانِ حقیقت کے سوا کچھ نہیں۔ اور مجھے سخت افسوس ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ احمدیت کے مخالفین مرزا غلام احمد صاحب سے بہت سی ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جو انھوں نے کبھی نہیں کہیں، خصوصیت کے ساتھ مسئلہ ختم نبوت کہ عام طور پر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ مرزا صاحب رسول اللہ کو خاتم النبیین نہیں سمجھتے تھے، حالاں کہ وہ شدت سے اس کے قائل تھے کہ شرعی نبوت ہمیشہ کے لیے رسول اللہ پر ختم ہو گئی اور شریعتِ اسلام دنیا کی آخری شریعت ہے“۔

[۶] ”جس وقت میں نے حضرت مرزا صاحب کے بیت الفکر، بیت الدعاء، بیت الریاضت، مسجد نور، مسجد اقصیٰ اور منارہٴ مسیح کو دیکھا تو اُن کی وہ تمام خدمات سامنے آ گئیں جو تحفظِ اسلام کے سلسلے میں ایک غیر منقطع جدوجہد کے ساتھ ہزاروں مصائب کو جھیل کر انھوں نے انجام دی تھیں اور جن کے فیوض اس وقت بھی دنیا کے دور دراز گوشوں میں جاری ہیں..... میں نے یہاں سے رخصت ہوتے وقت اُس قطعہ زمین کو بھی دیکھا، جہاں حضرت مرزا غلام احمد صاحب آسودہ خواب ہیں اور اُن کی وہ تمام مجاہدانہ زندگی سامنے آ گئی، جس کی کوئی دوسری نظیر مجھے اس دور میں تو کہیں نظر آتی نہیں“۔

۱- نیاز فتح پوری، ”باب الاستفسار“، مشمولہ ماہ نامہ ”نگار“، اکتوبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۳۵؛ عکسی نقل کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا صفحہ ۲۸۔

۲- ایضاً۔

۳- ایضاً۔

۴- نیاز فتح پوری، ”چند گھنٹے قادیان میں“، مشمولہ ماہ نامہ ”نگار“، ستمبر ۱۹۶۰ء، صفحہ ۲۳؛ عکسی نقل کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا صفحہ ۲۸۲۔

[۷] ”اس وقت تک بانی احمدیت کا جو کچھ مطالعہ میں نے کیا ہے، اور میں کیا جو کوئی خلوص و صداقت کے ساتھ اُن کے حالات و کردار کا مطالعہ کرے گا، اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ صحیح معنی میں عاشق رسول تھے، اور اسلام کا بڑا مخلصانہ درد اپنے دل میں رکھتے تھے“۔

یہ ہیں نیاز فتح پوری کے مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں افکار و خیالات — نیاز صاحب اس شخص کی زندگی ”مجاہدانہ“ قرار دے رہے ہیں جس نے تین سو جہاد کا اعلان کیا اور ساری عمر برٹش سرکار کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے اس کے سائے میں بسر کی۔ نیاز صاحب کا کہنا ہے کہ مرزا قادیانی نے اسلام کی حمایت و مدافعت اس وقت کی جب بڑے سے بڑا عالم دشمنوں کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ یہ بہت بڑا کذب ہے یا پھر بر عظیم میں دفاع اسلام کی تاریخ، اور اصلاح و تجدید کے علم برداروں کے علمی و عملی کارناموں اور مساعی جمیلہ سے ناواقفیت — یہ بات ٹھیک ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی عوامی زندگی کا آغاز ایک ”مناظر“ کے طور کیا تھا اور عیسائی پادریوں اور آریہ سماجی پنڈتوں کے مقابلے میں اسلام کی حقانیت پر سینکڑوں دلائل دینے کا دعویٰ کیا تھا۔ مخالفین کو جارحانہ لہجے میں خطاب کرنے، پچاس جلدوں میں حقانیت اسلام پر ”براہین احمدیہ“ کی تالیف کے دعوے، جو پانچ جلدوں سے آگے نہ بڑھ سکی، اور ”سُر مہ چشم آریہ“ کی تالیف نے نہ صرف ان کے نام کو گورداسپور کے ایک گم نام قصبے ”قادیان“ سے نکال کر بر عظیم کے ایک بڑے حصے میں پھیلا دیا اور ساتھ ہی مجروح قلوب اور وقت اور حالات کے ستم رسیدہ لوگوں کے دلوں کو بھی ان کی ”وکالت“ کے باعث وا کر دیا۔

مرزا قادیانی: ”حمایت اسلام“ کے لیے دیگر اہل علم سے استفادہ:

مرزا قادیانی نے ”ابطال مذاہب باطلہ“ اور ”حمایت اسلام“ میں جو کچھ تحریر کیا ہے، وہ ان کے معاصر اہل قلم کی تحریروں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، بلکہ مرزا قادیانی کے ہاں اپنے معاصر اہل قلم سے ”استفادے“ اور ”سرقے“ کے مستقل شواہد موجود ہیں۔ مثلاً سر سید احمد خان کے حلقے میں مولوی چراغ علی صاحب [م ۱۸۹۵ء] ایک معروف شخصیت تھی، ان کے انتقال کے بعد ان کے کاغذات میں مرزا غلام احمد قادیانی کے کئی خطوط ملے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا قادیانی کی بہ ذریعہ مراسلت مولوی چراغ علی صاحب سے علمی استفادے کی مستقل عادت تھی، مولوی چراغ علی کے نام ایک خط میں مرزا قادیانی نے لکھا:

”جب آپ سا اولوالعزم، صاحب فضیلت دینی دنیوی تہ دل سے حامی اور تائید دین حق میں دلی گرمی کا اظہار فرمائے تو بلا شائبہ ریب اس کو تائید غیبی خیال کرنا چاہیے۔  
 ما سو اس کے اگر اب تک کچھ دلائل یا مضامین آپ نے نتائج طبع عالی سے جمع فرمائے ہوں تو وہ بھی مرحمت ہوں“۔

۱- نیاز فتح پوری، ”ملاحظات“، مشمولہ ماہ نامہ ”نگار“، جولائی ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۱۹، عکسی نقل کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا صفحہ ۴۸۴۔

۲- محمد یحییٰ تنہا، سیرا مصنفین، دہلی: مکتبہ جامعہ ملیہ [س-ن]، جلد ۲، صفحہ ۱۱۹۔

دیگر حضرات کے مضامین کا انتظار، نہایت لجاجت اور عاجزی کے ساتھ ان کی طلب ایک ایسے انسان کے ہرگز لائق نہیں جو آسمانی امامت کا مدعی اور الہامی علوم کے القا کا دعوے دار ہو۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب [آنریری سیکرٹری انجمن ترقی اردو] مولوی چراغ علی صاحب کے حالات میں لکھتے ہیں:

”جس وقت ہم مولوی صاحب مرحوم کے حالات کی جستجو میں تھے، تو ہمیں مولوی صاحب کے کاغذات میں سے چند خطوط مرزا غلام احمد قادیانی صاحب مرحوم کے بھی ملے جو انہوں نے مولوی صاحب کو لکھے تھے اور اپنی مشہور اور پرزور کتاب براہین احمدیہ کی تالیف میں مدد طلب کی تھی۔“

ان اقتباسات سے مرزا غلام احمد قادیانی کی دیانت داری کی قلعی کھلی جاتی ہے کہ یہ کیسا ملہم ربتانی اور مامور آسمانی ہے جو اہل زمین سے علمی مضامین لے کر انہیں آسمانی عنایت بتلاتا ہے۔

مرزا قادیانی دفاع اسلام کی آڑ میں غیر مسلموں کی مقدس شخصیات پر ناروا حملے کر کے، نعوذ باللہ، اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخوں اور تبرے کا سبب بنا۔ جو گستاخ اس درجے بد زبان اور بے لگام ہو کہ حضرت سیدنا مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تین دادیوں اور نانیوں کو، نعوذ باللہ، زنا کار اور کسی بتلاتے ہوئے شرم نہ کرتا ہو۔ جس کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کو کبھیوں سے میلان اور صحبت رہی ہو، ایک متقی انسان کی صفت سے وہ عاری ہوں، زنا کار اور کسبیاں زنا کاری کا پلید عطران کے سر پر اور اپنے بالوں کو ان کے پاؤں پر ملتی ہوں، سبجو معجزات مسیح کو ”سامری کے گنو سالہ“ سے زیادہ اہمیت و حیثیت نہ دیتا ہو۔ سبجو خود کو حضرت مسیح علیہ السلام سے اپنی تمام شانوں سے بڑھ کر بتلاتا ہو۔ سبجو خود کو بعینہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتلاتے ہوئے حیا محسوس نہ کرتا ہو۔ سبجو خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ”اکمل“ اور پہلی شان سے بڑھ کر قرار دیئے جانے پر خوش ہوتا ہو۔ سبجو عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو محض تائیدات اور دفع بلیات کا اور مرزا قادیانی کے زمانے کو برکات کا زمانہ ٹھہراتا ہو۔<sup>۵</sup>

- ۱- مولوی عبدالحق، چند ہم عصر، کراچی: ناظم پریس، ۱۹۵۰ء، صفحہ ۲۸۔
- ۲- ”پرمیشرٹاف سے دس انگلی نیچے ہے [سمجھنے والے سمجھ لیں]۔“ مرزا غلام احمد قادیانی، چشمہ معرفت، قادیان: مطبع انوار احمدیہ، ۱۹۰۸ء، صفحہ ۱۰۶۔
- ۳- مرزا غلام احمد قادیانی، انجام آفتہم، قادیان: مطبع ضیاء الاسلام، [س-ن]، صفحہ ۷۔
- ۴- مرزا غلام احمد قادیانی، ازالہ اوہام، امرتسر: مطبع ریاض ہند، ۱۳۰۸ھ، جلد اول، صفحہ ۱۵۳-۱۵۵۔
- ۵- ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو اس سے بہتر غلام احمد ہے
- مرزا غلام احمد قادیانی، دفع البلاء و معیار اہل الاصفاء، قادیان: مطبع ضیاء الاسلام، ۱۹۰۲ء، صفحہ ۲۰۔
- ۶- ”حق یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی وہ پاک وحی جو میرے پرنازل ہوتی ہے۔ اس میں ایسے الفاظ، رسول اور مرسل اور نبی کے موجود ہیں نہ ایک دفعہ بلکہ صد ہا دفعہ۔“ مرزا غلام احمد قادیانی، ایک غلطی کا ازالہ، جھنگ: ناظر تالیف و تصنیف پبلیشرز [س-ن]، صفحہ ۳۔
- ۷- محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں اور آگے سے بڑھ کر ہیں اپنی شاں میں محمد دیکھنے ہوں جس نے اکمل غلام احمد کو دیکھے قادیان میں
- اخبار بدر، جلد ۲ نمبر ۳۷، ۲۶، ۲۷ فروری ۱۹۲۳ء۔
- ۸- مرزا غلام احمد قادیانی، مجموعہ اشتہارات، ربوہ: الشركة الاسلامیہ، [س-ن]، جلد ۲۔

جسے حضرت علیؑ کو ”مردہ“ اور خود کو ”زندہ علی“ کہتے ہوئے شرم نہ آتی ہو، بلجو صد حسین است در گریبانم کا نعرہ لگاتا ہو، جو معاذ اللہ، کہتا ہو کہ خاتونِ جنت سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا نے، معاذ اللہ، اپنی ران پر میرا سر رکھا اور مجھے دکھایا کہ میں اس میں سے ہوں بلجو علما و صلحا کو شیطان، اعمی، غول، شقی اور ملعون قرار دیتا ہو جس کی نظر میں پوری امت مسلمہ خنزیر اور ان کی مائیں، بہنیں اور بیٹیاں [جن میں میری طرح ڈاکٹر منظور احمد صاحب کی والدہ، بہنیں اور بیٹیاں بھی شامل ہیں] کتّیوں اور کنجریوں کے لقب سے ملقب ہوں۔ جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تاج و تختِ نبوت پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی ہو، انبیا کی عصمت پر شگاف ڈالا ہو، ازواجِ مطہرات کی عفت پر سیاہی پھینکی ہو، صحابہؓ اور اہل بیتؓ کے تقدس کو پامال کیا ہو، علما و صلحا کی دستاروں کو اچھالا ہو، پوری امت کی تکفیر، تھلیل، تسفیق اور تحمیق کی ہو، انھیں ”حرام زادہ“ کہا ہو۔ جس نے کہا ہو کہ میں نے الہام میں خود کو عورت کے روپ میں دیکھا اور اللہ

- ۱- ”پرانی خلافت کا جھگڑا چھوڑو۔ اب نئی خلافت لو۔ ایک زندہ علی تم میں موجود ہے، اس کو چھوڑتے ہو اور مردہ علی کی تلاش کرتے ہو۔“ مرزا غلام احمد قادیانی، ملفوظات احمدیہ، لاہور: احمدیہ انجمن اشاعت اسلام، [س-ن]، جلد ۱، صفحہ ۱۳۱۔
- ۲- کربلائے است سیر ہر آنم صد حسین است در گریبانم مرزا غلام احمد قادیانی، نزول المسیح، قادیان: مطبع ضیاء الاسلام، ۱۹۰۹ء، صفحہ ۹۹۔
- ۳- ”حضرت فاطمہؓ نے کشفی حالت میں اپنی ران پر میرا سر رکھا اور مجھے دکھایا کہ میں اس میں سے ہوں۔“ مرزا غلام احمد قادیانی، ایک غلطی کا ازالہ، صفحہ ۱۱۔
- ۴- پیر مہر علی شاہ: ”مجھے ایک کتاب کذاب [مہر علی شاہ] کی طرف پہنچی ہے، وہ خبیث کتاب اور بچھو کی طرح نیش زن۔ پس میں نے کہا اے گولڑہ کی زمین تجھ پر لعنت تو ملعون کے سبب ملعون ہوگئی پس تو قیامت کو ہلاکت میں پڑے گی۔“ مرزا غلام احمد قادیانی، اعجاز احمدی، قادیان: مطبع ضیاء الاسلام، ۱۹۰۲ء، صفحہ ۱۸۸۔
- مولانا محمد حسین بٹالوی: ”کذاب، متکبر، سربراہ گمراہان، شیخ احمقان، عقل کا دشمن، بد بخت، طالع، منحوس، لاف زن، گمراہ شیخ، معری۔“ مرزا غلام احمد قادیانی، انجام آتھم، صفحات ۲۳۱-۲۳۲۔
- مولانا رشید احمد گنگوہی: ”اندھا، شیطان، گمراہ دیو، شقی، ملعون۔“ ایضاً، صفحہ ۲۵۲۔
- مولانا سعد اللہ: ”اور میں اسے ایک فاسق آدمی دیکھتا ہوں کہ ایک شیطان ملعون ہے، سفیہوں کا نطقہ، بدگو ہے اور خبیث اور مفسد اور جھوٹ کو طمع کر کے دکھانے والا منحوس ہے، جس کا نام جاہلوں نے سعد اللہ رکھا ہے۔“ مرزا غلام احمد قادیانی، حقیقہ الوحی، قادیان: مطبع میگزین، ۱۹۰۷ء، صفحہ ۲۲۵۔
- ۵- ان العدا صارو خنازیر الفلا و نساء ہم من دونہن الا کلب ”دشمن ہمارے بیابانوں کے خنزیر ہو گئے اور ان کی عورتیں کتّیوں سے بڑھ گئی ہیں۔“ مرزا غلام احمد قادیانی، نجم الہدیٰ، قادیان: مطبع ضیاء الاسلام [س-ن]، صفحہ ۵۳۔
- ۶- تلک کتب ينظر اليها كل مسلم بين المحبة والمودة وينفع من معاد فها و يقبلني و يصدقني دعوتی الا ذرية البغايا۔ ”میری ان کتابوں کو ہر مسلمان محبت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کے معارف سے فائدہ اٹھاتا ہے اور میری دعوت کی تصدیق کرتا ہے، مگر کنجریوں کی اولاد نے میری تصدیق نہیں کی۔“ مرزا غلام احمد قادیانی، آئینہ کمالات اسلام، قادیان: مطبع ریاض ہند، ۱۸۹۳ء، صفحات ۴۵۷-۵۲۸۔

نے رجولیت کی طاقت کا اظہار فرمایا۔<sup>۱</sup>

نیاز فتح پوری کے نزدیک ایسے شخص نے دین اور اسلام کی حفاظت و مدافعت کا حق ادا کیا، سوتے ہوئے مسلمانوں کو جگایا، قرونِ اولیٰ کی تعلیم کو زندہ کیا، وہ صحیح معنوں میں ”عاشق رسول“ تھا اور اسے یہ حق حاصل تھا کہ وہ خود کو ”مہدی معبود“ اور ”مثیل مسیح“ قرار دے — اسلام اور اہل اسلام سے متعلق نیاز فتح پوری کی ذکر فرمودہ قلم فرسائیوں اور محاسمانہ و معاندانہ رویے کی پیش نظر بات اتنی تعجب خیز نہیں۔ ظاہر ہے جو شخص قرآن مجید کو انسانی دماغی کاوش کا نتیجہ قرار دیتا ہو، صحیح احادیث کا انکار کرتا ہو، اسلام کو نامکمل شریعت تصور کرتا ہو، حیات بعد الحیات، حشر و نشر، جنت و جہنم کا انکار ہی نہیں، تمسخر و استہزا اڑاتا ہو۔ وہ اگر مرزا غلام احمد قادیانی کو ”مجاہد اسلام“ اور ”عاشق رسول“ قرار دے دے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مسخرے نے اپنے سفیہانہ افکار کی فہرست میں چند مزید نکات کا اضافہ کر لیا۔ اصل حیرت تو جناب ڈاکٹر منظور احمد پر ہے کہ وہ نیاز فتح پوری صاحب کی تمام خرافات کو ان کی ”عقلیت پسندی“ کا نتیجہ ٹھہراتے ہیں، ان کے بنیادی نظریات کو درست قرار دیتے ہیں ڈاکٹر صاحب اس بات کے خواہاں ہیں کہ نیاز فتح پوری کو ”بیسویں صدی کے روشن خیال اسلامی مفکرین کی صفِ اول“ میں جگہ دی جائے اور ان کے تمام الحادی افکار و نظریات کو اسلام ہی کی ”ایک اور تفہیم“ کی حیثیت سے قبول کیا جائے۔ صفحات گزشتہ میں نیاز کی کتابوں کے اقتباسات کو پڑھنے کے بعد ان کا اسلامی مفکر ہونا تو دور کی بات ہے مسلمان ہونا بھی محال نظر ہے۔

اسلام، اسلامی عقائد اور اسلامی لٹریچر سے متعلق نیاز فتح پوری کے محاسمانہ اور معاندانہ افکار و خیالات ان ہی کی محکم تحریرات اور اقتباسات سے بیان کیے جا چکے۔ یہ تصویر کا ایک رُخ ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو شخص اپنی ناقدانہ طبیعت کے باعث اسلام کو دینِ کامل ماننے کو تیار نہ ہو، خدا، عقائد اور مذہب کو انسانی ذہن کی تخلیق قرار دیتا ہو۔ صحائف آسمانی خصوصاً قرآن مجید کو انبیاء کا کلام باور کرانا ہو۔ حیات بعد الموت، معاد اور جنت و جہنم کا منکر ہو بلکہ تمسخر اڑاتا ہو۔ وہی شخص منکر ختم نبوت اور مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کو نہ صرف مسلمان، عاشق رسول بلکہ مہدی معبود اور مسیح موعود تک مانتا ہے۔ جو ایک طرف انبیائے کرام علیہم السلام کو ”زیادہ کامیاب“ ماننے کے لیے تیار نہیں مگر مرزا غلام احمد قادیانی کو ”منزل پایا ہوا“ باور کراتا ہے۔ جس شخص کا قلم بارگاہ رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام میں بھی حد ادب ملحوظ نہیں رکھتا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کے ساتھ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“ کے اضافے یا کم از کم

۱- ”جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک موقع پر اپنی حالت یہ ظاہر فرمائی ہے کہ کشف کی حالت آپ پر اس طرح طاری ہوئی کہ گویا آپ عورت ہیں اور اللہ تعالیٰ نے رجولیت کی طاقت کا اظہار فرمایا تھا“۔

قاضی یار محمد، اسلامی قربانی، ضلع کانگرہ ریاض ہند، ۱۹۱۰ء، صفحہ ۱۳۔

۲- تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے منظور احمد صاحب کانٹروپو، روزنامہ ایکسپریس اسلام آباد، ۵ ستمبر ۲۰۰۷ء، صفحہ ۶۔

”ص“ بلکہ نام مبارک سے قبل ”حضرت“ تک لکھنے کا روادار نہیں ہے، بلکہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا جھجک اور بے کھٹکے نعوذ باللہ صرف محمد، محمد سے خطاب کرتا ہے۔ لیکن مرزا غلام احمد قادیانی کو ”حضرت مرزا صاحب“ یا ”حضرت مرزا غلام احمد قادیانی صاحب“ کے خطاب والقباب سے یاد کرتا ہے۔ مرزا غلام احمد کی اس قدر تعریف اور اور زلہ رُبائی کسی غلط فہمی یا سچ تحقیق پر مبنی نہیں تھی بلکہ اس کے پس پشت کچھ اور ہی محرکات تھے۔ نیاز فتح پوری کی زندگی کے اس تاریک رُخ سے پردہ اٹھاتے ہوئے ماہر القادری لکھتے ہیں:

”عمر کے آخری حصے میں نیاز فتح پوری کے قلم کو یہ کالک بھی لگ کر رہی کہ انھیں ”قادیان“ بلایا گیا، وہاں ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی اور اس مہمان نوازی اور میزبانی میں خالی عزت و تکریم ہی نہیں، فتوحات بھی شریک تھیں۔ قادیانیوں کے اس کرم اور نوازش کا انھوں نے بدلہ اس طرح ادا کیا کہ اپنے محلے ”نگار“ میں مرزا غلام احمد قادیانی کی خوب خوب تعریفیں کیں اور اس حریف نبوت اور نبی کا ذب کو ”عاشق رسول“ تک لکھ دیا۔“

اسلام کے مربوط فقہی اور افتائی نظام اور عوام الناس کے علما کے ساتھ ارتباط و اعتماد سے ڈاکٹر منظور احمد صاحب نہایت بیزار ہیں کہ علما کے اس ”تسلط“ کے باعث دین اور اسلام کے متعلق نفس کا مکمل اظہار ممکن نہیں رہتا۔ ڈاکٹر صاحب اس بات کے متنبی ہیں کہ علما و فقہاء کی رواداری ضد اور معکوس تک وسیع ہونی چاہیے، یعنی علما میں اسلام اور کفر دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھنے اور برداشت کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے کفریات و مغالطات سے محض اس لیے صرف نظر کر لیا جائے کہ وہ نیاز فتح پوری کو ”عینِ اسلامی“ نظر آتے ہیں، بلکہ تنوع کا اظہار یہاں تک ہونا چاہیے کہ مرزا غلام قادیانی کو مسلمان ہی نہیں ”مجاہد اسلام“ اور ”عاشق رسول“ بھی مانا جائے ورنہ کم سے کم دوسرے کے ماننے کے حق کو تو ضرور بالضرور تسلیم کیا جائے۔ اسی طرح نیاز فتح پوری کو ان کی تمام تر خرافات و ہذیانات سے نظر انداز کر کے محض ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے اصرار اور مطالبے پر ”بیسویں صدی کا روشن خیال اسلامی مفکر“ مان لیا جائے اور نیاز کے طحڑانہ افکار و خیالات کو اسلام ہی کی ”ایک اور تفہیم“ کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے اور بالفرض اسے رد بھی کرنا ہو تو ایسے جیسے راجح مرجوح اقوال میں قرآن و شواہد کی بنا پر ایک رائے کو [احتمال خطا کے امکان کے ساتھ] راجح قرار دیا جاتا ہے اور دوسری کو [امکان صواب کے احتمال کے ساتھ] مرجوح۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو علما کے فتاویٰ سے بیزار ڈاکٹر صاحب خود مسند افتا پر براجمان ہو کر علما کو تنگ نظر، جمود کا شکار اور اکیسویں صدی کے تقاضوں سے بے خبر ہونے کا ”فتویٰ“ صادر فرمادیتے ہیں۔

1- نیاز فتح پوری، من و یزداں، صفحات ۱۶۳، ۲۶۵، ۳۳۷۔

2- ماہر القادری، یاد رفتگان، حصہ دوم، صفحہ ۲۳۰۔

مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی — ”مجاہد اسلام اور عاشق رسول“ —

اپنے ایک انٹرویو میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں صاف اور صریح لفظوں میں ارشاد فرماتے ہیں:

”اسلام وہ نہیں جس کا درس مودودی صاحب دیا کرتے تھے گو ان کا مقصد نیک تھا“۔<sup>۱</sup>  
ایک نمونہ اور ملاحظہ فرمائیے، ڈاکٹر منظور احمد لکھتے ہیں:

”بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ دنیا کی تقریباً چوتھائی آبادی کے اس جم غفیر میں اور قیادت اور رہنمائی کے مناصب پر جو لوگ فائز ہیں ان کو ذہنی استطاعت کی وہ اقل مقدار فراہم نہیں ہے جو معاشرتی تبدیلیوں کے لیے ایک نئی منصوبہ سازی کر سکتی ہو۔ خاص طور پر ہمارے مذہبی رہنما چند پیش پا افتادہ نعروں کی مدد سے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی عقدہ کشائی میں مصروف ہیں، یہ جانے بغیر کہ اکیسویں صدی کے معاشرے اس طرح تشکیل نہیں پاتے۔ بہ حیثیت مجموعی مسلم اُمہ کی مثال گوسفندوں کے ایک گلے کی ہے“۔<sup>۲</sup>

چلیے مودودی صاحب کا درس تو ”منافی اسلام“ تھا اور علما پیش پا افتادہ نعروں پر انحصار کر کے منزل کی طرف آگے بڑھنے کی خام خیالی میں مبتلا ہیں، انہیں حقیقت حال اور درپیش صورت کی سنگینی کا اندازہ ہی نہیں۔ مگر ڈاکٹر منظور احمد تو اکیسویں صدی کے تقاضوں سے باخبر ہیں، انہیں تو پتا ہے کہ اکیسویں صدی کے معاشرے کس طرح تشکیل پاتے ہیں، وہ یہ یقین رکھتے ہیں اور بیان کر چکے ہیں کہ احکام کی عقلی توجیہ کے بغیر بدلے ہوئے زمانوں میں مذہب کا قابل قبول ہونا ممکن نہیں، تو بہ صد احترام سوال ہے کہ ڈاکٹر منظور صاحب نے کم و بیش نصف صدی کی علمی زندگی میں، دین اور مذہب پر قلم آزمائی کے باوجود، اب تک ایسی کون سی خدمت انجام دی ہے؟ اسلام کے دفاع اور جدید ذہن میں پیدا ہونے والی تشکیک کے ازالے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے کیا کچھ تحریر فرمایا ہے؟ مولوی تو اپنی بساط و استعداد کے مطابق کامل یا ناقص، درست یا غلط کام کر رہے ہیں، اُس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، اُسے رد کیا جاسکتا ہے، مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ علما دامن جھاڑ کے حالات و معاملات سے الگ ہو بیٹھے ہیں۔ یہ علما اور صوفیہ ہی کا فیضان تھا کہ بزرگ عظیم میں دو صدیوں پر محیط غلامی ہندی مسلمانوں کے دینی طرز احساس اور مذہبی تشخص و سالمیت کو متاثر نہ کر سکی۔ اس اعزاز میں ہندی مسلمان منفرد ہیں۔ اور آج تو دین و مذہب سے اس نخلے کے مسلمانوں کی وابستگی ضرب المثل بن چکی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب جہاں علما کے طریق استدلال کی خامیاں نکالنے، انہیں اجتہاد کا سبق پڑھانے اور تصور خدا سمجھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو اب تک وہ خود کیوں اس خدمت و سعادت سے محروم رہے؟ آخر ڈاکٹر صاحب بھی تو مسلمان ہونے کے مدعی ہیں، اسلام کا جیسا حق مولوی پر ہے ویسا ڈاکٹر منظور احمد پر بھی ہے، ڈاکٹر صاحب ایک سلسلہ تصانیف ”اسلام — چند عقلی مباحث“ کے نام سے شروع فرماتے اور مولویوں پر ثابت کرتے کہ جناب ایوں

۱- روزنامہ ایکسپریس، اسلام آباد، ۵ ستمبر ۲۰۰۷ء۔

۲- منظور احمد، یادوں کی تسبیح، [مؤلف: قاضی عبدالقادر]، کراچی: مکتبہ الہدیٰ، ۲۰۰۸ء، صفحہ ۱۴۔



مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی — ”مجاہد اسلام اور عاشق رسول“ —

اسلام پر عائد کردہ الزامات اور اعتراضات کے جواب دیئے جاتے ہیں اور اکیسویں صدی کے تقاضوں کے مطابق اسلام کو یوں پیش کیا جانا چاہیے۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی علمی و قلمی زندگی ایسے کسی کام کا ثبوت فراہم نہیں کرتی۔ اسلام اور مذہب کو تو رکھیے ایک طرف، خود فلسفہ جدید کی تفہیم و تشریح [جس کی خدمت پر ڈاکٹر صاحب سرکاری طور پر مامور تھے] میں تا حال منظور احمد کا کوئی قابل ذکر کام نہیں۔ نیاز فتح پوری کا نام لے کر، اُن کے مردہ افکار و نظریات کو از سر نو بیان کر کے اُمت مسلمہ میں تشکیک و ارتباب پیدا کرنا کون سی دینی اور اسلامی خدمت ہے؟

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۴۵۹

ضمیمہ

## علامہ نیاز فتح پوری — عبرت کا ایک ورق مولانا عتیق الرحمن سنبھلی

نیاز فتح پوری [۱۸۸۳ء-۱۹۶۶ء] ایک صاحب طرز ادیب تھے اور اردو ادب میں رومانوی تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ ابتدا میں افسانہ نگاری اور بعد میں تاریخی، دینی اور ادبی موضوعات پر قلم آزمائی کی۔ نیاز نے بھوپال سے فروری ۱۹۲۲ء کو ماہنامہ ”نگار“ کا اجرا کیا، ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ یہیں سے انھوں نے اسلامی عقائد کی مخالفت میں وہ مضامین لکھنے شروع کیے جنھوں نے کفر و الحاد اور تشکیک و ارتیاب کے دل دادہ حلقوں میں نیاز کو ”علامہ“ بنا دیا۔ اب نیاز کے شاگرد خاص ڈاکٹر فرمان فتح پوری استاد کی کتابیں اس خیال سے بار بار شائع کرتے رہتے ہیں کہ مبادا ”روشن خیالی“ اور دانش وری“ کی یہ لکیر پٹینے والے پیدا ہونے بند ہو جائیں۔

علامہ نیاز فتح پوری ایک زمانے میں بڑی دھوم اپنے ماہنامہ ”نگار“ کے ذریعے سے مچا چکے ہیں۔ اہل دین سے چھیڑ خانی اُن کا ایک خاص ذوق تھا۔ کفر و ارتداد کے فتوے بھی اُس زمانے میں اپنے اوپر لگوائے مگر بہ قول خود دو چیزوں کے بارے میں بالکل مجبور تھے۔ ایک عورت کی طرف رغبت، دوسری مولوی سے نفرت۔ یعنی ان کی چھیڑ خانیاں اسی نفرت کے ماتحت تھیں۔ اس چھیڑ خانی میں جو مضامین وہ اسلامی موضوعات پر لکھتے تو جہاں ایک طرف اہل دین میں نفرت و ناراضی پیدا ہوتی وہاں کچھ لوگوں کی نظر میں ان کی وہ تحریریں انھیں علامہ بنا دیتیں۔ حال ہی میں ان کے اوپر ان کے رسالہ ”نگار“ کا ایک خاص نمبر [کتابی ایڈیشن] نظر پڑا جو سندھ اکیڈمی [پاکستان] نے شائع کیا ہے۔ اور کسی دوسرے کی نہیں خود ان کی اپنی تحریر سے اس باب میں ان کی ”علامت“ کے جو نمونے سامنے آئے وہ اس قابل نظر آئے کہ انھیں عبرت کے لیے نقل کر دیا جائے کہ کسی موضوع سے اپنی اچھی واقفیت کے بغیر جب کسی کے حسن تحریر اور زور بیان سے متاثر ہو کر لوگ اسے ”علامہ“ قرار دے لیتے ہیں تو کیسے کیسے لوگ اس بے احتیاطی کے نتیجے میں ”علامت“ کا منصب پالیتے ہیں۔

نیاز صاحب نے اس نمبر کے لیے اپنے مضمون میں مولویوں کے اور اپنے تعلقات کی لمبی سرگزشت بھی سنائی ہے۔ اسی کے چند ٹکڑے عبرت پاروں کا درجہ رکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں.....

”میں اپنے وطن فتح پور کے عربی مدرسے میں پڑھتا تھا۔ شرح عقائد نسفی کا سبق پڑھتا تھا۔ اس میں مسئلہ یہ آیا کہ یزید پر لعنت نازل ہے [یہاں موصوف کے بیان پر اعتماد کیا گیا ہے راقم کو یاد نہیں]۔ اس پر موصوف نے کچھ سوال اٹھایا اور استاد کو بحث و تکرار سے ناراض کر دیا تو پھر موصوف کے والد ماجدان کو مدرسے لے کر گئے اور استاذ سے اس مسئلے پر بحث کی۔ بحث تو لمبی ہے۔ جو چیز سننے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس بحث میں موصوف کے والد ماجد نے حضرت استاذ سے فرمایا کہ ”آپ کو خبر نہیں کہ شرح عقائد نسفی امویین کے عہد کی کتاب ہے جو علویین کے شدید دشمن تھے۔ اس لیے لعن یزید کے مسئلے کو اس قدر اہتمام سے بیان کیا گیا ہے۔“ علامہ صاحب نے اپنے والد کا یہ ارشاد ان کے علم و فضل کی توثیق کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس لیے کہ انھیں خود خبر نہیں تھی کہ شرح عقائد نسفی کی تصنیف اور امویین [بنی امیہ] کے عہد میں چھ سو برس کا فاصلہ ہے۔“

اسی طرح اپنے استاذ کے ساتھ اپنی ایک بحث انھوں نے یہ سنائی کہ حدیث کی کتاب ”مشکوٰۃ شریف“ کے درس میں انھوں نے استاذ سے پوچھا کہ یہ حدیث کے ساتھ اتنی لمبی چوڑی سند حدیث درج کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ خواہ مخواہ وقت اور کاغذ دونوں ضائع ہوتے ہیں۔ مگر یہ سوال بتاتا ہے کہ موصوف نے مشکوٰۃ شریف دیکھی بھی نہیں ہے اس لیے کہ اس میں سند درج نہیں ہوتی۔ حدیث کی جو اصل کتابیں بخاری اور مسلم وغیرہ ہیں۔ سندان کتابوں میں درج ہوتی ہے۔

مشکوٰۃ ہی کے حوالے سے علامہ صاحب نے فرمایا کہ ”دوران درس ایک حدیث آئی کہ ”آسمان میں ایک اڑ رہا ہے جب وہ سانس دنیا کی طرف چھوڑتا ہے تو گرمی ہو جاتی ہے اور جب سانس کھینچتا ہے تو سردی ہو جاتی ہے“۔ حالانکہ مشکوٰۃ شریف میں یا کہیں ایسی کوئی حدیث نہیں ہے۔ لیکن موصوف لکھتے ہیں کہ... یہ حدیث پڑھتے ہی باوجود ضبط کے بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا کہ غلط... یعنی انھوں نے واقعی مشکوٰۃ پڑھی تھی اور استاذ کو حتمی تھا کہ وہ حدیث کی کتابوں میں لکھی ہوئی غلط باتوں کو نہیں مان سکتے۔ کوئی حد ہے اس زبردستی کی ”علامت“ کی؟ مگر اس طرح کتنے ہی لوگ ”علامہ“ بن ہی جاتے ہیں۔“

یہاں پر ایک اور بات یاد رکھنی چاہیے کہ علامہ صاحب نے اس بحث میں ایک اور بات بھی فرمائی ہے کہ ”میں نے اس وقت تک اس حدیث کو نہیں دیکھا تھا جب تک کہ اسے شرح عقائد نسفی میں نہیں دیکھا۔“

یہاں پر ایک اور بات یاد رکھنی چاہیے کہ علامہ صاحب نے اس بحث میں ایک اور بات بھی فرمائی ہے کہ ”میں نے اس وقت تک اس حدیث کو نہیں دیکھا تھا جب تک کہ اسے شرح عقائد نسفی میں نہیں دیکھا۔“

یہاں پر ایک اور بات یاد رکھنی چاہیے کہ علامہ صاحب نے اس بحث میں ایک اور بات بھی فرمائی ہے کہ ”میں نے اس وقت تک اس حدیث کو نہیں دیکھا تھا جب تک کہ اسے شرح عقائد نسفی میں نہیں دیکھا۔“

یہاں پر ایک اور بات یاد رکھنی چاہیے کہ علامہ صاحب نے اس بحث میں ایک اور بات بھی فرمائی ہے کہ ”میں نے اس وقت تک اس حدیث کو نہیں دیکھا تھا جب تک کہ اسے شرح عقائد نسفی میں نہیں دیکھا۔“

یہاں پر ایک اور بات یاد رکھنی چاہیے کہ علامہ صاحب نے اس بحث میں ایک اور بات بھی فرمائی ہے کہ ”میں نے اس وقت تک اس حدیث کو نہیں دیکھا تھا جب تک کہ اسے شرح عقائد نسفی میں نہیں دیکھا۔“

یہاں پر ایک اور بات یاد رکھنی چاہیے کہ علامہ صاحب نے اس بحث میں ایک اور بات بھی فرمائی ہے کہ ”میں نے اس وقت تک اس حدیث کو نہیں دیکھا تھا جب تک کہ اسے شرح عقائد نسفی میں نہیں دیکھا۔“

یہاں پر ایک اور بات یاد رکھنی چاہیے کہ علامہ صاحب نے اس بحث میں ایک اور بات بھی فرمائی ہے کہ ”میں نے اس وقت تک اس حدیث کو نہیں دیکھا تھا جب تک کہ اسے شرح عقائد نسفی میں نہیں دیکھا۔“

## علامہ.....یا.....ابوجہل؟

عبدالمجید سالکؒ

پڑھے لکھے جاہلوں کے طبقے میں آج کل نیاز فتح پوری ایڈیٹر رسالہ ”نگار“ کا اسم گرامی بے حد ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے جہل کے مختلف اطراف میں اس قدر ہمہ گیری حاصل کی ہے کہ ہندوستان بھر کا کوئی پڑھا لکھا جاہل آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آپ شعر میں جاہل، ادب میں جاہل، مذہب میں جاہل، اخلاق میں جاہل، فلسفے میں جاہل، سیاسیات میں جاہل، فارسی میں جاہل، عربی میں جاہل، اردو میں جاہل، انگریزی میں جاہل، غرض دنیا کے تمام شعبہ ہائے علم میں اس قدر جاہل اور کلچر سے اس قدر محروم واقع ہوئے ہیں کہ آپ کو بے اختیار ”ابوجہل“ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ سب سے پہلے ملک آپ سے اس وقت روشناس ہوا تھا، جب آپ نے ”شاعر کا انجام“ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ جن بدقسمتوں کو اس کتاب کے مطالعے کا موقع ملا ہے اور جنہوں نے اس کے بعد ”نقاد“ میں آپ کے بعض مضامین پڑھے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ زبان اردو میں آپ نے بڑی بڑی ”جبر اتوڑ“ ترکیبوں کی بھرمار کر کے اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کی بیک وقت مٹی پلید کی ہے اور ایک ایسا انداز تحریر ایجاد کیا ہے جو معانی کے لحاظ سے تو نہیں البتہ الفاظ کے اعتبار سے ”دڑا نادرہ“ کا فضلہ معلوم ہوتا ہے۔

سنا ہے ایک دفعہ آپ اپنا ایک مضمون کسی پختہ کار اور کہن سال ادیب کو سنا رہے تھے۔ جس نے سارا مضمون انتہائی حیرت و استعجاب سے سننے کے بعد فرمایا، ”خوب، خوب، بہت خوب کیا آپ اردو میں بھی لکھا کرتے ہیں؟ نیاز صاحب نے گھبرا کر کہا: ”حضرت یہ مضمون اردو میں نہ تھا تو اور کس زبان میں تھا؟“ ادیب کہن سال نے فرمایا: ”نہ صاحب، ہماری بھی ستر برس کی عمر ہونے کو آئی ہے، ہم نے تو ایسی اردو نہ آنکھوں سے دیکھی، نہ بزرگوں سے سنی۔ آپ کا مضمون تو غالباً سریانی زبان میں تھا۔“

اخلاق کے اعتبار سے آپ کی یہ کیفیت ہے کہ ہمیشہ شاہدان بازاری کے حسن و جمال اور رقص

۱۔ سالک مرحوم کے طنزیہ و فکاہیہ کالم ”افکار و حوادث“ کے غیر سیاسی انتخاب، جلد اول، مرتبہ محمد حمزہ فاروقی میں سے..... صفحات: ۱۲۹-۱۳۳۔

وسرور کی تعریفوں میں تر زبان بلکہ ”تر قلم“ رہتے ہیں۔ آپ کے مضامین کے عنوان ملاحظہ ہوں ”ایک رقاہ سے“، ”ایک مغنیہ کو دیکھ کر“ اور اس کے علاوہ جہاں کسی رنڈی سے ملاقات ہو، اس ملاقات کا حال بہت مزے لے لے کر اپنے رسالے میں شائع کرتے ہیں۔ آپ کے ادب نے ملک کے نوجوانوں پر یہ اثر ڈالا ہے کہ وہ آپ کے مضامین کو کوک شاستر سے زیادہ قابل ترجیح سمجھتے ہیں۔

اگر کوئی بد نصیب شریف زادی آپ کی ادبی شہرت یا ایڈیٹری سے متاثر ہو کر آپ کو خط لکھ بیٹھے تو آپ جھٹ اسے ”نگار“ میں چھاپ کر اس پر چند ایسی سطریں لکھ دیتے ہیں جن سے بازاری عورتوں ہی کو مخاطب کیا جاسکتا ہے۔ شریف زادی تو ان فقروں اور شعروں کو پڑھ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہوگی اور عمر بھر پشیمان رہتی ہوگی کہ ایسے ”دل پھینک“ بگڑے دل کو کیوں خط لکھ بیٹھی۔

آپ کی ادبی معلومات کی یہ کیفیت ہے کہ ایک دفعہ آپ نے غالب کی ایک غزل بڑی شان سے شائع کی اور اس پر نوٹ لکھا کہ یہ غزل بالکل غیر مطبوعہ ہے اور مرزا مرحوم کے کسی دیوان میں موجود نہیں۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے:

بیا کہ قاعدہ آسمان بگردانیم  
قضاء بہ گردش رطل گراں بگردانیم

جس شخص نے کلیات غالب کو ایک دفعہ بھی کھول کر دیکھا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ یہ غزل غالب کی مشہور ترین غزلوں میں سے ہے اور کلیات کا کوئی ایسا ایڈیشن آج تک نہیں چھپا جس میں یہ غزل موجود نہ ہو لیکن نیاز صاحب اسے غیر مطبوعہ بتا رہے ہیں۔ گویا اعلان کر رہے ہیں کہ آپ نے غالب کا کلام کبھی دیکھا ہی نہیں۔ آج کل مولانا نیاز فتح پوری نے ادب و اخلاق کے علاوہ مذہب پر بھی دست درازی شروع کر رکھی ہے۔ ”بازی بازی بار لیش بابا ہم بازی“ وہ ہاتھ جو پہلے ادب و شعر اور اخلاق حسنہ ہی کا دامن تاز تار کیا کرتا تھا، اب انبیاء کے گریبانوں تک جا پہنچا ہے۔ ہم نے ان کی جاہلانہ تحریر کو کبھی قابل اعتبار نہیں سمجھا کیوں کہ ایک بے خبر انسان کی ہرزہ سرائیوں کو اہمیت دینا محض تضحیح اوقات ہے، لیکن چوں کہ بعض بزرگوں نے اس بڑھتے ہوئے فتنے کے سدباب کے لیے مدیر ”افکار“ کو حکم دیا ہے، اس لیے، ان شاء اللہ، آئندہ وقتاً فوقتاً ”نگار“ کے الحاد و زندقہ کی دھجیاں بکھیری جایا کریں گی۔ تاکہ وہ بد مذاق اور غلط اندیش نوجوان جو نیاز و ”نگار“ کے دام میں پھنسے ہوئے ہیں متنبہ ہو جائیں اور ان پر اس ڈھول کا پول واضح ہو جائے۔

جس طرح ہندوستان میں ہزار ہا اشتہاری طبیب موجود ہیں جو طب میں الف کے نام سے بے نہیں جانتے۔ بس ایک نسخہ کہیں سے ہاتھ آ گیا ہے اور اسی پر اتر اتے پھرتے ہیں۔ جیسے چوہا ہلدی کی گرہ پا کر پنساری بن بیٹھا تھا، اسی طرح اس ملک میں بڑا بڑا نیاز فتح پوری بھی بھرا پڑا ہے، جسے نہ خدا کی حقیقت معلوم ہے نہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی، نہ ملائکہ کے معنی آتے ہیں، نہ جنت کا مفہوم پیش نظر ہے۔

لیکن رائے ہے کہ کند چھری کی طرح مذہب کے گلے پر پھیری جا رہی ہے..... ہمارے نزدیک یہ تجویز نہایت مناسب ہے لیکن جسم کے ساتھ روح کی حفاظت بھی ضروری ہے اگر قوم کی جسمانی صحت کی خاطر مدعیان علاج امراض کے لیے قانون کا نفاذ ضروری ہے تو انسانوں کی روحانی صحت کے لیے ایک ایسا قانون نافذ ہونا چاہیے کہ جو شخص علوم دین کا فارغ التحصیل ہوئے بغیر کسی وقت مذہب پر رائے زنی کرتا ہو پایا جائے اسے فی الفور ہتھ کڑی لگائی جائے اور جیل خانے میں جھونک دیا جائے۔ ہمارے نزدیک ان نیازوں، فتح پوریوں اور نگاروں کا اس سے بہتر کوئی علاج نہیں۔

واضح رہے کہ مدیر ”افکار“ نہ ”پیش طبیب ملّا ہے“ نہ ”پیش ملّا طبیب“ اور نہ پیش ہر دو ہیچ۔ جب کبھی سر میں درد ہوا حکیم فقیر محمد صاحب قبلہ سے ٹیلی فون پر نسخہ پوچھ لیا اور جب کسی دینی مسئلے میں دقت پیش آئی مولوی غلام مرشد صاحب کے مکان پر چلے گئے۔ طب اور دین میں ہماری اپنی کوئی رائے نہیں اور یہی وجہ ہے ہمارا جسم بھی تندرست رہتا ہے اور روح بھی صحیح رہتی ہے۔

ہمارا جی چاہتا ہے کہ کبھی مولانا نیاز فتح پوری کے خلاف کوئی مقدمہ دائر ہو جائے اور حکومت انھیں کسی وکیل کی خدمات حاصل کرنے سے منع کر دے۔ جب وہ اعتراض کریں تو یہ جواب دیا جائے کہ جس حالت میں آپ علم دین حاصل نہ کرنے کے باوجود سب سے بڑے عالم اور مجتہد بنے ہوئے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ قانون کی تحصیل کیے بغیر آپ سر محمد شفیع اور سر علی امام سے بہتر اپنے مقدمے کی پیروی نہ کر سکیں؟

نیاز فتح پوری اور ”نگار“ کے خلاف سارے اسلامی پریس میں محشر برپا ہو گیا ہے ”ہمت“ [لکھنؤ] میں مضمون چھپا، ”الجمعیۃ“ [دہلی] میں ایک صاحب نے مقالہ لکھا۔ ”زمیندار“ میں بھی اس بدنام کنندہ اسلام کی خبر لی گئی اور سب سے بڑھ کر مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ”سچ“ کا ایک پورا پرچا اسی موضوع پر صرف کیا ہے، جس میں نیاز کی ہفوات و خرافات کے اقتباس درج کر کے نہایت ادبیانہ تبصرہ فرمایا ہے۔

معارف“ میں بھی ایک دو مضمون ”نیاز“ اور ”نگار“ کی ہرزہ سرائیوں کے خلاف شائع ہو چکے ہیں۔

اب ضرورت یہ ہے کہ ”نگار“ کسی مسلمان کے ہاتھ میں نظر نہ آئے، اور جہاں کہیں اس کا پرچہ دکھائی دے ”بہ حق اسلام“ ضبط کر کے جلا دیا جائے بلکہ ہمارے نزدیک بعض وکلا سے مشورہ کر کے چند مسلمان اس رسالے کے مالک اور ایڈیٹر کے خلاف توہین مذہب کا دعویٰ بھی کر دیں تاکہ اس شخص کو جیل خانے میں جا کر قدر عافیت معلوم ہو۔ سچ یہ ہے کہ دنیا بھر میں کسی بڑے سے بڑے ملحد اور زندقہ نے خدا، رسول، انبیاء، جنت، دوزخ، کتب سماوی، مذاہب عالم، سزا جزا کے متعلق اس قدر شاذ خالی اور ہرزہ سرائی سے کام نہیں لیا جس کی ذمے داری نیاز نے اپنے سر لی ہے اور اگر یہ الحاد و فوری علم کا نتیجہ ہوتا تو شاید بعض لوگ اسے برداشت بھی کر جاتے لیکن لطف یہ کہ اس شخص کا علم سے دور کا واسطہ بھی نہیں، محض جہل ہی

جہل ہے جس کے یہ کرشمے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ مسلمان اس ”زاج پان“ سے کیا سلوک کرتے ہیں۔  
 نیاز فتح پوری نے توبہ بھی کر لی لیکن خدا کی مرضی، مسلمان اس توبہ کو بھی منظور نہیں کرتے اور  
 کہتے ہیں کہ یہ استغفار ریاکارانہ ہے کیوں کہ اس استغفار کے ساتھ ہی ساتھ ”نگار“ میں ”ملاحظات“ کا  
 کالم لکھ کر نیاز نے ثابت کر دیا ہے کہ اس کے قلب میں ابھی ”ایمان“ پیدا نہیں ہوا۔ بہر حال توبہ استغفار  
 کے بعد ہم اس بد نصیب انسان پر بہت زیادہ سختی روا نہیں رکھنا چاہتے۔ دلوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ جو  
 لوگ اس پر ریاکاری کا الزام لگاتے ہیں، ان سے ہم تو یہی سوال کریں گے کہ هل شققت قلبہ  
 لیکن جو بد بخت اور ملحد انسان نیاز فتح پوری کو جرأت اخلاقی کا سرمایہ دار، آزاد خیال اور وسیع  
 المشرب خیال کرتے تھے، ان سے ہمارا یہ سوال ہے کہ کیا یہی وہ تمہارا نیاز ہے جو امت مسلمہ کی ایک ہی  
 ڈانٹ سے ڈر گیا اور جھٹ قرآن کی آیتیں پڑھنے لگا؟ تم نے خدا اور رسول کی طاقت اور مذہب کے جلال  
 و جبروت کو دیکھا؟ نیاز تو کوئی چیز ہی نہیں، یہاں بڑے بڑوں کی اکڑی ہوئی گردنیں خم ہو گئیں اور ان کی  
 آزاد خیالی ان کے کام نہ آسکی۔

اصل بات یہ ہے کہ نیاز جیسے جاہل آدمی الحاد و زندقہ جیسی بڑی چیز کے متحمل ہو ہی نہیں سکتے۔  
 الحاد کے لیے بھی قوی کیریٹیو کی ضرورت ہے۔ جس طرح ہر شخص آسانی سے پکا مسلمان نہیں ہو سکتا اس  
 طرح پکا ملحد ہونا بھی بہت مشکل ہے۔ اگر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا اسلام اپنی مثال نہیں رکھتا تو ابو  
 جہل کا کفر بھی بے نظیر ہے۔ ابو جہل کافر تھا، جہنمی تھا لیکن جس چیز پر قائم تھا نہایت استحکام و استواری کے  
 ساتھ قائم تھا۔ اتنے بڑے کفر کو سنبھالنے کے لیے بھی بہت بڑا ظرف چاہیے۔

پہلے پہل تو نیاز فتح پوری یہ سمجھتے رہے کہ ان کے خلاف چند مولویوں کا یہ شور و غوغا بہت زیادہ  
 نقصان کا باعث نہ ہوگا بلکہ شاید کسی قدر فائدے ہی کا موجب ہو جائے کچھ اور نہیں تو شہرت ہی سہی  
 ”بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا“۔

نواب کلب علی خاں مرحوم حج کو گئے تو حجاز کے محتاجوں کو ہزار ہا روپیہ بہ طور خیرات تقسیم کیا۔  
 آپ کے جو دو سخا کی بہت شہرت ہوئی۔ اس پر ایک رام پوری کو بہت حسد ہوا۔ اس نے شہرت حاصل  
 کرنے کی ایک ”کم خرچ بالانشیں“ تدبیر سوچی۔ ایک دن زم زم کے پاس کھڑے ہو کر اس میں پیشاب  
 کر دیا۔ بس پھر کیا تھا، ہر طرف سے تڑا تڑ جوتے پڑنے لگے اور سارے حجاز میں مشہور ہو گیا کہ فلاں شخص  
 کی بے حیائی دیکھو، بد بخت نے زم زم جیسے چشمہ مقدس میں پیشاب کر دیا۔ رام پوری صاحب اپنی ہمہ  
 گیر شہرت کا آوازہ سن کر بہت خوش ہوئے کہنے لگے کہ نواب صاحب نے شہرت حاصل کرنے کے لیے  
 ہزار ہا روپیہ صرف کیا اور ہم مفت ہی میں ان سے زیادہ مشہور ہو گئے۔

نیاز بھی اسی قسم کی شہرت کے دل دادہ تھے۔ چنانچہ وہ انھیں حاصل ہو گئی۔ لیکن جب یار لوگوں نے ان کے رسالے کا بائیکاٹ تجویز کیا۔ ہر جگہ ”نگار“ بند ہو جائے جو رڈی کا ٹھیکرا ہے۔ دوسری طرف جیل خانے کی ذلت اٹھانی پڑے ”یکے نقصان مایہ دیگر شہادت ہمسایہ“ آپ نے جھٹ علمائے فرنگی محل کی پناہ لی اور توبہ کر لی۔ ”جان بچی لاکھوں پائے، خیر سے بدھو گھر کو آئے“۔

بہر حال ہمارا خیال یہ ہے کہ اب نیاز کو موقع دینا چاہیے کہ وہ اپنے طور طریقے درست کر لے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ”نگار“ کے گزشتہ پرچے جہاں کہیں پائیں بلا تامل جلادیں۔ اور اگر نیاز صاحب سے پھر کبھی وہی گستاخیاں سرزد ہوں تو پھر آپ سے وہ سلوک کیا جائے جو آپ کے ”شایان شان“ ہو۔

رہا آپ کے ادبی کمالات کا پہلو، تو ہم قارئین سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم عنقریب ”افکار“ کا ایک سلسلہ شروع کرنے والے ہیں جن میں ہم بتائیں گے کہ یہ شخص ادب سے جاہل محض ہے اور اس کی اکثر تصانیف و تالیف چوری کی ہیں اور اس کی عام عادت ہے کہ انگریزی سے الٹا سیدھا ترجمہ کر کے مضمون یا کتاب لکھ مارتا ہے اور اپنے نام سے چھاپ دیتا ہے۔<sup>۱</sup>

۱- روزنامہ ”انقلاب“ ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۱ء۔



## ڈاکٹر منظور احمد اور سیکولر ازم

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے تمام تر افکار و خیالات پر سیر حاصل بحث اور گفتگو کے بعد وہ ہی خطرہ اور نتیجہ سامنے آتا ہے، جس کا اظہار خود انہوں نے اپنے مضامین کے متعلق اپنے ہی قلم سے فرمایا ہے:

”ان مضامین پر ایک بڑا الزامی اعتراض ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ان میں مذہب کو سیکولر ازم میں تبدیل کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔“<sup>۱</sup>

سیکولر ازم کا تعلق بالعموم کلیسا اور ریاست کی دوئی کے تصور پر قائم ہے، جس کی اساس اس سیاسی نظریے اور تہذیبی رویے پر استوار ہے جس کی بدولت یورپ نے مذہب [عیسائیت] سے چھٹکارا حاصل کیا تھا۔ سوشل سائنس انسائیکلو پیڈیا میں Secularism اور Secularisation کی اصطلاح کو یوں بیان کیا گیا ہے:

"Secularisation refers to the displacement of religious beliefs, rituals and sense of community from the moral life of society. The major institutions of society became legitimated by secular ideologies and formal legal doctrines rather than by religions. It was the philosophy of enlightenment that provided the pivotal impetus towards the thoroughgoing secularization.

At the root of secularism is the principle that the society should be founded on principles devised by rational inquiry into the universal nature of human social life ..... The rational principles of social organisation are antithetical to religious traditions based upon faith.<sup>۲</sup>

۱- منظور احمد، ”پیش لفظ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۹۔

2- R.A. Jahangirdar, "Secularism", in *The Social Science Encyclopaedia*, Adam Kuper & Jessica Kuper [eds.], London: Routledge, 1985, p.737.

..... اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۴۶۷.....

ایک اور انسائیکلو پیڈیا میں سیکولرازم کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

"The term secularism signifies that which is not religious. It is rooted in the Latin word Saeculum, which initially meant 'age' or 'generations' in the sense of temporal time. It Later became associated with matters of this world, as distinct from those of the spirit directed towards attainment of paradise..... Secularism or the secularization process derives from the European historical experience. It meant the gradual separation of "almost all aspects of life and thought from religious association and ecclesiastical direction".<sup>1</sup>

ان بیان کردہ تعریفوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ سیکولرازم کی پوری اٹھان لادینی پر ہے، جو روحانیت کے بجائے مادیت و حسیت سے عبارت ہے۔ بعض سیکولر حضرات جو تکلفاً اور تصنعاً وجود خدا کے قائل ہیں [اگرچہ سیکولرازم کا خدا سے انتساب ایک مضحکہ خیز تصور ہے] ان کا خدا خود ان کے تصور کی تخلیق ہے، جو اس کائنات کی تخلیق کے بعد اس سے لائق ہو کر آسمانوں میں کہیں براجمان ہے۔ کائنات ایک خود کار مشین کی مانند از خود موجود سفر ہے۔

سیکولرازم: بنیادی خدوخال:

ذیل میں سیکولرازم کے خدوخال نہایت اختصار سے بیان کیے جا رہے ہیں، جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب پر مذہب کو سیکولرازم میں تبدیل کرنے کا اعتراض الزامی ہے یا واقعی؟ سیکولرازم کے مطابق:

[1] انسان عبد نہیں بلکہ آزاد [autonomous] اور قائم بالذات [self-determined] ہے۔

[2] عادلانہ معاشرے کی تشکیل مذاہب و ادیان یا رنگ و نسل کی بنیاد پر نہیں بلکہ "انسانیت" کی سطح پر استوار ہونی چاہیے، کیوں کہ وہ سب میں مشترک ہیں، ہم پہلے انسان ہیں، پھر عیسائی، ہندو یا مسلمان۔

[3] ما بعد الطبعی مصادر [metaphysical sources] کا، اجوادیان و مذاہب کا خاصہ، مذہبی تیقنات کی اساس اور اس کے استحکام و استقلال کا ضامن ہے، محض عقلیت پسندی کے دعوے پر نہ صرف انکار بلکہ ان حقائق اور صداقتوں کو موجب تحقیر اور باعث تضحیک گردانا۔ تصور حیات کو خدا اساسی اور دین مرکزی سے ہٹا کر "انسان مرکزی" اور "حیات پرستی" کی طرف یوں پھیر دینا کہ مادی خوش حالی اور مسرت و آسائش ہی کا محور نظر اور نصب العین رہے۔ جس کا حاصل و نکلنٹائن نے ایک جملے میں سمودیا ہے:

1- John L. Esposito, *The Oxford Encyclopedia of the Modern Islamic World*, Oxford University Press, 1995, Vol: IV, p.20.

Life is a game and maturity is to play it seriously.

”یعنی زندگی ایک کھیل ہے، جسے سنجیدگی سے کھیلنا ہی دانش مندی ہے۔“

بالفاظ دیگر اس دنیا ہی کو جنت بنا لیا جائے تاکہ آخری جنت کی ضرورت ہی نہ رہے۔

Harvey Cox، جس نے Secularism کو بڑی وضاحت اور بسط کے ساتھ بیان کیا ہے، ایک

ڈچ مصنف C.A. Van Peurson کے حوالے سے لکھتا ہے:

Deliverance of man first from religious and then from metaphysical control over his reasons and his language.

It is losing of the world from religious and quasi-religious understandings of itself, the dispelling of all closed world-views, the breaking of all supernatural myths and sacred symbols. Secularization occurs when man turns his attention away from worlds beyond and toward this world and this time.

یعنی مذہبی زبان، محاورے اور استدلال اس تصور حیات اور کائنات کے داعی ہیں جس کی اساس مابعد الطبعی

مآخذ ہیں، Cox کے مطابق اس سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے ورنہ ماؤی وجود مستحکم نہیں ہو سکے گا۔

منظور احمد کے سیکولر افکار

سیکولر ازم کی تعریف اور بنیادی اوصاف و نکات اور جناب منظور احمد صاحب کے افکار و

نظریات پر طویل گفتگو کے باوجود مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بطور خلاصہ سیکولر ازم اور ڈاکٹر صاحب کے

افکار کا ایک تقابلی جائزہ بھی لے لیا جائے، جس سے یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ ڈاکٹر صاحب کے

نظریات و خیالات پر سیکولر ازم کا اعتراض الزامی نہیں واقعی ہے۔

[۱] افکار نیازی تحسین و تاسید اور دفاع و ترویج جو مابعد الطبعی حقائق کے استہزا و استخفاف پر مبنی

ہیں، اور خود ڈاکٹر صاحب کے منہاج علم میں قرآن مجید کے کلام الہی [Word of God] ہونے کو

جیسے مشکوک ٹھہرایا گیا ہے، مابعد الطبعی حقائق کی اس روایتی تفہیم کی جو امت کی تاریخ میں عملاً متواتر چلی

آ رہی ہیں، جس طرح تغیر پذیری کا مطالبہ کیا گیا ہے، جس طرح عقل مجر و کوند ہی حقائق اور وحی الہی کے

تسلیم کرنے میں بہ طور میزان اور کسوٹی پیش کیا گیا ہے اور دین و قانون کی اساس پر استوار حقائق اور

خالصتاروایتی مسائل کا ڈاکٹر صاحب کی تالیفات میں جس طرح مغربی فکر و فلسفے کی روشنی میں تجزیہ و تحلیل

کیا گیا ہے، کیا یہ سب سیکولر ازم کی علامات نہیں ہیں؟

[۲] اجتہاد و ترقی کے نام پر قرآن مجید میں صراحتاً بیان شدہ احکام و حدود و کوزمان و مکان کا پابند

سمجھتے ہوئے، ان کی تبدیلی کا مطالبہ، سنت کی آئینی و تشریحی حیثیت کا انکار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1- Harvey Gallagher Cox, The Secular City: Secularization and Urbanization in Theological Perspective. New York: The Macmillan Company, 1966, pp:1-2

کے فیصلوں کو از قبیل اجتہاد جاننا، خرقِ اجماعِ امت کی کوشش، قرآن و سنت کی روایتی خوشہ چینی کو ترک کر کے اور استخراجی طریق کو چھوڑ کر [جس میں اجتہاد کو قرآن و سنت کے دائرے میں محدود رکھ کر احکام اخذ کیے جاتے ہیں] ایسے آزادانہ اجتہاد پر اصرار جس میں مقصد اور مصلحت کے نام پر کسی قرآنی حکم کو ساقط کر دینا بھی روا ہو۔ دوسری طرف مغربی فکر و فلسفے کی خوشی چینی کی دعوت دیتے ہوئے ڈاکٹر فضل الرحمن جیسے جدیدیت پسند کے تحقیقی نتائج کو مسلمانوں کی علمی روایت کی فراخ دلی سے تعبیر کرنا اور معاشی ترقی کے نام پر مسلم اقدار و روایات اور افکار و تہذیب کی تبدیلی کا مطالبہ سیکولرازم ہی کا مظہر ہے۔

[۳] ”موضوع ہی معروض ہے اور معروض ہی موضوع“ — کیا مستقل اقدار کو موہوم

کردینے کے مرادف نہیں ہے؟ جو کہ سیکولرازم کا جز و لازم ہے۔ Cox لکھتا ہے:

The relativization of all human values, one of the integral dimensions of secularization. ۱۔

مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

Secular man knows that the symbols by which he perceives the world and the values by which he makes his decisions are the products of a particular history. As such they are limited and partial ..... He must live with the realization that rules which guide his ethical life will seem just as outmoded to his descendants as some of his ancestors practices now appear to him. No previous generation has had to live in the glaring light of this realization. ۲۔

جبکہ اسلامی فکر اقدار کے استقلال سے عبارت ہے، جس کا منبع و مصدر روحی الہی ہے۔ اس لیے یہاں نہ صرف عقائد و عبادات بلکہ رسوم، اخلاق اور معاشرت تک کے سارے اصول مابعد الطبعی نظام سے اخذ کیے جاتے ہیں اور اسی کے تابع ہونے کے باعث مستقل، مطلق، دائمی اور اٹل ہیں، انھیں کسی وقتی ضرورت یا پسند و ناپسند کی بنا پر تبدیل نہیں کیا جاسکتا، اس میں کسی قسم کی تبدیلی مابعد الطبعی گمراہی کے زمرے میں آتی ہے۔ ہاں، روایتی مابعد الطبعیات کی روشنی میں کوئی نئی تشریح اس سے مستثنیٰ ہے، مگر اس کا حق بھی ہر کس و ناکس اور کہ و مہ کو نہیں بلکہ تقویٰ و تدین سے مزین فقیہ و مجتہد کو ہے، فقہائے عابدون کی اصطلاح اس بات کو واضح کر دیتی ہے — اس کے علاوہ اسلام میں کسی قسم کی آزادی [freedom] و خود مختاری [autonomy] نہیں ہے۔

1- Harvey Gallagher Cox, *The Secular City*, p.28.

2- Ibid., p.27.

### عبدیت: فکر اسلامی کا جوہر:

فکر اسلامی میں عبدیت کو اولیت حاصل ہے اور انسانیت کو ثانویت۔ انسانیت، عبدیت کے اظہار کا محض ایک ذریعہ ہے کہ اگر میں انسان نہ ہوتا تو جمادات، نباتات، حیوانات یا نوری و ناری مخلوقات میں سے کچھ ہوتا، مثلاً اگر میں فرشتہ ہوتا تو ملکوتیت میری عبدیت کے اظہار کا ذریعہ بنتی، اگر میں پودا ہوتا تو میری عبدیت کا اظہار پودا ہونے کی صورت میں ہوتا۔ غرض میں جو کچھ بھی ہوتا میرے وجود کی ہر ممکنہ صورت مجھ پر عبدیت کو لازم کر کے آزادی و خود مختاری کو سلب کر لیتی ہے۔ میری اصل عبدیت یعنی مخلوق ہونا ہے اور میری انسانیت ایک حادثہ و اتفاقی امر ہے۔ بالفاظ دیگر میرا حال تو تبدیل ہو سکتا ہے لیکن میرا مقام [مخلوق اور عبد ہونا] ناقابل تبدیل ہے۔ میرے وجود کی ہر حالت میرے لیے حادثاتی اور اتفاقی ان معنوں میں ہے کہ میں اپنی کسی حالت کا مختار ہوں نہ خالق، لہذا اگر میں انسان ہوں تو میری انسانیت کا وہی اظہار معتبر ہوگا جس سے عبدیت جھلکتی ہو نہ کہ اتباع نفس۔ لہذا اگر میں انسان ہوں تو میری انسانیت کا وہی اظہار معتبر ہوگا جس سے عبدیت جھلکتی ہو نہ کہ اتباع نفس۔ لہذا اگر میں انسان ہوں تو میری انسانیت کا وہی اظہار معتبر ہوگا جس سے عبدیت جھلکتی ہو نہ کہ اتباع نفس۔ لہذا اگر میں انسان ہوں تو میری انسانیت کا وہی اظہار معتبر ہوگا جس سے عبدیت جھلکتی ہو نہ کہ اتباع نفس۔

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ [۱۹:۳]

”بے شک اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے۔“

لہذا میری انسانیت اسی وقت معتبر اور با معنی ہو سکتی ہے، جب اس کا ہر گوشہ، خواہ اجتماعی زندگی کا ہو یا نجی، اسلام کے مطابق ہو، اسی لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ [۸۵:۳]

”جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے، اس کا دین قبول نہ کیا جائے گا۔“

انسان کی آزادی کا مطالبہ اس کی مخلوقیت [عبدیت] کے انکار اور الوہیت کے اصرار کے دعوے پر مبنی ہے، جسے قرآن نے نہایت بلیغ الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

مَنْ اتَّخَذَ إِلَهًا هَوَاهُ [۲۳:۲۵]

”جو اپنی خواہش نفس کو معبود بنائے ہوئے ہے۔“

### سیکولرازم کی روح: اخلاقیات کے الٰہی ماخذ کا انکار:

[۲۴] اخلاقی اقدار کا خدائی ماخذ مذہبی معاشروں کا مسلمہ اصول رہا ہے۔ بالفاظ دیگر خیر و شر کی بنیاد اسلامی ایمانیات ہیں، جس کے جاننے کا واحد ذریعہ وحی الہی اور اس پر مبنی علوم ہیں۔ خیر پر عمل کا محرک عند اللہ مسؤلیت کا استحضار اور احکام الہی کی تعمیل ہے، جس سے مقصود خوشنودی رب کا حصول اور بندگی و ذوق عبودیت کی تکمیل ہے۔ نفس انسانی میں کوئی ایسا حتمی ماخذ موجود نہیں جس کے ذریعے نفس انسانی کا مطالعہ کر کے حتمی طور پر خیر و شر کا ادراک کیا جاسکے۔ نفس انسانی کے ذریعے خیر و شر کے تعین کا مسئلہ تو رہا ایک طرف، نفس انسانی میں خیر و شر کا وجود عدم بھی بغیر خبر کے ممکن نہیں۔ اس لیے وگلنٹائن جیسا فلسفی کہتا

۱- زاہد صدیق مغل، اسلامی بینکاری اور جمہوریت، صفحہ ۳۷۱۔

ہے کہ حق اور قدر دنیا کے باہر سے آتی ہیں۔ اس کے برعکس سیکولر ازم کا دعویٰ ہے کہ انسان میں خیر و شر کی بنیاد نفس انسانی میں ودیعت شدہ تصورات ہیں، جس کی تعیین کے لیے انسانی ذرائع علوم یعنی حواس و عقل وغیرہ ہی کافی ہیں۔ اخلاقی سعی کا مقصد نفس انسانی کا اظہار ہے، جس سے مقصود حصول لذت و آسائش اور کمال یا فرض برائے فرض کی ادائیگی ہے۔ یعنی سیکولر ازم ایک ایسے نظام تربیت کا مظہر سمجھا جاتا ہے، جس سے مذہبی تعلیمات کو خارج کر دیا گیا ہو، بہ حیثیت ایک نظریے کے سیکولر ازم کا جو ہر یہ ہے کہ اخلاقیات کی بنیاد کمالاً انسان کی دنیوی زندگی کی بہبود کے تصور پر قائم ہونی چاہیے۔ اس طور پر کہ اس میں سے آخرت اور خدا پر ایمان سے وابستہ تصورات کو یک سر خارج کر دیا گیا ہو۔ یہ بات اتنی بدیہی ہے کہ اس کو جاننے اور سمجھنے کے لیے کسی فلسفیانہ کتاب یا مقالے کے مطالعے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لیے ڈکشنری میں لفظ ”سیکولر ازم“ کی بحث دیکھ لینا کافی ہے۔

The doctrine that morality should be based solely on regard to the well-being of man kind in the present life, to the exclusion of consideration drawn from belief in God or in a future state<sup>1</sup>

Cox اسی مسئلے کو واضح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

There is no reason that man must believe the ethical standards he lives by came down from heaven inscribed on golden tablets. He can accept the fact that value systems, like states and civilization, come and go. They are conditioned by their history and claim no finality..... Secularization places the responsibility for the forging of human values, like the fashioning of political system, in man's own hands.<sup>2</sup>

مذہبی اخلاقیات بت پرستی کی آمیزش سے آلودہ: منظور احمد:

ڈاکٹر منظور احمد مذہبی آدمی کی اخلاقیات کو ”حکمی اخلاقیات“ سے تعبیر کرتے ہیں، اور اخلاقی آدمی جن اخلاقیات پر عمل پیرا ہوتا ہے، اُسے ”انسانی اخلاقیات“ کہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے یہ قول:

”حکمی اخلاقیات میں ہمیشہ بت پرستی کی آمیزش ہوتی ہے، اس لیے کہ اس میں انسان ایک مطلق مقتدر کے احکامات پر عمل کرتا ہے جو خیر و شر اور صحیح و غلط کا ایک مطلق حکم ہے۔“<sup>3</sup>

ڈاکٹر صاحب کے مطابق اس حکمی اخلاقیات کا منبع انسان کی ذات سے باہر ہے لہذا یہ

1- J.A. Simpson and E.S.C. Weiner [eds.], *The Oxford English Dictionary*, Oxford: Clarendon Press, 1989, V. XIV, p. 849.

2- Harvey Gallagher Cox, *The Secular City*, p. 31.

3- منظور احمد، ”خدا“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، صفحہ ۲۵۔

اخلاقیات اپنی فطرت کے اعتبار سے اجنبی اور alienated ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس ”انسانی اخلاقیات“ نہ تو اجنبی اور alienated ہوتی ہیں اور نہ ہی اس میں بت پرستی کا کائی شائبہ پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ان کا منبع انسانی ذات کے باہر نہیں بلکہ اس کے اندرون یا ضمیر میں موجود ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہ قول یہ انسانی اخلاقیات یا انسانی ضمیر خارجی احکامات کی داخلیت میں تبدیل ہونے سے پیدا نہیں ہوتا، یہ کسی ایسے مقتدر حاکم کی اطاعت نہیں، جسے ہم اس کے احکامات کی بجا آوری سے خوش کرنا چاہتے ہوں یہ انسانی ضمیر خود ہماری ذاتی آواز ہے جو ہم کو واپس اپنی طرف بلاتی ہے اور ہماری ذات میں پنہاں خصوصیات کی پرورش کرتی ہے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب نے مذہبی آدمی کی اخلاقیات کو، جس کا منبع اور سرچشمہ انسانی ذات سے باہر خدا کی ذات تھی، بت پرستی سے آلودہ اور alienated قرار دے کر، انسانی اخلاقیات سے بالکل الگ کر دیا۔ اور چون کہ ”انسانی اخلاقیات“ کے منبع کو انسانی ذات سے باہر نہیں بلکہ اس کے دروں میں موجود ٹھہرایا گیا، اس لیے بہ طور معیار یہ اخلاقیات حکمی یعنی خدائی احکامات خیر و شر سے بھی آزاد قرار پائی۔ اس کا لازمی اور بدیہی مقصد یہ ہوا کہ مذہب [اسلام] کے علاوہ بھی کچھ آفاقی اقدار موجود ہیں اور خیر کے تعین کا پیمانہ ارادہ خداوندی سے باہر بھی ممکن ہے۔ یہ آفاقی اقدار ان اصولوں اور حقائق پر مشتمل ہیں جن کی اتباع خود خالق اور شارع پر بھی لازم ہے۔ اب گویا صرف اسلام الدین اور الحق ہونے کا دعوے دار نہ رہا بلکہ وہ ایک بڑے تصور خیر کا ایک جز بن گیا۔ اخلاقیات کو ایمانیات سے ماورا جان کر محض انسانی اقدار کے طور پر پیش کرنا غلط نہیں ہے، کیوں کہ اخلاقیات اور اقدار کا منبع اور مصدر لازماً ایمانیات ہیں۔ ایک ہی عمل ایک تصور خیر کے تحت اچھا بھی ہو سکتا ہے اور دوسرے تصور خیر کے تحت برا بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً اسلام کے تصور خیر میں سود لینا، دینا حرام اور گناہ کبیرہ ہے جب کہ سرمایہ دارانہ تصور خیر میں وقت پر سود کی ادائیگی عمدہ اخلاقیات کا اظہار ہے۔

مذہبی اخلاقیات انسانی آزادی کی راہ کا سب سے بڑا پتھر: منظور احمد:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا اقتباس ملاحظہ کیجیے، جو سیکولرازم کی مکمل ترجمانی ہے:

”سیاسی اور معاشرتی عوامل کے ساتھ مسلمانوں کا نظام اخلاق بھی اسی پیراڈائم کا پابند ہے۔ یعنی اخلاقی اور غیر اخلاقی کا انحصار اقدار کے فی نفسہ خیر و شر ہونے پر نہیں بلکہ خدا کے حکم اور مرضی پر ہے۔ یہ بات کہ سچ بولنا چاہیے اس لیے اخلاقی نہیں کہ سچائی بجائے خود ایک قدر ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ خدا نے سچ بولنے کو کہا ہے۔ سچ بولنے میں خدا کا عمل دخل انسانوں کو سچا رہنے پر آمادہ تو کر سکتا ہے۔ سچ کی علت ہونا ایک دوسرا مسئلہ ہے۔ خیر و شر فی نفسہ خدا کے حکم کے تابع ہونے سے انسان کی شخصی آزادی اور قوت فیصلہ ختم ہو کر چند ایسے لوگوں کے فتوؤں کی پابند ہو جاتی ہے جو یہ بتائیں کہ خدا کس کام کے کرنے کو کہتا ہے۔ فقہ اسلامی نے انسانی عمل کا ایک ایسا ہمہ گیر نظام تعمیر کر لیا کہ شاید ہی کوئی انفرادی عمل اب انسان اپنے ذمے داری پر اس یقین کے ساتھ کر سکتا ہے کہ ایسا کرنا اس کے لیے اخلاقی قدر کا حامل ہے۔“

یہی صورت حال انسانی معاملات سے متعلق قوانین کی ہے جو یا تو متعین ہیں یا متعینہ قوانین سے استخراج کیے جاتے ہیں، کسی مفسدہ کو ختم کرنے یا کسی اخلاقی قدر کو معاشرے میں قائم کرنے کے سلسلے میں مناسب قانون سازی کا حق انسانی اختیار میں نہیں رہا بلکہ وہ ہمیشہ خدائی نیت کے شارحین کے نام منتقل کر دیا گیا۔ اس میں اجتہاد کے ذریعے صرف ضمنی تبدیلی ہی ممکن ہے اور اس کی سند بھی وہی شارحین دے سکیں گے۔ کسی متعین قانون کی جگہ دوسرا قانون اگرچہ وہ نتائج کے اعتبار سے بہتر ہی کیوں نہ ہو، نہیں بنایا جاسکتا۔ ان سب عوامل نے مل کر انسان میں فکری آزادی کو بڑی حد تک معدوم کر دیا ہے۔ اب ایسا کرنا معاشرے میں انقطاع یا کسی دوسرے ضرور رساں نتیجے تک لے جاسکتا ہے۔

### اخلاقیات کا انسانی ماخذ: انسان کی خدائی کا اظہار:

ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے اس اقتباس میں یہ بات واضح اور دو ٹوک الفاظ میں تحریر فرمائی ہے کہ اخلاق، یعنی خیر و شر کی تعین، کا اختیار خود انسان کے سپرد ہونا چاہیے، چوں کہ مسلمانوں کے نزدیک اخلاقی یا غیر اخلاقی اقدار بہ ذات خود کوئی شے نہیں بلکہ یہ خدا کا حکم ہیں، اس عقیدے پر ایمان رکھنے سے ”فرد کی شخصی آزادی اور قوت فیصلہ“ ختم ہو جاتی ہے، فی الاصل خیر و شر کی تعین انسان کی ذات کرتی ہے نہ کہ خدا کا حکم۔ خیر و شر کی تعین کے اختیارات انسان کو سونپ کر ڈاکٹر صاحب نے انسان میں خدائی منتقل فرمادی ہے، کیوں کہ ایمانیات سے ماورا ہو کر خیر و شر کا معیار، کذب و صداقت اور کھرے کھوٹے کو پرکھنے کی کسوٹی سوائے ”میں“ اور ”میری عقل“ کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ جیسا کہ کانٹ کہتا ہے کہ روشن خیالی authority کا انکار ہے کہ انسان self پر ایمان لا کر اپنی بلوغت ذہنی کو ممکن بناتے ہوئے خود مختار ہو جاتا ہے۔ اس فکر کی موجودگی میں اسلام کے ”الحق“ ہونے کا دعویٰ از خود باطل ہو جاتا ہے، کیوں کہ اس فکر کے مطابق خیر اور نیکیاں سب اضافی [relative] ہیں، اخلاق کا انحصار محض عقل و تجربے اور خواہشات پر ہے کہ ان کے بدلتے فیصلوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی احکام بھی تبدیل ہوتے رہیں۔ گزشتہ زمانے کا سچ ممکن ہے آج کا جھوٹ ہو اور آج کا ظلم شاید کل کی قدر [value] بن جائے، خیر و شر کو کوئی استقلال اور پائیداری نصیب نہ ہو سکے۔

### حسن و قبح کلیات کے تابع:

ڈاکٹر صاحب یہاں اس فرق کو بھی ملحوظ نہ رکھ سکے کہ جزئیات کا حسن و قبح کلیات کے تابع ہوتا ہے، بالفاظ دیگر جزئیات یا فرعیات کسی بھی دائرے کی کیوں نہ ہوں اور کیسی ہی درست کیوں نہ لگیں ان کے صحت و سقم اور حسن و قبح کا مدار و انحصار اُس کلیتے اور اصولی نقطہ نگاہ [ایمانیات] پر ہوتا ہے جس کے ماتحت وہ پیش کی جاتی ہیں۔ زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے جزوی مسائل کی نوعیت تبدیل ہو جاتی ہے اور عمل کے دائرے

۱۔ منظور احمد، ”پاکستان“ مشمولہ پندرہ روزہ معارف فیچر، صفحہ ۷۔



میں شرعی حسناات فسادِ نیت یا بے محل استعمال سے سیناات بن جاتے ہیں، مثلاً غیبت میں سچ ہی بولا جاتا ہے غلط بیانی نہیں کی جاتی لیکن چونکہ اس کے پس پشت عیب بیانی موجب فتنہ ہوتی ہے اس لیے یہی سچ قبیح بن جاتا ہے، اسی طرح مثلاً نبی کہیں روپوش ہو اس وقت اسے سچ بول کر دشمنوں کے حوالے کر دینا کفر ہے، بلکہ اس وقت جھوٹ بول کر نبی کی جان بچالینا عین ایمان ہے۔ اس لیے اگر سچ کوئی نفسہ حسن اور خیر بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ بات قابل غور ہے کہ سلسلہ استعمال کی قباحت اسے قبیح بنا دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بیان کے پیش نظر سوال یہ ہے کہ اخلاق کے الوہی ماخذ کے انکار کرنے کے بعد کون سا متفقہ پیمانہ اور کسوٹی وضع کی جاسکے گی جس سے خیر و شر کا تعین ہو سکے؟ جدیدیت پسندوں کے نزدیک یہ پیمانہ عقل فراہم کرتی ہے، مابعد جدیدیوں کے نزدیک جمالیات، آرٹ اور فنون فراہم کرتے ہیں، رومانویت کے ماننے والوں کے نزدیک یہ پیمانہ وجدان [intuition] وضع کرتا ہے، غرض اس صورت میں اخلاق کا کوئی اتفاتی پیمانہ ممکن نہیں رہتا، یا ہر شخص آپ خدا ہے کہ وہ جیسے چاہے اپنے اخلاقی پیمانے وضع کرے، آج جو اسے ٹھیک لگ رہا ہے اس پر عمل کرے، کل ہو سکتا ہے کہ یہ عمل اس کو ٹھیک نہ لگے تو اسے حق ہے کہ خدائی اختیارات کی طرح اس عمل کو منسوخ قرار دے کر کسی اور عمل کو ناسخ قرار دے دے۔

اخلاقیات کا انسانی ماخذ اگر خدائی نہیں تو ابلیسیت ہے:

یا پھر یہ ابلیسیت ہے، شیطان نے خدا کی ذات میں کسی کو شریک نہیں کیا، وہ رجیم اس لیے ہے کہ اس نے کہا میں جس چیز کو صحیح سمجھتا ہوں میں وہ کروں گا، بالفاظ دیگر میں خیر کو اسی طرح متعین کروں گا جیسے کہ میں چاہتا ہوں۔

الوہی احکام کی مداخلت انسانی آزادی میں رکاوٹ: منظور احمد:

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ہر جگہ شریعت اور حکم الہی کی مداخلت سے قانون سازی بھی محدود ہوگی ہے، جس کی وجہ سے شریعت سے بہتر قانون نہیں بنایا جاسکتا اور نہ اجتہاد کے ذریعے مکمل تبدیلی ہی لائی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس بات پر مضطرب ہیں کہ اسلام میں قوانین یا ”متعین“ ہیں یا متعین اصولوں سے استخراج و استنباط کیے جاتے ہیں جس کے باعث: ”کسی مفسدہ کو ختم کرنے یا کسی اخلاقی قدر کو معاشرے میں قائم کرنے کے سلسلے میں مناسب قانون سازی کا حق انسانی اختیار میں نہیں رہا بلکہ ہمیشہ کے لیے خدائی نیت کے شارحین کے نام منتقل ہو گیا۔“ کیا ہی بہتر ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب ان اخلاقی اقدار کی ایک فہرست بھی مہیا فرمادیتے جسے وہ بہ ذریعہ قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس بات کا بھی تعین ہو جاتا کہ آخر وہ کون سی اخلاقی قدر ہے جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر سے چوک گئی ہے اور ڈاکٹر صاحب کو اس کا ادراک ہو گیا ہے۔

”نیت خدا کے شارحین“ اور قانون سازی: ایک بے بنیاد دعویٰ:

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ قانون سازی کا حق ”انسانی اختیار“ میں نہیں رہا، بلکہ نیت خدا کے شارحین کے نام منتقل ہو گیا۔ عجیب بات ہے جنہیں ڈاکٹر صاحب ”نیت خدا کے شارحین“ قرار دے

رہے ہیں یعنی علما و فقہا تو وہ بھی انسان اور مخلوق ہی ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب پاپائیت [Theocracy] کی بنیادیں اسلام میں تلاش کر رہے ہیں۔ حالاں کہ پاپائیت میں مذہبی گروہ کو آسمانی سند تقدیس حاصل ہوتی ہے اور ان کے خلاف بات نہیں کی جاسکتی۔ چرچ مسیح کی ذات کا نمائندہ ہوتا ہے، اور پوپ چرچ کا نمائندہ، لہذا پوپ کا فیصلہ مسیح کا فیصلہ ہے پوپ جو فیصلہ کرے وہ قانون ہے، اس کے لیے وہ انجیل سے سند کا محتاج نہیں، اس کے برعکس اسلامی تاریخ میں پوپ جیسی کوئی مقتدر ہستی موجود نہیں جو مفترض الطاعت ہو، یہاں سند اور دلیل کتاب و سنت ہیں اور علما و فقہا و مجتہدین محض شارح۔ اور امت کی تاریخ میں علما و فقہا کی ایک دوسرے سے اختلاف کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں، ہاں اختلاف کرنے کے لیے اہلیت کی موجودگی لازمی ہے، جس کے مطالبے سے کسی صاحب شعور اور صاحب عقل کو اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔ اگر علما و فقہا کے ارشادات و اقوال ان دو اساسی مآخذ، یعنی کتاب و سنت، سے ثابت شدہ نہ ہوں تو اس کی اتباع و تقید ضروری نہیں۔ اسلامی تاریخ میں یہ تصور حد درجے اجنبی ہے کہ انفرادی فیصلوں کو خدائی فیصلے قرار دیا جائے یا کوئی فرد ”خدائی نیت کا شارح“ کہلائے۔

قانون سازی کا انسانی اختیار: مغربی تناظر میں:

اگر ڈاکٹر صاحب کی ”انسانی اختیار“ سے مراد عوام ہیں، تو ان کی سادگی قابل رشک ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام تو رہا ایک طرف خود مغرب میں بھی فیصلے جمہور [People] نہیں پارلیمنٹ اور وزیر نہیں غیر منتخب اقلیت [Non elected minority] اور قومی اور عالمی استعماری ادارے [National and Global Imperialist Institutions] کرتے ہیں۔ مثلاً بیوروکریٹ [Bureaucrat]، سرمایہ دارانہ اقلیت [Capatalist minority]، عالمی مالیاتی فنڈ [IMF]، عالمی بینک [World Bank]، اقوام متحدہ [UNO]، ISO 2000، عالمی اقتصادی فورم [World Economic Forum]، عالمی تجارتی ادارہ [World Trade Organization]، کیوٹو پروٹوکول [Kyoto Protocol]، اسٹاک ایکسچینج، کیپٹل مارکیٹ، فری ٹریڈ پارلیمنٹ اور عدلیہ وغیرہ جیسے ادارے اور معاہدے عوامی رائے سے نہیں، سرمایہ دارانہ اقلیت [Capatalist minority] اور سرمایہ دارانہ تعقل [Capatalist rationality] کے علم بردار اشرافیہ کی مرضی سے لوگوں پر ان کے نام نہاد عوامی نمائندوں یعنی کونسلر، اراکین اسمبلی، اراکین سینیٹ، کے ذریعے مسلط کیے جاتے ہیں۔

سیکولرازم کے بنیادی خدو خال اور ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے افکار و نظریات کے مطالعے سے یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ وہ سیکولر نظریات کے حامل ہیں، یعنی مذہب ہر شخص کا انفرادی و ذاتی معاملہ ہے،

اجتماعی زندگی کو دین و شریعت کی مداخلت اور ارادہ مطلق یعنی احکام خداوندی کے اتباع سے بالاتر رکھا جائے۔ اجتماعی سطح پر ملک میں ایسی قانون سازی ہونی چاہیے جو ارادہ خداوندی کو نافذ نہ کرے بلکہ عوام کی خواہشات اور پسند و ناپسند کا خیال رکھے دنیا کے تمام تصورات برابر اور یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ غرض تمام اجتماعی معاملات کو الوہی ہدایت و دانش سے دور رکھنا ہی سیکولرازم کا خاصہ ہے۔ خیر و شر کی تمام جہات اور حلال و حرام کی تمام قیود و تحدید کے تعین کا حق اللہ تعالیٰ کو نہیں بلکہ افراد کی پسند اور مرضی پر موقوف ہے۔ ایسے حالات میں اگر لوگ نمازیں پڑھتے اور روزہ رکھتے ہیں تو انھیں ایسا کرنے دینا چاہیے کہ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ اجتہاد کے ذریعے ایسی قانون سازی ہونی چاہیے کہ قرآن و حدیث کے احکامات و حدود کو بھی بے کھٹکے اور بلا جھجک تبدیل کیا جاسکتا ہو۔ ڈاکٹر منظور احمد ایسے پاکستان کے حامی ہیں جو نظریاتی اور آئینی اعتبار سے اسلام کا ہم نہ نوا ہو۔ وہ اس سے بہتر ہندوستان میں اقلیت بن کر رہنا سمجھتے ہیں۔

سیکولرازم: مکمل تصویر:

اس تمام صورت حال کے اطلاق سے جو شخصیت اور فکر منصہ شہود پر آئے گی وہ Theodore Zelden کی کتاب میں دیے گئے اس گیت سے مختلف نہیں ہوگی جس میں بتایا گیا ہے کہ کیا چیزیں مل کر ایک French کو جو ذہن بخشی ہیں:

Catholic by my mother  
Moslem by my father  
A little Jewish by my son  
Buddhist on principle

Alcoholic by my uncle  
Neurotic by my grandmother  
Classless by long-felt shame  
Depraved by my grandfather

Royalist by my mother  
Fatalist by my brother  
Communist by my father  
Marxist by imitation....

Double-dealing like a lawyer  
Sensual like a miser  
Tough like a soldier  
Gentle like a drunkard....

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۱۷۷

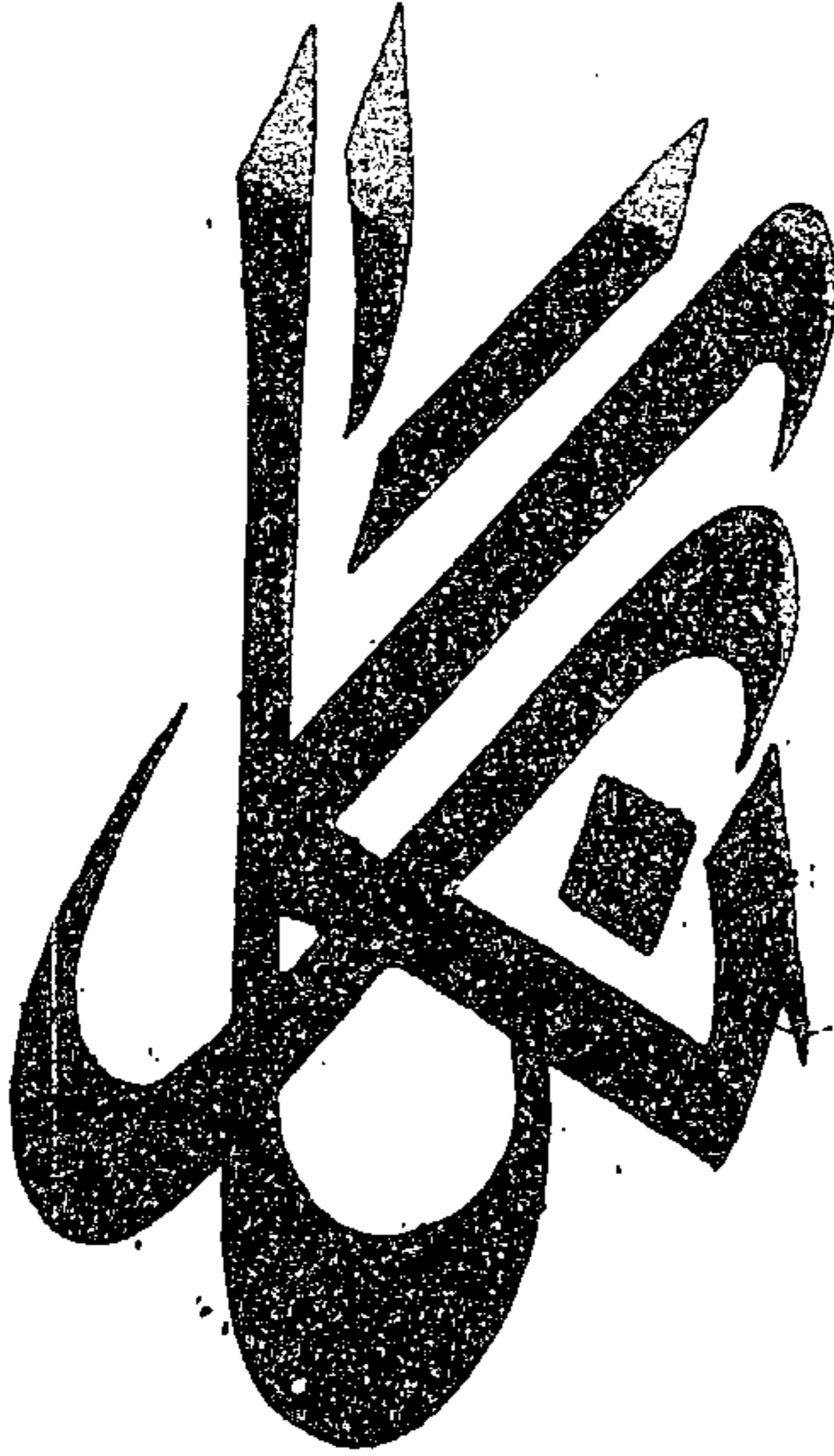
Deceived by my better half  
Pestered by my concierge  
Hated by my neighbours  
Detested by dogs

Atheist, O thanks to God  
Atheist, O thanks to God!

1- Theodore Zeldin, *The French*, London: The Harvill Press, 1997, pp.509-10.

مرزا غلام احمد قادیانی سے متعلق  
نیاز و نگار کے حوالہ جات کی عکسی نقول

نمبر ۶۱



بیتنا بی کاپی

بھرنے پتے

بنا لائن بچید

دستی روئے

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۲۸۰

کی مسلم اکثریت نے احمدی جماعت کو کافر قرار دے کر اس کے خلاف ہنگامہ قتل و خونریزی برپا کیا۔ اس سلسلے میں جو کتب زیادہ تکلیف دہ ہیں  
 کو کفر احمدی جماعت کو کافر تسلیم کر لیا جائے تو یہی ان کو قتل و ذبح کرنا ہاں کا اسلام اور شیوہ امر و نہی تھا۔ اس کے بعد جب میں نے جانا تھا ابا  
 پلٹنے کے قازین احمدیوں کو کافر کہتے ہیں تو تحقیق و مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ان کا سب سے بڑا الزام احمدیوں پر ہے کہ وہ رسول اللہ  
 کو خاتمہ حاصل تسلیم نہیں کرتے۔ یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی، کیونکہ اگر یہ سچ ہو تو بھی کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اس جرم میں انہیں  
 دار پر چڑھا دے، جبکہ پاکستان کی غیر مسلم لاکھوں آبادی رسول اللہ کو رسول ہی تسلیم نہیں کرتی ہے جابجا انہیں خاتمہ حاصل سمجھا۔ اور ان کو  
 نرون زدنی نہیں سمجھا جاتا۔ اس سلسلے میں مجھے احمدی جماعت کے لڑکھڑاہنے والے کا شوق پیدا ہوا اور میں تجب میرزا صاحب کی تصانیف  
 کا مطالعہ شروع کیا تو میں اور زیادہ حیران ہوا کیونکہ مجھے ان کی کوئی تحریر ایسی نہیں کی جس سے اس الزام کی تصدیق ہو سکتی ہو بلکہ برخلاف  
 اس کے میں نے ان کو ختم رسالت کا اقرار کرنے والا واضح معنی میں عاشق رسول پایا۔ اسی کے ساتھ میں نے میرزا صاحب کی زندگی کا  
 مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ یقیناً بڑے مخلص بڑے باعمل بڑے عزم و ہمت والے انسان تھے اور انہوں نے مذہب کی صحیح روح کو  
 سمجھ کر اسلام کی وہی حقیقی تعلیم پیش کی جو محمد نبوی و خلفاء راشدین کے زمانہ میں پائی جاتی تھی۔ میں نے ان کے مخالفین کی بھی تحریریں  
 پڑھیں، جن میں میرزا صاحب کو کافر، ملعون اور مکار و قدار کہا گیا ہے، لیکن میں نے ان تحریروں میں مطلقاً کوئی ذمہ نہیں پایا۔

میرزا صاحب کے خلاف دوسرا الزام یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مہدی موعود اور مثیل مسیح کہتے ہیں، سو اس کو میں نے کبھی قابلِ توجہ  
 نہیں سمجھا کیونکہ میں سب سے ان روایات کا قابل ہی نہیں، تاہم میرزا صاحب کے حالات زندگی کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا  
 ہوں کہ وہ روایات متداولہ کی بنا پر واقعی اپنے آپ کو مہدی موعود یا مثیل مسیح کہتے تھے اور اگر ایسا سمجھنے اور سمجھانے کے بعد انہوں نے ایک  
 باہل جماعت مسلمانوں میں پیدا کر دی تو اس کے خلاف مجھے اعتراض ہوتا ہو لیکن ان لوگوں کو کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں جو خود مہدی موعود  
 اور مثیل مسیح کے ظہور کی پیش گوئیوں کو صحیح سمجھتے ہیں۔

میرا مسلک مذہب کے باب میں یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ قطعاً مسلمان ہے اور کسی کو اسے غیر مسلم یا کافر  
 کہنے کا حق نہیں پہنچتا کیونکہ ہر مسلمان خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، کم از کم دوہرانیت و رسالت رسول کا طور قابل ہے اور اسلام  
 ہم صرت اسی عقیدہ کا ہے، رہے فردی مسائل سو ان کا اختلاف کوئی ایسا اختلاف نہیں جس کی بنا پر کسی جماعت کو اسلام سے خارج کر دیا جا  
 جس حد تک ذاتی عقاید کا تعلق ہے، مجھے شیعی، سنی، فلاہی، احمدی، اہل قرآن، اہل حدیث، مقلدین وغیر مقلدین سب سے اختلاف  
 ہے۔ کسی سے کم کسی سے زیادہ۔ لیکن میں ان سب کو مسلمان اور ہمیت، اجتماعی کافر سمجھتا ہوں۔ ہاں اس سے ہٹ کر جب سوال ترجیح و حقوق  
 کا سامنے آئے تو میں بے شک یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ اس وقت احمدیوں سے زیادہ باہل و منظم جماعت کوئی دوسری نہیں اور جب تک  
 ان کی تنظیم قائم ہے میں ان کو سب سے بہتر مسلمان کہتا ہوں گا، خواہ اپنی نااہلی، کم ہمتی، بے علمی یا بر خود غلط عقل بندی کی بنا پر میں کسی  
 ان میں شامل نہ ہو سکوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ احمدی جماعت فرشتوں کی جماعت ہے اور وہ کبھی کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے، لیکن میں  
 پر ضرور چاہتا ہوں کہ اگر دوسری جماعتوں میں فی ہزار کوئی ایک سچا مسلمان ملے گا تو ان میں ۵۰ فی صدی ایسے افراد مل جائیں گے جو اپنی  
 انسانیت اور بلند اخلاق کی لحاظ سے واقعی مسلمان کہے جاسکتے ہیں، پھر جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس جماعت کی یہ عزیمت و تنظیم  
 نتیجہ ہے صرف میرزا صاحب کی بلند شخصیت کا تو پھر وہ مجھے مہدی موعود سے بھی زیادہ اونچے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ اول تو ظہور مہدی کا  
 نتیجہ ہی سب سے بے معنی سی بات ہے، لیکن اگر کسی دو تشریف بھی لائے تو شاید اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکیں گے جو میرزا صاحب نے کر دکھایا۔

A.NO.2136/57

اکتوبر ۱۹۶۰ء

کتاب

قیمت فی کاپی  
ہندوستان  
پاکستان  
۶۵ روپے  
۱۲

سالانہ چندہ (میں صارفین ساکن)  
ہندوستان  
پاکستان  
دس روپے

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۲۸۲



انہوت و ہمدردی کا اور اس حرکت و عمل کا جو رسول اللہ کے کردار کی تنہا خصوصیت اور اسلام کی تنہا اساس و بنیاد تھی۔ میرزا غلام احمد صاحب نے اسلام کی مدافعت کی اور اس وقت کی جب کوئی بڑے سے بڑا عالم دین بھی دشمنوں کے مقابلہ میں آنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا، انہوں نے سوتے ہوئے مسلمانوں کو جگایا، اٹھایا اور چلایا، یہاں تک کہ وہ چل پڑے اور ایسا چل پڑے کہ آج روئے زمین کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ان کے نشانات قدم سے خالی ہو اور جہاں وہ اسلام کی صحیح تعلیم نہ پیش کر رہے ہوں۔

پھر ہو سکتا ہے کہ آپ ان حالات سے متاثر نہ ہوں، لیکن میں تو یہ کہنے اور سمجھنے پر مجبور ہوں کہ یقیناً بہت بڑا انسان تھا وہ جس نے ایسے سخت وقت میں اسلام کی جانبازانہ مدافعت کی اور قرون اولیٰ کی اس تعلیم کو زندہ کیا جس کو دنیا بالکل فراموش کر چکی تھی۔

۱۔ امر کہ میرزا صاحب نے خود اپنے آپ کو کیا ظاہر کیا۔ سو یہ چنداں قابل لحاظ نہیں، کیونکہ اصل سوال یہ نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو کیا کہا، بلکہ فرق یہ کہ کیا کیا اور یہ اتنی بڑی بات ہے کہ اس کے پیش نظر (قطع نظر روایات و اصطلاحات سے) میرزا صاحب کو حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ہمدی کہیں کیونکہ وہ ہدایت یافتہ تھے، مثیل مسیح کہیں کیونکہ وہ روحانی امراض کے مصلح تھے اور نفل نبی کہیں کیونکہ وہ رسول کے قدم پر قدم چلتے تھے۔

۲۔ اب رہا یہ امر کہ غیر احمدی لوگوں میں وہ رشتہ معاشرت قائم نہیں کرتے اور ان کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے تو اس پر کسی کو کیوں اعتراض ہو۔ کیا آپ کسی ایسے قائدان میں شادی کرنا گوارا کریں گے جس کے افراد آپ کے مسلک کے مخالف ہیں اور کیا آپ ان لوگوں کی اقتدا کریں گے جو اپنے کردار کے لحاظ سے مقتدا بننے کے اہل نہیں ہیں۔

احمدی جماعت کا ایک خاص اصول زندگی ہے، جس پر ان کے مرد ان کے بچے اور ان کی عورتیں سب یکساں کار بند ہیں اس لئے اگر وہ کسی غیر احمدی مرد یا عورت سے رشتہ ازدواج قائم کریں گے تو ان کی اجتماعیت یقیناً اس سے متاثر ہوگی اور وہ کیرنگی و ہم آہنگی جو اس جماعت کی خصوصیت خاصہ ہے ختم ہو جائے گی۔ آپ اس کو قصص کہتے ہیں، اور میں اس کو احتصاصاً غیر امت ہمیر رہی برقی صاحب کی کتاب سوا اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ جس حد تک بانی احمدیت کی زندگی و تعلیم احمدیت کا تعلق ہے وہ تلبیس و کتمان حقیقت کے سوا کچھ نہیں۔ اور مجھے سخت افسوس ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ احمدیت کے مخالفین میرزا غلام احمد صاحب سے بہت سی ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جو انہوں نے کہیں نہیں کہیں، خصوصیت کے ساتھ مسئلہ ختم نبوت کو عام طور پر لوگ بھی سمجھتے ہیں کہ میرزا صاحب، رسول اللہ کو خاتم النبیین نہیں سمجھتے تھے، حالانکہ وہ شدت سے اس کے قائل تھے کہ شرعی نبوت ہمیشہ کے لئے رسول اللہ پر ختم ہو گئی اور شریعت اسلام دنیا کی آخری شریعت ہے۔

## رعایتی اعلان

من ویزدیں - ذہبی استفسارات و جوابات - نگارستان - جالستان - مکتوبات نیازتین حقے - ذہب - حسن کی عیالیاں  
 فراست الید - مجموعہ استفسار و جواب جلد سوم - قول فیصل - شہاب کی سرگزشت - نقاب اٹھ جانے کے بعد  
 حیدر - حیدر - حیدر - حیدر - حیدر - حیدر - حیدر - حیدر - حیدر - حیدر

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر مع حصول مرن چالینس ڈروپ میں مل سکتی ہیں۔  
 میزبان: مہاشیہ  
 نیچر نگار لکھنؤ

R.NO. 2136/57

ستمبر ۱۹۶۰ء



قیمت فی کاپی  
ہندوستان  
پاکستان  
۵۵ روپے  
۱۲

سالانہ چندہ (مع صارفہ پٹری ساٹھا)  
ہندوستان  
پاکستان  
دس روپے

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۲۸۴

کے حق میں واگزارت کر دی گئی ہیں۔

جس وقت میں نے حضرت میرزا صاحب کے بیت الفکر، بیت الرعا، بیت الریاضت، مسجد نور، مسجد قحطی اور منارہ مسجد کو  
کو دیکھا تو ان کی وہ تمام خدمات سامنے آگئیں جو تحفظ اسلام کے سلسلہ میں ایک غیر منقطع جدوجہد کے ساتھ ہزاروں مصائب  
جامل کر انہوں نے انجام دی تھیں اور جن کے فیوض اس وقت بھی دنیا کے دور دراز گوشوں میں جاری ہیں۔

جس وقت میں قادیان پہنچا، اتفاق سے ایک جرمن احمدی ولیم نامی بھی یہاں مقیم تھے، یہ ایک درویش صفت انسان ہیں جو  
ہینوں سے احمدیہ جماعت کے مختلف مرکزوں اور اداروں کے ساتھ مطالعہ میں معروض ہیں، میں ان کو دیکھتا تھا اور حیرت کرتا  
تھا کہ جرمنی ایسے سولہ ملک کا باشندہ ہندوستان کی شدید گرمی کو کس طرح خوشدلی سے برداشت کر رہا ہے، لیکن جب میں نے  
اس کے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ ان کو شدید سفر کا احساس تک نہیں پہنچ رہا ہے:

عشق ہر جامی بردار ہے سالانہ کی برد

میں نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے عیسوی مذہب چھوڑ کر اسلام کیوں قبول کیا، تو اس کا سبب انہوں نے "اسلام  
کی بلند اخلاقی تعلیم" ظاہر کیا جس کا علم انہیں سب سے پہلے جرمنی کی جماعت احمدیہ کو دیکھ کر ہوا تھا۔ یہ جماعت بخدا حضرت و  
افریقہ میں جس جوش و ہنگام کے ساتھ خدمت اسلام میں معروض ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ دنیا کی مختلف  
زبانوں میں قرآن پاک کے تراجم صدر درجہ سلیقہ و اہتمام کے شایع کر رہے ہیں۔ چنانچہ انگریزی، جرمنی، ڈچ اور سواحلی زبان  
کے ترجمے خود میں نے بھی دیکھے اور ان کے اس عزم و دل کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

میں نے یہاں سے رخصت ہوتے وقت اس قطعہ زمین کو بھی دیکھا، جہاں حضرت میرزا قاسم احمد صاحب آسودۂ خواہی  
اور ان کی وہ تمام کاہانہ زندگی سامنے آگئی، جس کی کوئی دوسری نظیر مجھے اس دور میں تو کہیں نظر آئی نہیں۔

کیست کو کوشش فرما دلشاز باز و در  
مگر آن نقش کہ از قبتہ بخارا ماند

## تاریخ ویدی لٹریچر

نواب سید حکیم احمد

یہ تاریخ اس وقت سے شروع ہوئی ہے جب آریہ قوم نے ہندو اول یہاں قدم رکھا اور ان کی آریہ مذہبی کتاب رگ وید اور  
آئی، چنانچہ داخل ہونے کے اپنی کتاب کو اسی عہد سے شروع کیا ہے اور ویدی لٹریچر کے متعلق تاریخی ذمہ داری اور اپنی کوئی پہلو  
ایسا نہیں ہے جس کو آپ نے نہایت وضاحت و سلاست کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پہلے تحقیق انہوں نے مشرقی مغرب سے بھی کافی استفادہ کیا ہے۔ کچھوں کے ترجمہ میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اصل  
عبارت کا کوئی لحاظ ترک نہ ہونے پائے۔ اس کتاب میں جو زبان اختیار کی ہے وہ بہت سلیس اور عام فہم ہے۔

یہ کتاب صرف ویدی بوب بلکہ اس سے پیدا ہونے والے دوسرے مذہبی و تاریخی لٹریچر کے لحاظ سے بھی اتنی کل چیز ہے کہ  
اس کے مطالعہ کے بعد کوئی تسلی باقی نہیں رہتی اور اردو زبان میں بیخود سب سے پہلی کتاب ہے جو خاص موضوع پر اصل قدر احتیاط  
و تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے۔ قیمت چار روپے۔  
نیشنل بک کارپوریشن

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۱۹۸۵

R.No. 2136/57

جولائی ۱۹۶۰ء

خاص نمبر



قیمت فی کاپی  
پاکستان  
ہندوستان  
دو روپے

ساز و چھاپہ  
ہندوستان  
پاکستان  
دس روپے

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۱۹۶۰ء



## ایک وضاحت

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا مضمون ”پاکستان“ روزنامہ نوائے وقت کی تین مسلسل اشاعتوں، بعد ازاں پندرہ روزہ معارف فیچر میں طبع ہوا۔ بعض معتبر ذرائع سے خبر ملی ہے [جس کی فی الحال تصدیق نہیں کی جاسکی] کہ محترم ڈاکٹر صاحب کا متذکرہ مضمون متن میں بعض تبدیلیوں کے ساتھ انٹرنیٹ پر Upload کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی طرف سے اب تک ان کے متذکرہ مضمون کے مندرجات سے رجوع کی کوئی معتبر شہادت مہیا نہ ہو سکی لہذا انٹرنیٹ پر اس مضمون کی تبدیلی کو تحریف پر محمول کیا جانا قرین قیاس ہے [حسن ظن یہ کہتا ہے کہ شاید محترم ڈاکٹر منظور احمد بھی اس کارروائی سے لاعلم ہوں۔] اگر متذکرہ مضمون کے مندرجات میں تحریف کی روایت نادرست بھی ہو تو بھی اس مضمون کی کمیابی، حوالوں کے لیے عدم فراہمی، دیانت علمی اور زیر تالیف کتاب میں نقل کیے گئے حوالہ جات کی ثقاہت کے پیش نظر اس کی عکسی نقل دی جا رہی ہے۔



"پاکستان" اور "پاکستانی" سے الفاظ ہیں۔ اس نام کی کوئی قوم برصغیر میں نادر نہ دنیا کے کسی دوسرے کونے میں آباد تھی۔ یہ بات کہ محمد بن قاسم کی ہندوستان میں آمد یا ۸۵۷ء کی جنگ آزادی، پاکستان کی تشکیل کا پہلا قدم ہے، ہندوستانی مسلمانوں کو تاریخی شخص فرام کرنے کی مبالغہ آمیز کوشش ہے۔ خود ہندوستان میں مسلم لیگ کی تشکیل کا مقصد برطانوی حکومت کے لیے دکانداری کے جذبوں کو ابھارنا اور ہندوستان کے مسلمانوں کے مفادات اور سیاسی حقوق کا تحفظ کرنا تھا۔ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو بڑے مذاہب گروہوں کی حیثیت سے تو ہندوستان میں موجود تھے لیکن مسلمانوں کا ہمیشہ مجموعی ایک "تہذیبی اکائی" ہونے کا تصور چھٹی صدی کی سیاسی تحریکوں کے زیر اثر پیدا ہوا۔ مسلمانوں کی تہذیب میں، یہودی مذہب کی طرح "جلاوطنی" اور باطن سے منتشر ہو جانے کا کوئی تصور (Diaspora) بھی نہیں تھا۔ یہودیوں کے برعکس، جلاوطن ہو کر نہیں بلکہ مروجہ اقلیت کے طور پر دنیا کے مختلف ملکوں میں داخل ہوئے اور وہاں سلطنتیں قائم کیں۔ یہی صورتحال ہندوستان کی بھی تھی۔ یہاں مسلمانوں کا کوئی چھوٹا یا بڑا Diaspora نہیں تھا۔ اور انہیں جلاوطنی کے "ڈک" کا کوئی اجتماعی احساس بھی نہیں تھا۔ اس لیے ہندوستان میں مسلمان ایک Diaspora کی زینت سے آداب نہیں تھے کہ یہودیوں کی طرح اصلی مستقر کی طرف مراجعت کی کوئی داغی آرزو ان کے تحت الشعور میں پوسٹ ہو۔

مسلم لیگ کے قیام کے بعد مسلمانوں کو ہندوستان میں ایک علیحدہ ریاست کے تصور کی تشکیل میں ۳۳ سال کا عرصہ لگا اور ۱۹۴۷ء میں قرار دیا گیا کہ پاکستان کی گئی۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بے بعد دیگرے بیٹوں رسالتیہ میں سے کسی میں بھی اسلامی ریاست کا قیام افراط و تفریط میں شامل نہیں ہے۔ ۱۹۳۲ء میں ہندوستان میں خود مختاری کا حصول جس میں مسلمانوں کے سیاسی، مذہبی اور دیگر حقوق کی حفاظت اور دیکھنے والے مذہب اور کیونٹیز سے دوستی اور اتحاد نسبت اہم تھی۔ ۱۹۴۷ء میں مکمل آزادی جس میں وفاقی اکائیوں کو خود مختاری ہونا اور دستور کی ترمیم حاصل ہو اور ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کی اکثریتی علاقوں پر مستقل آزاد ریاستوں کے قیام کا مطالبہ شامل تھا۔ ان میں کسی دستور میں بھی "اسلامی مملکت" کے قیام کا نصاب اعلیٰ میں موجود نہیں تھا۔ البتہ یہ بات مفروضہ کرتی تھی کہ مسلمان بریاستوں کو اسلامی ہی کہا جائے

گا جس طرح اس سے نکل کر ہندوستان میں مسلمان بادشاہتیں اسلامی کے نام سے سوسم ہوتی رہی ہیں۔ اگر پاکستان کا مطالبہ جیسا آجکل مفروضہ کیا جاتا ہے "اسلام" کے تحفظ کی خاطر کیا گیا تھا تو ہندوستانی مسلمانوں کا کیا تصور تھا کہ ان کو اور ان کے "اسلام" کو ہندوستان کی اکثریتی تہذیبی اکائی کے دم و دم پر چھوڑ دیا جائے۔ اس ڈیڈ وڈ فکری کے نتیجے میں یہ قرار دیا ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی تقسیم کا باعث تو بنی گئی، لیکن "اسلام" اور مسلمانوں کی ایک تہائی آبادی کے لیے کوئی واضح اور محفوظ قلعہ نہ بن سکا۔ سوچنے کی بات تھی کہ متحد ہندوستان میں مسلمان کوئی معمولی اقلیت نہیں ہوتے، بلکہ اپنی تعداد کے اعتبار سے اور ملکہ طور پر اپنی قوم و فرامت اور امت کی بنیاد پر ہندوستانی قسمت (Destiny) کے فیصلوں میں برابر کے حصہ دار ہوتے۔ اتنی بڑی اقلیت کے حقوق کو نظر انداز کر دینا ہندوستانی ریاست کے بس میں نہیں ہوتا۔

برصغیر کے مسلمانوں کی دشواری یہ تھی کہ ان میں ایسے دانشور جو زمانہ جدید کے سماجی، عمرانی، معاشی اور سیاسی مسائل سے واقف ہوں نہ ہونے کے برابر تھے۔ مسلمانوں میں جدید تعلیم بہت تاخیر سے آئی، اس لیے اتنے کم عرصہ میں دانشوری کی وہ اہل ترین مقدار (Critical Mass) فراہم کرنے سے قاصر رہی جو حالات کا صحیح اندازہ کرنے کے قابل ہو اور معاشرہ میں تعمیر و ترمیم کا باعث ہو سکے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی دانش کا ایک غالب حصہ پاکستان کے تصور کو مسلمانوں کے لیے قابل ترجیح بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ایک حلقہ اس کی تشکیل کی جدوجہد میں اسلام کو ایک محرک کے طور پر استعمال کیے جانے کے خلاف تھا۔ مثلاً خود مولانا مودودی اور جماعت احرار اسلام اس خیال کے حامل تھے کہ مسلم لیگ کے طریق کار سے ایک "اسلامی مملکت" وجود میں آنا ناممکن ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی ایک سلطنت تو بن سکتی ہے لیکن اس کو "اسلامی" کی صفت سے سوسم کرنا یا یہ سمجھنا کہ اس کے قائدین اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں صحیح نہیں ہوگا۔ اس سب کے باوجود ۱۹۴۷ء کے بعد بہت جلد مسلمانوں کا سارا عظیم، اسلام سے جذباتی لگاؤ کے زیر اثر پاکستان کا مویہ بن گیا اور علماء کی آراء کے علی الرغم پاکستان کے قیام پر متفق ہو گیا۔ یہ بات تحریک پاکستان کے رہنما سمجھنے سے قاصر رہے کہ اس اتحاد کی بڑی جہد، اسلامی جذبہ کے ساتھ یہی تھی کہ ایک "غیر" (ہندوستان کا دورانیہ) سب سے سب سے، جس کے خلاف، (خاص طور پر

اقلیتی علاقوں کے) مسلمان متحد ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ اس "غیر" کے سامنے سے ہٹ جانے کے بعد کوشش اسلامی جذبہ کے زیر اثر مسلمانوں کو ایک قوم کی صورت میں جمع رہنے پر مجبور کرنا ترمیم قیاس نہیں تھا۔ یورپ کی دوسری دو بڑی جنگیں عیسائیت کے مشترک ہونے کے باوجود اور سماج مذہبی جنگیں مذہب نے سب ہی لڑی تھی تھیں اسلامی تاریخ میں کسی ایسے مثالیں کم ہیں جہاں مذہب نے اپنے آپ کو تمام حیرتوں کے سیاسی اتحاد کا محور بن سکا۔

پاکستان کا مسئلہ اس لگری ابھام سے پیدا ہوا کہ آیا ایک نئے ملک کا قیام اسلامی نظام کے قائم کرنے کے لیے ضروری تھا یا مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے؟ اور کیا واقعی مسلمانوں کے حقوق متحد ہندوستان میں اتنی کثیر اقلیت ہونے کے باوجود پامال کیے جائیں گے یا نہیں؟ ان باتوں پر سب سے حاصل سورا بھارت نہیں کی گئی بلکہ واقعی ضرورتوں کے پیش نظر مولانا مودودی نے اس بات پر کام چلایا جاتا رہا۔ مولانا نے یہ کہنا شروع کیا کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا جذباتی محرک اسلام کی حفاظت کا نعرہ اور اسلامی نظام کا قیام تھا۔ مسلمانوں کی روحانی طبیعت میں اسلامی نظام کے ذریعہ موجودہ زندگی سے ایک ارضی جنت بنانے کی خواہش بڑی شدت سے موجزن تھی۔ قائد اعظم نے بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اس محرک کو استعمال کرنے میں کوئی قیاحت محسوس نہیں کی۔ ان کی صدارت میں نواب بہار یار جنگ کی تقریریں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو براہمیت کرنے میں بڑی معاون ثابت ہوئیں اور مولانا مودودی نے انہیں انصاری کی پس پردہ کوششوں سے مسلمان علماء میں سے کچھ لوگ تحریک پاکستان کی حمایت کرنے لگے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر پاکستان بن گیا جیسا کہ نظر آتا ہے تو اس کو محض علی جناح اور ان جیسے سیکرٹریوں میں محدود نہیں جا سکتا۔ محض علی جناح نے عمومی اصطلاحات اور اسلام کی آفاقی اقدار کے بیان سے زیادہ کئی اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ پاکستان میں اسلامی نظام کی عملی صورت کیا ہوگی، اس کو کون نافذ کرے گا؟ کیا وہ تمام قوانین جو اس سے نکل اسلامی ریاستوں میں اسلامی شریعت کے نام سے رائج تھے۔ ان کو بھلے پاکستان میں نافذ کر دیا جائے گا یا نئے قوانین بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ اگر نئے قوانین بنائیں گے تو ان کے شرعی اور غیر شرعی ہونے کا فیصلہ کون کرے گا۔ یہ مسائل تو صرف پاکستان اور اسلام کے تقاضے کے حوالے سے تھے۔ ان کے علاوہ



بھی مسلم لیڈر شپ کو پاکستان کے نظم و نسق، قانون اور دستور صوبوں کے تعلقات، پاکستان میں بسنے والوں کی اسکول اور خواہشات جیسے مسائل کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا اور نہ مسلم دانشوری کے پاس ان مسائل کا بااستیجاب مطالعہ کرنے کی استعداد موجود تھی۔ عوام کو تو اس بارے میں خبر نہیں دیا جاتا ان لیے اور اسلام ان کے لیے ایک ارضی نبت کی آرزو تھا لیکن جہاں تک مسلم لیگ اور ذہنی لیڈروں کے اسلام کے نام کا استعمال کرنے کا سوال ہے صاف ظاہر ہے کہ اس کے سامنے ان میں سے ہر طبقے کے لیے مختلف تھے۔ مغربی ذہن رکھنے والوں اور ذہنی سماج کے درمیان کوئی متفقہ رائے عمل تھا اور نہ مذہبی علماء کے پاس ایک جدید مسلم ریاست کا کوئی واضح تصور۔ مجھے کسی نے یہ بتایا تھا کہ مستقبلاً کی صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے مسلم لیگ نے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس میں مسلمانوں کے جنس رائٹرز (Think Tank) ڈاکٹر ظفر الحسن جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فلسفہ کے پروفیسر تھے، ڈاکٹر انصاف حسین قادری، ڈاکٹر ایم ایچ احمد اور دیگر دوسرے حضرات شامل تھے۔ کمیٹی کی رپورٹ میں ہندوستان کا ایک نقشہ بھی شامل تھا جس میں اکثریتی صوبوں کے علاوہ دوسرے بہت سے چھوٹے بڑے حصے رنگ کے گول نشان بنے ہوئے تھے جو ان مسلمان ریاستوں کے تھے جو بالآخر پاکستان کا حصہ بننے لگیں گی۔ ایک ملک کے لیے یہی کیا تمنا کہ ان کے دو ٹکڑوں میں ایک ہزار ٹکڑوں کی دوری ہو سترادویہ کہ یہ ملک ہندوستان کے ان چھوٹے بڑے "جزیروں" پر بھی مشتمل ہو گا جو مسلمان والیان ریاست کے زیر نیش تھے اور جن کے چاروں طرف ہندوستان کے جوگ خون آشام منگولے کھڑے تھے۔ جتنا عقل و دانش بیاہ کرے۔

پاکستان کے وجود میں آنے کی داستان آئی سی سی ساری نہیں ہے جتنا ہمارا سارا اعظم سمجھا ہے یا اس کو سمجھایا جاتا ہے۔ یعنی مسلم لیگوں میں "نفاذِ حاکم" (یہ بھی بہم اصطلاح ہے) کی جڑیں اٹھی اور ہندوستان پاکستان کی تقسیم سے جو تاریخی عمل ہوا اس کے نتیجے میں مسلمانوں نے بڑی جدوجہد اور بڑی قربانیاں دیں کہ ایک فلسفہ میں حاصل کیا تاکہ یہاں تک وہ اپنے کے اس خواب کوئی جا۔ پرینا جاسکے۔ یہ بات حوالی اور علمی دونوں سطحوں پر ہوتی رہی ہے۔ عوامی سطح پر تو اس کو کسی بھی سیاسی مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن علمی سطح پر ہماری ہمت اور تعمیل اداروں میں جس حقیقی اور عقیدتی رویہ

کا فقدان ہے اس کی وجہ سے یہ بھی واضح نہیں ہو سکا کہ اس نفاذِ حاکم کے خدوخال کیا ہے اور کیا یہی وہی راہوں کی نشاندہی کرتی ہے یا پرانی ڈگر پر رجعت کی دعوت دیتی ہے۔ اگر نئی راہوں کی تلاش محسوس ہے تو ان کی بنیاد کیا ہوگی اور وہ کون سا نیا پیراڈائم ہوگا جس کے تحت نئے نظام زندگی کی تشکیل ہوگی۔

"پاکستان" ہمارے تشخص کا لازمی حصہ بن سکتے کی وجہ تصورات کا یہی ناقص ہے جو پاکستان کے قیام میں کارفرما رہے ہیں۔ اگر ہمارے تشخص کی اصل بنیاد ہمارا مذہب ہے تو یہ کسی ملک کا نام نہیں ہے۔ اگر "اسلام" اور "ملک" کے درمیان کسی قسم کی معینیت ہوتی تو دنیا کے تمام مسلمان عربی، عجمی، ہندوستانی، عراقی اور شمالی میں تقسیم نہیں ہوتے۔ بات یہ ہے کہ "اسلام" غیر "اسلام" کے، شامل تو ہو سکتا ہے، لیکن اگر یہ "غیر" موجود نہ ہو جیسا کہ غیر منقسم ہندوستان میں تھا، تو پھر ہمارا تشخص اپنی قوم قبیلہ صوبے، لسانی گروپ کی طرف الازوج کرے گا اور اس تشخص سے پہلو تہی کرنے اور دوسرے تصور سے تشخص جوڑنے کے لیے اس سے بھی زیادہ وقت و کار ہوگا جتنا امریکا میں نوآبادکاروں کو امریکی یا فرانس، انوں کو فرانسیسی اور جرمنوں کو جرمن بننے میں لگا۔ ہندوستان کے جن حصوں میں پاکستان بنانا کا اچھا ایک ذاتی تشخص پہلے سے موجود تھا جو اسلام سے متصادم نہیں تھا اور کفر کی طرح ان کے لیے اس ذاتی تشخص سے انکار لازمی نہیں تھا۔ پہلے سے موجود تشخص، دوسرے تشخص سے متصادم ہونے کی صورت میں ہی چھوڑا جاسکتا ہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ قبائلی، لسانی اور دوسرے پرانے میانات اور رجحانات پھر سے نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک سرسری مطالعہ بھی اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ حضور ﷺ کی روایت کے فوراً بعد جو صورتحال پیدا ہوئی ان میں بڑا دخل مختلف قبیلوں کے قسطنطنیہ تشخص کا بھی تھا جو اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی فوق قبائلی (Supra tribal) لیڈر شپ کے تحت تاریخی ہو گیا تھا لیکن حضور ﷺ کی روایت کے بعد دو بارہ عود کر آیا۔ پہلے دو خلفائے راشدین کی حکمت عملی کے سبب اگرچہ دو پھر تاریخی ہو گیا، لیکن فوراً بعد ہی آہستہ آہستہ اس نے ریاستی اداروں پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی ملکیت کوئی خصوص اور ہمیشہ اوقات مختار ملکوں میں تقسیم ہو جانے سے پس پشت بھی ایک بڑا اثر ہے۔

"پاکستان" کو نام حالات میں بھی پاکستانیوں کی فطرت

ہوئے بننے میں بھی طویل عرصہ کی ضرورت تھی لیکن ایسے حالات میں جب اس تصور کے تضاد یا اس پرستہ اور حرکات کارفرما ہوں اور عالمی سیاست بھی دخل انداز ہوتی رہتی ہو تو ہر یہ مسئلہ بجائے Problematic بن جاتا ہے۔ شرقی پاکستان کا بظلمہ پیش ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام بجائے حوراء تھا تو حرکت نہیں تھا کہ پہلے سے "میں شدہ تشخص کو جو اسلام کی ضد بھی نہ ہو تم کر سکے۔ اس کی قابل عمل صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ تصوراتی وحدت کی جگہ قابل حصول زمینی اغراض و مقاصد اور مشرک مفادات "پاکستانیت" کی بنیاد بنیں، جو کسی تشخص کی قربانی دیے بغیر مجموعی ترقی اور بہتری کے امکانات رکھتے ہوں۔

قیام پاکستان میں مسلمانوں کی جدوجہد اور قربانیوں سے انہار کیے بغیر پاکستان کے مسئلہ کو سمجھنے کے لیے چند اور حکایتی پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

غیر منقسم ہندوستان میں ہندوؤں کا ایک معتد بہ اور موثر طبقہ ہندوستان کے مسلمان اکثریتی علاقوں کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ علاقے اگر آزاد کر دیے گئے تو اپنے درونی معاشرتی تضادات کی وجہ سے یا تو خود ختم ہو جائیں گے یا مستقل طور پر بد امنی اور بے چینی کا شکار رہیں گے۔ اس لیے ان حصوں کو کٹ کر الگ کرنے سے ہندوستان کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ ہندوستان میں ہندوؤں کی اس فکر کے ساتھ ایک اور موثر طبقہ بھی ہندوستان کی تقسیم کا، یا کسی ایسے انتظام کا حامی تھا جہاں اس کو اپنی مقصد براری کے لیے مواقع فراہم ہوں۔ تاریخ کے اس حصہ کے متعلق جواب تک قیامی تھا، شاید ملنے لگے ہیں۔ برطانوی حکومت کی سرکاری دستاویزات ان کی مدت اخفا ختم ہونے کے بعد اب لوگوں کی دسترس میں ہیں۔ بمطابق اور مغربی طاقتوں کی دلچسپی پاکستان کی تشکیل میں اس لیے تھی کہ ان کو آئے والے لوگوں میں مشرق وسطیٰ اور روس دونوں میں اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے جغرافیائی اعتبار سے ایک ایسا ملک مہیا ہو سکے گا جس کو وہ آسانی سے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کر سکیں گے اور ان کو شمال مغربی علاقوں میں ہوائی اڈے اور کراچی کی بندرگاہ ایک سمندری سہولت کے طور پر میسر ہو سکیں گے۔ پاکستان کے قیام میں یہ سارے محرکات کام کر رہے تھے، جو اس نئی ریاست کے لیے پیچیدہ اور جلد مل نہ ہونے والے مسائل کا پیش خیمہ تھے۔

ڈاکٹر بشیر کی یادداشتوں میں ۱۹۴۷ء کی ایک

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۳۹۱

وہاں پر لکھی ہے جس کے مترادف پر "انجمنی خیر" لکھا ہے اور جس پر کسی کے دستخط نہیں ہیں اس میں لکھا گیا ہے کہ مشرق وسطیٰ اور اس کے محل کے ذخائر کے لیے کسی بھی دفاعی منصوبہ

۵۔ جنگ عظیم کے بعد کی عالمی منصوبہ بندی کے پیش نظر اس نے زائید ریاست کے مولیٰ اہداف کا رخ کیا ہے۔

میں وادی سندھ مغربی پنجاب، بلوچستان بڑی اہمیت کے ملک ہیں۔ اگر اس خط پر نظر اٹھائیں تو دفاعی حصار کی دیوار میں آپ کو پانچ اہم اہلیں نظر آئیں گی اور یہ ترکی، ایران، عراق،

۶۔ بیسویں صدی کے نصف آخر اور اکیسویں صدی کے شروع میں اس اور ہائی ٹیکہ"وں کے ساتھ جن میں سرمایہ دارانہ اور جمہوری اقدار بالادست ہوں گی نبرد آزما ہوتے کا رخ کیا ہوگا۔ اگر جمہوری رخ اختیار کرنا ہو تو اس کے اور اسلامی رخ کے فیرونی تضادات کے حل کا طریقہ کیا ہوگا؟

افغانستان اور پاکستان ہیں۔ سویت یونین کی جارحیت کے مقابلہ کے لیے کراچی ہی وہ بندرگاہ ہے جہاں سے دفاعی حملے ممکن ہے۔ یہ سمندر قلم ملکوں سے رابطہ کا ذریعہ ہے اور ان سمندری راستوں کی حفاظت کا خاصا کام ہے جو جنگ سے گھرے ہوئے ہیں اور جو روسی فضائی حملوں کا نشانہ بن سکتے ہیں یا

پاکستان کے بنیادی تصور کا یہ اہم ہر قسم کی تعمیر و ترقی کے امکانات کو کھلا چھوڑ دیتا ہے جس کے نتیجے میں انتشار و ترقی کے ساتھ مرکز گزیر تصورات کو آسانی سے دہرانے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔

جہاں پر فوجیں آڑھتی ہیں، دولت مشترکہ برطانیہ اور امریکا کو مشرق وسطیٰ میں اپنے حساس مفادات کے تحفظ کے لیے سب سے زیادہ مناسب اور محفوظ مقام پاکستان کی سرزمین ہے۔ پاکستان میں دفاعی منصوبہ کی کلیدی جڑیں پھیل رہی ہیں اور متعلقہ علاقوں پر کسی حملہ کی صورت میں پیش آسکتا ہے پاکستان بننے کے بعد آنے والے دنوں میں جو کہ ہوا و زمین الٹو اکی کنٹرول حاصل کر لینے کے لیے اسی منصوبہ کا حصہ تھا۔

"پاکستان کے مسئلہ" کے اس کے مادہ محمد اعلیٰ بھٹو کی ہیں اور یہ اہل بنیادی طور پر اس اجتماعی ہیرو ازم سے متعلق ہیں جو پاکستانی مسلمانوں کو دھری اتوام سے تیز کرتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے ہندوستان میں دوقومی نظریہ پیدا ہوا۔ اس ہیرو ازم کا ترقی یافتہ مسلمانوں کے مذہب اور معاشرتی بنت سے ہے جن کے مجموعہ کو آپ انگریزی (Mind set) بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کی وضاحت تھوڑی تفصیل اور تجزیہ کی طالب ہے۔

مندرجہ بالا باتوں کا اگر خلاصہ کیا جائے تو یہ ہے اس طرح ہو سکتا ہے۔

جب انگریزی کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اور مشابہ کہا جاتا ہے کہ مغربی ذہن مشرقی ذہن سے مختلف ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ انسانی گروہوں کے درمیان کچھ

۱۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا مسلمان کے حقوق کا تحفظ اور آبادی کے لحاظ سے ملک کے نظم و نسق کو چلانے میں ان کا حصہ تھا۔ یہاں تک تو بات واضح اور غیر مبہم ہے۔

حرکات، عقائد، اقدار، سماجی رویے، رسم و رواج اور طور طریقے مشترک ہوتے ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ یہ تمام اوصاف ہر شخص میں بندھنا شروع ہوں۔ ہر گروہ میں کچھ اشخاص اس گروہ کا رکن ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف بھی ہو سکتے ہیں، لیکن انفرادی، یا نجوی ذہن ان خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے جو گروہ کے اکثر ارکان میں پایا جاتا ہے۔ اسی

۲۔ صحن پاکستان بنانے کا مقصد ہم اور غیر واضح تھا اور متضاد محرکات کا ذکر تھا۔ مزید مسلمانوں کا بنیادی تشخص زبان، نسل اور قوم کا تھا "پاکستانی" کا نہیں۔

تقریب کے ساتھ ہم "مسلمان ذہن" یا "مسلمان ذہنیت" کو بھی موضوع بحث بنا سکتے ہیں۔ اس بڑے ذہنی سٹ (Set) کے

۳۔ اگر مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا معاملہ تھا تو اس سوال کا کوئی تفسیعی بحث جواب نہیں تھا کہ پاکستان بننے کی صورت میں ان کا تقریباً ایک تہائی حصہ اس احساس تحفظ سے بھی محروم ہو جائے گا جو اس کو ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے ایک ہی ریاست میں رہنے کی صورت حاصل ہوگا۔

تعمالی سٹ (Sub-set) بھی ہو سکتے ہیں اور مسلمان ذہن بھی کسی تعمالی سٹوں میں تقسیم ہو سکتا ہے جسے ایرانی، پاکستانی یا ترک۔ ان کی انگریزی میں ہنس نظر یکساں اور متضاد لطف ہو سکتے ہیں۔ پاکستان میں ہم ان دونوں اقسام کو جاننے بغیر

۴۔ اگر پاکستان بنانے کا مقصد "اسلام" تھا تو اس کے خدو خال کیا تھے؟ کیا وہ جو تہذیب عظیم کی مختلف اوقات میں کی گئی تقریروں میں ہم اعتماد میں ملتا ہے یا وہ جس کی دکالت مولانا مودودی کر رہے تھے یا عید حاسا اور ادنیٰ شریعت کا نفاذ تھا جس کا تجربہ افغانستان میں ہوا۔

پاکستان کی انگریزی کو نہیں جان سکتے۔ ہمارے ذہنی بحث میں مذہب کا رنگ کرا ہے۔ اور بڑی حد تک محیط ہے اور اس ذہن کو بننے میں تاریخی عوامل اسی طرح بہت اہم ہیں جس طرح وہ

دوسری اقوام یا طبقات میں اسلام، جیسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا کوئی نیا مذہب نہیں ہے۔ بلکہ یہ اسی سلسلہ مذہب کی ایک آخری کڑی ہے جن کو ہم کتابی مذاہب کہتے ہیں۔ دنیا کے دوسرے طبقوں میں بھی رسول آئے ہیں ان کے ذہن مذاہب کے بنیادی اصول مشترک ہونے کے باوجود اپنے اظہار کے رویوں میں وسیع حد تک مختلف ہو سکتے ہیں۔ کتابی مذاہب کی ایک خاص سلسلیات (Vocabulary) ان کا ایک خاص دائرہ بیان (Universe of Discourse) ہوتا ہے جو دوسرے مذاہب کی سلیات اور دائرہ بیان سے چند بنیادی تصورات کے اتحاد کے باوجود کافی مختلف ہے۔ اسلام کے بنیادی تصورات میں کوئی

تصور ایسا نہیں ہے جو اس وقت کے عربوں یا مسلمانوں کو نہیں ملے یا وہ۔ البتہ ان کی تقسیم میں ترقی (تعمیر) اور ترقی کے یوم آخرت، رسول و نبی، ملائکہ اور جن رکن کا مومن کا بنیادی تصور ہے۔ اس کا مشرہ سارے مذہب کے تصورات سے ہے جن سے اس وقت کے لوگ روشناس تھے لیکن ان تصورات کا اطلاق ترقی اور

خیمیائی (Mythological) ہو گیا تھا اور کتابی تصور میں مقصدیت اور عقیدت پیدا کرنے سے کام لیا۔

مدینہ ہجرت کرنے کی وجہ سے رسول کو جبریت ہیرائی اس نے رفتہ رفتہ اسلام کو اسلامی تحریک سے آگے بڑھ کر ایک

متحرک سماجی اور معاشرتی نظام میں تبدیل کر دیا۔ سیاست میں قبائلی طرز تو برقرار رہا، لیکن لیڈر شپ الیہ قبائلی نظام سے آزاد ہو گئی۔ مدنی معاشرہ کے وجود میں آنے کے بعد اسلام بڑی سرعت کے ساتھ پھیلا لیکن اس کی تقسیم کے ارتقاء کے سلسلے میں دو باتیں خاص طور پر واقع ہوئیں۔ اولاً وہ ضرورتاً ایک فقہی نظام کی حیثیت سے سمجھا جانے لگا اور ثانیاً بہت جلد اس نے دوسرے کتابی مذاہب کی طرح عقائد کے ایک مجموعہ کی شکل اختیار کر لی۔ اور یہ عقائد ہی نظام مع ذہنی تصورات کے مسلمانوں کے تشخص کا لازمی حصہ بن گیا۔ یہ دونوں خصوصیات ایک مجلس ایران اور پردگی کی کیفیت کے مقابلہ میں زیادہ سرروشی تھیں اور ان کی بنیاد پر اسلام اور کفر کا فرق

میدان عقائد کی نظام کے اقرار یا انکار پر مبنی ہو گیا۔ اسی عقائد کی اور فقہی نظام کی وجہ سے مسلمانوں میں فقہاء اور حکمیں کا ایک طبقہ بھی پیدا ہوا جو لوگوں کے عقائد کی سمت اور نہ سمت کے فیصلے صادر کر سکے۔ اس عقائد کی اور فقہی نظام نے مسلمانوں کی

ذہنی ہر چہ ہونے بڑے فیصلے کو ایک "عقلم و اطاعت" کے جزیے میں نظر کر دیا اور ان کے ہر عمل کو فقہی استناد کا پابند کر دیا۔

اسلام کے برکت کے ساتھ پہلے اور اس کے عقائد کی  
انجام کی حیثیت سے مشکل ہونے کے ساتھ ہی ابتدائی ادوار  
میں نے بعد دیکھے ایسے واقعات ہوئے جن کی وجہ سے  
مسلمانوں کے دل میں منتشر ہو جانے کا خوف پیدا کیا۔ رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ایسا حادثہ تھا جس کا پہلا رد عمل اضطرابی  
اور نفسیاتی تھا۔ حضرت عمر نے بدحواسی کے عالم میں، ایک  
روایت کے مطابق یہ کہا شروع کر دیا کہ حضور، حضرت موسیٰ  
کی طرح اپنے رب کی طرف گئے ہیں اور جس طرح حضرت  
موسیٰ چالیس رات بعد اپنی قوم میں واپس آئے، حضور بھی  
آجائیں گے۔ بعض دوسرے لوگوں نے اپنے کو اسلام کی  
طرف سے مانگ کر، بہت سی ذمہ داریوں سے بری کر لیا۔  
انصار نے کہا کہ رسول اللہ کے بعد مردانہ الی کا حق ہے۔  
دوسری طرف مخالفان بنو ہاشم اور قریش سمجھتے تھے کہ سرداری  
کے نظریہ جنداروہ ہیں۔ اس کے نتیجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
جو دار قبیلہ معاشرہ بنانے کی کوشش کی تھی وہ ایک بحرانی نظر  
آئی اور مسلم معاشرہ کو انتشار کا خطرہ نظر آنے لگا۔ خود رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائیوں میں سرداری کے منصب کے  
تعمین میں اختلاف شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ داروہ نے  
کے نتیجے میں حضرت ابو بکر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین بنا دیا گیا۔  
یہ فیصلہ شمس مصلحت اور ضرورت کے تحت کیا گیا اور یہ تھی کہ قبیلہ  
قریش میں قبیلہ قریش باقی قریش میں سے تو کسی کی  
امانت قبول کر سکتے تھے لیکن کسی اور کی نہیں۔ اس موقع پر رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑا کام کیا اور ان کے قریش میں سے  
ہونے، حضور کا ایک قبل سنہ کے طور پر پیش کر دیا گیا۔ ابو بکر  
نے ناسخ کر کے اپنے بعد بھی اختیار اور شورش ختم ہونے میں  
ایک عمر لگا اس لیے کہ کچھ لوگوں نے ایک مرکزی اقتداری کو  
اس کی ہرمانت سے انکار کر دیا جس طرح دور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مانتے  
تھے۔ پھر نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا، کچھ لوگوں نے  
تعمیری کا دعویٰ کر دیا اور اسلامی امانت کا قیادہ اپنی گردن  
سے اتار بیٹھنے کی کوشش کی اس افراتفری کا نتیجہ روز جنگوں کی  
سہولت میں سامنے آیا۔ حضرت ابو بکر اپنے دو سال سے کچھ  
زیادہ... خلافت میں زیادہ تر انہی مرکز گریز قوتوں پر غلبہ  
حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور بالآخر کامیاب  
ہوئے۔ لیکن ان واقعات نے دانش و ہمت کو یہ سوچنے پر مجبور کر  
دیا کہ انتشار کے خطرہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ اس خطرہ  
کے مقابلہ کے لیے جو قابل عمل طریقہ اس وقت آسانی سے

قابل حصول اور قابل قبول تھا وہ یہ تھا کہ لوگوں کو آزاد فکری سے  
باز رکھا جائے اور عقیدہ و اسلامی طرز عمل کا مستند معمول بنا دیا  
جائے۔ اس کا ایک مظاہرہ اس وقت ہوا جب حضرت عمر کے  
انتقال کے بعد خلافت کے لیے حضرت عثمان اور حضرت علی  
کے درمیان انتخاب کا سوال پیدا ہوا تو حضرت عثمان کے حق  
میں فیصلہ کن بات یہ رہی کہ انہوں نے شیخین کی بیرونی کے  
عزم کا اظہار کیا جبکہ حضرت علی مسائل کو اپنی فہم و فراست کی مدد  
سے حل کرنے کے قائل تھے۔  
روز جنگوں کے بعد مسلمانوں میں انتشار کی اور بھی کئی  
وجوہات ہوئیں جو زیادہ تر سیاسی نوعیت کی تھیں لیکن مذہب  
ایک اہم کے طور پر ان اختلافات کا اہم جزو رہا۔ جنگ  
تعلیم، جنگ تعلیم اور باہنہ کرنا کا واقعہ یہ سب امت مسلمہ  
کے مختلف حصوں میں بٹ جانے اور منتشر ہونے کے خطرہ کا  
احساس دلانے والے تھے۔ اس کا حل خاص طور پر فقہاء اور علماء کے  
گرد ہونے یعنی کلا کا کہ عقائد کی نظام کی روش کو مضبوطی سے قائم  
نیا جائے اور عقیدہ پر زور دیا جائے۔ اس طرح عقیدہ کی یہ روش  
مستقل طور پر مسلمانوں کے ذہنی رویہ کا جزو بن گئی۔ اس عقیدہ کی  
نظام کے باوجود جزئیات سے اختلاف کے سبب یا تو نئے  
فرقے ظہور میں آتے رہے، یا معاشرہ اختلاف کرنے والوں  
کو اپنے سے خارج کر رہا۔ امت کا فرقوں میں بٹ جانا بھی  
اس اعتبار سے قیمت ٹھہرایا گیا کہ ہر فرقہ اسلام کی بنیادی  
تعلیمات پر بحفاظت تو ایسا رہا کہ ہے، اختلاف تفصیل میں ہے اور  
اس کی بنیاد بھی قرآن وحدیث سے تخریج مسائل میں ہے۔ یہ  
عقیدہ اور عقائد کی ذہنی کچھ اس طرح مسلمانوں کی زندگی کا  
حصہ بن گیا کہ چاہے، ہر صوف کا میدان اور فقہاء اور فکر کا میدان  
ہو یا علم کلام کا، ایک بنیادی عقیدہ کی روحانیت و دشمنی ہر جگہ پایا  
جائے گا۔ جس کی وجہ سے معاشرہ کے بنیادی بیرونی امور میں خللی  
و نظر کا فخر کم سے کم ہو کر رہی و باطن کا معیار صحیح و عامت میں  
گیا۔ فکری آزادی بڑے جان جو کھوں کا کام ہے۔ ایک نگاہ پر  
چلتے رہتا اور اپنے افعال کا دوسروں کو ذمہ دار قرار دے دینا بڑا  
آسان کام ہے۔ دنیا میں امریت کے چلن کا ایک بڑا سبب  
انسان کی یہ فطرت بھی ہے کہ علم مانا اور وہی کرنا اس کے  
لیے زیادہ آسان عمل ہے۔ بیسویں صدی میں یورپ میں چار  
ڈکٹیٹروں کے گردن میں دوسرے اسباب کے ساتھ یہ فہم بھی  
دانش تھا کہ انسانی فطرت آزادی اور ذمہ داری سے ڈرتی ہے  
اور عقیدہ کو اپنے امان کے جزو کا زیادہ قابل طریقہ سمجھتی ہے۔

مسلمانوں کی ابتدائی ہجرت میں اس فکری عنصر کے ساتھ اس  
خوف کا محرک بھی شامل ہو گیا کہ فکری آزادی سے اسلامی  
تعمیریں ہجرت ہو سکتے ہیں اور مسلمان انتشار کا شکار ہو کر اس  
سیاسی فتنہ کو بھی بھگتتے ہیں جو ان کو حاصل ہو گیا تھا۔  
پاکستان بننے کے بعد دستور سازی کے مرحلہ میں اور  
بہت سی وہیدئیں کے ساتھ مذہب کے اس بیرونی اور داخلی  
تعمیر کے ساتھ جو بیسویں صدی میں پیدا ہوئی تھی مزید  
مشکلات پیدا ہوئیں۔ روایتی طور پر اسلامی حکومتوں کے قاضی  
دیوانی اور ذمہ داری مقدمات کا فیصلہ کسی فقہی مذہب کی روشنی  
میں کر دیا کرتے تھے اور حکمرانوں کے ساتھ ان کا رویہ عدل  
حکومتی کی نصیحت کا رہتا تھا۔ فکری اور سیاسی معاملات میں  
حکمران وقت، ضرورتاً ان کی مدد بھی حاصل کر لیا کرتا تھا، لیکن  
حکمرانی کا فیصلہ اور سیاسی معاملات ان کی پہنچ سے باہر تھے۔  
بیسویں صدی میں اسلام کا ایک "اگلی نظام حیات" کا تصور پیدا  
ہوا، جس کے نتیجے میں قانون سازی، سیاسی اور معاشی نظام کی  
ساخت اور ان کے اخلاق کے طریقے اور انتظامی معاملات  
بھی اسلام کے دائرہ اختیار میں شامل ہو گئے۔ نتیجتاً اس دائرہ  
اختیار کو قبول کرنے کی اہلیت کے استحقاق کا فیصلہ بھی ظاہر  
ہو گیا اور کئی کئی جگہ جہاں تعلیمات سے بہرہ ور ہوں۔  
اس طرح، مملکتی امور میں علماء کو قول فیصل کا حق دے کر ایک  
طرح کا پاپائی نظام جس سے اسلامی مزاج ابا کر رہا تھا ایک  
دوسرے انداز میں نئے م حکومت میں دخل ہو گیا جس کی ایک  
مثال ایرانی طرز حکومت ہے۔ پاکستان میں ایرانی طرز پر تو  
مذہب کو یا سب سے ذہنی کا مشکل ہے، لیکن اسلام بحیثیت  
جمہوری معاشرہ کا ایک طاقتور جزو ہے۔ اس کو دستور سازی کے  
مرحلہ میں اتنا شریک کرنے کی کوشش اسلام کے نام پر ایک  
زبردست تحریک کی شکل میں ہوئی جس کا مطالبہ تھا کہ دستور ساز  
اسمبلی "اسلامی دستور" بنائے۔ اسلامی دستور بنانے کے لیے  
بنیادی خود خدخال بھی علماء نے ۲۲ نکات کے ذریعہ متعین کر  
دیے۔ فیصلہ اس طرح ہوا کہ دستور میں قراردادت عہد کے نام  
سے ایک تمہید شامل کر دی گئی جو ابتدا میں دستور کا حصہ نہیں  
تھی۔ یہ پاکستان میں اسلامی قوت کا پہلا مظاہرہ تھا۔ اس کے  
بعد رفتہ رفتہ یہ تمہید دستور کا حصہ بنی اور مزید چند فقہوں اور علماء  
بھی کر دیا گیا جن کی رو سے پاکستان میں ولی قانون کتاب و  
سنت کے مفارقتیں بن سکتی ہیں۔ اس سے کوشش کرنے کے لیے کہ  
کون سا قانون کتاب و سنت کے مفارقت ہے ایک ادارہ اسلامی

اسلام اور جدیدیت کی کشمکش ۱۹۹۳

نظریاتی کونسل دستور کی وجہ کے ساتھ قائم کیا گیا اور رفتہ رفتہ پاکستانی حکومت نے اقدار کی بنیاد پر نئی نظام کی تخلیق کی بجائے اپنی اسی قانونی نظام کے نفاذ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی جو مسلمان ملکوں میں ہزار سال تک رائج رہا تھا۔

دستوری حکومتیں زمانہ جدید کی پیداوار ہیں اور ان دساتیر میں جو اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں ان کا ایک تاریخی لیکن منقرہ جو نیسالی مذہب کی تجدید (Reformation) اور نشاۃ ثانیہ سے منسلک ہے۔ یہ اصطلاحات پاپائی اقدار اور بادشاہت کے تصور سے برأت کا اعلان ہیں۔ جدید دستوری حکومتوں میں مقدر، یا مقدر اعلیٰ (Sovereign) کی اصطلاح غیر مذہبی (Secular) ہونے کے سبب ہی استعمال ہوتی ہے اور اس کے معنی ایک ایسے شخص یا ادارہ کے ہوتے ہیں جو مملکتی امور سے متعلق فیصلے کرنے کا اہل ہو اور اس پر قدرت رکھا ہو کہ وہ ان کو نافذ کر سکے۔ مسلمان حکومتوں میں یہ مقدر اعلیٰ بادشاہ ہوتا تھا اور دستوری حکومت میں دستور کے مطابق بنائے گئے ادارے۔ مقدر کا تصور بنیادی طور پر زمینی ہے۔ لیکن پاکستان میں اس اصطلاح کو "اسلامیائے" کے عمل میں آسان ترین طریقہ یہ نظر آیا کہ اس کے کو بنیاتی اقدار کو ایک یہی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جائے اور چونکہ خدا خود مقرون معنوں میں موجود نہیں ہے اس کی نیابت جو امتداد انسان کو دی گئی تھی مگر ان لوگوں کی طرف منتقل کر دی جاتے جو زمانہ حال میں خدا کے احکام کی ترجمانی کا کام انجام دیتے ہیں۔ پاپائیت بھی اسی دلیل کے تحت قائم ہوئی تھی اور چرچ کا پاپا یا اقدار بھی انہیں نہیں کردہ اختیار تھا۔ اب علمائے کرام چونکہ اسی بار اہم میں کام کرنے کے عادی ہیں اور اسی کو ایک غیر تبدیل پذیر اہم گردانتے ہیں اس لیے ان کی لکری پہنچ کتاب اٹھل سے آگے نہیں جرتی۔ اسلامی بینکنگ کی ایجاد اس کی ایک مثال ہے جس کے متعلق اٹھل بینک آف پاکستان کا بڑے غرور سے یہ کہنا ہے کہ دنیا میں اس وقت ایک ٹریڈین ڈائریکٹی اسلامی بینکنگ ہی ہے۔ یہ کہنا کہ وہاں کے دساتیر کے دور بہت اس پر غور کرنے کی اس مسلم ملت کو ضرورت نہیں ہوتی۔ نتیجتاً اسلام کے نام پر اتھصال کا ایک نیا طریقہ وجود میں آیا جس کا ناکارہ بھی وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو دنیا میں طاقت کے مانگ ہوتے ہیں۔ "مجاہدین" کی افغانستان میں روسوں کے خلاف اور اب پاکستان کے خلاف جنگ اس کی ایک اور مثال ہے۔

نتیجے میں علماء کا سیاست، دستور سازی اور قانون سازی میں اٹھل ہوتا ہے۔ بحیثیت پاکستان نے شہری کے وہ اس مداخلت کا حق رستے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس مداخلت کو اسلامی قرار دے کر اس پر کسی (دوسری رائے کے اعتبار کاراستہ بند کر دیتے ہیں اور ان کی مداخلت دوسروں کے برعکس "فیصل" ہوتی ہے۔ پاکستان میں دستور سازی کی تاخیر میں دوسری بہت سی وجوہات کے ساتھ ساتھ اسلامی آئینہ لونی بھی اس کا ایک بڑا سبب رہا ہے۔

اس وقت کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کو آئینہ لونی کے جدید تصور میں نواب پر غور کیے بغیر اٹھل سے یہ صورتوں پیدا ہوئی کہ دستور میں تو اسلامی شخصیں داخل ہو گئیں لیکن اسلامی فکر کتاب اٹھل سے آگے نہ بڑھی اور ایک جدید ریاست کے لیے اسلامی فکر کی جس نئی تفہیم کی ضرورت تھی وہ پیدا نہیں ہوئی۔ بعض جدید باتوں کو استخراجی طریقہ سے کسی نہ کسی طرح اس روایتی نظام سے اخذ کر لیا جاتا ہے۔ لیکن سیاسی فکر و فلسفہ، سماجی نظام، تلمیحی نظام اور معاشرتی مسائل، اس طرح نہ "اسلامی" بن پاتے ہیں اور نہ ہی طور پر جمبوری۔

اسلام کو دستوری بنانے سے ایک اور مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ خود جمہوریت کا تصور وضوحاً ہو گیا۔ ماہ کہ جمہوری نظام خاصوں سے نبرا کو کی مثالی نظام نہیں ہے لیکن جمہوریت اور اسلامی آئینہ لونی کے تصور میں جو بنیادی تضاد موجود ہے اس پر یہ حاصل مشکور کے ایک راستہ نکالنے کی بجائے چند سبھی اور چشم پانا اور باتوں سے کام چلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً اسلام میں شوریائیت ہے، اس لیے اسلامی نظام جمہوری ہے۔ واضح رہے کہ جدید فلسفہ سیاست میں جمہوریت دراصل پاپائیت کی بغیر کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ لیکن اسلامیانے کی تجلیل میں جمہوریت کو شوریائیت اور دستور ساز اسمبلی کو مجلس شوریٰ بنا کر یہ سمجھا لیا کہ ہم نے جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کر دیا یا اسلام کو مشرف بہ جمہوریت۔ نہ اس شوریائیت پر کوئی میر حاصل تحقیق ہوئی جو زمانہ رسالت، زمانہ خلافت اور پھر زمانہ بادشاہت میں مسلمانوں میں اب تک رائج رہی ہے اور نہ جمہوریت کی اساس سے کما حقہ واقفیت حاصل کر کے ہمارے مقننیاں کرام نے اسلام سے اس تصور کی مغایرت دور کرنے کا کوئی حیرانہ ذمہ نہ کیا۔ نتیجتاً پاکستان میں وہ لوگ جو مقدر تھے اسلام اور جمہوریت دونوں میں سے کسی کو بھی پاکستان میں قائم کرنے سے قاصر رہے اور ذہنی پراگندگی کے سبب دستور

پاکستان میں ایک نہ ختم ہونے والے ٹھنڈے کو بھی شامل کر دیا۔ اس کا ناکارہ اٹھانے والے ہر سیاسی مقدر نے یہ کہہ کر اٹھایا کہ پاکستان کی اپنی ایک دیسی جمہوریت (Indigenous Democracy) ہے اور اس کو مغرب ملکوں کی جمہوریت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام کو آئینہ لونی سمجھ کر پاکستان میں نافذ کرنے کا مسئلہ ہر اس مسلمان ملک میں بھی ہے، بارے گا جہاں اس قسم کی کوششیں کی گئیں اور چونکہ مسلمان بحیثیت جمہوری مع و اطاعت کی سوچ کے خورک ہیں اس لیے جمہوریت کو اس روایتی سوچ کے ساتھ پروان چڑھانا مشکل ہے۔ قرآن و حدیث و مغرب کی طرح سیاسی معاملات میں مقننیاں کرام اور علماء کی باہمی قسم کر دیں۔ یہ بات کہ یہ طریقہ غیر اسلامی ہے، جدید آئینہ لونی کی فکر کے ایک سطحی انحراف کے طور پر سامنے آیا اور اس کا بڑا سبب مغرب کی فکر کی مخالفت (جو بہت سے دوسری قومی بنیادوں پر بھی کی جاسکتی ہے) تھا۔ دین و سیاست کی سمجھ کی، سیاست کو اخلاقی اقدار سے جدا کرنے کے معنی میں یہ سوال نہیں بن جاتی اور یوں بھی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ دین و سیاست میں بھی داخل نہ ہوسکا البتہ سیاست دین میں آسانی سے داخل ہو گئی۔ میری دانست میں عیسائیوں کی طرح اسلام میں سیکولر ازم مسئلہ نہیں ہے ان دونوں مذاہب میں جو چیز ہے یعنی کاسبب بنی وہ مذہب نہیں بلکہ تمباک کی تھی۔ بدقسمتی سے ہم نے اس تمباک کی کو پھیلے دروازے سے اسلام میں داخل کر کے یہ مسئلہ اپنے لیے بھی پیدا کر لیا۔

پاکستان کے مسئلہ میں اس کا معنی (Mind set) کے ساتھ یہاں کے کچھ دوسرے معاشرتی عوامل مزید شدت پیدا کر رہے ہیں۔ اس وقت کے پاکستان کا معاشرتی حیرانہ ذمہ بھی بنیادی طور پر اس مع و اطاعت کے ماڈل پر قائم ہے غیر منقسم ہندوستان میں یہ علاقہ آریوں کے زمانہ سے بہت آگے والوں کی گزر گاہ رہا ہے۔ آریوں کے وقت سے لے کر مغلوں تک جو تو نہیں یہاں مسئلہ رہا ہے ان کا زمانہ دور پانچا جانا دوآ رہا ہے۔ مختلف تاریخی وجوہات سے موجودہ پاکستان کا علاقہ کراچی سے تو خرم تک فیوڈل یا سرداری نظام کے تابع رہا ہے۔ قبائلی علاقوں میں سرداری نظام اور میدانی علاقوں میں کاشت کاری کی وجہ سے فیوڈل سلسلہ کو مسلمانوں کے ہمت لے کر آزادی سے پہلے تک ہندوستان کے حکمرانوں نے تقویت دی۔ یہ نظام بڑی آسانی سے مذہبی رویوں میں

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۱۹۹۴

ہوست ہو گیا اور اس کو اسلامی جواز سہرا گیا۔ یہ مسلمانوں کی تاریخی روایت کی ایک توسیعی شکل تھی جو آج تک جاری ہے۔ یہ یعنی رزیدہ جمہوری طرز زندگی کی ضد ہے اور مذہب کے ساتھ مل کر ان کا اثر کئی گنا زیادہ جاتا ہے۔ ہندوستان کی طرف پاکستان کا مسئلہ صرف جاگیر داری نہیں ہے بلکہ اس کے ہمیں پشت مذہبی جواز کی ایک مضبوط پشت پڑھنا موجود ہے۔ مولانا مودودی کی منشا حکمت زمین اس نقطہ نظر کی ایک بڑی مضبوط اور مدلل کتاب ہے۔

پاکستان کے موجودہ چاروں صوبوں کی معاشرتی بنیاد میں صدیوں سے بھی بڑا اثر کام کر رہا ہے۔ غزنوی، غوری اور ۱۰۰۰ء سے ۱۰۰۰ء سے سامرائی جب تک سلطنت کا نظام ہی روایت فرماتے پر چہتا رہا جس طرح دنیا کی دوسری بادشاہتیں چلتی ہیں۔ جہاں حکومت کرنے کا جواز شرف طاقت فراہم کرتی ہے اور طاقت اور صواب سے اطاعت اور فرمانبرداری کا مطالبہ کرتی ہے۔ ماضی کی دوسری مملکتوں کی نسبت یہ تمدن ان طبقہ مذہب کو بھی ایک اضافی سہارے کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ عمل اللہ، خلیفہ فی الارض، بیعت شریعت، بن لڑ مذہب کی قوی اور عینی توثیق حاصل کرتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اپنے امراء اور تابعین سے مشورہ کرتا ہے جن کی مدد اور طاقت پر خود اس کا اپنا اقتدار منحصر ہوتا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کے لیے وہ شہرانی نظام کا جواز بھی مہیا ہو جاتا ہے۔ یہ بات کہ یہ حکومت اچھی ہوتی ہے یا بڑی بڑی حد تک بادشاہ کی ہیرت اور اس کے حوالوں کے تروار پر منحصر ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلم مملکت میں شہزادہ اور بی، غزالی، ابن جبار، ابن حبیہ کے سامنے مسئلہ یہ نہیں تھا کہ ریاست کیسے قائم ہونا چاہیے۔ ان کے فلسفہ سیاست میں ریاست کا ایک سیاسی ادارے کی حیثیت سے وجود مسلم امت یا جماعت کے تصور ہی میں مضمون تھا۔ "شریعت" کے نفاذ کا تھا جو خلیفہ یا امیر المؤمنین کا فرض منصبی تھا۔ اس کا کام مسلمانوں کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کے لیے ضروری سہولتیں اور آزادی مہیا کرنا اور اسلامی حکومت کی توسیع تھا جس کے لیے وہ "جہاد" کر سکتا تھا اور اس فرض کی ادا ہوگی میں اس کی سلطنت کے مسلمانوں کا حصہ لینا فرض تھا۔ اس بات کا فیصلہ کہ دو کب اور اس کے خلاف جہاد کرے اس کی اپنی سوا بدیدہ پر تھا اور وہ ضروری سمجھے تو لوگوں کے مشورہ سے روز صرف ایک جماعت کو کھنکھار کے کسی ملک پر حملہ کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ اس قسم کے عملوں کو

جواز تقریباً اسی قسم کا تھا جس طرح آج کل امریکی اپنے لیے جواز تلاش کرتے ہیں۔ ایک بہتر نظام کا نفاذ، مظلوم انسانوں کی دادرسی، اپنے کو مزہ و تہ خطروں سے بچانا (Pre-emptive strike)، اپنا سرحدوں کی حفاظت کے لیے دوسروں کی سرحدوں کو محروم و کرنا وغیرہ۔ یہ باتیں چاہے کسی ہی سطح کیوں نہ لگیں اور مسلمانوں کا ذاتی رویہ دوسری اقوام کے مقابلہ میں کتنا ہی زیادہ انصاف پسند کیوں نہ ہو یا مسلمانوں کا طریقہ جنگ اخلاقی اقتدار کتنی ہی لحاظ کیوں نہ کرنا اپنی اصل میں اسی طرح تو سچے پندار ہے جس طرح دوسری اقوام کا۔ وقت اور زمانہ کے اعتبار سے ان جنگوں سے جو غمی تباہی (Collateral Damage) آتی تھی وہ آج کل جدید ہتھیاروں کی تباہی سے البتہ کم ہوتی تھی اور ہات جنگ میں زور روزیادتی کا جواز بھی مذہب کی رو سے جواز تھا۔ اگرچہ اکثر "جہاد" یا فتوحات مذہبی اعتبار سے درست نہیں تھیں، لیکن مسلمانوں کے مذہبی طبقے سے ان کے خلاف کوئی خدمت یا اجتماعی مزاحمت نظر نہیں آتی۔

پاکستان کے اس روایتی فیوژن جہاد کا مذہب کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ مذہب کے پاس نظام سلطنت چلانے کا کوئی ناجایز اڈا نہیں موجود نہیں تھا اور اسلامی تاریخ میں امیر کی اطاعت اور اس کے خلاف بغاوت نہ کرنے کی بڑی مضبوط مذہبی پلیس وجود میں آئی تھی۔ مظلوموں کے زوال کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کے احیاء کے لیے شاہ ولی اللہ کی نظریں بھی رہیں اور شاہ ابدالی کی طرف انھیں اس لیے کہ مذہبی لگن میں ایک مضبوط بادشاہی اسلام کا عہد ہو سکتا تھا جو صوبہ داروں سسٹم کے تحت رہا جو کٹر زول بھی کر سکتا تھا اور ملک میں امن و امان بھی قائم کر سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نھارہ بی صدی میں دنیا میں کسی دوسرے نظام کی توقع رکھنا محال تھا۔ لیکن یہاں صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ مسلمانوں کے ذہن میں کن دعاوت کا فلسفہ سیاسی اور مذہبی اعتبار سے تمام تاریخی و مذہبی رکھتا ہے اور اس میں جمہوری فلسفہ یا غمی آزادی کی روایت کا در آنا بڑا مشکل امر ہے۔ یورپ میں اگرچہ مذہب کا اسی قسم کا رویہ رہا ہے اور اس نے ساتھ ہی بادشاہت اور جاگیر دارانہ نظام کا قیام بھی قائم کیا۔ لیکن سائنسی لگن، صنعتی انقلاب، سرمایہ دارانہ نظام اور معاشرہ میں اتحادیں مددی سے منظرینا کے ایک معتد بہ گروہ کا نتیجہ تھی تبدیلی کا سبب بنا۔ سو سالہ مذہبی جنگوں سے بھی یورپ نے یہ سبق سیکھا کہ پراگمٹام اب زندگی کے مسائل حل نہیں کر سکتا

اس لیے ہمیں جگہ انتخاب کے ذریعہ (جیسے فرانس میں) اور بعض جگہ معاشی معاشرتی اور سیاسی تبدیلیوں کے ذریعہ نیا نظام وجود میں آ گیا۔ ایسا مسلمان ملکوں میں اس لیے نہیں ہو سکتا کہ اولاً یہاں استعمار کا تسلط، معاشرہ زور تھا اور مسلمانوں میں منکرینا کا ملکی دائرہ ایک خاص فقہی سطح سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ مغربی استعمار سے جدید تعلیم کا جوفہ کو دورا نفاکتے تھے وہ بھی اپنا تشخص کھودینے کے خوف کی وجہ سے نہ اٹھا سکے۔ ایک مطلوب منت کی یہ فقہی نفسیات ہے لیکن مذہب کے تاریخی رویہ کی وجہ سے بھی مسلمان علوم جدید سے فائدہ اٹھانے اور تاریخ کے تحیدی مطالبہ میں سب سے زیادہ مذہب رہے ہیں۔

یاسی اور معاشرتی اسباب و عوامل کے ساتھ مسلمانوں کا نظام اخلاق بھی اسی جہاد کا پابند ہے۔ یعنی اخلاقی اور غیر اخلاقی کا انحصار اللہ کے فی نفسہ خیر و شر ہونے پر نہیں بلکہ خدا کے حکم اور مرضی پر ہے۔ یہ بات کہ سچ بولنا چاہیے اس لیے اخلاقی نہیں ہے کہ سچائی بجائے خود ایک قدر ہے بلکہ اس لیے ہے کہ خدا نے سچ بولنے کو کہا ہے۔ سچ بولنے میں خدا کا عمل دخل انسانوں کو چھوڑنے پر آمادہ تو کر سکتا ہے لیکن سچ کی علت بیہودہ ایک دوسرا مسئلہ ہے۔ خیر و شر فی نفسہ خدا کے حکم کے تابع ہونے سے انسان کی غمی آزادی اور قوت فیصلہ ختم ہو کر چند ایسے لوگوں کے فتوؤں کی پابند ہو جاتی ہے جو یہ بتا سکیں کہ خدا کس کام کو کرنے کو کہتا ہے۔ فقہ اسلامی نے انسانی اعمال، ایک ایسے گہرے نظام توڑ کر لیا کہ شاید ہی کوئی انفرادی عمل اب انسان اپنی ذمہ داری پر اس یقین کے ساتھ کر سکتا ہے کہ ایسا کرنا اس کے لیے اخلاقی قدر کا حامل ہے۔ یہی صورت حال انسانی معاملات سے متعلق قوانین کی ہے جو یا تو متعین ہیں یا متعین قوانین سے اخراج کیے جا سکتے ہیں۔ کسی مسئلہ کو ختم کرنے یا کسی اخلاقی قدر کو معاشرہ میں قائم کرنے کے سلسلے میں مناسب قانون سازی کا حق انسانی اختیار میں نہیں رہا بلکہ وہ بھی ہمیشہ کے لیے عدالتی ذمہ داری کے ماتحت منتقل کر دیا گیا۔ اس میں استعمار کے ذریعہ صرف غمی تبدیلی ہی ممکن ہے اور اس کی سند بھی وہی شاریعت ہے جس نے۔ کسی متعین قانون کی جگہ کوئی دوسرا قانون اگرچہ دنیا کی اعتبار سے بہتر ہی کیوں نہ ہو نہیں بنایا جا سکتا۔ ان سب عوامل نے اس کو انسان میں فکری آزادی کو بڑی حد تک محروم کر دیا۔ اب یہاں معاشرے سے انتظام یا کسی اور سے ضرور سامان نتیجہ تک لے جا سکتا ہے۔

﴿﴾ ﴿﴾ ﴿﴾

# کتابیات

## القرآن المجید

### (1) عربی کتابیں

- ۱- ابن القیم الجوزیؒ، زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۴۱۸ھ۔
- ۲- ابن القیم الجوزیؒ، اعلام الموقعین عن رب العالمین، المملكة العربية السعودية: دار ابن الجوزی، ۱۴۲۳ھ۔
- ۳- ابن امیر الحاج الحلبیؒ، التقریر والتعبیر علی التحریر، مصر: المطبعة الأميرية، ۱۹۰۰ھ۔
- ۴- ابن جریر الطبریؒ، تفسیر الطبری جامع البیان عن تأویل آی القرآن، القاهرة: حجر، ۱۴۲۲ھ۔
- ۵- ابن نجیم المصریؒ، البحر الرائق، کوئٹہ: مکتبہ رشیدیہ، [س-ن]۔
- ۶- ابوالخلیف ابراہیم الشاطبیؒ، الاعتصام، بیروت: دارالکتب العلمیہ [س-ن]۔
- ۷- ابوالخلیف ابراہیم الشاطبیؒ، الموافقات، العربية السعودية: دار ابن عثمان، ۱۴۱۷ھ۔
- ۸- ابوالشکور السالمیؒ، التمهید، دہلی: الفاروق، ۱۳۰۹ھ۔
- ۹- ابوبکر ابن ابی شیبہؒ، المصنف، کراچی: ادارۃ القرآن، ۱۹۸۵ء۔
- ۱۰- ابوبکر حصصؒ، احکام القرآن، بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲م۔
- ۱۱- ابوبکر عبدالرزاق الصنعانیؒ، المصنف لعبد الرزاق، کراچی: مجلس علمی، ۱۹۷۲ء۔
- ۱۲- ابو جعفر احمد الطحاویؒ، شرح معانی الآثار، لاہور: مطبع مجتہائی، ۱۴۱۳ھ۔
- ۱۳- ابو حامد محمد الغزالیؒ، تہافت الفلاسفہ، قاہرہ: دار المعارف، [س-ن]۔
- ۱۴- ابو حامد محمد الغزالیؒ، احیاء علوم الدین، انڈونیشیا: کریا طہ فو ترا، [س-ن]۔

اسلام اور جدیدیت کی کش مکش ۳۹۶

- ۱۵- ابو حامد محمد الغزالی، المستصفی من علم الأصول، شركة المدينة المنورة للطباعة، [س-ن]-
- ۱۶- ابو حامد محمد الغزالی، المنقذ من الضلال، قاہرہ: مکتبۃ الانجولو المصریۃ، ۱۹۶۲ء۔
- ۱۷- ابولیت سمرقندی، فتاویٰ النوازل، بیروت: دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴م۔
- ۱۸- ابی الفداء اسمعیل ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، الرياض: دارطبیۃ، ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء۔
- ۱۹- ابی بکر اشعری، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، بیروت: دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء۔
- ۲۰- ابی یعلیٰ محمد بن حسین، الأحكام السلطانیۃ، بیروت: دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۲۱ھ۔
- ۲۱- احمد بن حجر العسقلانی، العجائب فی بیان الاسباب [اسباب النزول]، بیروت: دار ابن حزم، ۱۴۲۲ھ۔
- ۲۲- احمد بن حجر العسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، بیروت: دارالمعرفۃ، ۱۳۷۹ء۔
- ۲۳- احمد بن حجر العسقلانی، تہذیب التہذیب، لاہور: مکتبۃ الاثریۃ، [س-ن]-
- ۲۴- احمد بن حجر العسقلانی، ہدی الساری مقلدۃ فتح الباری، الرياض: مکتبۃ الملک فہد الوطنیۃ، ۱۴۲۱ھ۔
- ۲۵- احمد بن حنبل، مسند أحمد، الرياض: بیت الافکار الدولیۃ، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء۔
- ۲۶- احمد بن علی الخطیب البغدادی، تاریخ مدینۃ السلام، بیروت: دارالغرب الاسلامی، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱م۔
- ۲۷- احسین بن علی الیہی، السنن الکبریٰ، بیروت: دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء۔
- ۲۸- احسین بن علی الیہی، الجامع لشعب الایمان، الرياض: مکتبۃ الرشید، ۱۴۲۳ھ۔
- ۲۹- الشریف الرضی، نوح البلاغۃ، بیروت: دارالاسلامیۃ، ۱۴۱۴ھ۔
- ۳۰- امام الحرمین الجوینی، البرہان فی اصول الفقہ، قطر: دولۃ قطر، ۱۳۹۹ھ۔
- ۳۱- بدرالدین الزرکشی، البحر المحیط فی اصول الفقہ، الغردقۃ: دارالصفوۃ، ۱۴۱۳ھ۔
- ۳۲- بدرالدین الزرکشی، البرہان فی علوم القرآن، القاہرۃ: مکتبۃ دار التراث، ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء۔
- ۳۳- بدرالدین عینی، عمدۃ القاری، بیروت: دارالکتب العلمیۃ، ۲۰۰۹ء۔
- ۳۴- تقی الدین ابن تیمیہ، الرد علی المنطقیین، لاہور: دار ترجمان السنۃ، ۱۹۷۶ء۔
- ۳۵- تقی الدین ابن تیمیہ، موافقۃ صحیح المنقول لصریح المعقول، قاہرۃ: مطبعۃ السنۃ الحمدیۃ، ۱۹۵۱ء۔
- ۳۶- تقی الدین ابن تیمیہ، السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ، بیروت: دار الآفاق الجدیدۃ، ۱۴۰۳ھ۔
- ۳۷- تقی الدین ابن تیمیہ، مجموع فتاویٰ، الرياض: مکتبۃ الملک فہد الوطنیۃ، ۱۴۲۵ھ۔
- ۳۸- تقی الدین ابن تیمیہ، مقلدۃ فی اصول التفسیر، دمشق: کلیۃ الشرعیۃ جامعۃ دمشق، ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء۔
- ۳۹- تقی الدین ابن تیمیہ، منہاج السنۃ النبویۃ فی نقص الکلام الشیعۃ والقدریۃ، لاہور: المکتبۃ السلفیۃ، [س-ن]-
- ۴۰- تقی الدین ابن تیمیہ، نقض المنطق، قاہرۃ: مطبعۃ السنۃ الحمدیۃ، ۱۹۵۱ء۔

- ۴۱- جلال الدین سیوطی، مفتاح الجنة في الاحتجاج بالسنة، بيروت: دار الكتب العلمية، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء۔  
 ۴۲- جلال الدین سیوطی، الاتقان في علوم القرآن، بيروت: مؤسسة الرسالة ناشرون، ۱۴۲۹ھ۔  
 ۴۳- جلال الدین سیوطی، لباب النقول في أسباب النزول، بيروت: مؤسسة الكتب الثقافية، ۱۴۲۲ھ۔  
 ۴۴- جلال الدین سیوطی، الاشباه والنظائر في النحو، حیدرآباد دکن: دار المعارف العثمانیہ، ۱۳۵۹ھ۔  
 ۴۵- جمال الدین یوسف المزکی، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۴۲۳ھ۔  
 ۴۶- حبیب اللہ الخٹار، السنة النبویة و مکانتها فی ضوء القرآن الکریم، کراچی: المکتبۃ النبویة، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۶ء۔

- ۴۷- راغب اصفہانی، المفردات في غريب القرآن، مکتبۃ نزار مصطفیٰ الباز، [س-ن]۔  
 ۴۸- سعد الدین التتازائی، التوضیح والتلویح، لاہور: مکتبۃ رحمانیہ، [س-ن]۔  
 ۴۹- سلیمان بن احمد الطبرانی، المعجم الكبير، القاہرہ: مکتبۃ ابن تیمیہ، [س-ن]۔  
 ۵۰- سلیمان بن اشعث ابی داؤد، سنن أبی داؤد، کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی، [س-ن]۔  
 ۵۱- سید شریف جرجانی، معجم التعريفات، قاہرہ: دارالفضیلت، [س-ن]۔  
 ۵۲- شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء عن خلافة الخلفاء، کراچی: قدیمی کتب خانہ [س-ن]۔  
 ۵۳- شاہ ولی اللہ، الفوز الكبير في أصول التفسير، القاہرہ: دارالصحوة، ۱۴۰۷ھ۔  
 ۵۴- شاہ ولی اللہ، الفوز الكبير مع العون الكبير، دیوبند: المکتبۃ الوحیدیہ، [س-ن]۔  
 ۵۵- شاہ ولی اللہ، حجة الله البالغة، پشاور: وحیدی کتب خانہ [س-ن]۔  
 ۵۶- شاہ ولی اللہ، عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، الشارقة: دار الفتح، ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۵ء۔  
 ۵۷- شعیب بن علی النسائی، سنن النسائی، ملتان: المکتبۃ الفاروقیہ، ۱۴۲۱ھ۔  
 ۵۸- شعیب بن علی النسائی، السنن الكبرى، بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۱م۔  
 ۵۹- شمس الدین الذہبی، سیر اعلام النبلاء، بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۴۰۳ھ۔  
 ۶۰- شمس الدین السخاوی، فتح المغیث بشرح الفیہ الحدیث، الرياض: دار المنہاج، ۱۴۲۶ھ۔  
 ۶۱- شمس الدین السرخسی، المبسوط، بیروت: دار المعرفۃ، ۱۳۹۸ھ۔  
 ۶۲- شہاب الدین القرانی، کتاب الفروق، بیروت: عالم الکتب، ۱۳۴۷ھ۔  
 ۶۳- شیخ احمد ملا جیون، نور الانوار شرح رسالۃ المنار، کراچی: المکتبۃ البشری، ۱۴۳۳ھ/۲۰۱۱ء۔  
 ۶۴- عالم بن العلاء الانصاری، الفتاوی التاتار خانیہ، کراچی: قدیمی کتب خانہ، [س-ن]۔  
 ۶۵- عبد الرحمن الدارمی، سنن الدارمی، الرياض: دار المغنی، ۱۴۲۱ھ۔  
 ۶۶- عبد العزیز ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، الرياض: دار عالم الکتب، ۱۴۲۳ھ۔  
 ۶۷- عبد القادر الجیلانی، الغنیة لطالبي طريق الحق، بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۶ھ۔



- ۶۸- عبدالقادر بجیلانی، فتوح الغیب، مصر: مطبعة مصطفى البابي الحلبي واولاده، ۱۳۹۲ھ۔
- ۶۹- عبداللہ بن عمر البیضاوی، منہاج الوصول إلى علم الأصول، بیروت: مؤسسة الرسالة ناشرون، ۲۰۰۶ء۔
- ۷۰- عبدالرحمن ابن خلدون، المقدمة، الدار البیضاء، ۲۰۰۵ء۔
- ۷۱- عبدالرحمن ابن رجب، جامع العلوم والحکم، بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۳۶۹ھ۔
- ۷۲- عبدالحی محمد الانصاری، فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت، بیروت: دارالکتب العلمیة، ۱۳۲۳ھ/۲۰۰۲ء۔
- ۷۳- عبداللہ حاکم نیشاپوری، المستدرک علی الصحیحین، القاہرہ: دارالحرثین، ۱۳۱۷ھ/۱۹۹۷ء۔
- ۷۴- عبدالوہاب خلاف، علم اصول الفقہ، القاہرہ: مکتبۃ الدعوة الاسلامیة، ۱۳۷۶ھ۔
- ۷۵- عبدالوہاب شعرائی، الیواقیت و الجواهر فی بیان عقائد الأكابر، بیروت: داراحیاء التراث العربی، [س-ن]۔
- ۷۶- عبدالوہاب شعرائی، کتاب المیزان، بیروت: عالم الکتب، ۱۴۰۹ھ۔
- ۷۷- عزالدین بن عبدالسلام، قواعد الاحکام فی مصالح الانام، قاہرہ: مطبعة حسینیة، ۱۹۳۳ء۔
- ۷۸- علاءالدین الکاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت: دارالکتب العربی، ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء۔
- ۷۹- علی بن احمد الواحدی، أسباب نزول القرآن، بیروت: دارالکتب العلمیة، ۱۳۱۱ھ۔
- ۸۰- علی بن حزم الاندلسی، الفصل فی الملل والأهواء والنحل، بیروت: دارالنجیل، ۱۳۱۶ھ۔
- ۸۱- علی بن حزم الاندلسی، الإحکام فی أصول الأحکام، بیروت: دارالآفاق الجدیدة، [س-ن]۔
- ۸۲- علی بن حزم الاندلسی، مراتب الاجماع فی العبادات والمعاملات والمعتقدات، بیروت: دارالآفاق الجدیدة، ۱۴۰۲ھ۔
- ۸۳- علی بن حزم الاندلسی، المحلی، بیروت: دارالآفاق الجدیدة، [س-ن]۔
- ۸۴- علی بن عمر الدارقطنی، سنن الدار قطنی، دہلی: المطبع الفاروقی، [س-ن]۔
- ۸۵- علی بن محمد الخازن، تفسیر الخازن المسمی لباب التأویل فی معانی التنزیل، مصر: دارالکتب العربیة الکبریٰ، [س-ن]۔
- ۸۶- فاطمة سلیمان محمد سلیمان، القرآن والنظر العقلي، امریکا: المعهد العالمی للفکر الاسلامی، ۱۳۱۳ھ/۱۹۹۳ء۔
- ۸۷- فخرالدین الرازی، مفاتیح الغیب أو التفسیر الکبیر، بیروت: دارالفکر، ۱۴۰۱ھ۔
- ۸۸- فواد سیزگن، محاضرات فی تاریخ العلوم العربیة والاسلامیة، فرانکفرٹ: جمہوریة آلمانیة الاتحادیة، ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء۔
- ۸۹- مالک بن انس، المؤطا للامام مالک، کراچی: قدیمی کتب خانہ، [س-ن]۔
- ۹۰- مجد الف ثانی، مکتوبات امام ربانی، کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی، ۱۹۷۷ء۔

- ۹۱- محمد ابوزہرہ، ابو حنیفہ: حیاتہ و عصرہ۔ آراؤہ الفقہ، دارالفکر العربی، [س۔ن]۔
- ۹۲- محمد امین المعروف بامیر بادشاہ، تیسیر التحریر شرح علی کتاب التحریر، مصطفیٰ البابی الحلبي واولاده بمصر، ۱۳۵۱ھ۔
- ۹۳- محمد باقر مجلسی، بحار الأنوار، بیروت: داراحیاء التراث العربی، ۱۴۰۳ھ۔
- ۹۴- محمد بن احمد القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۴۲۷ھ۔
- ۹۵- محمد بن اسمعيل بخاری، الصحيح البخاری، لاہور: مکتبۃ الحسن [س۔ن]۔
- ۹۶- محمد بن جریر الطبری، تاریخ الأمم والملوک [تاریخ الطبری]، سعودیہ: بیت الافکار الدولیہ، [س۔ن]۔
- ۹۷- محمد بن حبان، صحیح ابن حبان بترتیب ابن بلبان، بیروت: مؤسسة رسالة، [س۔ن]۔
- ۹۸- محمد بن حسن الشیبانی، الموطا للإمام محمد، ملتان: مکتبۃ حقانیہ [س۔ن]۔
- ۹۹- محمد بن حسن الشیبانی، کتاب الآثار، کراچی: ادارۃ القرآن والعلوم والاسلامیہ، ۱۴۰۷ھ۔
- ۱۰۰- محمد بن سعد، کتاب الطبقات الكبير، القاہرہ: مکتبۃ الخانجی، ۱۴۲۱ھ، ۲۰۰۱ء۔
- ۱۰۱- محمد بن علی الشوکانی، نیل الأوطار من أسرار منتقى الأخبار، المملكة العربية السعودية: دار ابن الجوزی، ۱۴۲۷ھ۔
- ۱۰۲- محمد بن علی الشوکانی، إرشاد الفحول إلى تحقيق الحق من علم الأصول، الرياض: دارالفضيلة، ۱۴۲۱ھ۔
- ۱۰۳- محمد بن عیسیٰ الترمذی، سنن الترمذی، کراچی: قدیمی کتب خانہ [س۔ن]۔
- ۱۰۴- محمد بن یزید القزوی، سنن ابن ماجہ، ملتان: المکتبۃ الفاروقیہ [س۔ن]۔
- ۱۰۵- محمد طاہر گجراتی، مجمع بحار الأنوار فی غرائب التنزیل ولطائف الأخبار، المدینۃ المنورۃ: مکتبۃ دارالایمان، ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۴ء۔
- ۱۰۶- محمد عبداللہ بن نور الدین، النجم الثاقب فی اقصیٰ علی بن ابی طالب، لاہور: جہانگیر بک ڈپو، ۱۳۶۰ھ۔
- ۱۰۷- محمود آلوسی البغدادی، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، بیروت: ادارۃ الطباعة المنیریہ، [س۔ن]۔
- ۱۰۸- محی الدین ابن عربی، فصوص الحکم، بیروت: دارالکتب العربی، ۱۹۴۶ء۔
- ۱۰۹- محی الدین ابن عربی، الفتوحات المکیہ، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۹۹۹ء۔
- ۱۱۰- محی الدین النووی، شرح النووی علی مسلم، بیت الافکار الدولیہ [س۔ن]۔
- ۱۱۱- مسلم بن حجاج القشیری، صحیح مسلم، ملتان: دارالحديث، [س۔ن]۔
- ۱۱۲- مصطفیٰ السباعی، السنۃ و مکانتہا فی التشريع الإسلامی، مصر: المکتب الاسلامی- دارالوراق، ۲۰۰۰ء۔
- ۱۱۳- مصطفیٰ زید، المصلحة فی التشريع الإسلامی ونجم الدین الطوفی، قاہرہ: دارالفکر العربی، ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴م۔

- ۱۱۴- ملا علی قاریؒ، المصنوع فی معرفة الحدیث الموضوع [الموضوعات الصغری]، بیروت: دار البیضاء الاسلامیة، ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲م۔
- ۱۱۵- موفق الدین ابن قدامہ المقدسیؒ، المعنی، بیروت: دار الفکر، ۱۴۰۵ھ۔
- ۱۱۶- موفق بن احمد الحکی، المناقب الموفق، حیدرآباد: مجلس دائرة المعارف النظامیة، ۱۳۲۱ھ۔
- ۱۱۷- موفق بن احمد الحکی، مناقب الامام الاعظم، کوئٹہ: مکتبہ اسلامیة، ۱۴۰۷ھ۔
- ۱۱۸- ملّا نظام الدینؒ، فتاوی عالمگیری، لاہور: حامد اینڈ کو [س۔ن]۔
- ۱۱۹- نجم الدین الحلی، المعبر فی الشرح المختصر، ایران: مؤسسۃ سید الشہداء، ۱۳۶۳ھ۔
- ۱۲۰- نجم الدین طوقی، شرح مختصر الروضة، المملكة العربیة السعودیة: وزارة الشؤون الاسلامیة والاوقاف والدعوة والارشاد، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء۔
- ۱۲۱- یوسف بن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضلہ، المملكة العربیة السعودیة: دار ابن الجوزی، ۱۴۱۳ھ۔

## (2) اردو کتابیں

- ۱۲۲- احمد حسین صدیقی، دیستانوں کا دیستان، کراچی: محمد حسین اکیڈمی، ۲۰۰۳ء۔
- ۱۲۳- امیر عارفی، نیاز فتح پوری، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند پریل ۱۹۷۷ء۔
- ۱۲۴- پیر کرم شاہ الازہریؒ، سنت خیر الانام، اسلام آباد: دعویہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، [س۔ن]۔
- ۱۲۵- جمال پانی پتی، اختلاف کے پہلو، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۲ء۔
- ۱۲۶- حضرت شاہ سید محمد ذوقی، سر دلبران، لاہور: الفیصل، ۲۰۰۸ء۔
- ۱۲۷- خالد محمود، آثار التشریح، لاہور: دارالمعارف، [س۔ن]۔
- ۱۲۸- ڈاکٹر سحیحی محمصانی، فلسفہ شریعت اسلام، [مترجم: مولوی محمد احمد رضوی]، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۹ء۔
- ۱۲۹- ڈاکٹر قاضی عبدالقادر، کشاف اصطلاحات فلسفہ، کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۳ء۔
- ۱۳۰- رواں قلعبی، فقہ عبداللہ بن مسعود، لاہور: ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، ۱۹۹۲ء۔
- ۱۳۱- زاہد صدیق مغل، اسلامی بینکاری اور جمہوریت: فکری پس منظر اور تنقیدی جائزہ، لاہور: مکتبہ وراثت، ۲۰۱۲ء۔
- ۱۳۲- سالک مرحوم کے طنزیہ و فکاہیہ کالم "افکار و حوادث" کے غیر سیاسی انتخاب، جلد اول، مرتبہ محمد حمزہ فاروقی۔
- ۱۳۳- سعید انصاری، سیر الصحابیات، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۳۳۱ھ۔
- ۱۳۴- سفیر اختر، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کا سرمایہ قلم، واہ کینٹ: ادارہ المعارف، ۲۰۰۲ء۔
- ۱۳۵- سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، سنت کی آئینی حیثیت، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء۔

- ۱۳۶- سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیمات، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء۔
- ۱۳۷- سید ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، کراچی: مجلس نشریات اسلام، [س-ن]۔
- ۱۳۸- سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین [س-ن]۔
- ۱۳۹- سید محمد سلیم، مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ، لاہور: تنظیم اساتذہ، ۱۹۸۹ء۔
- ۱۴۰- سید احمد خان، خطوطِ سرسید [مرتب: راس مسعود]، بدایوں: نظامی پریس، ۱۹۲۳ء۔
- ۱۴۱- سید احمد خان، سفر نامہ پنجاب [مرتب: سید اقبال علی] علی گڑھ: انسٹی ٹیوٹ، ۱۸۸۳ء۔
- ۱۴۲- سید احمد خان، مقالاتِ سرسید [مرتب: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی]، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۱ء۔
- ۱۴۳- سید احمد خان، آخری مضامین [مرتب: امام الدین گجراتی] لاہور: کوآپریٹو پرنٹنگ پریس، [س-ن]۔
- ۱۴۴- سید احمد خان، الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرة الحمدیہ، لاہور: مسلم پرنٹنگ ورکس [س-ن]۔
- ۱۴۵- سید احمد خان، تہذیب الاخلاق [مرتب: منشی فضل دین] لاہور: مصطفائی پریس، ۱۸۹۵ء۔
- ۱۴۶- سید حسن عسکری، مجموعہ حسن عسکری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء۔
- ۱۴۷- شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر [اردو ترجمہ: رشید احمد انصاری]، دہلی: مکتبہ برہان [س-ن]۔
- ۱۴۸- طارق جان، دانش وری یا تخریب کاری، ادارہ پاکستانیات ۲۸۶ سیٹلائیٹ ٹاؤن گوجرانوالہ، [س-ن]۔
- ۱۴۹- طارق جان، سیکولرزم: مغالطے اور مباحث، اسلام آباد: ایمل مطبوعات، ۲۰۱۲ء۔
- ۱۵۰- ظفر حسن، سرسید اور حالی کا نظریہ برفطرت، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۰ء۔
- ۱۵۱- عبدالقادر بجلانی، فیوض یزدانی ترجمہ الفتح الربانی، مترجم: عاشق الہی میرٹھی، کراچی: ندینہ پبلشنگ کمپنی، ۱۹۸۲ء۔
- ۱۵۲- علی عباس جلال پوری، روایات فلسفہ، لاہور: تخلیقات، ۲۰۱۰ء۔
- ۱۵۳- علی یاسر [مرتب]، اہل قلم ڈائریکٹری، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۰ء۔
- ۱۵۴- قاضی عبدالصمد الصارم، تاریخ التفسیر، کراچی: میر محمد کتب خانہ [س-ن]۔
- ۱۵۵- قاضی قیصر الاسلام، تاریخ فلسفہ مغرب: قدیم یونان سے عہد جدید تک، کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۲ء۔
- ۱۵۶- قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کے بنیادی مسائل، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۰ء۔
- ۱۵۷- قاضی یار محمد، اسلامی قربانی، ضلع کانگڑہ ریاض ہند، ۱۹۱۰ء۔
- ۱۵۸- کلیمنٹ سی۔ جے۔ ویب، تاریخ فلسفہ [مترجم: مولوی احسان احمد]، کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۱۹۸۹ء۔
- ۱۵۹- گوپی چند نارنگ، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۴ء۔

- ۱۶۰- ماہر القادری، یاد رفتگان، لاہور: البدر پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء۔
- ۱۶۱- محمد اسحاق صدیقی، خدا کا تصور اور اس کا ارتقاء، لکھنؤ: احباب پبلشرز، ۱۹۶۳ء۔
- ۱۶۲- محمد اقبال سلیمانی، براہین وحی، امرتسر: مکتبہ امت مسلمہ ہند، اپریل ۱۹۴۱ء۔
- ۱۶۳- محمد تقی امینی، احکام شرعیہ میں حالات و زمانے کی رعایت، لاہور: سندھ ساگر اکادمی، ۱۹۶۹ء۔
- ۱۶۴- محمد قاسم نانوتوی، تصفیۃ العقائد، دیوبند: کتب خانہ عزیز، [س-ن]۔
- ۱۶۵- محمد یحییٰ تنہا، سیرا المصنفین، دہلی: مکتبہ جامعہ ملیہ [س-ن]۔
- ۱۶۶- محمد حنیف ندوی، مطالعہ حدیث، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۷ء۔
- ۱۶۷- مرزا غلام احمد قادیانی، دافع البلاء و معیار اہل الاصفاء، قادیان: مطبع ضیاء الاسلام، ۱۹۰۲ء۔
- ۱۶۸- مرزا غلام احمد قادیانی، مجموعہ اشتہارات، ربوہ: الشركة الاسلامیہ، [س-ن]۔
- ۱۶۹- مرزا غلام احمد قادیانی، نزول المسیح، قادیان: مطبع ضیاء الاسلام، ۱۹۰۹ء۔
- ۱۷۰- مرزا غلام احمد قادیانی، ازالہ اوہام، امرتسر: مطبع ریاض ہند، ۱۳۰۸ھ۔
- ۱۷۱- مرزا غلام احمد قادیانی، اعجاز احمدی، قادیان: مطبع ضیاء الاسلام، ۱۹۰۲ء۔
- ۱۷۲- مرزا غلام احمد قادیانی، انجام آتھم، قادیان: مطبع ضیاء الاسلام، [س-ن]۔
- ۱۷۳- مرزا غلام احمد قادیانی، ایک غلطی کا ازالہ، جھنگ: ناظر تالیف و تصنیف پبلیشرز [س-ن]۔
- ۱۷۴- مرزا غلام احمد قادیانی، چشمہ معرفت، قادیان: مطبع انوار احمدیہ، ۱۹۰۸ء۔
- ۱۷۵- مرزا غلام احمد قادیانی، حقیقۃ الوحی، قادیان: مطبع میگزین، ۱۹۰۷ء۔
- ۱۷۶- مرزا غلام احمد قادیانی، ملفوظات احمدیہ، لاہور: احمدیہ انجمن اشاعت اسلام، [س-ن]۔
- ۱۷۷- مرزا غلام احمد قادیانی، ہر نعم الہدیٰ، قادیان: مطبع ضیاء الاسلام [س-ن]۔
- ۱۷۸- مرزا غلام احمد قادیانی، آئینہ کمالات اسلام، قادیان: مطبع ریاض ہند، ۱۸۹۳ء۔
- ۱۷۹- مسافران لندن [مرتب: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی]، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۱ء۔
- ۱۸۰- مناظر احسن گیلانی، تدوین حدیث، کراچی: ادارہ مجلس علمی، ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء۔
- ۱۸۱- منظور احمد، نظریہ اور پاکستان، کراچی: شوکت ٹریڈنگ پارکھ فاؤنڈیشن [س-ن]۔
- ۱۸۲- منظور احمد، یادوں کی تسبیح، [مؤلف: قاضی عبدالقادر]، کراچی: مکتبہ الہدیٰ، ۲۰۰۸ء۔
- ۱۸۳- مولوی عبدالحق، چند ہم عصر، کراچی: ناظم پریس، ۱۹۵۰ء۔
- ۱۸۴- نذیر احمد، موعظہ حسنہ، دہلی: مطبع انصاری، ۱۸۹۰ء۔
- ۱۸۵- نواب محسن الملک، مکاتبات الخلائق فی اصول التفسیر و علوم القرآن [مرتب: محمد عثمان مقبول]، علی گڑھ: مطبع احمدی، ۱۹۱۵ء۔

- ۱۸۶- نیاز فتح پوری، قمر زمانی بیگم: علامہ نیاز فتح پوری کی انوکھی داستان معاشقہ، [مرتب: ڈاکٹر فرمان فتح پوری]، کراچی: اردو اکیڈمی، ۱۹۷۹ء۔
- ۱۸۷- نیاز فتح پوری، قمر زمانی بیگم [مرتب: ڈاکٹر فرمان فتح پوری]، کراچی: اردو اکیڈمی، ۱۹۷۹ء۔
- ۱۸۸- نیاز فتح پوری، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، لاہور: آواز اشاعت گھر [س۔ن]۔
- ۱۸۹- نیاز فتح پوری، من ویزداں، لاہور: فلکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء۔

### (3) مضامین و مقالات

- ۱۹۰- تقی الدین ابن تیمیہ، ”معارج الوصول“، فی مجموع فتاویٰ، الریاض: مکتبۃ الملک فہد الوطنیہ، ۱۴۲۵ھ۔
- ۱۹۱- حبیب الرحمن اعظمی، ”نصرۃ الحدیث“، مشمولہ، رسائل اعظمی، کراچی: زمزم پبلشر، ۲۰۰۹ء۔
- ۱۹۲- خالد علوی، ”علامہ اقبال اور حدیث“، مشمولہ، علامہ اقبال کا تصور اجتہاد [مرتبین: ایوب صابر، محمد سہیل عمر]، لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۰۸ء۔
- ۱۹۳- زاہد صدیق مغل، ”اسلام، ہیومن رائٹس اور جمہوریت“، مشمولہ اسلامی بینکاری اور جمہوریت: فکری پس منظر اور تنقیدی جائزہ، لاہور: مکتبہ وراثت، ۲۰۱۲ء۔
- ۱۹۴- سید سلیمان ندوی، ”سود اور صحف انبیا“، مشمولہ مقالات سلیمان [مرتبہ: شاہ معین الدین احمد ندوی]، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۰ء۔
- ۱۹۵- عبد الوہاب سوری، ”مغربی تہذیب کے اصول و مبادی“، مشمولہ سرمایہ دارانہ نظام: ایک تنقیدی جائزہ، [مرتب: محمد احمد حافظ]، کراچی: الغزالی پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء۔
- ۱۹۶- مجنوں گورکھپوری، خودنوشت، مشمولہ ”ارمغان مجنوں“ مرتبہ صہبا لکھنوی، شبنم رومانی، کراچی: مجنوں اکیڈمی، ۱۹۸۰ء۔
- ۱۹۷- منظور احمد، پس چہ باید کرد؟ ”لوگ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟“، بش / مسلمان، کراچی: شوکت ثریا پارکھ فاؤنڈیشن [س۔ن]۔
- ۱۹۸- منظور احمد، ”اسلام اور پاکستان“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۴ء۔
- ۱۹۹- منظور احمد، ”اسلامی فکر کی بصیرت اور اقبال“، مشمولہ اقبال شناسی، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۲ء۔
- ۲۰۰- منظور احمد، ”اسلام، قانون اور اخلاقیات“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۴ء۔
- ۲۰۱- منظور احمد، ”اقبال کا فلسفہ مذہب“، مشمولہ اقبال شناسی، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۲ء۔
- ۲۰۲- منظور احمد، ”پیش لفظ“، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۴ء۔

- ۲۰۳- منظور احمد، "پیش لفظ"، مشمولہ اقبال شناسی، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۲ء۔
- ۲۰۴- منظور احمد، "ثابت قدمی"، مشمولہ اسلام اور زندگی، کراچی: ہمدرد فاؤنڈیشن، ۲۰۰۴ء۔
- ۲۰۵- منظور احمد، "ثبات، تغیر اور نشاۃ ثانیہ"، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۴ء۔
- ۲۰۶- منظور احمد، "چند تعلیمی مسائل"، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۴ء۔
- ۲۰۷- منظور احمد، "چند توجہ طلب مسائل"، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۴ء۔
- ۲۰۸- منظور احمد، "حواشی"، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۴ء۔
- ۲۰۹- منظور احمد، "خدا"، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۴ء۔
- ۲۱۰- منظور احمد، "خدا، خودی اور زمان و مکان"، مشمولہ اقبال شناسی، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۲ء۔
- ۲۱۱- منظور احمد، "عصر حاضر میں اسلام کی تفہیم"، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۴ء۔
- ۲۱۲- منظور احمد، "لڈوگ و ٹکنسٹائن"، مشمولہ تاریخ فلسفہ [مترجم، مولوی احسان احمد] کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۱۹۸۹ء۔
- ۲۱۳- منظور احمد، "مذہب کی صداقت"، مشمولہ اسلام۔ چند فکری مسائل، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۴ء۔

#### (4) اخبارات، رسائل و جرائد

- ۲۱۴- اخبار بدر، جلد ۲ نمبر ۳، ۲۶، ۲۷ فروری ۱۹۲۳ء۔
- ۲۱۵- ترجمان القرآن، جولائی۔ اگست، ۱۹۳۵ء۔
- ۲۱۶- جمال پانی پتی، "نقطہ نظر کی بطخ اور موضوع کا خرگوش"، مشمولہ مکالمہ، کراچی: اکادمی بازیافت، شمارہ ۱۳ جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۴ء۔
- ۲۱۷- جمال پانی پتی، "ڈاکٹر منظور احمد کا اسلام"، مشمولہ مکالمہ، کراچی: اکادمی بازیافت، شمارہ ۱۳ جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۴ء۔
- ۲۱۸- چہ دلا و راست، [مرتبین: سلمان چشتی، ریحان چشتی، خالد جامعی] کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی، ۲۰۰۷ء۔
- ۲۱۹- ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، "لبرل ازم کیا ہے؟"، مشمولہ ماہنامہ سنابل، اکتوبر۔ نومبر، ۲۰۱۲ء۔
- ۲۲۰- ڈاکٹر فریحہ نگہت، "مابعد الطبیعیات کے بنیادی مباحث"، مشمولہ مجلہ دریافت، اسلام آباد: نمل یونیورسٹی، شمارہ نمبر ۱۲۔
- ۲۲۱- روزنامہ ایکسپریس، اسلام آباد، ۵ ستمبر ۲۰۰۷ء۔
- ۲۲۲- روزنامہ نوائے وقت، ۲۳ اگست ۲۰۰۸ء۔

- ۲۲۳- روزنامہ نوائے وقت، ۲۵ اگست ۲۰۰۸ء۔
- ۲۲۴- روزنامہ نوائے وقت، ۲۶ اگست ۲۰۰۸ء۔
- ۲۲۵- روزنامہ ایکس پریس، اسلام آباد، ۱۲ جولائی ۲۰۰۹ء۔
- ۲۲۶- روزنامہ ”انقلاب“ یکم اکتوبر ۱۹۳۱ء۔
- ۲۲۷- روزنامہ ”انقلاب“ ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۱ء۔
- ۲۲۸- روزنامہ ”انقلاب“ ۲۳ ستمبر ۱۹۳۱ء۔
- ۲۲۹- روزنامہ ”انقلاب“ ۱۹ ستمبر ۱۹۳۱ء۔
- ۲۳۰- زاہد صدیق مغل، ”سائنسی طریقہ علم کیا ہے؟: سائنٹیفک میٹھڈ اور مذہب“ [حصہ اول]: زاہد صدیق مغل، سید محبوب الحسن، ”کیا اسلام سائنسی مذہب ہے؟: سائنسی طریقہ علم کا اسلامی جائزہ“ [قسط دوم]، مشمولہ ”جریدہ“، نمبر ۳، کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی، ۲۰۰۶ء۔
- ۲۳۱- سالنامہ ”نگار“ [کراچی]، نیاز نمبر حصہ اول، ۱۹۶۳ء۔
- ۲۳۲- سہ ماہی ”اجتہاد“، اسلام آباد، ۲: ۱، دسمبر ۲۰۰۷ء۔
- ۲۳۳- سہ ماہی ”تہذیب و روایت“، لاہور: مکتبہ روایت، جنوری ۱۹۹۰ء۔
- ۲۳۴- سید حسین نصر، ”عقل اور وجدان“ [ترجمہ: احمد جاوید]، مشمولہ اقبالیات ۲: ۲، جولائی ۱۹۸۶ء، اقبالیات ۲: ۲، جولائی- ستمبر ۲۰۰۶ء۔
- ۲۳۵- عبدالوہاب سوری، ”مسلم معاشرہ اور مغربی تہذیب کا چیلنج: ٹیکنالوجی کی بحث“، مشمولہ ماہ نامہ البرہان، لاہور، اگست ۲۰۱۱ء۔
- ۲۳۶- عدنان محمد جمعہ، رفع الحرج فی التشریعیۃ الاسلامیۃ، صفحات ۱۰۰-۱۰۳، بحوالہ ریاض الحسن نوری، ”نصوص اور مصالح مرسلہ“ مشمولہ سہ ماہی منہاج، لاہور: مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، جنوری ۱۹۸۶ء، مصادر شریعت نمبر، حصہ سوم۔
- ۲۳۷- علی محمد رضوی، ”جدیدیت: دینی اور لادینی پس منظر“، مشمولہ ساحل، جولائی- اگست، ۱۹۹۹ء۔
- ۲۳۸- ماہ نامہ ”الفرقان“، لکھنؤ، مارچ ۱۹۹۸ء۔
- ۲۳۹- ماہ نامہ ”ترجمان القرآن“ [لاہور]، اکتوبر ۱۹۹۷ء۔
- ۲۴۰- ماہ نامہ ”معارف“، اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۳۵ء۔
- ۲۴۱- ماہ نامہ ”معارف“، اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۳۵ء۔
- ۲۴۲- محمد اسحاق صدیقی، ”کچھ نگار کے ”خدا نمبر“ کے بارے میں“ مشمولہ ماہ نامہ فروغ اردو، لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۶۴ء۔
- ۲۴۳- ”مکالمہ“ [کراچی]، جولائی- دسمبر ۲۰۰۴ء، نمبر ۱۳۔
- ۲۴۴- منظور احمد، ”پاکستان“ مشمولہ پندرہ روزہ معارف فیچر، کراچی، یکم اگست ۲۰۰۸ء۔
- ۲۴۵- منظور احمد، ”روایت، جدیدیت اور لسانیات“، مشمولہ ماہ نامہ صریح، جلد ۱۵، شمارہ ۶۵، نومبر ۲۰۰۳ء۔



- ۲۳۶- منظور احمد، "علم کے امین" مشمولہ ماہ نامہ "تعمیر افکار" [کراچی] علامہ طاسین نمبر، جون۔ جولائی، اگست ۲۰۰۶ء۔
- ۲۳۷- منظور احمد، "نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام"، مشمولہ سہ ماہی المعارف، لاہور، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۵ء۔
- ۲۳۸- نیاز فتح پوری، "باب الاستفسار"، مشمولہ ماہ نامہ "نگار"، اکتوبر ۱۹۶۰ء۔
- ۲۳۹- نیاز فتح پوری، "باب المرسلۃ والمناظرۃ: احمدی جماعت"، مشمولہ ماہ نامہ نگار، نومبر ۱۹۵۹ء۔
- ۲۵۰- نیاز فتح پوری، "چند گھنٹے قادیان میں"، مشمولہ ماہ نامہ "نگار"، ستمبر ۱۹۶۰ء۔
- ۲۵۱- نیاز فتح پوری، "ملاحظات"، مشمولہ ماہ نامہ "نگار"، نومبر ۱۹۶۱ء۔
- ۲۵۲- ہفتہ وار "سرفراز"، لکھنؤ، ۹ دسمبر ۱۹۶۳ء۔
- ۲۵۳- Le Monde et La Vie, March 1964، بحوالہ سہ ماہی "تہذیب و روایت"، لاہور: جنوری ۱۹۹۰ء۔
- ۲۵۴- Le Monde et La Vie, November 1963، بحوالہ سہ ماہی "تہذیب و روایت"، لاہور: جنوری ۱۹۹۰ء۔

### (5) English Books

- 255- A. E. Taylor, *Plato: The Man and his Work*, London: Methuen & Co. Ltd., 1960.
- 256- A. F. Chalmers, *What is this Thing Called Science?: an Assessment of the Nature and Status of Science and its Methods*. England: Open University Press, 1988.
- 257- A. J. Ayer, *Logical Positivism*, USA: The Free Press, 1959.
- 258- A. Sprenger, *On the Origin and Progress of Writing Down Historical Facts among the Muslims*. Jornd of the Asiatic Society of Begal, 1856.
- 259- A.H. Smith, *Kantian Studies*, Oxford: Clarendon Press 1947.
- 260- Ahmad Hasan, *The Early Development of Islamic Jurisprudence*, Islamic Research Institute, 1970.
- 261- Albert J. Fritsch, Paul Gallimore, *Healing Appalachia: Sustainable Living Through Appropriate Technology*, Kentucky: University Press of Kentucky, 2007.
- 262- Alex Rosenberg, *Philosophy of Science: A Contemporary Introduction*, New York: Routledge, 2000.
- 263- Alexander koyré, *Metaphysics and Measurment: Essays in Scientific Revolution*, London: Chapman and Hall, 1968.
- 264- Alfred North Whitehead, "Process and Reality", eds., David Ray Griffin and Donald W. Sherburne, Free Press, 1979.

- 265- Alvin Toffler, *Future Shock*, New York: Bantam Books, 1990.
- 266- Aziz Ahmad, *Islamic Modernism in India & Paksitan: [1857-1964]*, India: Oxford University Press, 1970.
- 267- Baradat Leon, *Political Ideologies: Their Origins and Impact*, New Jersey: Prentice Hall, 2000.
- 268- Benedetto Croce, *What Is Living and What Is Dead of the Philosophy of Hegel*, [trans., Douglas Ainslie] London: Macmillan, 1915.
- 269- Benjamin Lee Whorf, *Language, Thought, and Reality*, [ed., John B. Carroll], USA: The MIT Press, 1956.
- 270- Bernard Lewis, *The Political Language of Islam*, Chicago: University of Chicago Press, 1988.
- 271- Bertrand Russell, *The Impact of Science on Society*, New York: AMS Press, 1968.
- 272- Bertrand Russell, *The Problems of Philosophy*, Oxford: Oxford University Press, 1959.
- 273- Brian Garrett, *What is this Thing Called Metaphysics?*, New York: Routledge, 2011.
- 274- Bruno Latour, *Science in Action*, Cambridge: Harvard University Press, 1987.
- 275- C. J. Friedrich, ed., *The Philosophy of Hegel*, New York: Random House, 1953.
- 276- C.E. Ayers, *The Theory of Economic Progress: A Study of the Fundamentals of Economic Development and Cultural Change*, New York: Schocken Books, 1962.
- 277- C.E.M. Joad, *Decadence: A Philosophical Inquiry*, Kessinger Publishing, 2008.
- 278- Charles Sanders Peirce, *Peirce on Signs: Writings on Semiotic*, [ed., James Hoopes], University of North Carolina Press, 1991.
- 279- Charles Singer, *A Short History of Science to the Nineteenth Century*, Oxford: Clarendon Press, 1941.
- 280- Charles Taylor, *Sources of the Self: The Making of the Modern Identity*, UK: Cambridge University Press, 1989.
- 281- Clement C.J. Webb, *A History of Philosophy*, New York: Henry Holt and Company.
- 282- Colin Wilson, *Beyond the Outsider: The Philosophy of the Future*, Houghton Mifflin, 1995.

- 283- D.C Stove, *Probability and Hume's Inductive Scepticism*, Oxford: Oxford University Press, 1973.
- 284- Dafna Lemish, *The Routledge International Handbook of Children, Adolescents, and Media*, London: Routledge, 2013.
- 285- David E. Roberts, *Existentialism and Religious Belief*, New York: Oxford University Press, 1959.
- 286- David Hume, *A Treatise of Human Nature*, edition by David Fate Norton and Mary J. Norton, Oxford: Oxford University Press 2000.
- 287- David Hume, *Enquiries Concerning the Human Understanding and Concerning the Principles of Morals*, Oxford: Clarendon Press, 1902.
- 288- Des Raj Bhandari, *History of European Political Philosophy*, Bangalore: Print. & Pub. Co., 1963.
- 289- Donald D Evans, *The Logic of Self-involvement (The Library of Philosophy and theology)*, London: SCM Press, 1963.
- 290- Douglas Dewar, *The Transformist Illusion*, Sophia Perennis, 2005.
- 291- E. J. Lowe, *A Survey of Metaphysics*. Oxford: Oxford University Press, 2000.
- 292- E.E. Harris, *The Foundation of Metaphysics in Science*. London: George Allen and Unwin, 1965.
- 293- E.E. Harris, *The Restitution of Metaphysics*. New York: Humanity Books, 2000.
- 294- Edmund Husserl, *Cartesian Meditations: An Introduction to Phenomenology*, [tr., Dorion Cairns], Netherlands: Kluwer Academic Publishers, 1999.
- 295- Edmund Husserl, *The Crisis of European Sciences and Transcendental Phenomenology: An Introduction to Phenomenological Philosophy*, Evanston: Northwestern University Press, 1970.
- 296- Edwin Arthur Burtt, *The Metaphysical Foundations of Modern Science*, New York: Dover Publication, Inc., 2003.
- 297- Erich Fromm, *Escape from Freedom*, New York: Open Road Media, 2013.

- 298- Erich Fromm, *The Sane Society*, New York: Routledge Classics, 2002.
- 299- Ernst Friedrich Schumacher, *A Guide for the Perplexed*, New York: Harper and Row, 1977.
- 300- Evan Shute, *Flaws in the Theory of Evolution*, Nutley, NJ: Craig Press, 1976.
- 301- Evelyn Baring Earl of Cromer, *Modern Egypt*, New York: Macmillan Company, 1916.
- 302- Francis Fukuyama, *Trust: The Social Virtues and Creation of Prosperity*, Free Press, 1995.
- 303- Franklin Baumer, *Religion and the Rise of Scepticism*, New York: Harcourt, Brace & Company, 1960.
- 304- Fritjof Capra, *The Turning Point: Science, Society, and the Rising Culture*, New York: Bantam Books, 1988.
- 305- Fritjof Capra, *Uncommon Wisdom: Conversation with Remarkable People*, London: Fontana, 1989.
- 306- Fuat Sezgin, *Geschichte des arabischen Schrifttums.*, 9 Vol., E.J. Brill, Leiden, 1966.
- 307- G. W. F. Hegel, *Lectures on Philosophy of History*, [trans., J. Silbree], New York: Dover Publications, 1956.
- 308- G. W. F. Hegel, *Reason in History: A General Introduction to the Philosophy of History*, [trans. R. S. Hartman] New York: Liberal Arts Press, 1953.
- 309- Georg W. F. Hegel, *The Philosophy of History*, New York: Cosimo, Inc., 2007.
- 310- George Jacob Holyoake, *English Secularism: A Confession of Belief*, Chicago: The Open Court Publishing Company, 1896.
- 311- Gilles Deleuze & Felix Guattari, *A Thousand Plateaus Capitalism and Schizophrenia*, [trans., Brian Massumi], London: University of Minnesota Press, 2005.
- 312- Gilles Deleuze & Felix Guattari, *Anti-Oedipus: Capitalism and Schizophrenia*, New York: Penguin Books, 2009.
- 313- Gross Barry, *Analytic Philosophy: An Historical Introduction*, New York: Pegasus, 1970.
- 314- H.A.R. Gibb, *Mohammedanism: An Historical Survey*, New York: A Galaxy Book, 1962.
- 315- Hans-Georg Gadamer, *EPZ Truth and Method (Continuum Impacts)* New York: Continuum, 2004.

- 316- Harry Gaylord Dorman, *Toward Understanding Islam: Contemporary Apologetic of Islam and Missionary Policy*, New York: Columbia University, 1948.
- 317- Harvey Gallagher Cox, *The Secular City: Secularization and Urbanization in Theological Perspective*. New York: The Macmillan Company, 1966.
- 318- Havelock Ellis, *Studies in The Psychology of Sex: Eonism and Other Supplementary Studies*, F.A. Davis, 1928.
- 319- Helen Beebee, Nikk Effingham & Philip Goff, *Metaphysics: The Key Concepts*, New York: Routledge, 2010.
- 320- Henryk Skolimowski, *Living Philosophy: co-Philosophy as a Tree of Life*, Arkana, 1992.
- 321- Herbert Marcuse, *One-Dimensional Man: Studies in the Ideology of Advanced Industrial Society*, Boston: Beacon Press, 1991.
- 322- Hermann Cohen, *Religion of Reason: Out of the Sources of Judaism*, London: Continuum International Publishing Group, Ltd., 1972.
- 323- Immanuel Kant, *Critique of Pure Reason*, [trans., Norman Kemp Smith], London: Macmillan and Co. Ltd., 1929.
- 324- Immanuel Kant, *Groundwork for the Metaphysics of Morals*, [ed., Lara Denis], Canada: Broadview Press, 2002.
- 325- Imre Lakatos and A. Musgrave, eds., *Criticism and the growth of Knowledge*, Cambridge: Cambridge University Press, 1970.
- 326- Imre Lakatos, Robert Sonné Cohen, Paul Feyerabend, Marx W. Wartofsky [eds.], *Essays in the Memory of Imre Lakatos*, Springer, 1976.
- 327- J. Bronowski and Bruce Mezlish, *The Western Intellectual Tradition*, Great Britain: Penguin Books, 1963.
- 328- J. Kim and Ernest Sosa Ed. *Metaphysics: An Analogy*. Blackwell Philosophy Anthologies, 1999.
- 329- J.F. Lyotard, *The Postmodern Condition: A Report on Knowledge*, trans., Geoff B Bennington and Brian Massumi, Minnesota: University of Minnesota Press, 1984.
- 330- Jacques Barzun, *Science: The Glorious Entertainment*, Harper and Row, 1964.

- 331- Jaegwon Kim, Ernest Sosa, and Gary S. Rosenkrantz [eds.], *A Companion to Metaphysics*, UK: Blackwell Publishing Ltd, 2009.
- 332- James Mannion, *Essential Philosophy: Every thing You Need to Understand the World's Greatest Thinkers*, U.K.: David & Charles Book, 2007.
- 333- Jared Diamond, *The World Until Yesterday: What Can We Learn from Traditional Societies?*, London: Penguin Books Ltd., 2012
- 334- Jared Diamond, *Guns, Germs and Steel: The Fates of Human Societies*, New York: W.W. Norton & Company, 1999.
- 335- Javed A. Ansari and S. Zeeshan Arshad, *Business Ethics in Pakistan*, Karachi: Royal Book Company, 2006.
- 336- John Rawls, *Political Liberalism*, New York: Columbia University Press, 2005.
- 337- John Rawls, *The Theory of Justice*, New York: Oxford University Press, 1971.
- 338- John William Navin Sullivan, *The Limitations of Science*, New York: The Viking Press, 1933.
- 339- Josef Köhler, *Philosophy of Law*, [trans., Adalbert Albrecht], New York: The Macmillan Company, 1921.
- 340- Joseph Schacht, *The Origins of Muhammadan Jurisprudence* ACLS, 2008.
- 341- Jürgen Habermas, *The Philosophical Discourse of Modernity : Twelve Lectures*, trans., Frederick G. Lawrence, MIT Press, Paperback edition, 1990.
- 342- Jürgen Habermas, *The Philosophical Discourse of Modernity*, Cambridge: Cambridge University Press, 1987.
- 343- Jürgen Habermas, *Towards a Rational Society*, [trans., Jeremy J. Shapiro], London: Heinemann Educational Books, 1971.
- 344- Karl Marx, *Karl Marx: A Reader*, Jon Elster [ed.], UK: Cambridge University Press, 1986.
- 345- Karl Popper, *The Logic of Scientific Discovery*, London: Hutchinson, 1968.
- 346- Karl Popper, *The Open Universe: An Argument for Indeterminism From the Postscript to The Logic of Scientific Discovery*, [ed., W.W. Bartley, III], New York: Routledge, 2012.

- 347- Karl R. Popper, *Conjectures and Refutations: The Growth of Scientific Knowledge*, New York: Basic Books Publishers, 1962.
- 348- Lewis Memford, *The Condition on Man*, London: A Harvest / HBJ Books 1973.
- 349- Lilli Alanen & Charlotte Witt, eds., *Feminist Reflections on the History of Philosophy* [The New Synthese Historical Library], Netherlands: Kluwer Academic Publishers, 2004.
- 350- Ludwig Wittgenstein, *Tractatus Logico-Philosophicus*, [trans., D. F. Pears and B. F. McGuinness] New York: Routledge Classics, 2001.
- 351- Lynn White, Jr., *The Historical Roots of Our Ecologic Crisis*, Science, March 10, 1967.
- 352- M. J. Loux, *Metaphysics: A contemporary Introduction*. [3rd ed.] London: Routledge, 2006.
- 353- Mahomed Ali Jinnah, *Some Recent Speeches and Writings of Mr. Jinnah*, comp. Jamal al-Din Ahmad, S. M. Ashraf, 1947.
- 354- Mahomed Ali Jinnah, *Speeches, Statements & Messages of the Quaid-e-Azam: 1941 [April 14]-1945*, comp. Khurshid Ahmed Khan Yusufi, Bazm-e-Iqbal, 1996.
- 355- Malcolm Bowden, *The Rise of the Evolution Fraud: An Exposure of Its Roots*, Bromely Kent: Sovereign Publications, 1982.
- 356- Marc Lange, *Philosophy of Science: An Anthology*, Oxford: Blackwell Publication, 2007.
- 357- Mark Jago, *Wettgenstein*, Humanities-Ebooks, 2007.
- 358- Martin Heidegger, *Being and Time*, Oxford: Blackwell, 1962.
- 359- Martin Heidegger, *Being and Time*, [trans., John Macquarrie & Edward Robinson] USA: Blackwell Publishing, 1962.
- 360- Martin Heidegger, *The Question Concerning Technology, and Other Essays*, New York: Harper Collins, 1982.
- 361- Maryam Jameelah, *Islam and Modernism*, Lahore: Mohammad Yusuf Khan, 1968.
- 362- Max Horkheimer & Theodor W. Adorno, *Dialectic of Enlightenment: Philosophical Fragments*, Stanford University Press, 2002.
- 363- Max Webber, *The Protestant Ethic and the Spirit of Capitalism*, [trans., Talcott Parsons], New York: Routledge, 1930.

- 364- Michael Denton, *Evolution: A Theory in Crisis*, MD: Adler & Adler, 1986.
- 365- Michel Foucault & Sylvère Lotringer, *The Politics of Truth*, Los Angeles: Semiotext(e), 2007.
- 366- Michel Foucault, *Madness and Civilization: A History of Insanity in the Age of Reason*, New York: Vintage Books, 1988.
- 367- Mohammad Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Lahore: Institute of Islamic Culture, 2009.
- 368- Muhammad Khalid Masud, *Islamic Legal Philosophy: A Study of Abu Ishaq al-Shatibi's Life and Thought*, Islamabad: Islamic Research Institute, 1977.
- 369- Muhammad Mustafa Azmi, *On Schacht's Origins of Muhammadan Jurisprudence*. New York: John Wiley, 1985.
- 370- Muhammad Mustafa Azmi, *Studies in Early Hadith Literature*. Beirut: al-Maktabal-Islami, 1962.
- 371- Muzaffar Iqbal, *Islam and Science: Explorations in the fundamental Questions of the Islam and Science Discourse*, Lahore: Suhail Academy, 2004.
- 372- Niall Ferguson, *Civilization: The West and The Rest*, Penguin Books, 2011.
- 373- Norman Kemp Smith, *A Commentary to Kant's Critique of Pure Reason*, 2nd ed., London: Macmillan 1923.
- 374- P. Guyer, *Kant* London & New York: Routledge, 2006.
- 375- Paul Feyerabend, *Against Method: Outline of an Anarchistic Theory of Knowledge*, London: New Left Books, 1975.
- 376- Paul Feyerabend, *Farewell to Reason*. New York: Verso, 1987.
- 377- Paul Feyerabend, *Science in a Free Society*, London: New Left Books, 1978.
- 378- Peter L. Berger, *The Desecularization of the World, Roourgent Religion and World Politics*, Michigan: William B Eerdmans Publishing co., 1999.
- 379- Philipp G. Frank, *Philosophy of Science: The Link Between Science and Philosophy*, Connecticut: Greenwood Press Publishers, 1974.
- 380- Pierre Lecomte do Noüy, *Human Destiny*, Longmans: Green and Co., 1947.



- 381- R. Joseph McCarthy, *Freedom and Fulfilment: An Annotated Translation of al-Ghazzalis al-Munqidh min al-dalal and other Relevant Works of al-Ghazzali*, Boston, 1980.
- 382- René Descartes, *The Principles of Philosophy*, [tr., John Veitch], Kessinger Publication, 2004.
- 383- Reynold Alleyne Nicholson, *A Literary History of Arabs*, Cambridge University Press, 1953.
- 384- Rich Ling, *The Mobile Connection: The Cell Phone's Impact on Society*, San Francisco: Morgan Kaufmann Publications, 2004.
- 385- Richard C. Martin, Mark R. Woodward, and Dwi S. Atmaja, eds., *Defenders of Reason in Islam: Mu'tazilism from Medieval School to Modern Symbol*, Oxford: Oneworld, 2003.
- 386- Richard M. Gale, *The Blackwell Guide to Metaphysics*. Oxofrd: Blackwell, 2000.
- 387- Richard P. Feynman, *Six Easy Pieces: Essentials of Physics Explained by Its Most Brilliant Teacher*, New York: Basic Books, 2011.
- 388- Richard Rorty, *Contingency, Irony, and Solidarity*, UK: Cambridge University Press, 1989.
- 389- Robert B. Pippin, *Modernism as a Philosophical Problem: On the Dissatisfaction of European High Culture*, Chicago: Chicago University Press Chicago, 1999.
- 390- Robert B. Pippin, *Modernism as a Philosophical Problem: On the Dissatisfactions of European High Culture*, UK: Blackwell Publishers, 1999.
- 391- Robert C. Scharff, Val Dusek, *Philosophy of Technology: The Technological Condition - An Anthology*, Oxford: Blackwell Publishing, 2003.
- 392- Roger W. Brown, *Language Thought & Culture*, [ed., Paul Henle], US: University of Machigan Press, 1958.
- 393- Rudolph Carnap, *The Unity of Science*, Oxon: Routledge, 2011.
- 394- S. Korner, *Kant*, England: Penguin Books, 1977.
- 395- Samir Okasha, *Philosophy of Science: A Very Short Introduction*, Oxford: Oxford University Press, 2002.
- 396- Samuel P. Huntington, *The Clash of Civilizations and the Remarking of World Order*, Penguin Books, 1997.

- 397- Seyyed Hossein Nasr, *Islam and the Plight of Modern Man*, Chicago: ABC International Group, 2001.
- 398- Seyyed Hossein Nasr, *Man and Nature: The Spiritual Crisis in Modern Man*, London: Unwin Paperbacks, 1990.
- 399- Sigmund Freud, *New Introductory Lectures on Psycho-Analysis*, [trans. Joan Riviere], Georg Allen and Unwin Ltd., 1949.
- 400- Sir Karl Raimund Popper, *The Philosophy of Karl Popper*, Volume 1, [ed., Paul Arthur Schilpp], Lasalle, IL: Open Court Pub Co., 1974.
- 401- Soren Kierkegaard, *Either/or: A Fragment of life [penguin classics]*, New York: Penguin Books 1992.
- 402- Soren Kierkegaard, *Fear and Trembling*, eds., Stephen Evans and Sylvia Walsh, New York: Cambridge University Press, 2006.
- 403- Stanley M. Honer, Thomas C. Hunt, Dennis L. Okholm, [eds.], *Invitation to Philosophy: Issues and Options*, Wadsworth Pub. Co., 1996.
- 404- Stephen G. Brush, *Fruitful Encounters: The Origin of the Solar System and of the Moon from Chamberlin to Apollo*, Cambridge: Cambridge University Press, 1996.
- 405- Theodore Zeldin, *The French*, London: The Harvill Press, 1997.
- 406- Thomas S. Kuhn, *The Structure of Scientific Revolutions*, Chicago: Chicago University Press, 1996.
- 407- Touraine Alain, *Critique of Modernity*, [Trans., David Malcy], Cambridge: Blackwell 1995.
- 408- W. Montgomery Watt, *The Faith and Practice of al-Ghazzali*, Chicago: Kazi Publications, 1982.
- 409- W.A. Robson, *Civilization and the Growth of Law*. London: Macmillan & Co. 1935.
- 410- Weal B. Hallaq, *History of Islamic Legal Theories: An Introduction to Sunni Usual al-Fiaq*. Cambridge: Cambridge University Press, 1997.
- 411- Werner Brock, *Existence and Being*, Chicago: H. Regnery & Co., 1949.
- 412- Wesley J. Wildman and W. Mark Richardson, *Religion and Science: History, Method, Dialogue*, UK: Routledge, 1996.

- 413- Wilfred Cantwell Smith, *Islam in Modern History*, New American Library, 1959.
- 414- William Henry Hudson, *An Introduction to the Study of Literature*, New Delhi: Atlantic Publishers & Dist., 2006.
- 415- William P. Berlinghoff and Fernando Quãdros Gouvea, *Math Though the Ages: A Gentle History of Teachers and Others*, Oxton House Publishers and Mathematical Association of America, 2004.
- 416- Ziauddin Sardar, *Explorations in Islamic Science*, London: Mansell Pub., 1989.
- 417- Ziauddin Sardar, *Postmodernism and the Other: the New Imperialism of Western Culture*, London: Pluto Press, 1998.
- 418- Alfred von Kremer, *Culturgeschichte Des Orients Unter Den Chalifen*, Wilhelm Braumüller, 1875.
- 419- Ignác Goldziher, *Muhammedanischẽ Studien* Halle a. S, 1889.
- 420- Johann Leo Weisgerber, *Vom Weltbild der deutschen Sprache: Die inhaltbezogene Grammatik*, Pädagogischer Verlag, 1953.
- 421- Theodor Nöldeke, *Geschichte des Qorãns*, Göttingen, 1860.
- 422- Vincenzo M. Poggi, *Un classico della spiritualità musulmana: Saggio monografico sul Munqid di al-Gazali*, Roma: Gregorian Biblical BookShop, 1967.

## (6) Selected Articles

- 423- Abdul Wahab Suri, "What is Living and What is Dead in Iqbal: A Critical Attempt to Understand Apparently Incommensurable Hermeneutical Circles Prevailing in Iqbal's Thought" in *Revisioning Iqbal As a Poet and Muslim Political Thinker*, [Gita Dharampal-Frick, Ali Usman Qasmi and Katia Rostetter, eds.], Pakistan: Oxford, 2011.
- 424- *Afkar Inquiry*, Vol. 5, Issues 1-5, Tropvale Limited, 1988.
- 425- Burton Dreben, "On Rawls and Political Liberalism", in *The Cambridge Companion to Rawls*, [ed., Samuel Richard Freeman], UK: Cambridge University Press, 2003.

- 426- Farhad Khosrokhavar, "Reformist and Moderate Voices in European Islam" in *Reformist Voices of Islam: Mediating Islam and Modernity*, ed., Shireen T. Hunter, New York: M.E. Sharpe, 2009.
- 427- Francis Fukuyama, "History and September 11" in *Worlds in Collision: Terror and the Future of Global Order*, [eds., Ken Booth and Tim Dunne], New York: Palgrave Macmillan, 2002.
- 428- Hossein Nasr, "Epistemological Questions: Relations among Intellect, Reason, and Intuition within Diverse Islamic Intellectual Perspectives", in *Islamic Philosophy from its Origin to the Present: Philosophy in the Land of Prophecy*, USA: State University Press of New York Press, 2006.
- 429- I. Lakatos, "Popper on Demarcation and Induction" in *The Philosophy of Karl Popper*, [ed., P. A. Schilpp, La Salle, Illinois: Open Cort, 1974.
- 430- Immanuel Kant, "What is Enlightenment", in *Perpetual Peace and Other Essays on Politics, History, and Moral Practice*, [ed., Ted Humphrey], Indianapolis :Hackett Publishing, 1983.
- 431- Imre Lakatos, "Falsification and the Methodology of Scientific Research Programmes", in *Criticism and the Growth of Knowledge*, ed. I. Lakatos and A. Musgrave, Cambridge: Cambridge University Press, 1974.
- 432- John Rawls, "Social Unity and Primary Goods" in *Beyond Utilitarianism*, [eds., Amarty Sen and Bernard Williams], Cambridge: Cambridge University Press.
- 433- José Maria Sbert, "Progress" in *The Development Dictionary: A Guide to Knowledge as Power*, [ed., Wolfgang Sachs], New York: Schocken Books, 1962.
- 434- Julie Owen, "Human Rights as Civil Religion : the Glue for Global Governance?", in *Criticizing Global Governance*, [ed., Markus Lederer], 2005, New York: Palgrave Macmillan.
- 435- K.R. Popper, "Conjectural Knowledge: My Solution of the Problem of Induction", in *Objective Knowledge*, Oxford: Oxford University Press, 1972.

- 436- M.Saeed Shaikh, "Al-Ghazzali: Metaphysics" in *A History of Muslim Philosophy* [ed., M.M. Sharif], Wiesbaden, 1963.
- 437- Mark Blaug, "Kuhn Versus Lakatos, or Paradigms Versus Research Programmes in the History of Economics" in *Paradigms and Revolutions*, Gary Gutting ed., Notre Dame, Ind.: University of Notre Dame Press, 1980.
- 438- Mark Blaug, "Paradigms versus Research Programmes", in *Philosophy & Methodology of the Social Sciences: Scientific Knowledge as a Social Product*, [ed., Mark J. Smith], California: SAGE Publications Ltd., 2005.
- 439- Osman Bakr, "The Place of Doubt in Islamic Epistemology: Al-Ghazzali's Philosophical Experience", in *The History and Philosophy of Islamic Science*, Cambridge: Islamic Texts Society, 1999.
- 440- R.J. Hollingdale, "The Hero as Outsider", in *The Cambridge Companion to Nietzsche*, [eds., Bernd Magnus and Kathleen M. Higgins], Cambridge: Cambridge University Press, 1996.
- 441- Sami M. Najm, "The Place and Function of Doubt in the Philosophies of Descartes and al-Ghazali", *Philosophy East and West*, Vol. 16, No. 3/4 (Jul. - Oct., 1966).
- 442- Seyyed Hossein Nasr, "Chapter Seven: Eternity and the Temporal Order", in *Knowledge and the Sacred: Revisioning Academic Accountability*, New York: SUNY Press, 1989.
- 443- Thomas Vargish, "Modernism" in *Routledge Encyclopedia of Philosophy*, [ed., Edward Craig], London and New York: Routledge, 1998.
- 444- W. Dilthey, "The Hermeneutics of the Human Sciences", in *The Hermeneutics Reader: Texts of the German Tradition from the Enlightenment to The Present*, ed., Kurt Muller-Vollmer, New York: Continuum, 1985.
- 445- Giuseppe Furlani, "Dr. J. Obermann, Der philos. und religiose Subjektivismus Ghazalis" [Recensione] in *Rivista trimestrale di studi filosofici e religiosi*, Vol. III, No. 2, Perugia, 1922.

## (7) Encyclopedia & Dictionaries

- 446- E.J. Brill, [ed.], *The Encyclopaedia of Islam*, London: Luzac & Co. 1971, Vol. III.
- 447- J.A. Simpson and E.S.C. Weiner [eds.], *The Oxford English Dictionary*, Oxford: Clarendon Press, 1989.
- 448- John Daintith & Derek Gjertsen, [eds.], *A Dictionary of Scientists*, New York: Oxford University Press, 1999.
- 449- John L. Esposito, *The Oxford Encyclopedia of the Modern Islamic World*, Oxford University Press, 1995.
- 450- R.A. Jahangirdar, "Secularism", in *The Social Science Encyclopaedia*, Adam Kuper & Jessica Kuper [eds.], London: Routledge, 1985.
- 451- Routledge [Firm], *Concise Routledge Encyclopedia of Philosophy*, Oxford: Taylor & Francis Routledge, 2000.
- 452- *The American Heritage Dictionary of the English Language*, United States: Houghton Mifflin Publication, 1969.
- 453- *The Encyclopedia of Philosophy*, [ed., Paul Edwards], Vol. 7, New York: Macmillan Publishing Co., 1967.
- 454- *The New Encyclopædia Britannica*, "Natural Law", Fifteenth Edition, 1983, Vol. 12,
- 455- Vincent N. Parrillo, *Encyclopedia of Social Problems*. Vol. 2, California: SAGE Publications, 2008.
- 456- William Darrach Halsey & Emanuel Friedman, *Collier's Encyclopedia*, London: Macmillan Educational Corp., 1981.

## (8) Newspapers & Journals

- 457- "A Survey of Islam" in *The Economist*, Aug 6th 1994.
- 458- Javed Akber Ansari, "Rejecting Freedom and Progress: The Case Against Capitalism" in *Jareeda*, 29, KU: BCC&T, 2004.
- 459- Milton Friedman, "The Social Responsibility of Business Is to Increase Its Profit", in *The New York Times Magazine*, September 13, 1970.

460- *The Times*, 30 Sep. 2004.

461- Cornelia Kinger, "From Freedom Without Choice to Choice Without Freedom: the Trajectory of the Modern Subject", in *Constellation* Vol. 11, No. 1, Blackwell Publisher, March 2004.

## (9) برقی مآخذ

462- <https://www.cia.gov/library/publications> [25-12-2013]

463- [www.hu.mtu.edu/~flockha/h3700kuhn.f06.doc](http://www.hu.mtu.edu/~flockha/h3700kuhn.f06.doc) [10-12-2011]

## محمد ظفر اقبال کی زیر تصنیف اور زیر طبع کتابیں [تفصیلی تعارف]

[۱] اسلام اور جدید سائنس نئے تناظر میں [مطبوعہ]

امت مسلمہ اس وقت جن بیرونی یلغار اور اندرونی خلفشار کا شکار ہے، اس نے معاصر علمی و فکری حلقوں میں اس یقین کو راسخ کر دیا ہے کہ دین کی تبلیغ و ترسیل کے لیے پیمانہ، معیار اور کسوٹی عصر حاضر اور اس کا مزاج اور اسلوب ہے۔ دین کو موجودہ انسانی ذہن اور فہم کے معیار کے مطابق بیان کر کے ہی لائق تسلیم اور قابل قبول بنایا جاسکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مخاطب تک داعی کے پیغام و کلام کی راست تفہیم کے بغیر دعوت دین اور دفاع اسلام کا فریضہ با معنی طور پر ادا نہیں کیا جاسکتا، یہ کلمو الناس علی قدر عقولہم کا اقتضاء بھی ہے۔ فی زمانہ امت مسلمہ کے زوال و ادبار کے خوف اور مشاغب نے امت کے عبقری اذہان کو گرفت میں لے کر اپنا اسیر بنا لیا ہے۔ ان کی تمام مخلصانہ دینی دعوت اور دفاع اسلام کی کوششیں، الا ماشاء اللہ، اصول اور مقاصد دین ہی سے ٹکرانے لگی ہیں — کلاسیکی اسلامی ذخیرہ علمیات اور تاریخ سے اگر تاویلاً بھی کوئی جزیہ ہاتھ لگ جائے جس سے جدید ذہن کی تسلی اور جدید زمانے کی تسکین اور حصول کامن پیدا ہوتا ہو تو مسلم مفکرین اس کے ذریعے مغربی افکار، اہداف اور اقدار کی اسلام سازی کے درپے ہو جاتے ہیں۔ دین، دینی عقائد و اعمال اور اقدار و تہذیب کو جدید زمانے اور جدید ذہن کے مطابق ڈھال دینے کی طرف شعور اور ارادے کی پوری کوشش، قابلیت اور لیاقت صرف کر دینے نے غیر ازادی طور پر مذہب کے بنیادی جوہر اور مرکزی و کلیدی نکتے، یعنی ایمان بالغیب کی روح، کو بڑی حد تک نقصان پہنچایا ہے۔ اس طرز کی مکمل پیروی اور اسلوب کی مسلسل گردان نے، غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ تو رہی ایک طرف، خود مسلم نوجوانوں کو اس بات کا عادی بنا دیا ہے کہ وہ ان ہی

— الف —



دلائل اور اسالیب کا اثر قبول کرتے ہیں جو طبیعیاتی اور عقلی علوم سے میل کھاتا ہو، جو حقائق و واقعات ان خود ساختہ اصولوں اور معیارات سے الگ ہوں یا ماورا ہوں یا ان کے خلاف ہوں جدید مسلم ذہن اس کی قبولیت میں اس ہمہ گیر یقین اور مخبر کی صداقت پر اعتماد کا ثبوت نہیں دیتا جو اسلام کا جوہر خاص ہے۔ بالفاظ دیگر اس کاوش نے غیر ارادی طور پر امت سے براہی روح کی سلطیت اور کار تہیسی روح کی بیداری کا سامان مہیا کر دیا ہے، جس کے مطابق انسان کا مایہ امتیاز یقین نہیں، شک ہے۔ محدود دائرے میں عقلی و تجربی علوم کی افادیت سے انکار نہیں، لیکن اثبات دین اور قبولیت مذہب کے لیے اسے بہ طور کلیہ استعمال کرنا نہایت خطرناک رویہ ہے۔

دعوت و تبلیغ اور دفاع اسلام کے مذکورۃ الصدر طریقے اور اسلوب کی پیروی کرنے والوں میں محترم ڈاکٹر ڈاکٹر نائیک صاحب کا نام بہت معروف ہے۔ ان کی مناظرانہ کاوشوں اور دفاع اسلام کی کوششوں سے معاصر مسلم دنیا کے [سادہ لوح اور ناواقف لوگوں کے] دل ان کے لیے محبت اور ہم دردی کے جذبات سے مملو ہیں، خود مصنف بھی ان کی بعض واقعی خوبیوں اور کمالات کا معترف ہے — اور اخلاص نیت کے ساتھ ان کی داعیانہ اور مناظرانہ کاوشوں کی کمزور بنیادوں اور اصولی نقائص کی اصلاح کا متمنی ہے۔ اوپر بیان فرمودہ اسباب کے پیش نظر جب ان کے خطبات اور مناظروں کا مطالعہ کیا گیا تو نہایت خطرناک نتائج سامنے آئے۔ مصنف نے خالصۃ الدین النصیحة، عند اللہ مسئولیت کے استحضار اور دعوت دین و دفاع اسلام کے نبوی منہاج اور روایتی علم کلام کی احیاء کے پیش نظر کلامی و منطقی دلائل کے جائزے کا حاصل پیش کیا ہے۔ ان کے دلائل کی کمزور بنیادوں کو اپنی علمی استعداد اور مطالعے کے مطابق واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ راقم کو اپنی کسی رائے پر اصرار نہیں اور نہ ہی اس کو دعویٰ ہے کہ تحقیقی اعتبار سے اس کی یہ حقیر کاوش حرف آخر ہے، بلکہ شاید منزل کی طرف اٹھنے والے قدموں میں اسے ”پہلا قدم“ کہا جاسکتا ہے۔

کتاب کا مقصد صرف اخلاص کے ساتھ ان لغزشوں اور کوتاہیوں کی علمی تصحیح تھی، لہذا کتاب کا مسودہ مکمل ہونے کے بعد طباعت سے چار ماہ قبل محترم نائیک صاحب کی خدمت میں ای میل کے ذریعے ارسال کر دیا گیا اور واضح طور پر یہ تحریر کیا گیا کہ اگر ہمارے موقف کی کمزوری اور کوتاہی کو کتاب و سنت اور اجماع و تعامل سے واضح کر دیا جائے تو مصنف کو اپنے موقف پر کوئی اصرار نہیں، بہ صورت دیگر ڈاکٹر صاحب بھی رجوع میں تامل نہ فرمائیں۔ ان دونوں صورتوں میں کتاب کی تالیف کا مقصد پورا ہو جائے گا اور اس کی اشاعت کا کوئی جواز نہیں رہے گا — ڈاکٹر صاحب کی جانب سے مکمل خاموشی رہی — بار بار کی یاد دہانی بھی ڈاکٹر صاحب کی نگاہ التفات میں جگہ نہ پاسکی۔

— ب —

کتاب کی اشاعت کے بعد اس کے نتائج نہایت حوصلہ افزا اور ثمر آور رہے۔ عالم اسلام کے ممتاز عالم دین اور مایہ ناز مفتی جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے کتاب کے مندرجات کو ملاحظہ فرمانے اور بعض اہم نکات پر سوالات اور مکاتبت کے بعد اسے اپنی پرزور تائید و تقریظ سے مشرف فرمایا۔ اسی طرح ریاض میں مقیم پاکستانی سائنس دان اور ماہر فلکیات اور سابق پروفیسر کنگ سعود یونیورسٹی ڈاکٹر فضل احمد، جو ڈاکٹر ڈاکر نائیک صاحب کے دیرینہ رفیق ہیں اور سعودی عرب میں ڈاکٹر ڈاکر نائیک کے قیام کے دوران میزبانی کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں، نے کتاب کو مکمل ملاحظہ کرنے کے بعد ای میل کے ذریعے اپنی تفصیلی تائید سے نوازا۔ متذکرہ دونوں اور دیگر تائیدات و تقریظات کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں لگادی جائیں گی۔

## [۲] علوم عقلیہ اور زوال امت

مغرب میں سائنسی ترقی تین بنیادی تحریکوں نشاۃ ثانیہ [renaissance]، تحریک اصلاح [reformation movement]، اور تحریک تنویر [enlightenment] کی مرہون منت ہے اور یہی تینوں تحریکیں فی الاصل لا دین [Secular] مغرب کی اساس اور ”بشر مرکزی“ [Humanism] کی داعی ہیں — اس میں شک نہیں کہ مغرب نے بہت سے عقلیاتی علوم میں مسلمانوں کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن کیا یہ کہنا صحیح ہوگا، جیسا کہ عالم اسلام کے بعض جدیدیت پسند مفکرین یہ دعویٰ کرتے ہیں، کہ مغرب کی تمام تر سائنسی ترقی اسلام بالخصوص قرآنی تعلیمات پر مغرب کے غور و تدبیر کا پھل ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو کیا مغرب کو مسلمانوں کے عہد عباسی میں وضع شدہ عقلیاتی و تجربی علوم سے پہلے قرآن و احادیث کا مغربی زبانوں میں ترجمہ نہیں کرنا چاہیے تھا؟ اس لیے کہ مسلم متجددین کے نزدیک عقلیاتی علوم کا بنیادی ماخذ قرآن ہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر واقعی ایسا ہے تو کیا قرآن مجید میں اس تمام تر غور و خوض کا بنیادی زمانہ عہد نبوی، عہد خلفائے راشدین اور خیر القرون نہیں ہونا چاہیے جب کہ اسلام کی ابتدائی چھ صدیاں مسلمانوں کی ان علوم و فنون میں غور و خوض اور دلچسپی کے شواہد مہیا نہیں کرتیں؟

گزشتہ نصف صدی سے مسلمانوں کے عروج و زوال پر ایک طویل بحث جاری ہے۔ امت مسلمہ کے زوال کے واقعی اسباب کے تجزیے اور تحلیل کے لیے کتابوں اور مقالات کا ایک انبار ہے۔ مسلم دنیا میں بسنے والے اہل علم و قلم، خواہ ان کا تعلق کسی بھی رنگ و نسل اور فرقہ و مکتب سے ہو، کی غالب اکثریت نے مسلمانوں کے دور زوال کا بالعموم ایک ہی تجزیہ پیش کیا ہے، جس کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ مسلمان علوم عقلیہ کی طرف سے صرف نظر اور بے اعتنائی کے باعث زوال و ادبار کا شکار ہوئے۔ مفکرین کی غالب اکثریت کے نزدیک اگر مسلمان اپنی عقلی اور سائنسی سرگرمیوں کی طرف سے اغماض اور روگردانی کے مرتکب نہ ہوتے تو آج مغرب کی جگہ عالم اسلام ”سپر پاور“ ہوتا۔ زوال امت کے تجزیوں کے ضمن میں عالم اسلام میں ”سائنس زدگی“ اور ”سائنسی اعتزال“ کے آثار و مظاہر کا ایک اجمالی تاریخی جائزہ کہ ترقی کا اسم اعظم اور کامیابی کی شاہ کلید صرف اور صرف سائنس اور ٹیکنالوجی ہیں؟ کیا اسی کی عدم حصولی کے باعث آج امت مسلمہ زبوں حالی کا شکار ہے؟ اس نفسیات نے جدید مسلم

ذہن پر ایسی گرفت پکڑی کہ ان کی تمام تر دینی سرگرمیاں اور علمی نکتہ آفرینیاں اسی دائرے کی رہن منت ہو کر رہ گئی ہیں۔ قرآن کی تفسیر ہو یا حدیث و فقہ کی تشریح ہر جگہ بحث کا مرکزی نکتہ تدبیر و تفکیر کائنات بہ معنی سائنس اور ٹیکنالوجی ہو کر رہ گیا ہے۔ جدید مسلم مفکرین نے گزشتہ دو سو سال میں قرآن مجید سے تقریباً ہر نمایاں سائنسی علوم و فنون کا ”استنباط“ اور استخراج ”فرمایا ہے۔ ارضیات [geology] اور نباتات [botany] سے لے کر جہاز سازی اور چشم و قلب کی جراحی تک سب کچھ گزشتہ دو سو سالوں میں مسلم مفکرین نے قرآن مجید سے برآمد فرمایا ہے۔ عجیب تر بات تو یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے بنیادی سرچشموں سے ان علوم و فنون کی ”دریافت“ اور ”بازیافت“ سے اسلام کی سابقہ تاریخ ”لاعلم“ اور ”نابلد“ رہی ہے۔

چوں کہ جدید سائنسی ترقی نے سائنسی تحقیق کے عمل کو نہایت سرعت پذیر بنا دیا ہے لہذا پہلے جن نظریات کو رد اور متروک ہوتے ہوتے سالوں لگتے تھے اب ان کے متروک ہونے میں بہت کم وقت درکار ہوتا ہے لہذا سابقہ دہائیوں میں جن نظریات کی بنا پر قرآن مجید کی حقانیت کا اثبات مہیا کیا گیا تھا بعد کے زمانے میں غلط ثابت ہو جانے کے بعد ان ہی نظریات کو، جو پہلے قرآنی آیات کی حقانیت کا ”ثبوت“ تھے، بیان کرنے سے اجتناب برتا جاتا ہے۔

اس کتاب میں اس امر پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے کہ اگر یہ سائنسی نظریات، جیسا کہ متجددین کا دعویٰ ہے، قرآن مجید کی حقانیت کی ”دلیل“ تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر بالخصوص اور مسلمانوں کی استخلاف فی الارض سے محرومی تک بالعموم ان ”حقائق“ کی نقاب کشائی سے چشم پوشی کیوں برتی گئی؟

اس سلسلے میں عرب و عجم اور امریکہ و یورپ کے مسلمانوں نے کیا کیا لٹریچر تخلیق کیا ہے؟ جن میں بالخصوص مغرب پر نہایت عمیق اور گہری فلسفیانہ نظر رکھنے والے دبستان روایت سے وابستہ مفکرین رہے، فرتھ جوف شوآں، اور دبستان روایت ہی سے وابستہ لیکن ایک مستقل دبستان کی حیثیت سے معروف اور کثیر التصانیف شیعہ مفکر حسین نصر، امریکہ میں سائنس کے ذریعے علوم کو اسلامیانے [Islamization of knowledge] کی تحریک کے روح رواں اسماعیل راجی الفاروقی، اجمالیز کے نام سے مغرب پر انتہائی نفیس تنقید کرنے والے مفکر ضیاء الدین سردار وغیرہ کے ”اسلامی سائنس“ کی حمایت، دفاع اور حکمت عملی کے خدو خال — ادھر ترکی میں سعید نورسی سے لے کر الپ ارسلان تک ”سائنس زدگی“ کا ارتقائی سفر — ایران میں علی شریعتی، آیت اللہ مر قاضی مطہری اور مہدی گلشنی کے سائنسی افکار — انڈونیشیا میں نقیب العطاس اور عثمان بکر جیسے نمایاں محققین کے آثار — ہندوستان میں علی گڑھ اسکول سے وابستہ مفکرین زکی کرمانی، ریاض کرمانی، امریکہ میں

بسنے والے ڈاکٹر وقار حسینی، جرمن نو مسلم مفکر مراد ہوف مین اور بہ ظاہر راسخ العقیدہ رہ نما علامہ محمد اسد اور فرانسیسی نژاد مفکر محمد آرکون وغیرہ کے دلائل وغیرہ کا ایک تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔ سائنس زدگی کی ترویج و تشکیل میں عرب دنیا بالخصوص مصری ادب و صحافت کا کیا کردار رہا ہے؟ یہاں تک کہ بعض انتہائی راسخ العقیدہ اور تجدد سے پورے ایمانی جوہر کے ساتھ نبرد آزما مسلم مفکرین کے ہاں بھی، اصول کی سطح پر نفی کے باوجود، جزئیات میں ”سائنس زدگی“ کے کیا کیا اور کیسے کیسے آثار و مظاہر ملتے ہیں؟ سائنس کی اسلام سازی کے لیے مغربی مفکرین کے تحریر کردہ اور مسلم جدیدیت پسندوں کے ”بنیادی مآخذ“ کی نشان دہی اور اس کی اسنادی، علمی اور تحقیقی لیاقت۔۔۔ الغرض ان تمام امور پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور آخر میں تفہیم مسئلہ کی غرض سے مسلم دانش وروں خواہ متجددین ہوں یا راسخ العقیدہ مفکرین کی خدمت میں علم و تہذیب کی سطح پر سائنس کی اسلام سازی کے ضمن میں ایک مربوط سلسلہ سوالات پیش کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر و تشریح میں اس بے باکی سے سائنسی اکتشافات اور انکشافات کی جستجو نے کیسے کیسے سنگین مسائل کھڑے کر دیے ہیں اور اس کے کیا کیا جوابات ہیں۔

یہ کتاب مسلم مفکرین کے کسی طبقے پر کوئی حکم لگانے، ان کے اخلاص پر شک کرنے یا ان کی علمی کاوشوں کی تحقیر کی غرض سے نہیں لکھی گئی بلکہ عہد حاضر میں درپیش انتہائی سنجیدہ مسئلے، جس سے قرآن مجید کی حقانیت اور، معاذ اللہ، الوہی پیشین گوئیوں کا اثبات وابستہ ہے، کا روایتی علم کلام کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ فی الحقیقت یہ کتاب روایتی علم کلام کی جانب پیش رفت کی ایک عاجزانہ لیکن مخلصانہ کاوش ہے۔

## [۳] تصوف — چند بنیادی مباحث

اسلامی تاریخ کی علمی روایت میں یہ مسلمہ بدیہی ہے کہ دین نے انسانوں کی ”تعمیر ظاہر“ کے ساتھ ”تزئین باطن“ کا بھی پورا پورا اہتمام کیا ہے۔ خیر القرون خصوصاً عہد صحابہ میں اگرچہ دین کے ان دونوں مطلوبہ مقاصد کی تکمیل و تحصیل کے لیے کوئی مخصوص اور معنون شعبہ [institution] موجود نہیں تھا جیسا کہ بعد میں فقہ اور تصوف جیسے شعبے وجود پذیر ہوئے۔ مناظرانہ کج بحثیوں سے قطع نظر کیا یہ امر بنی برحقیقت نہیں کہ خیر القرون میں دین کے ان دونوں شعبوں کے تمام تر اسباب و محرکات اور اساسیات و مقاصد کے استنادی اور تاریخی شواہد موجود ہیں؟ اگر لفظیت اور حرفیت ہی پر اصرار کیا جائے کہ نہیں! ایک ایک لفظ کا ایسا ثبوت مہیا کر دیا جائے جیسا کہ معترض کی منشا ہے تو کیا یہ اسی طرز کے ”فرمانشی دلائل“ کا مطالبہ نہیں ہوگا جیسا کہ کفار بالعموم حضرات انبیائے کرام اور مشرکین عرب بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کرتے تھے؟ اگر اس طرز استدلال کو معیاری اور حقیقی مان لیا جائے تو کیا پھر اسلام کے بیش تر حقائق کا اثبات یا استرداد مورد سوال نہیں بن جائے گا؟ — کیا تصوف اور صوفیہ کا منہاج علم، ماخذ، پیانہ، کسوٹی اور معیار قرآن و سنت کے سوا کچھ اور بھی ہے؟ کیا گمراہی کے موجودہ ”صوفیانہ مظاہر“ کا محاکمہ خود محققین صوفیہ کی طرف سے نہیں ہوا؟ اگر تصوف اتنی بڑی ”گمراہی“ ہے جیسا کہ جدید ناقدین خیال کرتے ہیں تو عالم اسلام کے محدثین، مفسرین اور فقہاء کی غالب اکثریت اپنا انتساب تصوف سے کیوں کرتے رہے؟ کیا کسی غیر مستند، غیر ثابت شدہ اور جعلی حکایت و کرامت کے صوفیانہ کتابوں میں اندراج کے باعث صوفیہ مورد الزام ٹھہرائے جاسکتے ہیں، یا ان جعلی کرامات و حکایات کو بھی اسی حیثیت سے رد کیا جاسکتا ہے جس طرح حدیث کی کتابوں میں سے ”موضوع“، تفسیر و قرأت کی کتابوں میں سے ”شاذ“ اور فقہ کی کتابوں میں سے ”غیر مفتی بہ“ اقوال کو رد کر دیا جاتا ہے؟ کیا صوفیہ کے نزدیک کشف و کرامات کا حصول اور اس کا اظہار ہی معراج تصوف ہے؟ کیا تمام صوفیہ کرام علی الاطلاق سماع کی ہر شکل کو جائز اور حلال سمجھتے ہیں؟ کیا صوفیہ باطنیت اور شیعیت سے متاثر رہے ہیں، یا ان سے فکری و عملی محاذ پر لڑی جانے والی موثر جنگیں صوفیہ کے ہاتھوں برپا ہوئی ہیں؟ کیا تصوف امور دنیا سے انمناض اور جہاد سے شکست خوردگی کا نام ہے، یا اسلام کے دفاع کے لیے لڑی جانے والی جنگوں اور جہاد و قتال میں صوفیانے کرام

کی عملاً شرکت کے مستند تاریخی شواہد موجود ہیں؟ کیا ”تصوف“ کے نام کو آڑ بنا کر، کہ یہ لفظ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں ہے، مطلقاً صوفیہ کی خدمات اور جہد و سعی اور اس پورے ادارے [Institution] کا انکار کر دینا درست علمی رویہ ہے؟ کیا قرآن، حدیث اور فقہ میں مستعمل تمام اصطلاحات قرآن و حدیث سے ثابت ہیں، جنہیں ناقدین دن رات ”دین“ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں، بلکہ انکار تصوف کے لیے ان ہی انسانوں [فقہاء و محدثین] کی وضع فرمودہ اصطلاحات کو استعمال کیا جاتا ہے؟ کیا حضرت جنید بغدادیؒ سے لے کر مجدد الف ثانیؒ تک تمام صوفیہ شرک و بدعات کی ترویج کرنے والے اور ”متوازی دین“ کسی اور مذہب یعنی ”طریقت“ کے داعی تھے؟ کیا طریقت دین کے متوازی کوئی راہ ہے یا اس کی جڑیں اور بنیاد کتاب و سنت ہی میں پیوستہ ہیں؟ غیر اسلامی تصوف کے شدید ترین ناقدین حافظ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ نے اپنی تمام تر تنقیدات کے باوجود بالکل علی الاطلاق تصوف کو رد کیوں نہ کیا؟ بلکہ حافظ ابن تیمیہؒ کے بارے میں بعض معتبر شہادتیں ان کے سلاسل تصوف سے وابستگی کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں — یہ اور اس طرح کے کئی اور اہم سوالات، اعتراضات، شبہات کے تحقیقی جوابات اور حضرات صوفیہ و تصوف پر جدید معاندانہ تنقیدات کا بسیط محاکمہ — ان تنقیدات اور اعتراضات میں تصوف اور صوفیہ کو بدنام کرنے کے لیے کس طرح علم و تحقیق اور دیانت کا خون کیا گیا ہے۔

## [۴] اسلام اور مغرب: مغربی افکار و اقدار: چند بنیادی مباحث

مغرب کیا ہے؟ کیا اس سے مراد ایک جغرافیائی خطہ ہے؟ یا یہ مستقل نظریے اور آدرشوں کے ایک مربوط نظام سے وابستگی کا نام ہے۔ اس وابستگی نے مغرب کی جغرافیائی حدود کو بے معنی بنا کر غیر مغربی خطوں کو بھی اپنے اقدار کی یک رنگی اور افکار کی یک جائی میں سمو کر اپنا جزو غیر منفک بنا لیا ہے۔ اس کے بنیادی اصول آزادی، ترقی اور مساوات ہیں۔ ان اقاہیم ثلاثہ کی بنیاد پر مغرب کا تصور انسان، انسان کے یکہ و تنہا اور قائم بالذات ہونے کے تصور پر قائم ہے۔ تنہائی اور علیحدگی کا لازمی نتیجہ انسان کی خود مختاری ہے [جو عبدیت کی نفی پر مبنی ہے]، خود مختاری کا لازمہ مساوات ہے۔ آزادی، اور مساوات اس لیے ضروری ہیں تاکہ انسان زیادہ سے زیادہ ترقی کر سکے۔ لیکن مغربی افکار و اقدار کی درست تفہیم نہ ہونے کے باعث ہمارے نہایت مخلص مگر سادہ لوح مسلم مفکرین کے نزدیک مغرب آج بھی اسی ”عیسائی عصبیت“ کا نام ہے، جس کا اظہار اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں تحریک اصلاح سے قبل اسلام کے حریف کی حیثیت سے ”صلیبی جنگوں“ کی صورت میں ہوتا رہا ہے۔ ہمارے یہ مفکرین ابھی تک اسلام اور مغرب کے درمیان مباحثے کے ضمن میں عیسائیت کی تردید میں مصروف ہیں۔ اگرچہ عیسائیت آج بھی مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے اس لیے اس کی تردید ایک مستقل دینی سرگرمی ہے، اس کام کی اہمیت اور وقعت سے انکار نہیں لیکن آج مغربی افکار عیسائیت سے عبارت نہیں ہیں۔ فی زمانہ مغربی فکر و تہذیب سے مراد وہ افکار اور نظام اقدار ہیں جو قدیم یونان سے شروع ہو کر جدیدیت [Modernism] اور مابعد جدیدیت [Post Modernism] اور اس کے دیگر ذیلی مکاتب کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ آج کا مغرب مکمل طور پر خدا بیزار ہے، جس میں محرف عیسائیت بھی اسلام کی حریف نہیں بلکہ حلیف ہے۔ جدید مغرب نے اس عہد کے انسانوں کے لیے علمی، فکری اور اقداری سطح پر خدا، رسالت، وحی اور آخرت کو مضحکہ خیز حد تک بے معنی بنا دیا ہے۔ عیسائیت اب مغرب میں اجنبی ہو چکی ہے۔ اگرچہ اس کا ”علامتی وجود“ تا حال موجود ہے، لیکن وہ سراسر غیر فعال اور غیر مؤثر ہے۔ افکار، اقدار، تہذیب، معاشرت، حکومت، ریاست ہر جگہ جدیدیت ”سرمایہ داری“ [Capitalism] کی شکل میں حکمران ہے، جس کی ”انجیل“ بنیادی انسانی حقوق کا چارٹر ہے۔ اس نے



دنیا مرکزی اور حیات پرستی کو انسانیت کے لیے نہایت پرکشش اور بامعانی بنا کر زندگی کے ہر شعبے کو اپنے دائرے میں داخل کر لیا ہے۔ — اس نظام سے پورے ایمانی جوہر سے لڑنا خدا، مذہب اور وحی پر یقین رکھنے والے ہر فرد اور گروہ خصوصاً مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے، یہ اس دور کا بدترین کفر اور شرک ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا فرمودہ دین، مزاج، اقدار، اخلاق، معاشرت، ریاست، حکومت غرض ہر شے سے براہ راست متصادم ہے۔ — اس کتاب میں ان بنیادی مباحث اور مغرب کے خلاف جنگ کی حکمت عملی میں درست سمت اور خطوط کی نشان دہی کی گئی ہے۔

## [۵] مسئلہ اجتہاد اور مقاصد شریعت: اصول، شرائط اور حدود

اجتہاد فی الاصل ہے کیا؟ یہ بحث زمانہ قدیم سے آج تک برابر تحریر و گفتگو کا عنوان بنا رہا ہے۔ اسلامی تاریخ کی مسلسل روایت میں ”اجتہاد“ چند مسلمہ اصولوں [قرآن، سنت اور اجماع] کی روشنی میں معاشرے کی بدلتی ہوئی ضرورتوں اور تقاضوں کو خالق کی منشا اور شارع کی ہدایات کے مطابق پورا کرنے کا ایک اصول ہے۔ — ماضی میں علما و فقہانے ان اصولوں کی روشنی میں مسلم معاشرے اور اسلامی تمدن میں دیگر تہذیبوں اور ثقافتوں کے زیرِ تحت نفوذ کر جانے والے اثرات و مضمرات پر بڑی فیصلہ کن حد بندیاں اور محتاط توسع کی راہ دکھائی ہے۔ لیکن اٹھارویں صدی میں مغرب کے سائنسی انقلاب، مادی ترقی کے عروج اور مسلمانوں کی اختلاف فی الارض سے محرومی نے مسلمانوں کے ایک معتد بہ طبقے میں احساس کہتری پیدا کر دیا ہے۔ متجددین نے جانے انجانے اسلامی تشریح کے اس چوتھے ماخذ ”اجتہاد“ کی آڑ لے کر خود نصوص ہی کو اجتہاد کا موضوع بنا دیا ہے، جب کہ دین و شریعت محل اتباع ہیں محل اجتہاد نہیں۔ گزشتہ دو صدیوں میں اگر متجددین کے ”اجتہادات“ کے متفرق نمونے یک جا کیے جائیں تو اسلام کا کوئی ایک حکم اور دین کا کوئی ایک اصول بھی ان اجتہادات کی رو سے دائمی اور ناقابل تبدیل نہ ٹھہرے گا بلکہ پورا اسلام اپنے عقائد، احکام اور حدود سمیت ”اجتہاد“ ہی کی نذر ہو جائے گا۔ بالفاظ دیگر قرآن مجید کے کلام الہی ہونے، اس میں وارد شدہ حدود و احکام کی دائمیت اور احادیث و سنت کی حجیت سے لے کر اس میں وارد شدہ محکم امور، اجماع کی حجیت، اس کے ذریعے طے شدہ فیصلوں، یہاں تک کہ خلفائے راشدین کے اجماعی فیصلوں غرض ہر وہ امر جسے اسلام کی تاریخ اپنی مسلسل روایت میں ثبات سے متصف اور ناقابل تغیر و تبدل مانتی آئی ہے وہ سب ہمارے متجددین کے اجتہادات کی رو سے ”اجتہاد“ کا موضوع بن گئے ہیں۔ ان متجددین کا، جن کی اکثریت ماخذ تشریحی کے تیسرے اصول اجماع کی حجیت کی منکر ہے، اجماعاً یہ فیصلہ ہے کہ ثبات سے اتصاف اور تغیر سے اغماض ہی مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب ہے۔ علما نے باب اجتہاد کو بند کر کے امت کی ترقی اور جہاں بانی کی ہر راہ مسدود کر دی ہے۔ اجتہادی روح [جس کا خاصہ تغیر محض کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانا ہے] کے فقدان کے باعث آج امت مسلمہ من حیث الکل ذلت، محکومی، مفلسی اور آزاد ہوتے ہوئے بھی غلامی سے دوچار ہے۔ — زیر تعارف کتاب میں اجتہاد کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم، عہد نبوی اور حیات صحابہ میں اجتہاد کی نوعیت، قرآن و سنت اور اجماع کی حجیت اور ان سے ثابت و صادر ہونے والے احکام کے دائمی ہونے کے دلائل اور ان پر متجددین کے سوالات اور اعتراضات کے جوابات، انفرادی اجتہاد کے بجائے اجتماعی اجتہاد کی ضرورت اور افادیت اور اسلاف میں اس طریق اجتہاد کا رواج،

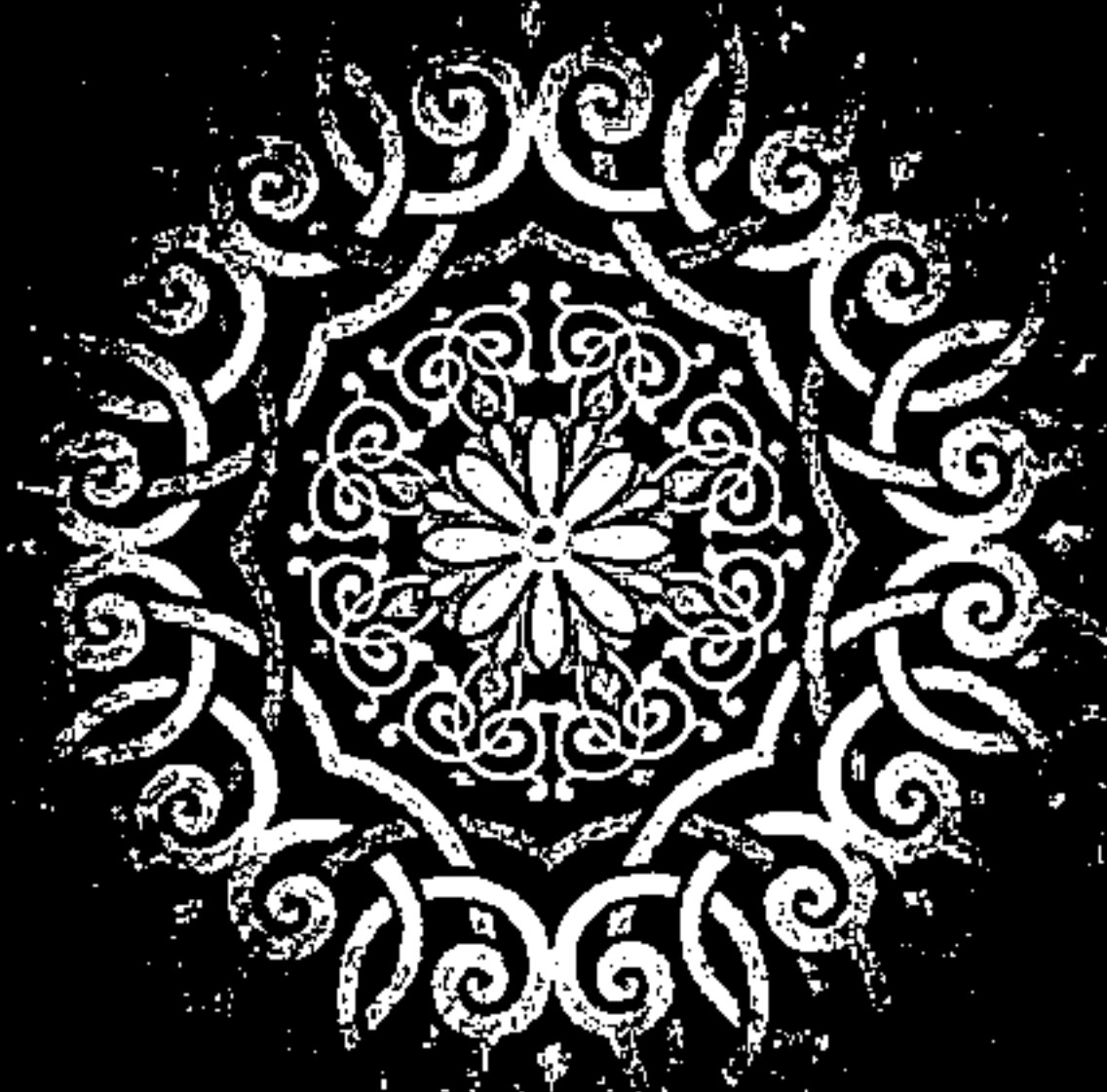
اصول کی کتابوں میں مجتہد کی لیاقت اور شرائط اور ان پر معترضین کے مضحکہ خیز اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں، مثلاً ہر متجدد، الا ماشاء اللہ، اجتہاد کی ادنیٰ اہلیت سے محرومی کے باوجود خود کو ”مجتہد“ باور کرتا ہے اور چوں کہ سلف اور اصول کی کتابوں میں منقول اجتہاد کی بنیادی شرائط اس میں مفقود ہوتی ہیں لہذا وہ ہر اس شرط کو شرائط اجتہاد سے خارج کر دینا چاہتا ہے جو اس میں نہیں پائی جاتی۔ مثلاً کسی کے نزدیک مجتہد کا عربی زبان جاننا ضروری نہیں ہے، کسی کے خیال میں مجتہد کا ماہر کتاب و سنت ہونا لازمی نہیں ہے، کسی کے مطابق مجتہد کا سابقہ فقہی ذخیرے پر نظر اور عبور اجتہاد کی بنیادی شرائط میں شامل نہیں، بعض کے نزدیک مجتہد کے تدین و تقویٰ سے اتصاف پر اصرار درست نہیں، یہاں تک کہ چند متجددین کے رو سے مجتہد کا مسلمان ہونا بھی محل نظر ہے۔ الغرض ہر متجدد نے شرائط اجتہاد کی متفرق شقوں پر اپنے اپنے ”اجتہادات“ صادر کر کے مجتہد کے لیے کسی بھی قسم کی علمی یا عملی لیاقت اور اہمیت کو ناممکن بنا دیا ہے یعنی ”ہر شخص آپ اپنا مجتہد ہے“۔ کیا اجتہاد ایک ”امر عام“ ہے؟ کیا ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم کے ایک ہی مسئلے پر اجتہادی فیصلوں کے نتائج ایک ہی جیسے ہوں گے؟ کیا اجتہاد دنیوی زندگی کو دین کے مطابق گزارنے کا اصول اور عملی طریقہ مہیا نہیں کرتا؟ اس لحاظ سے کیا اجتہاد کا تانا بانا آخرت سے وابستہ نہیں ہو جاتا؟ اسی طرح ”مقاصد شریعت“ اس کی شرائط اور حدود، جن کے حصار میں مجتہد اپنی اجتہادی کاوش کے نتائج فراہم کرتا ہے، پر معترضین کے سوالات اور اسلاف نے مقاصد شریعت کے اصول خمسہ [تحفظ دین، تحفظ نفس، تحفظ عقل، تحفظ نسل اور تحفظ مال] کی روشنی میں بدلتے ہوئے سماج اور مختلف تہذیبوں کے اثرات کے باوصف دین پر عمل کو ممکن بنایا تھا، متجددین نے ان ہی شرائط کے مفاہیم میں جزئیات نگاری بلکہ صریح لفظوں میں تحریف کرتے ہوئے ان اصول خمسہ کو تغیر محض، حصول تعیش اور دنیا پرستی کی کلید بنا دیا ہے۔ اجتہادی عمل پر قدم اور اسلاف کے منہج، اجتہاد کی کلیت اور حقیقی روح اور متجددین کی تحریفات کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔ الغرض اجتہاد اور اس کے متعلقہ تمام اہم امور مکمل دلائل اور اعتراضات کے جوابات نہایت بسط اور تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں زیر بحث لائے گئے ہیں اور یہ حقیقت ثابت کی گئی ہے کہ سلف نے اصول و ماخذ کی سطح پر باب اجتہاد کو مقفل قرار دینے کے باوجود امت کی ہر اجتہادی ضرورت کو پورا کیا۔ اس کتاب میں راسخ العقیدہ مکاتیب فکر کے سربراہ اور وہ علماء کے اجتہادات کی ایک جامع فہرست مہیا کی گئی ہے، جنہوں نے اصول کی سطح پر باب اجتہاد کے بند ہونے کے باوجود اپنی اجتہادی بصیرت سے نئے پیش آمدہ مسائل کا حل پیش کیا ہے۔ اس کے برعکس متجددین نے اجتہاد کا دروازہ چوہٹ کھول کر سوائے تشکیک پیدا کرنے کے اور کوئی خدمت نہیں انجام دی۔ احساس کہتری اور خود پر عدم اعتماد کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ متجددین خود کو مجتہد اور علماء کو کم علم باور کرنے کے باوجود علماء ہی سے اجتہادات کے صدور کے متمنی ہیں حالانکہ اہلیت اور شرائط اجتہاد کے استحقاق کی بحث سے بڑھ کر نفس مسئلہ پر اجتہاد ہی وہ اصل کام تھا جسے اگر متجددین انجام دے دیتے تو، بہ شرط درست، امت اسے قبول کر لیتی۔

## [۶] معرکہ عقل و نقل

عقل کی حدود اور نارسائی حکمائے اسلام اور فلاسفہ مغرب کی نظر میں

حصولِ تیقن انسانی شعور کی بنیادی ضرورت ہے۔ کیا شعور کو یہ تیقن محض عقل کی استعداد یا مظاہر پر انحصار سے حاصل ہو سکتا ہے؟ عقل اپنے ساتھ دو مستقل مجبوریاں رکھتی ہے: [۱] مسلسل جستجو، [۲] خود پر کسی مقتدرہ کو حکم نہ بننے دینا۔ — خوئے جستجو عقل کو یقین اور قطعیت کا اثبات نہیں کرنے دیتی اور کسی بھی مقتدرہ کو خود پر حکم نہ تسلیم کرنے کے باعث عقل ہر اس امر اور حقیقت کو محال باور کرتی ہے جو اس کے دائرہ ادراک سے ماورا ہیں۔ — عقل اپنی تمام تر عظمتوں اور رفعتوں کے باوصف زمان و مکاں کی اسیر، مظاہر پرست اور تشبیہ گرفتہ ہے۔ جب کہ ذات حق ہر قسم کی حدود و جہت سے ماورا ہے۔ — کیا ماورائے زمان و مکاں حقائق کے اثبات و ادراک کے لیے عقل کے پاس کوئی اور راہ ہے؟ یا اس کی واحد راہ ایمان ہے؟ خود ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس میں ایسا کون سا ملکہ پایا جاتا ہے جو شعور کے لیے زمان کے جبر اور مکاں کی حد بندیوں کو توڑ کر ماورائے مظاہر حقائق کو واجب الاثبات بنا دیتا ہے؟ کیا شعور کو ایمان تعقل قلبی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جو تعقل ذہنی سے اپنی ماہیت و غایت دونوں میں مختلف ہوتا ہے؟ عقل ذہنی حقائق تک رسائی کے لیے معروض کو حصوں اور ٹکڑوں میں توڑ کر درجہ بہ درجہ پہنچنے کی کوشش کرتی ہے جب کہ مابعد الطبیعی حقائق کبھی خانوں میں منقسم ہو کر قابل ادراک نہیں ہوتے کہ وہ بھی ایک ”شے“ بن جائیں۔ قلب اس حقیقت کو شعور کے لیے من حیث الکل واجب القبول بناتا ہے۔ کیا ایمانی جہت سے حقائق علم کا نہیں انکشاف کا موضوع ہیں؟ اس انکشاف کے بعد شعور کو صورت اور علم کے اعتباری ہونے اور معنی و وجود کے حقیقی ہونے کا مشاہدہ میسر آتا ہے؟ — اسلامی فکر اپنے روز اول سے آج تک عقل و نقل کے حوالے سے کیا نقطہ نظر اختیار کرتی آئی ہے؟ مسلمانوں کے سوا اہل سنت و جماعت کی علم یاتی اور مابعد الطبیعیاتی سطح پر دیگر فرق اسلامیہ خصوصاً معتزلہ سے طویل ترین معرکہ آرائی کا اصل سبب کیا تھا؟ جب کہ اہل سنت عقل کی عظمت کے معترف اور معتزلہ نقل کی حجیت کے قائل تھے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ راسخ العقیدہ اسلامی تاریخ کی مسلسل علمی روایت خواہ حدیث و تفسیر سے وابستہ ہو، چاہے فقہ و تصوف سے منسلک ہو، یا عقائد و کلام سے متعلق ہو ان سب کا عقل کی مخصوص دائرے میں اہمیت کے باوصف اس کی نارسائی، محدودیت اور نقص پر اجماع رہا ہے؟ مغرب میں عقلیت پسندی کی بحث چار علمی

اسلام اور جدید سائنس



محمد ظفر اقبال

اسلامیہ علم و فنانش